

تاریخ تحریک آزادی ہند

جلد دوم

تارا چند

مترجم

غلام ربانی تاباں



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویٹ باک-1، آر-کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

Tarikh Tehrik Azadi Hind II

By

Tara Chand

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سزا شاعت : اکتوبر، دسمبر 2001 شک 1923

1100 : پہلا ایڈیشن

163/= : قیمت

891 : سلسلہ مطبوعات

ناشر : ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک - I، آر۔ کے۔ پورم،

نئی دہلی - 110066

طالع : جے۔ کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی - 110006

پیش لفظ

”ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے“

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمود پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبقت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت ساحصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جاسکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہن انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین
6	دیباچہ
9	پہلا باب مزاہمتیں اور شور شین
38	دوسرا باب 1857ء کی بغاوت
101	تیسرا باب ہندوستانی درمیانی طبقہ
152	چوتھا باب نئی تعلیم اور مغربی تہذیب کا اثر
185	پانچواں باب اخبارات اور رائے عامہ
198	چھٹا باب سماجی اصلاح
237	ساتواں باب ہندوستانی قوم پرستی کا معاشی پس منظر
295	اٹھواں باب مسلم سیاسی فکر کے رجحانات
327	نواں باب مذہبی اور سماجی اصلاحی تحریکات
358	دسواں باب تعلیم اور ہندوستانی اخبارات
387	گیارہواں باب سامراج اور اُس کے ریکارڈ
434	بارہواں باب سیاسی تحریک
480	تیرہواں باب ادبی نشاۃ ثانیہ

دیباچہ

انیسویں صدی میں برطانوی اثرات کے خلاف ہندوستان کے رد عمل کا جائزہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کی دوسری جلد میں لیا گیا ہے۔ یہ اثرات بڑی حد تک سیاسی تھے اور اس کے ایجنٹ جدیدیت کے جذبے سے سرشار تھے جو ہندوستان میں پائے جانے والے عہد وسطیٰ کے روپنے کے برعکس تھا۔ وہ سیاست کو تعمیری معنی میں ایک ایسا عنصر سمجھتے تھے۔ جو سماج کی تمام سرگرمیوں میں شامل ہے اور ان کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی زندگی پر برطانوی اثرات وسیع بھی تھے اور ان کی جڑیں گہری بھی تھیں۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثر پڑے۔

مغرب کے خلاف ہونے والی صف آرائی نے ہندوستان کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی روایات یعنی اقتدار و تصورات رسم و رواج اور اداروں کا تنقیدی جائزہ لے اور ان میں سے جو غیر معقول یا غیر صحت مند نظر آئیں انھیں یا تو ترک کر دے یا نئی شکل دے۔ اس تصادم کا یہ تخریبی پہلو تھا۔ دوسری طرف یہ ضروری تھا کہ اس چیلنج کا جواب ہندوستانی شعور کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھرے جو ہندوستانی زندگی کے بنیادی اصولوں کی یکتائی کے اعادے کے مترادف ہوتا۔ وہ اصول جو ہزاروں سال تک فرد اور سماج کے طور طریقوں کے لیے محرکات مہیا کرتے رہے۔ جن سے ہندوستانی تہذیب کی خصوصیات عبارت ہیں اور جو ہزاروں سال تک ان کی انفرادیت اور تسلسل کے ضامن رہے۔

ان خصوصیات کو دوبارہ دریافت کرنے اور ان میں نئی جان ڈالنے اور ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کرنے کے لئے پہلی شرط تھی سیاسی آزادی۔ یہ تھا بدلتی اقتدار کا اصلاحی رول۔

سماجی اور مذہبی اصلاح کی تحریکیں ہوں یا مذہن نشیں کر کے اولیٰ اظہار یا معاشی اور سیاسی تبدیلی کی تحریکیں ہوں۔ یہ سب مظہر تھیں اس بڑے تغیر کی جو جدیدیت کے نظریاتی اور عملی حصے کے نتیجے میں وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں جب جدیدیت کی روشنی رفتہ رفتہ پھیلنے شروع ہو گئی تھی قدیم ہندوستان اس منظر کو دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا اس لیے کہ وہ مغربی سامراج کی ابتدا کو اپنی قدیم تہذیب کے لئے ایک خطرہ سمجھتا تھا جس میں معیشت، سیاسی نظام اور مذہب شامل تھے۔ اس ہلاکت آفرینی سے بچنے کے لئے پرانے نظام نے شدید مگر بے اثر رد عمل کا مظاہرہ کیا۔ ابتدائی شورشیں انفرادی حادثات تھے جن میں کوئی تال میل نہیں تھا لیکن ان کا نقطہ عروج تھی 1957ء کی بغاوت جس کا شہر ایک الیہ پر ہوا۔

اس دوران ایک نیا ہندوستان شکل پذیر ہو رہا تھا۔ ہندوستانی تہذیب کی انفرادیت اور تسلسل کی بنیاد پر قومی اتحاد کی عمارت تعمیر کی جا رہی تھی ابھی تک ہندوستان کی تاریخ کی نمایاں خصوصیات رہی ہے تہذیبی یک جہتی اور اس کے ساتھ سیاسی تفریق پسندی۔ اب کوشش کی گئی تہذیبی ہم آہنگی کو تقویت دینے کی اور ایک دوامی بنیادی سیاسی یک جہتی پیدا کرنے کی ہندوستان کا قوم پرستی کے ارتقا میں انیسویں صدی کا نصف آخر ایک تشکیلی دور تھا۔ ابتدا میں تحریک کمزور تھی۔ اور اسے خود پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے سماج کے درمیانی طبقے کو متاثر کیا۔ اس کی کئی آوازیں تھیں اور اپنے سیاسی اور مذہبی مفادات و مقاصد میں امتیاز نہیں کر سکی یہ برطانوی سامراج کے دامن سے چینی رہنا چاہتی تھی۔ اپنے بھولے پن اور نا تجربہ کاری کی بنا پر اس نے سیاسی اصلاح کی ڈیپلیمٹک یقین

دہانوں اور فیاضی کے ساتھ کئے جانے والے وعدوں پر یقین کر لیا اور اتنی سی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ سامراجی مفادات قومی توقعات سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ قومی عزم کے اس آرگن نے، جو وجود میں آچکا تھا، ابتدا میں اپنے مقاصد کو گم نہ کر دیا اور اُن مقاصد کو حاصل کرنے کے طریقوں میں دوسروں کی نقل کر نے لگا اس دوران سماجی و معاشی تبدیلیاں آزادی کی جدوجہد کے آخری مرحلے کے لیے میدان تیار کر رہی تھیں۔ لوگوں کی بد حالی بڑھتی جا رہی تھی۔ درمیانی طبقوں کی طاقت اور اثر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اُن خرابیوں سے روز بروز زیادہ باخبر ہوتے جا رہے تھے جو ہندوستان کو لاحق تھیں اور اُن کو دور کرنے کے لئے جو طریقے انہوں نے ابھی تک اپنائے تھے اُن کی بے اثری اُن پر رفتہ رفتہ ظاہر ہونے لگی تھی۔ عام لوگوں کے مایوس کن حالات کا ناقابل انکار ثبوت مہلک قحطوں کے اُس سلسلے نے فراہم کر دیا تھا جس کی وجہ سے انیسویں صدی میں لوگوں کو ناقابل بیان دکھ سینے پڑے۔

دوسری طرف مذہبی اور سماجی اصلاح کی تحریکات اور ادب و فن کا نشاۃ ثانیہ قوم پرستی کے ابھرتے ہوئے جذبے کے مظاہر تھے۔ ایک ایسی نئی صبح کے مظاہر جو غلامی اور دکھوں کی رات کے خاتمے کا اعلان کر رہی تھی۔

بدقسمتی سے ہندوستان کے حکمرانوں نے جس طرح لوگوں کے دکھوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اُس طرح وہ ہندوستان کی قوم پرستی کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ بقول سر جان اسٹریچی ”ہندوستان ہے اور نہ کبھی تھا۔ ہندوستان کا کوئی ملک بھی نہیں ہے“ بلاشبہ حکمرانوں کی یہ بے نیازی ہندوستانی لوگوں اور اُس کی بددلی حکومت کے درمیان تصادم کی اصل وجہ بن گئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ تصادم بڑی حد تک تقریروں، تحریروں، کبھی کبھی تحریکوں، پر جوش جلسوں، تجویزوں اور عرصہ اشتوں کی شکل میں کئے جانے والے اختلاف و احتجاج سے ظاہر ہوتا رہا۔ سیاست کا کل کھیل اُن کے مطابق کھیلا جاتا تھا جو ”دستوری ضوابط“ کے نام سے مشہور تھے۔ اس کا مقصد تھا حکومت وقت کے جذبہ خیر سگالی سے رجوع کرنا اور اُسے اجتماعی امکان کم سے کم تاراشگی کا موقع دینا۔

اُس صدی کا راج آخر میں الا قوامی معاملات میں برطانیہ کے مسئلہ قیادت اور سامراج کے بڑے فروغ کا زمانہ تھا۔ سلطنت کے دونوں حصوں میں سے سفید حصے کو رفتہ رفتہ ڈومنین انٹینس کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جس میں اصل ملک کے ساتھ مساوی حیثیت مضمحل تھی۔ دوسرے حصے کو جہاں غیر سفید نسلیں اور مختلف تہذیبوں کے لوگ آباد تھے، برطانیہ کی شان و شوکت کو برقرار رکھنے کی خاطر ایک ضروری بنیاد کے طور پر تعمیر کیا جا رہا تھا۔ کمرزن کے زمانہ حکومت میں ہندوستان میں سامراج کے دعوے اپنے نقطہ عروج کو پہنچ چکے تھے جس کا رد عمل ناکر ہوا تھا۔ وہاں سے جا رہا نہ قوم پرستی کا دور شروع ہوا۔

صدی کے انتقام کے ساتھ آزادی کی تحریک کی کہانی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے جہاں سے اُس نے بیسویں صدی میں نفوذ کیا اور اپنی تکمیل کو پہنچی۔ اس موضوع پر بحث تیسری جلد میں کی جائے گی۔ اس تاریخ کو لکھتے وقت اتنا دور نئے واقعات کی دریافت پر نہیں دیا گیا جتنا کہ جاننے پہچاننے واقعات کی تشریح و تفسیر پر۔ صراحت کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اُسے کسی قدر موضوعی عمل بنادیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تشریح کی بنیاد ہونی چاہئے وہ واقعات جو تاریخی بیان کے لئے خام مال کی حیثیت رکھتے ہیں پھر بھی واقعات کے انتخاب، اُن کی ترتیب اور اُن کی قدر و قیمت کا انحصار ہوتا ہے۔ مورخ کی پسند، فیصلے اور دلچسپی

پر۔ جیسا کہ ای۔ ایچ۔ کار نے کہا ہے ”تاریخی واقعات کے ایک ایسے مرکزی نقطے پر یقین رکھنا جو مورخوں کی تشریحات سے آزاد ایک معروض وجود رکھتا ہو بڑی خام خیالی ہے“ چارلس اے۔ بیرڈ کی بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ”تاریخ جیسی کہ وہ حقیقت میں تھی اور تاریخ کے مخصوص واقعات سے جس کی حیثیت جداگانہ تھی اُس کو نہ ہم جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں چاہے کتنے ہی جوش و خروش کے ساتھ معروضی حقیقت کی کوشش کے تصور پر عمل کیا جائے“

میں اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ تاریخ نویسی میں قطعیت نہیں ہوا کرتی ہے اور نیو کیبرج ماڈرن ہسٹری کے مدیر اعلیٰ سر جارج کلارک کی طرح میں بھی توقع کرتا ہوں کہ میری کتاب میں بار بار ترمیم کی جائے گی۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ ان جلدوں میں نے دل کو گرمانے والے اُن واقعات کو صحت اور یکسانیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے جو انسانی ارتقا کی تاریخ کے ایک دلچسپ اور سبق آموز باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مجھے اپنے کام میں دوستوں اور ساتھیوں سے بیش قیمت امداد ملی۔ میں ڈاکٹر کے۔ کے۔ دتا، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر نبھار رنجن رے، ڈاکٹر بشپور پرشاد اور پروفیسر کے۔ اے۔ نیگلٹ ساشری کا انتہائی ممنون ہوں جنہوں نے مخطوطے کو پڑھا اور اُس کو بہتر بنانے کے لئے مفید مشورے دئے۔ اُنھوں نے بغیر کسی پس و پیش کے میری جود دہی کے میں شکریے کے ساتھ اُس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔

میرے ساتھی ڈاکٹر وی۔ جی۔ دگلے ڈاکٹر آر۔ کے۔ پارمو اور ڈاکٹر بی۔ ایم۔ بھائی نے اس کام میں اپنی بہترین قوت عمل اور صلاحیت صرف کی۔ معاشی حالات کے متعلق ترتیب دئے جانے والے ابواب میں ڈاکٹر بھائی کا بڑا حصہ ہے۔ ڈاکٹر دگلے اور ڈاکٹر پارمو کا حصہ بھی اسی قدر بیش قیمت ہے جنہوں نے جلد کے بقیہ حصے کے لئے نہ صرف بڑا ممولہ فراہم کیا بلکہ حوالہ جات کی تصدیق کی، واقعات کی تفتیش کی اور مخطوطے پر نظر ثانی کی۔ ڈاکٹر دگلے نے اشاریہ بھی تیار کیا۔ اُن کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

نیٹلس لائبریری کلکتہ کے لائبریریئن شری وائی۔ ایم۔ مولے اور نیٹلس آرکائیو آف انڈیا، نئی دہلی، کے ڈائریکٹر اور ڈپٹی ڈائریکٹر بالترتیب شری کے۔ ڈی۔ بھارگو اور شری ایس۔ رائے اور اُن کے ماتحتوں کے نام اُن لوگوں کی فہرست میں شامل نہ کرنا درست نہیں ہو گا جن کے تعاون کے لئے مصنف ممنون ہے۔

میرے پرنٹل سکریٹری شری بی۔ آر۔ ایمانی پرناپ شدہ اسکرپٹ تیار کرنے کی انتہائی محنت طلب ذمہ داری تھی۔

ان سب کام میں ممنون ہوں۔ لیکن تاریخ میں جو کچھ درج کیا گیا ہے اُس کی ذمہ داری اُن میں سے کسی پر نہیں ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جیسے کہا گیا ہے اُس کے لئے تمنا میں جوابدہ ہوں۔

تارا چند

نئی دہلی

2، مئی 1967ء

پہلا باب

مزاہمتیں اور شور شین

پلائی کی فتح کے ساتھ ہندوستان میں برطانوی فتوحات کا دھار ابھرنے لگا۔ 1764ء میں دہلی کے شہنشاہ کو بکسر کی جنگ میں شکست ہوئی اور 1765ء میں اُس نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو عطا کر کے انقال اختیارات کو قانونی شکل دیدی۔ 1772ء میں دارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کے راست اختیارات سنبھال لیے اور برطانوی حکومت کے نظام کی بنیاد اُٹنی شروع کی۔ اُس وقت ہندوستان میں کئی ذیلی ڈھالی تنظیموں والی سیاسی طاقتیں اور بہت سی نیم خود مختار فیوڈل ریاستیں موجود تھیں۔ اُن میں سے زیادہ تر مغل شہنشاہ کی حکم فرمائی تسلیم کرتی تھیں جس کے اختیارات تیزی کے ساتھ ختم ہوتے جا رہے تھے۔

یہ ریاستیں اور جاگیریں خود کشی کے راستے پر چل رہی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف دائمی جنگوں میں مبتلا تھیں۔ ریاستیں مقابلہ بڑی تھیں۔ اُن میں سے کچھ مثلاً مرہٹہ سلطنت ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن اُن میں سے کسی کو سیاسی استحکام یا مالیاتی قدرت نصیب نہیں تھی۔ وہ داخلی جھگڑوں، جماعتی منافقوں اور ذاتی رقابتوں کی شکار تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ کمپنی کی مدد کرنے میں ایک دوسرے پر بہت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میلکم نے کہا ہے ”ان سرداروں نے تنگ نظری کی پالیسی کی بناء پر نفرت اور جاہ طلبی کے فوری مقاصد کو حاصل کرنے کی خاطر دائمی آزادی کو قربان کر دیا (1) دیکھنے میں وہ عالی شان عمارتیں معلوم ہوتی تھیں اور اُن کے مالک بڑے بڑے دعوے کرتے تھے لیکن اُن کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور انھیں آسانی سے ڈھایا جاسکا۔ وہ صرف اُس وقت تک برقرار رہ سکیں جب تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں سے اُن کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ جنگ کی صورت میں وہ جلد ختم ہو گئیں۔ ہر مہم نے اُن کی فوجی کمزوری کو ظاہر کیا اور قریب قریب ہر جنگ میں انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ اس طرح میسور، حیدر آباد اور اودھ کی بڑی بڑی ریاستیں اور مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے علاقے انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ لیکن ان فتوحات سے اُن کی وسعت کچھ سہی، نہ تو پورے ملک پر حاوی کوئی سلطنت قائم کی اور نہ لوگوں کو امن سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ ریاستوں کے حکمرانوں کے مغلوب ہونے کے معنی یہ نہیں تھے کہ صدسری فیوڈل اثرانہ ختم ہو گئی جو اختیارات سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ اور بدیسی حکمرانوں کے نئے قسم کے ظلم و نسل سے نفرت کرتی تھی۔ دیسی حکومتوں کی کمزوری نے برطانوی فاتحین کے کام کو ایک تھکا دینے والی طویل جدوجہد میں تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے کمپنی کو بہت زیادہ مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ہوتا یہ تھا کہ ہر فتح اور نئے انتظامی ڈھانچے کے قیام کے بعد برے قسم کے سیاسی رد عمل رونما ہوئے تھے۔ اُن سرداروں اور زمینداروں سے، جن کی وفاداری خود ہندوستانی بالادستوں کی طرف مذہب تھی، اس امر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ آسانی سے بدیسی حکمرانوں کی اطاعت قبول کر لیں گے خصوصیت کے ساتھ اُس صورت میں جب وہ کسانوں پر اُن کے

اختیارات کی گرفت کو ڈھیلا کرنا چاہتے تھے، اُن پر ناقابل برداشت مالی بار ڈال رہے تھے اور انہیں ایک بدلتی عدالتی نظام کے تابع لانا چاہتے تھے جس نے ”نچلے طبقوں کو بالادستوں سے آڑلو کر کے سماج میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔“ (1) چنانچہ پلاسی کے بعد کی صدی کے دوران، جس میں 1857ء کی عظیم بغاوت پھوٹ پڑی تھی، ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی توسیع نے شورشوں اور ہنگاموں کے ایک سلسلے کو جنم دیا۔ الحاق کے بعد ہر علاقے میں مزاحمت اور بغاوت شروع ہو گئی۔ جس میں زمیندار اور کسان شامل ہو گئے۔

اور زمینداروں کی ملازمت سے سبکدوش ہو جانے والے سپاہیوں، مذہبی رہنماؤں اور محروم ہونے والے متعلقین نے حصہ لیا۔ لیکن یہ ہنگامے صرف اُن علاقوں تک محدود نہیں تھے جن کا الحاق کیا گیا تھا۔ اُن کے ساتھ کئے جانے والے برتاؤ کے خلاف احتجاج کے طور پر وقتاً فوقتاً کمپنی کی فوجوں کے سپاہیوں میں بھی بغاوت پھوٹ پڑتی تھی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک طرف تو ہندوستان میں اقتدار کے نئے نظام کی توسیع ہو رہی تھی اور سماج میں ایک نیا طبقہ ابھر رہا تھا اور دوسری طرف پرانے نظام کے مختلف شعبے اپنے کو فنا ہونے سے بچانے کی جرات مندانہ لیکن بے سود کوششیں کر رہے تھے۔

II بنگال اور مشرقی ہندوستان کے ہنگامے

میر قاسم کی بغاوت

برطانوی اقتدار کی تاریخ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبوں کو حاصل کرنے سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ فطری امر تھا کہ جذبہ مزاحمت کا اظہار بھی سب سے پہلے اس علاقے میں ہو۔ پہلا چیلنج میر قاسم کی طرف سے آیا جسے 1760ء میں میر جعفر کی معزولی کے بعد بنگال کے نواب ناظم کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ دارن ہسٹنگز کے مطابق اس عہدہ کے لئے اُس کی اہلیت کی بنیاد تھی ”بڑی اور جنگ سے دور بھاگنے کی خواہش“۔

لیکن میر قاسم نے اپنے متعلق دارن ہسٹنگز کی رائے کو غلط ثابت کر دیا۔ اُس نے غیر متوقع حد تک آزادی کے جذبے اور اپنی رعایا کی خوش حالی کے لئے گہرے احساس کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے بغیر جنگی اداکے داخلی تجارت کرنے کے انگریز تاجروں کے غیر قانونی اور نامعقول مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کو اگر تسلیم کر لیا جاتا تو ہندوستانی زمیندار اور تاجر بہت حسارے میں رہتے اور ملک برباد ہو جاتا۔ کلکتہ کی کونسل نے اُسے جان پر کھیل جانے پر مجبور کر دیا۔ اُس کے بعد جو جدوجہد ہوئی اُس میں میر قاسم نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور شہنشاہ عالم کی حمایت حاصل کر لی، اور دشمن کے خلاف ایک متحدہ محاذ بن کیا۔ لیکن اتحادی فوجیں کمپنی کی تربیت یافتہ فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ بکسر کے مقام پر انھیں ذلت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا (1764ء) اور میر قاسم کو 1777ء میں اپنی موت تک ایک آوارہ گرد کی زندگی گزارنی پڑی۔

لیکن نواب کی طاقت ختم ہو جانے کے معنی یہ نہیں تھے کہ مخالفت بھی ختم ہو گئی۔ بنگال کے تمام ضلعوں میں، گنگا کے جنوب میں واقع بہار کے ضلعوں میں اور چھوٹا ناگپور کے ضلعوں میں الا بغاوتیں اور ہنگامے ہوتے رہے۔ ان ہنگاموں کی اصل وجہ تھی روایتی سیاسی نظام کی شکست و ریخت اور مالگوار کی کے تعلق سے کمپنی کی سخت گیر پالیسی۔ اس کے علاوہ ملک کے قدیم رواجوں میں مداخلت اور انگریزوں کے قائم کردہ انجینی عدالتی نظام نے بھی عام بے چینی میں بڑا اضافہ کر دیا تھا۔

مغربی بنگال میں میر بھوم اور بسو پور کے راجوں کی سخت گیری، قحط اور مالگوار کی میں اضافے نے مل کر وسیع پیمانے پر بے چینی پھیلا دی تھی۔ سرکش عناصر نے حالات سے فائدہ اٹھا کر 1789ء میں ڈکیتی اور رہزنی کی وارداتیں شروع کر دیں جن کی وجہ سے حکومت معطل ہو کر رہ گئی۔ بالاخر امن بحال کر دیا گیا لیکن ان ہنگاموں کے اثرات جرمیت تک محسوس کئے جاتے رہے۔

پہاڑی قبیلوں کی بغاوتیں

پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل وسیع علاقے میں، جہاں پہاڑی لوگ اور آدی واسی قبائل آباد تھے، بہت سے بھونے بھونے رہا تھے جن میں سے کچھ خود کوراجپوتوں کی اولاد بتاتے تھے اور کچھ اپنا سلسلہ نسب قدیم زمانے سے ملاتے تھے یعنی بنگال میں ترکوں کی آمد سے پہلے کے دور سے۔ یہاں بنگال کے سخت ضابطوں پر جی

انتظامی نظام قائم کرنا دشوار امر تھا۔ اس کی کوشش کا نتیجہ ہوا اناراضی اور عدم دلی۔

چور بغاوتیں

جن علاقوں میں آدی واسی قبائل آباد تھے وہاں قریب قریب مسلسل بد نظمی پھیلی رہی۔ مغربی مدناپور سے جنوبی بہار، چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ تک جنگل محل کے چوروں، سنگھ بھوم کے ہوؤں، چھوٹا ناگپور کے کولوں اور منڈوں، من بھوم کے بھوئیچ اور راج محل کی پہاڑیوں کے سنسکالوں میں بار بار بغاوتیں بھوٹ پڑیں۔ اڑیسہ میں کھنڈوں اور آسام میں کھاسیوں نے بڑی بڑی شور شیں شروع کیں۔

قطعا، جنگلی جانوروں کی تاراجی، شخصوں میں اضافہ اور مالگواروں کی وصول کرنے میں سختی نے معاشی دکھوں اور سہمی بے چینی کو جنم دیا۔ ہر طرف شدہ سپاہیوں، تلوہ حال کسانوں اور بے روزگار دست کاروں نے لیڈروں کے چلتے پھرتے کر وہ بتائے جو گاؤں میں سے گزرتے تھے، انھیں لوٹتے تھے اور لوگوں کو خوفزدہ کر دیتے تھے۔ اس کے نتیجے میں تصادم ناکرہ تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے ہنگامے ہوئے۔

چور یا بھوئیچ جنگل کے مدناپور ضلع میں آباد تھے جس میں اُس وقت مان بھوم اور بڑا بھوم کے محل شامل تھے۔ مدناپور، کے ضلع پر 1760ء میں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور محلوں پر 1765ء میں، لیکن زمیندار سرکش تھے۔ دھل بھوم کے راجہ جگن ناتھ نے حمایت کی قیادت کی (1768ء) اور سب کچھ جلا کر خاک کر دیا۔ اُس نے اپنے جھنڈے کے نیچے چوروں کو جمع کر لیا۔ لیکھ پال، دھولا کا اور بڑا بھوم کے راجہ بغاوت میں شامل ہو گئے اور نواب شیخ اور جھریا کے زمینداروں نے مالگواروں کی ادائیگی نہیں کی۔ یہ بد نظمی تقریباً تیس سال تک جاری رہی اور اُس کے بعد از خود فرو ہو گئی۔

لیکن 1832ء میں گنگارام کی قیادت میں قبائل کی ایک نئی بغاوت شروع ہوئی۔ اُس نے بڑا بازار میں سرکاری دفاتر پر حملہ کیا اور بڑا بھوم پر قبضہ کر لیا۔ اُس کے بعد سنگھ بھوم کے ہوؤں کو اپنے گرد جمع کر کے اُس نے ایسی تازک صورت پیدا کر دی کہ اُس کے خلاف فوجی کارروائی کی ضرورت پڑی۔ جنگ میں لیڈروں کی موت سے باغیوں کی ہمت نہیں ٹوٹی اور وہ اُس وقت تک حمایت کرتے رہے جب تک سرکاری فوجوں نے کوہن پر قبضہ نہیں کیا۔

چھوٹا ناگپور اور سنگھ بھوم کے ہوؤں کو بھی پراٹھا حساب چکانا تھا۔ 1773ء میں پوراٹھا، کھراسوان اور سرائے قلعہ کے راجوں کو پناہ کزین باغیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے پر مجبور کیا گیا تھا۔ لیکن 1820ء میں پوراٹھا کے راجہ نے کھراسوان اور سرائے قلعہ کو ذلیل کرنے اور آزادی پسند ہو قبائلیوں کو اطاعت پر مجبور کرنے کی خاطر برطانیہ کے باج کراہ کی حیثیت قبول کر لی تھی۔ اُس نے انگریزوں سے مدد مانگی اور برطانوی فوجیں کوہن میں داخل ہو گئیں اور چائے باساک طرف پیش قدمی کرنے لگیں۔ لیکن ہوؤں نے بڑا سخت مقابلہ کیا اور دو سال تک (1820-22ء) وہ دھل دھوم کو اور باجن گھائی کو تاخت و تاراج کرتے رہے اور چھوٹا ناگپور میں داخل ہو گئے۔ اور اُس وقت تک لڑتے رہے۔ جب تک 1827ء میں انھیں اطاعت پر مجبور نہیں کر دیا گیا۔ لیکن اُس وقت بھی پوری طرح امن بحال نہیں کیا جاسکا۔ 1831ء میں چھوٹا ناگپور سنگھ بھوم، مان بھوم اور قبائلی علاقوں میں شور شیں ہوئیں جہاں چھوٹا ناگپور کے منڈوں نے بغاوت کی اور ہوؤں سے جاملے۔

کول بغاوتیں

کولوں کی بغاوت (1831، 32ء) کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے گاؤں کول قبائل سرداروں (منڈوں) سے بھین کر بدھئی سکھ اور مسلمان کسانوں کو منتقل کئے جا رہے تھے۔ یہ شورشیں راہچی میں شروع ہوئی اور سنگھ بھوم، ہزاری باغ، پلام اور مان بھوم کے مغربی حصوں تک پھیل گئیں۔ اس پر قابو پانے کے لئے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی کرنی پڑی۔

سنہتال کی بغاوتیں

سنہتال کی ہزاری باغ اور مان بھوم سے ترک وطن کر کے راج محل کی پہاڑیوں کے علاقے میں آباد ہو گئے تھے اور 1836ء تک انہوں نے دامن کوہ میں چار سو سے زائد گاؤں پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ سیدھے سادھے لوگ تھے۔ لگان کے بڑے بڑے مطالبوں نے انہیں مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور کر دیا اور وہ آسانی سے اُن کی چال بازیوں کا شکار ہو گئے۔ حکام مال بھی اُن کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے تھے۔ ریلوے کے حکام، جو اُن سے کام کر داتے تھے، اُن کی اجرت نہیں دیتے تھے اور اس سے بھی زیادہ بری بات یہ تھی کہ وہ اُن کی عورتوں کی بے عزتی کرتے تھے۔ ان باتوں کی وجہ سے اُن میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس آگ پر تیل کا کام کیا ایک جو شیلے مذہبی انسان نے جو خود کو صاحب کشف ظاہر کہتا تھا اور کہتا تھا کہ حکام میں جھوٹ اور بددیانتی کا رواج ہونے کی وجہ سے، مہاجنوں کے خون چوسنے کی وجہ سے اور پولیس کی زیادتیوں کی وجہ سے یہ ملک صاحبوں سے بھین لیا جائے گا۔ شکایتیں بڑھتی چلی گئیں اور 1855ء میں سنہتالوں نے بغاوت کر دی۔ لیکن بندو قوں کا مقابلہ تیرکان سے نہیں کیا جاسکتا تھا اور انہیں اطاعت تسلیم کرنی پڑی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ اُن کے لئے ایک خصوصی انتظامی نظام کی ضرورت ہے اور سنہتال پر گنہ کا ایک علیحدہ ضلع بنادیا گیا۔

اڑیسہ کے زمینداروں کی بغاوت

کمپنی نے 1803ء میں اڑیسہ کی حکومت لیا۔ زمیندار اس سے مطمئن نہیں تھے۔ کھر دا کے راجہ نے، جو ایک بڑا زمیندار تھا، 1804ء میں بغاوت کر دی لیکن اُسے اطاعت پر مجبور کر دیا گیا۔ اُس کے بعد زمین رکھنے والی نیم فوجی تنظیم پانک نے مال ہزاری، صول کٹندہ اور پولیس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اُن کے قائد جکبند ہونے بان پور پر حملہ کیا، کاری خزانہ لوٹ لیا اور کھر دا کی عمارتوں کو آگ لگا دی۔ سرکاری حکام بھاگ گئے اور پچھ دن کے سپہ سالاروں نے اقتدار کے تمام نشانات مٹ گئے۔ 1817ء کے اختتام تک انگریزوں نے پھر کھر دا پر دوبارہ قبضہ کر لیا لیکن وہ پوری مخالفت پر ڈٹا ہوا تھا۔ لیکن بالآخر امن بحال کر دیا گیا۔ مارشل لانا نافذ کیا گیا اور بغاوت کو چل دیا گیا۔ بہت دن تک چچھا کرنے والی فوج سے بچنے کے بعد بالآخر 1825ء میں جکبند ہونے خود کو حکومت کے نوا لے کر دیا۔ لیکن چونکہ وہ بہت بااثر تھا اس لیے اُس کی

میٹن مقرر کر دی گئی اور کلک میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دیدی گئی (1)

کھونڈ بغاوتیں

کھونڈ اُس پہاڑی علاقے میں آباد تھے جو کھونڈلی کہلاتا تھا اور انگل کے جنوب مغرب میں واقع تھا۔ یہ علاقہ پایود کی پانچ گزار ریاست اور پنجم کے ضلع سے گمراہوا تھا۔ 1815ء میں حکومت مدراس نے گم سور کے راجہ دھن بے بھیر کی کو گرفتار کر لیا اور کمر داکی جاگیر ضبط کر لی اُس کے بعد 1835ء میں اُس نے راجہ سے اختیارات چھین لئے جو پہاڑیوں کی طرف بھاگ گیا اور کھونڈوں سے لہذا کا طلب گار ہوا۔ 1836ء میں ڈورائیس کی قیادت میں کھونڈوں نے بغاوت کر دی لیکن برطانوی فوجوں نے، جنہیں کلک پہنچ چکی تھی، مزاحمت کو کچل دیا۔ 1836ء میں کھونڈوں نے ایک دفعہ پھر علم بغاوت بلند کیا اور اُن کے قائد چکراہیسی نے ملک میں فتنہ و فساد برپا کر دیا۔ پایود کھونڈوں سے بغاوت گم سور کے نشیبی علاقے میں پھیل گئی۔ انگل کے راجہ اور دوسرے سرداروں کو، جو باغیوں سے ہمدردی رکھتے تھے، اس بات پر مجبور کیا گیا کہ بنی کو اپنی جاگیروں سے نکال دیں۔ لیکن حکومت مشکوک تھی اور اُس نے انگل کے راجہ کو مددگی سے آزاد دیا اور جاگیر ضبط کر لی۔ اس کے بعد چکراہیسی پہاڑوں کی طرف چلا گیا اور چھ سال تک خاموش رہا۔ لیکن 1854ء میں اُس نے پھر حکومت کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ اُسے کھونڈوں کی حفاظت سے محروم کرنے کے لئے پایود کے راجہ کو مخدول اور چکراہیسی کو کھونڈوں سے بھڑکانے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ فرار ہو گیا، اور اُدھر گھومتا پھرا اور بالآخر لاپتہ ہو گیا۔

کئی سال کی جنگ کے بعد بغاوت فرو کر دی گئی۔ 1855ء میں ایک دفعہ پھر بغاوت پھوٹ پڑی۔ وہ اُس وقت ختم ہوئی جب کھونڈوں کو مدراس کے حلقہ اختیار سے نکال کر کلک کے حلقہ اختیار کو منتقل کر دیا گیا۔ راجہ کو گرفتار کر کے ایک قیدی کی طرح ہزاری باغ بھیج دیا گیا۔

آسام کی بغاوتیں

بنگال کی شمالی مشرقی سرحد پر آہوم کی قدیم سلطنت تھی۔ 1824ء میں برما کی پہلی جنگ شروع ہونے پر برمیوں کو نکلنے کے لئے ایک برطانوی فوجی دستہ اُن کے علاقے میں سے گزرا۔ قدیم آہوم دربار کے شہزادوں اور امیروں کو بتایا گیا تھا کہ برما کی جنگ ختم ہونے کے بعد انگریزوں سے چلے جائیں گے اور برطانیہ کے زیر تحفظ اُن کی حکومت بحال کر دی جائے گی بشرطیکہ وہ خراج ادا کریں لیکن وعدے پورے نہیں کئے گئے۔ اس کے برعکس مال گزاری وصول کرنے اور حکومت کا بندوبست سنبھالنے کے انتظامات کئے جانے لگے اور آسامی دربار کے حقوق و اختیارات چھین لئے گئے۔ اس کی وجہ سے آہوم امیروں میں بددلی پھیل گئی۔

1828ء میں آسامیوں نے آہوم شاہی خاندان کے مگدھر کنور کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور آہوم امیروں کے ساتھ مل کر انگ پور کی طرف بڑھنے کی تجویز کی۔ اس مہم کے قاعدوں میں آہوم حکومت کا ایک سابق وزیر دھمن بے بارگوئین اور ریاست کے دوسرے سابق حکام شامل تھے۔ یہ کوشش قبل از وقت ثابت ہوئی اور اکتوبر 1828ء میں اُس پر قابو پایا گیا۔ مگدھر نے خود حکومت کے حوالے کر دیا اور اُس کو سات سال قید کی سزا دی گئی۔

1830ء میں ایک اور بغاوت کا منصوبہ بنایا گیا۔ کھمبھیوں، سنگھ پھنوں، موہاریوں، من پوریوں، ناگوں، کھاسیوں اور گاروؤں کے سرحدی قبیلوں کے سرداروں کے نام خط بھیجے گئے اور انھیں دشمن کے خلاف مشترکہ اقدام کی دعوت دی گئی۔ روپ چند کوٹار کو راجہ بنایا گیا۔ پیالی بار پھوکن، جیورام دھولیہ باردا اور امیر گھرانوں کے دوسرے فوجدار اکین نے مل کر ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ رنگ پور کی طرف بڑھنا شروع کیا لیکن انگریزوں کو اُن کے منصوبے کا پہلے سے علم تھا۔ وہ سب گرفتار کر لئے گئے اور غداروں کے جرم کی سزا کے مستوجب قرار پائے۔ پیالی بار پھوکن اور جیورام کو سزائے موت دی گئی اور بقیہ کو چودہ سال کے لئے ملک بدر کر دیا گیا۔ اُن کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ 1833ء میں طحانی ماقات کے طور پر بالائی برہمہر مہاراجہ پورندر سنگھ نرندر کے سپرد کر دیا گیا اور سلطنت کا ایک حصہ آسام کے راجہ کو دیدیا گیا۔

کھاسی بغاوتیں

مغربی کھاسی پہاڑیوں میں ایک ریاست پر تیرت سنگھ حکومت کرتا تھا جو اُس زمانے میں لہیماکھات، سکھراکھائی تھی اور آج لونگ کھلاڈ ریاست کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ایک اچھا اور قابل اعتماد حکمران تھا۔ انگریز، جن کا کھاسی پہاڑیوں کے ایک طرف کام روپ پر قبضہ تھا اور دوسری طرف سلہٹ پر، آسام کو سلہٹ سے جوڑنے کے لیے ایک سڑک بنانا چاہتے تھے جس کے ذریعے فوجیں برما بھیجی جاسکیں۔ برطانوی نمائندے ڈیوڈ اسکاٹ نے تیرت سنگھ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسے لونگ کھلاڈ میں رہنے اور سڑک بنانے کی اجازت دیدی جائے۔ سڑک بنانے کے بہانے بہت سے فوجی اور شاگرد پیشہ سلطنت میں داخل ہو گئے۔ کھاسی اس سے خائف ہو گئے۔

ان افواہوں نے اُن کے شکوک کو تقویت پہنچائی کہ انگریز حاصل لگانا چاہتے ہیں۔ 1829ء میں تیرت سنگھ نے اپنے ساتھیوں کے ایک گروہ کے ساتھ لونگ کھلاڈ میں انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ دوسرے سردار بھی اس میں شریک ہو گئے اور گور پلا جنگ شروع ہو گئی۔

کھاسیوں نے گاروؤں، کھمبھیوں اور سنگھ پھوڈوں کی مدد سے شمال مشرقی سرحد کے لئے خطرہ پیدا کر دیا۔ اپنے بھادر راجہ کی زیر قیادت قبائلی جنگ جو اتنی بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں کو بھی اُن کی تعریف کرنا پڑی اُس کے بعد انگریزوں نے تیرت سنگھ کو ملانے کی کوشش کی لیکن اُس نے اُس وقت تک گفتگو کرنے سے انکار کر دیا جب تک اُس کا علاقہ بغیر کسی شرط کے واپس نہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ تاہم بری کی لڑائی زیادہ مدت تک جاری نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ اور شیر دل سپاہی تیرت سنگھ کو مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے اور اُسے ریاست بدر کر کے ڈھاکہ بھیج دیا گیا۔ اُس کو پیش کش کی گئی کہ اُس کی حیثیت بحال کی جاسکتی ہے

بشرطیکہ وہ برطانوی حکومت کی اطاعت قبول کرے اور اُس کے احکامات کی تعمیل کرے۔ اُس کا جواب تھا ”ایک غلام بادشاہ کی زندگی سے ایک آزاد عام آدمی کی موت بہتر“۔ جلاوطنی کے دوران 1844ء میں اُس کا انتقال ہوا۔ اُس کے بعد ملک میں عام طور سے امن و امان رہا۔

III نیپال کی ریشہ دو انیاں

ہندوستان کے مختلف حصوں میں انگریزوں کے خلاف جو سازشیں کی جاتی تھیں اُن کی بہت افزائی پڑوسی ملک اور خاص طور سے نیپال کرتا تھا۔ گورکھا حکمرانوں کے زیر نگیں جب سے نیپال متحد ہوا تھا۔ انگریز اُس کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ 1814ء تک گورکھوں نے اپنی سلطنت کی توسیع شمالی ہندوستان میں برطانوی علاقے کی سرحد تک کر لی تھی۔ اُسکے بعد ایک جنگ ہوئی جس میں نیپالی فوج کو شکست ہوئی اور معاہدہ گنگولی پر دستخط کئے گئے (28 نومبر 1816ء)۔

یہ ذلت آمیز شکست گورکھوں کے ذہنوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی جس کی بنا پر انھیں برطانوی سفیر کو کٹھ منڈو آنے کی اجازت دینی پڑی تھی۔ ایک طرف تو انہوں نے اپنے ملک میں برطانوی سفیر سے کم سے کم تعلقات رکھے دوسری طرف وہ انگریزوں سے انتقام لینے کے منصوبے بنانے لگے۔ لیکن کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے دیسی حکمرانوں سے امداد لینا ضروری تھا۔ چنانچہ انہوں نے اُن حکمرانوں کے پاس اپنی بیچیم جس کے متعلق انھیں گمان تھا کہ انگریزوں سے غیر مطمئن ہیں۔

ہندوستان میں دیسی حکمرانوں کے خلاف بے اطمینانی کا جذبہ پلایا جاتا تھا اور اسلئے یہ فطری امر تھا کہ وہ نیپالیوں کی دوستانہ پیش کش کا خیر مقدم کریں۔ برطانوی حکومت کو جلد ان سازشوں کا پتہ چل گیا۔ حیدر آباد میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ نے مدد اس میں لی جانے والی شہادت کی بنیاد پر لکھا تھا میرے خیال میں اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ایک ایسا محاذ موجود ہے جس کا مقصد ہے اُن انیسویں سو کو پورا کرنا ہے جو کسی نہ کسی طرح سے ہمارے مفادات کے لئے مضر ہو سکتی ہیں۔ (1)

او کی ریاست کے لئے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے مخالفت کا رویہ اختیار کر لیا ہے، گورکھا مدد توں سے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے، جو دھپور کے راجہ نے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اُس جماعت نے جو اُس کی ریاست میں حکومت کر رہی ہے حکم عدولی کا راستہ اختیار کیا ہے، ستاراکار راجہ قریب قریب ہمارا کھلا دشمن ہے، کیونکہ اڑانتہائی بد باطن دوست ہے اور ہندوستان کے جنوب میں ایک طاقت ور جماعت حیدر آباد میں ہمارے خلاف سازش کر رہی ہے۔ (2)

اس میں کوئی تعجب نہیں کہ اُن حالات میں نیپال دربار نے انگریزوں کے خلاف عام بے چینی کے احساس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔ انھوں نے خطوط اور پیغامات کے ساتھ اپنی پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کو، ہنس راج کے ذریعے اودے پور کو، جس کے سامان کی غازی پور میں تلاشی

لی گئی اور سات خطاُس میں پائے گئے، جو دھپور میں آپا صاحب بھونسلے کو، شاہ پور کے مہاراجہ کو، جے پور کو، آسام کے راجوں کو جو نیپال اور برما کے ایجنسیوں سے خفیہ ملاقات کرنے اور انھیں ہلا دینے کے لئے کام کیا، کے مندر کو استہلال کرتے تھے، بندیل گھنڈ میں پنا کو اور برما اور آوا کے بادشاہوں کو بھیجے۔ انہوں نے ایک پیغامبر ہیرات بھی بھیجا جہاں ایرانی ایک مہم میں مصروف تھے۔ نامس نے 14، فروری 1829ء کو بنارس سے لکھا تھا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیپال دربار پہلے کے مقابلے میں زیادہ سازشیں کر رہا ہے۔ گوسائیں، چنڈ اور پرکھڑے سب کے کام مقرر ہیں۔ اور نیپال کے باشندے مسلسل میدانوں کی طرف آرہے ہیں۔ چھپلے مینے یاترا، تجلوت یا ملازمت کے بہانے تقریباً 500 ہٹاس آئے اور میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ تعداد میں پڑنے گئے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے کسی برس میں اتنے زیادہ نیپالی نہیں آئے تھے۔“ (1)

منصوبوں کے کوئی نتیجہ نہیں نکلے۔ جو اُس وقت تک بنائے جاتے رہے۔ جب تک طاقت راتا، فک بہادر کے ہاتھ میں نہیں آگئی۔ کاٹھ منڈو میں مقیم برطانوی ریڈنٹ اور ہندوستان میں حکام اُن سے پوری طرح باخبر تھے۔ خفیہ پولیس نے حکومت کو یقین دلادیا تھا کہ جب تک دیسی حکمران اور عام ہندو اور مسلمان مل کر کوئی اقدام نہیں کرتے ہیں ہندوستان میں برطانوی حکومت کو کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا ہے۔

IV مسلمانوں کی تحریکات

یہ امر قدرتی ہے کہ بنگال کے مسلمانوں میں انگریزوں کی طرف سخت بے اطمینانی اور نفرت کے جذبات پائے جاتے تھے۔ اُن کے بالائی طبقہ نظامت کی معزولی، انگریزی انداز کے انتظام اور مسلمان حاکموں کی جگہ انگریز حاکموں کے تقرر سے متاثر ہوئے تھے۔ بڑی بڑی زمینداروں کی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کی وجہ سے بھی اُن پر مضراثر پڑا تھا۔ مسلم درمیانی طبقے کو نواب کی فوجوں کی برطرفی، دیہی پولیس کی منسوخی، جس کی وجہ سے اُن کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ختم ہو گیا اور اُن زمیندار پر از سر نو سرکاری قبضے کی بنا پر نقصان پہنچا جو علما کو مدد معاش کے طور پر دی گئی تھیں پارچہ بانی کی صنعت کی بربادی، انگریزوں اور اُن کے ہندو گماشتوں کے مظالم اور نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں کی بنا پر مسلم نچلے طبقے بے روزگار ہو گئے تھے۔

بدیہیوں کے غیر اسلامی طور طریق اور عیسائی مشربوں اور ضرورت سے زیادہ پر جوش سرکاری کام کی سرگرمیوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بری طرح مجروح کر ڈالا تھا۔ چنانچہ سیاسی، معاشی اور مذہبی عناصر مسلمانوں میں بے چینی پھیلاتے رہے۔ اس بے چینی نے کئی صورتیں اختیار کیں۔ انگریز حکمرانوں کے لئے تکلیف کا کسی قدر غیر معمولی ذریعہ تھا مسلمان فقیروں کی تحریک۔ فقیروں کے اس گردہ کا قائد تھا مجنوں شاہ جس نے 77-1776ء میں بنگال کے مختلف حصوں میں

بد تعلقی پھیلا دی۔ اُن کا صدر مقام تھانیپال کی ترائی بالخصوص کاٹھ منڈو کے جنوب میں واقع مکوان پور میں۔ بنگال میں اُن کی سرگرمیوں کے خاص خاص مرکز تھے بوگرا ضلع کے مارنجن اور مہاستھان جہاں ایک قلعہ تعمیر کر لیا گیا تھا۔ اُن کی فکٹریاں اُس علاقے میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی رہتی تھیں، زمینداروں اور کسانوں سے چندہ وصول کرتی تھیں اور حکومت کی حکم عدولی کرتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ انھیں پناہ دیتے تھے اور اُن کے کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے۔ 1787ء میں مجنوں شاہ کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا چراغ علی شاہ اور اُس کے پیر 90-1788ء میں بنگال کے شمالی اضلاع سے گزرے۔ انہوں نے دوسرے مجاہدین آزادی مثلاً بھوانی پٹھک اور ایک خاتون لیڈر دیوی چودھوری کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ انہوں نے انگریزوں کی کوششوں پر حملے کئے اور مال دزر کے علاوہ ہتھیاروں اور گولی بارود پر بھی قبضہ کر لیا۔ جلد ہی اُن کی طاقت بڑھ گئی اور تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ پٹھان، راجپوت اور برطرف شدہ سپاہی اُن کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ 1793ء سے 1800ء تک وہ لڑتے رہے۔ کبھی کبھنی کی فوجوں سے اُن کی جھڑپیں ہوتی تھیں اور کبھی مال گزاری کی وصولی کو خطرہ لاحق ہو جاتا تھا، لیکن وہ ایک منتظم حکومت کا مقابلہ ہمیشہ تو نہیں کر سکتے تھے۔ جب انگریزوں نے نیپال کے مہاراجہ کے ساتھ معاہدہ کیا اور بنگال کے لکھم ونق کو سدھارنے کے لئے ضابطوں کا ایک سلسلہ نافذ کیا گیا تو رفتہ رفتہ اُن پر قابو پایا گیا۔ پھر بھی کئی سال تک اُن کا اثر برقرار رہا اور 1800ء میں لارڈ منٹو کو اعتراف کرنا پڑا ”واقعہ یہ ہے کہ اُس گروہ کے سرداروں اور پکستان کی عزت کی جاتی تھی اور انہیں حاکم تک کہا جاتا تھا۔ حکومت کے پاس اتنے اختیارات تھے نہ اثر کہ وہ اپنے تحفظ کو خاطر لوگوں سے تھوڑی سی بھی مدد حاصل کر سکے۔“ (1)

پاگل چنتی فرتے کے قادیان نے بھی اسی انداز سے حکومت کی مخالفت کی۔ اُس کے باپ کرم شاہ نے تقریباً 1775ء میں سوسنگ پرگنہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور سچائی، مساوات اور بھائی چارے کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اُس کے پیروں میں ہندو اور مسلمان، گارو اور ہاجو یک سبھی شامل تھے۔

1813ء میں کرم شاہ کے انتقال کے بعد اُس کے بیٹے چوپے نے ایک مسلح گروہ اکٹھا کر لیا اور کسانوں کو زمینداروں کے خلاف اکسانے لگا۔ 1825ء میں اُس نے شیرپور کے زمینداروں اور گارو جاریا کے قلعے پر حملہ کیا۔ جو اُس کا صدر مقام تھا۔ اُس نے دربار آراستہ کیا، اور انتظام چلانے کے لئے ایک مجسٹریٹ اور ایک کلرک کا تقرر کیا۔ کچھ برسوں تک اُس نے آزاد حکومت چلائی لیکن 1831ء میں انہوں سے اور 1833ء میں پہاڑی علاقے سے چوپے کے پیروں کو نکال دیا گیا۔ 1852ء میں چند میں اُس کا انتقال ہوا۔ انگریزوں کے خلاف ایک اور تحریک، جس میں مذہبی جذبہ غالب فصر تھا، وہ تھی جسٹی قیادت فرامشی کر رہے تھے۔ اس فرقے کی بنیاد مشرقی بنگال میں واقع فرید کے حامی شریعت اللہ نے ڈالی تھی (1781ء لغایت 1840ء) جو مذہبی طریقوں میں ایک بڑی اصلاح لے کر دیگرام کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ اسلام کو بعد کے الحاقات و اضافات سے پاک کرنا چاہتا تھا، اور دور رس سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کی وکالت کرتا تھا۔ وہ زمینداروں کے ہاتھوں کسانوں کے استحصال کا مخالف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں کو نکال کر بنگال میں مسلم حکومت بحال کر دی جائے۔ اُس نے بیٹے محمد حسن نے، جو عام طور سے دادو میاں کے نام سے پکارا جاتا تھا

محاصل ادا کرنے کے خلاف ایک جدوجہد کی قیادت کی اُس نے تجربہ کار اور فہم کسانوں کے تحت گاؤں میں عدالتیں قائم کیں تاکہ وہ جھڑپے بنائیں اور زمینداروں کی بالجبر وصولی میں کسانوں کی مزاحمت میں معاون ثابت ہوں۔ 1838ء سے 1857ء تک اُس کی سرگرمیاں وقفہ وقفہ سے جاری رہیں۔

فرائضی تحریک کو سید احمد شہید کے پیروؤں کے منظر عام پر آنے اور اُن کے ساتھ مل کر کام کرنے سے تقویت حاصل ہوئی۔ سید احمد شہید دہلی کے دبستان ولی اللہ کے شاگرد اور بنگال میں مجاہدین کے قائد تھے۔ وہ طریقہ محمدیہ قائم کرنا چاہتے تھے اسلامی عقاید کا وہ پاک و صاف نظام جس پر اسلامی تاریخ کے ابتدائی برسوں میں عمل کیا جاتا تھا۔ اُن کے شاگرد میر مصطفیٰ علی عرف تینو نظام، ولایت علی، اور عنایت علی بنگال میں کام کر رہے تھے۔ تینو نظام نے ظالم زمینداروں کے خلاف جدوجہد کی قیادت کی جو اخلاق سے زیادہ تر ہندو تھے۔ 1831ء میں ایک فوجی مہم کے ذریعے تینوں کو کچل دیا گیا۔ لیکن فرائضی اُس وقت تک زمینداروں کے خلاف لڑتے رہے جب تک 1859-60ء میں نیل کی شورش نہ پھوٹ پڑی۔ بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے 1857ء میں اطلاع دی تھی ”اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت بنگال کے تحت ایک ضلع ایسا نہیں ہے جو حقیقی خطرے سے محفوظ ہو یا جہاں بڑا خطرہ لاحق نہ ہو۔“

۷ سیاستوں کی بغاوت

لیکن ابتدائی بغاوتوں میں سب سے عجیب و غریب بغاوت تھی سیاستوں کی۔ وہ ہندوستان کے عظیم مذہبی فلسفی سری شکر اچاریہ (آٹھویں صدی) کے پیرو تھے۔ جنہوں نے مطلق وحدت الوجود کے عقیدے کی تشکیل کی تھی۔ شکر اچاریہ کے شاگرد دس حلقوں میں بنے ہوئے تھے اور باغی سیاستوں کا تعلق تھا گریہوں سے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ انہوں نے فوجی پیشہ کب اختیار کیا۔ لیکن اکبر کے دور حکومت میں ایک جنگجو حلقے کے طور پر پہلی مرتبہ اُن کا ذکر کیا گیا۔ فاروقیہ کے مطابق مدھو سودن سرسوتی نے سیاستوں کے حلقے میں مشنریوں کو شامل کرنا شروع کیا۔ مسلح ناگ اور گیری سیاستی اٹھارہویں صدی کی فوجوں میں مل کر لڑا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر مسلح گسائیوں کا ایک دستہ اودھ کے نواب کی فوج میں شامل تھا جب وہ مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی مدد کرنے کے لئے پانی پت گیا تھا۔ بکسر کی جنگ میں گوسائیں ہمت گیری کی قیادت میں پانچ ہزار سیاستوں نے انگریزوں کو بنگال سے نکالنے کے لئے میر قاسم کی طرف سے جنگ میں شرکت کی تھی۔ مرہٹ سردار ہلکھ اور سندھیا اور بے پور کے راجوں کی فوجوں میں سیاستی ملازم تھے۔

بنگال کے معاملات میں سیاستوں کی مداخلت وہاں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد شروع ہوئی۔ ممبئی کی حکومت کے ابتدائی برس لوگوں کے لئے سخت تکلیفوں اور دکھوں کا زمانہ تھا۔ مال گزاری کے تعلق سے انگریزوں کی پالیسیوں اور اُس کے وصولی میں کی جانے والی سختی نے زمینداروں، کسانوں اور دست کاروں کو تباہ حال کر دیا تھا۔ اُس لے بعد 1770ء کے قحط نے بنگال کو انتشار اور دکھوں کا شکار بنادیا۔ اس قسم کے حالات میں بدامنی اور قانون سے روگردانی ناگزیر تھی۔ بنگال کے فورٹ ولیم کی کونسل اور اُس کے صدر نے 1773ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کیا کہ سیاستوں اور فقیروں کے گروہ، جن کی

صفوں کو بھوکے کسانوں کے انہوہ کی شرکت نے زیادہ بڑھا دیا ”زیریں بنگال کے زیر کاشت کھیتوں میں آتے ہیں اور انھیں جلاتے ہیں، لونٹے ہیں اور برباد کرتے ہیں۔ اُن کی تعداد پچاس ہزار ہوتی ہے۔“ (1)

سنیاسیوں کی بغاوت کی اصل وجوہ تھیں بنگال میں اُن کی سرگرمیوں کی روک تھام اور مقدس مقامات کی باترا پر عاید کی جانے والی بندشیں۔ 1763ء ہی میں سنیاسیوں نے نو کھیتوں پر حملے شروع کر دیے تھے۔ اُس کے بعد بڑے بڑے گروہ بنا کر انہوں نے برطانوی فوجوں سے ٹکر لینی شروع کی۔ وہ کسی ضلع پر اچانک حملہ کرتے تھے، وہاں کے لوگوں سے چندہ وصول کرتے تھے اور اُس کے بعد جینزی سے منتشر ہو جاتے تھے۔ اُن کا چھپا کرنے کے لئے سپاہیوں کے دستے بھیجے جاتے تھے لیکن انھیں آسانی سے کھلے میدان میں لڑنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مزید برآں اکثر اوقات کھیتی کے سیاسی پورے طرح و فادار ثابت نہیں ہوتے تھے اور سرکاری فوج کو جانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

VI مدراس پریسڈنسی میں شورشیں

جو بنگال میں ہو اس کی آواز بازگشت ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی سنائی دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں جہاں انگریزوں نے اپنی حکومت قائم کی وہاں ایک سے عناصر عمل میں آئے۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف جگہوں پر احتجاج اور بے اطینانی کا اظہار مقامی حالات کے زیر اثر مختلف طریقوں سے کیا گیا۔

مدراس پریسڈنسی میں انگریزوں نے مال گزاری وصول کرنے کے رعیت داری نظام کو رواج دیا جس کی بنا پر کسان کا راست رابطہ حکومت سے قائم ہو گیا اور بیچ کے لوگوں کو اس کا موقع نہ تھا کہ وہ منافع کا حصہ خود حاصل کر سکیں۔ آر۔ سی۔ دت کے مطابق ”کسانوں پر کمپنی کی گرفت ویسی تھی جیسی کہ غلام کے مالک کی غلاموں پر ہوتی ہے اور جو کچھ انھیں زندہ رکھنے کے لئے ضروری نہیں ہوتا تھا وہ کمپنی سے لیتی تھی۔“ (2) جہاں تک رعیت کا تعلق تھا اُسے زمین پر حق دوام حاصل نہیں تھا اور اُس کے لگان میں ہر سال فصل کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی تھی۔ جن غیر یقینی حالات میں اُسے کام کرنا پڑتا تھا انہوں نے اُس کو وہاں پہنچا دیا تھا جہاں کاشت میں کوئی ترقی ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن عام بندوبست میں کچھ پولیکروں کی زمینداریاں بیچ گئی تھیں اور حکومت کو زیادہ تر اُن کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

وزیا نگر م کے راجہ کی بغاوت

پہلی بغاوت تھی وزیا نگر م کے راجہ کی جس کی چیرک کول میں بڑی زمینداری تھی۔ فرانسسویوں اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی جنگ کے پر آشوب دور میں راجہ نے وزا گائیم کا سہم کوٹا، چیرک کول اور

(1) ہمد۔ کونسل کاغذ (غیر منظر) کورٹ آف ڈائریکٹرز کے نام، مورخہ 15 جنوری 1773ء، پیج 131، ہنر۔ ڈبلیو۔ ایلیمو۔

Annals of Rural Bengal (لندن 1868ء) صفحات 70-71۔

(2) آر۔ سی۔ دت۔ Economic History of India under Early British Rule (London: دت۔

پارکلی میدی کے اطراف کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1765ء میں شمالی سرکاریں بطور عطیہ کے حاصل کر لیں تو اُس نے راجہ سے تین لاکھ روپے کی پیش کش طلب کی۔ کچھ دن بعد اس مطالبے کو ٹکنا کر دیا گیا اور راجہ سے یہ کہا گیا کہ وہ بڑی سی فوج کو ہر طرف کر دے۔ راجہ نے ان مطالبات کو پورا نہیں کیا اور اُس کی زمینداری ضبط کر لی گئی۔ اپنی فوج کی مدد سے راجہ نے علم بغاوت بلند کیا لیکن 1794ء میں وہ لڑائی میں ہار گیا۔ اُس کے بعد کمپنی نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے مصالحت آمیز اقدام کیا۔ اُس نے پیش کش کی رقم میں تحفہ کی اور مرحوم راجہ کے بیٹے کی زمینداری بحال کر دی جس کا رقبہ کم کر دیا گیا تھا۔

تنی دہلی، پنجلم کور پچی، سیوگیری اور رام ناد کے پولیگروں نے بھی بے چینی کی علامتوں اور سر تابی کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔ 1801ء میں جنوبی پلا میوں وندیگی اور ملابار میں شور شیں پھوٹ پڑی۔ باغیوں نے علم کو ٹاور ٹوٹی کورن کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بغاوت کو فرو کر دیا، پولیگروں کے قلعے مسمار کر دیے گئے اور باغیوں سے اسلحہ چھین لئے گئے۔ اُس کے بعد واگزار شدہ اضلاع (1801ء) لغایت 1805ء) شمالی ارکاٹ (1803ء لغایت 1807ء) اور پولیگروں نے ناکام بغاوتیں کیں۔

1830ء سے 1834ء تک وزا گچم کے بیر بھد راجہ اور جگن ناتھ راجہ نے بغاوت کا علم بلند رکھا۔ گچم ضلع کا گمسور کے زمیندار اور کرنول کے پولیگروں نے 37-1835ء اور 47-1846ء میں بغاوت کی۔

1792ء میں دلی ناد کے گوالاؤز راجہ نے (جو ایک نوجوان حینہ کے روپ میں خود کو روج کی تجسیم سمجھتا تھا) بد نظمی پھیلا دی جس کی پلیٹ میں پورا صوبہ آگیا اور جو 1805ء میں اُس کی موت کے بعد ختم ہو سکی۔

دیوان دیلو تابی کی بغاوت

1805ء میں معادنت کا ایک نیا عہد نامہ کرنے پر انکور کو مجبور کیا گیا۔ دربار غیر مطمئن تھا اور برطانوی حکومت سے اُس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ زر معادنت ادا نہیں کیا گیا اور ہتھیار ہا۔ دیوان دیلو تابی اور ریزینڈنٹ میں جھگڑا ہو گیا جس کی وجہ سے ریاست کانارہ ٹیلیمن نے بغاوت کر دی۔ لیکن برطانوی فوج نے بغاوت فرو کر دی اور راجہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔ دیوان نے خود کشی کر لی۔

دھوندی واگھ کی بغاوت

میسور میں سر پنجم پر 1799ء میں قبضہ ہو جانے کے بعد نیپو سلطان کے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔ جن میں دھوندی واگھ بھی شامل تھا۔ اُس نے غیر مطمئن عناصر کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ کچھ قلعہ دار اُس سے مل گئے اور پید نور کے آس پاس کے ضلعوں سے رقیس وصول کی جانے لگیں۔ جب برطانوی فوج نے اُس کے ساتھیوں کو شیوگا اور شکار پور کے مقاموں پر شکست دیدی تو دھوندی بھاگ کر مرہٹوں کے علاقوں میں چلا گیا جہاں اہر قہر دلیتر نے اُس کا پچھا کیا۔ 10 ستمبر 1800ء کو دھوندی ایک بڑی فوج کے خلاف جہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔

1831ء میں میسور کی رعیت کو، جو راجہ کی لاپرواہی اور زمینداروں کے مظالم کی بنیاد پر غیر مطمئن تھے، مجبوراً بغاوت کرنی پڑی۔ امن بحال کرنے کے لئے برطانوی فوج کو استعمال کرنا پڑا۔ کورگ میں راجہ میزاجہ کپینی کی حکومت کے خلاف ہو گیا۔ جنرل فریزر نے 15 مارچ 1834ء کو ایک فرمان کے ذریعے اُسے گدی سے اتار دیا۔

VII دکن کی بغاوتیں

راجہ مہی پت رام کی بغاوت

دکن میں نظام علی خاں سے 1800ء میں کئے جانے والے معاہدہ کی رو سے حیدر آباد کے نظام کی آزاد حیثیت کو انگریزوں کے ایک ماتحت حلیف کی حیثیت میں بدل دیا گیا تھا۔ لیکن ریاست کے بااثر عناصر اس تبدیلی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ سکندر جاہ، جو 1803ء میں نظام علی خاں کے بعد گدی پر بیٹھا تھا، اس معاہدہ کے خلاف تھا اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں اُس نے مدد نہیں کی۔ راجہ مہی پت رام نے، جو برادر کا گورنر اور نظام کا ممتاز اعلیٰ تھا، انگریزوں کی مخالف جماعت کی حمایت کی۔ دولت آباد، دھرد اور بدناپور کے قلعہ داروں نے برطانوی فوجوں کی طرف معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ نظام اور اُس کے حکام پر بدگمانی اور نفرت کا الزام لگایا گیا اور یہ بھی الزام لگایا گیا کہ وہ بلگر اور سندھیا سے خفیہ مراسلت کر رہے ہیں۔ ریاست میں مقیم ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں مخالفت کا جذبہ پایا جاتا تھا اور کچھ امرامشلا راجہ راؤ امھاتبا لکر اور نور امرام پر شبہ کیا گیا کہ وہ اُن سے ہمداری رکھتے ہیں۔ دونوں کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ برطانوی ریزیڈنٹ سیدن ہیم نے انگریزوں کے حامی وزیر اعظم میر عالم کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ مہی پت رام کو ہر طرف کر دے اور نظام پر اُس کے اثر کو زائل کر دے۔ اس کی بنا پر راجہ نے 1808ء میں بغاوت کر دی اور سیاسی منظر سے وہ ہٹ گیا۔ اس کے بعد بھی سکندر جاہ کی دشمنی میں کمی نہیں ہوئی۔ لیکن 1808ء سے ریاست کے معاملات میں چند و اہل کا عمل داخل ہو گیا، جو انگریزوں کے جاں نثاروں میں سے تھا، اور نظام نے حالات عامہ میں دلچسپی لیتی چھوڑ دی۔ 1820ء میں اُس کا انتقال ہو گیا اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا نصر الدولہ تخت پر بیٹھا۔ اُس کا بھائی مبارز الدولہ، جو ایک پر جوش اور آزاد نوجوان تھا، انگریز مخالف سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

مبارز الدولہ کی بغاوت

اس زمانے میں سید احمد بریلوی کی مسلمانوں کی اصلاح اور جہاد کی تحریک پورے ہندوستان میں پھیل رہی تھی۔ دکن میں مبارز الدولہ اس کا پر جوش حامی بن گیا۔ حیدر آباد میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ نے، جو ان سرگرمیوں پر بڑی نظر رکھتا تھا، گو لکھنؤ کے قلعے میں مبارز الدولہ کی نظر بندی کے احکام نظام سے حاصل کر لئے۔ اُس کے مقدمے کی سماعت کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اُس کمیشن نے مبارز الدولہ اور اُس کے ساتھیوں کو ہندوستان کے دیہی حکمرانوں کی مدد سے برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے

کی سازش، اڈگیر کے قلعہ کو تقویت پہنچانے، اسلحہ اور گولہ بارود اکٹھا کرنے اور مبارز الدولہ کی قیادت میں جہاد کا علم بلند کرنے کی اسلیمین بنانے کا ملزم مہربا جس کو رئیس المومنین کا لقب دیا گیا تھا۔ اس تفتیش کے نتیجے کے طور پر 1840ء میں مبارز الدولہ کو ایک سرکاری قیدی کی حیثیت کے گولکنڈا کے قلعے میں نظر بند کرنے کا حکم صادر کیا گیا اور اُس کے ساتھی حراست میں لے لئے گئے۔ وہ باغی شہزادہ جو پوری زندگی برطانوی اقتدار کو خاطر میں نہ لایا 1854ء میں ایک سرکاری قیدی کی حیثیت سے مرا۔

اعلیٰ حیثیت رکھنے والے افراد کی جانب سے کئے جانے والے مخالفانہ مظاہروں کے علاوہ کئی اور بھی شور شیں پھوٹ پڑیں جن میں چھوٹے چھوٹے سرداروں اور زمینداروں نے حصہ لیا۔ اُن میں شامل تھے۔ دھرم جی پر تاپ راؤ، جس نے 1818ء میں بہار میں بنجاروں کی قیادت کی، ہتھیار تانک یعنی نوسابی اور ہسابی، جن کی بغاوت کئی سال تک جاری رہی، رانچور ضلع کا زمیندار و بریتا، جس نے کوپ ہال کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور نظام کی حکم عدولی کی اور اڈگیر کا دیش کھ (ضلع بیدر) جس نے 1820ء میں مالگوار کی کا نظام کا مطالبہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

رموسی بغاوتیں

مغربی ہندوستان یعنی مرہٹوں کے علاقے میں 1818ء میں پیشوا کی قطعی شکست کے بعد نظم و نسق بحال کرنا آسان نہیں تھا۔ نئی حکومت نے کسانوں پر براہِوجہ ڈال دیا تھا اور پہاڑی قبائل، جن سے ہندوستانیوں کی حکومت میں تعرض نہیں کیا جاتا تھا، انگریزوں کی حکومت کی دراز دستی کے دباؤ کو محسوس کرنے لگے اور مزاحمت پر آمادہ ہو گئے۔ اُن میں اُمائی تانک اور اُس کا حامی باپو تر بنک جی سادنت شامل تھے جنہوں نے تورتا کے قلعے کے آس پاس کی پہاڑیوں میں اپنی سرگرمیاں 28-1827ء کے دوران جاری رکھیں۔ لیکن انھیں گرفتار کر لیا گیا اور اُن پر مقدمہ چلا۔ اُس کے بعد داواچی دولت راؤ گھور پاڈے نے کولہاپور کے مضافات میں ایک بغاوت کی تنظیم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش بھی ناکام رہادی گئی (1829ء)۔ اس سلسلہ میں قابل غور واقعہ تھا سیاسی زریا (زنگھہ راؤ زامتریہ پنکر) کی بغاوت جو ستارا کے معزول راجہ پر تاپ سنگھ کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دو عرب بھاڑے کے سالاروں سلیم بن ابود (کوہران) طالب بن علی کو عرب اور روہیلا سپاہی اکٹھا کرنے پر مامور کیا۔ اُس کے بعد انہوں نے دھودرگ (رانچور) سے باوامی کی طرف پیش قدمی کی، قلعہ پر قبضہ کر لیا اور ستارا کے راجہ کا بھند لگا دیا۔ لیکن ایک لمبی جدوجہد کے بعد 1841ء میں یہ بغاوت کچل دی گئی۔

گدکاری بغاوت

1844ء میں کولہاپور میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ 1837ء میں شاہ جی کی موت کے بعد شیواجی چھارم کو گدی پر بٹھادیا گیا جو نابالغ تھا اور ریاست کے معاملات کے ذمہ دار وزیر کی حیثیت سے دااجی کرشنا پنڈت کا تقرر ہوا۔ اُس نے مال گزاری کی وصولی کے نظام میں جن تبدیلیوں کو رواج دیا اُن کی وجہ سے وہ

غیر مقبول ہو گیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ قلعوں پر قبضہ کرے تاکہ انھیں مسار کر کے وہ گد کار یوں یا قلعہ سے تعلق رکھنے والے موردی ملازمین کو برطرف کر سکے، جن کے ساتھ دوسرے طبقوں کے لوگوں کو ہمدردی تھی، اور اُن کی ذمہ داریوں کی نگرانی میں دیدی جائیں۔ اس نے بغاوت کے لئے اسباب مہیا کر دیے۔ گد کار یوں نے سمن گڑھ اور بھودار گڑھ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ بانیوں پر قابو پانے اور امن بحال کرنے میں انگریزوں کا بہت خون بہا اور روپیہ خرچ ہوا۔

اُسی سال سادنت داوی میں بھی، جہاں بے چینی اپنے نقطہ عروج تک پہنچ چکی تھی، ریاست کے ایک سردار پھوند سادنت کی قیادت میں ہونے والی بغاوت کی وجہ سے بد نظمی پھیل گئی۔ اُس نے حکمران کے نابالغ بیٹے نانا صاحب کو اور کئی دوسرے سرداروں اور دیسیائیوں کو اپنے ساتھ ملا کر کچھ قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ جب برطانوی فوجوں نے اُسے اُن قلعوں سے نکالا تو وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گوا کی طرف بھاگ گیا اور ریاست میں بد نظمی جاری رہی۔ اُس کے بعد پرنگالی حکام کو اس امر پر آمادہ کیا گیا کہ وہ سرکرداروں اور دیسیائیوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ لیکن انہوں نے پھوند سادنت اور نانا صاحب کو اُن کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ جن لوگوں کو انگریزوں کے حوالے کیا گیا تھا ان پر خداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور محنت مدتوں کی سزا دی گئی۔

VIII گجرات اور سوراشٹر میں بغاوتیں

گجرات اور سوراشٹر میں بے اطمینانی نے کچھ ایسی ہی شکل اختیار کی۔ جب 1835ء میں کیپٹن اوٹ روم وہاں گیا تو اُس نے سرداروں کو بغاوت کرتے ہوئے پایا۔ اُس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا ”باغی سرداروں کی اصل قوت اور ہماری مخالفت کرنے میں اُن کے اور جھگڑوں کو ہوا دینے والوں کے اعتماد کا باعث ہیں بدیسی بھاڑے کے سپاہی جن کا ذریعہ معاش ہیں وہ دنگے اور لڑائیاں جن کے لئے وہ خود اشتعال انگیزی کرتے ہیں۔ زیادہ تر وہ ہیں کمرانی، سندھی، سیدی، گوساتی، اور کچھ عرب۔“ اُس نے مزید لکھا ”بلا خوف پاداش گجرات کے لوگ جتنی آسانی کے ساتھ برطانوی حکام کی توہن کرتے ہیں اور انھیں لوٹتے ہیں وہ، اگر اُس کی روک تھام نہیں کی گئی، ہندوستان کے اس حصے میں یورپی حکومت کو اُن اکھوں غیر مطمئن مقامی باشندوں کے مقابلے میں مٹی بھر انگریزوں کی محض جسمانی قوت کی نیچی سطح تک پہنچا دے گی جو ہماری قوت سے خائف نہیں ہیں۔“ (۱)

(۱) کیپٹن جیمس روم کی رپورٹ گجرات کی بد نظمی کے متعلق (P.D. Vol No. 37/736 of 1836) 1835ء ہندوستان کی

تحریک آزادی کی تاریخ میں استعمال ہونے والے ماخذ دیکھے حکومت بمبئی، 1957ء جلد 55-54

وگھیر بغاوت

مندرجہ بالا رپورٹ میں کچھ کی اُن شورشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو 1815ء سے 1832ء تک جاری رہیں۔ اُس کے علاوہ اکھا منڈل کے وگھیروں کی بغاوت تھی جنہوں نے ابتدا سے انگریزی حکومت کے قیام کی مزاحمت کی تھی۔ اُن کی بے اطمینانی کی بڑی وجہ تھی برودا کے کیکواڑ کا عاید کردہ ملک گیری کا محصول اور اُس پر عملدرآمد کرنے میں برطانوی حکومت کی امداد۔ سورت میں اختلاف کی طویل روایت پائی جاتی تھی۔ وہاں کے شہریوں نے غیر پسندیدہ اقدامات مثلاً نمک کا محصول اور معیاری اوزان اور پیمائش کے طریقوں کے رواج کی پہلے بھی مزاحمت کی تھی۔ انہوں نے دوکانیں بند کر دیں، سرکاری ملازمین کا بائیکاٹ کیا اور عرصہ اشتہیں تیار کیں جن پر ہزاروں نے دستخط کئے یہاں تک کہ حکومت کو ان غیر پسندیدہ اقدامات کو منسوخ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

بھیل بغاوتیں

بھیل خاندان اور ملک آباد ضلع کے آس پاس کے پہاڑی علاقے میں رہنے والا ایک آدی واسی قبیلہ تھا، شمال اور دکن کے درمیان واقع پہاڑی دروں پر قابو رکھتا تھا۔ وہ راجپوت حکمرانوں کی جاں نثاری کے دعویدار تھے اور اُن سے بڑی وفاداری کا مظاہرہ کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے آخری برس اُن کے لئے دکن کا زمانہ تھا اس لئے کہ اُن کا علاقہ مرہٹوں کی جنگوں، چنڈاریوں کی لوٹ مار، بد نظمی اور قحط کی بنا پر تباہ ہو گیا تھا۔ مزید برآں 1818ء میں انگریزوں نے اُن کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس بغاوت نے جس فتنہ و فساد کو جنم دیا وہ تقریباً تیس سال تک جاری رہا اور بالآخر فوجی کارروائی کے ساتھ مصلحت آمیز مصالحتی اقدامات کے نتیجے میں ختم ہو گیا۔

کولی بغاوتیں

بھیلوں کے پڑوسی کولی، جو اُس پہاڑی علاقے میں آباد تھے جس کو سپہدارس کہا جاتا ہے، فطرتاً سرکش لوگ تھے۔ قلعوں میں تعینات حلقہ دستوں میں انھیں عام طور سے ملازم رکھا جاتا تھا۔ لیکن جب انگریزوں نے قلعہ مسمار کر دئے تو اُن کے روزگار کے مواقع ختم ہو گئے، اس کے نتیجے میں اُن میں بڑی بے چینی پھیل گئی اور 1828ء، 1839ء اور 48-1844ء کی بغاوتوں کی باعث بنی۔ لیکن 1850ء تک حکومت انھیں اطاعت پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

IX راجپوتانہ میں بے چینی

راجپوتانہ کے عیسائیوں سے زیادہ آزاد حکمران باہمی رقابت اور پھوٹ کے شکار تھے۔ اُن کی باہمی رقابت اور ایک دوسرے کے خلاف کئے جانے والے دعووں نے انھیں ذلیل کیا تھا اور آزادی سے محروم کر دیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں راجپوتانہ سے سر ہٹے خراج لیا کرتے تھے جسکو وصول کرنے کی خاطر اُن کی فوجی مہموں نے ملک کو دکھوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ حالانکہ برطانوی مدخلیت ان حکمرانوں کو مرہٹوں کے مظالم سے نجات دلادی پھر بھی حقیقت میں صرف مالک تبدیل ہو گئے تھے۔ اُس وقت کچھ صورتوں میں انگریزی حکومت کی اطاعت ممکن ہے مرہٹوں کی لوٹ مار سے بہتر ہو پھر بھی اس سے راجپوت حکمرانوں کی بحران خودداری کا مدد نہیں ہو سکتا تھا جو نتیجہ قحی خود مختاری سے محروم ہونے کا۔ اس کے علاوہ نظم و نسق کے ایک نئے نظام کے رواج، اُن کے کچھ قدیم اور مقبول رواجوں کی تہذیب، کچھ ایسے حکمرانوں کی چیرہ دستی جنہیں انگریزوں کی حمایت کا یقین دلایا گیا تھا، برطانوی چھاؤنیوں کا قیام جو ہر وقت غلامی کی یاد دلاتی رہتی تھیں اور خوف کہ اُن کی روایت و مذہب کو ختم کر دیا جائے گا۔ اُن سب باتوں نے بڑے پیمانے پر بے چینی پھیلا دی۔

انگریزوں کے خلاف تحریک کا مرکز تھا جو دھورو کا مہاراجہ مان سنگھ۔ لیکن وہ اپنی بے بسی سے انتہا بددل ہوا کہ اُس نے گدی چھوڑ دینے کو ترجیح دی، کوٹا کے جو تھا رام اور مہاراجہ روشن سنگھ کی کوششیں اور میواڑ اور مادھاڑ کے جاگیرداروں کی سازشیں ظاہر کرتی ہیں کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں راجپوتانہ کس حد تک مشتعل تھا۔ بغاوت کے جذبے کی عوامی تصدیق کا اظہار کوئی راج باگی داس بھاٹ کی نقلوں اور مہاراجہ کی سوریاتل مشرائی تحریروں سے ہوتا ہے۔

X اتر پردیش میں شور شیں

1765ء اور 1805ء کی درمیانی مدت میں شمال ہند کا وہ علاقہ انگریزوں کے زیرِ نگیں اور زیرِ حفاظت آگیا جو بہار اور پنجاب کے درمیان واقع ہے۔ ابتدائی زمانے میں انگریزوں کی نگرانی میں اودھ کا نواب دو آجے کے بڑے حصے پر حکومت کرتا تھا اور بقیہ حصے پر مرہٹوں کو اقتدار حاصل تھا۔ مرہٹوں کے ساتھ تیسری جنگ کے بعد انھیں دو آجے اور بندیل بھٹ سے بے دخل کر دیا گیا اور نواب کے زیرِ نگیں علاقے میں تخفیف کر دی گئی۔ 1856ء تک پورے علاقے پر انگریزوں کی راست حکومت قائم ہو چکی تھی۔

انگریزوں کی مدخلیت اور نگرانی اودھ کے نوابوں کو ناگوار تھی اور دونوں فریقوں میں مسلسل لڑائی جھگڑے کا باعث بنی رہتی تھی۔ اودھ کی بہت سی خرابیوں کی اصل وجہ قحی حکومت کا غیر فطری نظام جس میں انتظام کی ذمہ داری نواب پر تھی لیکن اصل طاقت انگریزوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا 1856ء میں اودھ کا الحاق اور درمیانی مدت میں ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ حادثات کا سلسلہ۔

گور کھپور کی بغاوت

ان حادثات میں سے پہلا حادثہ کمپنی کے ایک حاکم کرئل پنے کی اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھا۔ 1778ء میں اودھ کے نواب نے اُسے اپنی ملازمت میں لے لیا اور گور کھپور بہرائچ، اور بستی کے اضلاع کا انتظام اُس کے سپرد کیا۔ پنے نے بڑی سخت گیری سے کام لیا اور خوب دولت کمائی۔ اُس نے مال گزاری وصول کرنے کا حق ٹھیکیداروں کو دیدیا جنہوں نے گاؤں سے بہت زیادہ لگان وصول کیا اور انھیں خوب لوٹا۔ مال گزاری کے مطالبے کی وصولی میں بڑی سختی سے کام لیا جاتا تھا۔ تین سال سے کم کی مدت میں وہ علاقہ جو خاصہ خوشحال تھا بدویران کر دیا گیا۔ مجبور لوگوں نے اُس ظالم کے خلاف بغاوت کر دی۔ گھاگر اوریا کے مشرق کے علاقے میں رہنے والے زمینداروں نے نکوار اٹھائی، گور کھپور، پھلیا اور ڈومریا گنج کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور آمد و رفت کے راستے کاٹ دئے وارانہ مسلک کو، جو اودھ کی بیگمات اور بدس کے مہاراجہ جیت سنگھ کے خلاف الزامات پر یقین کرنے کے کچھ غمی وجوہ رکھتا تھا، کرئل پنے نے اس بات کا یقین دلایا کہ اس بغاوت میں اُن کا ہاتھ ہے۔ انگریزوں نے بغاوت کو کچلنے کے اقدامات میں اتنی زیادہ سختی سے کام لیا کہ وہ پورا علاقہ ویران ہو گیا۔

وزیر علی کی بغاوت

کمپنی کے حکمت عملی اور موقع شناسی سے کام لینے والے حکام کی اسکیم میں اودھ ایک ماتحت حلیف تھا اور اُس کا مقصد کمپنی کے مشرقی صوبوں اور مغرب کی دہلی ریاستوں کے درمیان فاصلہ ریاست کا کام کرنا تھا۔ وزیر علی نے اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور زیادہ آمدنی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اُسے 1799ء میں معزول کر دیا گیا۔ اُس کے متعلق شبہ کیا جا رہا تھا وہ برطانوی مفادات کے خلاف کام کر رہا ہے اور راجپوت اور مرہٹہ سرداروں اور مسلم حکمرانوں کے ایک محاذ کی تنظیم کر رہا ہے جن میں زیادہ اہم تھے گوالیا کا سندھیا اور کابل کا زماں شاہ، مرشد آباد اور ڈھاکہ کے نواب بھی اس سازش میں شامل تھے۔ جب وزیر علی کو لکھنؤ پہنچنے اور فکلت جانے کا حکم دیا گیا تو بغاوت ہو گئی۔ برطانوی فوجوں کے حملے کے بعد وزیر علی بھاگ نکلا ہوا لیکن وہ گرفتار کر لیا گیا اور جلاوطن کی حیثیت سے ویلور بھیج دیا گیا۔

روہیلوں کے علاقے میں بغاوت

روہیل کھنڈ میں، جسے اودھ کے نواب نے 1801ء میں کمپنی کے حوالے کر دیا تھا، جلد ہی عوامی بے چینی کی آثار دکھائی دینے لگے۔ اُن روہیلہ سرداروں کے لئے یہ صورت حال بڑی توہین آمیز تھی جن کی حیثیتیں چھین لی گئی تھیں اور اُن کو ملازمین کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ حرب معمول بے چینی کی اصل وجہ تھی مالگوار اور عدالت کے انتظام کا نیا انتظام۔ بغاوت کا فوراً سبب تھا 1814ء کے ضابطے XVI کے تحت بریلی میں چوکیداروں کا انتظام کرنے کے لیے عاید کیا جانے والا پو لیس محصول۔ لوگوں کے احتجاج پر کسی

اجتناب پر کسی نے توجہ نہیں دی اور ایک مولوی کے ساتھ، جس کا لوگ احترام کرتے تھے، براسلوک کیا۔ اس نے عام لوگوں کو بری طرح مشتعل کر دیا جو ہر حد سے آگے بڑھ گئے۔ مجسٹریٹ کے ساتھ جو سپاہی تھے وہ چونکہ مؤثر ثابت نہیں ہوئے اس لئے باغیوں کو منتشر کرنے کے لئے فوج بلائی پڑی۔

ہاتھرس کا دیارام

علی گڑھ کے ضلع میں بالگورہی کے اضافے نے چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو تکلیفوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ تشخیص شدہ قیمیں وصول کر سکتے تھے اور بقیہ وصول کرنے کے لئے اُن کی زمینداریاں بیچ دی جاتی تھیں۔ برطرف شدہ سپاہیوں اور سرکش زمینداروں نے مل کر بد نظمی اور بد امنی پھیلادی تھی۔ ان خرابیوں میں میواتیوں اور بدھیکوں کے گروہوں نے اضافہ کر دیا۔ ہاتھرس کے ایک تعلقدار دیارام کو، جو ضلع میں کئی گاؤں کا مالک تھا اور ایک ایسے قلعہ میں رہتا تھا جس کی حفاظت اونچی اونچی دیواریں اور گہری کھائی کرتی تھی، قلعہ سہار کرنے اور سپاہیوں کو درخواست کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کی تعمیل کروانے کے لئے ایک پورا ڈویژن بھیجا گیا۔ توپوں نے اس جھوم کے مقابلے میں، جو اس سے پہلے ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا، زیادہ مدت تک دفاع نہیں کیا جاسکتا تھا اور قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن دیارام بیچ کر نکل گیا۔

اس اجمالی جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تمام مدت میں بے چینی اور بغاوت ابتدا کی دور سے گزر رہی تھی اور کبھی کبھی ملک کے مختلف حصوں میں سامنے آ جاتی تھی۔ ہندوستان کے برطانوی علاقوں میں یکساں حالات پائے جاتے تھے۔ اُن میں سے سب سے اہم تھے زمین کی مالگورہی کے اختتام کے ایک نئے نظام کو رواج دینا جس کی بنا پر زمینداروں کے اختیارات کم ہو گئے اور زمین پر بہت زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ اس نظام نے سماجی اور معاشی سطحوں پر ایک انقلاب برپا کر دیا اور قدرتی طور سے اُن زمینداروں اور کسانوں کو مخالفت پر آمادہ کر دیا جن کے حقوق ان سے متاثر ہوئے اور قدیم معاشی ڈھانچے میں خلل پڑا۔ حالانکہ اسباب یکساں تھے پھر بھی حکومت کی مخالفت کا مظاہرہ اُس علاقے کے حالات کے مطابق ہوا۔ بغاوتیں یا تو مقامی تھیں یا کسی خاص فرقے تک محدود تھیں۔ اُن میں تال میل اور اتحاد کی کمی تھی اس لئے انھیں آسانی سے دبا دیا جاتا تھا۔

1 ولی اللہی تحریک

اس زمانے میں جو تحریک برطانوی اقتدار کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گئی وہ تھی مسلمانوں کے ایک طبقے کی جانب سے کی جانے والی جہاد کی تبلیغ۔ اس کے قاید تھے اُتر پردیش کے ضلع رائے بریلی کے سید احمد۔ وہ علما کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے تھے جو اپنا سلسلہ نسب پیغمبر اسلام سے ملاتا تھا۔ سید احمد طبعاً نہایت زود حس واقع ہوئے تھے اور انھیں کشتی پیکر نظر آتے تھے جو مذہب کے لئے زندگی وقف کر دینے کی تلقین کرتے تھے۔

اپنے تشکیلی دور میں اُن کے جو شیپے ذہن نے ولی اللہ (1703 1762ء) کے قائم کئے

ہوئے دیستان کے احیائے مذہب کے ماحول کا اثر قبول کیا ہو گا۔ جس کے سربراہوں کے بعد اُن کے بیٹے عبدالعزیز (1746 تا وفات 1823ء) ہوئے جنہوں نے 1803ء میں فتویٰ دیا کہ ہندوستان اب دارالسلام نہیں ہے۔

اس صداقت پرستانہ اور احیا پسندانہ ماحول میں سید احمد کے رجحانات اور رویے اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئے۔ لیکن وہ محض ایسے خیال پرست نہیں تھے جو فنا فی اللہ کا ناقابل بیان تجربہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ اُن کی روح عمل کی پیاسی تھی۔ وہ پیغمبر اسلام کے نقش قدم پر چلنا چاہتے تھے اور طریقہ محمدیہ کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ سر رکنی پروگرام کے ذریعے وہ زیوں حال ملت اسلامیہ کو نئی زندگی بخشنا چاہتے تھے۔ اُن کے پروگرام کے تین ارکان تھے۔ خدا کے کلام کا عروج، قول و فعل میں جذبہ ایمان کی تجدید اور جہاد پر عمل۔ مذہب کے پانچ ارکان یعنی نماز، خدا اور اُس کے رسول کا اقرار، زکوٰۃ، روزہ اور حج میں وہ آخرالذکر کو خدا کی عبادت کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔

1808ء میں سید احمد کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ چنانچہ وہ اپنے گھر واپس چلے گئے اور شادی کر لی۔ اُس کے بعد وہ اپنی منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور ٹونک پہنچے جہاں امیر خان ایک آزاد خدراں کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا۔ اُس کی فوج میں ملازم ہو گئے، اُس کی جنگوں میں حصہ لیا اور فوجی حکمت عملی اور تدابیر میں ضروری تربیت حاصل کی۔ لیکن 1817ء میں جب امیر خاں نے انگریزوں کے باج گزار کی حیثیت قبول کر لی تو انہوں نے اُس کی نوکری ترک کر دی۔

ٹونک سے واپس آنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اتر پردیش کے مغربی اضلاع کا دورہ کیا۔ میرٹھ، مظفرنگر اور سہارن پور کے اضلاع کے اہم قصبوں اور گاؤں کا انہوں نے سفر کیا۔ اُس کے بعد انہوں نے مشرقی اضلاع کا بھی دورہ کیا یعنی لاہ آباد، بنارس، کانپور اور لکھنؤ کا اور تیسرا دورہ وہ ہیکلہنڈ کا کیا۔ وہ جہاں جہاں گئے سید احمد کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا اور خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ لوگ بڑی تعداد میں اُن کا دواغظ سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ وہ قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور دو باتوں پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ پہلی بات تھی شرک سے بچنا یعنی خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہ کرنا اور خدا کی صفات کو کسی سے منسوب نہ کرنا۔ وہ اس کو گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ایک سچے مسلمان کو اس پر یقین نہیں کرنا چاہئے کی کوئی فرشتہ، روح، روحانی پیشوا، معلم، نبی یا دلی اللہ اس کے اور خدا کے درمیان پڑ سکتا ہے اور انسان کی دشواریوں کو دور کر سکتا ہے یا اُس کی خواہشات پوری کر سکتا ہے۔ کسی مسلمان کو نہ اُس سے کچھ طلب کرنا چاہئے اور نہ اُن کی ناراضگی سے ڈرنا چاہئے اس لیے کہ خدا کے حضور میں وہ بھی اسی طرح بے بس ہیں جیسے کوئی اور انسان۔ دوسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو بدعت ترک کر دینا چاہئے اور تمام معاملات میں چاہے وہ اہم ہوں یا غیر اہم، سنت پر عمل کرنا چاہئے۔ سید احمد کی سیدھی سادی زندگی، اُن کے بے پایاں جوش اور بے پناہ خلوص اُن کی بے لوثی اور انکساری نے اُن سب لوگوں پر گہرا اثر ڈالا جو اُن کے قریب آئے۔ چنانچہ انہوں نے جو حج بویا تھا وہ بھی فصل کا خا من بن گیا۔ بہت سے شاگردوں نے اُن کی پیروی کرنے کا پکا عہد کر لیا۔

لیکن جہاد شروع کرنے سے پہلے انہوں نے مکہ جاکر حج کرنے کا فیصلہ کیا۔ جولائی 1821ء میں وہ رائے بریلی سے نکلتے کے لیے روانہ ہوئے۔ مئی 1822ء میں جب وہ مدینہ پہنچے تو اُن کے ساتھ آٹھ

سومعتقدین تھے۔ جس وقت وہ رائے بریلی سے روانہ ہوئے تو اُن کے پاس پیسہ کوڑی کچھ نہیں تھا پھر بھی اُن کے سفر پر ستر اسی ہزار روپیہ خرچ ہوا جو اُن کے مداحوں اور شاگردوں کے چندوں سے جمع ہوا تھا۔ دو سال کے بعد وہ گھر واپس آئے (29 اپریل 1824ء)۔

سید احمد نے عرب میں جس سے اثر لیا وہ محمد بن عبد الوہاب کا مسلک نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی ذلت و خواری کی داستان اور مشرقی ممالک میں مغربی طاقتوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے غلبے کی روداد تھی۔ اس نے اُس شخص کو جو کسی حد تک تخیل پرست کہا جاسکتا تھا ایک آتش نفس مجاہد میں تبدیل کر دیا جس نے اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنے کا مقصد عزم کر لیا تھا تاکہ اُن علاقوں کو دوبارہ حاصل کیا جاسکے جن پر مسلمان حکومت کر چکے تھے۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد انہوں نے فوراً اپنی تحریک کی تنظیم کا کام شروع کر دیا۔ انہوں نے "ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعہ انہوں نے (اُن کے پیروؤں نے) احیاء مذہب کا اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے اور جسکی وجہ سے پچاس سال تک انگریزی حکومت کے خلاف جذبہ بغاوت زندہ رہا۔" (1)

جہاد کی تیاری میں شامل تھے (1) لڑنے والے سپاہیوں کا ایک گروہ تیار کرنا جن کی تعداد اور اسلحہ ایسے ہوں کہ دشمن کی مزاحمت کا مناسب و معقول دافع فراہم کر سکیں۔ (2) ایسے قائد کا انتخاب جس میں وہ صفات پائی جاتی ہوں جو فوج کے کمانڈر کے لئے ضروری ہیں (3) کسی مسلم حکمران کے زیرِ نگیں ایسے علاقے کا انتخاب جو مجاہدین کے گروہ کی حفاظت کی ضمانت کر سکے۔

پہلی دو شرائط تو اس وقت پوری ہو گئیں جب کئی سو ہندوستانی مسلمان بھرتی کر لئے گئے اور سید احمد کو امام منتخب کر لیا گیا۔ تیسری شرط ہندوستان کی سرحدوں کے اندر رہ کر پوری نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس لئے لڑائی کے میدان کے طور پر شمال۔ مغربی سرحد کے علاقے کا انتخاب کیا گیا۔ سرحد کے قابلِ کنٹرول تھے اور اُن کے اطراف کٹرین کو پوری طرح استعمال کرنا جانتے تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ عرب کے محمد بن عبد الوہاب کے عقائد کی تھوڑی بہت اشاعت اس علاقے میں بھی کی جا چکی ہے۔

پہلا قدم تھا ہندوستان سے، جو دارالحرب تھا، موئنیں کے گروہ کا سرحدی علاقے کی طرف، جو دارالاسلام تھا، ہجرت کا انتظام کرنا۔ پانچ چھ سو انسانوں کو، جن کے ساتھ کچھ عورتیں اور بچے بھی تھے، پانچ ہزار روپے فراہم کئے گئے تاکہ وہ اپنے خطرناک عزائم پورے کرنے کے لئے شمال۔ مغرب کی طرف سفر کریں۔ 17، جنوری 1826ء کو یہ قافلہ سید احمد کی قیادت میں رائے بریلی سے روانہ ہوا جن کی مدد ایک مجلس مشاورت کرتی تھی۔ اُس کے اراکین میں اہم تھے مولوی محمد اسماعیل اور مولوی عبدالحی جو شاہ عبدالعزیز کے قریبی عزیز تھے۔ پہلی اہم قیام گاہ تھی گوالیار۔ گوالیار سے وہ ٹوبہ گئے، پھر اجیر پہنچے اور راجپوتانہ سے گزر کر سندھ میں داخل ہوئے۔ حیدر آباد (سندھ) پہنچ کر کٹر مجاہدین کا یہ گروہ اپنے ہم مذہبوں کے درمیان آ گیا تھا اور انھیں توقع تھی کہ سندھ کے امیر اُن کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اُن کے رویے سے مایوس ہو کر ہر شکار پور کی طرف بڑھے جہاں سید احمد نے سرداروں اور علماء کو جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔ اُن کا جواب بھی اُسی حد تک مایوس کن ثابت ہوا۔ اُس کے بعد ریگستان اور پہاڑی علاقے کو پار کر کے مجاہدین کا گروہ دوبارہ اُن سے گزر کر کوئٹہ پہنچا۔ کوئٹہ سے وہ قندھار، غزنی اور کابل گئے اور بالآخر 20 نومبر 1826ء کو پشاور پہنچے۔ انہوں

نے تقریباً دس مہینے تک سفر کیا تھا اور قریب قریب تین ہزار میل چلے تھے۔

یہ حیرت انگیز کارنامہ تھا۔ زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ برطانوی حکومت نے، جو سید احمد کے منصوبوں اور مقاصد سے واقف ہو گئی تھی۔ اپنے علاقے سے گزرتی ہوئی اس چھوٹی سی فوج سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ کیا اس عدم مزاحمت کی وجہ یہ علم تھا کہ جہاں کا نشانہ برطانوی ہندوستان نہیں بلکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سکھ ریاست ہے؟ اگر شمال۔ مغرب کی طرف سے رنجیت سنگھ کے لئے خطرہ پیدا ہو تا تو انگریزوں کے لئے یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ اسلئے کہ اس حملے کی بنا پر اُس کی توجہ سندھ اور ستلج کے علاقوں سے ہٹ جاتی جنہیں وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جلد ہی انہوں نے پشاور پر قبضہ کر لیا جس سے اُن کے وقار میں اضافہ ہو گیا لیکن انہوں نے جہاد کے صدر مقام کے لئے چار سدا کے قصبے کا انتخاب کیا۔ یہاں سے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا گیا۔ سرحد کے قبائل کو ہندوستانی مجاہدین کی صفوں میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ قبائل نے بڑی مستعدی کے ساتھ اس دعوت پر لبیک کہا لیکن اُن کے سردار مذہب میں تھے اور انہوں نے گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔

بہر حال سید احمد کو امام یا مجاہدین کا قائد تسلیم کر لیا گیا۔ انھیں امام مہدی، امیر المومنین اور خلیفہ کے القاب دئے گئے۔ اُن کی پاکباز و برگزیدہ زندگی کی بنا پر انہیں ولی کا درجہ دیا گیا۔ جب اُن کی یہ حیثیت تسلیم کر لی گئی تو انہوں نے وحشی قبائل کی اصلاح کی کوشش کی اور انھیں ایک مذہبی۔ سیاسی طاقت کے طور پر منظم کرنا چاہا۔ انھیں عشر اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت کی گئی اور کہا گیا کہ فیصلے کے لئے اپنے جھگڑے امام کے مقرر کردہ قاضی کے سامنے پیش کریں اور اُس کے احکام کی تعمیل کریں شادی کے قبائلی رواجوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا اور ہندوستانی مہاجرین کی پٹھان لڑکیوں کے ساتھ شادیاں کرائی گئیں۔ انتہائی کاروائیوں، رقباتوں اور حدود کی مذمت کی گئی، جن کی وجہ سے دائمی ہلاکت خیز لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور اسلامی برادری کی کمزوری کا باعث بنتی تھیں۔

بد قسمتی سے اتحاد و اتفاق کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ اصلاح کے اقدامات نے قبائل میں ناگواری کا احساس پیدا کر دیا اور ملائے ناراض ہو گئے کہ عشر اور زکوٰۃ کے ضوابط نے انھیں باڈائی آمدنی سے محروم کر دیا تھا۔ قبائل کے خان اور سردار فی الجملہ بڑے خود غرض لوگ تھے۔ وہ ضعیف فروش تھے اور بڑی آسانی سے خریدے جاسکتے تھے۔ صدیوں سے وہ لوٹ مار تشدد اور غیر شائستہ قبائلی طریقوں کے عادی رہے تھے۔ مذہبی جذبات کی اپیل کا اُن پر اثر نہیں ہوتا تھا حالانکہ اُن کے خدام جو غریب، توہم پرست اور کٹر تھے اپنے مذہبی رہنماؤں کی بات سنتے اور ایسی جنگ میں حصہ لینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے جس سے انھیں مذہبی فائدہ بھی ہو اور مال غنیمت بھی۔ یہ آئے۔

ان ناکامیوں کے باوجود جہاد کی آگ ایک دفعہ روشن ہونے کے بعد آدھی صدی چلتی رہی۔ اس کے پہلے مرحلے میں راست نشانہ تھا پنجاب کی سکھ ریاست پر حملہ۔ فریقین میں بہت سی جھڑپیں ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم تھی 18۴1ء میں ہونے والی باا کوٹ کی جنگ جہاں مجاہدین کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔ سید احمد اور شاہ محمد اسامیل اس جنگ میں مارے گئے۔

امام کا منظر عام سے ہٹ جانا ایک کاری ضرب تھا۔ لیکن سید احمد نے ہندوستان میں جو تنظیم بنائی تھی اُس کی وجہ سے سرحد پر لڑنے والے گروہ میں انتشار نہیں پھیلایا۔ سرحد کے لئے روانہ ہونے

سے پہلے سید احمد نے مرکزوں اور گماشتوں کا ایک جال پھیلادیا تھا تاکہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کریں اور سرحد پر لانے والے گروہ کے لئے چندہ جمع کریں اور سپاہی بھرتی کریں۔ حیدر آباد دکن، مدراس، بنگال، بمبئی اور اس صوبے میں جس کو اب اتر پردیش کہا جاتا ہے ادارے قائم کئے گئے تھے۔ اس تحریک کا صدر مقام تھا پٹنہ۔ روپیہ اکٹھا کرنے اور سلسلہ مرسلات جاری رکھنے کے لئے گماشتے مقرر کئے گئے تھے۔ چندہ اور رنکروٹ صدر مقام آتے تھے اور سرحد کو روانہ کر دئے جاتے تھے۔ نقد روپیہ گماشتے لے جاتے تھے اور ہندیا سرحدی مقبول کے ساہوکاروں (جو عام طور سے ہندو ہوتے تھے) کو بھیجی جاتی تھیں۔ رنکروٹوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اتر پردیش اور پنجاب سے گزرتے تھے۔ راستے میں قیام گاہیں تھیں یعنی تھامس اور راولپنڈی میں تاکہ خوردنی اشیاء اور سامان لیجانے میں مسافروں کی مدد کی جاسکے۔

ہندوستان کے مختلف حصوں کے مسلمانوں نے چندہ اکٹھا کیا اور رضا کار بھیجے لیکن ان مقاصد کے لئے زیریں صوبوں میں زیادہ بہتر تنظیم کی گئی تھی۔ قریب قریب ہر گاؤں میں ایک مبلغ ہوتا تھا اور گاؤں کی مسجد میں جو ان کی جلسہ گاہ تھی وہاں لوگ وعظ سننے کے لئے جمع ہوتے تھے جس میں مذہبی اصلاح، سرحد پر جہاد کا جذبہ برقرار رکھا گیا۔

سید احمد کے ایک قریبی رفیق کار مولوی محمد قاسم پانی پتی سہتا آئے اور قبائلی سردار اکبر شاہ کے ساتھ مل کر وہاں کام کیا جو سید احمد کا جاں نثار تھا۔ انہوں نے تمام مرکزوں کو خطوط لکھے اور انھیں یقین دایا کہ قائد کی موت کی خبر غلط ہے۔ مولوی ولایت علی اور عثمان علی کو، جو پٹنہ کے گروہ کے قائد تھے، یہ یقین آگیا کہ سید نہیں مرے ہیں اور جنگ جاری رکھنے کی غرض سے وہ سرحد کی طرف گئے۔

رنجیت سنگھ کی موت اور سکھوں کے ساتھ انگریزوں کی پہلی لڑائی (1845ء) کے بعد پنجاب میں انگریزوں نے غلبہ حاصل کر لیا۔ مجاہدین نے اب جہاد کا رخ ان کی طرف پھیر دیا۔ ہونے والی جھڑپوں میں انھیں اکثر شکستیں ہوئیں لیکن انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اب حکومت نے ان کے خلاف دو محاذوں پر جنگ شروع کر دی انہوں نے پولیس کا ایک خصوصی محکمہ قائم کیا جس کے سپرد ہندوستان میں ان کی سرگرمیوں کی نگرانی اور ان مرکزوں کو ختم کرنے کا کام کیا گیا جہاں سے روپیہ اور رنکروٹ سرحد بھیجے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ سرحدوں پر مجاہدین کو ختم کرنے کے لئے باضابطہ فوج کی ہمیں شروع کی گئیں۔

1850ء اور 1863ء کی درمیانی مدت میں بیس مہمیں بھیجی گئیں جن میں 60,000 سپاہی تھے۔

سہتا سے نکال دئے جانے کے بعد انہوں نے ملکانا کو اپنا صدر مقام بنالیا اور اُس کے کچھ دن بعد سہتا پر قبضہ کر لیا۔

1863ء میں جنرل سر نوبل جیمز لین کی قیادت میں ایک بڑی فوج ان کی سرزنش کے لئے بڑھی لین قبائل نے اُسے درہامپلا میں لپی پٹے تک گھیرے رکھا اور بہت جانی نقصان پہنچایا۔ سرحدی فوج کو جابی سے بچانے کے لیے پنجاب کو فوجوں سے خالی کرنا پڑا۔ لیکن جہاں برطانوی اسلحہ ناکام رہے تھے وہاں ان کی سخت عملی کامیاب ہو گئی۔ قبائلیوں کا اتحاد ٹوٹ گیا اور برطانوی فوج نے ملکانا کو جاکر خاک کر دیا۔ لیکن مذہب کی خاطر لڑنے والے ناقابل تسخیر جنگجو پھر برسر پیکار ہوئے۔ چونکہ فوجی کارروائی مجاہدوں کو بانے میں ناکام رہی تھی اس لیے تیزی کے ساتھ پولیس کی کارروائی کی گئی اور اُس کے بعد ان پر

مقدمے چلائے گئے۔

اس وقت تک مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی مرچلے تھے اور ان کا بھائی سحی علی پنڈہ میں کاروبار کی نگرانی کر رہا تھا۔ مولوی فرحت علی اور مولوی احمد اللہ اُس کے کٹر حامی تھے۔ انہوں نے تحریک کو پورے زور و شور کے ساتھ چلانے کے لئے ہر امکان کی کوشش کی۔ مذہبی اصلاح اور جہاد کی نشر و اشاعت کی خاطر کتابیں اور کتابچے چھاپے گئے۔ پنڈہ میں صادق پور کے مقام پر ایک عمارت بنائی جس میں تحفظ اور پردہ پوشی کے پورے انتظامات کئے گئے تھے۔ دیہی علاقوں میں ایک تنظیم قائم کی گئی جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مختلف مراکز میں بستیاں آباد ہو گئیں جن میں مبلغین، محصول وصول کنندہ گان اور تنظیمیں کا عملہ تھا جن کا کام تھا رقم یا جنس کی شکل میں چندے وصول کرنا۔ پنڈہ سے سرحد کو جانے والی سڑک پر مراکز قائم تھے جو رقبوں اور اشخاص کو ادھر سے ادھر بھیجتے تھے اور ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔

حکومت نے اس خطرے کا مقابلہ تنظیم پر بسیار ارضی حملے سے کیا۔ 64-1863ء میں کچھ بڑے اچھے کارکنوں کو، جن میں سحی علی ولایت علی کا شاگرد محمد جعفر اور ایک ٹھیکیدار محمد شفیع شامل تھے، اہلالہ کی عدالت میں پیش کیا گیا اور لمبی لمبی قید کی سزائیں دی گئیں۔ کچھ کو جڑاڑا امان بھیجا گیا۔

1865ء میں پنڈہ میں پہلا مقدمہ چلایا گیا۔ جن لوگوں کے خلاف ملکہ کے خلاف جنگ کرنے کے الزام میں مقدمہ شروع کیا گیا ان میں سحی علی کا بھائی احمد اللہ بھی شامل تھا۔ اُن سب کو جس دوام عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد بنگال میں مالدہ اور راج محل کے مقامات پر مقدمات کی سماعت ہوئی اور کئی مجاہدین کو جس دوام کی سزا دی گئی۔ 1871ء میں پنڈہ میں ہونے والے مقدمے کی دوسری سماعت نے تنظیم کا شیرازہ بکھیر دیا اس میں پانچ سرکردہ مولویوں کو جلاوطن کیا گیا۔

حکومت نے پرچار کے ذریعے اپنے موقف کو زیادہ مضبوط بنالیا۔ تذبذب کے شکار اشخاص کو اپنے ساتھ کرنے کے لئے تحریک کے خلاف فتوے حاصل کئے گئے۔ اُن کے خلاف الزام تراشی کے لئے مکہ کے مفتی کو آمادہ کر لیا گیا۔ ہندوستان میں شیعوں نے جہاد کی مخالفت کی۔ شمالی صوبے کے علمائے جہاد کو غیر ضروری ٹھہرایا۔ کلکتہ کے علماء نے اعلان کیا کہ ہندوستان دارالاسلام ہے جہاں بغاوت حرام ہے۔ کلکتہ کے محزون لٹریچر سوسائٹی نے بحث و مباحثے کے بعد ایک کتابچہ شائع کیا جس میں دلیلیں دے کر ثابت کیا گیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد حرام ہے۔ اس قسم کے سرکردہ مسلم علمائے جیسے جون پور کے مولوی کرامت علی اور کلکتہ کے مولوی عبداللطیف نے اس خیال کی حمایت کی۔

ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت شکست و ریخت کا شکار ہو گئی اور 1884ء کے بعد اُس کے متعلق کچھ سننے میں نہیں آیا حالانکہ اُس کے بعد بھی وہ سرحد میں مدت تک موجود رہے، لیکن سید احمد کی تحریک کی پچھونچیں قابل غور ہیں۔ اس نے ظاہر کر دیا کہ ملکا کی قیادت میں بے پایہ طبقات کی حمایت سے حکومت کے خلاف بغاوت کی تنظیم کی جاسکتی ہے اور پولیس کی نگرانی اور فوج کی احتیاطی تدابیر کے باوجود اُسے نصف صدی سے زیادہ موت تک پوری شدت کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے۔ بالآخر تحریک کی ناکامی نے ثابت کر دیا کہ مذہبی جوش، اعلیٰ و ارفع مقاصد، استقامت عزم، داوری، قربانی اور جاں نثاری کا جذبہ کتنا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ کافی نہیں ہے۔ بڑی سے بڑی تنظیمی سلامیت اور قابل لحاظ فوجی مہارت بھی اُس طاقت ور

سلطنت کا تختہ نہیں الٹ سکتی ہے جو قوم پرستی، سائنس اور ٹکنالوجی کی جدید سماجی قوتوں کی بنیاد پر قائم ہو۔ جن تصورات نے سید احمد اور اُن کے پیروؤں کو متاثر کیا وہ کئی طرح سے اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ وہ اُس طرز زندگی کی تجدید کرنا چاہتے تھے جو ساتویں صدی کے عربوں میں رائج تھی۔ انہوں نے تاریخ کے اسباق، اداروں کی اضافیت اور انسانی معاملات پر مکان و زمان کے اثر کو پوری طرح نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف اخلاق و مذہب کی بنیادی حقیقتوں کی مطلقیت پر زور دیا بلکہ اُن سماجی اور معاشی نظاموں، رسموں اور رواجوں پر بھی جو ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے جغرافیائی، معاشی، سماجی اور سیاسی حالات کو پوری طرح نظر انداز کرنے کا نتیجہ مایوسی اور ہزیمت کی شکل میں ظاہر ہونا لازمی تھا۔ سید احمد کی اس کوشش نے کہ سرحد کے قبائلی لوگوں پر قانون اور اخلاقیات کے متعلق اپنے تصورات تھوپیں انھیں ناراض کر دیا اور جہاد کو ہلاکت خیز جنگوں میں تبدیل کر دیا۔ سیاسی تشکیل نو کے پروگرام میں ہندوستانوں کی ایک بڑی اکثریت کو پوری طرح نظر انداز کرنے کی وجہ سے وہ سب سے کٹ کر رہ گئے جس کی بنا پر اُن کی ناکامی اُن کی کوششوں کا مقدر بن گئی۔

سید احمد کی تحریک ناکام ہو گئی لیکن اُس نے دور رس اثرات چھوڑے۔ اس نے ہندوستانی سانچ میں علیحدگی پسندی کے جذبہ کو تقویت دی۔ اس بات پر سید احمد کے اصرار کے نتیجے میں کہ تمام اُن رواجوں اور عادتوں کو ترک کر دینا چاہئے، چاہے وہ اچھی ہوں یا بری، اہم ہوں یا غیر اہم (بدعت حسنہ یا بدعت سوء) جو ہندوستان میں رہ کر ہندوؤں کے ساتھ میں میل ملاپ کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں، دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کا وسیع ہونا لازمی تھا۔ اس تحریک سے تصورات کی ایسی لہریں پھوٹیں جنہوں نے علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت پہنچائی۔

اس تحریک نے مسلمانوں میں احیا پسندی کے پرچار کو بڑھا دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے قسم کا واقعہ دیکھنے میں آیا۔ انگریزوں کے دہلی پر قبضے کے بعد اہل سیف اور تاجداروں کی سیاسی قیادت کا دور ختم ہو گیا اور دورِ اول اہل قلم اور مذہبی رہنماؤں کو اُن کے لئے۔ اس تبدیلی کے بعد سیاست پر مذہبی اعتقاد نے غلبہ حاصل کر لیا۔ پھر بھی سید احمد کی تحریک کی یاد نے مسلمانوں میں آزادی کی خواہش کو زندہ رکھا۔ اُس کے بعد انگریزوں کی حکومت کے خلاف کی جانے والی جدوجہد میں مولویوں کی حمایت شامل حال رہی مثلاً 1857ء کی بغاوت میں۔

XII- سپاہیوں کی بغاوتیں

دیکھ بے چینی اور مجروحہ مذہبی جذبات نے بدلتی حکومت کے خلاف نفرت میں اضافہ کر دیا۔ دیہی طبقوں یعنی کسانوں، زمینداروں، قبائلی سرداروں اور اُن کے متعلقین میں پھوٹنے والی شورشوں کی وجہ تحریک یہ تھیں۔ اُن ہندوستانی سپاہیوں پر بھی اُن کا اثر پڑا تھا جو کمپنی کی فوجوں میں ملازم تھے اور خود اپنے ہم وطنوں کی گردنوں پر غلامی کا جوار کھنے کی خاطر اپنے ماللوں کے لیے لڑتے تھے۔ یہ اثر اور بھی بڑھ گیا جب کمپنی کی فوج میں ملازمت کی شرائط مقابلہ بدتر ہو گئی۔

ہندوستانی سپاہیوں کی پہلی بغاوت 1764ء میں ہوئی جب پٹنہ میں میر قاسم کا مقابلہ کرنے والی فوج کی ایک پوری ٹیلیمن اپنی صفوں سے نکل کر نواب کی فوج میں شامل ہو گئی۔ لیکن انھیں کمپنی کے نمک حلاوت اور وفادار سپاہیوں نے ٹھیکر لیا اور اُس کے بعد اُن پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اُن میں پوہیس

کو توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔

1806ء میں دلیور میں ہونے والی بغاوت زیادہ اہم تھی۔ 1796ء میں ہونے والی فوج کی تنظیم نو نے برطانوی حکام کے حقوق میں اضافہ کر دیا لیکن ضبط و نظم کم ہو گیا۔ اُن میں کئی بخش کے نوادے استفادہ کرنے کی غرض سے ملازمت سے علیحدہ ہو گئے اور انگلستان واپس چلے گئے۔ فوج میں ایسے افسر رہ گئے جو سپاہیوں سے پوری طرح واقف نہیں تھے اور اپنی ٹیلیجوں سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔

1803ء تک نیپو سلطان (وفات 1799ء) اور مرہٹوں کے خلاف کبھی کی ہز جوش جنگوں کے نتیجے میں ہندوستان میں برطانوی اقتدار اعلیٰ قائم ہو چکا تھا۔ نئے جوش کے ساتھ حکام فوج کے حالات سدھارنے کی اسکیموں پر غور کر رہے تھے۔ انہوں نے طور طریق کے نئے ضابطے بنائے اور ردوی اور ڈال میں جدت پیدا کی۔ سپاہی کو داڑھی منڈوانے، ماتھے سے قشے کا نشان مٹانے اور کانوں سے دراتارنے اور صاف کے بجائے ایک گول ہیٹ پہننے کا حکم دیا جس کا اوپری حصہ مسلح تھا اور چڑے کا طرہ اور کھڑا ہوا پر لگا تھا۔ طرے کا چڑیا تو کندے سور کی کھال سے بنا تھا یا مقدس گائے کی۔

ان نئے طریقیوں نے جنہیں سپاہیوں کے احساسات کا خیال کئے بغیر نافذ کیا گیا تھا، اُن کے ذہنوں میں طرح طرح کے خطرات کو جنم دیا اور اُن کے شکوک میں اضافہ کر دیا۔ پرانی شکایتوں نے نئی شدت اور نئی وسعت پائی۔ انگریز حکام کی بد تمیزیوں پر زیادہ شکایت پیدا ہونے لگی، ہندوستانی حکام کی طرف انگریز سپاہیوں کے بدتمیزی کے رویے پر زیادہ غصہ آنے لگا، معمولی الفاظ اور اعمال میں زیادہ گہرے مضمرات نظر آنے لگے اور وطن سے دور رہ کر ملازمت کرنا زیادہ تکلیف دہ معلوم ہونے لگا۔ کرناٹک اور دکن پر بے چینی اور کشیدہ احساسات کے بادل منڈلانے لگے۔

بارود بچھاؤ چابکی تھی۔ اس میں آگ اس وقت لگی جب نیپو سلطان کے بیٹوں نے چنگاری پھینکی جو انگریزوں کی نگرانی میں دیور کے قلعے میں رہتے تھے۔ 1806ء کے مئی کے مہینے کے شروع میں ایک ٹیلیمن نے بغاوت کر دی۔ بغاوت فرو کر دی گئی اور ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے باغیوں کے سرغٹوں کے کوڑے مارے گئے۔ کچھ دن تک خاموش رہے اسکے بعد 10 جولائی کو طوفان پھٹ پڑا۔ آدھی رات کے وقت ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی، پہرہ داروں کو قتل کر دیا، اصل گارڈ کو موت کے گھاٹ اتار دیا، کچھ افسروں کو گولیوں سے اڑا دیا اور ”دین دین“ کے نعروں کے ساتھ دم دم پر میسور کا شیر کی دھاریوں والا بھنڈا پھیلا دیا۔ اُس کے بعد سپاہی نظم و ضبط کو بالکل بھول گئے۔ سرکش لوگوں کا ایک جم غفیر اُن سے آن ملا اور برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کا اصل مقصد قتل و غارت کے سیلاب میں ڈوب گیا۔

جب اس کی خبر آ رکٹ میں انگریزوں کو ملی تو ملک کی قیادت میں ایک فوجی دستہ قلعے کی طرف بڑھا۔ دیواروں پر فوجی چڑھ گئے، چھانک توڑ دئے گئے اور رسالہ قلعہ میں داخل ہو گیا۔ ہندوستانی سپاہی، جن کی حیثیت بد نظمی کے شکار ایک مجمع سے زیادہ نہیں تھی، تحفظ کی صلاحیت سے محروم تھے۔ انھیں گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ ڈالا گیا۔ کچھ دیواروں پر سے کود کر بھاگ گئے، بہت سوں نے ہتھیار ڈال دئے اور رہم کی درخواست کی۔ بغاوت کچل دی گئی۔ طوفان بھٹی تیزی کے ساتھ آیا تھا اتنی تیزی کے ساتھ کہ گزر گیا۔

دلیور کے حادثے کے کچھ ہی دنوں بعد بنگال کی فوج میں پائی جانے والی بے چینی نے 1824ء میں بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں بھی رجموں کے انتظامات میں کمی جانے والی تبدیلیوں اور افسران

بالا کے ہاتھوں میں اختیارات مرکوز کرنے کی بنا پر سپاہیوں اور اُن کے افسروں کے درمیان خلج پیدا ہو گئی تھی۔ برما کی جنگ کی ضرورتوں نے حکومت کو اس پر مجبور کر دیا کہ ہندوستانی سپاہی کے سپرد تکلیف دہ فرائض کرے۔ جس بات کو وہ مذہب اور اپنی سہولت کی بنیاد پر سب سے زیادہ ناپسند کرتا تھا وہ تھا ہندوستان کی سرحد سے گزرتا اور سمندر پار کرتا۔ ایک ایسے ملک میں لڑا اسے تاگوار تھا جہاں کی آب و ہوا مختلف تھی اور جہاں کے لوگ، زبان، نسل اور رسم و رواج تو اُس کے لئے بالکل اجنبی تھے۔

سوار برداری کے ذرائع کی کمی کی بنا پر جب سپاہی کو اپنا سامان لاد کر چلنا پڑا تو اُس نے کہاوت کے مطابق آخری خطرے کا کام کیا۔ 47 ویں نیو انفنٹری نے اُس وقت تک برما جانے سے انکار کر دیا جب تک اُن کے ہتھے مین سو فی صدی اضافے کا یقین نہ دلایا جائے۔ کمانڈر انچیف نے جو بڑا سخت گیر افسر تھا، بغاوت کو کچلنے کا پکارا وہ کر لیا۔ وہ یورپین رجمنٹ کے پریڈ گراؤنڈ پر طلب کیا اور محاذ جنگ کی طرف روانہ ہونے پابھیار ڈال دینے کا حکم انھیں دیا۔ سپاہیوں نے یہ کیا نہ وہ۔ اُس کے بعد اُن پر آگ برسنے لگی۔ جو بیچ گئے اُن پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور پھانسیاں دیدی گئیں۔ 47 ویں رجمنٹ کا نام فوج کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔

اُس کے بعد بنگال کی فوج کی دوسری ریمپوں میں بھی بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔ پہلی افغان جنگ کی بے پناہ تباہی نے انگریزوں کی عزت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ تیزی کے ساتھ انگریزوں کی گزرتی ہوئی حالت اور ملک سے اُن کے انخلا کی کہانیاں بازاروں میں گشت کرنے لگیں۔ سپاہی اُن احکام کی عمل کے لئے تیار نہیں تھے جن کو وہ غیر معقول سمجھتے تھے۔ بد قسمتی سے حکومت نے اس وقت انھیں ناراض کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سندھ کے امیروں کے ساتھ جنگ کے دوران انھیں تنخواہ کے علاوہ دگنا بہتہ دیا جاتا تھا۔ فتح کے بعد سندھ برطانوی علاقے کا حصہ بن گیا اور بدلیس میں عملی خدمت کے لئے دیا جانے والا بہتہ ختم کر دیا گیا۔ اس تخفیف نے سپاہیوں کو مشتعل کر دیا اور انہوں نے حکم عدولی کرنے کا فیصلہ کیا۔

فروری 1844ء میں فیروز پور میں مقیم 34 ویں رجمنٹ نے سندھ جانے سے انکار کر دیا۔ باغی سپاہیوں کو واپس لایا گیا اور سرخون کو سزا دی گئی۔ 64 ویں رجمنٹ کو نشان سے محروم اور 34 ویں کو خدمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ بنگال کے محافظ دستوں کی جگہ مدد اس اور بمبئی کے دستے مقرر کئے گئے۔ پھر بھی بنگال کی فوج کا ڈچلن بری طرح مجروح ہو چکا تھا۔

سندھ میں ہجرت والے شعلے ابھی پوری طرح بجھ بھی نہیں پائے تھے کہ بہار میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ پٹنہ جہاد کی تحریک کا مرکز رہ چکا تھا۔ اب مولوی فوج کے مسلمان سپاہیوں کو کھپتی کی ملازمت ترک کرنے اور جہاد میں شریک ہونے کی ترغیب دے رہے تھے۔ سکھوں سے ہونے والی جنگ کی غرض سے برطانوی فوجیں شرق کی چھاؤنیوں سے ہٹا کر شمال مغربی سرحد کے قریب جمع کی جا رہی تھیں۔

یہ خبر فوج میں پھیلانی گئی جس سے اُن کے اشتعال میں اضافہ ہو گیا۔ اُس کے بعد خفیہ نہ اُکرات ہوئے اور سپاہیوں کو اس امر کا یقین دلایا گیا کہ وہ کھپتی کی ملازمت اگر ترک کر دیں تو دہلی کا بادشاہ انھیں ملازمت رکھ لے گا۔ جو کچھ ہو رہا تھا اُس کی رپورٹ انگریز کمانڈنٹ آفیسر کو اور اُس کے ذریعے حکومت کو بھیجی گئی۔ طریموں پر مقدمہ چلایا گیا اور انہوں نے اپنی تائید بھی کی سزا پائی۔ بنگال کے گورنر نے ایک اعلان جاری کیا جس میں لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ حکومت کسی کے مذہب میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی

ہے۔ سکموں کے خلاف برطانوی فوجوں کی کامیابیوں نے اُن کے وقار کو بحال کر دیا اور اشتعال رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔

اُس کے بعد یہ منظر پنجاب میں نظر آیا جہاں سکموں کے خلاف جنگ میں بنگال کی فوج نے کارہائے نمایاں انجام دئے تھے۔ لیکن سپاہیوں کو اس بات نے بدل کر دیا تھا کہ فتح سے کسی قسم کا فائدہ ہونے کے بجائے اُنھیں حقیقت میں بھگتے کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ جن رجموں پر اس کا اثر پڑا تھا انہوں نے آپس میں مشورہ کیا، ایک چھاونی سے دوسری چھاونی کو پیغام بھجیے اور حکم عدولی کا فیصلہ کیا۔ راولپنڈی میں مقیم 22 دس رجمنٹ نے تنخواہ لینے سے انکار کر دیا اور وزیر آباد اور جہلم میں مقیم رجموں نے بھی اسی قسم کا رویہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ کمانڈر انچیف سر چارلس میپر نے علاقے کا دورہ کیا اور اُسے اس قسم کے ناقابل تردید ثبوت ملے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کئی رجموں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ جب تک تنخواہ میں اضافہ نہ کیا جائے وہ پنجاب میں اپنے فرائض ادا نہیں کریں گے۔ ہوا میں بغاوت کی بو تھی۔ شورش وزیر آباد میں شروع ہوئی اور اُس کے بعد گوئڈ گڑھ میں پھیل گئی جہاں 66 یو ایس رجمنٹ تھی۔ لیکن میپر کے فوری اور سنگ دلانہ اقدامات بغاوت کو فرد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بے چینی دور کرنے کی غرض سے بھتوں کے معاوضے کی اونچی سرع مقرر کی گئی اور گورکھوں کو بھرتی کیا گیا جنہوں نے وہ آہے کے برہمنوں کی جگہ لے لی۔

چنانچہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پہلی صدی میں بڑھتے ہوئے دکھوں اور تکلیفوں کا زمانہ تھا۔ پرانے حکمران طبقے محسوس کرتے تھے کہ اُن کی زندگی رنگ و نور سے محروم ہو گئی ہے۔ نمایاں کارناموں اور جرأت آمیز مہموں کے مواقع ختم ہو چکے تھے جن سے زندگی کی سرسبز عبارت تھیں۔ ہندوستان کے پیش نظر حقیقت میں ایک ادا اس منظر تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ملحقہ مکانوں میں رہتا تھا اور سردی سے ٹھنڈا کرتا تھا جب کہ اُس کے بدلیسی آقا مالک اُن گرم و کشادہ محلوں میں رہتے تھے جو خود اُس نے تعمیر کئے تھے۔ اُس کا حال غیر یقینی تھا اور مستقبل مشکوک اس لئے وہ اُن حاکموں کے سامنے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کرتا تھا اور چالپوسی سے کام لیتا تھا جو اُس کی قسمت کے مالک تھے۔ اُسے اُن پالیسیوں کی تشکیل میں حصہ لینے سے محروم کر دیا گیا تھا جو اُس کی تقدیر کا فیصلہ کرتی تھیں اور حکم اور اختیار کی حیثیت چھن جانے کی بنا پر وہ سیاسی طور سے حقیر اور اخلاقی اعتبار سے پست ثابت ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس سے پہلے کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جب وہ اس حد تک ذلیل و خوار ہوا ہو۔ اُس نے زنجیریں توڑنے کی بڑی کوششیں کیں۔ ان سو برسوں کی بغاوتیں اور شورشیں اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ وہ آزادی حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن اُس کی ناکامیوں نے اُس کی کوتاہیوں کو واضح کر دیا۔ الگ الگ کی جانے والی ایسی کوششوں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا جن کی وجہ تحریک سماجی خوشحالی اور عام بھلائی کے محدود و سطحی تصورات تھے۔ 1857ء کی بغاوت، جس کو ان کوششوں کا نقطہ عروج کہنا چاہئے، سطحی نظام کی آخری جدوجہد تھی۔ لیکن یہ پچھلی کوششوں سے مختلف تھی اس لیے کہ اس میں وہ تمام تحریکیں اور مقاصد شامل تھے جنہوں نے گزشتہ بغاوتوں اور شورشوں کو جنم دیا تھا اور قریب قریب پورے ہندوستان پر محیط تھی۔

دوسرا باب

1857 کی بغاوت

I۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی نوعیت

جس وقت ڈیہوڑی اپنے عہدے سے سبکدوش ہوا ہندوستان میں برطانوی حکومت اپنی فطری حدود کو پہنچ چکی تھی۔ مغرب سے مشرق کی طرف یہ دریا سندھ سے ایراودی تک پھیلی ہوئی تھی اور شمال سے جنوب کی طرف ہمالیہ سے بحر ہند تک فتح کئے ہوئے ان وسیع علاقوں میں برطانوی سامراجی اہلیت نے حکومت کا ایک ایسا انتظام بنایا جو دو مقاصد پورے کرتا تھا۔ ایک طرف تو اس نے مزاحیت سے نجات دلائی جو اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں پائی جاتی تھی، امن قائم کیا اور جان و مال کی حفاظت کا انتظام کیا اور ہندوستان کے لوگوں کے سیاسی اتحاد کے لئے سازگار حالات پیدا کئے۔ دوسری طرف انگریزوں نے ایک ایسی سلطنت پائی جس کی وسعت، دولت و وسائل بے مثال تھے اور جس نے ایک چھوٹے سے جزیرے تک محدود برطانوی سلطنت کو دنیا کی قیادت کا منصب عطا کر دیا۔ اُس مہم کو جو سولہویں صدی میں دولت اور طاقت حاصل کرنے کی غرض سے تجارتی جذبے کے تحت شروع کی گئی تھی اتنی بڑی کامیابی نصیب ہوئی جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔

اس غیر معمولی واقعے کے تین مرحلے تھے۔ پہلے مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیاں تجارت تک محدود تھیں۔ دوسرے مرحلے میں کمپنی نے دوسرے یورپی رقیبوں کے ساتھ جنگیں کیں، تجارت میں اپنی اجارہ داری قائم کی اور ہندوستان میں سیاسی اثر حاصل کیا۔

تیسرے مرحلے میں جو جنگ پلائی سے شروع ہوتا ہے کمپنی نے تجارت کے ساتھ فتوحات بھی شروع کر دیں اور دونوں میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اُس نے ایک وسیع علاقہ حاصل کر لیا جو قدرتی وسائل سے مالا مال تھا اور جہاں صابرو شا کر محنتی اور فرماں بردار کسانوں اور دست کاروں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ بنگال سے ہونے والی آمدنی نے نہ صرف مزید فتوحات کے لئے ساز و سامان مہیا کیا بلکہ منافع بخش بدیسی تجارت میں لگانے کے لیے نقد سرمایہ سے اور کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے بڑے حصے پر تسلط جمالیا۔

جب کمپنی اپنے تجارتی موقف سے دست بردار ہوئی تو تجارت سے منافع حاصل کرنے کا حق سب انگریزوں کو دیدیا گیا۔ لیکن کمپنی نے علاقوں کی مزید توسیع سے اپنے نقصان کی تلافی کر لی۔ اس پوری کی پوری طویل مدت میں یورپی طاقتوں کے ساتھ تصادم اور فضول خرچ اور کمزور ہندوستانی حُکمرانوں کے ساتھ جنگوں میں منافع کا جذبہ ایک اہم عنصر رہا ہے۔ اس کے علاوہ نئے علاقوں میں بڑی کشش تھی۔ یہ واقعہ کہ آسانی سے انہیں حاصل کیا جاسکتا تھا، ہندوستان کے مزید شاداب علاقوں کو سلطنت میں شامل کرنے کے لیے وجہ تحریک بن گیا تھا۔ لیکن آمدنی میں اضافہ کی خواہش کے ساتھ جزیرہ کی خواہش بھی تھی جو کبھی اعتقادِ حدوں تک پہنچ جاتی تھی۔

لارڈ مینٹلو، ایلن برو اور ڈلہوزی کی چار حانہ جنگیں، ہندوستانی حکمرانوں کی بدانتظامی کو بھانہ بنا کر کئے جانے والے الحاقات اور دلی مہدوں کو گود لینے کے طریقے کو تسلیم نہ کر کے علاقوں پر عمل دخل حاصل کرتا۔ ان سب کے پیچھے علاقے حاصل کرنے کی خواہش کا فرما تھی۔ ڈزرائیلی نے تسلیم کیا تھا کہ انگریزوں کی پالیسی ہے ”اپنے علاقے کی توسیع کر کے سلطنت کی آمدنی بڑھانا“ (1)۔ میکاف نے ان لفظوں میں پالیسی کی تشریح کی تھی ”جن خطرات کا ہمیں اس وقت سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن سے زیادہ خطرات میں ہمیں ڈالے بغیر ہندوستان کے وسط میں جو بھی علاقہ حاصل کیا جائے گا وہ اُس سرحد کی لمبائی کو کم کر دیگا جس کی ہمیں حفاظت کرنی پڑتی ہے یا قریب قریب بنگال کی فوجوں کے دوسری پر لسیوں کی فوجوں کے ساتھ روابط کو کم کر دیگا یا فوجوں کی تنخواہیں دینے کے لئے مزید آمدنی میا کر دیگا۔ اس لئے علاقہ میں اضافے کو بُرا سمجھ کر اُس سے بچنے کے بجائے جہاں کہیں بھی وہ جائز طور سے حاصل کیا جاسکتا ہو ہمیں اُسے تحفظ اور طاقت کے ایک ذریعہ کے طور پر حاصل کرنا چاہئے“۔ (2) ڈلہوزی نے جو ”زرائل ہونے“ کی پالیسی کا مہمار اعظم تھا، خود 30 اگست 1848ء کو لکھا تھا ”میرے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص اس پالیسی سے اختلاف کر سکے کہ ہمیں اُن ریاستوں پر قبضہ کر کے جن کا حق زائل ہو جائے اپنے علاقوں کے استحکام کی غرض سے ہر جائز موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس طرح اُن چھوٹی چھوٹی درمیانی ریاستوں سے ہمارا پیچھا کٹ جائے گا۔ جو تاگواری کا ذریعہ بنائی جاسکتی ہیں۔“ (3) چنانچہ اُس نے ”اس اصول کا اعلان کیا کہ جب بھی موقع ملے ایسی حکمرانوں کو ختم کر دیا جائے“۔ (4)

الحاق کو جائز قرار دینے کے لئے انگریزوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی ناقابل برداشت بددیانتی اور بدانتظامی اور پکچے ہوئے عام لوگوں کے انتہائی دکھوں اور تکلیفوں کی بنیاد پر خود کو مطمئن کر لیا۔ لیکن حقیقت برتاؤ شلوہ کے جوشیے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ ”ہر انگریز کچھ مافوق الفطرت طاقت لیکر پیدا ہوتا ہے جو اُس کو دنیا کا آقا بنا دیتی ہے۔ جب وہ کسی چیز کا خواہش مند ہوتا ہے تو وہ خود سے کبھی نہیں کہتا ہے کہ وہ اُس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اُس وقت تک انتظار کرتا ہے جب تک، نجانے کیسے، اُس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ نہ جائے کہ مطلوبہ شے جن لوگوں کے پاس ہے اُن کو فتح کرنا اُس کا اخلاقی اور مذہبی فرض ہے۔ اُس کے لیے وہ ناقابل مزاحمت ہو جاتا ہے۔ طبقہ اشراف کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز کو پسند کرتا ہے اُسے پھین لیتا ہے۔ ایک دکاندار کی طرح وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اُس محنت اور ثابت قدمی سے کام کرتا ہے جو کلنڈ بنی اوزان اور اخلاقی ذمہ داری کے گہرے جذبے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اُسے موثر اخلاقی رویے کی تلاش میں کبھی کوئی دقت نہیں ہوتی ہے۔ کوئی کام نہ اتنا برا ہے نہ اتنا اچھا کہ انگریز اُسے نہ کر سکے۔ لیکن انگریز کبھی غلطی پر نہیں ہو گا۔ وہ آپ سے لڑتا ہے تو جب الوطنی کے اصولوں کے مطابق، وہ آپ کی چوری کرتا ہے تو تجارتی اصولوں کے مطابق، وہ آپ کو محکوم بناتا ہے تو سامراجی

(1) ایلن آف کازنز میں ڈزرائیلی کی تقریر جو 27 جولائی 1857ء کی انگریز پریس میں شائع ہوئی CXLVII کالم 44

(2) کے۔ جے۔ ڈیلو Life & correspondence of Charles, Lord Metcalfe (London, 1854) صفحہ 446۔

(3) دیکھئے کے اور مینٹن (Longmans, 1897) History of the Indian Matiny (جلد 1، صفحہ 53)۔

(4) سر پارلس وڈ کا خط لارڈ مینٹلو کے نام، 17 اکتوبر 1862ء (India office library-MS. Vol XI)۔

اصولوں کے مطابق، وہ آپ کو پریشان کرتا ہے تو سردا لگی کے اصولوں کے مطابق۔ وہ دہلاواری کے اصولوں کے مطابق اپنے بادشاہ کا سر کاٹ لیتا ہے۔ اُس کا نعرہ ہے فرض شناسی اور وہ یہ بات کہی نہیں بھولتا ہے کہ جو قوم اپنے فرض کو اپنے مفاد کے خلاف بن جانے دیتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔“ (1)

الحالات کی بنا پر کمپنی کی آمدنی تو بڑھ گئی لیکن جلد ہی اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا اور ڈائریکٹر اپنے منافعوں کے لئے تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ اس لئے انہوں نے کفایت شعاری سے کام لینے کا حکم جاری کیا۔ کفایت شعاری سے کام لیتے وقت نتائج پر توجہ نہیں دی گئی۔ ان اقدامات میں دیسی حکمرانوں کو دی جانے والی پیشگوئی کی تشخیص یا تخفیف بھی شامل تھی۔ اس کی واضح مثالیں تھیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوہ ملکہ رانی جنہن کور کی بیٹھن 15,000 پاونڈ سے کھھا کر 12,000 پاونڈ کر دی گئی، پیشوا باجی راولدوم کے پسر متقی ناتا صاحب کی بیٹھن منسوخت کر دی گئی، جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی بیٹھن بند کر دی گئی اور کرناٹک اور تنجور کے اخراجات میں کمی اور حکومت کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے قدیم خاندانوں کی جاگیریں اور انوم چھین لئے گئے جنہوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی خدمات انجام دی تھیں۔

سلمی بہبود کے کاموں میں بھی کفایت شعاری برتی گئی۔ 1813ء میں تعلیم کے لئے 10,000 پاونڈ کی حقیر رقم منظور کی گئی تھی۔ لیکن صحت عامہ طبی سہولت، قحط کے دوران راحت پہنچانے اور اس قسم کے دوسرے کاموں کے لئے کوئی رقم منظور نہیں کی گئی تھی۔ تعلیم کے لئے جو رقم منظور کی گئی تھی وہ بھی کئی سال تک خرچ نہ کی جاسکی۔

لیکن کفایت شعاری کی بدتر مثال قسطنطنیہ فوجی اخراجات میں کمی۔ ہندوستانی سپاہیوں کی مدد سے ہندوستان فتح کیا گیا تھا اور امن و امان بحال رکھنے کی ذمہ داری بڑی حد تک ہندوستانی فوجوں پر تھی۔ ہندوستانی سپاہی ایران، افغانستان، سندھ اور برامیں لڑ چکے تھے اور کریمپاں لڑنے کے لئے انھیں بھیجنے کی تجویز پر بھی غور کیا گیا تھا۔ ہر میدان جنگ میں دھاپنی دہلاواری، بہلاواری اور ضبط و نظم کا افراتفرات پیش کر چکے تھے۔ وہ نمک حلال تھے، آٹھوں کے دہلاوے تھے اور افسروں کے جاں نثار تھے۔ لیکن کمپنی کی نظروں میں ان کی سب سے بڑی خوبی تھی کم تنخواہیں اور روپے کی لالچ میں بھرتی ہونا۔ اسلئے ان کی طرف سے کوئی سیاسی خطرہ نہیں تھا۔

ایک ہندوستانی سپاہی پر جو رقم خرچ کی جاتی تھی وہ برطانوی سپاہی پر خرچ کی جانے والی رقم کا ایک تہائی حصہ تھی۔ اس کفایت شعاری کا نتیجہ تھا کہ 1856ء میں مجموعی اہتیار سے کمپنی کی تقریباً تین لاکھ فوج میں صرف 24 رائل رجمنٹیں تھیں جو مجموعی اعتبار سے 23,000 سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔ اور اتنی ہی تعداد میں یورپوں کو ہندوستان میں بھرتی کیا گیا تھا۔ (2) ظاہر ہے کہ یہ بڑے جو حکم کی بات تھی۔ برطانوی مدبرین دہری مشکل میں تھے یعنی سلطنت کی حفاظت و توسیع کے لئے ایک بڑی فوج کی موجودگی اور صحت مند عوامی مالیات اور تجارتی منافع اور لاگت کے دعوؤں میں مطابقت کیسے پیدا کی جائے۔ مختلف گورنر جنرل کبھی ایک راستہ اختیار کرتے تھے اور کبھی دوسرا۔ دونوں صورتوں میں کفایت شعاری کا خیال فیصلہ کن عنصر ہوتا تھا۔ حکومت کے سول شعبہ میں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ انگریز حکام کی تعداد کم تھی۔ لیکن وہ

(1) شاہ، برہادیشی The Man of Destiny (1929ء، ایڈیشن)، صفحات 201، 200

(2) ہوکس۔ ٹی۔ رائس، A History of Indian Mutiny (London, 1888) صفحہ 62

اختیار، رہنمائی اور نگرانی کے تمام عہدوں پر فائز تھے۔ اُن کی تنخواہیں دنیا میں سب سے زیادہ تھیں۔ وہ ہندوستانی ماتحتوں کی ایک بڑی فوج کے ذریعے کام کرتے تھے جن کی تنخواہیں بہت کم تھیں اور جن کے عہدوں پر کم حیثیتی کی چھاپ لگی تھی۔

ایسی سلطنت جس کے غالب مفادات معاشی ہوں تاریخ کے لئے کوئی نیا واقعہ نہیں تھی۔ لیکن انگریز اپنے کو انتہا پاک باز سمجھتے تھے اور اپنی نام نہاد پاکبازی کی بنا پر اتنے مطمئن تھے کہ انہوں نے سلطنت کے انسانی مضمرات پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن میں سے کچھ ہندوستان کے تعلق سے حکومتی خود اختیاری کی دور افتادہ منزل کی بات کرتے تھے لیکن دوسری تک ہندوستان سے رہنے والے رشتے کے دور اُن میں سے زیادہ تر کے اعمال و افعال سے اُس منزل تک پہنچنے کی خواہش کا اظہار بہت کم ہوا۔ اُن میں سے کچھ اس غیر فطری صورت حال سے پریشان ضرور تھے لیکن وہ بھی برطانوی حکومت کے غیر محدود تسلسل کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچ سکتے تھے۔

طوفان سے پہلے کی خاموشی

جب دہلی کی مدت کا ختم ہوئی تو اس کی جگہ لینے کے لیے کیننگ کا انتخاب کیا گیا وہ اول درجے کا کلاسیکی عالم تھا اور اس نے برطانوی سردار کرٹسلس کے متعلق جو رد من سلطنت کی عظمت و جلال سے ٹکرایا تھا، اعلیٰ میں ایک نظم لکھ کر آکسفورڈ میں انعام حاصل کیا تھا۔ اس کے اعزاز میں کمپنی کے ڈائریکٹروں نے الوداعی دعوت کی تھی اس میں جام صحت کا جواب دیتے ہوئے اس نے عجیب و غریب تقریر کی جو اُن اُنکھوں اور پریشانیوں کی آئینہ دہی کرتی ہے جو اُس زمانے میں انگلستان کے حکمران طبقے میں پائی جاتی تھیں۔ اُس نے حسب دستور ایک ایسے خود اعتماد گورنر جنرل کی طرح تقریر شروع کی جس کے جذبات کو اُس منظر نے براہِ روزہ کر دیا تھا جس کی مثال دنیا میں کوئی تدخیش پیش نہیں کر سکتی یعنی ”ذیہ سولین لوگ پر امن انداز میں اور دلجمعی کے ساتھ، ایک ایسے ملک میں جو دولت سے بھرا ہوا ہے، بدلیسیوں اور اجنبیوں کی حکومت کی اطاعت کرتے ہیں۔“ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھا اس کے دل میں شک و شبہ پیدا ہونے لگا۔ ایسا لگا کہ خود اعتمادی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا اور بات کرنے میں احتیاط سے کام لینے لگا۔ اس نے کہا مجھے معلوم نہیں کہ حالات کیا شکل اختیار کریں گے۔ مجھے امید ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ہمیں جنگ کی آخری منزل تک نہ جانا پڑے۔“ اُس کے بعد اس نے سنجیدگی کے ساتھ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا ”ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہندوستان کے مطلع پر، جو ابھی صاف ہے، ہلکا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ سکتا ہے جو شروع میں انسان کے باشندے سے بڑا نہ ہو لیکن برابر بڑھتا جائے اور بالآخر اُس کے پھٹ پڑنے اور ہمیں تباہی سے دوچار کر دینے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔“ آخر میں اُس نے دھمکی دی مگر اپنی کوششوں کے باوجود بدلے لئے ضرب لگانا ضروری ہو گیا تو ہمسائی ضحیر کے ساتھ ضرب لگائیں گے۔ اس قسم کی ضربوں کی صورت میں جدوجہد کم مدت میں ختم ہو جائے گی اور اُس کے نتیجے کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔“ (1)

کون جانے کہ ہندوستان کے متعلق دستاویزات کا مطالعہ کرتے وقت کیننگ نے سلطنت کی نوعیت پر غور بھی کیا اور اُسے یہ خیال بھی آیا کہ ہندوستان کی سلطنت کا مقابلہ اُن دو سلطنتوں سے کر لے جنہوں نے انگلستان کو غلامی کی زنجیروں سے جکڑ دیا تھا یعنی رومن سلطنت جو ایسی حکومت کی نمائندگی کرتی تھی جس نے وطن سے دور کے علاقوں پر اپنا تسلط برپا کیا تھا اور نارمن حکومت جس کے فاتحین نے مفتوحہ علاقوں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

سلطنتوں کا حشر کیا ہوا اس کے متعلق کیننگ کے خیالات کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے لیکن ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ ہندوستان میں پائی جانے والی عام بے چینی سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ کوئی بری شکل اختیار کر سکتی ہے۔ جو خطرناک صورتحال ہندوستان میں پیدا ہو رہی تھی وہ سلطنت کی نوعیت کا لازمی نتیجہ تھی۔ حالات مختلف ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں انگریز اگرچہ وہ سب نہیں کر سکتے تھے جو انگلستان میں نارمنوں نے کیا پھر بھی شہنشاہی روم کے نقش قدم پر تو چل ہی سکتے تھے اور ہندوستان کو ایک ایسی دو دھارو گائے سمجھنے کے بجائے جس کو انگلستان کے مفاد میں استعمال کیا جائے، وہاں کے لوگوں کی معاشی اور سیاسی ضرورتوں پر تو غور کر سکتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا جس کے نتیجے میں 1857ء کے موسم گرما میں انہیں نفرت اور عداوت کی افسوسناک فصل کاٹی پڑی۔

II شورش کی نوعیت

برطانوی مورخین کے مطابق 1857ء کی شورش غدر تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا اس زمانے کی حکومت کی طرف سے ہوئی۔ اس زمانے کے سکرٹری آف اسٹیٹ لارل اسٹینسلی نے 1857ء کے واقعات کی رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرتے ہوئے ”غدر“ کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ اس موضوع پر لکھنے والے زیادہ تر مصنفین نے اس کی پیروی کی۔ چنانچہ چارلس ہال، جی۔ ڈبلیو۔ فاسٹ، ٹی۔ آر۔ ہولس، ایم۔ اے۔ جے۔ ڈبلیو۔ کے، جی۔ این۔ میک من، جی۔ بی۔ بلن، سی۔ بی۔ ٹکف، ول رابرٹس اور دوسرے لکھنے والوں نے اس شورش کے لئے ”غدر“ کی اصطلاح استعمال کی۔

بہر حال یہ اصطلاح گمراہ کن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس بغاوت میں فوج بڑے پیمانے پر شامل تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کی تحریک بنگال کی فوج کی طرف سے ہوئی حالانکہ دوسرے صوبوں کی کچھ اور جموں میں بھی بے چینی پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کی ابتدا فوج تک محدود نہیں تھی۔ نہ یہ عام اصطلاحی معنوں میں غدر تھا یعنی مسلحہ آداب سے روگردانی اور آئینی ارکان اختیار کی حکم عدولی۔ اس کی وجہ ان اسباب سے زیادہ گہری تھیں۔ جو عام طور سے فوجی ڈسپلن توڑنے کے واقعات کی تہہ میں پائے جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ذرا گلی نے اس شورش کی اصل نوعیت کا سمجھ لیا تھا۔ ہاؤس آف کامنز میں 27 جولائی 1857ء کو تقریر کرتے ہوئے اس نے حکومت کی رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ تحریک ”فوجی غدر“ کے بجائے ایک ”قومی بغاوت“ ہے۔ (1) پھر اگلے میری میں

30) ستمبر 1857 کو تقریر کرتے ہوئے اس نے زور دیکر کہا ”میرا خیال ہے کہ اب یہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں رونما ہونے والی افسوسناک اور غیر معمولی تحریکات کی جو توضیح ابتدا میں کی گئی تھی۔ وہ واقعات کے مطابق نہیں تھی۔ روز بروز یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ جس کو ابتدا میں ایک چھوٹا سا اتفاقی واقعہ بتایا گیا تھا وہ حقیقت میں اُن عظیم حالات میں سے ایک ہے جو انسانی تاریخ کا ایک دور تشکیل کرتے ہیں اور جن کی توجیہ کرنے کے لئے مدبروں اور قوموں کی انتہائی گہری توجہ درکار ہوتی ہے۔“ (1)

ایلیٹین بروئے، جو 1858ء میں بورڈ آف کنٹرول کا صدر مقرر ہوا تھا، لارڈ کیننگ کے اس اعلان پر تنقید کرتے ہوئے، جس کی رو سے اودھ کی تحفظداریاں ضبط کر لی گئی تھیں، لکھا تھا ”ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا چاہئے کہ وہاں پائے جانے والے حالات کے پیش نظر اودھ میں جو جارحانہ کاروائیاں ہوئیں اُن کو غدر کے بجائے ایک جائز جنگ سمجھا جانا چاہئے۔“ (2)

جسٹس میک گارگھی نے اس موضوع کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھا تھا ”واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عظیم جزیرہ نما کے شمال اور شمال مغرب میں انگریزی حکومت کے خلاف دیسی نسلوں نے بغاوت کی تھی۔ اس کو کسی طرح بھی محض فوجی غدر سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف یہ فوجی شکایتوں، قوی نفرت اور مذہبی تعصب کا ایک مشترکہ محاذ تھا۔ اس میں دیسی حکمران بھی شامل تھے اور دیسی سپاہی بھی عیسائیوں کے خلاف متحد ہونے کے لئے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے قدیم مذہبی اختلافات کو بھلا دیا تھا۔“ (3)

چارلس بال نے مندرجہ ذیل الفاظ میں رونما ہونے والے واقعات کا ذکر کیا ہے ”بالآخر حداد اکندوں سے گزر گیا اور ہندوستان کی انتظامی سرزمین پر پھیل گیا۔ اس کے بعد یہ تو قیہ تھی کہ موچیں تمام یورپی عناصر کو غرقاب اور تباہ کر دیں گی اور یہ کہ بغاوت کا حداد جب ایک دفعہ پھر کنڈاروں کی آغوش میں سمائے گا۔ تو بدیسی حکمرانوں کی محکومی ہے آزادی حاصل کر کے حریت پسند ہندوستان محض کسی آزادی دیسی حکمران کے سامنے اپنا سر جھکائے گا۔ اب اس تحریک نے زیادہ اہم صورت اختیار کر لی تھی۔ اور وہ تمام لوگوں کی بغاوت بن گئی تھی۔“ (4)

دو آزادی فرامشی مصنفین کی رائے تھی ”ہندوستان میں قتل عام کا لمحہ قریب آتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے تمام طبقات میں بے چینی پھیل چکی ہے۔ وہ سپاہیوں کا ساتھ دیں گے۔“ (5)

بہادر شاہ کے مقدمے کی پیروی کرنے والا جج ایڈوکیٹ جنرل ہریٹ-مجر ساعت کے وقت پیش کی جانے والی دستاویزات کے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا ”ابتداء سے یہ سازش سپاہیوں تک محدود نہیں تھی۔ اس کو جنم بھی سپاہیوں نے نہیں دیا بلکہ اس کی شاخیں محل اور شہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔“ (6)

(1) بال سی، The history of India Multiny (London) جلد 11 صفحہ 418

(2) Secret committee of the court of direction to governer general 19 اپریل 1858ء

(3) میک گارگھی، شش، 1883 (London) Ashort History of our own times صفحہ 644

(4) بال، محلہ بالا، جلد 1 صفحہ 644

(5) Tonvielle et Legant, l' insurrection de l inde (5) (مہدی سن، بہادر دوم (دہلی) 1958ء، متحدہ، صفحہ 1)

(6) Proceedings of the trical of Bahadur Shah (Calcutta, 1899) صفحہ 145

ونسف استعجہ کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ”سول آبادی میں بے چینی اور بے امنی بڑے پیمانے پر پائی جاتی تھی اور کئی مقامات پر وہاں مقیم سپاہیوں کی بغاوت سے پہلے لوگوں نے بغاوت کر دی۔“ (1)

کینگ نے بھی اُس وقت اپنی رائے بدل دی جب اُس نے سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو لکھا کہ اُسے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ”بغاوت“ کے لئے اشتعال ”مذہبی بنیادوں پر برہمنوں نے اور سیاسی وجوہ کی بنا پر دوسروں نے دی“ اور اینڈ ملیسن کے مطابق ”اُس نے جلد ہی غدر کی بات کرنا چھوڑ دی اور اسے بغاوت سے تعبیر کرنے لگا۔“ (2)

چنانچہ یہ تو مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ 1857ء کے واقعات کو ”غدر“ سے تعبیر کیا جائے لیکن کیا انہیں ”قومی جنگ آزادی“ کہا جاسکتا ہے؟

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا محرک کوئی قومیت کا جذبہ نہیں تھا اس لیے کہ 1857ء میں ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے ایک قوم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا لیکن دونوں فرقوں کے قائدوں اور اُن کے ساتھیوں نے ایک مشترک بلور وطن کی وفاداری کے بجائے ذاتی وفاداریوں سے تحریک پائی۔ اس کے باوجود 1857ء کی شورش ہندوستان کو بدیسوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جنگ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدیسوں نے عسکری طبقے کے وفد اور عزت نفس کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ یہ وہ طبقہ تھا جو ایک زمانے میں سلطی اثر رکھتا تھا اور نظم و نسق کا بوجھ اٹھا چکا تھا۔ بدیسوں نے مل گزری کی ظالمانہ پالیسی کی بنا پر اور ان معاشی اقدامات کی بنا پر، جن کی وجہ سے فنون اور دست کاریاں تباہ ہو گئی تھیں، عام لوگوں کو بھی اپنا مخالف بنا لیا تھا۔

آگرہ کے کشن ہاڈلے نے 17 نومبر 1857ء کو لکھا تھا اس بغاوت کی ابتدا محض مسلمانوں کی طرف سے ہوئی نہ صرف ہندوؤں کی۔ اس کو جلدی بھی کسی ایک فرقے نے نہیں رکھا۔ اس قسم کے اسباب ہمیشہ پائے جاتے تھے جو اس کی توضیح کے لیے کافی ہیں۔ حالات اور مواقع اور پرفریب کذب و اختراے مسلمانوں کو شورش پر آمادہ کیا تاکہ وہ اُس کا بدلہ لے سکیں جسے اُن کے مذہب کی توہین سے تعبیر کیا گیا تھا۔ ایک پراسرار ہندو پیش گوئی نے، جسے بڑے پیمانے پر پھیلا گیا، اُس مذہب کے غیر مطمئن پیروؤں کو ہونے والے غدر اور بغاوت میں حصہ لینے پر آمادہ کر دیا۔“ (3)

نردین کی شہادت بھی دیکھئے اُس نے کہا ہے ”بڑے ہوں یا چھوٹے، دولت مند ہوں یا غریب اُن میں سے ہر ایک محض اپنے سیاسی حالات کو سدھارتا چاہتا تھا۔ سماج بالائی طبقے میں اپنی پہلی سی اہمیت دوبارہ حاصل کرنے کی امید پر زندہ تھے۔ نچلے طبقے اس امید پر زندہ تھے کہ دیسی حکومت کے دوبارہ قیام کے بعد دولت و عزت کے راستے اُن پر ایک دفعہ پھر کھل جائیں گے۔“ (4)

فی الجملہ 1857ء کی بغاوت زوال کے سلسلے کو روکنے اور کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش تھی جسے عہد وسطی کے نظام کی آخری کوشش کہنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نظام

(1) Oxford History of India (1920ء کا ایڈیشن)، صفحہ 722

(2) کے اینڈ ملیسن، نو ر ہالا، جلد 4، صفحات 452-453

(3) Narrative of Events attending the out track of disturbance

Agra district in 1857-58، صفحہ 3

(4) نروڈ لین، On Education of the people fo India، صفحہ 199

زوال پذیر تھا۔ بہر حال یہ اپنی سیاسی تنظیم کی قوت کو بحال رکھنے اور بیرونی حملوں کے سیلاب کو روکنے میں ناکام رہا تھا حالانکہ انیسویں صدی کے وسط تک پریسڈنسی شہروں کے باہر اس کی عزت و وقار میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ مغربی اقتدار کے زیر اثر ہندوستان کے سماجی نظام میں کوئی بڑی تبدیلی ابھی تک نہیں آئی تھی اور بالائی طبقوں کو ابھی تک لوگوں کے قائد اور ہندوستان کے مفادات کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔

1857ء کی بغاوت مسلمانوں اور ہندوؤں کے روایتی اشراف کی عام تحریک تھی یعنی حکمرانوں، زمینداروں، سپاہیوں، عالموں اور چنڈتوں اور مولویوں کی تحریک۔ باغیوں کی اصل جماعت مندرجہ ذیل پر مشتمل تھی۔ دہلی کا شہنشاہ، اودھ کا بادشاہ، کچھ نواب اور راجہ، تعلقدار اور زمیندار، سپاہی جن میں بھان، مغل، راجپوت اور شمالی ہندوستان کے برہمن شامل تھے اور مولوی جو اس نظام کے جڑ تھے۔ باغیوں میں مختلف طبقات کی نمائندگی کی تحریک کے جغرافیائی کردار کو ظاہر کرتی ہے اور شرکاء کے مقاصد پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظام سے تعلق رکھنے والے قریب قریب سبھی لوگ غیر مطمئن تھے حالانکہ ان میں سے کچھ نے اپنے خصوصی حالات کی بنا پر اس میں عملی حصہ لینے سے گریز کیا۔

سردار اور زمیندار باغیوں کی جماعت کے سرغنہ تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی باضابطہ اور بے ضابطہ فوجوں اور حکمرانوں کے مسلح سپاہیوں، ماتحتوں، کسانوں اور ملازموں پر مشتمل تھی۔ ان کی روایتیں بھی مشترک تھیں اور شکایتیں بھی۔ وہ دکھوں میں ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے تھے۔ حکمرانوں کے علاقے اور سیاسی طاقت چھین جانے کا اثر ان پر پڑا تھا۔ اگر بالائی طبقوں سے حق فرماں روائی چھین لیا گیا تھا یعنی ان کی ریاستیں، فوجی کمانداری اور سول وقار تو دوسروں سے روزگار کے ذریعے اور اثر اور مالی منفعت کی جھپٹیں چھین گئی تھیں۔ صاحب علم یعنی عالم، مذہبی پیشوا اور شاعر اور دستکار اہل ہنر سرپرستی سے محروم ہو گئے تھے۔ بہت سے وہ لوگ بے روزگار ہو گئے تھے جن کا آبائی پیشہ تھا پہ گری اور ان میں بہت سوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں میں شامل ہونا پڑا تھا۔

اس تحریک کے قائدوں نے برطانوی حکومت کے خلاف جو فرد جرم تیلہ کی تھی وہ اس کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بہار شہ نے 25 اگست 1857ء کو شائع ہونے والے منشور میں کہا تھا "یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے لوگ، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، کافر اور ریاکار انگریزوں کے مظالم اور جبر کی بنا پر جلا ہو رہے ہیں۔" اس کے بعد اس نے پانچ اصل الزامات کی وضاحت اس طرح کی۔ (1)

1۔ زمینداروں کے تعلق سے اس نے یہ الزام لگائے۔ ان پر بڑی بڑی جمع (زمین کی مالکداری) تنصیص کی جاتی ہے، بھلا مال تیزی وصول کرنے کے لئے ان کی جائیداد کو نیا نام پر چڑھا کے ان کی بے عزتی کی جاتی ہے، مذہبی مقدمے بڑی سے انہیں جلا کیا جاتا ہے جس میں اسٹامپ کورٹ فیس اور سماعت میں ہونے والی دیر کی بنا پر بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

II۔ تاجروں کے تعلق سے اس نے کافر اور ریاکار برطانوی حکومت پر الزام لگایا تھا کہ تمام اچھی اور بیش قیمت اشیاء مثلاً تیل، کپڑا اور جہازوں کے ذریعے بھیجی جانے والی دوسری چیزوں کی تجارت میں اجارہ

(1) یہ دو مشہور اشتہار ہے جو پہلے اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ اس نے بعد فقیر طور سے دہلی تخت مارتہ 29 ستمبر 1857ء میں شائع کیا کرتا تھا۔ 11۔ 12۔ 13۔ 14۔ 15۔ 16۔ 17۔ 18۔ 19۔ 20۔ 21۔ 22۔ 23۔ 24۔ 25۔ 26۔ 27۔ 28۔ 29۔ 30۔ 31۔ 32۔ 33۔ 34۔ 35۔ 36۔ 37۔ 38۔ 39۔ 40۔ 41۔ 42۔ 43۔ 44۔ 45۔ 46۔ 47۔ 48۔ 49۔ 50۔ 51۔ 52۔ 53۔ 54۔ 55۔ 56۔ 57۔ 58۔ 59۔ 60۔ 61۔ 62۔ 63۔ 64۔ 65۔ 66۔ 67۔ 68۔ 69۔ 70۔ 71۔ 72۔ 73۔ 74۔ 75۔ 76۔ 77۔ 78۔ 79۔ 80۔ 81۔ 82۔ 83۔ 84۔ 85۔ 86۔ 87۔ 88۔ 89۔ 90۔ 91۔ 92۔ 93۔ 94۔ 95۔ 96۔ 97۔ 98۔ 99۔ 100۔ 101۔ 102۔ 103۔ 104۔ 105۔ 106۔ 107۔ 108۔ 109۔ 110۔ 111۔ 112۔ 113۔ 114۔ 115۔ 116۔ 117۔ 118۔ 119۔ 120۔ 121۔ 122۔ 123۔ 124۔ 125۔ 126۔ 127۔ 128۔ 129۔ 130۔ 131۔ 132۔ 133۔ 134۔ 135۔ 136۔ 137۔ 138۔ 139۔ 140۔ 141۔ 142۔ 143۔ 144۔ 145۔ 146۔ 147۔ 148۔ 149۔ 150۔ 151۔ 152۔ 153۔ 154۔ 155۔ 156۔ 157۔ 158۔ 159۔ 160۔ 161۔ 162۔ 163۔ 164۔ 165۔ 166۔ 167۔ 168۔ 169۔ 170۔ 171۔ 172۔ 173۔ 174۔ 175۔ 176۔ 177۔ 178۔ 179۔ 180۔ 181۔ 182۔ 183۔ 184۔ 185۔ 186۔ 187۔ 188۔ 189۔ 190۔ 191۔ 192۔ 193۔ 194۔ 195۔ 196۔ 197۔ 198۔ 199۔ 200۔ 201۔ 202۔ 203۔ 204۔ 205۔ 206۔ 207۔ 208۔ 209۔ 210۔ 211۔ 212۔ 213۔ 214۔ 215۔ 216۔ 217۔ 218۔ 219۔ 220۔ 221۔ 222۔ 223۔ 224۔ 225۔ 226۔ 227۔ 228۔ 229۔ 230۔ 231۔ 232۔ 233۔ 234۔ 235۔ 236۔ 237۔ 238۔ 239۔ 240۔ 241۔ 242۔ 243۔ 244۔ 245۔ 246۔ 247۔ 248۔ 249۔ 250۔ 251۔ 252۔ 253۔ 254۔ 255۔ 256۔ 257۔ 258۔ 259۔ 260۔ 261۔ 262۔ 263۔ 264۔ 265۔ 266۔ 267۔ 268۔ 269۔ 270۔ 271۔ 272۔ 273۔ 274۔ 275۔ 276۔ 277۔ 278۔ 279۔ 280۔ 281۔ 282۔ 283۔ 284۔ 285۔ 286۔ 287۔ 288۔ 289۔ 290۔ 291۔ 292۔ 293۔ 294۔ 295۔ 296۔ 297۔ 298۔ 299۔ 300۔ 301۔ 302۔ 303۔ 304۔ 305۔ 306۔ 307۔ 308۔ 309۔ 310۔ 311۔ 312۔ 313۔ 314۔ 315۔ 316۔ 317۔ 318۔ 319۔ 320۔ 321۔ 322۔ 323۔ 324۔ 325۔ 326۔ 327۔ 328۔ 329۔ 330۔ 331۔ 332۔ 333۔ 334۔ 335۔ 336۔ 337۔ 338۔ 339۔ 340۔ 341۔ 342۔ 343۔ 344۔ 345۔ 346۔ 347۔ 348۔ 349۔ 350۔ 351۔ 352۔ 353۔ 354۔ 355۔ 356۔ 357۔ 358۔ 359۔ 360۔ 361۔ 362۔ 363۔ 364۔ 365۔ 366۔ 367۔ 368۔ 369۔ 370۔ 371۔ 372۔ 373۔ 374۔ 375۔ 376۔ 377۔ 378۔ 379۔ 380۔ 381۔ 382۔ 383۔ 384۔ 385۔ 386۔ 387۔ 388۔ 389۔ 390۔ 391۔ 392۔ 393۔ 394۔ 395۔ 396۔ 397۔ 398۔ 399۔ 400۔ 401۔ 402۔ 403۔ 404۔ 405۔ 406۔ 407۔ 408۔ 409۔ 410۔ 411۔ 412۔ 413۔ 414۔ 415۔ 416۔ 417۔ 418۔ 419۔ 420۔ 421۔ 422۔ 423۔ 424۔ 425۔ 426۔ 427۔ 428۔ 429۔ 430۔ 431۔ 432۔ 433۔ 434۔ 435۔ 436۔ 437۔ 438۔ 439۔ 440۔ 441۔ 442۔ 443۔ 444۔ 445۔ 446۔ 447۔ 448۔ 449۔ 450۔ 451۔ 452۔ 453۔ 454۔ 455۔ 456۔ 457۔ 458۔ 459۔ 460۔ 461۔ 462۔ 463۔ 464۔ 465۔ 466۔ 467۔ 468۔ 469۔ 470۔ 471۔ 472۔ 473۔ 474۔ 475۔ 476۔ 477۔ 478۔ 479۔ 480۔ 481۔ 482۔ 483۔ 484۔ 485۔ 486۔ 487۔ 488۔ 489۔ 490۔ 491۔ 492۔ 493۔ 494۔ 495۔ 496۔ 497۔ 498۔ 499۔ 500۔ 501۔ 502۔ 503۔ 504۔ 505۔ 506۔ 507۔ 508۔ 509۔ 510۔ 511۔ 512۔ 513۔ 514۔ 515۔ 516۔ 517۔ 518۔ 519۔ 520۔ 521۔ 522۔ 523۔ 524۔ 525۔ 526۔ 527۔ 528۔ 529۔ 530۔ 531۔ 532۔ 533۔ 534۔ 535۔ 536۔ 537۔ 538۔ 539۔ 540۔ 541۔ 542۔ 543۔ 544۔ 545۔ 546۔ 547۔ 548۔ 549۔ 550۔ 551۔ 552۔ 553۔ 554۔ 555۔ 556۔ 557۔ 558۔ 559۔ 560۔ 561۔ 562۔ 563۔ 564۔ 565۔ 566۔ 567۔ 568۔ 569۔ 570۔ 571۔ 572۔ 573۔ 574۔ 575۔ 576۔ 577۔ 578۔ 579۔ 580۔ 581۔ 582۔ 583۔ 584۔ 585۔ 586۔ 587۔ 588۔ 589۔ 590۔ 591۔ 592۔ 593۔ 594۔ 595۔ 596۔ 597۔ 598۔ 599۔ 600۔ 601۔ 602۔ 603۔ 604۔ 605۔ 606۔ 607۔ 608۔ 609۔ 610۔ 611۔ 612۔ 613۔ 614۔ 615۔ 616۔ 617۔ 618۔ 619۔ 620۔ 621۔ 622۔ 623۔ 624۔ 625۔ 626۔ 627۔ 628۔ 629۔ 630۔ 631۔ 632۔ 633۔ 634۔ 635۔ 636۔ 637۔ 638۔ 639۔ 640۔ 641۔ 642۔ 643۔ 644۔ 645۔ 646۔ 647۔ 648۔ 649۔ 650۔ 651۔ 652۔ 653۔ 654۔ 655۔ 656۔ 657۔ 658۔ 659۔ 660۔ 661۔ 662۔ 663۔ 664۔ 665۔ 666۔ 667۔ 668۔ 669۔ 670۔ 671۔ 672۔ 673۔ 674۔ 675۔ 676۔ 677۔ 678۔ 679۔ 680۔ 681۔ 682۔ 683۔ 684۔ 685۔ 686۔ 687۔ 688۔ 689۔ 690۔ 691۔ 692۔ 693۔ 694۔ 695۔ 696۔ 697۔ 698۔ 699۔ 700۔ 701۔ 702۔ 703۔ 704۔ 705۔ 706۔ 707۔ 708۔ 709۔ 710۔ 711۔ 712۔ 713۔ 714۔ 715۔ 716۔ 717۔ 718۔ 719۔ 720۔ 721۔ 722۔ 723۔ 724۔ 725۔ 726۔ 727۔ 728۔ 729۔ 730۔ 731۔ 732۔ 733۔ 734۔ 735۔ 736۔ 737۔ 738۔ 739۔ 740۔ 741۔ 742۔ 743۔ 744۔ 745۔ 746۔ 747۔ 748۔ 749۔ 750۔ 751۔ 752۔ 753۔ 754۔ 755۔ 756۔ 757۔ 758۔ 759۔ 760۔ 761۔ 762۔ 763۔ 764۔ 765۔ 766۔ 767۔ 768۔ 769۔ 770۔ 771۔ 772۔ 773۔ 774۔ 775۔ 776۔ 777۔ 778۔ 779۔ 780۔ 781۔ 782۔ 783۔ 784۔ 785۔ 786۔ 787۔ 788۔ 789۔ 790۔ 791۔ 792۔ 793۔ 794۔ 795۔ 796۔ 797۔ 798۔ 799۔ 800۔ 801۔ 802۔ 803۔ 804۔ 805۔ 806۔ 807۔ 808۔ 809۔ 810۔ 811۔ 812۔ 813۔ 814۔ 815۔ 816۔ 817۔ 818۔ 819۔ 820۔ 821۔ 822۔ 823۔ 824۔ 825۔ 826۔ 827۔ 828۔ 829۔ 830۔ 831۔ 832۔ 833۔ 834۔ 835۔ 836۔ 837۔ 838۔ 839۔ 840۔ 841۔ 842۔ 843۔ 844۔ 845۔ 846۔ 847۔ 848۔ 849۔ 850۔ 851۔ 852۔ 853۔ 854۔ 855۔ 856۔ 857۔ 858۔ 859۔ 860۔ 861۔ 862۔ 863۔ 864۔ 865۔ 866۔ 867۔ 868۔ 869۔ 870۔ 871۔ 872۔ 873۔ 874۔ 875۔ 876۔ 877۔ 878۔ 879۔ 880۔ 881۔ 882۔ 883۔ 884۔ 885۔ 886۔ 887۔ 888۔ 889۔ 890۔ 891۔ 892۔ 893۔ 894۔ 895۔ 896۔ 897۔ 898۔ 899۔ 900۔ 901۔ 902۔ 903۔ 904۔ 905۔ 906۔ 907۔ 908۔ 909۔ 910۔ 911۔ 912۔ 913۔ 914۔ 915۔ 916۔ 917۔ 918۔ 919۔ 920۔ 921۔ 922۔ 923۔ 924۔ 925۔ 926۔ 927۔ 928۔ 929۔ 930۔ 931۔ 932۔ 933۔ 934۔ 935۔ 936۔ 937۔ 938۔ 939۔ 940۔ 941۔ 942۔ 943۔ 944۔ 945۔ 946۔ 947۔ 948۔ 949۔ 950۔ 951۔ 952۔ 953۔ 954۔ 955۔ 956۔ 957۔ 958۔ 959۔ 960۔ 961۔ 962۔ 963۔ 964۔ 965۔ 966۔ 967۔ 968۔ 969۔ 970۔ 971۔ 972۔ 973۔ 974۔ 975۔ 976۔ 977۔ 978۔ 979۔ 980۔ 981۔ 982۔ 983۔ 984۔ 985۔ 986۔ 987۔ 988۔ 989۔ 990۔ 991۔ 992۔ 993۔ 994۔ 995۔ 996۔ 997۔ 998۔ 999۔ 1000۔

داری حاصل کر لی ہے اور عام لوگوں کے لئے محض حقیر اشیاء کی تجارت چھوڑی ہے اور اُس میں بھی کسٹم ڈیوٹی، اسٹامپ فیس، جماعتی اور پنڈوں کے ذریعے وہ منافع میں سے اپنا حصہ وصول کر لیتے ہیں۔

III۔ ملازمین پولیس کے تعلق سے اُس نے کہا تھا کہ سول اور فوجی خدمات پر مامور ہونے والے دیسی لوگوں کی عزت نہیں کی جاتی۔ انہیں کم تنخواہ ملتی ہے اور اُن کا کسی طرح کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ دونوں محکموں میں باعزت اور منافع بخش عہدے محض انگریزوں کو دئے جاتے ہیں۔

IV۔ دست کاروں کے تعلق سے اُس نے کہا تھا کہ انگریزوں نے انگلستان کی مصنوعات کو رواج دیکر بکروں، ندافوں، برصیوں، لوہاروں اور موچیوں وغیرہ کی روزی چھین لی ہے اور اُن کے پیشے پھین کر ہر قسم کے دیسی دست کاروں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔

V۔ پنڈتوں، مولویوں اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے تعلق سے اُس نے کہا کہ پنڈت اور مولوی بالترتیب ہندو مسلم مذاہب کے سرپرست ہیں اور یورپین دونوں کے دشمن ہیں اور اسلئے اُن کے لئے لازمی ہے کہ وہ جہاد میں حصہ لیں۔ یہ اعلان برطانوی حکومت میں پائی جانے والی سیاسی اور معاشی خرابیوں کی طرف توجہ کھینچتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ بالائی طبقوں یعنی زمینداروں، بڑے تاجروں، سول اور فوجی حاکموں اور ہندو اور مسلمان عالموں کے دکھ بے دخلی کی اصل وجہ تھے۔

ہانا صاحب نے فرانس کے شہنشاہ کو خطوط (1) لکھے تھے جو بہادر شاہ کے لگائے ہوئے الزامات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ”انگریز حکومت کی ناانصافیوں میں وہ مندرجہ ذیل کا ذکر کرتا ہے: ”جھوٹ اور فریب سے کام لیکر مرہٹہ علاقوں کا الحاق کر لیا گیا، باقی راؤ دوم سے اُس کے اور اُس کے وارثوں کے لئے جس پیشے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ختم کر دی گئی، سیاسی سازشوں اور چال بازیوں سے کام لے کر ہندوستانی حکمرانوں کا تختہ الٹ دیا گیا، ایسی عداوتیں قائم کی گئیں جن میں مقدمہ بڑی کرنے کے بڑے اخراجات نے صاحب حیثیت لوگوں کو تباہ کر دیا اور ایسے قانون بنائے گئے جو اُن کے مقدس ضابطوں اور مذہبی جذبات کے خلاف ہیں۔ مالکان آراضی پر بڑے بڑے محاصل لگائے اور اُن کے کھیتوں کی پیداوار پر کسٹم ڈیوٹی عاید کی، ایسی من مانی کاروائیاں کیں جن کی وجہ سے 2000 سے زیادہ دیسی حکمران اُن کے شہر اپنے چالوں کے شکار ہو گئے، ٹاکیور کے راجہ سے کئے گئے معاہدوں اور وعدوں کے خلاف ورزی کی گئی اُس کے محل کو لوٹا گیا اور اُس کے قیمتی سامان کو نیاام کر دیا گیا، دہلی کے شہنشاہ اور دکن اور سندھ کے حکمرانوں کے بے عزتی اور ذلت کی گئی، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نابالغ وارث دلیپ سنگھ کو معزول کر دیا گیا، معاہدوں اور عہد و پیمان کی خلاف ورزی کر کے لودھ کے بلاشہ کو تخت سے ہٹا دیا گیا، عورتوں کی بے آبروئی کی گئی اور مندر اور مسجدیں مسخر کر دی گئیں، ہندوؤں کے گود لینے اور سستی ہونے کے دروازوں میں مداخلت کی گئی، مندروں اور دوسرے خیراتی اداروں کی مدد کے

(1) ان میں تین خط پنڈت رنگ کے گورنروں کے توسط سے بھیجے گئے تھے اور ایک برطانوی ”ملک“ معظم چیلرین بہادر شاہ شاہان، امیر الہمدرا“ کے نام بھیجا گیا تھا۔ اُن پر ہانا صاحب کے ایکٹوں درگاہ پر شاہ اور بھگوان پر شاہ کے دستخط 28 اپریل اور 30 مئی 1958ء کو روانہ کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے ”انگریزی حکومت کی انتہائی ناانصافی کے شکار، نف مہدیوں کو توڑنے میں پس و پیش نہیں ہوتا ہے، ہم پنڈت انگریز میں پنہ لینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ خطوط اس وقت لکراکپوز ڈومشٹر لیس دس انفرس آرڈر بنجیر، زچیرس، کی تحویل میں ہیں۔ ہندو تان کے شیشیل لکراکپوز نے اُن کی تصویریں (فوٹو اسٹیشن) حاصل کر لی ہیں۔

لیے کئے جانے والے لوگوں پر قبضہ کر لیا گیا اور سب سے زیادہ یہ کہ ہندوستانوں کی مذہبی رسوم اور روایوں کو مسخ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا یہاں تک کہ سپاہیوں نے بیک آؤ کہہ، انگریزوں نے ہند سے ذریعہ ہندوستان کے تمام ملکوں کو فتح کیا۔ ان کے سپاہیوں نے کیا کیا ہے؟ کیا ہم نے اپنی زندگیاں اور اپنا وجود اس لئے قربان کیا تھا کہ ہم اپنے مذہب اور اپنی رسوم کو کھودیں؟ ہم اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک ہند کی قوت بالکل ختم نہیں ہو جاتی ہے اور جب تک ہم میں سے ایک بھی زندہ ہے۔" تاتا صاحب نے ایک جملے میں اس دکھ بھری کہانی کی تلخیص پیش کر دی۔ "انگریزی حکومت کی نا انصافیاں اور دروغ بیانیات سورج کی شعاعوں کی طرح ہر طرف پھیل گئی ہیں۔" (1)

برہمن قدر نے، جسے باغیوں نے اسکی ماں حضرت محل کی تولیت میں 5 جولائی 1857ء کو دودھ کے تخت پر بٹھایا تھا، انگریزوں کے خلاف بغاوت کے جوش میں ایک فرمان جلدی کیا اس میں کہا گیا ہے "تمام ہندو اور مسلمان اس سے واقف ہیں کہ ہر انسان چار باتوں کو عزیز رکھتا ہے، (1) مذہب اور ایمان (2) عزت اور آبرو (3) اپنی اور اپنے قریب و دوروں کی زندگیوں (4) اور جائیداد۔ ہندوستانوں کی حکومت میں ان چاروں کا تحفظ کیا جاتا تھا ہر شخص اپنے مذہب کی پیروی کرتا تھا اور خود اس کی فضا کے مطابق اس کی عزت کا تحفظ کیا جاتا تھا اشراف کے ساتھ چاہے وہ مسلمان ہوں اور سید، شیخ، مغل اور پٹان خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوں یا ہندوؤں میں براہمن، شتری ویش اور کاستہ ہوں، ان کی حیثیت کے مطابق عزت و احترام کیا جاتا تھا کوئی پابی مثلاً چوڑہ، چمدا، دھلک اور پاسی ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا لیکن چاہے کوئی بوہنے طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا نچلے طبقے سے اس کی جان خطرے میں نہیں تھی کسی بھی جرم یا خطا کی پاداش میں کسی کی جائیداد پر قبضہ نہیں کیا جاتا تھا اس میں مزید کہا گیا ہے "لیکن انگریز ان چاروں کے دشمن ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان اپنا مذہب کھودیں اور سب عیسائی ہو جائیں۔ ان کے دور حکومت میں ہزاروں نیا مذہب اختیار کر چکے ہیں اور دوسرے اپنا مذہب بدل رہے ہیں۔ وہ اعلیٰ طبقات کی آبرو کو نیچے کے لوگوں کی سطح پر لے آئے ہیں یعنی چوڑوں اور پملاؤں کی سطح پر واقع یہ ہے کہ انگریز اعلیٰ طبقوں پر نیچی ذاتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک چوڑہ یا چمدا کی شکایت پر وہ ایک نواب یا راجہ کو بھی پلا لیتے ہیں اور اس کی بے عزتی کرتے ہیں۔ جہاں بھی وہ جلتے ہیں اعلیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والوں کو پھانسیاں دیتے ہیں اور ان کی بیویوں اور بچوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ ان کے سپاہی عورتوں کی بے آبروئی کرتے ہیں۔ وہ ان کے گھر کھودالتے ہیں، جائیدادیں چھین لیتے ہیں اور کچھ بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔" (2)

تحریک کے تین اہم ترین قائدوں کی تین دستاویزات اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ 1857ء کے واقعات کی ذمہ داری محض فوج کی شکایت پر نہیں تھی بلکہ بالائی طبقوں میں عام بے یقینی پائی جاتی تھی۔ یہ کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں تھی جو کسی ایک فرقے تک محدود ہو اور نہ اس کے محرک محض مذہب اور رسم و رواج کی خیالات تھے۔ موئے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک سیاسی تحریک تھی

(1) اس کے الفاظ ہیں۔

"Les actes d'injustice et de perjure du gant Anglois brillent partout comme Les rayons du soleil"

جس کا مقصد تھا ملک میں بدلی حکومت کا ختم کرنا۔ یہ اُس پرانے نظام کو ایک دفعہ پھر رواج دینے کی آخری کوشش تھی جسے بالآخر طاقت سے محروم کر دیا گیا تھا۔

اسکاٹ لینڈ کے مشنری الگوینڈر ڈف کے لئے، جو آؤٹ ریم، ہنری لارنس اور چارلس ٹریوہلین کا دوست اور فکلتہ یونیورسٹی کے بانیوں میں تھا واقعات کے متعلق صحیح صحیح معلومات حاصل کرنا دشوار نہیں تھا اسلئے کہ بغلت کے دوران وہ ہندوستان میں موجود تھا۔ بغلت کی نوعیت کے متعلق اُس کی شہادت بیش قیمت ہے۔ فری چرچ آف اسکاٹ لینڈ کی فارن مشن کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر ٹویڈی کے نام ایک خط مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں اُس نے لکھا تھا ”میں اُس یقین کی حقیقت کو اب پہلے سے زیادہ محسوس کرتا ہوں، جو ابتدا سے میرے ذہن میں تھی کہ یہ بڑی بغلت بڑی حد تک سیاسی اور بہت کم حد تک مذہبی نوعیت کی ہے۔“ (۱)

III انگریزوں کی فرد قرار داد جرم

عظیم بغالت کے قائدوں نے انگریزوں کے خلاف جو فرد جرم تیار کیے ہیں اُس میں درج کئے گئے ہر الزام کی حمایت تاریخ کرتی ہے۔ مغل شہنشاہ کے واقع کو لیجے۔ ۱۸۰۳ء سے وہ انگریزوں کے زیر تحفظ رہ رہا تھا۔ پہلے عزت و احترام اور ترجیح کے تعلق سے اُس کے دعوؤں کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ گورنر جنرل کو ”پسر عزیز“ اور ”وفادار ملازم“ کہہ کر خطاب کیا کرتا تھا اور گورنر کی مہر پر ”فدوی“ کندہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک تبدیلی آئی۔ لیمرسٹ نے بادشاہ سے صاف صاف کہہ دیا ”آپ کی بادشاہت محض نام نہاد بادشاہت ہے۔ آپ کو محض بر بنائے خوش خلقی بادشاہ کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔“ دربار سے منسلک ریزینڈنٹ نے نذر پیش کرتے وقت کھڑے ہونے سے انکار کر دیا۔ اکیڈ نے بہادر شاہ سے کہا کہ وہ اپنے حقوق اور دعوے ترک کر دے۔ اُس سے نذر پیش کرنے خلعت عطا کرنے اور دربار کرنے کے حقوق چھین لئے گئے۔ دیوان خاص اور دیوان عام بند کر دئے گئے۔ اُس پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بادشاہ کے لقب سے دست بردار ہو جائے، لال قلعے کی سکونت ترک کر دے اور اپنا جائشیں تاجرو نہ کرے۔ ڈیہوڑی نے اُس سے زیادہ کج خلقی کا ثبوت دیا۔ وسطی کا کہنا ہے ”بغالت چھوٹے سے پہلے بادشاہ کی حیثیت ناقابل برداشت دکھوں سے عبارت تھی۔ اُس کا محل حقیقت میں اُس کا قید خانہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گزشتہ عروج کی مضحکہ خیز نمائندگی کرنے والے کچھ استحقاق جو اسے حاصل ہیں وہ اُس کے جائشیں سے چھین لئے جائیں گے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ خود اپنے محل میں رہنے کے حق سے محروم کر دئے جائیں گے۔ اور شہر پناہ کے باہر کہیں بھیج دئے جائیں گے۔“ ہم نے اُس کے عزیزوں کو اپنی ملازمت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ہم نے انہیں محل کے حدود کے اندر افلاس اور قرض کی ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور کیا اور اُس کے بعد کابلی، کمپنی اور زودحسی کے لیے انہیں سخت سخت کہا۔ ہم نے فوجی مہدوں

کے دروازے اُن پر بند کر دئے، ہم نے ہر کاروبار کے راستے اُن پر مسدود کر دئے، ہم نے اُن سے باعزت عزم کا ہر شائبہ چھین لیا اور اُس کے بعد ہمارے اخبار اور ہمارے میس کے کمرے اُس کے گھرانے کے ست، کابل اور زرد حسن شہزادوں کے خلاف الزاموں سے معمور ہو گئے (۱)

اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ لال قلعے کا باہی اگرچہ محض کھ پتلی تھا پھر بھی اُس کی بڑی عزت کی جاتی تھی کہ نظام، بنگال کے نواب، پیشو، مرہٹہ سردار یعنی سندھیا اور بلکر اور راجپوت راجوں کی طرح نیم آزاد حکمران اُس کی اطاعت کرنے، اُس کو نذر پیش کرنے اور اُس سے خطاب و خلعت حاصل کرنے کے خواہش مند رہا کرتے تھے۔ حالانکہ اُس کے پاس نہ طاقت تھی نہ دسائل پھر بھی مغل خاندان کے تیمور، بابر، اکبر اور شاہ جہاں کی طرح کے عظیم شہنشاہوں کے وارث کی حیثیت سے اُس کی عزت کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ مسلمان اور ہندو، حکمران اور عام لوگ سب بادشاہ وقت کی بے عزتی سے تالاں تھے اور اُس خاندان کے ختم ہو جانے کے تصور کو ناپسند کرتے تھے۔

بنگل کی دیوانی رکھے دالوں کے لیے یہ بات نامناسب بھی تھی اور احسان فراموش کی مترادف بھی کہ وہ اپنے عہدے اور اُس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو وہ اپنے علاقے کو توسیع دینے، فتوحات حاصل کرنے اور اپنے قانونی بادشاہ کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے اور براہِ برکت کرنے کے لئے استعمال کریں۔ اُن کی بے وفائی کے متعلق اب کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ مارکو ز آف ویلز نے 1803ء میں شہنشاہ عالم کو یقین دلایا تھا ”حضور یقین رکھیں کہ برطانوی حکومت ہر اُس احترام کا مظاہرہ کرے گی اور ہر وہ توجہ صرف کرے گی جو حضور اور شاہی خاندان کے آرام و آسائش کے لئے ضروری ہو اور یہ کہ حضور کی ذات، آپ کے خاندان اور آپ کے متعلقین کی اعانت کا برطانوی حکومت کی طرف سے مناسب انتظام کیا جائے گا۔“ (۲) ایک نے، جس نے ویلز کی خط بھیجا تھا لکھا تھا ”حضور کی خدمت میں وفاداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کی میں دوستانہ خواہش رکھتا ہوں اور میں اسے اپنے لئے ایک نمایاں اعزاز تصور کرتا ہوں، اسلئے کہ یہ ایک خصوصی حق ہے کہ حضور کے احکام کی تعمیل کروں۔“ (۳)

گورنر جنرلوں کے طریقہ کار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا جملوں میں خلوص نہیں تھا اور واقعہ یہ ہے کہ انگریز اپنے اُن حقوق کا قانونی جواز تلاش کرنے کے لئے شہنشاہ کے نام اور وقار کو استعمال کر رہے تھے جو انہوں نے بالآخر حاصل کئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ بین الاقوامی انجمنوں سے بچنا چاہتے تھے جو اس علاقے کے متعلق صاف صاف دعوے کی بنا پر حکومت فرانس پیدا کر دیتی۔ لیکن بعد میں جب انہیں معلوم ہوا کہ اُن کی طاقت اختیارات کی بنیاد بن سکتی ہے تو انہوں نے عہد و پیمان توڑ دئے۔ اپنے ایک خط میں ڈائریکٹروں نے اس پالیسی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا ”ہمارا خیال ہے کہ اب ہندوستان میں ہماری طاقت

(۱) رسل۔ ذیل۔ ایچ۔ My Diary in India (London, 1860) جلد II، صفحہ 51

(۲) ویلز کی خط شاہ عالم کے نام، 27 جولائی 1902، Wellesley's Correspondence، جلد III، صفحہ 233

(۳) سپر، پریسبول، Twilight of the Mughals (conbridge, 1951) صفحہ 35

اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ ہم دہلی کے بادشاہ سے کچھ اور اختیارات حاصل کر کے، جن پر ہم خود اپنے نام سے عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُس کے مزید استحکام کی کوشش کا خطرناک تجربہ کریں۔“ (1)

اودھ کا معاملہ بھی اتنا ہی افسوس ناک ہے۔ وارن ہسٹنگز کے زمانے سے اودھ کے تعلق سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا مل دو طاقتوں کے روابط کی تاریخ میں ایک دردناک باب کا حکم رکھتا ہے۔ بکسر کی جنگ (1764ء) کے بعد بچے اودھ کے نواب کمپنی کے دباؤ میں تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کے اختیارات کم کر دئے گئے لیکن اُن کی ذمہ داریوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نواب شجاع الدولہ 1763ء میں مجبور کیا گیا کہ وہ فوج کی تعداد 35,000 افراد سے زیادہ نہ بڑھائے۔ اُسے اس امر کی ممانعت بھی کر دی گئی کہ برطانوی فوجوں کی طرح وہ 10,000 سے زیادہ پیدل فوج کو نہ اسلحہ مہیا کرے نہ قواعد پریڈ کروائے۔ بعد میں اُسے کمپنی کے علم میں آئے بغیر کسی ریاست سے مراسلت کرنے سے بھی روک دیا گیا اور اس طرح اُسے ایک ماتحت کی حیثیت تک پہنچا دیا گیا۔ 1798ء میں سعادت علی خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ برطانوی فوج کے اخراجات کے لئے سالانہ ترسہ لاکھ روپے ادا کرے۔ اس کی بے بسی نے نواب سعادت علی خاں کو اتنا مغموم بنا دیا تھا کہ اُس نے تخت سے دست بردار ہو جانے کی دھمکی دی۔ لیکن ویلزی نے اُسے واضح طور سے بتا دیا کہ اس کے معنی ہونگے اُس کے خاندان کا زوال۔ اس دھمکی کے بعد سعادت علی خاں نے خاموشی اختیار کر لی اور اپنی حکومت کے بقیہ سال لوگوں کی حالت سدھارنے میں گزارے۔ اُس نے خزانہ ایک دفعہ پھر بھرا دیا اور ریاست کے امور کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ بکسر ہر بر نے، جس نے اودھ میں سفر کیا تھا، ملک کو ”اُس حد تک آباد و زیر کاشت پایا جس حد تک کمپنی کے زیادہ تر علاقے تھے۔“ (2) اہرون کے مطابق غالباً اس وقت اودھ میں ہمارے آس پاس کے اضلاع کے مقابلے میں بہت زیادہ دولت تھی، محاصل کم تھے اور وہ صوبے کے اندر خرچ کئے جاتے تھے۔“ (3)

سعادت علی کے جانشین غازی الدین حیدر کو، جسے دہلی کے شہنشاہ کی حیثیت کم کرنے کے برطانوی منصوبے کے تحت اراڈ ہسٹنگز نے بادشاہ کا لقب اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا تھا، نیپال کے خلاف جنگ میں کمپنی کی مالی امداد کرنے کی غرض سے مجبور آئینیس لاکھ روپیہ قرض دینا پڑا۔ وہ ایک ناکارہ حکمران ثابت ہوا اُس کا بیٹا نصیر الدین اُس سے بدتر تھا۔

1837ء میں نصیر الدین کی موت کے بعد اُس کے جانشین محمد علی شاہ کو ایک نیا معاہدہ کرنا پڑا جس نے 1801ء کے معاہدے کی شرائط کو بدل دیا۔ اُس کے بعد تخت پر بیٹھے والے امجد علی کے زمانے میں حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ مسز ہنری لارنس نے خود اُس کی وجوہ بیان کی ہیں۔ اُس کا کہنا ہے ”اصل خرابی اس نظام میں ہے، اُن میں نہیں جن کے ذریعے اس کو چلایا جاتا ہے۔ ہم نے ہر قسم کی مداخلت کی کوشش کر کے دیکھی۔ ہم نے براہ راست مداخلت کی، بالواسطہ طور سے مداخلت کی، عمل کے ذریعے مداخلت کی،

(1) گورٹ آف دائرکٹرز کا سیاسی خط، مورخہ 4 ستمبر 1811ء، پیپر 199، بحوالہ بالا، صفحہ 44

(2) اقتباس، اردن، ایڈج۔ سی۔ (The Garden of India (London, 1880)، صفحہ 113

(3) ایضاً صفحہ 114

ترک عمل کے ذریعے مداخلت کی لین ہر کوشش رائیگاں گئی۔“

”ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ ہم نے چھوٹی چھوٹی باتوں میں دست اندازی کی لیکن جب اہم مسائل سامنے آئے تو اُن کی طرف توجہ نہیں دی۔ ایک اور بڑی خرابی یہ کہ لکھنؤ کے دربار کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے پالیسی کا کوئی مسلمہ نظام موجود نہیں تھا۔“ (1) جہاں تک نظام کا تعلق تھا اُس نے لکھا ”اگر بد نظمی کو یقینی بنانے کا کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ ہے ایک دیسی حکمران یا وزیر کی حکومت جن کا انحصار ہو دیسی سگھینوں پر اور جو برطانوی ریڈیٹ کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔“ (2)

اُس کے بعد اُس نے مشورہ دیا ”اس صوبے کا انتظام کچھ اسی قسم کے قواعد کے تحت ہاتھ میں لیا جائے جو لارڈ ولیم بینٹک نے بنائے تھے (جولائی 1831ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بھیجی جانے والی رپورٹ میں) جہاں تک ممکن ہو سکے ملک کا انتظام مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں رہنا چاہئے۔ ایک روپیہ بھی کپہنی کے خزانے میں نہیں آنا چاہئے۔ اودھ پر حکومت ایک شخص یعنی بادشاہ کی خاطر نہیں بلکہ اُس کے لوگوں کی خاطر کی جانی چاہیے۔“ (3)

لیکن ڈلبوزی نے جو اودھ کے الحاق کا فیصلہ کر چکا تھا اُس کے مشورے کو رد کر دیا۔ واجد علی شاہ کی معزولی نے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی۔ نواب میں جو بھی خرابیاں تھیں پھر بھی ہندوستان کے لوگ اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ہندوستان کا سب سے اچھا صوبہ بدیسوں کو مختل ہو جائے۔ دیسی حکمران، تعلقدار، حکام، متوسلین اور اودھ کے سپاہ گرانہ طبقے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ غم و مایوسی سے بھرے ہوئے تھے۔ برطانوی عہدیدان میں اعتماد عمل طور سے ختم ہو چکا تھا۔

الحاق کے متعلق اُس کے خیالات قابل غور ہیں۔ اُس نے لکھا تھا۔ لیکن اس اقدام نے ہندوستان کے لوگوں کے ذہنوں پر جو اثر ڈالا اُس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے ہم نے جو فائدہ حاصل کیا اس سے اس عمل کی انسان دوستانہ نوعیت پر دھبہ آ گیا اور لاکھوں لوگوں کو ایسا لگا کہ عام لوگوں کی بھلائی، جس کا ہم نے اُس وقت دعویٰ کیا تھا جب ہم خود فائدہ اٹھا رہے تھے، ایک بہانے اور مکرو فریب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔“ (4)

واجد علی شاہ کی سلطنت کا الحاق 3 فروری 1852ء کو کیا گیا الحاق کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا ”خدا اور انسان کی نظروں میں برطانوی حکومت گنہگار رہے گی اگر وہ ایک ایسی حکومت کی پشت پناہی لرتی رہی جو لاکھوں انسانوں کے دکھوں کا باعث ہے۔“ (5)

اودھ کو چیف کمشنر کا صوبہ بنا دیا گیا۔ لارنس جو پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا تھا

(1) ایسا صفحہ 134

(2) لکھنے پاسو، بمبئی۔ ڈی۔ (2) Rise of The Christian Power in India (Calcutta) صفحہ 946

(3) اردن محول، صفحہ 134 (4) کے اور ملیسن، محول بالا، صفحہ 110

(5) لارڈ ڈلبوزی کا اعلان جو 13 فروری 1852ء کو جاری کیا گیا، فارمٹر ہے۔ ڈلبوزی۔

آزادی کے ساتھ ہر قسم کے لوگوں سے ملتا تھا اور اُن کے احساسات جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ برطانوی حکومت کی طرف اُن کی وفاداری پہ اُسے شبہ تھا۔ اُس نے 2 مئی 1857ء کو لکھا تھا ”توپ خانے کی وفاداری پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی حالانکہ دہلی اندروں کو متفرق کرنے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں..... جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک برے جذبات زیادہ تر ہندو سپاہیوں میں پائے جاتے ہیں..... مسلمان جلد ہی نہایت پر جوش اور تشدد باغی بن جائیں گے۔“ (1) اُس نے مزید لکھا تھا ”جب تک ہم یہ نہ سمجھیں کہ دہلی لوگ اور خصوصیت کے ساتھ دہلی سپاہی اُسی قسم کے احساسات، توقعات اور اہلیت اور نااہلی کا تصور رکھتے ہیں جیسا کہ خود ہم رکھتے ہیں۔ اُس وقت تک ہم محفوظ نہیں ہو سکتے۔“ (2) یہ سلیٹی ہوئی آگ 31 مئی 1857ء کو انتقام کے شعلوں کی صورت میں بھڑک اُٹھی۔ اس سے پہلے کہ میرٹھ میں سپاہی بغاوت کریں ساتھ میں اودھ رجنٹ میں بغاوت پھوٹ پڑی سپاہیوں نے نئے کار توپوں کو دانتوں سے کاٹنے سے انکار کر دیا، اپنے ہتھیار پھینک دیے اور بھاگ گئے۔ ہنری لارنس کو یقین تھا کہ ہندوستان کی سلطنت کے لیے انگریزوں کو آئرس فو معرکہ آرائی کرنی ہوگی۔

پنجاب سرحدی صوبہ تھا اور اس لئے اُس پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں مغربی ایشیا میں رونما ہونے والے واقعات نے برطانوی سلطنت کے لیے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ روس نے ایران کو شکست دیدی تھی۔ اُس کے بعد اُس نے ایران کو معاہدہ ترکمانچہ، (1828ء) کرنے پر مجبور کیا، کاکیشیا کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور کسچن کے آس پاس کے علاقے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ تقریباً دو سال بعد پامرسن خائف ہو گیا اور ایک ہوا کھڑا کر دیا جو پوری انیسویں صدی میں اور اُس کے بعد بھی برطانوی مددگاروں کے ذہنوں پر مسلط رہا۔ ہندوستان کی طرف روسیوں کی پیش قدمی کو روکنا برطانوی خارجہ پالیسی کا اصل مقصد بن گیا اور روس اور ہندوستان کی سلطنت کے درمیان فاضل ریاستوں کی تشکیل برطانوی ڈپلومیسی کا اصل کام بن کر رہ گیا۔

روس نے ایران کی ہمت افزائی کی جو افغانستان کے خلاف اپنے دعوؤں کی تجدید کر کے نقصان کی صفائی کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستان کی سرحد سے ملے ہوئے علاقے کے متعلق اُس کے عزائم نے ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔

پنجاب بھی، جو رنجیت سنگھ کی موت کے بعد خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا تھا، انگریزوں کے لئے زیادہ تشویش کا باعث بن گیا اُن کی حکمت عملیوں نے سکھوں کو مشتعل کر کے جنگ پر آمادہ کر دیا جس کی وجہ سے بالآخر پنجاب کا الحاق کر لیا گیا۔ پچاس ہزار مربع میل زرخیز زمین اور چالیس لاکھ تومند کسان برطانوی حکومت میں آ گئے۔

شکست کے ساتھ ذلت بھی ہوئی۔ معزول شہزادے دلیپ سنگھ کو عیسائی بنالیا گیا اور ملک بدر کر کے انگلستان بھیج دیا گیا۔ لاہور دربار کی ہلاک نیلام کر دی گئیں۔ برطانوی تاج کی آرائش کے لیے کوہ

نور انگلستان بھیج دیا گیا۔ اور ڈلہوزی امرت سر کے سنہرے کردارے میں گیا اور جوتے پہن کر اس نے مقدس حدود میں چلا۔

انگریزوں کی زیادتی کی ایک اور واضح مثال ہے ٹاگپور کا الحاق۔ اس کے متعلق ڈلہوزی نے روداد میں یہ وجہ بیان کی ہے ”میں اپنی قوت فیصلہ کو اس امر کے اعتراف کے لئے آمادہ نہیں کر سکا ہوں کہ مہربانی و شفقت کا جذبہ ایک منصفانہ اور مصلحت اندیش پالیسی کو رد کر سکتا ہے۔“ (1) لیکن اس پالیسی کے پیچھے کیا عوامل کام کر رہے تھے یہ بات ڈزرائلی نے پارلیمنٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے واضح کر دی تھی جس میں اس نے گورنر جنرل کی روداد کے اقتباسات پیش کئے تھے۔ اس نے کہا تھا ”ٹاگپور کے الحاق سے ہمیں ایسا علاقہ مل جائے گا جو 80,000 مربع میل پر مشتمل ہے، جس کی سالانہ آمدنی چالیس لاکھ روپیہ ہے اور جہاں 40,00,000 سے زیادہ لوگ آباد ہیں۔ اس کی وجہ سے بڑھائی نس نظام کی سلطنت برطانوی علاقے سے بالکل گھر جائے گی۔“ (2) ڈلہوزی کے لئے براد کے علاقے کی کپاس پیدا کرنے کی صلاحیت اتنی زیادہ پرکشش تھی کہ اس نے لوگوں کے احساسات اور انصاف کے تقاضے کو نظر انداز کرنے کے نتائج کے متعلق کرمل لو اور ولیم منسل کے مشوروں کو رد کر دیا اور ٹاگپور کی مرہٹ ریاست کی موت کے پروانے پر دستخط کر دئے۔

سندھ کی فتح کو بد طبیعتی اور بد کرداری کے مظاہرہ کہنا چاہیے۔ گندی جارحیت۔ اس کے روح رواں شیخ نے اعتراف کیا ”ہمیں سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ پھر بھی ہم اس پر قبضہ کریں گے اور یہ نہایت سودمند، مفید اور انسان دوستی کے جذبات پر مبنی بد معاشی ہو گی۔“ (3) امیروں کے خلاف جھوٹے الزامات تراشے گئے جن کی بنیاد تھیں جعلی دستاویزات۔ برطانوی فوجوں کی بندوقوں نے زرق برق لباس پہنے اور بھڑکیلے صافے ہانڈے بلوچیوں کو بھون کے رکھ دیا جو بڑی بہادری سے لڑے۔ لیکن ان کے پاس عہد و سٹی کے ہتھیار تھے یعنی تکواریں اور بھالے لیکن اس ظاہری تمسخر اور دکھاوے کی بہادری کے پیچھے ایک سنجیدہ مقصد تھا جس کا اعلان پامر سٹن نے کیا یعنی ”کاسکوں اور سکھوں کی ملاقات کو ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ دور رکھا جائے۔“ (4)

بہت سے شاہی خاندانوں سے وارث کو گود لینے کا رواجی حق چھین کر انہیں علاقوں اور زمینوں سے محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ ستارہ رانچور، نلدرگ، کرناٹک، تانجور، مہاسنی، کرولی اور سمبھل پور وغیرہ کے خاندان اپنے علاقوں سے محروم کر دئے گئے۔

(1) کے اور ملسن، محول بالا، جلد 1، صفحہ 78

(2) ڈزرائلی کی تقریر 27/1857 Hansards Parliamentary Debates. 454

(3) شیخ۔ سر۔ ڈبلیو۔ The life & opinions of Genral Sir Charles (London, 1857) جلد 1، صفحہ 218

(4) بینٹ پی، The Concept of Empire, Burke to Attile (London, 1962)، صفحہ 25

مالکان اراضی کے ساتھ برابر تاؤ

حکمران خاندانوں کے بعد امراء اور شرفاء کے طبقے کا نمبر آیا یعنی تعلقداروں، زمینداروں اور اعلیٰ سرکاری حکام کا۔ اُن کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ "اُس زمانے کی پالیسی یہ تھی کہ حکمران اور کسان کے درمیان کسی کو تسلیم نہ کیا جائے۔" (1) اس طبقے کا خاتمہ جلدی طور سے بڑی بڑی ریاستوں کے خاتمے کی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ ہندوستانی انتظامیہ کے زوال اور اُس کی جگہ برطانوی نمونے کے سول اور فوجی انتظام کے قیام نے، جو برطانوی کارکنوں پر مشتمل تھا، قدرتی طور سے ہندوستانی حکمران طبقے کو برطرف کر دیا۔

کچن نے جو مال گزاری کا نظام قائم کیا تھا اُس کی نوعیت نے بھی حکمران طبقے کو ختم کرنے میں مدد دی۔ استمراری بندوبست کے علاقوں میں پرانے خاندانوں کی جگہ نئے قسم کے مالکان اراضی نے لے لی۔ رعیت داری علاقوں میں مالکان اراضی نیست و نابود ہو گئے۔ مرہٹوں کی جنگوں اور اودھ کے الحاق کے نتیجے میں جو علاقے برطانوی سلطنت میں شامل کر لئے گئے تھے وہاں "بہت سے قابل برطانوی مدد، خصوصیت کے ساتھ شمالی ہند میں، کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جس کو بجا طور سے مقامی شرفاء کے زمرے میں شامل کیا جاسکے۔ اُن کے دل ہمدردی اور مکمل انسان دوستی کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے پھر بھی وہ مقامی شرفاء کے متعلق صرف ایک خیال رکھتے تھے اور وہ یہ تھا کہ اس ادارے کو بڑی ایمانداری کے ساتھ مٹا دیا جانا چاہیے۔" (2)

صوبجات شمال مغربی اور اودھ

مثال کے طور پر بالائی صوبوں میں مالکانہ حقوق رکھنے والے تین طبقے تھے۔ (1) زمیندار (2) تعلقدار اور (3) معافی دار، فیل کار۔ شروع میں اُن کے ساتھ جو بندوبست کئے گئے تھے اُن کی بنیاد پر کوئی واضح اصول نہیں تھے۔ پھر بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ اراضی کے تمام خالص اثاثے کی حقدار ریاست ہے۔ 1824ء میں خالص لگان کا 5% حصہ معیاری مال گزاری قرار دیا گیا تھا۔ 1922ء میں اُسے کھساکر لگان کا دو تہائی کر دیا گیا۔ صوبہ جات شمال مغربی کے لیٹنٹ گورنری۔ سی۔ رابرٹسن کو 1833-42ء کی بندوبست کی کارروائی "کچھ اس نوعیت کی معلوم ہوئی جس کا مقصد ہے سانج میں ایسی برابری پیدا کرنا کہ بالآخر حکمران طبقے اور زمین جوٹنے والے میں بڑے پھوٹے کا امتیاز باقی نہ رہے۔ یہ تجربہ خطرناک ہے کہ کسی درمیانی مقامی ایجنسی کی مدد کے بغیر حکومت کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس وقت ہم جو

(1) اے اور ملیسن، نول بال، جلد 111

(2) اے اور ملیسن، نول بال، جلد 112

کاروائی کر رہے ہیں اُس کا راست نتیجہ ہوگا اس قسم کی صورت حال پیدا کرنا۔ (۱)

1855ء میں سہلان پور ضوابط کی رو سے تفتیش کی شرح 50 فی صدی کر دی گئی۔ اس شرح کا نفع، لودھ، صوبہ جلت متوسط، پنجاب اور بعد میں مدراس اور بمبئی میں کر دیا گیا۔ لیکن یہ راحت اتنی دیر میں نصیب ہوئی کہ 1857ء کے واقعات پر اس کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔

اس بے اندازہ مطالبے کی وصولی میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا تھا اس کا نتیجہ کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ "اس نظام کے تحت، جس کو ہم نے رواں دیا تھا وہ لوگ جو متحد نظر پھیلے ہوئے زمین کے بڑے بڑے خصلوں کے ملک تھے کچے جمو پڑوں میں رہنے والے کسان بن گئے جن کے پاس صرف کھلا رکانے کے کچھ برتن بھانڈے تھے۔" (2)

جہاں تک لودھ کے تعلقداروں کا تعلق تھا انہیں بلاشبہ جاگیردارانہ حقوق حاصل تھے۔ 1856ء میں لودھ کے الحاق کے وقت لودھ کا دو تہائی حصہ اُن کی ملکیت تھا لیکن برطانوی حکومت انہیں محض "مل گزری وصول کرنے کی خاطر مقرر کئے گئے درمیانی لوگ" (3) سمجھتی تھی۔ حکام ہندوستان کا نظریہ تھا کہ "تعلقدار ایک نو دولتیار اور فرجی انسان ہوتا ہے۔" کچھ نوجوان حکام ہندوستان کا خیال تھا کہ ایک تعلقدار کو زمین سے محروم کرنا اتنا ہی بڑا کارنامہ ہے جیسے شیر کا شکار کرنا اور اس پر عمل کرتے تھے۔ کارروائی اس طرح کی جاتی تھی کہ جو لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے انہیں بھی بدلہ خواہش اس کی تعریف کرتا دیتی تھی۔ سب کو برابر بنانے کا یہ عظیم نظام تھا جس نے ہر چیز کو پہلے اصولوں اور گرتے ہوئے آدمی کی سطح تک پہنچا دیا۔" (4)

ہومس کے مطابق ”لیکن حکام ہندوستان، جنہوں نے مشہور و معروف رابرٹ مرٹنس برڈ سے تحریک پائی تھی، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بڑی سے بڑی سرت سے ہمسکا کرنے کے تصور سے سرشار تھے وہ تعلقہ داروں کو بے مصرف کالوں سے تعبیر کرتے تھے چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک فٹ زمین پر بھی اُن کے حق کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ جب تک وہ حق ملیت کا دیا ثابت نہ پیش کریں جو ایک انگریز وکیل کو مطمئن کر سکے۔“ (5) کے کا کہنا ہے ”ہندوستان کی جلدوب نے بچے لہجے بالکل اراشی سے جاگیروں کو پاک کر دیا اور حق ملیت رکھنے والے کسانوں کی ایک نسل کو زمین کے جائز وارث تسلیم کر لیا گیا۔“ (6)

مثیل کے طور پر مہدیاجہ مان سکتے ہیں، جو 577 گلوں کا مالک تھا اور حکومت کو سالانہ 1000 روپے بطور مالٹوری ہوا کرتا تھا، جس کے علاوہ سب گلوں چھین لیے گئے اور اس کی مال گزری

The Economic History of India in the Victorian Age (London, Kegan, (1) تہ میٹھ

42-43 من paul }

(2) نے اور ملیں محمد لہ مال، جلد ۱، صفحہ ۱۱۴

23 Moral and Material Progress and Condition of India(3)

(4) محور مال، صفحہ 116

(5) ہر مہر، کھولہ والا، صفحہ 25

(6) لے اور ملیں، نحو مال، جلد ۱، صفحہ 114

20000 پونڈ سے گھٹ کر 200 پونڈ رہ گئی۔ ایک اور تعلقہ کے 378 گاؤں میں سے 266 چھین لئے گئے اور ایک کے 204 میں سے 155 چھین گئے۔ (1)

دوسری کھدوائی جس نے اس طبقے کو متاثر کیا معافی دلو و فیل کھڑکی زمینوں کو واپس لینا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر زمینیں اُن لوگوں کا ترکہ تھیں جنہوں نے حکومت کی شاندار خدمت سرانجام دی تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مغل سلطنت کے زوال کے انتشار پذیر زمانے میں اُن میں کچھ زمینوں کو ناجائز طور سے حاصل کر لیا گیا ہو۔ فی الجملہ تحقیقات کا حکم دیا گیا اُس کا جو نتیجہ ہوا اُسے کے کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے ”معافی دلوں سے زمین خالی کروانے والے حاکم کو پورے اختیارات سونپ دئے گئے۔ معافی نامے طلب کئے گئے۔ اُن کے جائز ہونے کے ایسے ثبوت پیش کرنے تھے جو سرکاری کھڑکیں کو مطمئن کر سکیں۔ اتنی مدت تک قابض رہنے کے بعد اُن سے کہنا کہ ثبوت پیش کریں ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ اُس وقت اُن کے پاس محض ایک ثبوت تھا اور وہ تھا اُن کا قبضہ اور دخل۔ اُس کے بعد مظالم کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اس میں شک نہیں کہ اُس کے بعد جو کچھ کیا گیا اُسے عام مضبوطی سے تعبیر کیا جلتا چاہیے۔“ (2)

متاثر ہونے والوں میں سے بہت سے علم دوست حضرات تھے۔ وہ علما تھے جنہیں بزرگوں اور عالموں کے طور پر مذہبی خدمات سرانجام دینے کے لئے مدد معاش ملی تھی۔ اُن کے حقوق اور ذرائع معاش کی مضبوطی بیدار کرنے کی ایک بڑی وجہ بن گئی اور انہیں دشمنی پر آمادہ کر دیا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں مولویوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ نظام مالگزمی کے شکر چھوٹے لوگ بھی ہوئے، واقعہ یہ ہے کہ چھوٹے زمینداروں کی تعداد اور زیادہ تھی۔ وہ کئی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے یعنی راجپوت تھے، برہمن، جات، گوجر وغیرہ تھے۔ حاصل حقوق پر حملے نے انہیں دشواریوں میں مبتلا کر دیا اور اُن کی وجہ سے سپاہی بھی دشواریوں میں مبتلا ہو گئے اس لئے کے سپاہی اُن چھوٹے زمینداروں کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جن کی آمدنی خاندان کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ روٹی روزی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے سپاہی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

کسانوں کی بے چینی

کسان بھی خوش نہیں تھے۔ عظیم بغاوت کے واقعات کے سرکاری بیان میں کہا گیا ہے۔ (3) 19 پانچ ۹۰ کے پرنٹوں میں شورش کے اسباب مختلف تھے۔ اُن کا تعلق مذہب سے زیادہ نہیں

Statement Exhibiting the moral & material progress and condition of (1)

23 ستمبر 1872-73 India

(2) کے اور ملیں، نولہ بالا، جلد ۱، صفحہ 123

(3) الہ آباد کے قائم مقام کمشنر ای۔ سی۔ ہیلی کے ہم الہ آباد کے قائم مقام کمشنر ایف۔ ٹامسن کا مرسلہ مورخہ ۹ نومبر

Narratives events attending the out break of disturbances and the , 1958

Restoration of authority in the Allahabad district, in 1958. صفحہ 9

تھا۔ ہمارے حوالے کئے جانے کے وقت ان پر گنوں کے گھوڑوں کے بڑے بڑے قلعے ٹھاکر خاندانوں کی ملکیت تھے۔ قدیم زمیندار جو عداً فضول خرچ تھے اور لوٹ کھسوٹ کر کے گزر معاش کرتے تھے اپنی فضول خرچیوں کی بنا پر جہ ہو گئے اور ہمارے ضابطوں اور قانونوں کی بنا پر ان کی جائیدادیں نیلام ہو گئیں۔ کسان اور غریب طبقے نیلام خریدنے کے مقابلے میں ان کا زیادہ لحاظ کرتے تھے چاہے نیلام خریدنے والا کتنی مدت تک جائیداد پر قابض کیوں نہ رہا ہو اب بھی سابق زمیندار اور اس کا خاندان گھوڑوں کے سب سے زیادہ بااثر لوگ سمجھے جاتے تھے۔ اکثر اوقات گاؤں کے غریب لوگ انہیں ایک قسم کا خزانہ دیکھتے تھے اور وہ اس کے عوض ان کی مدد کرتے تھے۔

نیلام خریدنے والا عام طور سے شہر کا رہنے والا ہوتا تھا جو لگان وصول کرنے یا گری جلدی کرانے کے قابل نفرت مقصد کے علاوہ کبھی گاؤں نہیں جاتا تھا۔ قدرتی طور سے لوگ زمینداروں کا ساتھ دیتے تھے جنہوں نے اس بغاوت کو پرانی حیثیت دوبارہ حاصل کرنے کا بہترین موقع سمجھا انہوں نے پہلے تو ہر اس چیز کو جہ کر دیا اور لوٹ لیا جس کا تعلق یورپ سے تھا اور اس کے بعد اپنی پرانی جائیدادوں پر بلبلہ قبضہ کر لیا۔

ان علاقوں میں بھی زراعت کی صورت حل اتنی ہی خراب تھی جہیں رعیت داری طریقہ رائج تھا۔ بمبئی پریسڈنسی میں میرٹھ دلا ختم کر دیئے گئے جو زمین کے موردنی ملک تھے اور اراضی کا ایک مقررہ محصول لوار کرنے کی صورت میں وہ اس پر قابض رہ سکتے تھے اور جب تک وہ محصول لوار کرتے رہیں انہیں بیدخل نہیں کیا جاسکتا تھا۔

1824ء لغایت 1828ء پرنسپل نے مجموعی پیدوار کا 55 فی صدی سرکاری مطالبہ مقرر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے اپنے کھیت چھوڑ دئے اور بڑے بڑے قطعوں پر کاشت ختم ہو گئی۔ 1835ء میں اس کی جدی طمانی کی گئی۔ پھر بھی 1852ء کی پالیسی کی کمی کے سائے سرحد کی شہادت کی رو سے رعیت داری علاقوں کے لوگ غربت اور افلاس کا شکار تھے۔ (1) 1817ء اور 1835ء کی درمیانی مدت میں مالگوری قریب قریب دگنی ہو گئی تھی یعنی 8,68,000 پونڈ سے بڑھ کر 15,35,000 پونڈ ہو گئی تھی۔ مدارس پریسڈنسی میں بھی حالات بہتر نہیں تھے۔ 1820ء میں رعیت داری بندوبست کی کارروائی شروع کی گئی۔ اور 1817ء میں وہ پائے تکمیل کو پہنچی۔ رعیت داری کے الفاظ میں اس کا نتیجہ تھا "تیس سال تک مدارس کے صوبے میں ایسے مظالم اور زرعی دکھ دیکھنے میں آئے جن کی مثال اس عہد کے ہندوستان میں بھی نہیں ملتی ہے۔" (2)

بعد میں ہونے والے بندوبستوں نے اس صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی۔ 1852-53ء میں بورڈیون نے دیکھا تھا کہ کسان روز کنواں کھو کر روز پنی پیچے تھے اور ہمیشہ چینی (مہاجن) کے مقروض رہتے تھے۔

شمال کے صوبوں کی طرح بمبئی اور مدراس میں شورش نہ پھوٹنے کی وجہ سے اطمینانی کی کمی نہیں تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ رعیت داری نظام نے انہیں ضروری قیادت سے محروم کر دیا تھا۔

بڑی حد تک بمبئی کے میراث دار اور مدد راس کے پولیکر اور زمیندار ختم کئے جانے چکے تھے۔ حالانکہ مجموعی اعتبار سے یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ کے خلاف عام طور سے بے اطمینانی پائی جاتی تھی پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے کچھ حصوں میں اور کچھ طبقوں میں یہ احساس دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھا، اس اختلاف کی بڑی وجہ تھی مال گزاری کے نظام کی نوعیت۔ جن علاقوں میں زمینداری نظام تھا، وقفہ وقفہ سے بندوبست کیا جاتا تھا اور سرکاری مطالبے کی شرح میں تبدیلی کا بڑا بار اٹھانا پڑتا تھا وہاں برطانیہ کا تختہ الٹنے کی خواہش میں معاشی دکھوں نے شدت پیدا کر دی تھی۔ زمینداری نظام رکھنے والے دوسرے علاقوں میں جہاں مال گزاری کی استمراری تھیں جو مقابلہ کم تھی اور آسانی سے ادا کی جاسکتی تھی وہاں کے لوگ زیادہ شدید کاروائی کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

شمالی ہندوستان میں بنگال کو جو زرعی نظام کے تجربوں کی سر زمین تھا، ابتدا میں بہت سے دکھ اٹھانے پڑے لیکن جب بندوبست استمراری کی ابتدائی بھاری شرح تفتیش کے نتائج کی شدت رفتہ رفتہ کم ہو گئی تو انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے زمیندار یوں کی سلیس برہمنی ہوئی خوشحالی کے دور میں داخل ہو گئیں اور 1857ء میں ان کی زمیندار یوں کی آمدنی اتنی تھی جس سے وہ فی الحال مطمئن تھے۔ ان خاندانوں کے نوجوان انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے اور اُس زمانے میں انھیں روزگار حاصل کرنے میں بھی زیادہ دشواری نہیں ہوتی تھی۔ وہ سرکاری ملازمتوں یا آزاد پیشوں میں داخل ہو گئے۔

سننے مالکان اراضی کا تعلق کئی ذاتوں سے تھا اور انتظام، انصرام یا جنگ کی روایات ان میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ انہوں نے بدلیسی حکومت کو قبول کر لیا اور ان کے پہلے کے حکمرانوں کے متعلق العنان اور من مانے نظم حکومت پر ان سے باضابطہ طریقہ اور باقاعدہ طریقہ کار کو ترجیح دی۔ قدرتی طور سے وہ نوابوں کے فیڈرل حکومت کی بحال کے خلاف تھے۔ باغیوں سے انھیں کوئی بھدردی نہیں تھی۔ کلکتہ کے ہندو بیڑیارتھ نے ان کے نقطہ نظر کی وضاحت اُن الفاظ میں کی تھی۔

”میں صوبہ جات کے لوگ اپنی حادث اور توہم کی بنا پر باغی سپاہیوں کی صفوں میں شامل نہ ہو سکیں گے یا قومی امن وامان میں خلل ڈالنے والوں کی حفاظت کی کم سے کم ذمہ داری بھی قبول نہیں کر سکیں گے۔ بنگالیوں نے کچھ اس امر کی خواہش نہیں کی ہے وہ جنگ میں فوجوں کی قیادت یا مابوس زندگی کی شہادت کی ناموری سے بہرہ یاب ہوں۔ اُن کے چپے اوپر اُن کی کامیابیاں تمام تر سول ہیں۔ ایک ہمہ گیر بصیرت سوچنے اور پہلے سے کسی مسئلہ پر غور و فکر کرنے میں اُن کی معاونت کرتی ہے۔ وہ اس سے واقف ہیں کہ اُن کے پرسکون ذہنی مذاق کے لئے برطانوی حکومت سب سے زیادہ موزوں ہے یہ کہ ایک مفتوح نسل جس حد تک خوشحالی حاصل کر سکتی ہے وہ برطانوی حکومت کے سازگار دور میں اُس حد تک خوشحالی حاصل کر سکیں گے۔ انہیں امید ہے کہ انگریزوں کے جذبہ انصاف پسندی سے جو اپنے نمائندوں کے ذریعے متقدر کو نسل پالار لینٹ میں حصہ لیتے ہیں، قانونی اور دستور ی طریقوں سے رجوع کر کے وہ وقت آنے پر، اپنے بدلیسی حاکموں کے ساتھ زیادہ برابری کے مدارج طے کر لیں گے اور ایشیائی سب سے زیادہ منظم سلطنت کے انتظام، انصرام کی باعزت ذمہ داری میں اُن کے شریک ہو سکیں گے۔ ہندوستانوں کے دوسرے حصوں سے زیادہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ شورش میں ملک کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔“ (1)

صوبہ جات متوسط

1818ء میں مرہٹہ سلطنت کے زوال کے بعد وہ علاقے انگریزوں کے ہاتھوں میں آ گئے جن پر صوبہ جات متوسط مشتمل ہیں۔ مال گزاری کے بندوبست کی فوری کارروائی کی گئی۔ اس بندوبست کی خاص خاص باتیں یہ تھیں کہ حکومت کے مطالبے کی تفصیلات اور ان کی شرح سے کی گئی اور اُس پر نظر ثانی کرنے کی مدت کم کر دی گئی۔ مالکان اراضی کے اُس طبقے کو تسلیم کر لیا گیا جو مالگوار کہلاتا تھا اور اُن کے سابق حقوق میں بیع اور رہن کے حقوق کا اضافہ کر دیا گیا۔

بہت بھاری لگان کی وصولی میں برقی جانے والی سختی کے حسب دستور نتائج سامنے آئے۔ ہوشنگ آباد اور سیونی کے اضلاع میں 1825ء میں مال گزاری کی تفصیلات 2,277 پاونڈ فی سال سے بڑھ کر 13,877 پاونڈ کر دی گئی۔ چونکہ اس رقم کی وصولی ناممکن ثابت ہوئی اس لئے اسے کھٹا کر 6,192 پاونڈ کر دیا گیا۔ یہ بھی اُس رقم سے تقریباً آدھی تھی جو مرہٹے وصول کیا کرتے تھے۔ نرسنگھ پور، دمور، ساگر اور ہزبدا کے علاقوں میں بھی یہ طریقہ اپنایا گیا۔ 1853ء میں ناگپور کے الحاق کے بعد وہاں بھی یہی کیا گیا۔ اضلاع سے مظالم، جائیداد کی قیمت گرنے، تباہی اور بد نظمی کی اطلاعات آنے لگیں اور بے اطمنانی بڑے علاقے میں پھیل گئی۔ اُس کا تلخ اثر تھا 1857ء میں رونما ہونے والے واقعات۔

پنجاب

1839ء میں محل الحاق کے بعد پنجاب میں مالگوار کی کا بندوبست شروع کیا گیا۔ دوسرے مقامات پر تفصیلات کی اور ان کی شرح نے جن دشواریوں کو جنم دیا تھا اُس کے تجربے کی بنا پر انگریزوں کے کان ہو گئے تھے اسلئے پنجاب میں بڑی احتیاط کے ساتھ بندوبست کئے گئے۔ زمین کی پیمائش، فصلوں کی قیمت اور تفصیلات کے کاموں میں مقامی محاسبوں اور گاؤں کے نمائندوں کو شامل کیا گیا۔ 1856ء میں حکومت کا مطالبہ اُس سے 25 فی صدی کم تھا جو سکھ حکومت وصول کرتی تھی۔ 58-1857ء کی رپورٹ کے مطابق اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”زراعت پیشہ طبقے بافراغت اور خاموش تھے، حالات کا شکار کوئی نہیں تھا، کوئی تبدیلی کا خواہش مند نہیں تھا“ (۱) مالگوار کی تفصیلات کی شرح کم تھی اور بغاوت کے دوران پنجاب میں مقابلہ پر سکون حالات کی وجہ یہی تھی۔

اڈیتوں کا استعمال

ایسٹ، نارٹن اور اسٹوکس نے 1855ء میں اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ سرکاری مالگوار کی وصول کرنے کے لئے لوگوں کو اڈیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ مالگوار کی وصول کرنے اور پولیس کی تفتیش کے دوران

اڈیتیں پہنچانے کا بڑا الزام کپہی کی حکومت پر لگایا گیا تھا۔ مسٹر بلیکٹ نے ۱۱ جولائی ۱۸۵۴ء کو ایک تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کی تجویز پر بولتے ہوئے ہاؤس آف کامنز میں یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ اُس نے کہا کہ سرکاری مطالبات اتنے بھاری ہیں کہ بد قسمت رعیت ظالمانہ وصولی کے بوجھ کے نیچے پس رہی ہے۔“ (۱) اُس کے خلاف سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ”اُس پر اُن ذرائع کو استعمال کئے بغیر عمل نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے اس کو انتہائی ناقابل برداشت ظلم میں تبدیل کر دیا ہے۔“ (۲) اُس نے مزید کہا کہ نظام کے تحت لوگوں کی حالت ”نہایت درجہ خائف کن ہو گئی ہے جنہیں زمین اور چاہی کے بوجھ نے جسمانی اور ذہنی طور سے خاک میں ملا دیا ہے۔ یہ بوجھ غربت، دکھ اور فاقہ کشی کا بوجھ ہے۔“ (۳) مسٹر ویچی سیمور نے کہا کہ ہمارا اس کی حکومت کا بڑا مقصد تھا اُس شخص سے ۱۰ شلنگ فی سال وصول کرنا جس کے پاس محض شلنگ تھے۔ یہ کام ہمیشہ آسان نہیں ہوتا تھا اور رقم وصول کرنے کے لئے اُس قسم کی جسمانی اڈیتیں پہنچائی جاتی تھیں جن کا رواج پچھلی صدی کے اوائل میں تھا۔“ (۴) جان براؤٹ کے مطابق ”زمین غیر زر خیز نہیں تھی لیکن اُس پر اتنا بھاری محصول لگایا جاتا تھا کہ اُس میں کاشت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔“ (۵) اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ مال گزاری کی وصولی کے سلسلے میں جسمانی اڈیتیں پہنچائی جاتی تھیں اس نے انگریزوں یعنی کلکٹر اور دوسرے حاکموں کی شہادتیں پیش کیں۔ مسٹر آٹو نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کلکتہ کے ایک بیرسٹر مسٹر تھیوڈ کا حوالہ دیا جس نے اُسے لکھا تھا ”ہندوستان میں قریب قریب ہر قسم کی خرابی اور برائی پائی جاتی ہے۔ آپ نے جسمانی اڈیتوں کے متعلق جو اطلاعات حاصل کیں ہیں وہ میرے لئے نئی نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کلکتہ کی ہر حوالات میں اُن پر عمل کیا جاتا ہے۔ زیادہ مدت نہیں ہوئی جب

مضافات میں خود مجھے اس کا ثبوت ملا۔“ (۶)

پانچ دونوں سے یہ تحریک گرگئی اُس کے بعد ارل آف ایمپل نے ہندوستان کے لوگوں کی شکایتوں کو د کرنے کی خاطر ایک عرضداشت ۱۶ جولائی ۱۸۵۵ء کو ایوان میں پیش کی اور ہمارا پریسڈنسی میں مبینہ اڈیتوں کی تفتیش کرنے والے کمیشنروں کی رپورٹ کا حوالہ دیا جس میں مالگوزاری کے معاملات اور پولیس کے مقدمات کے سلسلے میں پہنچائی جانے والی اڈیتوں کی نوعیت کی وضاحت کی گئی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ”مال گزاری کے وصولی اور پولیس کے مقدمات دونوں صورتوں میں اس پریسڈنسی کے طول و عرض میں مقامی مال گزاری اور پولیس کے حکام لوگوں کے خلاف تشدد سے کام لیتے ہیں۔“ (۷)

ایک آزاد فرانسسی مشاہدہ کانڈر مارٹن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اُن اڈیتوں کی ذمہ داری خود کپہی

(۱) ہنری ڈس پارٹیمنٹری ڈیپٹ، جلد cxxxv، کالم ۴۹

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً، کالم ۵۰

(۴) ایضاً، کالم ۶۱

(۵) ایضاً، کالم ۷۹

(۶) ایضاً، کالم ۸۹

(۷) ایضاً، جلد cxxxix، کالم ۷۳-۸۷۔ ہمارا اس میں مبینہ جسمانی اڈیتوں کی تفتیش کرنے والے کمیشن کی رپورٹ، دیکھئے مارچ

(مارچ ۱۸۵۵ء) ۲۴ جولائی ۱۸۵۵ء۔

پر آتی ہے جنہوں نے 1857ء میں بہت سے انگریز خاندانوں کو سگوار بنادیا "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ (کچنی کے) ایجنٹوں کی زیادتیوں کا انتقام لینے کے لئے باغیوں نے وہ خوفناک مظالم کئے جس نے پوری سلطنت میں غصے کی لہر دوڑا دی ہے؟ بغاوت شروع ہونے سے مشکل سے ایک سال پہلے حکومت کے حکم پر کی جانے والی تفتیش سے ظاہر ہوا تھا کہ ہندوستانیوں کو جسمانی اذیتیں پہنچانے کا ایک قابل نفرت باقاعدہ نظام پلایا جاتا ہے جس سے عورتیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اس تحقیقات کے بعد انگلستان کو، جو ہوورز اور دلیر فورس کی سرزمین ہے، اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ کچنی کے ملازم ہندوستانی مقبوضات میں اس قسم کی خباثت آمیز جسمانی اذیتیں پہنچاتے ہیں جو غیر مہذب طریق عملی کی آپ مثال ہیں"۔⁽¹⁾

انتظامیہ سے ہندوستانیوں کی علیحدگی

بالائی طبقوں کی مزاحمت اور بے اطمینانی کی کئی اور وجوہ تھیں۔ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ حکومت کے اثر اور اُس کی کاروائیوں سے ہندوستانیوں کی مکمل علیحدگی سے اہم تھی۔ انہوں نے لکھا تھا "یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ اچھی اور مناسب حکومت اور استحکام کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کی حکومت میں رعایا کا بھی دخل ہو۔ اس سے پہلے کہ خرابیاں اُس منزل تک پہنچ جائیں جب اُن کا تدارک ناممکن ہو صرف عام لوگ منتظمین کو اُن کی پالیسیوں کی اچھائیوں اور برائیوں سے باخبر رکھ سکتے ہیں۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں کر سکتا ہے جب تک رعایا کو ایسی حکومت کے معاملات میں دخل و رسوخ حاصل نہ ہو جو ہمارے لوگوں سے مذہب، روایات، طور طریق، رواجوں، مزاج اور عادات میں مختلف ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کو مجلس قانون ساز سے دور رکھنا کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اُن کو دور رکھنے کی وجہ سے نہ صرف اتنا نقصان ہوا کہ حکومت کو اُن قوانین و ضوابط کی حقیقی خامیاں نہیں معلوم ہو سکیں جنہیں اس نے نافذ کیا، بلکہ اُس کا بدترین نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اپنی رعایا کے حقیقی اغراض و مقاصد اور ارادوں سے واقف نہ ہو سکی اور لوگ حکومت کی تمام تر تجاویز کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہے۔"۔⁽²⁾

IV ہندوستانیوں کے ساتھ براسلوک

ایک اور وجہ تھی ہندوستانیوں کی طرف انگریزوں کا بدلا ہوا رویہ۔ یہ تبدیلی، نتیجہ تھی نپولین کے خلاف جنگ میں انگلستان کی کامیابی، صنعتی انقلاب کی بنا پر بڑھتی ہوئی خوشحالی، میٹروڈیم اور ایوٹیکلے کلورم کی طرح نئی نئی تحریکوں کے پھیلاؤ اور سماجی رسم و رواج اور اخلاقی معیارات میں سدھار کا۔ ان تمام

(1) مدائن ملاتر، La puissance Militaire des Anglais dans L'inde etc, insurrectionelles

capayes (1859) 447

(2) سالہ اسباب بغاوت ہند، ۱۸۵۸ء انگریزی ترجمہ لکچر ہمارے کرون (جلد ۳ 1873ء) صفحات 12-13، ڈاکٹر صدیقی کاوشیں، صفحات

وجوہ کی بنا پر انگریزوں میں دوسروں کے مقابلے میں احساس برتری پیدا ہو گیا اور اُن کے قومی فخر و مہابت میں اضافہ ہو گیا۔

بال کے مطابق ہندوستان کی مقامی نسلوں کے ساتھ یورپی حکام اس قسم کا برتاؤ کرتے تھے "جسے کوئی بھی باجمیت لوگ ایک گھنے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔" (1) اُس نے ایک ہندوستانی مصنف کی شہادت پیش کی جس نے لکھا تھا "سول اور فوجی دونوں قسم کے انگریز حکام کی ایک بڑی اکثریت اپنے ماتحتوں ملازموں اور سپاہیوں کے ساتھ اور ملک کے عام لوگوں کے ساتھ بھی بدکلامی کرتے ہیں (2) اُس کا خیال تھا کہ حاکموں اور محکموں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی "روز بروز وسیع تر اور ناقابل عبور بنتی جا رہی ہے علاوہ ازیں کمپنی کے سول اور فوجی ملازمین پڑے لکھے مقامی باشندوں کے ساتھ بھی جس توہین آمیز لہجے اور طریقے سے بات کرتے ہیں اور جس قسم کے تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں اُس نے دونوں فریقوں میں جذبہ خیر سگلی اور اعتماد پیدا نہیں ہونے دیا۔" (3)

سکرٹریٹ آف انٹیلی جنس فائنڈ لارڈ اسٹیلی نے مہر دسمبر 1857ء کو ولیمس کونڈ کالج کے نوجوان کڈٹوں کے سامنے ساتھ تقریر کرتے ہوئے ہندوستان میں یورپیوں کے "تکبرانہ اور نفرت انگیز احساس برتری" (4) کی طرف اشارہ کیا تھا۔

1818ء میں منرو نے گورنر جنرل لارڈ ویسٹنگھم کو لکھا تھا "بدیہی فاتحین نے مقامی آبادی کے خلاف تشدد اور اکثر اوقات بڑی سنگدلی سے کام لیا ہے لیکن کسی نے اُس قسم کا ذلت آمیز برتاؤ نہیں کیا جیسا ہم نے کید کسی نے پوری قوم کے چہرے پر کالک نہیں لگائی اور اُس کو ناقابل اعتناء، دیات دہی سے محروم اور اس قابل نہیں ٹھہرایا جس کو محض اُس وقت استعمال کیا جائے جب اُس کے بغیر کام نہ چلے۔ یہ بات محض غیر شریفانہ نہیں بلکہ مصالح کے منافی بھی ہے کہ جو لوگ ہمدے زیر نگیں ہیں اُن کے کردار کو ہدف ملامت بنایا جائے۔" (5)

اُس نے مزید کہا "ہمدے نظام کی اصل خرابی وہ ذلت آمیز حقیقت ہے جو ہم نے مقامی باشندوں کو دی ہے۔ ہمداء خیال ہے کہ وہ تو ہم پرست، جہل اور جھوٹ اور بے ایمانی کی طرف مائل ہیں۔ اُن کی خوشحالی کے لیے ہمداء جوش اس امر کی اہمیت نہیں دیتا کہ اتنے پست ذہیت لوگوں کو ملک کے انتظام میں کوئی حصہ دیا جائے ہم انہیں قابل اعتناء اور منافع بخش عہدوں سے دور رکھتے ہیں۔ ہم انہیں کوئی ترین عہدوں تک محدود رکھتے ہیں جہاں ان کو محض اتنی یافت ہوتی ہے جو انہیں زندہ رکھ سکے یہ عہدے بھی اُن کو محض اس لیے دئے جاتے ہیں کیونکہ یورپین ان پر کام کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ ہم انہیں انسانوں کی فرو نسل سمجھتے ہیں۔ ہم انہیں اس گری ہوئی حالت تک پہنچا دیتے ہیں اور اُس کے بعد بڑی قہارت کے ساتھ ہم انہیں اعلیٰ عہدوں کے ناقابل سمجھتے ہیں۔" (6)

ملکوزائف کلینزیکرڈ نے فروری 1857ء میں ہاؤس آف ارڈرز میں اُس نظام پر بحث کرتے

(1) بال، محول، جلد دوم، صفحہ 636 (2) ایضاً (3) ایضاً (4) ایضاً 637

(5) ٹھیک The life of Major General Sir Thomas Munzo. جلد دوم، صفحات 85-86

(6) اقتباس The Mutinies, The Government and the People by a Hindu، مشہوری فونڈ

ہوئے کہا تھا جس کے تحت حکومت ہند انتظام و انصرام لرتی تھی "سچ تو یہ ہے کہ وہ نظام جس کے ذریعے ہندوستان پر حکومت کی جاتی ہے مقامی باشندوں میں ثروت پیدا کرنے اور انہیں پالا کی، کمینگی اور دھوکے بازی سے کام لینے پر اکسانے کا باعث ہے۔" (1)

ہندو مذہب اور رسم و رواج کے متعلق انگریزوں کا تحقار آمیز رویہ

انگریزوں کے دلوں میں ہندوستانوں کے تعلق سے جو جذبہ تحقیر پلایا جاتا تھا اس کا اطلاق ان کے مذہب اور تہذیب پر بھی ہوتا تھا۔ ہندو دھرم کے تمام پہلوؤں کی خدمت میں عیسائی مشنری سب سے آگے تھے اور بہت سے سول اور فوجی افسر اس امر کو اپنا فرض منصبی تصور کرتے تھے کہ ہندوستان کے مذہبیک خیالوں کو عذاب ابدی سے محفوظ رکھنے کے لئے شدت عیسوی کی ترویج کریں۔ غالباً اس کی وجہ تھی ہندوستانی نظام مذہب کے متعلق ان کی عدم واقفیت۔ واقعہ یہ ہے کہ ولیم بینٹ نے اے ڈوبو کی کتاب کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا "ہندوستان میں اپنے مذہب قیام میں جو کچھ میں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ بالعموم یورپ کے لوگ ہندوؤں کے رسم و رواج کے متعلق بہت کم یا بالکل نہیں جانتے ہیں۔ ہم سب کچھ اہم نشانات و واقعات سے واقف ہوتے ہیں جو انہیں جانے والا ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر ان کے انداز فکر اور ان کی گھریلو علاقوں اور رسموں سے ناواقف ہوتے ہیں جو کسی قوم کو سمجھنے کے لئے ضروری شرط ہیں۔ ہم ان کی زبان بھی پوری طرح نہیں سمجھتے ہی۔۔۔ اور انھیں ان کے گھروں اور خاندانوں میں دیکھنے کا موقع ہمیں نہیں ملتا ہے۔" (2)

مائیکل ایڈورڈسن نے کہا ہے "اٹھارویں صدی میں ہندوستانی اور انگریز ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا برہنہ کرتے تھے جیسا کہ ملک کی طاقتیں کرتی ہیں۔ لیکن اُس صدی کی آخری دنوں میں وہ کشیدگیاں نمودار ہونے لگیں جو 1857ء کے غدار کی سبب بنیں جو انگریزوں میں اپنی طاقت کا شعور بڑھاتا تھا اور دور نیچے مئے اور ان تک رسائی مشکل ہو گئی اور سماجی حکومت کے لازمی جو کے طور پر کٹر اور مفتون لوگوں کے لئے تحارک کا جذبہ علمبرائیت کی نمایاں خصوصیت کے طور پر روز بروز بڑھنے لگا۔" (3) انگریز ان لوگوں سے بالکل علیحدہ رہتے تھے جن پر وہ حکومت کرتے تھے۔ انہوں نے میچر کے مشورے کو قابل اعتنا نہیں سمجھا یعنی "ہر چیز میں انھیں حصہ دیتے یہاں تک کہ ہم ان میں آمیز ہو جائیں اور قوم بن جائیں۔" (4)

شورش کی اصل وجہ تھی لوگوں کے مختلف حصوں کی سیاسی اور معاشی شکایتیں۔ مذہب کے لیے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ گڑبڑ کی مزید وجہ بن گیا اس لیے کہ ہندو مذہب کو زندگی کا سرچشمہ اور وجود کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اپنے مذہب سے دور ہو جانے کے بعد ہندو یا مسلمان ایک ایسی کشش کی طرح تھا جس میں اُتار اور پتو اتر نہ ہو۔ وہ سب سے زیادہ مخالف اس سے تھا کہ جانے پہچانے ماحول سے اٹھا کر کسی انجان اور

(1) ہال، کول ہال، جلد اول، صفحہ 42

(2) ڈوبو، ایس۔ اے، Hindu Annual Customs and Ceremonies، ترمیم ایچ۔ کے۔ دیو

ہمپ (آئسنور 1906ء)، صفحہ xv

(3) میکسیرسل، ڈبلیو۔ ایچ، My Indian Mutiny Diary، تدوین از مائیکل ایڈورڈسن (لندن 1957ء)

(4) The Mutinies. The Government and the People، کول ہال، صفحہ 38

انجینی دنیا میں بھینک دیا جائے۔ یہ خیال ہی اُس کے لئے پریشان کن تھا۔

عیسائی مشن کا پرچار

سید احمد خاں نے کہا کہ حکومت کے سماجی اقدامات، مشنریوں کی کارروائیوں اور سرکاری حکام کے بیانیوں نے مل کر لوگوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ حکمران ہندوستانوں کو عیسائی بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

1813ء کے بعد، جب انھیں ہندوستان میں آباد ہونے کی اجازت دی گئی۔ عیسائی مشنریوں کا

پرچار ہونے لگا۔ اُن کے پوری بازاروں اور میلوں میں نظر آنے لگے۔ اکثر اوقات پولیس اُن کے ساتھ ہوتی تھی۔ سر سید نے لکھا ”مشنریوں نے انجیل کی تبلیغ کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا۔ ایسے مذہبی رسالے شائع کئے اور لوگوں میں تقسیم کئے جانے لگے جو سوالوں اور جوابوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی خاطر وہ حسبِ مرضی مسلمانوں کی مسجدوں، ہندوؤں کے مندروں اور میلوں میں جاتے تھے اور حکومت کے خوف کی بنا پر کوئی اس پر اعتراض کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اضلاع میں وہ خدمت کے لئے چہر اسی کو استعمال کر سکتے تھے یا تھانے سے کسی سپاہی کو بلا سکتے تھے۔ یہ لوگ محض انجیل کی تبلیغ پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ دوسرے مذاہب کے بزرگوں اور مقدس مقامات کا ذکر بڑے توہین آمیز انداز میں کرتے تھے جس سے سننے والوں کی دل آزاری ہوتی تھی اور اُن کے دلوں میں حکومت کے خلاف بے اطمینانی کا جذبہ بڑھ کر پکڑ لیتا تھا۔“ (1)

جن اقدامات کو قابلِ اعتراض سمجھا گیا وہ تھے سنی کی رسم کو ختم کرنا، ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی، عیسائی مذہب قبول کرنے والے کا حق موروثی جائیداد پر تسلیم کرنا، مختلف ذاتوں کے قیدیوں کے لئے یکساں کھانے کا انتظام، ریلوے میں ذات پات کا خیال نہ کرنا، سپاہیوں کی بھرتی کی شرط کہ انھیں باہر کے ملکوں میں جانا پڑے گا اور پوری کے جگنا تھ مندر کی طرح کے مندروں کا انتظام سنبھالنا۔ اخلاق اور انتظامی کارکردگی کی بنیاد پر ان تمام اقدامات کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے کچھ کم روشن خیال ہندوستانوں کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن پرانے خیال کے لوگوں کی ان سے بڑی دل آزاری ہوئی۔ چونکہ ان فیصلوں میں ہندوستانوں کو دخل نہیں تھا اس لیے وہ انھیں اوپر سے ادا کئے گئے ایسے فیصلے سمجھتے تھے جن کا نفاذ ایک بدلیسی طاقت کی مدد سے کیا جا رہا تھا۔

تعلیم کے نئے نظام کے میدان میں پنڈت اور مولوی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا اور نوجوانوں کے ذہنوں میں ایسے تصورات پیدا کر دیے جن کی بنا پر ہندوستانی مذاہب کے عقائد و رسموں کو تہات کی نظر سے دیکھنے لگے۔ چونکہ تعلیم کے نظام میں عیسائی مشنریوں کا بڑا اثر تھا اس لیے نئے تعلیمی اداروں کو تبدیلی مذہب کے مرکز تصور کیا گئے۔

ایک طرف تو مشنری کھل کر ہندو دھرم اور اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور اُن کی خدمت کرتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو غصہ آتا تھا مگر عیسائی حکمرانوں کی حکومت کے تحت وہ اُس کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف بہت سے سول اور فوجی افسر اُس کی حمایت کرتے تھے جس کو وہ یسوع مسیح کی اعلیٰ وارفع تعلیمات سمجھتے تھے اور مشنری نہ ہونے کے باوجود تبلیغ کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ رپورٹ

ایم۔ ایڈمنڈ نے 1855ء میں کلکتہ سے ایک شش ماہی شائع کی جس میں اُس نے کہا ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت آگیا جب اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانا چاہئے کہ سب لوگوں کو ایک مذہب قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔ ریلوے، داخلی جہاز اور تار برقی تیزی کے ساتھ دنیا کے لوگوں کو متحد کر رہے ہیں۔ کیا اس تصور کو معقول طور سمجھا جاتا ہے کہ ہر قوم برائے قیاس خدا کی مہربانی سے اپنے لئے ایک رستے کا انتخاب کرے۔ یا یہ کہ اُس خدائے واحد نے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اپنے خاندان کے مختلف حصوں کی موجودہ اور آئندہ مسرت کے لئے مختلف طریقے متعین کئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ عیسائی مذہب وہ واحد مذہب ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ راست وحی کے ذریعے وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جو اس دنیا میں مسرت کا باعث ہے اور دوسری دنیا میں جس کے حالات کا انکشاف اُس نے کیا ہے۔۔۔ چونکہ ہم نے اس سے بہت سی سلاقیں اور برکتیں پائی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان کے حصول میں دوسروں کی ہمت افزائی بھی کی جائے۔

ہماری خواہش ہے کہ گر جہاں ہندوستانوں سے بھرے ہوں جہاں نہ صرف بدیسی بلکہ اس ملک کے لوگ بھی باقاعدگی سے مسیحی مذہب کی بشارت دیں اور جہاں وہ اپنے گناہوں سے توجہ کریں اور خدا کی حضور جانے کے لیے خود کو تیار کریں اور جہاں بچوں کو اخلاق اور سچائی کی تعلیم دی جاسکے۔ (1)

V سپاہیوں کی شکایتیں

جو شکایتیں بالائی طبقوں کے ذہنوں کو پریشان رکھتی تھیں ان میں بنگال آرمی کے ہندوستانی سپاہی بھی شریک تھے جو زیادہ تر برہمن اور راجپوت تھے لیکن انھیں کچھ اور بھی شکایتیں تھیں۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل تھیں۔ ملازمت کے غیر اطمینان بخش حالات، مذہبی رسوں میں مداخلت اور ان کے وقار و عزت نفس کو پہنچائے جانے والے مدے۔

جہاں تک ملازمت کی شرائط کا تعلق تھا ترقی اور تنخواہ کے مسائل سب سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ اس لیے کہ ان کا اثر سپاہیوں کی ملازمت اور وقار پر بڑا تھا۔ ابتدائی زمانے میں جب کمپنی جنوب میں اپنی بٹا کے لیے فرانسیسی رقیبوں اور دکنی حکمرانوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی ہندوستانی سپاہی ترقی کر کے افسروں کے عہدوں تک پہنچ سکتے تھے جو یورپی اور ہندوستانی فوجوں کی آوازوں کا ٹکڑا کرتے تھے بنگال کی فتح کے بعد جب انگریز افسروں کی بڑی تعداد ہندوستان آگئی اور کارنوالس نے انگریزوں کو افسر بنانے کی پالیسی اختیار کی تو ان عہدوں کے دروازے ہندوستانیوں کے لیے پوری طرح بند ہو گئے۔ ہندوستانیوں کو معمولی سپاہیوں کی حیثیت دی گئی اور کیٹنڈ افسروں کے عہدوں تک پہنچنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔ بالائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے ان سپاہیوں کے لیے جو عقل حکومت اور ہندوستانی حکمرانوں کی فوجوں کو اعلیٰ ترین حیثیت کے کمانڈر مہیا کر چکے تھے، یہ واقعہ اس توہین آمیز صورت حال کا مظہر تھا کہ انگریزوں کے تحت ان کی حیثیت کمتر ہے۔

تنخواہوں کا مسئلہ زیادہ الجھا ہوا تھا۔ یوں بھی تنخواہیں کم تھیں اور یورپی سپاہیوں کی تنخواہوں کے مقابلے میں تو وہ اور بھی کم تھیں۔ ہندوستانی سپاہی کا تعلق سماج کے معزز گروہوں سے تھا۔ اسے اپنے پیسے پر بڑا فخر تھا اور اخلاق اور پیسے کے اونچے معیار رکھتا تھا۔ اس کے برخلاف یورپی سپاہی کی خود اس کے سماج میں عزت نہیں کی جاتی تھی اور اس کے عادات و اطوار بہت اچھے نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان بڑا فرق تھا اور ان کے تنخواہوں کا فرق ذلت آمیز تھا (1) اگر ان کے مختلف معیار زندگی کے پیش نظر تنخواہوں اور بھتوں کی مختلف شرحوں کو جائز قرار بھی دیا جائے پھر بھی ہر جنگ کے بعد ان کی تنخواہ اور بھتے کے سلسلے میں جو غیر یقینی حالات پیدا ہو جاتے تھے اور جن من مانے طریقے سے ان کا فیصلہ کیا جاتا تھا اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سر ہمفری لارنس نے اس وقت اس کی طرف اشارہ کیا تھا جب اس نے لکھا ”فوج کی ضرورتوں میں غالباً سب سے بڑی ضرورت ہے تنخواہ کا ایک سیدھا سادا ضابطہ

(1) ”انگلستان میں بہت کم لوگ ایک معزز پیسے کے طور پر فوج میں ملازمت کرتے ہیں یا اسے گزر بسر کا ایک مفید ذریعہ سمجھتے ہیں۔ عام طور سے ریکروٹ ایک بے سہارا سولین ہوتا ہے جس کی مالی حالت خراب اور شہرت داغدار ہو چکی ہوتی ہے اسے لالچ دے کر بلامحور کے کپڑے فوج میں چھان لیا جاتا ہے۔ وہ یا تو ایسا شخص ہوتا ہے جس کا اپنی محبوبہ سے بھڑا ہو گیا ہو یا وہ جس نے اپنے مالک کی چوری کی ہو۔ وہ اپنے لوگوں کی میر کا پتہ نہ سیریز کر چکا ہوتا ہے اور باہر کی دنیا اس کو بھول چکی ہوتی ہے۔ ایسا شخص سپاہی بن جاتا ہے“ کے اور ملیں، بحوالہ جلد ۱، صفحہ 185۔

جس میں ہر حال میں اور ہر شعبے کے تمام چھوٹی بڑی حیثیتوں کے سپاہیوں کی تنخواہ واضح انداز سے دکھائی جائے۔ اس سلسلے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اس وقت بہت سے شبہات پائے جاتے ہیں..... حالانکہ تنخواہ اور اڈٹ کے ضابطوں کی جلدیں موجود ہیں۔“ (1)

ظاہر ہے کہ اس بات پر سپاہیوں کو بڑا غصہ آتا تھا کہ کسی صوبے کی فتح اور الحاق کے بعد بہتہ ختم کر دیا جاتا تھا اور انہی سپاہیوں کو کم تنخواہیں دیکر ان علاقوں میں رکھا جاتا تھا۔ غریب سپاہی کو محض 7 روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی جس میں سے وہ ساڑھے تین روپے کھانے پر صرف کر دیتا تھا اور دو سے ڈھائی روپے تک زندگی کی دوسری ضروریات پر خرچ کرتا تھا اور بڑی مشکل سے ایک یا ڈیڑھ روپیہ بچا پاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پانے والے سپاہیوں کو جو بات گھر سے دور جانے پر آسانی تھی وہ تھا روپیہ بچانے کا خیال جو وہ اپنے خاندان کو بھیج سکے۔ لیکن یہ اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

زمانہ امن میں اس قسم کے بے اطمینانی تو ہمیشہ موجود ہی رہتی تھی۔ اس میں اضافہ اُس وقت ہو گیا جب مطالبے کی شرائط کے خلاف ہندوستان کے باہر افغانستان اور برما لڑنے کے لیے انہیں بھیجے گا غیر معقول فیصلہ کر کے انگریزوں نے برہمن اور راجپوت سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا۔ مسلمانوں کے درمیان رہتا اور ان کا چھو ہوا کھانا کھاتا یا پانی پیتا ان کی روایات کے قطعی متافی تھا اور سمندر پار کرنا دھرم سے دست بردار ہونے کے مترادف تھا۔ ان میں سے کوئی بھی عمل کر کے وہ ذات باہر ہو جاتے تھے جو ان کی سماجی زندگی کا کلیدی عنصر تھی۔

مالی دشواریوں اور مذہبی اشتعال کی بنا پر سپاہی کو انگریزوں کے متعلق پھیلائی جانے والی کہانیوں پر یقین آ گیا کہ وہ ہندوستانوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ سرہنری لارنس نے لاڈ کینگ کو رپورٹ میں کہا تھا کہ اودھ توپ خانے کے ایک جعدار کو، جو ایسے کردار کا انسان ہے، یقین ہے کہ ”پچھلے دس سال سے حکومت مقامی باشندوں کو بالآخر بلکہ دھوکہ دے کر عیسائی بنانے کے کام میں مصروف ہے۔“ (2)

اس سے بھی زیادہ یہ کہ ”سفید قام“ افسروں کے برتاؤ پر، جن میں کیشن اور نان کیشن دو نوں قسم کے افسر شامل تھے، بڑی ناراضگی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس کا شاہد سیتارام ہے جو کمپنی کی فوج میں صوبیدار تھا اور اُس وقت بھی کمپنی کا وفادار رہا جب اُس کا بیٹا بغاوت میں شامل ہو گیا۔ اُس نے کہا: ”لیکن بہت سے (یورپی سارجنٹ) اپنا مالی انصرم ظاہر نہیں کر سکتے تھے یا لوگوں کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے تھے اور اس قسم کے لوگ گالیاں دینے پر اتر آتے تھے اور سپاہیوں کو مارنے اور تلکے رسید کرنے میں بھی انہیں تامل نہیں ہوتا تھا۔ کئی دفعہ اڈجوینٹ سے شکایتیں کی گئیں لیکن اس نے ہمیشہ سپاہی کے خلاف سرجنٹ کا ساتھ دیا اور شکایت دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔“ (3)

(1) کے اور ملٹین، محولہ بالا، جلد ۱، صفحہ 346۔

(2) میڈورسن اور میریویل، سرہنری لارنس کی زندگی، جلد، صفحات 322-323۔

(3) سپاہی سے صوبیدار تک، مترجمہ انقش کرل نور کیت، صفحہ 23۔

کیشنڈ افسروں کا برتاؤ بھی اس سے بہتر نہیں تھا۔ وہ سپاہیوں کو کمتر مخلوق سمجھتے تھے "اُسے برا بھلا کہا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ برا برتاؤ کیا جاتا ہے اُس کو "جھٹی" کہا جاتا ہے۔" نوجوان اس کو ایک اچھا مذاق، جوش کے انکھار کی شہادت اور سپاہی کے مقابلے میں قابل قدر احساس برتری سمجھتے ہیں کہ اُس کے ساتھ جانوروں سے بھی برا سلوک کیا جائے۔" (1)

لغنت کرل ولیم ہنٹر کی شہادت اس کو ثابت کرتی ہے۔ یورپین تان کیشنڈ افسروں کی بے ہودگی کے تعلق سے اُس نے کہا کہ مردچہ نظام "ہمیشہ انہیں (ہندوستانی افسروں کو) پس پشت رکھتا ہے اور نہ صرف رجمنٹ کا سب سے کم عمر اور نا تجربہ کار یورپین سکند لغنت اُن پر حکم چلاتا ہے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ یورپین تان کیشنڈ افسر بھی نہ صرف اُن پر حکم چلاتے ہیں بلکہ اکثر لوقات اس بغیر کسی وجہ کے نہایت فحش گالیاں بھی دیتے ہیں۔" (2)

اس نظام کے تحت یہ ممکن نہیں تھا کہ افسروں اور اُن کے سپاہیوں کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کیے جاسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دونوں دو مختلف دنیاؤں کے باسی تھے۔ یورپین افسر ہندوستانی سپاہیوں اور ہندوستانی افسروں سے دور رہتا تھا۔ فرائض منصبی کے علاوہ اُن میں کوئی سہمی مراسم نہیں تھے۔ 1824ء میں فوج کی تنظیم نو کے بعد کمانڈنگ افسر کا سپاہیوں سے تعلق ٹوٹا گیا۔ وطنی جہازوں کے رواج نے یورپ سے رشتہ رکھنے کے لیے زیادہ سہولتیں پیدا کر دیں جس کی بنا پر یورپی افسروں کا نقطہ نظر اور اُن کی دلچسپیاں بدل گئیں جوں جوں اپنی نسل کے مردوں اور عورتوں سے رسم درو پیدا کرنے کے مواقع بڑھتے گئے دیے دیے اپنی رجمنٹ، اپنے سپاہیوں اور اپنی ہندوستانی وابستہوں سے اُس کا لگاؤ کم ہوتا گیا۔ فوجی افسروں کی سروے، امور عامہ اور سیاسی محکموں کے لیے خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کی وجہ سے بھی فوج کی کارکردگی متاثر ہوئی۔ نظم و ضبط کم ہو گیا اور سپاہیوں کے دلوں میں افسروں کی عزت کھٹے لگی۔

یورپین افسروں میں ڈسپلن کی کمی نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا۔ وہ لالچی، ناعاقبت اندیش، اور فضول خرچ تھے اور کھلم کھلا الزام تراشی کرتے تھے۔ تنخواہ اور بھتے کے معاملے میں وہ حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی بھی کرتے تھے۔ اس طریق عمل نے اُن کے خلاف جذبہ حسد پیدا کر دیا اور سپاہیوں کے سامنے بری مثالیں رکھیں۔ افسر کے الفاظ اپنی قدر و قیمت کھو چکے تھے اور سپاہی اُن کے وعدوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ بار بار وعدے توڑے گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگال آرمی کے ایک رٹائرڈ افسر کے مطابق "ہندوستان کی تمام بغاوتیں، چاہے وہ بنگال میں ہوئی ہوں یا کہیں اور، خود ہماری پیدا کردہ ہیں یا کم از کم اُن کے لیے پہل بننے والی۔ عام طور سے یا تو معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی یا مقامی سپاہیوں کیے احساسات، صحت یا سہولت کا خیال نہیں کیا گیا۔" (3) اس کی مثالیں ہیں جلو، دیور، بارک پور،

(1) ہندوستان میں بغاوت، ہندوستان سے شمال مغربی سو بہ جات میں مقیم ایک بریٹن کے قلم سے، صفحہ 34۔

(2) ہنٹر، لغنت کرل ولیم، بنگال آرمی کے آئندہ انتظام، ڈسپلن اور تنظیم نو کے - غداشات، صفحہ 2۔

(3) اکتیاس، سین، افکارہ سواتون، صفحہ 17۔

بنگال اور مدراس کی فوجوں میں 1842ء اور 1844ء میں ہونے والے ہنگامے اور پنجاب کی بغاوت
1849-50ء۔

کمپنی کی فوجوں کی ساخت

جہاں تک فوجوں کا تعلق تھا بنگال کمانڈ کی تمام تر چھاونیاں متاثر ہوئیں۔ کمپنی کی فوجوں میں، جن کی تنظیم تین کمانڈوں میں کی گئی تھی۔ بنگال کمانڈ سب سے بڑی تھی۔ اُس کا علاقہ اختیار ایک بڑے علاقے پر محیط تھا جو ضلع بنگال سے افغانستان کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ پورا علاقہ ایک کمانڈر انچیف کے تحت تھا جس کے ماتحت سات ڈویژنل کمانڈ تھیں۔ ہر ڈویژن کے تحت کئی اول اور دوسرے درجے کے بریگیڈ تھے۔ جن کی کمانڈ بریگیڈیر کرتے تھے۔ بنگال کمانڈ میں 1,10,000 پیدل، دس سے بارہ ہزار تک رسالہ اور تیس ہزار ہر قسم کے یورپی سپاہی تھے۔ ہندوستانی فوجوں میں آٹھویں سے دسویں حصے تک مسلمان تھے اور بقیہ سب ہندو تھے۔ (1)

ڈویژنل علاقوں میں سے ایک تھا بنگال۔ وہاں تین چھاونیاں کلکتے کے گرد اور تین چھوٹی چھاونیاں سرحدوں پر واقع تھیں تاکہ آسام اور مشرقی پہاڑیوں کے سرداروں پر نظر رکھی جاسکے۔ بارک پور، برہم پور اور ڈم ڈم کی بڑی چھاونیوں میں مجموعی اعتبار سے ہندوستانی پیدل فوج کی پانچ رتھیں، بے ضابطہ رسالے کا ایک دستہ، ایک ہندوستانی توپ خانہ اور رائلٹوں کا اسلحہ خانہ تھا جس کی حفاظت ایک چھوٹا سا دستہ کرتا تھا۔ چٹاگانگ، ڈھاکہ اور جلیسگیری کی چھوٹی چھوٹی چھاونیوں میں فی الحال ہندوستانی پیدل فوج کی چھ کمپنیاں مقیم تھیں۔

دوسرا ڈویژنل علاقہ تھا بہار۔ اُس کا صدر مقام تھا دیناپور اس کے تحت سات چھاونیاں تھیں جن میں پانچ پیدل اور دو بے ضابطہ رسالے کی رجمنٹ، ایک یورپی بٹالین اور ایک یورپی توپ خانے کی بٹالین تھی۔ شمال مغربی صوبجات میں دو کمانڈ تھیں یعنی کانپور اور میرٹھ اور وہاں بیس سے زیادہ چھاونیاں تھیں۔ وہاں کم سے کم دس رجمنٹ تھیں جن میں کئی بے ضابطہ رسالے، کچھ سکھ سپاہی اور کچھ توپ خانوں کی بٹالین اور اسلحہ سازی کے ڈپو تھے۔

آگے مغرب کی طرف فوجوں کا ارتکاز بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اُس علاقے کو تین کمانڈوں میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی سرہند، لاہور اور پشاور جس میں تقریباً بیس فوجی مرکز تھے۔ ہندوستانی فوج میں تیس سے زیادہ پیدل رجمنٹ اور خاص بڑی تعداد میں رسالہ اور توپ خانہ تھا جس کی مجموعی تعداد تقریباً 65,000 تھی۔ زیادہ تر یورپی فوج پنجاب میں تھی۔ اُن چار بٹالینوں اور یورپی توپ خانوں کو چھوڑ کر جو کلکتہ اور دہلی کے درمیان مقیم تھے زیادہ تر یورپی فوج جس میں 15,000 سپاہیوں سے زیادہ تھے، پنجاب میں تھی۔ میرٹھ سے پشاور تک یورپی

(1) سدرلینڈ، کمپنیز کے Sketches of the Relations Subsisting between the British

Government in India & Different Retire State (ملٹری انٹرنیشنل پریس، کلکتہ 1837ء) صفحہ 7۔

پیدل فوج کی نو رجمنٹ تھیں جن کے ساتھ گھوڑوں پر لے جائی جانے والی اور زمین پر لے جائی جانے والی توپوں کے کئی دستے تھے۔

دستہ ہند اور راجپوتانہ میں کمپنی کی ہندوستانی فوجوں کے کئی دستے کچھ بے ضابطہ رسالے، ہندوستانی توپ خانہ اور ہندوستانی واپیان ریاست کی فوجیں تھیں۔ اُس علاقے میں تقریباً ایک درجن چھاونیاں تھیں۔ سب سے بڑی چھاونی تھی گوالیار۔ وہاں 8,000 سپاہیوں کا دستہ تھا، دو رسالے کی رجمنٹ تھیں، دس پیدل ٹائلین تھیں اور توپ خانے کی چار کمپنیاں تھیں۔ جبل پور، مہو اور گھوڑ میں ایک ایک رجمنٹ تھی اور دیولی، پور، رنپور اور کھرد اڑامیں چھوٹی چھوٹی فوجی اکائیاں تھیں۔ اجیر میں گولا بارود بنانے کا کارخانہ تھا۔ جہاں تک بنگال کی فوج کے مواصلات اور نقل و حمل کا تعلق تھا ریلوں کی عدم موجودگی میں آبی راستے استعمال کیے جاتے تھے۔ چونکہ شمالی ہندوستان کے لیے گنگا، جمنا اور دریائے سندھ اور مٹھی رانی کے قابل اُن کی معاون ندیاں بڑی اہمیت رکھتی تھیں اس لیے چھاونیاں اور اسلحہ خانے اُن کے ساتھ ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔

بنگال کی فوج میں بالائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لیکن بمبئی اور مدراس کی فوجوں میں ایسا نہیں تھا۔ بمبئی کی کمانڈ کے تحت، جس میں سندھ بھی شامل تھا، 23 چھاونیاں تھیں جہاں کچھ بلوچی فوجوں کے علاوہ 26,000 فوج مقیم تھی۔ اس فوج کا ایک تہائی حصہ شمال کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر اور ایک تہائی مرہٹوں پر مشتمل تھا۔ بقیہ فوج نیچی ذاتوں پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تر مرہٹے تھے۔ اُنچے طبقوں سے تعلق رکھنے والے مرہٹوں، برہمنوں، پرجوں اور سرسوتوں کو بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔

مدراس کی فوج کی بھرتی مقامی طور سے کی جاتی تھی اور اُس میں بہت سے قبیلوں اور ذاتوں سے تعلق رکھنے والے سپاہی تھے۔ چونکہ مدراس میں کوئی جنگجو طبقہ نہیں تھا اور برہمن سپاہی کا پیشہ اختیار نہیں کرتا چاہے تھے اس لیے مدراس کی فوج بڑی حد تک نیچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ زیادہ تر مسلمان شمالی ہند کے تھے۔ مدراس اور بمبئی کی فوجوں میں ایک تہائی مسلمان تھے اور دو تہائی ہندو۔⁽¹⁾

چربی لگے کارتوس

چربی لگے کارتوسوں نے بغاوت کرانے میں جو رول ادا کیا اُس کو ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈم ڈم کے اسلحہ خانے کے کمانڈر میجر یونٹین نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ حالانکہ چربی لگے کارتوس نے ہندوستانی سپاہیوں میں اشتعال پیدا کر دیا تھا لیکن جب اُس نے اُن سے پریڈ کروائی ”تو اُن میں سے کم سے کم ایک تہائی، جس میں ہندوستانی کیڈٹ افسر تھے، فوراً آ گئے۔ انہوں نے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئی رائفلوں کے

کارتوس بنانے کے طریقے پر واضح الفاظ میں اعتراضات کیے۔ سپریم کونسل کے رکن جزل لونس لودھ کی بے ضابطہ پیدل فوج کے متعلق اپنی تحریر میں کہا تھا ”مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس رجمنٹ کے زیادہ تر سپاہیوں نے غالباً حکومت یا اپنے افسروں کے خلاف کسی بے اطمینانی یا بے وفائی کا اظہار کرنے کی خاطر ان کارتوسوں کو کاٹنے سے انکار نہیں کیا بلکہ انہیں واقعی اس امر کا خوف ہے..... کہ کارتوس کاٹنے کی وجہ سے اُن کی ذات خراب ہو جائے گی اور آئندہ اُن کے کردار کے لوگوں کی دلوں میں عزت باقی نہیں رہے گی۔“ (1)

لیکن سپاہیوں کی شکایتوں میں سے چربی لگا کارتوس محض ایک بہانہ تھا۔ اس کو رواج دیے جانے کی بنا پر اُس کے خطرات بڑھ گئے اور اشتعال میں اضافہ ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے میں پائے جانے والے حالات میں ”بجائ کی فوج کا عمومی موقف تھا بغاوت۔“ (2) اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا؟ ہندوستانی سپاہی محض بھاڑے کا سپاہی تھا۔ فوج میں ملازمت کرنے کی جزوی وجہ تو تھی اُس کی ذات کی روایات اور جزوی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانی فوجیں تائید ہو چکی تھیں جن میں اُسے روزگار ملتا تھا اور کمپنی اُسے تنخواہ اور پیشہ کے علاوہ ایک ایسا پیشہ دیتی تھی جس کا وہ عادی تھا۔ کمپنی کی فوج کی فوجات نے اُس کو خود پسند بنا دیا اور ابتدا کے زمانے میں اُس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا جاتا تھا جس نے اُس میں ذاتی وفاداری اور باہمی اعتماد کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن نظام کی تبدیلی کے ساتھ حالات بھی خراب ہونے لگے اور یورپیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان دوری پیدا ہو گئی۔

ہندوستانیوں کی عزت نفس مجروح ہو گئی۔ شاہی خاندانوں کی بے حرمتی ہوئی۔ امیروں کا اثر زائل ہو گیا۔ بدیسی طاقت نے لوگوں کو سرنگوں کر دیا۔ طاقت کے قدیم مراکز کھنڈر بنا دیے گئے۔ قدیم طور طریقے ماند پڑ گئے۔ ایک دوسری نسل کے نئے انسان، جن کا مذہب، زبان اور تہذیب مختلف تھی، ملک کے باشندوں پر حکم چلانے لگے اور اُن کی توہین و تذلیل کرنے لگے۔ اس میں کیا تعجب کہ سول آبادی کے ساتھ سپاہی بھی غصے سے بھر گئے اور بدیسی حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ملک میں بغاوت کے لیے حالات سازگار تھے۔

یہ قدرتی امر ہے کہ مفتوح لوگ بدیسی حکومت کو ناپسند کرتے ہیں۔ انگریز اس سے واقف تھے۔ سر جان شور نے یہ مسئلہ اس وقت اٹھایا تھا جب اُس نے لکھا ”برطانوی نظام حکومت کے جو بھی فوائد ہوں لیکن بدیسی غلبے کی برائی اُن تمام فوائد پر پانی پھیر دیتی ہے۔“ میکالے نے کہا تھا ”سب سے بھاری ہوتا ہے اجنبی کا جوا۔“ فلسفی جان اسٹورٹ ل نے خیال ظاہر کیا تھا ”عام لوگوں کی حکومت بامعنی اور ایک حقیقت ہے۔ لیکن ایک قوم کی دوسری قوم پر حکومت کوئی وجود نہیں رکھتی۔ ایک قوم دوسری قوم کو محض خرگوشوں کا ایک جنگل تصور کر سکتی ہے یا اُسے ایک ایسا مخصوص علاقہ تصور کر سکتی ہے جہاں دولت کمالی جائے اور اپنی قوم

(1) ایضاً، صفحہ 242 (تعارف)

(2) کے اور ملیسن، بحول بال، جلد 1، صفحہ 242۔

کے لوگوں کے فائدے کے لئے اسے انسانی جانوروں کے فارم کے طور پر استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر حکومت کا صحیح کام ہے ان کی بھلائی جن پر وہ حکومت کرے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ قوم برلہ راست یہ خدمت سر انجام دے سکے۔“ (1)

VI بغاوت کی پیش رفت

چنانچہ دھماکہ ہوا اور پورا ملک قہرا گیا۔ اس کا اثر ہر علاقے میں محسوس کیا گیا۔ اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی سیاسی شورش تاریخ ہند میں ایک نیا حادثہ تھی۔ پچھلے زمانوں میں فاتح آئے اور خاندانوں کا تختہ الٹ گیا لیکن فتنہ و فساد زندگی کی اوپر سطح تک محدود رہا۔ کسی فتح کے نتیجے میں ہونے والی سیاسی تبدیلی عموماً کسی ایک علاقے تک محدود رہتی تھی۔ اگر پنجاب میں شورش پھوٹ پڑتی تھی تو ملک کے دوسرے حصے اُس سے مامون و محفوظ رہتے تھے جیسا کہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدلی کے حملوں کے وقت ہوا۔ انگریزوں نے بنگال فتح کیا لیکن سرانج الدولہ کے زوال نے لکھنؤ، دہلی، لاہور، حیدر آباد، پونا یا مدراس کو بالکل متاثر نہیں کیا۔ دو آبے میں جاؤں اور پنجاب میں سکھوں کی بغاوت کی آواز بازگشت کہیں اور سنائی نہیں دی۔ اورنگ زیب کے خلاف مہاتوں کی لڑائی ایک طاقتور سلطنت کے خلاف طویل جدوجہد تھی لیکن مہاراشٹر کے باہر اُس کا شور مشکل سے کسی نے سنا ہوگا۔ انیسویں صدی کے نصف اول کی بغاوتیں شور شیں علیحدہ علیحدہ رونما ہونے والے حادثات تھے۔

لیکن 1857 کی بغاوت ان سے بہت مختلف تھی۔ اس کی بنا پر ملک کے بڑے بڑے حصے نے بالواسطہ یا بلاواسطہ انداز سے انگریزی سرکار کی مزاحمت کی۔ بغاوت کی آگ بھڑکی اور اُس کے شعلے پورے ملک میں پھیل گئے۔ کچھ حصوں میں بغاوت نے خوں ریز جنگ کی شکل اختیار کی جس میں لاکھوں انسانوں نے حصہ لیا، دوسرے علاقوں میں مختلف مقامات پر مسلح بغاوتیں ہوئیں اور کچھ اور حصوں میں سول بد نظمی پھوٹ پڑی۔ لیکن ملک کا کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جس نے حاکموں کو تشویش میں مبتلا نہ کیا ہو اور جہاں بغاوت کا خطرہ نہ پیدا ہوا ہو۔

بنگال سے پنجاب تک شمالی ہندوستان میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ دوسرے صدیوں میں حالانکہ وہاں کے خصوصی حالات نے بے چینی کو بغاوت کی شکل اختیار نہیں کرنے دی پھر بھی لوگ مطمئن نہیں تھے۔ جس طبقے نے بغاوت کی حمایت نہیں کی وہ تھانیا متوسط طبقہ جس نے مغربی تعلیم پائی تھی۔ لیکن اُن کی تعداد کم تھی اور وہ پریڈیٹری شہروں تک محدود تھے۔ اُن کے متعلق ٹرو لین نے لکھا ہے ”انگریزوں کے گلے کاٹنے کے بجائے وہ اُن کے ساتھ گرنڈ چیوری اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ پنجاب اور نیپال کی سیاست کے مطلق قیاس آرائی کرنے کے بجائے وہ مباحث اُن کی انجمنوں میں، جو انہوں

نے قائم کر لی تھیں، انگریزی میں دو خطابت دے کر طباعت و آزادی اظہار کے فوائد پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔“ (۱)

چنانچہ تعلیم یافتہ بنگال نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن فوج نے بغاوت کی جو بالائی ہند سے تعلق رکھنے والے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ بارک پور میں، جو کلکتہ سے 16 میل کی دوری پر واقع ہے، ۲۹ مارچ 1857ء کو مشکل پانڈے آگے بڑھا اور اُس نے اپنے ساتھیوں کو مذہب کے لیے ضرب لگانے کی دعوت دی۔ اُس کے بعد ہفتوں اور مہینوں میں کلکتہ میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا بار بار خطرہ پیدا ہوا اور یورپین بہت دنوں تک اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے رہے۔ کلکتہ کے باہر کئی مقامات پر یا تو بغاوت ہوئی یا اُس کا خطرہ پیدا ہو گیا مثلاً بیر بھوم، بالکورا، جیسور، کرشن نگر، مالدا، ڈھاکہ، فریڈ پور، بافرنچ، حیدرہ، سلہٹ، چٹاگانگ، کھاسی اور جیجیکا کی پہاڑیاں۔

آسام

آسام میں 1832ء سے تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہی تھیں۔ آسام کے آخری بادشاہ پر بندر سنگھ کو اپنی سلطنت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کے بوجھ کے نتیجے میں لوگ پس رہے تھے جو اُن پر لادی گئی تھی۔ اُس وقت کے دیوانی متی رام دت نے 1853ء میں حکومت کو پیش کی جانے والی ایک یادداشت میں کہا تھا ”شاہنشاہوں میں لکھا ہے کہ حکمرانوں کو پاکبازی سے کام لینا چاہئے اور اُس کی خوشحالی پر نظر رکھتے ہوئے اپنی رعایا پر انصاف کے ساتھ حکومت کرنی چاہئے۔ اس وقت اس پر عمل نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اس کے برعکس کاروائی ہو رہی ہے۔ اس قسم کے گناہوں اور لاپرواہیوں کا خمیازہ ایک سرحدی ریاست میں بھی بھگتنا پڑے گا“ اور سابق مقامی حکومت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ لیکن مقامی حکام اور گورنر جنرل دونوں نے یہ اپیل خارج کر دی۔

جس وقت 1857ء کی بغاوت شروع ہوئی اُس وقت متی رام کلکتہ میں تھا۔ ناکامیوں نے اس کے دل میں غم و غصہ بھر دیا تھا اس لیے اُس نے باغیوں کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے قدیم امیروں کے خاندانوں کو خطوط لکھے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ 1857ء میں چاند کی آٹھویں تاریخ کو وہ بغاوت کریں گے اور آسام کے آخری تاجدار کے پوتے کندر پیور سنگھ کو تخت پر بٹھادیں گے۔

لیکن ایک پیغامبر کی بے اعتیادگی کی بنا پر سازش کا علم حکومت کو ہو گیا جس نے اُس کو کچلنے کے فوری اقدامات کیے۔ کندر پیور سنگھ کو اُس کے محل سے اور متی رام کو کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ محبت وطن عناصر کے لیے آسام کا کوٹا ناگچھان ڈال دیا گیا۔ متی رام اور بیالی برادر پر مقدمہ چلا اور اُن دونوں کو ایک ہی دن یعنی 26 فروری 1858ء کو پھانسی دی گئی۔ دوسروں کو مختلف مدتوں کی قید کی سزائیں دی گئیں اور دوبارہ آزادی حاصل کرنے کی آسامی امیروں کی کوشش ناکام بنادی گئی۔

اُزیرہ میں حالات مختلف تھے۔ 1803ء میں اُس کے الحاق کے بعد دو تہائی اُزیرہ زمیندار ختم کر دیے گئے اور اُن کی جگہ بنگالی زمینداروں نے لی۔ کاشتکاروں کے طبقے کو بھی بہت نقصان پہنچا اور اُن

میں سے پاکوں کو، جو اڑیسہ کے خطر انوں کی کسانوں کی نیم فوجی تنظیموں میں شامل تھے، کمپنی کی حکومت کے چھوٹے حکام کچلنے لگے اور ان کا خون چوسنے لگے۔ چونکہ گم سورا، باؤ اور انگل کے سردار انگریزوں کے اقتدار اعلیٰ کی مزاحمت کر رہے تھے اس لیے اڑیسہ میں بد نظمی پھیل ہوئی تھی۔ ایک اور مظلوم عنصر تھا کھونڈ کا آدمی واسی قبیلہ جو اُس علاقے میں آباد تھا۔

1857ء میں غیر مطمئن عناصر متحد ہو گئے اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔ سبیل پور کے شہزادوں سر ندر سانی اور اہل سانی کو، جو ہزاری بارغ نیل میں بند تھے، باغی سپاہیوں نے پھڑ لیا اور انہوں نے بغاوت کی قیادت سنبھال لی۔ بغاوت کا جھنڈا بلند کیا گیا اور انگریزی حکومت سے ٹکرائی گئی۔ سبیل پور کے آس پاس کا پور علاقہ عارضی طور سے باغیوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ بالآخر 1862ء میں سر ندر سنگھ نے خود کو انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ جلا وطن کر دیا گیا۔ اُس وقت بھی مالکان اراضی اور کسانوں نے حکومت سے درخواست کی کہ اُسے گدی پر بحال کر دیا جائے۔

پرکلی میدی کے زمیندار پنجم کے ایک آدمی واسی قبیلے سواروں نے راوہا کرشن ڈنڈ سینا کی قیادت کی۔ کوتیہ کھونڈوں نے بھی بغاوت کی۔

چھوٹا ناگپور

چھوٹا ناگپور میں، جو اُس وقت بنگال کا حصہ تھا، پالاموں، ہزاری بارغ، رانچی، سنگھ بھوم، مان بھوم اور سبیل پور کے ضلعوں میں بغاوتیں ہوئیں۔ حالات اتنے خراب ہو گئے کہ انگریز افسروں کو ”مصلوں کو ناکام بنانے، چھوٹی موٹی شورشوں کو فرو کرنے، حکومت کے دعویداروں کو کچلنے، مسلح لیروں کی سرکوبی کرنے، اُن مقامات کو دوبارہ حاصل کرنے پر اچانک قبضہ کر لیا گیا تھا اور مظالم کا انتظام لینے کا دشاوار کام کرنا پڑا“۔ (1)

ان شورشوں میں حصہ لینے والے تھے آدمی واسی قبیلے اور مالکان اراضی۔ باغی سپاہیوں اور غیر مطمئن زمینداروں کا مقصد تھا بابو کنڈر سنگھ کے ساتھ اشتراک عمل کرنا۔ پوراہٹ کے راجا کی قیادت میں سنگھ بھوم کے کونوں اور پالاموں کے چیر داور کھیر داڑ قبیلوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور کئی مہینوں تک گوریلا جنگ جاری رکھی۔

شمالی ہندوستان

اُس وسیع میدان میں جو بنگال کی سرحد سے پنجاب تک پھیلا ہوا ہے بڑے پیمانے پر بغاوت ہوئی۔ جو لوگ اس کی وسعت کو کم کر کے پیش کرنے کی طرف مائل تھے انھیں بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اُس علاقے میں بغاوت نے کم سے کم ایک عمومی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اودھ، ردھیل، کھنڈ، بندیل

کھنڈ، الہ آباد، آگرہ اور میرٹھ کی کمشنریوں اور مغربی بہار میں ”زیادہ تر لوگوں نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی“ اور ”عام لوگوں اور سپاہیوں کی بغاوتیں قریب قریب ایک ہی وقت میں تھیں۔“ (1)

ڈف نے ڈاکٹر ٹوئیڈی کے نام اپنے خط مورخہ 10، ستمبر 1857ء میں بڑی صحت کے ساتھ اس کی نوعیت کو پیش کیا تھا۔ ”اس بات کی تصدیق ہر نیا حوالہ کرتا ہے کہ یہ بغاوت ایک ایسی بغاوت ہے جو کسی فوری وجہ کی بنا پر وجود میں نہیں آئی۔ یہ ایسی بغاوت ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک غیر فطری صف میں لا کھڑا کیا ہے، ایسی بغاوت جس کو اودھ کی پوری آبادی ہوا دیر ہی ہے اور جاری رکھے ہوئے ہے بالواسطہ یا بالواسطہ انداز سے جس سے ہمدردی اور جس کی حمایت آس پاس کے قریب قریب آدھے صوبے کر رہے ہیں۔“ (2)

بہار

اس علاقے کے مشرقی حصے یعنی بہار میں بغاوت کی پہلی چنگاری سنہ 1857ء میں واقعہ بنی میں نظر آئی جہاں ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے افسروں پر حملہ کیا۔ جلد ہی پورے بہار میں بغاوت کی آگ پھیل گئی جہاں بے اطمینانی پہلے سے پائی جاتی تھی۔ گنگاپار کے شمال ضلعوں میں پورنیا سے چمپارن تک یہ چنگاریاں بھڑک کے شعلے بن گئیں۔ شاہ آباد، پٹنہ اور گیا کے اضلاع وہ خاص خاص مرکز تھے جہاں بغاوت کا سب سے زیادہ اثر پڑا۔ جلدیش پور کے بابو کنور سنگھ اور ان کی موت کے بعد ان کے بھائی امر سنگھ نے باغی فوجوں کی قیادت کی۔ کچھ مدت کے لیے بہار کے حصوں میں برطانوی حکومت کی جگہ بانیوں نے لے لی۔

بغاوت شروع ہوئی تھی ہندوستانی فوج میں لیکن جلد ہی سول آبادی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ ایک انگریز فوجی افسر نے لکھا تھا ”پہلے تو یہ محض فوجی بغاوت لگی لیکن جلد ہی اس کی نوعیت بدل گئی اور اس نے قومی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ بہار کے راجپوت گاؤں میں اور بنارس، اعظم گڑھ، گورکھپور کے ضلعوں، پورے دو آبے میں جوالہ آباد، کانپور، میرٹھ اور آگرہ کمشنریوں پر مشتمل ہے ہماری حکومت ختم کر دی گئی اور ہمارے خلاف اعلان جنگ کیا گیا۔“ (3) پٹنہ ڈویژن کے کمشنر سیولکس نے بنگال کی حکومت کو لکھا کہ ”شاہ آباد میں اس تحریک نے ایک فوجی بغاوت کا رکارڈ حاصل کر لیا ہے۔“ (4) ٹریلر نے حکومت کو اطلاع دی تھی کہ ”پچھرا کے مغرب کے ضلعوں میں لوگ ٹھہر گئے بغاوت کر رہے ہیں۔“ (5)۔

بہار کے ہندو اور مسلمان شانے سے شانہ ملا کر لڑے 46-1845ء میں بھی وہ حکومت کے خلاف مشترکہ اقدام کر چکے تھے۔ جب 1857ء کی بغاوت شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے مشترکہ محاذ کو

(1) ایضاً، جلد پنجم، صفحہ 293۔

(2) ایضاً، لے، محولہ، ص 220۔

(3) The Mutiny of the Bengal Army (دسمبر 1857ء) (جی۔ بی۔ ملیسن)، صفحہ 53۔ اقتباس کے۔ کے۔ دت

History of Freedom Movement in Bihar، جلد 10، صفحہ 10۔

(4) سیولکس، ایس۔ اے، Brief Narrative of Events Connected with the Removal of،

Taylor، ت، ایضاً صفحہ 10۔

(5) ت، ایضاً، صفحہ 18۔

برقرار رکھا۔ یہ اتحاد حکمرانوں کے مفاد کے منافی تھا اور وہ اُسے مسلمانوں کی سازش تصور کرتے تھے جو ہندوؤں کی شکایتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لیکن اُس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دونوں مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والوں نے بہار اور ملک کے دوسرے حصوں میں گوارا اٹھائی تھی۔ جہاں تک بہار کا تعلق ہے اس کی تصدیق پنڈے کے کٹھن ٹیلر نے کی جو پہلے ہی مشورہ دے چکا تھا کہ پولیس کے پرانے دستوں کو ہر طرف کر دیا جائے اور نئے دستے کھڑے کیے جائیں ”جن میں کوئی راجپوت، برہمن یا مسلمان بھرتی نہ کیا جائے“۔ (۱) بہار میں بغاوت کی عام نوعیت کے پیش نظر تمام شمالی اور جنوبی بہار میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

مولویوں اور پنڈتوں دونوں نے باغیوں کی ہمت افزائی کی۔ پنڈے کشتری میں پیر علی کی طرح کے مسلمان رہنماؤں نے شورش کو ہوا دی۔ راجپوت اور مسلمان زمینداروں باغیوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ صادق پور کے مولوی، جو نامہ اراخان کے وارث تھے، نرہٹ کا زمیندار اور نواوا، جہان آباد، راجگیر، امرتھو، پاتا، وغیرہ کے ہندو اور مسلم زمیندار ان سب نے ہتھیار اٹکے عمل کیا۔

بہار کے سرکردہ رہنما تھے ضلع شاہ آباد میں واقع جگدیش پور کے معمر بابو کنور سنگھ۔ وہ اس تحریک کے مرکزی کردار تھے۔ اُن کی بھادری، تنظیمی صلاحیت اور فوجی سوجھ بوجھ نے اُن کے دشمنوں کو بھی متاثر کیا۔ تمام گروہوں نے اُن کے ساتھ اتحاد کیا چاہے وہ پیر علی، یوسف علی، امدادین وغیرہ کی قیادت میں ہوں یا دہلی کے حامی یعنی علی کریم، وارث علی وغیرہ کی قیادت میں۔ جب دیتاپور کے سپاہیوں نے بغاوت کی تو انہوں نے دہلی کے بادشاہ کے نعرے بلند کیے اور کنور سنگھ کو اپنا کمانڈر بنایا۔ کنور سنگھ کامرکڑ تھا بہار اور وہاں سے انہوں نے ریوا، باندہ اور کاپسی تک اپنی سرگرمیاں بوجھائیں اور کانپور کے ضلع میں انگریزوں کے خلاف لڑائی میں تاتا صاحب کی لہ ادا کی۔ کانپور سے وہ لکھنؤ گئے اور اُس کے بعد بہار واپس چلے گئے جہاں ایک معرکہ کی جنگ کے بعد اپریل 1858ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

اتر پردیش

اتر پردیش میں (جو اُس زمانے میں صوبجات شمال۔ مغرب و اوڈھ کہلاتا تھا) بغاوت کا جذبہ سب سے زیادہ شدید تھا۔ یہ سپاہیوں کا وطن تھا اور وہ علاقہ تھا جسے مغل سلطنت کا دل کہنا چاہئے۔ یہاں ہندوؤں کے مقدس مقامات اور اُن کی قدیم اور وسطی تہذیب کے مشہور مرکز واقع تھے یعنی دہلی، آگرہ، لکھنؤ، متھرا، اجودھیا، پرباگ اور بنارس۔ یہ وہ شہر ہیں جن کے نام ناقابل فراموش یادوں کو جنم دیتے ہیں۔ اُن کے ناموں کے ساتھ ہندوستان کے لوگوں کے پر جوش عزائم اور عظیم کارنامے جڑے ہوئے ہیں۔ دہلی کا اہل قلعہ ماضی کی عظمت اور شان و شوکت کی علامت تھا۔

اتر پردیش کی آٹھ کشتریوں میں سے ہر ایک میں شورش پھوٹ پڑی تھی اور بہت سے علاقوں میں برطانوی حکومت ختم ہو گئی تھی۔ بے چینی اور بالچل بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی لیکن 10 مئی 1857ء کو میرٹھ میں شروع ہونے والی بغاوت نے پورے صوبے میں عام شورش پھیلادی۔ کچھ مقامات پر، جہاں کپہنی کی فوجیں نہیں تھیں، عالم لوگوں نے پہل کی جگہ دوسرے مقامات پر پہلے ہندوستانی سپاہیوں کی

رہنماؤں نے بغاوت کی اور اُس کے بعد عام لوگ اُس میں شریک ہو گئے۔

سول آباد کے رہنما مالکان اراضی کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ صوبے کے مغربی حصوں میں گوجر، جاٹ اور راجپوت پیش پیش تھے۔ لیکن اس تحریک کے اہم حامی تھے راجپوت یعنی چوہان، بائی، پٹواری، گوڑ، پنوار وغیرہ جو پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ روہیلکھنڈ کے روہیلے اور پورے صوبے کے مسلمان زمیندار اس میں شامل ہو گئے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بغاوت کی روح رواں تھے۔ شہروں اور دیہات میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں مولویوں اور پنڈتوں نے اہم رول ادا کیا جیسا کہ وہ بہار میں کر رہے تھے۔ ہر جگہ باغیوں نے بڑی تعداد میں برطانوی حکومت کا مقابلہ کیا۔ فوج کے سپاہیوں کے علاوہ دیہی حکمرانوں اور سرداروں کے بہت سے سپاہیوں اور زمینداروں کے عملوں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ محاصرہ کے دوران مکانات کے اندازے کے مطابق دہلی میں 40,000 سے لیکر 60,000 تک سپاہی موجود تھے۔ کانپور میں تاتا صاحب کے مجنڈ کے نیچے تقریباً 58,000 مجاہد جمع ہو گئے تھے جن میں سے تقریباً 20,000 سپاہی تھے۔ خان بہادر خان کی کمان میں کئی ہزار راجپوت اور روہیلوں کی فوج تھی۔ فیض آباد کے ضلعوں میں شکر پور کے رانا بنی مادھو سنگھ کے 15,000 محلی سپاہی تھے اور تقریباً 85,000 باغی انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ گورکھپور کی کیشوری میں مغلادر سنگھ کی قیادت میں 51,000 باغیوں نے ترائی کے جنگوں میں رہ کر حکومت کا مقابلہ کیا۔ گورکھپور کے ناظم محمد حسن خاں کے ساتھ دس سے بارہ ہزار تک فوج تھی جن میں سے آدھے سپاہی تھے۔ یہ بات مبالغے پر مبنی نہیں ہوگی اگر کہا جائے کہ لڑائی میں عملی حصہ لینے والوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ظاہر ہے کہ پانچ لاکھ تعداد بڑی تعداد ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تمام مالکان اراضی بغاوت میں شامل نہیں ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ زمینداروں کی خاصی تعداد نے اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر گورکھپور کے میر محمد حسن اور سلطان پور کے مہدی حسن کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کی سرکریوں نے بہت سے ہندو اور مسلمان غیر مطمئن سرداروں کو تحریک میں شامل ہونے پر آمادہ کر دیا۔ بہرائچ، گونڈہ، پردوار چندوکی وغیرہ میں خاص طور سے بہت بدامنی پھیل گئی۔ بانداس میں "ایک چھوٹے بھی ایسا نہیں تھا جو کسی نہ کسی حد تک تحریک سے وابستہ نہ تھا" (1)

دہلی

میرٹھ میں 10، مئی 1857ء کو خطرے کی گھنٹی بجی، باغی فوجیں دہلی کی طرف بڑھیں اور بہادر شاہ سے انہوں نے درخواست کی کہ وہ ہندوستان کے شہنشاہ کی جائز حیثیت اختیار کریں۔ ابتدا میں وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے لیکن شدید خطرات کے باوجود انہوں نے کانٹوں کا تاج پہن ہی لیا۔ اس کا فوری اثر ہوا۔ کچینی کے دعوے بے نقاب ہو گئے۔ (2) قانون اور اخلاق کی نظر میں کچینی محض غاصب تھی۔ اُس نے اُس بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی جس نے اُسے محصول کنندہ محاصل کے عہدہ پر مقرر کیا تھا یعنی بنگال کی

(1) Narrative of Events in Banda، سورج 41، جنوری 1857ء، اڈالیف، اور مین، مجسٹریٹ باندہ۔

(2) Proceedings of the Trial of Bahadur Shah (2) Press of Mutiny Papers، 1921، 1895ء، کلکتہ۔

سین۔ ایس۔ این، جولوہ 11، صفحات 69-75، ملیسن، کرمل جی۔ بی۔ 58-59، History of the Indian Mutiny، 1857ء۔

(اندون 1879ء، سید دوم، صفحات 72-73، پہلے سوم، سنی 387۔)

دیوانی عطا کی تھی۔ اب کچھنی کے خلاف یہ الزام ثابت ہو چکا تھا کہ اُس نے اطاعت سے منہ موڑا اور اپنے مالک کے خلاف تشدد سے کام کیا۔ برطانوی حکومت کے خلاف اور اُس کو اکھاڑنے کے لیے ہر طرف ایک سورش پھیل گئی۔ اس کے اثرات اُن تمام چھاونیوں کے علاوہ، جہاں ہندوستانی سپاہی مقیم تھے، پورے ہندوستان کے بہت سے شہروں اور گاؤں میں محسوس کیے گئے۔

شمالی ہندوستان کے وسطی علاقے میں اس بغاوت نے ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ پورے اتر پردیش بشمول اودھ، بہار کے بہت سے ضلعوں، چھوٹا ناگپور، وسطی ہند، مالوا، بندیل کھنڈ اور صوبہات متوسط میں لوگوں نے تلواری اٹھائی۔ ہر جگہ جنگ و جدل کا منظر دکھائی دینے لگا۔ لوگ غم و غصے کے جذبات سے مغلوب ہو گئے اور دردناک مظالم کیے گئے۔ دہلی وہ مرکز تھا جس کی طرف اس علاقے کے تمام لوگوں کی نظریں اٹھتی تھیں۔ بہادر شاہ کے تاج و تخت قبول کرنے کے بعد لوگوں کو ایک ایسا مرکز مل گیا جہاں برطانوی حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والے جمع ہو گئے۔ سپاہیوں کی باغی رچھوں کا اولین کام تھا دہلی کی طرف بڑھنا اور باغی رہنماؤں نے مغل شہنشاہ کی نیابت کا اعلان کر دیا۔

دہلی کا محاصرہ 11 مئی سے 20 ستمبر تک جاری رہا۔ انگریزوں نے 20 ستمبر کو شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے کے واقعات بہادری اور غدار، سول انتظام اور فوجی کاروائیوں کی بڑھتی ہوئی دشواریوں، خاص خاص مشیروں کے اختلافات اور کچھ رہنماؤں کی اٹل ثابت قدمی کی ملی جلی کہانیاں سناتے ہیں۔ اُن سب کے درمیان بہادر شاہ کی شخصیت تھی جو اتحاد اور شہر میں امن و امان کے خواہش مند تھے۔ اور محاصرہ ختم کرنے کے لیے زور دار اقدامات کے خواہاں۔ سرکاری فرائض پورے کرنے اور تمام سول اور فوجی معاملات میں فیصلے کرنے کی غرض سے ایک کونسل مقرر کی گئی تھی۔ یہ کونسل فوج اور سول حکام کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔

ابتداء میں فوج کی قیادت مغل شہزادے کر رہے تھے لیکن جولائی کے شروع میں جب بخت خاں بریلی سے دہلی آ گئے تو اعلیٰ کمان اُن کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن یہ لڑائی دو غیر مساوی فریقین کی لڑائی تھی۔ ایک طرف ایک منظم طاقت تھی جس کے وسائل روز بروز بڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف وہ فوج تھی جو شہر کے حدود میں محصور تھی، جس کے سپاہی اور افسر نا تجربہ کار تھے۔ اور جنگی وسائل دن بدن کم ہوتے جا رہے تھے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود دہلی نے سخت مقابلہ کیا اور محاصرہ کرنے والی فوج پر بار بار حملے کیے۔ ایک وقت تو دہلی والوں نے خود محاصرہ کرنے والوں کو محصور کر لیا تھا۔ لیکن پنجاب سے آنے والی بڑی کمک نے پانہ پلٹ دیا اور دہلی کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔

آس پاس کے ضلعوں کی قسمت دہلی سے جڑی ہوئی تھی۔ گوڑھکوں کے ضلع میں وہاں کے سرداروں اور عام لوگوں نے شہنشاہ کا ساتھ دیا۔ دہلی کی ہمدردی میں حصہ اور وہ جنگ میں بھی بغاوت پھوٹ پڑی اور اُن کا بھی وہی حشر ہوا جو دہلی کا ہوا۔

دہلی کے باہر ہونے والی بغاوتیں

دہلی میں بغاوت کے جو شعلے بھڑکے تھے انہوں نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلے وہ دہلی کے آس پاس کے ضلعوں میں پھیلی۔ سر دھنہ اور باغپت میں 11 اور 12 مئی کو بغاوتیں ہوئیں۔ رزکی 13 مئی کو آزاد کرالیا گیا اور 26 مئی کو بلند شہر میں ایک مغل گورنر مقرر کیا گیا۔ مظفر نگر میں 14 مئی کو، علی گڑھ میں 20 مئی کو اور سہارن پور میں 30 مئی کو بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ اس طرح صوبے کی زیادہ تر محضری کشنریوں میں شورش پھیل گئی۔ روہیل کھنڈ میں بغاوت مئی میں شروع ہوئی اور خان بہادر نے ۳۱ مئی کو انتظام سنبھال لیا۔ بریلی کے بعد رام پور، مراوا آباد، امر دہہ، بجنور، بدایوں اور شاہجہاں پور میں بغاوتیں ہوئیں۔ فرخ آباد میں سپاہیوں نے نواب قاضی حسین خاں کی اطاعت قبول کر لی اور فتح گڑھ اور سیتا پور بھی ان کے زیر نگیں آ گئے۔

آگرہ

آگرہ کشنری آگرہ، متھرا، مین پوری اور اٹاوا کے اضلاع پر مشتمل تھی۔ آگرہ صوبے کا صدر مقام تھا اور لیفٹنٹ گورنر وہاں رہتا تھا۔ دہلی سے بغاوت کی خبر آنے کے فوراً بعد وہاں بھی طوفان کے آثار نظر آنے لگے۔ علی گڑھ اور بلند شہر کے واقعات نے 23 مئی کو مین پوری میں اور 20 مئی کو اٹاوا میں بغاوت شروع کر دی اور جلد ہی باغیوں کا آگرے پر قبضہ ہو گیا۔ بھرت پور کی فوج نے جولائی کے شروع میں بغاوت کر دی۔ باغیوں نے آگرے کے قریب ساسیہ کے مقام پر انگریزی فوجوں کو 8 جولائی کو شکست دی اور لیفٹنٹ گورنر اور آگرے میں رہنے والے انگریزوں نے قلعہ میں پناہ لی۔ مئی کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہاتھرس، متھرا اور دوسرے قریبی اضلاع میں بغاوت شروع ہو چکی تھی۔

الہ آباد کی کشنریوں میں بغاوت پہلے ہی شروع ہو چکی تھی اور یہاں دونوں فریق کچھ انتہائی نفرت انگیز کاروائیوں کے مرتکب ہوئے۔ لیکن جلد ہی جب مولوی لیاقت علی نے فوجی قیادت سنبھالی تو پورے کے پورے دہلی علاقے میں شورش پھوٹ پڑی۔

”اس شخص نے، جو ذات کے اعتبار سے بکر اور پیشہ کے اعتبار سے مدرس تھا، گاؤں میں اپنے انتہائی تقدس کی بنا پر عزت حاصل کر لی بغاوت شروع ہونے کے بعد پرگنہ چائل کے زمینداروں نے ان کی قیادت قبول کر لی اور ان کی سربراہی میں شہر کی طرف بڑھے۔ وہاں انھیں دہلی کے بادشاہ کی طرف ضلع کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔“ (1) فتح پور، باند اور ہمیر پور بھی جلد ہی بغاوت میں شامل ہو گئے۔

کانپور

لیکن کانپور میں، جو کبھی کی فوجی قلعے کا صدر مقام تھا، دل دہلا دینے والے نفرت انگیز واقعات رونما ہوئے۔ سپاہیوں میں 14 مئی سے بھجان واشتعال پلایا جاتا تھا اور وہ اپنے بال بچوں کو واپس گھروں کو بھیج رہے تھے۔ خیال تھا کہ 24 مئی کو بغاوت شروع ہوگی جو عید کا دن تھا۔ لیکن حقیقت میں بغاوت 4 جون کو شروع ہوئی۔ باغیوں نے خزانہ چھین لیا، جیل کا پھاٹک کھول دیا، اسلحہ خانے اور سرکاری دفاتر پر قبضہ کر لیا اور دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ نانا صاحب کو رہنما بنایا گیا اور عظیم اللہ کو ان کا مشیر خاص مقرر کیا گیا۔ ابھی وہ کلیان پور تک ہی پہنچے تھے کہ پردہ گرام تبدیل ہو گیا اور کانپور کو واپسی کا حکم دیا گیا۔ باغیوں نے دہلی کے کیمپ پر حملہ کیا اور تین ہفتے کے محاصرے کے بعد انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ نانا صاحب کو پیشوا بنایا گیا۔

جھانسی

بندیل کھنڈ مرہٹہ سلطنت کا حصہ رہ چکا تھا۔ اس میں جھانسی اور باند اشامل تھے جن پر مرہٹہ والیان ریاست حکومت کرتے تھے۔ جھانسی کے گونگا دھر راؤ کا انتقال 1854ء میں ہوا۔ اُس نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ ڈیوبھی نے 1817ء کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اُس ریاست کا الحاق کر لیا۔ یہ وہ رانی کھنڈی بائی کی کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ اُس وقت اور زیادہ سختی پیدا ہو گئی جب مندروں کی معافیاں ختم کر دی گئیں۔ باپوسی نے جان پر کھیل جانے کی دعوت دی۔ رانی کے ایک ملازم برہمن لکشمی راؤ نے سپاہیوں کو بھڑکایا جنہوں نے 4 جون کو مقامی افسروں کی حکم عدولی شروع کر دی اور تشدد اور قتل و غارت پر اتر آئے۔ رانی کو ریاست کا والی مقرر کیا گیا۔ انہوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ باغیوں کی قیادت کی، بہادری کے ساتھ انگریزی فوجوں کے خلاف لڑیں اور میدان جنگ میں ایک سپاہی کی طرح شہید ہوئیں۔ باندہ کے نواب نے بھی، جو پیشوا خاندان کا ایک رکن تھا، باغیوں کا ساتھ دیا اور اپنی ریاست کھودی۔

بنارس

شمال مغربی صوبجات کی مشرق کی طرف آخری کٹھنری تھی بنارس۔ وہ شہر صرف ہندوؤں کا مقدس مقام اور مہاراجا کا مستقر ہی نہیں تھا بلکہ دہلی کے شاہی خاندان کے کچھ افراد بھی وہاں رہتے تھے۔ مئی کے شروع میں انگریز افسروں نے چنار جانے کا منصوبہ بنالیا تھا چونکہ وہاں بد امنی نہیں پھیلی تھی اس لیے یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ لیکن 21 مئی کو وہاں بغاوت پھوٹ پڑی۔ سپاہیوں سے ۳ جون کو اسلحہ واپس لے لیے گئے جس کی وجہ سے فوراً بغاوت شروع ہو گئی۔ مارشل لاء نافذ کر دیا گیا لیکن یہی علاقے باغیوں کے ہاتھوں میں رہے۔ ”دیہاتی سماج کی سطح پر وہ عظیم تحریک ابھرنے لگی جس نے وہیں جنم لیا تھا۔“ (۱)

اعظم گڑھ میں شعلے پہلے ہی سے بھڑک رہے تھے جو پور میں ۵ جون کو بغاوت پھوٹ پڑی اور لدھیانہ کی سکھ رجمنٹ نے اُس میں حصہ لیا۔ گورکھپور میں ۶ جون کو سپاہیوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن قیدیوں نے جیل کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور سپاہیوں نے خزانے پر قبضہ کرنے کا منصوبہ ناکام بنادیا گیا اور انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے پھر بھی ضلع میں بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غازی پور میں شورش پھوٹ پڑی تھی اور سکھ ایسی میں سپاہی بغاوت کر چکے تھے۔ اگست کے شروع میں حالات نے بدتر شکل اختیار کر لی اور انگریزوں کو گورکھپور سے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اُس کے بعد کنور سکھ کی طوفانی ہجم کے نتیجے میں انگریزوں کو اعظم گڑھ سے بھی ہٹا پڑا۔

اودھ اور لکھنؤ کا محاصرہ

الحاق کے بعد برطانوی حکام لوٹ کھسوٹ کی بنا پر اودھ بڑے دکھوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُن کے خلاف یہ الزام لگائے گئے تھے کہ ”انہوں نے لکھنؤ کے شاہانہ محلوں کو اصطبلوں اور لٹے خانوں میں تبدیل کر دیا، یہ کہ بادشاہ کے مصاحبوں کی نازک اندام بیٹیوں کو بے گھر اور بے سہارا بنادیا، یہ کہ خزانوں کے قفل توڑ کر انہیں لوٹ لیا گیا، یہ کہ شاہی خاندان کے نجی املاک کو نیشام کر دیا گیا اور یہ کہ بہت سی ایسی باتیں کی گئیں جو صرف بادشاہ کی رعایا کے لیے توہین آمیز ہیں بلکہ خود ہمارے لیے شرمناک تر ہیں۔“ (۱)

ان الزامات کی تحقیقات کرانے کی کمینیک کی کوششوں کو لکھنؤ میں مقیم اس کے نمائندے نے ناکام بنادیا۔ اس کی وجہ سے بے اطمینانی اور بڑھ گئی۔

واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی نے لوگوں میں سخت غم و غصہ پیدا کر دیا تھا۔ ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں تھی جو حالات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُن میں سے ایک تھے مولوی احمد اللہ شاہ جنہوں نے 57-1856ء کے موسم سرما میں شمالی صوبوں کا دورہ کیا اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے لکھنؤ اور اودھ کے دوسرے اضلاع میں بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں۔ نانا صاحب کے ساتھ عظیم اللہ بھی لکھنؤ گئے۔

اپریل کی 3 تاریخ کو حکم عدولی کے آثار نظر آنے لگے اور بغاوت کی تیاری ہونے لگی لیکن سپاہیوں سے اسلحہ واپس لے لیے گئے۔ نانا صاحب اور عظیم اللہ نے اودھ کے دوسرے اضلاع کا بھی دورہ کیا۔ دہلی سے آنے والی خبروں نے انگریزوں کو خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہوں نے فوراً ضروری حفاظتی انتظامات کیے۔ لیکن مئی کے آخری ہفتے میں طوفان پھوٹ پڑا اور 30 تاریخ کو سپاہیوں کی بغاوت شروع ہو گئی۔ شعلوں نے لکھنؤ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جلد ہی سیتاپور (30 جون)، محمدی (4 جون)، کھیم پور کھیری (4 جون)، فیض آباد (5 جون)، بہرائچ (9 جون)، سلطان پور (9 جون) اور گونڈا (10 جون) تک پھیل گئے۔ چنانچہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے اودھ میں ایک ضلع بھی ایسا نہیں تھا جو باغیوں کے قبضے میں نہ آ گیا ہو۔

لکھنؤ میںواجد علی شاہ کے گیارہ سالہ بیٹے برہمچند کو اُن کی ماں حضرت محل کی ولایت میں

ولی مقرر کیا گیا۔ انتظام ایک کمپنی کے سپرد تھا جو ہندو اور مسلمان مشیروں پر مشتمل تھی۔ انھیں معلوم ہوا کہ انگریزوں نے ریزید کی قلعہ بندی کر لی ہے اور وہاں وہ ملک کے آنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ انقلابیوں کی حکمت عملی کا تقاضہ تھا کہ انگریز فوج کو لکھنؤ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اور محصور دستے تک غذائی اجناس نہ پہنچنے دی جائیں تاکہ قافلوں کی تاب نہ لا کر وہ ہتھیار ڈال دیں۔ ریزید نیسی کے لیے جنگ جون 1857ء کے وسط سے شروع ہوئی اور فریقین کی ہلاکت کے ساتھ 21 مارچ 1858ء تک جاری رہی بالآخر انگریزی فوج نے لکھنؤ پر قبضہ کر لیا۔ مولوی احمد اللہ شاہ آخری دم تک بہادری کے ساتھ لڑتے رہے۔ حضرت محل ہاتھی پر بیٹھ کر میدان جنگ میں اپنی فوج کی ہمت بڑھاتی تھیں۔ جب لکھنؤ ہاتھ سے نکل گیا تو مولوی احمد اللہ شاہ نے گوریلا جنگ شروع کی۔ روہیلکھنڈ میں دوا شجاعت دیتے تھے اور کبھی اودھ میں۔ لیکن جب انہوں نے محمدی کو اپنا مستقر بنالیا تو پوہن کے راجہ نے ان سے غداری کی اور انہیں قتل کر دیا۔ حضرت محل نے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیا اور اپنا پیچھا کرنے والی انگریزی فوج سے لڑتی ہوئی نیپال چلی گئیں۔

فیض آباد میں، جو اُس زمانے میں لکھنؤ کے بعد سب سے اہم شہر سمجھا جاتا تھا، نیو انغٹری کی 22 دسمبر رجمنٹ کی چھاونی تھی۔ وہاں 15 دسمبر بے ضابطہ رسالے کا ایک دستہ اور نیو انغٹری کا گھوڑوں سے بچانے والا توپ خانہ بھی تھا۔ اس چھاونی میں بغاوت شروع ہو گئی۔ اعظم گڑھ اور بنارس کے انقلابی ان سے آکر مل گئے اور تعلقہ اردو نے ان کی حمایت کی مولوی احمد اللہ شاہ نے اس تحریک میں جان ڈال دی۔ بڑے دشاو حالات میں باغی بہادری کے ساتھ لڑے لیکن لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد ان کی مزاحمت ختم ہو گئی۔

قصہ مختصر جب بغاوت شروع ہوئی تو انگریزی حکومت قریب قریب مفلوج ہو کر رہ گئی۔ پورے دو آجے میں ان کا اقتدار ختم ہو گیا۔ لیکن بد قسمتی سے بغاوت کے رہنماؤں میں ایسی تعاون کی کمی اور پورے صوبے کے لیے یکساں نظم حکومت قائم کرنے کی عدم صلاحیت نے ان کے انقلابی جوش کو بار آور ہونے سے محروم رکھا۔

گنگا کی وادی کے باہر اور مغرب کی طرف کئی مقامات پر انگریزوں کو دشاویوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پنجاب

میرٹھ میں 10 دسمبر کو بغاوت شروع ہونے، سپاہیوں نے 11 دسمبر کو دہلی کی طرف بڑھنے اور بہادر شاہ کے آزاد اختیارات سنبھال لینے کی بنا پر جلد ہی پنجاب میں ایب بڑا بحران شروع ہو گیا۔ انگریزی سلطنت میں پنجاب کا حال ہی میں الحاق ہوا تھا اور یہ بتانا مشکل تھا کہ کچھ سرداروں اور برطرف شدہ کچھ سپاہیوں کا رد عمل کیا ہو گا۔ افغانوں کا رد یہ بھی انگریزوں کے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھا۔ کچھ سلطنت ختم ہونے کے بعد پشاور اور سرحدی علاقہ، جو رنجیت سنگھ نے افغانوں سے چھین لیا تھا، انگریزوں نے زیر نگیں آگیا۔ خیال تھا کہ افغان ممکن ہے کہ انگریزوں کی دشاویوں سے فائدہ اٹھا کر کھویا ہو علاقہ پھر حاصل کرنا چاہیں۔ رائے بریلی کے بعد سید احمد نے جہاد کی جو تحریک چلائی تھی اُس کی پیکاریاں پوری طرح غنڈہ نہیں ہوئی تھیں اور انھیں بھڑاوتے کر آسانی سے شعلوں میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ قبائل میں

سرکش عناصر موجود تھے مثلاً مغرب کی طرف رائگر اور صوبے کے مشرقی حصوں میں پہاڑی لوگ، حصار، ریواڑی اور گروڈ گاؤں کے لوگ دشمنی پر آمادہ تھے۔

بالائی صوبوں میں بغاوت میں ہندوستانی سپاہیوں کی رجمیں پیش پیش تھیں۔ پنجاب میں بھی بہت سی رجمیں موجود تھیں۔ وہ رجمیں اُن بہادر سپاہیوں پر مشتمل تھیں جنہوں نے کئی لڑائیوں میں دلوشافت دی تھی۔ لیکن انگریزوں کو شبہ تھا کہ وہ بغاوت کے اُن منصوبوں سے ہم ردی رکھتے ہیں جو چمک رہے تھے۔

چنانچہ پنجاب میں صورت حال بہت تازک تھی۔ لیکن ستیج کے اس طرف کی ریاستوں کے سکھ سردار اور مغربی اضلاع کے مسلمانوں نے بھی بڑی ثابت قدمی کے ساتھ انگریزوں کی مدد کی۔ کشمیر کے مہاراجا گلاب سنگھ کو ”جہانگیر اعلائے پر آمادہ“ کر لیا گیا تھا اور پنجاب میں انگریزوں کی قسمت کا فیصلہ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ پرانے سکھ امرا کو مکمل شکست نے سرسید کر دیا تھا اور وہ حمزی کے ساتھ ختم ہو رہے تھے۔ پنجاب میں بڑے بڑے مالکان اراضی نہیں تھے اس لیے کہ ”مسلم سلطنت“ پٹھان قاتحین اور بعد میں سکھ حکمرانوں نے مقامی سرداروں کو اُس قسم کے اختیارات سے کبھی نہیں نوازا جیسے لودھ کے تعلقہ اردن یا بنگال کے زمینداروں کو حاصل تھے اور اس لیے وہ کبھی مالکان اراضی کی حیثیت حاصل نہیں کر سکے۔“ (1) برطریق شدہ سکھ سپاہی قیادت سے محروم تھے اور لڈو کے لیے اُن کی درخواستوں کا پنجاب کے سرداروں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ زلمتہ امن میں قاتل برطانوی افراد کے ایک گروہ نے لوگوں کی دشمنی کو برطانوی حکومت کی مداح دستائیں میں تبدیل کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ نظریات لادلوگوں کو غیر مسلح بھی کر دیا تھا۔

جہاں تک افغانوں کا تعلق تھا اُن کے حکمران دوست محمد کی حمایت دولت کے زور پر حاصل کر لی گئی تھی۔ اُس کے لیے ”انگریز قوم کی غیرت کے مقابلے میں انگریزوں کی دولت کا پیار زیادہ اہم تھا۔“ (2) اس کے علاوہ اگرچہ ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد بہت تھی پھر بھی یورپین پیدل فوج، رسالہ اور توپ خانہ کا تناسب بھی خاصا تھا۔ کل 59,656 سپاہیوں میں سے، جو اُس صوبے میں مقیم تھے، ہندوستانی اور پنجابی (زیادہ تر باضابطہ) تھے 35,900 پنجابی (بے باضابطہ) 13,430 اور یورپین 10,336 علاوہ ازیں فوجی پولیس کے سپاہیوں کی تعداد تقریباً 9,000 تھی۔ ہندوستانی باضابطہ سپاہیوں میں کچھ پنجابی تھے۔ زیادہ تر یورپین فوجیا تو شملہ اور انبالہ یا پشاور کی داوی میں تھی۔

لیکن جس بات سے انگریزوں کو سب سے زیادہ فائدہ ہوا وہ یہ تھی کہ ہندوستانی انقلابیوں کے سامنے نہ تو کوئی واضح مقصد تھا اور نہ اُن میں اتفاق رائے تھا۔ انگریز افراد نے جو خطا کچڑے تھے اُن سے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ”بڑی سوجہ بوجہ کے ساتھ بغاوت کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔“ (3) چنانچہ مگر ٹھہر میں ارمی کو بغاوت ہونے کی خبر سننے ہی انہوں نے بڑے جوش اور عزم کے ساتھ کارروائی شروع کر دی۔ دوسرے دن انہوں نے پوری کی پوری ہندوستانی فوج کو، جو دپیدل رجموں اور ہلکے رسالے کے دوستوں پر مشتمل تھی، پریڈ کے میدان میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور اُن سے، اسلحہ واپس لے لیے۔ لاہور بچ گیا اور دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کر دی گئی۔

(1) پیٹن پاول، بی۔ ایچ۔ The Land Systems of British India، جلد دوم، صفحہ 617

(2) کے لور ملٹین، کولہ پال، جلد دوم، صفحہ 316

(3) کریف، The Crisis of the Punjab from May until the fall of Delhi، (لندن 1858)، صفحہ 7۔

دوسری طرف پنجاب کے باغی رہنما تاج الدین (۱) نے 29 مئی 1857ء کو شہنشاہ بہادر شاہ کو جو عرصہ ضد اشت بھینچی تھی اُس کا جواب نہیں دیا گیا۔ اُس نے اپنے خط میں 10 مئی کے بعد پنجاب کے حالات کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ تمام ہندوستانی سپاہی باغیوں سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔ یہ کہ پنجاب کے سردار مذہب ہیں اور یہ کہ گرمی کے موسم نے انگریزوں کے لیے لڑائی کی سختیاں برداشت کرنا مشکل بنا دیا ہے۔ اُسے اس امر کا یقین تھا کہ اگر ایک باصلاحیت افسر کی کمان میں پانچ چھ ہزار سپاہی بھیج دیے جائیں تو پورے پنجاب سے، بشمول پشاور، انگریزوں کو نکالا جاسکتا ہے۔

لاہور میں انگریز حکام کے جرات مند اندہ طریق عمل کی تقلید دوسرے فوجی مراکز میں بھی کی گئی یعنی جمیل، سیالکوٹ، امرتسر اور گورداس پور خلعت علوی کی رجمنٹ کے ہندوستانی سپاہیوں کے علاوہ تمام دوسری چھادیوں سے اسلحہ واپس لے لیے گئے اور انہیں برطرف کر دیا گیا۔ انگریزی پیدل فوج کی رانٹوں اور اُن کے توپ خانوں کی توپوں کے پیش نظر اسلحہ واپس کرنے کے حکم سے سرتابی ممکن نہیں تھی۔ لیکن یہ کام آسانی سے نہیں ہوا۔

نویں بے ضابطہ رسالے میں بغاوت ہوئی۔ یہ وہ رجمنٹ تھی جس نے افغانستان میں بڑے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ اس کو اس قدر قابل اعتماد سمجھا گیا کہ دہلی کے خلاف لڑنے کے لیے اُسے بھیجا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اس لیے انہیں پنجاب واپس جانے کا حکم دیا گیا۔ جب وہ کالا باغ پہنچے تو انہوں نے بغاوت کر دی۔ اُن کا رہنما وزیر خاں ”رجمنٹ کا سب سے بڑا نامتاز سالدار تھا“ بھنگ کے مقابل باغیوں کی انگریزوں سے جنگ ہوئی جس میں بہادر سالدار اور اُس کے سپاہی سبھی مارے گئے۔

میاں میر میں ہندوستانی رسالے نے گھوڑوں کے زین واپس کرنے سے انکار کر دیا اور جس دن اُن کے ہتھیار واپس لیے گئے اُس کے دوسرے دن برطرف کی جانے والی رجمنٹ کے 1,400 سپاہیوں کے ساتھ فیروز پور چلا گیا۔ انگریزوں سے اُن کی لڑائی ہوئی جس میں 100 انگریز مارے گئے۔

میاں میر کے سپاہیوں سے اسلحہ واپس لینے کی خبر نے پنجاب میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ بغاوت پر متحمل ہو گئے۔ اُن میں سے بہت سے خود کو بے سہارا سمجھتے تھے۔ دہلی پہنچنے کے ارادے سے وہ اپنی بارکوں سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن دہلی دور تھا۔ اُن کا پیچھا کیا گیا اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ چیمپیسون نولٹن کی کو سخت سزا دی گئی۔ اُن میں سے دو سویا سی جنگ کے دوران گرفتار کر لیے گئے۔ انہیں اجالا لایا گیا اور وہاں فیصلہ کیا گیا کہ سزائے موت دی جائے دس دس کر کے سپاہی پکارے جاتے تھے، اُن کی منگیلیں کسی جانی شخص اور قتل گاہ کی طرف لیجایا جاتا تھا جہاں گولی سے اڑانے والا دست تیار کھڑا تھا“ (2) اس طرح دو سو سینتیس نے جام شہادت پیا۔ اُن میں سے کچھ خاموش تھے اور کچھ ناچتے گاتے قتل گاہ کی طرف جا رہے تھے بقیہ سینتیس نے اُس قاعدہ کے باہر آنے سے انکار کر دیا جہاں انہیں قید کیا گیا تھا۔ لیکن جس وقت قلعہ کا دروازہ توڑ کر انگریز سپاہی اُس میں داخل ہوئے تو ”وہ سب قریب قریب مر چکے تھے“۔ (3)

(1) نادر خلیفہ مشورہ، نمبر 1، 18، 3، دسمبر 1857ء۔ (2) کوپر، کوہا، صفحہ 161

(3) ایسا صفحہ 162

ایک نبرد آزمایات کے طور پر ہندوستانی فوج ختم ہو گئی۔ اُس کی جگہ اتنی ہی نئی بھرتی ہونے والی سکھوں، آفریدیوں، خٹ کون اور مہمندوں کی جمیوں نے لے لی۔ لیکن پنجاب کی دشواریاں محض فوج تک محدود نہیں تھیں۔ گلو کی پہاڑیوں میں راجہ پر تاپ سنگھ اور اُن کے بھائی ویر سنگھ نے بغاوت کی۔ لیکن انہیں شکست ہوئی، مقدمہ چلا اور سزائے موت دی گئی۔ ہر طرف رنجوں کی یعنی جیسلم کی 14 دیں انفنٹری، سیالکوٹ کی 446 دیں اور میاں میر کی 26 دیں انفنٹری کے سپاہیوں نے لڑائی کا فیصلہ کیا جو جموں کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے تھے۔ انہوں نے راوی کو پار کیا اور ملو پور کے قصبے میں داخل ہو گئے جو بڑی دود آج شہر کا صدر مقام تھا۔ لیکن سکھ سپہ سالاروں نے انہیں بھگادیا۔ سیالکوٹ میں سپاہیوں نے اسٹیشن پر قبضہ کر لیا اور دیہات میں پھیل گئے لیکن یورپین "خدا کی مہربانی سے بچ نکلے جس نے باغیوں کی گولیوں کا رخ موڑ دیا"۔ (1)

ستمبر میں محمل، کھنٹی، ہون، نوان اور دوسرے مسلم قبیلوں کے بیس سے تیس ہزار تک افراد نے بغاوت کر دی جو مسلم ملتان میں 3,000 مربع میل کے رقبے میں آباد تھے۔ انہوں نے بہاول پور اور فیروز پور سے اسلحہ حاصل کیے تھے۔ انہوں نے اچانک حملہ کر کے پولیس کی چوکیوں پر قبضہ کر لیا، اُن سے اسلحہ چھین لیے، لاہور اور ملتان کے درمیان سلسلہ مواصلات کاٹ دیا اور لوگوں سے چندہ وصول کرنے لگے۔ اُن کے خلاف جو ملٹری پولیس بھیجی گئی تھی اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ انہوں نے بے ضابطہ رسالے کو بھی چھاپو لٹنی کے سرانے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اُس کے بعد باغی گوگیر کے ریستائوں کی طرف چلے گئے جہاں انہیں برطانوی فوج نے گھیر لیا اور گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ ڈالا۔ (2)

سندھ

انگریزوں نے امیروں کو جس طرح ہٹایا تھا اُس کی یاد لوگوں میں بے اطمینانی کا سبب بن گئی تھی اس لیے سندھ بھی بغاوت میں شامل ہو گیا۔ بیرات کھلے شاہی خاندان کے ایک رکن اور شکار پور میں نظربند و خلیفہ خوار شہزادہ پیر محمد ایک اور سردار امام بخش اور ایک و خلیفہ خوار الف خاں نے مل کر برطانوی حکومت کو معزول کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

راجستھان

اٹھارویں صدی میں راجپوتانہ کے حالات میں انتشار پایا جاتا تھا۔ وہ زمانہ انحطاط اور سرکردہ قبائل کے سرداروں کے باہمی رقابت کا دور تھا۔ کچھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور جاگیروں کے علاوہ وہاں چار اہم ریاستیں تھیں۔

(1) خارچہ خلیفہ مشورہ نمبر 79-80-28 مئی 1857ء۔

(2) پنجاب کے چیف کمشنر کے ٹیکر بیڑی کا مراسلہ حکومت ہند کے خارچہ امور کے سکرٹری کے نام، 3 اکتوبر 1857ء۔ خارچہ خلیفہ مشورہ نمبر 445-452-18 دسمبر 1857ء، کیو برلن، ہے، The Punjab and Delhi in 1857 جلد دوم، صفحہ

مارواڑ کا سیو دیا ایک قدیم قبیلہ تھا جن کو راجپوتوں میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حالانکہ اُن کی بڑی عزت کی جاتی تھی لیکن وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اور دوسرے خاندانوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ وہ جلی کی سیاست سے بھی دور رہتے تھے۔ 1857ء میں مہاراجہ رام سنگھ اُدے پور کا راجہ تھا۔ جنے پور کے کچھ اہوں نے ایک بڑی سی ریاست قائم کر لی تھی اور اُس وقت دلی ریاست تھا مہاراجہ رام سنگھ۔ اُس خاندان کی ایک شاخ الور پر حکومت کرتی تھی۔

جودھ پور میں مہاراجہ تخت سنگھ راٹھور حکومت کرتا تھا۔ لیکن لوگ اُسے پسند نہیں کرتے تھے اور اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ مہاراجہ مان سنگھ کے عہد میں جودھ پور نے اپنی آزادی کے لیے شہرت حاصل کر لی تھی اس لیے کہ مہاراجہ نے انگریزوں کے خلاف جسوت راہبکر کی مدد کی تھی۔ اس نے سندھ کے امیروں اور تاجپور کے گروہ کی مدد کی تھی۔ جب اُسے برطانوی ریڈنٹ رکھنے پر مجبور کیا گیا اور اُس کے دماغ بھی مشیروں کو گر فتار کر لیا گیا تو اُس نے بدل ہو کر گندی چھوڑ دی اور سنیاں لے لیا۔

بوندی اور کوتا کے راجہ ہداراجپوت تھے۔ ٹونک میں ہزاری رہنما میر خاں کے خاندان کا ایک فرد حکومت کر رہا تھا۔

مندرجہ بالا ریاستوں کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی راجپوت ریاستیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے جاگیر دار تھے جو نام کو دالیان ریاست کے اطاعت گزار تھے بڑی حد تک خود مختار، بد قسمتی سے دالیان ریاست اور جاگیر داروں کے مراسم خوشگوار نہیں تھے۔ برطانوی حکومت کی پالیسی تھی جاگیر داروں کے خلاف دالیان ریاست کی حمایت کرنا۔ وہ جاگیروں کے داخلی معاملات میں مداخلت کرتے تھے تاکہ رعایا پر جاگیر داروں کے فیوڈل اختیارات کو محدود رکھا جاسکے۔ جاگیر دار اپنے مالکوں کے ساتھ انگریزوں سے بھی غیر مطمئن تھے جو اُن کی پشت پناہی کرتے تھے۔

جہاں تک دالیان ریاست کا تعلق تھا وہ بڑی دشواریوں میں مبتلا تھے۔ مرہٹوں کے حملوں اور خراج کے مطالبوں کی بنا پر وہ بہت نقصان اٹھا چکے تھے اور جب انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور برطانوی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن مالک بدلنے کے بعد انہیں آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ اگرچہ نئے مالک باضابطہ انداز سے کام کرتے ہیں لیکن مطالبوں کی حد تک اُن میں اور مرہٹوں میں کوئی فرق نہیں۔ زیادہ بری بات یہ تھی کہ انگریز دالیان ریاست کے اختیارات کم کرنے میں بڑی سنگدلی سے کام لیتے تھے اور چونکہ اُن کے پاس بڑی طاقت تھی اس لیے مزاحمت نہیں کی جاسکتی تھی۔

اُن ریاستوں میں جو چھاڑیاں قائم کی گئی تھیں وہ اُن کی آزادی کے لیے خطرہ بن گئی تھیں۔ اُن کی فیوڈل فوجیں ہر طرف کردی گئی تھیں اس لیے وہ انگریزی حکومت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ اُن کے رسم و رواج میں مداخلت کی جاتی تھی اس لیے اُن کے دلوں میں مذہب و مراسم کو برقرار رکھنے کے تعلق سے خدشات پیدا ہو گئے تھے۔

1857ء سے پہلے فتنہ و فساد سر اٹھا چکا تھا۔ اُس کی وجہ تھی مان سنگھ کی سرتابی، دنگار پور کے

جسوت سنگھ کی معزولی، جودھ پور میں راجپوت بھیم جی کالڈ پر حملہ اور بنے پور میں کیٹن بلیک کا قتل۔ سیکر، کھالی اور لھیری میں بغاوتیں ہوئیں۔ میواڑ، مارواڑ اور سیکھادی کے جاگیردار اور سول آبادی غیر مطمئن تھی۔ بائگی داس کی طرح کے شاعر اور سورہ مشر اور ان کی طرح کے دانش ور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کر رہے تھے۔

دلیان ریاست کے باہمی اختلافات اور حکمرانوں اور جاگیرداروں کے آپسی جھگڑوں کے علاوہ انگریز حکمران اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ رکھتے تھے۔ اجپیر میں اُن کا ایک بڑا اسلحہ خانہ تھا جس کی نگرانی ہندوستانی پیدل فوج کی کمپنیاں کرتی تھیں، نصیر آباد اور بھجی میں دو اہم چھاؤنیں تھیں اور چھوٹی چھوٹی چھاؤنیاں ارن پوری، دیولی اور دیاس میں تھیں۔

حالانکہ ضابطے کی رو سے راجپوتانہ کا انتظام شمال مغربی صوبجات کے لفٹنٹ گورنر کے ذریعہ ہمارا تھی لیکن عملاً اختیارات گورنر جنرل کے ایجنٹ اور اودے پور، بے پور، جودھ پور اور کوٹا میں مقیم ایجنٹوں کو حاصل تھے۔

میرٹھ کی بغاوت کی خبر جب راجپوتانہ پہنچی تو چھاونیوں میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کی جمعوں، ریاستوں کے ملازم، راجپوت سپاہیوں اور جاگیرداروں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ عام لوگوں میں اُن کے لیے براہمہ رومی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ پہلی بغاوت 28، مئی کو نصیر آباد میں ہوئی۔ اُس کے بعد 3، جون کو بھجی میں بغاوت ہوئی۔ پھر تو بدامنی پھیلتی ہی چلی گئی۔ اجپیر پر حملہ کیا گیا۔ اس حملے کی قیادت ابو نے کی تھی۔ ارن پورہ میں سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور مند سور پر شہزادہ فیروز شاہ نے قبضہ کر لیا۔ جودھ پور میں ”لوگوں میں پھیلی ہوئی بے چینی کو خاکی سادھوؤں نے تعویذ پہنچائی جو جگہ جگہ جاتے تھے اور محل میں بھی مدعو کیے گئے تھے۔“ لیکن بدامنی کے اصل مرکز تھے کوٹا اور جودھ پور کی باج گزار جاگیر اُوا۔

سب سے پہلے ارن پورہ کی فوج نے بغاوت کی۔ جلد ہی جاگیردار بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اُوا کے ٹھاکر کشن پال سنگھ ہی نے اُن کا ساتھ دیا اور میواڑ اور مارواڑ کے جاگیرداروں اور واسپ، لکھنویس، گولار، روپ، مگر، سلطہ وغیرہ کے سرداروں نے اُس کی حمایت کی۔ انہوں نے مہاراجہ جودھ پور کی بھیجی ہوئی فوج کو شکست دی اور شہنشاہ کے سامنے اپنی شکایتیں پیش کرنے کی غرض سے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ راستے میں انھیں مجبوراً انڑول کے مقام پر جنگ کرنی پڑی جس میں انھیں شکست ہوئی۔ لیکن ستمبر میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد اُن کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔

راجستھان میں انگریزوں کے خلاف انقلابی تحریک کا سب سے اہم مرکز تھا کوٹا۔ وہاں پولیٹیکل ایجنٹ۔ ماجر برٹن کو قتل کر دیا۔ افسروں میں بنے دیال اور اُن کے بھائی ہر دیال نے تحریک کی رہنمائی کی۔ ریڈیٹیس کا محاصرہ کر لیا گیا اور مہارو کو قریب قریب حراست میں لے لیا گیا۔ یہ حالات کئی مہینے تک جاری رہے یہاں تک جنرل رابرٹسن نے پانچ ہزار پانچ انگریز سپاہیوں کی مدد سے جن کے ساتھ ایک کروڑی کا دستہ بھی تھا، باغیوں پر حملہ کیا، بہت نقصان پہنچایا اور شکست دی۔ اُن کے رہنماؤں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اُن تاجروں اور دستکاروں پر جرمانے کیے گئے جن کے متعلق شہ تھا کہ تحریک سے مدد دی رکھتے ہیں اور بنے دیال کو توپ سے اڑا دیا۔

حالانکہ کھلی بغاوت کچل دی گئی تھی پھر بھی بہت سے راجپوت باغیوں کی مدد کرتے رہے۔ تانچاٹو نے راجستھان میں پناہ لی اور تمبر اور کوٹھاریا کے سرداروں نے مہاراجن کی مدد کی۔

اس اجمالی بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہالیوڈ سے نزدیک اور کلکتہ سے پشاور تک پورا شمالی ہند انقلابی شورش کا مرکز بننا ہوا تھا۔ مختلف علاقوں میں شورش کم یا زیادہ ہو سکتی تھی لیکن کوئی حصہ بے جینی سے خالی نہیں تھا۔

جنوبی ہند

مہاراشٹر

دکن اور جنوبی ہند میں بھی کئی جگہ پر شورشیں ہوئیں۔ وسطی ہند میں اندور، سور، مہو، دھار، امھیر اور غیرہ میں بغاوت ہوئی اور حکومت کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ مہاراشٹر سے ملا ہوا تھا جہاں بڑی ”بے چینی“ پائی جاتی تھی۔ آزادی کے خاتمے، پیشوا کی حکومت کے زوال اور پونا کی حیثیت کم ہو جانے کی بنا پر، جو مرہٹہ حکومت کا مستقر تھا، لوگ بد دل ہو گئے تھے۔ وہ تاریخی خاندان خاص طور سے متاثر ہوئے تھے جنہوں نے قدیم ریاست کے معاملات میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اٹام کمیشن کے فیصلے کے مطابق بہت سی ریاستوں کی مضبوطی، زمینداروں کے مالکوں کے قدرتی وارث نہ ہونے کی صورت میں وارث کو گود لینے کی ممانعت اور نانا صاحب اور پنڈورھن سرداروں سے خاندانوں کے باہمی قریبی رشتوں کی بنا پر خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

نوجوان شہزادہ پر تاپ سنگھ، جیسے انٹسٹن نے ستارا کی گدی پر بٹھادیا تھا، آزادی پسند طبیعت رکھتا تھا اور انگریز افسر اُس پر شبہ کرتے تھے۔ 1839ء میں اسے معزول اور جلا وطن کر دیا گیا۔ انصاف کے لیے اُسکی درخواستیں رد کر دی گئیں اور اُس کے وارث کی 1848ء میں موت کے بعد ریاست کا الحاق بمبئی پریذنسی میں کر لیا گیا۔ مرہٹوں کی سر زمین کا جنوبی حصہ اٹام کمیشن کی سرگرمیوں کے نتیجے میں اور کو لہا پور 1844ء کی بغاوت کے بعد عائد کیے جانے والے بھاری جرمانے کی بنا پر مایوسی کا شکار تھا اور انگریزوں نے وہاں کے لوگوں کو بڑی شکایتیں تھیں۔ چھوٹا سا مجھوٹا واقعہ ان عناصر کو ”مرتا کیا نہیں کرتا“ کے مصداق بغاوت پر آمادہ کر سکتا تھا۔ حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔

اسیر گڑھ، ہربان پور، اورنگ آباد، بلگام، کو لہا پور اور بمبئی کے ہندوستانی سپاہیوں اور غیر مطمئن مسلمانوں نے مل کر بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ ستارہ میں شیواجی کے خاندان کے ایک قدیم اور وفادار ملازم رنگو باپو جی کہتے ہیں کہ رموشی، منگ اور کوئی رنگھوٹ بھرتی کیے اور انگریزوں کو نکلنے اور پر تاپ سنگھ کے بیٹے شاہو کو گدی پر بحال کرنے کے لیے مرہٹہ سرداروں میں سے کچھ کی حمایت حاصل کر لی۔ کندل کے نانا رموشی راجہ، کراو کے دولت راؤ ہری پور اور کو لہا پور کے تاتیافندنس اور دوسرے سرداروں نے حمایت کا وعدہ کیا۔ شورا مٹکرنی اس کا روح رواں تھا اور رنگو باپو جی کے بیٹے ستیارام کے سپرد عام نگرانی کا کام کیا گیا تھا۔ ایک راجپوت سپاہی مان سنگھ کو پیغام پر مقرر کیا گیا کہ وہ سپاہیوں کی رمبھوں کی حمایت حاصل کرے۔ بد قسمتی سے سازش کا علم ہو گیا اور سازش کرنے والے قتل کر دیے گئے۔

کو لہا پور، بلگام اور دھاروار میں بڑی بے چینی تھی۔ کانپور میں نانا صاحب کی بغاوت کی خبر نے ہندوستانی سپاہیوں کی رمبھوں میں بڑی اشتعال پھیلا دی تھی۔ بغاوت 31 جولائی کو پھوٹ پڑی۔ کچھ سپاہیوں نے دودھ کو لہا پور پر قبضہ کرنے کی کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ دسمبر میں ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی۔ اس دفعہ انہیں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ شہر پر قبضہ ہو گیا اور اُس کے دروازے بند کر دیے گئے۔ لیکن برطانوی فوجوں نے ایک دروازہ بارود سے اُڑا دیا اور شہر اور راجہ کے محل پر قبضہ کر لیا۔ راجہ کے بھائی کو قید کر کے سندھ بھیج دیا گیا۔ بلگام میں ایک خوشی نے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ لیکن

بغاوت شروع ہونے سے پہلے انگریزوں کو اس کا علم ہو گیا اور شورش فرو کردی گئی۔
 بمبئی میں تین ہندوستانی رجمنٹ تھیں۔ انہوں نے محرم کے موقع پر بغاوت کرنے کا منصوبہ
 بنایا تھا۔ لیکن پولیس کا ڈپٹی کمشنر فورجٹ اس کے لیے تیار تھا اور اُس کے اقدامات نے سازش کو ابتدائی
 مراحل ہی میں ختم کر دیا۔

نارنگھ کے سردار نے، جس کے دل میں اتام کمیشن کی کاروائیوں نے خطرات پیدا کر دیے تھے،
 بغاوت کی اور حکمرانوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گیا۔ سوانت داری کے دیباہوں نے اپنے جنگلوں میں
 واقع قلعوں سے حکومت کی مخالفت شروع کی لیکن بالآخر انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔
 لوگوں کی سرگرمیوں میں تال میل کی کمی اور برطانوی حکمرانوں کی حکمت عملی اور ہوشیاری
 نے ان شعلوں کو بڑے پیمانے پر پھیلنے سے روک دیا، مرہٹوں کی سرزمین کے جنوبی حصے میں ہونے والی
 بغاوت ایک چھوٹے سے واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں تھی جو سرداروں، زمینداروں اور تھوڑے سے شمالی ہند
 کے سپاہیوں تک محدود تھی۔ مرہٹوں اور مہاروں اور پوربیا سپاہیوں میں کوئی چیز مشترک نہیں تھی اور اس
 لیے ان کی بات کا مقامی لوگوں نے اثر قبول نہیں کیا۔
 بمبئی کے تاجروں اور تھوڑے سے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو اس انقلاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

حیدر آباد اور مدراس کی بغاوت

دہلی کے مغل حکمران سے ہمدردی کی بنا پر نظام کے علاقے کی مسلم آبادی بہت بے چین تھی۔
 مولوی جہاد کی تبلیغ کر رہے تھے جس کے نتیجے میں روہیلہ فوج اور اُس کے بہت سے ہمدردوں نے بغاوت
 کر دی اور برطانوی ریجنل کمیٹی کی طرف بڑھے۔ لیکن نوجوان نظام اور اُس کا معروضیہ آعظم سالار جنگ
 انگریزوں کے وفادار رہے اور باقی کچل دیئے گئے۔

مدراس کی پریسڈنسی میں بے چینی تو کم نہیں تھی لیکن قیادت کا فقدان تھا۔ ہندوستانی سپاہی پنچ
 ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے جنہیں اونچی ذاتوں کے خلاف کی جانے والی زیادتیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
 پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ رعیت داری نظام کے قیام نے اُس طبقے کو ختم کر دیا تھا۔ جو حکومت کرنے کی
 روایات کے قابل تھے۔ مغربی تعلیم پائے ہوئے لوگ اس تحریک کے خلاف تھے اور اُس کو رجعت پسند
 تحریک سمجھتے تھے۔

اس کے باوجود دہلی میں مغل حکومت کی بحالی کی خبر نے جنوب کے لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی۔
 مسلمان سپاہیوں کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ عام مسلمانوں کا رویہ تہدید آمیز تھا۔ کرنول، کرپا اور مالابار میں
 مسلمانوں کی خاص آبادی تھی۔ اراکٹ ویلر اور تریچا پٹی کرناٹک سے نوابوں کی حکومت میں رہ چکے تھے اور اُس
 حکومت کی یاد تازہ تھی جو حال میں ختم ہوئی تھی۔ حیدر آباد اور میسور میں غیر مطمئن کردہ موجود تھے۔

پورے مدراس میں باغی سرگرم عمل تھے۔ مثال کے طور پر نیٹو انفسری کی تیرہویں رجمنٹ
 میں ایک براہمن سادھو پکڑا گیا جو برطانوی حکومت کے اختتام کا اعلان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتحاد کی
 تلقین کر رہا تھا۔ سرکاری رپورٹ میں کہا گیا تھا (1) کہ بنگال کمانڈر کے بہت سے سپاہی اس پریسڈنسی کے

(1) مدالتی مشورے، 3 ستمبر 1857ء اور دود ستمبر 1857ء (مدراس نے ریکارڈ آفس میں فوجی حکم 1857ء کی کارروائی کی جلد)

مختلف حصوں میں موجود ہیں جن کا مقصد ہے ”ہمارے سپاہیوں سے ملنا اور جھوٹی اور بد باطنی پر مبنی افواہیں پھیلا کر ان کے دلوں میں حکومت کی طرف سے شک و شبہات اور نفرت پیدا کرنا۔“

ستمبر 1857ء میں صورت حال تشویشناک ہو گئی تھی۔ لیکن حکومت مدراس نے اشتعال کو فرد کرنے اور امن بحال رکھنے کے لیے مناسب اقدامات کیے۔ ریاست کے خلاف جرائم کی سرسری سماعت کے لیے 1857ء کے ایکٹ نمبر 14 کے تحت احکام جاری کیے گئے، فوجی عدالتیں قائم کی گئیں تاکہ ان سپاہیوں کے خلاف عدالتی کارروائی کی جاسکے جو قواعد شکنی کے مرتکب ہوں اور تمام مرکزوں میں پولیس میں نئی بھرتی کی گئی۔ اس طرح اکادکا شور شیں فرو کر دی گئیں۔ حالانکہ لوگوں کے جذبات نے حکومت کو بڑی تشویش میں مبتلا رکھا لیکن بڑے پیمانے پر تشدد نہیں پھیل سکا۔

VII تبصرہ

ہندوستان کی مجموعی صورت حال کا مطالعہ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتا ہے کہ بغاوت وسیع پیمانے پر ہوئی تھی، یہ کہ سپاہی اور سول آبادی دونوں نے اس میں شرکت کی اور یہ کہ دونوں نے ملکر بدیلی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ کچھ حصوں کے خیال اور توقع کے برعکس مسلمانوں اور ہندوؤں نے مشترک عمل کیا۔ حالانکہ کچھ مقامات پر فرقہ وارانہ اختلافات بھی رونما ہوئے پھر بھی مجموعی اعتبار سے دونوں نے شانے سے شانہ ملا کر جنگ کی اور ایک دوسرے کی پوری پوری حمایت کی۔ بہادر شاہ نے بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی کی ممانعت کر دی اور خان بہادر رومیلکھنڈ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کی انگریزوں کی کوششوں کو ناکام بنادیا۔ زیادہ تر باغی رہنماؤں نے بہادر شاہ کو ہندوستان کا جائز شہنشاہ تسلیم کر لیا۔ باغیوں کی قائم کی ہوئی حکومت میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ ہندوؤں کے مقدموں کا فیصلہ کرنے کے لیے ہندو ججوں کی عدالتیں قائم کی گئیں اور مسلمانوں کے لیے قاضی مقرر کیے گئے۔ جہاں کہیں بھی اعلان جہاد کیا گیا اُس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی کہ جہاد محض عیسائی حکمرانوں کے خلاف کیا جائے گا۔

بغاوت کے اسباب بہت سے تھے۔ کمانڈنٹ جے۔ مارٹن نے لکھا ہے ”اس وسیع سلطنت کو فتح کرنے کے لیے مفید تھا کہ وہ نظام جس پر اب تک عمل کیا گیا لیکن وہ اس پہلے دھکے کو بھی برداشت نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے اندر اُس کے پاس وہ مضبوط امدادی عناصر نہیں تھے جن پر وہ بھروسہ کر سکتا اور جن کی مدد سے ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف لڑ سکتا۔ چونکہ کہنپی میں خود کو بحال و برقرار رکھنے کی صلاحیت نہیں تھی چنانچہ وہ اپنے وطن (انگلستان) کی مدد کے بغیر اس بغاوت پر قابو پانے کی سکت نہیں رکھتی تھی اس لیے کہ اپنی قدیم علیحدگی پسندی پر عمل کرتے ہوئے اس نے باقاعدہ تصورات کے پرچار کو نظر انداز کیا یا اُن ملکوں میں جن پر اُسے غلبہ حاصل ہو گیا تھا مغربی تہذیب کی شجر کاری سے احتراز کیا۔ چونکہ اُسے اپنی رعایا کی خوشحالی، اخلاق اور زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی

اور برآمدات، درآمدات، اجارہ داریوں، تنخواہوں اور منافعوں کے علاوہ کسی اور بات سے سرکار نہیں تھا اس لیے ہندوستانوں کو مہذب بنانے کے بجائے اس نے محض اُن کا استحصال کیا۔ اُن لوگوں کو وہ تعلیم اور مہارت مہیا کرنے کی بجائے جو آزادی کے خواہش مندوں میں تحریک پیدا کرتے ہیں اُس نے وہاں کے لوگوں کو حکومت خود اختیاری کے ناقابل بنا دیا۔ یہ پالیسی چالاک پر مبنی ہو سکتی ہے لیکن اس کو فیاض سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ بات قرین انصاف ہے کہ ہندوستان کی کمپنی کی بدباطنی، جاہ طلبی، خود غرض اور ہر قسم کے استحصال پالیجر کے لیے مذمت کی گئی ہے۔“ (1)

ہندوستان کے لوگوں پر ایک صدی تک کی جانے والی اس قسم کی حکومت کا نتیجہ جاہ کن ہونا ضروری تھا جس کی لپیٹ میں پورا ملک آگیا۔ الگوینڈر ڈف نے ٹھیک ہی کہا ہے ”ہر وہ شخص جس نے عمداً آنکھیں بند نہیں کر لی ہیں یہ جانتا ہے کہ اُن سینکڑوں اور ہزاروں مقامات پر بھی جہاں حسن انتظام یا قدرت کی مہربانی سے بغاوت نہیں ہوئی وہاں بھی بے اطمینانی اور بڑے خدارانہ جذبات اور باغیانہ احساسات کا اظہار کیا گیا اور وہاں بھی حکام کو بہت سے خطرات و خدشات کا سامنا کرنا پڑا۔“ (2)

اپنے غیر ضروری اطمینان قلب کی بنا پر انگریز جس فریب میں مبتلا ہو گئے تھے 1857ء کی بغاوت نے اُسے پاش پاش کر دیا۔ اس تحریک نے اُن پر روشن کر دیا کہ محکموں کو طاقت کے ذریعے اطاعت پر مجبور تو کیا جاسکتا ہے لیکن طاقت کے ذریعے کسی کو وفادار نہیں بنایا جاسکتا ہے۔

اس عظیم بغاوت کی وسیع نوعیت کی بنا پر ظاہر ہے کہ تال میل اور منصوبہ بندی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے طوفان کا کچھ نہ کچھ احساس ہندوستانی جمہوں کو تھا۔ اس قسم کے واقعات جسے چپائیاں یا سرخ کنول کے پھول تقسیم کرتا اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تانا صاحب کے مشیر خاص عظیم اللہ خاں، مولوی احمد اللہ شاہ، جنہوں نے اودھ میں اہم رول ادا کیا، مشہور و معروف مولوی فضل الحق خیر آبادی اور بہت سے دوسرے مولویوں کے ردِ ابطال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک عام تحریک کے لیے صلاح مشورے کے بعد کوششیں کی گئیں۔ حالانکہ ایران اور روس کے ساتھ مرسلت کی کہانی دور ازکار معلوم ہوتی ہے لیکن اس امر کا ثبوت کافی ملتا ہے بہادر شاہ نے کئی دیسی حکمرانوں اور سرداروں اور ہندوستانی فوج کے کارکنوں سے بھی خط و کتابت کی۔ اس قسم کی افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ ایک مقررہ دن تمام چھاؤنیوں میں فوجیں بغاوت اور انگریزوں پر حملہ کریں گی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ بغاوت کے لیے 31 مئی کا دن مقرر کیا گیا ہے جس کا شمار شمالی ہند کے گرم ترین دنوں میں ہوتا ہے اور اس لیے ملک کے بدیسی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے لیے بہت موزوں تھا۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ میں جب

(1) مارتن۔ ہے۔ مکائنٹف، محول بالا، صفحات 445-440

(2) ڈف، اے۔ محول بالا، صفحہ 280

سپاہیوں نے مقررہ دن سے تین ہفتے پہلے ہی بغاوت کردی تو اس پر بہادر شاہ کو تعجب ہوا اور وہ قبل از وقت بغاوت میں حصہ لینے کے سلسلے میں تذبذب کا شکار ہو گئے۔

مختلف مواقع پر رہنماؤں میں تال میل دیکھنے میں آیا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کانپور کی لڑائی میں شہزادہ فیروز، گوالیار کی فوج، بابو کور سنگھ اور دوسروں نے تانا صاحب کی مدد کی۔ بہادر شاہ نے راجوں، نوابوں اور راجستھان، پنجاب اور شمالی ہند کے سرداروں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی لیکن انہیں خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ خاص طور سے اودھ کے اخبارات نے تال میل کے نظریے کی حمایت کی۔ ملک کے مختلف حصوں میں وہ جاتے تھے جس کی وجہ سے دہلی اور دوسرے مراکز کی خبریں پھیل رہی تھیں۔

حالانکہ معمر بہادر شاہ جو کدڑی پر بیٹھے محض نام کے شہنشاہ تھے پھر بھی تاریخ کے فیصلہ کن بحران میں اُن کا نام چادو کا سا اثر رکھتا تھا۔ پرانے جھگڑے جنہوں نے پچھلے سو سال سے ملک کو پریشان کر رکھا تھا، عارضی طور سے بخلا دیے گئے، عقیدت اور وفاداری کے پیمانے کیے گئے اور اطاعت کے عہد کی تصدیق تو ہوئی۔ واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر نے، جن کے اسلاف نے شہنشاہ کی اطاعت سے منہ موڑ کر بادشاہ کا خطاب اختیار کر لیا تھا، والی کی حیثیت سے کدڑی پر بیٹھے کے بعد اعلان کیا کہ وہ دہلی کے حکام کی پوری پوری تعمیل کریں گے۔ خان بہادر خاں نے، جو حافظ رحمت خاں ہکے پوتے تھے جس نے وہ آبے میں اپنے لیے ایک ریاست حاصل کر لی تھی، جب روہیلکھنڈ کا انتظام سنبھالا تو انہیں دہلی کے شہنشاہ کا واسرائے تسلیم کیا گیا۔ وہ بڑی فوجی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، انگریزوں کی فوجی طاقت سے واقف تھے اور اُن سے مقابلہ کرنے اور انہیں شکست دینے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل حکم عام سے ملتا ہے جس کی متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جاری کیا تھا کافروں کے باضابطہ دستوں کا مقابلہ نہ کیجئے اس لیے کہ لقمہ و ضبط اور بندوبست کی حد تک وہ آپ سے برتر ہیں اور اُن کے پاس بڑی بڑی توپیں ہیں۔ لیکن اُن کی نقل و حرکت پر نظر رکھیے، دریاؤں کے تمام گھاٹوں کی حفاظت کیجئے اُن کے مواصلات کاٹ دیجیے، رسد روک دیجیے، اُن کی ڈاک اور چوکیاں کاٹ دیجیے اور اُن کے کیمپوں کے قریب رہیں۔ انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیجیے۔ (1)

پشوا باہمی راؤ دوم کے بیٹے تانا صاحب نے اُس وقت اختیار ات سنبھال لیے جب کانپور میں فوجوں نے بغاوت کی اور دہلی کی طرف بڑھنے لگے اس لیے کہ ”مغل شہنشاہیت کی بحالی سے اُن کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔“ (2) بغاوت کے شروع ہونے سے پہلے اپنے مشیر عظیم اللہ خاں کے ساتھ تانا صاحب نے ایسے حالات میں دہلی اور لکھنؤ کا سفر کیا تھا جنہوں نے انگریز افسران کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر دیئے تھے۔ باندا کے نواب علی بہادر

(1) اقتباس، رسل۔ ذیل، ایچ، کولہ، ۱۱۱، صفحہ 73

(2) کے فور ملین، کولہ، ۱۱۱، جلد دوم، صفحہ 234

نے، جو تانا صاحب کی عملی حمایت کر رہے تھے، شاہ گڑھ کے راجہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا ”خدا کے فضل سے شہنشاہ کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔“ (1) میسور کے جڈ-شیل کشن، مسٹر ایچ۔بی۔ڈورو کے سامنے بیان دیتے ہوئے بیتارام بادا نے کہا ”تاننا صاحب اور مان سنگھ نے دہلی کے بادشاہ سے خط و کتابت کی اور یہ طے ہوا کہ بادشاہی مسلمانوں کو ملے اور دیوان گیری ہندوؤں کے حصے میں آئے۔“ (2)

ان بیانیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تانا صاحب کو شش کر رہے تھے کہ شہنشاہ کے ساتھ مل کر کام کریں۔

پنڈ، الہ آباد، لکھنؤ، کانپور، فرخ آباد، بریلی وغیرہ کے حکمران اپنے القاب کی تصدیق کے لیے دہلی پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور دہلی کی کوشش تھی کہ تمام طبقات میں تال میل پیدا کیا جائے چاہے وہ ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹ ہوں یا ہندوستانی راجہ نواب اور امیر۔ شہنشاہ نے فوجوں کو ہدایتیں جاری کیں اور شمالی ہندوستان کی کئی حصوں سے غرضداشتیں قبول کیں یعنی راجپوتانہ، مالوا، صوبجات متوسط، شمال مغربی صوبجات اور اودھ اور بہار سے پٹیالہ اور گوالیار کے راجوں راجستھان کے راجوں، کشمیر کے مہاراجہ گلاب سنگھ اور دوسرے ہندو مسلم سرداروں کو نجی خط بھی لکھے گئے۔ کچھ نے اطاعت ظاہر کی لیکن بہت سوں نے یا تو کوئی بہانہ بنا دیا یا راست عمل سے گریز کیا اس لیے کہ اُن کے خیال میں بغاوت کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے اور ناکامی کی صورت میں اُن کی بتابی لازمی تھی۔

مدرس (3) میں باغیوں نے ”بادشاہ دہلی زندہ باد“ کے نعرے لگائے۔ حیدر آباد اور پنجاب میں ہندوستانی رجمنٹوں سے اسلحہ واپس لے لیے گئے تھے لیکن بہت سے برطرف شدہ سپاہی دہلی کی طرف چل پڑے۔ تانا صاحب نے جب بیثباتی کا لقب اختیار کیا تو راجپوتانہ، وسطی ہند اور مہاراشٹر میں سرداروں کے دل خوشی سے بھر گئے اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑ گیا کہ اگر کوئی منصوبہ بنایا گیا تو وہ معمولی نوعیت کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا کوئی رہنما منظر عام پر نہیں آیا جو تحریک کی قیادت کے لیے ضروری تنظیمی صلاحیت رکھتا ہو۔ باغی بہادر تھے اور داد شجاعت دے سکتے لیکن نظم و ضبط کا اُن میں فقدان تھا۔ نہ کوئی لڑائی کا معقول منصوبہ تیار کیا گیا تھا، نہ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ کام کتنا بڑا ہے فوجی ضرورتوں کا بھی انہیں پورا احساس نہیں تھا اور روپے اور جنگی سامان کی فراہمی کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ حکومت اور فوج کی ویسی تنظیم نہیں کی گئی تھی جس کا تقاضا اُس وقت کے حالات کرتے تھے۔ بغاوتیں تو بہت سی ہوئیں لیکن کسی ایسے جامع پروگرام میں انہیں شمولیت نہیں کیا جا سکا کہ مل کر وہ مشترک مقصد حاصل کر سکیں۔

عظیم بغاوت تقریباً دو سال تک جاری رہی اور اس دوران بہت سے اچھے اور

(1) Freedom struggle in Uttar Pradesh، جلد سوم، صفحہ 161 (2) ایضاً جلد اول، صفحہ 374.

(3) 'The Friend of India'، مورخہ 10 ستمبر 1857ء صفحہ 867۔ سفر اسلم نمبر 1376، مورخہ 25 ستمبر 1857ء لاہ قائم مقام چیف سکریٹری، فورٹ سینٹ جارج بنام سی بیٹن، سکریٹری حکومت ہند، جس میں 150 ویں مدرس نیو انٹنری میمورس باغیانہ روئے کا ذکر کیا گیا تھا۔

بڑے واقعات ہوئے۔ ایک طرف اگر شجاعت اور مقصد سے لگن، بے جگری کے ساتھ مقابلہ کرنے اور سپر انڈی پر عزت کی موت کو ترجیح دینے کے واقعات دیکھنے میں آئے تو دوسری طرف بزدلانہ بے رحمی، غداری، نا اہلی، بزدلی اور بیوقوفی کے نمونے بھی سامنے آئے سرکردہ مردوں اور عورتوں میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے ثابت قدمی، وفاداری، دشوار حالات میں تدبیر سے کام لے، دشمن کی چالوں کو ناکام بنانے اور جنگی کاروائیوں کے دوران مہارت سے کام کرنے کی اہلیت کا ثبوت دیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بہت سے وہ بھی تھے جنہوں نے ڈر کے یا تو محض فائدے کی خاطر تحریک میں حصہ لیا تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ غداری کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ان لوگوں کا طرز عمل ملک کے حسین دامن پر ایک داغِ نر سوائی کے سوا کچھ نہیں۔

آخر الذکر واقعات کو بخلا دیات ہی اچھا ہے۔ (۱) لیکن تاریخ اُن پر جو سرکردہ اور عورتوں کو کبھی نہیں بھلا سکے گی جنہوں نے ملک کو بدلی حکمرانوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ دہلی کے شاہی خاندان نے اس تحریک کو ایک ایسا نمائندہ عطا کیا جو ماضی کی شاندار روایات کے ناقابلِ نہیں تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ ابھی صرف تیس چوبیس سال کے تھے جب غدر شروع ہوا لیکن اپنی کم عمری کے باوجود وہ ایک کامیاب رہنما ثابت ہوئے۔ انہوں نے مند سور میں علم بغاوت بلند کیا اور وسطی ہند میں انگریزی فوجوں کے خلاف لڑتے رہے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد وہ اتر پردیش میں نمودار ہوئے اور روہیلکھنڈ اور اودھ میں جنگیں کیں۔ وہاں شکست پانے کے بعد وہ راجپوتانہ میں تانتا ٹوپے کی فوجوں سے جا کر مل گئے، انگریزوں کی بڑی بڑی فوجوں سے جنگ کی اور اپنے پیچھا کرنے والوں سے بچ کر سرحد کے جنگل میں پناہ لی۔ اُس وقت تک بغاوت ختم ہو چکی تھی اور ملکہ وکٹوریہ کا اعلان جاری ہو چکا تھا جس میں اُن لوگوں کو معاف کر دینے کا وعدہ کیا گیا تھا جو اطاعت کر لیں۔ اس اعلان کی بڑی تشہیر کی گئی تھی۔ حالانکہ انھیں بہت دشوار حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لیکن انہوں نے اپنی عزت نفس، آزادی یا اپنے خاندان کے وعدوں کو ذلت آمیز اور شرمناک قید پر ترجیح دی۔ وہ ایک بہادر سپاہی تھے اور آخری سانس تک اپنے ملک کے روشن مستقبل پر اُن کا اعتماد باقی رہا۔ جاواطی میں اُن کا انتقال ہوا۔

روہیلکھنڈ میں حافظ رحمت خاں کے پوتے خاں بہادر خاں نے، جن کی عمر ستر سال تھی، دہلی کے شہنشاہ کے واسطے کا عہدہ سنبھال لیا اور اتنی مدد برائے سوجھ بوجھ کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں پر حکومت کی کہ اُن میں اختلافات پیدا کرنے کی دشمنی کی تمام کوششیں ناکام ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے بڑی مہارت کے ساتھ روہیلکھنڈ کی حفاظت کی اور شکست کھانے اور ترائی کے جنگوں میں پناہ لینے سے پہلے انگریزی فوج کے اُن چار دستوں کو شکست دی جو بریلی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک غدار نے انہیں گرفتار کر دیا۔ اُن پر مقدمہ چلا اور سزائے موت دی گئی۔ انہوں نے ایک محب وطن بہادر کی طرح جان دی اور آخر تک نہایت بہادری اور بے جگری کا مظاہرہ کیا۔

اودھ میں ایک بہادر خاتون حضرت محل نے، جو واجد علی شاہ کی بیگم تھیں، بغاوت میں یادگار

(۱) ہندوستانیوں پر برطانوی فوجوں کے مظالم اور انگریزوں پر ہندوستانی سپاہیوں کے مظالم کی صرف چند مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

کے A History of Sepoy War in India، جلد دوم، صفحات 284، 368، 373 اور بعد کے صفحات۔ رسل، صفحات 42-43 اور اٹامن Meethu Ali of the melah، صفحہ 56، خارجیہ سیاسی مشورہ، نمبر 28، 30، دسمبر 1857 (سیلینٹ)۔

رول ادا کیا۔ انھوں نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے برہمیس قدر کی طرف سے اقتدار اعلیٰ سنبھال لیا۔ وہ باغیانہ تحریک کی روح رواں بن گئیں۔ انھوں نے نہ صرف انتظامی ڈھانچہ ترتیب دیا اور سرکاری کام سرانجام دیے بلکہ ریڈیٹس پر حملے کی قیادت بھی کی۔ جب وہ لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں تو انہوں نے شاہجہاں پور کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تاکہ وہاں مولوی احمد اللہ شاہ کی حمایت کر سکیں۔ لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکیں اور نیپال کی سرحد کے جنگلوں کی طرف چلی گئیں۔ انہوں نے بڑی بازی لگائی تھی لیکن وہ ہار گئیں۔ حالانکہ میدان جنگ میں انہیں شکست ہوئی لیکن انہوں نے اپنی عزت نفس کو برقرار رکھا۔ انہیں جیتنے کی پیش کش کی گئی جسے انہوں نے منظور نہیں کیا اور بدلیس میں گمناہی کی موت کو ترجیح دی۔

شیر بہار کتور سنگھ سپہ سالاری کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک حقیقی راجپوت زمیندار کی طرح وہ کشادہ دل اور بہادر انسان تھے۔ رعیت اُن کی پوجا کرتی تھی اور خود وہ برطانوی حکومت کے شدید دشمن تھے۔ ربعی میں ۱۲ جون کو ہونے والے سپاہیوں کی بغاوت نے اسی سال کے اس بزرگ سپاہی کے لیے ہنگ دراکا کام کیا۔ انہوں نے شاہ آباد کے ضلع میں برطانوی حکومت کو معزول کر لیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ جب دشمن کے دباؤ کی بنا پر وہ شاہ آباد پر اپنا قبضہ بحال نہ رکھ سکے تو اپنے سپاہیوں کے ساتھ روہتاس کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے اور انگریزی مواصلات کے لیے خطرہ بن گئے۔ مرزا پور کے جنگلوں میں سے گزر کے وہ یو اے پیچھے۔ اُن کو امید تھی کہ راجہ کی حمایت حاصل کر لیں گے۔ جب وہ اسی میں کامیاب نہ ہو سکے تو باندھ گئے اور وہاں سے قابض گئے تاکہ تانا صاحب سے مل کر کانپور پر حملہ کر سکیں۔ یہ منصوبہ بھی کامیاب نہ ہو سکا اور وہ لکھنؤ چلے گئے جہاں اُن کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے بعد وہ آعظم گڑھ کی طرف بڑھے، انگریزی فوج کو شکست دی اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ ایک بڑی انگریزی فوج کے آنے کے بعد انہوں نے شہر خالی کر دیا اور غازی پور کے قریب گنگاپار کر کے ایک دفعہ پھر بہار میں داخل ہو گئے۔ اُن کا آخری کارنامہ تھا اپنے وطن جلدیش پور کے قریب دشمن کو ایک بڑی شکست دینا۔ اس جنگ میں انگریزوں کا بڑا نقصان ہوا۔ برطانوی کمانڈر اور کئی دوسرے افسر مارے گئے اور باغیوں نے اُن کی کھوپڑیاں چھین لیں۔ لیکن اس شاندار کامیابی سے زخمی شیر زیادہ دن تک اپنا دل خوش نہ کر سکا۔ غیر معمولی مشقت اُنہیں تھکا دیا تھا اور پچھلی لڑائی میں لگنے والے زخموں نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ بالآخر 26 اپریل 1858ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے بھائی امر سنگھ کی قیادت میں جنگ دسمبر 1859ء تک جاری رہی۔

ایک اور انتھک سپاہی تھے تاتیا پوے جن کا اصل نام تھارام چندر چندر ننگ۔ انہوں نے مرہٹوں کی ابتدائی گوریلا جنگ کی روایات وراثت میں پائی تھیں اور اس غیر مسلوی لڑائی میں، جو نہایت دشوور حالات میں دو سال تک جاری رہی تھی انہوں نے اپنی اہلیت کا بہترین مظاہرہ کیا۔ بجلی کی سی سرعت کی طرح وہ جگہ جگہ پہنچتے اور بغاوت کے شعلے بجھاتے تھے۔ اپنے مخالفوں کی حکمت عملیوں کو ناکام بناتے اور انہیں شکست دیتے تھے، جم کر جنگ کرنے سے بچتے تھے، شکست کے بعد بچ نکلتے تھے اور اپنا پیچھا کرنے والے دشمنوں کو چکر میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک بڑی برطانوی فوج وسطی ہند اور راجپوتانہ میں اُن کا پیچھا کرنے میں مصروف تھی جہاں وہ کبھی پیچھے ہٹتے تھے اور کبھی آگے بڑھتے تھے۔ شکست سے اُن کا جوش کم نہیں ہوا تھا اور تباہی اور بربادی کے خوف سے اُن کی وفاداری میں کمی نہیں آتی تھی۔ اُن کا انجام افسوسناک ہوا۔ اُن کی ایک دوست نے اُن کے ساتھ ندراری کی۔ ایک برطانوی عدالت میں، جسے اُن کے مقدمے کی سماعت کا اختیار حاصل نہیں تھا اس لیے کہ وہ

انگریزی رعایا نہیں تھے، اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا دی گئی۔ ایک بہادر برہمن کی طرح انہوں نے پھانسی کا پھندا اپنے ہاتھ سے گلے میں ڈالا اور بڑی شان بے نیازی کے ساتھ پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو گئے۔

بنہیل کھنڈ میں باغیوں کی رہنما قہس بھانسی کی رانی کلشی بانی جن کی یاد کے بجا طور سے اس تحریک کے گرد و رمانی کہانیاں بنادی ہیں اور جن کے شجاعت کے کارناموں کا ذکر گاؤں کے شاعروں کے گیتوں میں ملتا ہے۔ ”اس نوجوان، پر جوش، خود دار، منت ساجت سے عاری اور سمجھو تانہ کرنے والی رانی“ کو برطانوی حکام کی بے رحمی اور بیجا شک و شبہ نے بغاوت میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی بے جا مخالفت نے رانی کے غصے کو بھڑکایا اور جب برطانوی فوج نے بڑھ کے بھانسی کا محاصرہ کر لیا تو انہوں نے بڑی بہادری کے ساتھ اُس کا مقابلہ کیا۔ ”سڑک سڑک، گھر گھر اور کمرے کمرے میں بڑی سخت لڑائی ہوئی اور شہر کی حفاظت کرنے والے شیروں کی طرح لڑے۔“ اس سے پہلے کی قلعے پر حملہ آوروں کا قبضہ ہو ہر شخص کے جسم کے کٹوے ہو چکے تھے۔ لیکن رانی بچ کر نکل آئیں اور کاپسی پہنچیں۔ جب کاپسی پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے اور اُن کے ساتھی تاتیا توپے نے گوالیار پر قبضہ کرنے کا جرأت آمیز منصوبہ بنایا۔ یہ خیال ”اتنا ہی نیا اور جرأت آمیز تھا جتنا راکٹ پر قبضہ کرنا یا دھواں گار منصوبہ۔“ (۱) گوالیار پر اُن کا قبضہ تو ہو گیا لیکن وہ زیادہ دن تک اُس پر قابض نہ رہ سکے اس لیے کہ مختلف دستوں سے برطانوی فوج کے دستے اُس پر حملہ کر رہے تھے۔ کوٹا کی سرانے سے گوالیار آنے والی سڑک کی حفاظت کرنے کے لیے رانی اپنے سپاہیوں کے ساتھ شہر کے باہر نکلیں۔ اُس لڑائی اور رانی کلشی بانی کی بہادری کے ساتھ جان دینے کی کہانی بغاوت کے سرکاری برطانوی مورخ ملیسن کے الفاظ میں بیان کی جانی چاہیے۔ اُس نے لکھا ہے ”مردانہ لباس پہنے اور گھوڑے پر سوار بھانسی کی رانی دن بھر اپنی فوجوں کی ہمتیں بڑھاتی دیکھی گئیں۔ جب ایک ایک آگے بڑھتی ہوئی برطانوی فوجیں دڑے میں سے گزر گئیں اور جب یونیورسٹی پر پہنچنے کے بعد اسمتھ نے رسالے کو مملہ کرنے کا حکم دیا تو بھانسی کی رانی نے برطانوی رسالے کے سپاہیوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ جب اُن کے ساتھی انہیں چھوڑ کر بھاگے تو اُن کی کوشش کی باوجود اُن کا گھوڑا بھی دوسروں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ اُن کے ساتھ شاید وہ بھی بچ کر نکل جائیں لیکن چھاؤنی کے قریب ایک نہر پار کرتے ہوئے اُن کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر گیا۔ رسالے کے سپاہی نے، جو اُن کا پیچھا کر رہا تھا، بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ عورت ہیں اُن پر تلوار سے وار کیا۔ وہ گریں اور پھر اُنھ نہ سکیں۔ اُس رات اُن کے جاں نثار ساتھیوں نے اس خیال سے اُن کا جسم جلا دیا کہ انگریز یہ ڈیک نہ مار سکیں کہ انہوں نے رانی کو گرفتار کر لیا۔ چاہے وہ اُن کی اشیاء کیوں نہ ہو۔“ (۲) کلشی بانی کی بہادری کی یہ کہانی کبھی فراموش نہیں کی جاسکے گی۔

مندرجہ بالا کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے جن کے نام بہادری کے کارناموں، مزاحمت کی تنظیم اور بغاوت کی تحریک کے لیے یاد رکھے جائیں گے۔ اس قسم کی ایک شخصیت تھی بخت ناں بود جلی کی فوجوں کی کمانڈران چیف تھے اور جنہوں نے انتظامی کونسل کی تنظیم کی تھی۔ ایک اور تھے احمد اللہ شاہ جن کے متعلق اُن کے دشمن بھی کہتے تھے کہ ”بڑی صلاحیتوں کے مالک، بہت بہادر، راجہ ارادہ رکھے والے انسان اور باغیوں میں سب سے اچھے سپاہی ہیں۔“ (۳) آلہ آباد کے مولوی لیاقت علی نے، جو بہت معمولی

(۱) ہو مس، مول بالا، صفحہ 517 (۲) کے اور ملیسن، مول بالا، جلد پنجم، صفحات 154-155

(۳) ملیسن، ارنل، بی، History of the Indian Mutiny، جلد دوم صفحہ 541

خاندان سے تعلق رکھتے تھے، شہر پر دہلی کے بادشاہ کی طرف سے حکومت کی۔

مرکزی کردار تھے شہنشاہ بہادر شاہ اور تانا صاحب وہ دونوں ہندوستان کی تاریخ کے دو مشہور حکمران خاندانوں کے وارث تھے۔ بہادر شاہ کے بزرگ ایسی سلطنت پر حکومت کر چکے تھے جس کی شہرت دو سو سال تک پوری دنیا میں رہی تھی۔ تانا صاحب کا تعلق ان پیشواؤں کے خاندان سے تھا جنہوں نے کاویری سے الٹک تک مرہٹہ راج پھیلایا تھا۔ بد قسمتی سے یہ نام بہت سی نژادی بحثوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔

بہادر شاہ اور تانا صاحب مزاج کے اعتبار سے بہادرانہ کارناموں سے مناسبت نہیں رکھتے تھے اور انہیں جو رول او اکرنا پڑا اُس کے انتخاب میں اُن کی مرضی کو دخل نہیں تھا۔ یہ رول محض حالات کی دین تھا۔

جس وقت تحریک کی قیادت کرنے پر بہادر شاہ کو مجبور کیا گیا اُس وقت اُن کی عمر اسی سال سے زیادہ تھی۔ پوری زندگی انہوں نے دہلی کے لال قلعہ کے محل میں گوشہ نشینی میں گزاری تھی جہاں تخت پر بیٹھنے کے بعد وہ مصاحبوں میں گھرے رہتے تھے۔ انگریزوں پر اُن کا انحصار تھا جو ذاتی اخراجات کے لیے انہیں سالانہ پیشکش دیا کرتے تھے۔ انہیں سرکاری معاملات کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے کہ وہ ایسے بادشاہ تھے جس کی کوئی سلطنت نہیں تھی۔ لیکن اُن میں اہلیت کی کمی نہیں تھی۔ وہ خود بھی ہندی اور اردو کے اچھے شاعر تھے اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس عمر میں اور ایک خصوصی منظر کے باوجود انہوں نے وہ موقف اختیار کیا جس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اُن سے کہیں زیادہ کم عمر رکھنے والے انسانی کے لیے بھی دشوار ہوتا۔ لیکن انہیں داؤد دینی پڑتی ہے کہ ایک دفعہ اس پر خداراستے میں قدم رکھنے کے بعد انہوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ زیادہ تعجب تو اس بات پر ہے کہ انہوں نے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے دہلی کے لوگوں کو متحد کرنے، محصور شہر دہلی میں امن و امان قائم رکھنے، اپنی رعایا کی ہمتیں بڑھانے اور آخر دم تک لڑائی جاری رکھنے کی خاطر اپنی فوجوں کی ہمت افزائی کرنے کی انتھک کوششیں کیں۔ لیکن اُن کو ایک بہت بڑی طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا اور اُن کا انجام افسوسناک ہوا۔ اُن کی نظروں کے سامنے اُن کے بیٹوں کو گولیاں ماری گئیں اور انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سال اپنی ملکہ کے ساتھ اپنے ملک سے دور جا وطنی کے عالم میں برہامیں گزر رہے۔

تانا صاحب آخری پیشوا بانی راؤدہم کا پسر منتخب تھے۔ جب بانی راؤ انگریزوں کا باج گزار ہو گیا تو غلامی کی زنجیریں اُسے گراں گزرنے لگیں۔ تانا ایک آزاد امیر کی حیثیت سے زندگی گزارتے تھے جس کے مشاغل تھے سماجی دلچسپیاں، تفریحات اور کھیل تماشے۔ جب بغاوت نے انہیں ایک دورِ اب پر اُلٹا رکھا تو انہوں نے بادلِ نخواستہ باغیوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ انہیں سیاسی رہنما تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اصل طاقت دوسروں کے ہاتھوں میں تھی۔ شکست کے بعد انہیں نیپال کی سرحد کی طرف جانا پڑا۔ انہوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور بڑی خوداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”جب تک میری جان میں جان ہے اُس وقت تک تم سے لڑائی جاری رہے گی چاہے میں مارا جاؤں، قید ہوں یا پھانسی پاؤں۔ میں جو کچھ بھی کروں گا تلوار کے ذریعے کیا جائے گا۔“ اُس کے بعد وہ نیپال کے جنگلوں میں ہمیشہ کے لیے کھو گئے۔

بغاوت ناکام ہو گئی۔ اُس کے رہنماؤں کو پھانسی دے دی گئی۔ ناکامی کی قیمت انہیں آزادی

اور جانداؤ کی ضبطی کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ جانبدار مورخوں نے بد قسمتی سے اُن پر مظالم اور غیر انسانی کاروائیوں کے الزامات لگائے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن میں سے کسی (1) سے نہ اُس قتل عام کا منصوبہ بنایا تھا اور نہ حکم دیا تھا جو اس بغاوت کی تاریخ پر ایک بد نما دھبہ بن گیا ہے۔ اُن کا اصل مقصد تھا بدایہ حکومت کا تختہ الٹنا۔ زیادہ شرمناک کاروائیاں یا تو سپاہیوں نے کی تھیں جن پر مذہبی خون طاری تھا اور جو بہت زیادہ خائف تھے یا اُن بد معاشر اور جرائم پیشہ لوگوں نے جنہیں جیلوں سے رہا کر دیا گیا تھا اور جو قتل و غارت کرنا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ایسے ہندوستانیوں کی بھی کمی نہ تھی جنہوں نے انسانیت کا ثبوت دیا اور جن کا وہ یہ قابل ستائش تھا۔ (2)

گنجی کی فوجوں کی افسروں کی کادر و انیاء بھی اتنی ہی غیر انسانی تھیں جن کے ذکر سے بھی دکھ ہوتا ہے۔ وہ بڑے پیمانے پر ناقابل یقین خفیف الحركات کی کے مرتکب ہوئے۔ جرم کی تعقیب کیے بغیر ہزاروں انسانوں کو پھانسیاں دیدیں۔ جن کو سزائیں دی گئیں ان کی کسی انسانی جذبہ کا پاس کیے بغیر تہلیل کی گئی، گاؤں کے گلاں تباہ کر دیئے گئے۔ یہ وہ کہلی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اخلاق اور انسانی جذبات سے محروم تھے۔ یہ صورت حال زیادہ عقلمن عقل اختیار کر لیتی ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وہ نظم و ضبط سے بیگانے نہیں تھے بلکہ ایک ایسی منظم حکومت کے تربیت یافتہ افسر تھے جو اپنے مذہب اور تہذیب کی برتری پر اصرار کرتی تھی۔

بعادت کی ناکامی غیر متوقع نہیں تھی۔ اس کو منفی نظریات نے جنم دیا تھا۔ اس کا محرک کوئی مثبت تخلیقی تصور نہیں تھا۔ اس کے سامنے کسی اعلیٰ سماجی نظام یا اعلیٰ نظام کا تصور نہیں تھا۔ وہ تو ایک ہنگامی نشہ تھا کہ لوگوں کی ایک منظم اور مستقل تبدیلی کی کوشش۔ چونکہ یہ ایک بلا قصد ہنگامی حادثہ تھا اس لیے اس تحریک کے پیچھے کوئی مستحکم تنظیم کام نہیں کر رہی تھی۔ اس کے پاس نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ روپیہ تھا۔ بانیوں نے اتحاد کی بنیاد تھی بدلی حکومت کے ختم کرنے کی خواہش۔ لیکن باغی و سطی جذبات و افکار سے اتنے سرشار تھے کہ ان کے ذہن میں اس نے ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی۔ بدلی حکومت کو ختم کرنے کے

(۱) (الف) کا پیرور میں ہونے والے مظالم میں نامساعدت کے مفید حصے سے متعلق اس بات کو ایک انگریز خاقان مسز ہورسٹ کا بیان ثابت کرتا ہے۔ اس کو ناماد، جو برطانوی فوج کا ایک اعلیٰ افسر تھا، سی پورہ لگاٹ کا پورہ کے حوالے کا فکیر ہوا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ناماد صاحب نے ۱۸۰۸ء اور ۱۸۰۹ء کے انگریزوں کے ساتھ اسی طرح بائینوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا اس نے لکھا ہے "میں نے پہلے جب اس شخص کو اس وقت دیکھا تھا اس کوئی شخص اس کے متعلق بچہ کہتا ہے یہ اس کی ضربی ہے لیکن اس قتل عام کے سلسلے میں اس کو میں غم نہیں کر دیتی ہوں۔ مجھے تو ایک صاف دل، سید کا مالدار، خوش اخلاق تیس سالہ نوجوان معلوم ہوا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اس کے صدمہ کی تعمیل کی جاتی تو نہ کوئی قتل کیا جاتا اور نہ کسی کا مال و اسباب لوٹا جاتا۔"

(i) سرگزشت مازهر مؤلف: خانم انگلیسی، بریلوه بند، استان (فارسی) (مخطوطه فارسی است ترجمه 1311 هجری (1853ء) در تبران، از محمد یوسف، افتخار السلطنت، از چاپ اعلیٰ، مترجم مخصوصی اعلیٰ حضرت شیشه‌ها ایران، این محقق جعفر کبیر الو.
(ii) پیام عزیزی مازهر مؤلف: خانم انگلیسی کی در دایک سرگزشت (مترجم بالاکا ۱۷۰۱ ترجمه از مولوی سید جعفر حسین اور مطبوعه دارالاشاعت پنجاب، لاہور، 1933ء).

(ب) اس طرح جمہانی نئی، فی، کی یکایک 20 راجست 1889ء کو ثابت ہوئی جب ایک انگریز برادر نے اپنے پھر جمہوری دستور کو ڈاکو
 لکھا جمہوری ہاں کے ساتھ نہایت غیر متصافانہ رویہ ردی کا طوط نکالیا ان کے ساتھ کٹر ظلم کیا گیا کہ یہ میرے علاوہ کسی
 کو نہیں معلوم ہے۔ انہوں نے جمہانی کے پرچم پر باشندوں سے اس قتل عام میں نوبی حصہ نہیں لیا تھا جو جون 1857ء میں ہوا
 تھا۔ ”مرائنس، جمہانی مستحقان صاحب مبادئی لکھی جانی، صفحہ 125، مجلہ 11، صفحات 274-280

(۲) بے ڈوب۔ برطانیہ نے ۱۷ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا تھا ”یچھو لوگوں کی ہائیں حقیقت میں بڑے عجیب انداز سے تھیں۔ جہاں اناتیت سازگار، اس کی جاری تھیں، وہیں یچھو مند تانگوں نے بڑی شافت کا ثبوت دیا۔“

کے معنی سمجھے گئے بدیسیوں کو ختم کرنا اور آزادی کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ اُن کی ذاتی حکومت بحال کی جائے جنہیں بدیسیوں نے حقوق و استحقاق سے محروم کر دیا تھا۔ دشمن کے سیاسی نظام کی نوعیت کو وہ نہ سمجھ سکے اور یہ بات بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آئی کہ افراد کا قتل نظام کی شکست و ریخت کے مترادف نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو کسی قدر سمجھ لیا گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعاون ضروری ہے۔ لیکن وہ یہ بات نہ سمجھ سکے کہ قوم کی بنیاد ایک فطری اتحاد ہوتا ہے اور یہ کہ اُن آزاد اکائیوں کا عارضی تعاون اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ بات بھی اُن کی نظر سے پوشیدہ رہی کہ کسی جدید طاقت کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک اعلیٰ سیاسی نظام میں مختلف فرقوں کا امتزاج ضروری ہے۔

جس مقصد کے لیے وہ لڑے اس کو غیر منصفانہ نہیں قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اتنا کافی نہیں تھا۔ باغیوں میں نظم و ضبط کی کمی تھی اور اُن کی وفاداریوں میں بھی زیادہ جان نہیں تھی۔ ذہنی اعتبار سے بھی وہ دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے مخالفوں کی فوجی تکنیک سائنس پر مبنی تھی اور اُن کا سوچنے اور عمل کرنے کا انداز زیادہ منطقی اور اور معقول تھا۔ فوجی حکمت عملی اور تدابیر کے تعلق سے انگریزی فوج ہندوستانیوں سے بہت بہتر تھی۔ برطانوی کمانڈر تربیت یافتہ سپاہی تھے جنہیں جنگ کا بہت تجربہ حاصل تھا۔ یہ فوجیں اعلیٰ درجہ کی منظم حکومت ہند کے احکام کی تعمیل کر رہی تھیں۔ جسکی پشت پر برطانوی لوگوں کی اور برطانوی حکومت کے بڑے بڑے وسائل تھے۔ جب تک کہینی کی حکومت کے مرکزی ڈھانچے کام کر رہے تھے اُس وقت تک آس پاس کے علاقوں کا ہاتھ سے نکل جانا اُس کے لیے مہلک ثابت نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک سمندر پار سے کمک آرہی تھی اُس وقت تک ہندوستان میں برطانوی حکومت کا طوفان چھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ 1857ء کی بغاوت آخری کوشش تھی جس کے ذریعے ایک ناکارہ نظام اپنی گزشتہ شان و شوکت دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بغاوت کی موت نے نئی طاقتوں کی سرگرمیوں اور نئے سانحے کے معرض وجود میں آنے کے لیے میدان تیار کر دیا۔

تیسرا باب

ہندوستانی درمیانی طبقہ

I۔ تغیر پذیر ڈھانچہ

ہندوستان میں آنے والے یورپی تاجر ایک نئی تہذیب کے نمائندے تھے۔ اُن کی معاشی سرگرمیوں کے مقاصد اور طریق کار، اُن کی تجارتی کاموں کی تنظیم اور اُن کے کام کرنے کے طریقے ہندوستانیوں کے طریقوں سے مختلف بھی تھے اور اُن کے لیے اجنبی بھی۔ وہ لوگ یورپی ممالک سے آئے تھے جہاں کاسمانی اور سیاسی پس منظر مختلف تھا۔ اخلاق و رسوم، مذہب و تہذیب اور ذہنی رویوں اور رجحانوں میں وہ ہندوستانیوں سے بعد المشرقین رکھتے تھے۔ یورپی تاجروں اور مشنریوں کی آمد ہندوستانیوں کے ساتھ اُن کے روابط نے سماجی تبدیلی کے عمل کو جنم دیا جو وقت گزرنے اور مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت بڑھنے کے ساتھ ساتھ تیز تر ہو تا گیا۔ جب اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگریزوں نے بنگال کو فتح کر لیا تو یہ عمل ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان کی سیاست، سماجی زندگی، معیشت اور تہذیب پر مغرب کا اثر زیادہ گہرا اور دور رس ہو گیا۔

یوں تو تبدیلی پلاسی کی جنگ سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن ابتداء میں اس کی رفتار دھیمی تھی۔ 1757ء سے 1833ء تک اس تبدیلی کی سمت کا واضح تعین ہو گیا اور اُس کی رفتار بڑھ گئی۔ سماج کی نئی شکل اور نئے تصورات کی اہم خصوصیتیں لوگوں کے ذہنوں میں بیجان پیدا کر رہی تھیں۔ اس دوران ہندوستان کے مختلف علاقے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے اور سماجی گروہوں کی درجہ بندی ٹوٹنے لگی۔ ذات پات کے نظام کی سختی میں کمی آئی اور روایتی دہکی معیشت نے خود کفالت اور علیحدگی کی قدیم نمایاں خصوصیتیں کھو دیں۔

اس تبدیلی کا تجربہ سب سے پہلے بنگال کو ہوا۔ اُس کے بعد ہندوستان کے دوسرے حصے جب برطانوی حکومت میں آنے لگے تو وہاں بھی اس قسم کی تبدیلی ہوئی یہاں تک پور ملک ایک سیاسی نظام کے تحت متحد ہو گیا۔ اس نے قومی شعور کے نشوونما کے لیے ایک ضروری شرط پوری کر دی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ برطانوی حکومت نے سماجی تبدیلی بھی پیدا کی۔ قدیم طبقوں میں سے، جن میں ہندوستانی سماج بنا ہوا تھا، نئے نئے گروہ بھرے جو دولت، تعلیم اور پیشے کے اعتبار سے مختلف ہونیکے باوجود کچھ مشترک خصوصیتیں رکھتے تھے جن کی بنا پر انہوں نے ایک سماجی طبقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس طبقے نے نئی توقعات و عزائم کے ساتھ انفرادی، سماجی اور سیاسی طرز عمل کے نئے تصورات کو بھی جنم دیا۔ اس نئے طبقے کو متوسط طبقے کا نام دیا گیا حالانکہ اپنی تشکیل، ساخت اور فلسفے کے اعتبار سے وہ مغرب کے متوسط یا بورژوا طبقے کے ساتھ وسطی ہند کے درمیانی طبقے سے بھی مختلف تھا۔

لیکن ایک طرح سے ہندوستانی متوسط طبقہ مغرب کے متوسط طبقے سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ یورپ کے متوسط طبقے نے فیوڈل مالکان اراضی کی طاقت توڑی، بادشاہوں کی مطلق العنانیت کا تختہ الٹا اور کلیسا کے اختیارات ختم کیے۔ اُس نے انفرادی آزادی، آزاد مقابلے اور سرمایہ دارانہ کاروبار کے اصولوں کو فروغ دیا۔ ہندوستان کا ابھرتا ہوا متوسط طبقہ معاشی میدان میں تو درہل ادا نہیں کر سکا جو یورپ کے متوسط طبقے نے ادا کیا لیکن سیاسی میدان میں اُن دونوں کے رول بڑی حد تک یکساں تھے۔ عام لوگوں میں قومی شعور پیدا کرنے، قومی آزادی کی تحریک چلانے اور بالآخر ملک کو بدیسی حکومت سے آزاد کرنے کا سہرا اس طبقے کے سر ہے۔

II۔ ہندوستانی متوسط طبقے کی ابتدا

ہندوستان میں جدید متوسط طبقے کا ارتقاء کاروائیوں کی بنا پر عمل میں آیا۔ ایک طرف قدیم حکمران طبقہ ختم کر دیا گیا اور دوسری طرف مالکان اراضی، تاجروں اور دانشوروں کا ایک نیا گروہ وجود میں آیا۔ قدیم بالائی طبقے کی کلکتہ و ریخت برطانوی فتح کا راست نتیجہ تھی۔ تاجر طبقے کی تشکیل برطانوی تجارتی سرگرمیوں کی ذیلی پیداوار تھی اور مالکان اراضی اور دانشوروں کے طبقے کی نمو برطانوی حکومت کے قیام اور برطانوی تعلیم کے رواج کی مرہون منت تھی۔

جدید ہندوستانی متوسط طبقے کا جو ہندوستان میں برطانوی کاروبار کی بنا پر عمل میں آیا۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ پہلے پہل نئے آباد کیے جانے والے مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے شہروں میں ظاہر ہوا اور اُس کے بعد اُن شہروں میں نظر آیا جو برطانوی کاروباری سرگرمیوں اور نظم و نسق کے ذیلی مرکز بن گئے تھے۔ پرہی ڈنکی شہر ہر اعتبار سے نئے تھے۔ وہ محض تجارت اور صنعت کے مرکز نہیں تھے۔ وہاں انگلستان کی طرح کی میونسپل تنظیمیں تھیں جو شہریوں کے کاموں کو منضبط کرتی تھیں اور اُن کی خاص خاص ضرورتیں پوری کرتی تھیں۔ مفاد عامہ اور معاشی سرگرمیوں کے اعتبار سے وہ مغربی تھیں۔ ان شہروں کے ہندوستانی باشندوں کے تصور درجہ، پیش اور تعلیم کو ان کاموں نے متاثر کیا۔ اُن کے طور طریق میں تہذیبوں، معیشتوں اور رجحانات کی آمیزش ہونے لگی۔ (1) عقاید اور طور طریق کے معیارات کے اعتبار سے شہری علاقوں کا ہندوستانی متوسط طبقہ دیہات کے عام لوگوں سے مختلف نظر آنے لگا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی دیکھ ریکھ میں جن شہروں نے نشوونما پائی اُن میں کلکتہ کا رول سب سے اہم ہے۔ کلکتہ تاجروں، بنک کاروں اور تکنیکی کارکنوں کا گھر بن گیا، صنعت کا مرکز بن گیا اور داخلی اور بدیسی تجارت کی ایک بڑی منڈی بن گیا۔ کلکتہ سے یورپی تصورات، طور طریق، رواج اور ادارے بنگال میں پھیل گئے۔ جس وقت سیاسی جھگڑوں، وراثت کی جنگوں اور مرہٹوں کے حملوں نے بنگال میں انتشار پھیلارکھا تھا اُس وقت آس پاس کے لوگوں کے لیے کلکتہ جائے پناہ بن گیا۔ روزگار کے متلاشی برطانوی تجارتی مراکز کی

(1) دو معیشتوں کے تصور کو بونے، جے، ایچ نے متعارف کرایا ہے۔ Economics and Economic Policy of

طرف مائل ہوئے اور کلکتہ کے کچھ سرکردہ باشندوں نے اپنے ہم وطنوں کو وہاں آنے پر آمادہ کیا۔ کشمی کانت جمدار اور اس وقت کے مہاراجہ تابا کرشنا دیب نے بہت سے برہمنوں کو وہاں آباد ہونے کی دعوت دی۔ ست گاؤں، ہالی شہر اور تہور سے تاجر وہاں آئے اور گماشتے، دلال، بچے، لیے، دست کار، تاجر، گھنٹی عملہ اور مزدور کام اور منافع کی تلاش میں جوق در جوق وہاں پہنچنے لگے۔ تہور سے جو تاجر آئے اُن میں سے سینھ اور بیساکھ سبچ پہلے آئے تھے۔ انہوں نے سواتوٹی میں ایک کپڑے کی منڈی قائم کر لی۔

اس کے نتیجے میں کلکتہ تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ جس وقت کمپنی نے اس کے حقوق لگان داری خریدے تھے اُس وقت اس کی آبادی دس ہزار سے کم تھی لیکن 1756ء تک وہ بڑھ کے سو لاکھ ہو چکی تھی۔ ابتدا میں کچے مکان نہیں تھے۔ 1756ء میں تقریباً پانچ سو کچے مکان تھے جو مختلف سڑکوں اور گلیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ زمین کا لگان 300 روپیہ سالانہ سے بڑھ کے 16,000 روپیہ سالانہ سے زیادہ ہو چکا تھا اور مجموعی آمدنی 900 روپیہ سے بڑھ کے تقریباً 50,000 روپیہ ہو گئی تھی۔ (۱)

یورپی تجارت اور متوسط طبقے کا فروغ

بنگال میں ہندوستانی متوسط طبقے کا فروغ کلکتہ میں انگریزوں کی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں سے جڑا ہوا تھا۔ اس کا کردار ان کے خصوصی کاموں نے تشکیل کیا تھا جو اسے سرانجام دینے پڑتے تھے۔ اس کی ترقی اور ساخت کا انحصار کمپنی کی سرگرمیوں کے مقاصد اور طریق کار میں ہونے والی تبدیلیوں پر تھا۔ اس طبقے کے ارتقائی عمل کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کمپنی کی تاریخ اور ان مراحل کا اجمالی بیان کیا جائے جن سے اس کی تجارت گزری۔

کمپنی کی سرگرمیوں کا پہلا مرحلہ محض تجارتی تھا جو 1757ء میں پلاسی کی جنگ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بنگال کی فتح کے بعد یہ تجارتی ادارہ تیزی کے ساتھ ایک انتظامی ادارے میں تبدیل ہونے لگا۔ یہ عبوری دور تقریباً تیس سال پر محیط تھا یعنی جنگ پلاسی سے 1785ء اور ان ہسٹنگز کی واپسی تک۔ تیسرے مرحلے میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ایک مستقل عمارت تعمیر کی گئی اور یہ ختم ہوا 1833ء میں کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کے اختتام کے ساتھ۔ آخری مرحلہ 1857ء کی بغاوت کے نتیجے میں 1858ء میں ختم ہو گیا۔

ابتدائی دور میں جب کمپنی اپنی تجارت کو بڑھانے میں مصروف تھی اس وقت وہ ہندوستانیوں کی آمد اور تعاون حاصل کرنے پر مجبور تھی اور تجارت کے پھیلاؤ کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی اُس کے حلقہ اثر میں آ گئے تھے۔ وہ مختلف حیثیتوں سے کام کرتے تھے یعنی ٹھیکیدار، دالوں، تاجر، ایجنٹ یا مانیان، صراف، ادوی عملہ، ملازم وغیرہ۔ ان تجارتی رشتوں کے مرحلے میں انگریز تاجروں کے ساتھ اُن کے تعلقات ضروری تھے اس لیے کہ کمپنی نے ہندوستانی مال حاصل کرنے کے لیے اُن لوگوں کو استعمال کرنے کا طریقہ اختیار کیا تھا جو اُس کے ملازم نہیں تھے۔

ہندوستانیوں کے لیے یہ طریقہ اچھی نہیں تھا۔ لیکن ہندوستان میں پائے جانے والے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے کمپنی کو اس میں ترمیم کرنی پڑی تھی۔ کمپنی بچوں کو ذریعے کام

(۱) اے۔ اے۔ کے Short History of Calcutta in XIX Causes of India جلد ہفتم، صفحہ 64 (1902)۔

کرتی تھی یعنی داؤنی تاجروں کے ذریعہ پیدا کاروں سے روابط قائم کرتی تھی۔ چونکہ انگریز تاجر بدیسی تھے، ہندوستانی مصنوعات کے حالات سے واقف نہیں تھے اور یہاں کے لوگوں کی زبان نہیں جانتے تھے اس لیے ہندوستانی بچوں کا استعمال ناگزیر تھا۔ داؤنی تاجر کو اُس مال کی ۱۰ سے ۲۰ فیصدی تک قیمت پیشگی مل جاتی تھی جو کمپنی یا انفرادی خریدار کو مہیا کرتا ہو تا تھا۔ (انفرادی خریدار وہ کمپنی کا ملازم ہو تا تھا جس کو اس امر کی اجازت دی جاتی تھی کہ اپنی قلیل آمدنی میں ذاتی تجارت کے منافع یا آزاد تاجرانہ ہم سے اضافہ کرے) خود داؤنی تاجر بنگرڈ اور دوسرے پیدا کاروں سے اُن کی پیداوار حاصل کرنے کا معاہدہ کرنے کے بعد پیشگی رقم دیدیتا تھا۔ مال اور رنگوں میں لایا جاتا تھا اور کوٹھوں میں بھردیا جاتا تھا جہاں اُس کی نوعیت اور مقدار کی جانچ کی جاتی تھی۔ اور اُس کے بعد یا تو وہ لے لیا جاتا تھا یا رد کر دیا جاتا تھا۔ جو مال پسند کر لیا جاتا تھا اُسے برآمد کرنے کے لیے فلیکٹ کے گوداموں کو منتقل کر دیا جاتا تھا۔

داؤنی تاجر دلالوں سے کام لیتا تھا جو بشرط ضرورت ذیلی دلالوں سے کام لیتے تھے۔ اُن کا کام تھا بنگرڈ اور پیدا کاروں کے گاؤں میں جانا، اپنی گرانٹی میں مال جمع کروانا، اُس کی جانچ پر تال کرنا اور قیمتیں طے کرنا۔ اس طرح ہندوستانی تاجروں اور اُن کے گمشدوں کو منافع کمانے کے بڑے مواقع ملتے تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ مال کی قیمت پر انہیں 2 سے 4 فیصدی تک جائز کمیشن ملتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر دوسرے فریق سے بھی منافع کما تے تھے۔ اول تو دست کار اپنے افلاس اور مول بھاؤ کرنے کی سکت نہ رکھنے کی بنا پر اُن کے رحم و کرم پر ہو تا تھا۔ دوسرے یہ کہ یورپی تاجر اپنی عدم واقفیت اور باہمی رقابت کی بنا پر اُن کے ہاتھوں میں کھینٹتا تھا۔ بیدردانہ طریق کار، داؤچ اور منافع کی لالچ کا جہاں تک تعلق ہے داؤنی تاجر مغرب کے قدیم تاجر قسمت آزماؤں کے مشابہہ تھا۔ ملک کے اہمیرے ہوئے متوسط طبقے کی ابتداء اُن سے ہوئی۔ کمپنی کے سیاسی طاقت حاصل کرنے سے پہلے بھی اُن کے ہاتھوں میں بہت کاروبار آچکا تھا۔ مثال کے طور پر 52-1751ء میں 1,58,756 روپے کی مالیت کے ٹھیکے دیئے گئے اور 3,52,054 روپے کا مال رقم ادا کر کے خرید گیا۔ یہ دونوں معاملے بڑی حد تک داؤنی تاجروں کے ذریعے کیے گئے تھے۔

ہندوستان کے بچوں کے پاس منافع کمانے کا ایک اور ذریعہ تھا بدیسی تجارت جو تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان میں ہونے والی درآمدات کا اوسط 1667ء اور 1672ء کی درمیانی مدت میں تھا 2,53,000 پاؤنڈ سالانہ جو 1664ء اور 1681ء کی درمیانی مدت میں بڑھ کے 4,47,710 پاؤنڈ فی سال ہو گیا تھا۔ (1) 1708ء کے بعد ان درآمدات کی قیمت میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ اگر ہم 1907ء اور 1917ء کی درمیانی دس سالہ مدت میں پائی جانے والی قیمتوں کو بنیاد بنائیں اور انہیں 100 قرار دیں تو دوسری دس سالہ مدت میں درآمدات کی قیمت کا شمار 150 ہو گیا تھا، تیسری میں 153، چوتھی میں 158 اور پانچویں میں 219۔

اسی مدت یعنی 1707ء لغایت 1757ء میں ہندوستان سے ہونے والی برآمدات کی مالیت دکنی ہو چکی تھی یعنی 1708ء میں برآمدات کا شمار 100 تھا تو 1757ء میں بڑھ کے 193 ہو گیا تھا۔

اس کے معنی تھے کہ کمپنی اور دوسرے یورپی تاجروں میں ہندوستانی تاجروں کی خدمات کی مانگ بڑھ گئی۔ اُس وقت جو تاجر خاندان موجود تھے وہ اس بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ بہت سے نئے خاندان، جن کے پاس نہ کوئی تجارتی تجربہ تھا نہ روایت، اس میدان میں کود پڑے تاکہ یورپی تجارت نے

جو مواقع مہیا کیے تھے اُن سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تاجر نے نئے متوسط طبقے کے پہلے اور غالب عناصر بن گئے۔ ایک اور گروہ جو اس طبقے کا جز بن گیا وہ تھا صرافوں کا گروہ۔ وہ مقامی تجارتی برادری کا لازمی جز تھا۔ اُن بدیسگی اور ہندوستانی تاجروں کو جو کاروبار کرتے تھے مختلف کرنسیاں استعمال کرنی پڑتی تھیں۔ بدیسوں کو عام طور سے زیادہ تر ہندوستانی مال جنس، زریا طین کے عوض خریدنا ہوتا تھا جو وہ اپنے وطن سے درآمد کرتے تھے۔ اس طرح بہت سی چاندی، کچھ سونا اور مختلف قسم کی کرنسیاں ہندوستانی منڈیوں میں آتی تھیں۔ اور یہ ضروری تھا کہ کوئی ادارہ ہو جو اُن کی قیمت کا فیصلہ کر سکے اور معیاری کرنسی میں انہیں تبدیل کر سکے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں زر کی صورت حال تاجروں کے لیے بڑی پریشان کن تھی اس لیے کہ تقریباً ۹۰۰۰ قسم کے سکہ ملک میں چل رہے تھے۔ ان سکوں کو پرکھنا، وزن کرنا اور کھرے کھونے کا فیصلہ کرنا ایک تکنیکی عمل تھا اور یہ کام تھا صراف کا۔ تجارت میں کتنی پریشانی ہوتی تھی اسکا اندازہ اُن سکوں کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے جو اُس وقت رائج تھے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی سکوں میں تو بنگال سکہ روپیہ بدراس کا آرکات روپیہ اور بمبئی کا روپیہ جن میں سے ہر ایک کا وزن اور اس میں چاندی کی مقدار مختلف تھی، بنگال کی سونے کی مہر تھی، بدراس اسٹار اور تین سوامی پکواڑا تھے۔ اور مختلف شہنشاہوں کے زمانوں کے سونے اور چاندی کے سکہ تھے اور سنوت روپے تھے۔ اس کے علاوہ یورپی کرنسیاں تھیں یعنی ڈچ، رکنس ڈالر، اسپینی ڈالر، جرمن کراون، ڈچ فلورین، فرانسیسی مورے، پرتگالی ملرے وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ زر کے مبادلے کے کاروبار کی گنجائش بھی بہت تھی اور وہ منافع بخش بھی تھا۔ لیکن صرافوں نے بینکاری اور روپیہ قرض دینے کے کاروبار کا اضافہ کر کے اسے وسیع تر بنادیا تھا۔ تجارت میں ہونے والے اضافے سے تاجروں کی طرح صرافوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اُن کی خدمات کی مانگ اُس وقت تک بڑھتی رہی جب تک یورپی انجینیئرز مراکز قائم نہیں ہو گئے اور اس گروہ کے بہت سے رکن بڑی دولت کے مالک نہ بن بیٹھے۔

اس طبقے کا ایک اور حصہ اُن کاروباری لوگوں کا گروہ تھا جنہوں نے کچھ اشیاء کی حد تک کمپنی سے داخلی تجارت کا چارہ لے لیا تھا۔ اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھے کھالوں، سندور اور آتش بازی کا کاروبار کرنے والے اور تمباکو، بھانگ، پرائیوٹا، رال، پرانی رسیوں کا سن وغیرہ بیچنے والے۔ اُن میں سے تھے کچھ کے پاس عرق کشید کرنے کا لائسنس تھا اور دوسرے جہازوں کی درزیں بند کرنے یا ملاحوں کے صندوقوں کی مرمت کرنے کا کام کرتے تھے۔

اُن کے بعد تکنیکی کام کرنے والے آتے تھے۔ ہندوستانیوں کا ایک گروہ پیداوار کے ترقی یافتہ طریقے استعمال کرتا تھا جنہیں کمپنی نے روانہ دیا تھا۔ 1678ء میں کمپنی کچھ رنگ ریزوں کو لائی تاکہ خام ریشم کے رنگ کو بہتر بنایا جاسکے۔ اُن کے ساتھ کچھ ریشم کا دھاگہ بننے والے اور بکر بھی آئے۔ اُس کے بعد کپاس، نیل اور شکر کی صنعتوں کو ترقی دی گئی اور زراعت اور مصنوعات کے کام کو فروغ دیا گیا۔ جہازوں کی مرمت، ہنگلی دریا کے سروے اور نقشہ سازی اور دوسری کاروائیوں نے نئی تکنیک کا علم حاصل کرنے اور اُس پر عمل کرنے کے مواقع فراہم کر دیے۔ کچھ ہندوستانیوں نے انجینئروں، اُورسیروں، رنگرانوں، فوجیوں، ڈبئیوں اور ماتحتوں کے تکنیکی عہدے حاصل کر لیے۔

خاصی تعداد میں ہندوستانی مترجم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بہت سے ہندوستانی دلالوں اور بانیانوں کے فرائض ادا کرنے لگے جو انفرادی یورپی افسر اور ایک عام خاندان کی درمیان بچے لیے کا کام کرتے تھے۔

ایک گروہ اُن کا بھی تھا جو انتظامی فرائض ادا کرتے تھے یعنی لگان وصول کرنا اور محاصل اور مانگداری کی وصولی کرنا اس لئے کہ 1757ء میں کلکتہ کی جموئی آمدنی ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ کمپنی کے کاموں سے قریبی تعلق رکھنے والوں میں وکیل شامل تھے جو ہندوستانی سکومتوں کے حکام سے مذاکرات کرنے میں کمپنی کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دیوان، زمینداری پکچری (مشرکہ عدالت) کے مشیر، ”سیاہ قام زمیندار“ یا انگریز کلکٹروں کے ہندوستانی ماتحت بھی تھے۔

چنانچہ اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں جو متوسط طبقہ ابھر رہا تھا وہ بہت سے ایسے گروہوں پر مشتمل تھا جو اُن یورپی کمپنیوں کے انتظامی اور تجارتی معاملات کے تعلق سے بہت سے مختلف فرائض ادا کرتے تھے جن میں سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔

ظاہر ہے کہ اُن سماجی گروہوں کے افراد کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے جن پر ابھرتا ہوا متوسط طبقہ مشتمل تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبقے میں زیادہ تعداد تاجروں، کاروباری لوگوں اور یورپی تاجروں کے تجارتی گماشتوں کی تھی۔ اس طبقے کے فروغ کا اندازہ لگانے کے لیے مونے طور سے تجارتی اعداد و شمار کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ اُن سے اُن لوگوں کی حقیقی تعداد تو نہیں معلوم ہوتی ہے جو کمپنی کے لیے کام کر رہے تھے لیکن ہونے والی تبدیلیوں کے رجحانات واضح ہو جاتے ہیں۔ اُن سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ مال کی برآمد و درآمد اور متعلقہ کاروباری اور انتظامی سرگرمیوں میں اضافے کے بعد ان کاموں میں لگے ہوئے ہندوستانیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہوگی۔

انگلستان میں فروخت ہونے والے ہندوستانی اور مشرقی مال کی مقدار ظاہر کرتی ہے کہ 1708ء اور 1757ء کی درمیانی مدت میں اُن کی برآمد دگنی ہو گئی تھی۔ اصل ایشیا میں کپڑے سب سے اہم تھے۔ دوسری ایشیا تھیں چائے، کافی، بنگال کا خام ریشم، شورہ نیل، شکر، پتہ سن وغیرہ۔

انگلستان اس کے عوض ہندوستان کو زر نقد اور تجارتی مال برآمد کیا کرتا تھا جس کا تناسب معمولاً تین اور ایک ہوا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر 1708ء اور 1717ء کی درمیانی دس سالہ مدت میں 9,66,253 پاؤنڈ کے بقدر تجارتی مال اور 3,60,122 پاؤنڈ کے بقدر زر نقد ہندوستان کو برآمد کیا گیا تھا۔ 1747ء اور 1757ء کی درمیانی دس سالہ مدت میں یہ بڑھ کے بالترتیب 25,31,245 پاؤنڈ اور 56,44,245 پاؤنڈ ہو گیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں (1708ء تا 1757ء) مجموعی اعتبار سے تجارتی مال میں 60 فیصدی کا اور زر نقد میں 68 فیصدی کا اضافہ ہوا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کے ساتھ بھی انگریز تاجر، مہم کار اور بلا اجازت تجارت کرنے والے اور دوسری یورپی قومیں یعنی برطانیہ، ڈچ، فرانسیسی اور ذہین بھی تجارت کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ایشیائی لوگ مثلاً افغان، وسطی ایشیا کے لوگ، ایرانی، عرب اور آرمینیا کے باشندے بھی تجارت میں مصروف تھے۔

بدیہی تجارت، داخلی تجارت اور صنعت کو فروغ دیتی تھی۔ اس کے نتیجے میں ساحلی تجارت بہت بڑھ گئی اور بنگال کی بری تجارت میں بہت اضافہ ہو گیا جو سڑکوں اور دریاؤں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ چنانچہ تجارت کے بہت سے دھارے مل گئے جس کی وجہ سے کاروباری طبقے نے طاقت حاصل کر لی۔

تجارت کے فروغ نے نہ صرف ہندوستانی متوسط طبقے کو وسعت دی بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مغربی اداروں اور طریقوں کے ساتھ اس طبقے کے روابط نے ایک نئے، ہنری رنجان کو جنم دیا۔ تجارت میں

مشترک سرمائے کی تنظیمیں ایک نیا تجربہ تھیں جن میں حصہ داروں کو محض ایک سیکولر رشتہ متحد کرتا ہے اور اُن کے اتحاد کی بنیاد کسی فرقہ، ذات یا خاندان کا رشتہ نہیں ہوتا ہے۔ حساب اور تجارت کے مغربی طریقوں اور پیداوار کی ترقی یافتہ تکنیکیوں نے بھی انہیں متاثر کیا۔

تجارت اور صنعت کی طرح انتظامی معاملات میں بھی کلکتہ برطانوی مہم کا اصل مرکز بن گیا تھا۔ وہاں مغرب کی طرح ایک اداراتی تنظیم موجود تھی۔ برطانوی نوآبادی کا انتظام ایک صدر اور کونسل کے سپرد تھا جس میں کمیٹیاں اور ذیلی کمیٹیاں تھیں۔ 1726ء میں کلکتہ کی کارپوریشن کا قیام عمل میں آیا جس میں ایک میر اور نو لیبلڈر مین تھے۔ کئی انتظامی اور عدالتی امور کے لیے میر کی عدالت قائم کی گئی۔ کچھ کاموں کے لیے بورڈ مقرر کیے گئے۔ زمینداری پکھری میں ہندوستانیوں کے مقامات کی سماعت ہوتی تھی۔ اور زمیندار (انگریز کلکٹر) انتظامی، مالیاتی اور عدالتی فرائض ہندوستانی ماتحتوں کی مدد سے سرانجام دیا کرتا تھا۔ جو ہندوستانی تجارتی یا انتظامی کاموں میں انگریزوں کے قریب آگئے اُن کے ذہنوں کو ان تبدیلیوں نے متاثر کیا۔ یہ قدرتی امر تھا کہ یہ نیا طبقہ سب سے پہلے کلکتہ میں ابھرے۔ لیکن جب تجارتی اور انتظامی سرگرمیاں کلکتہ کے باہر پھیلنے لگیں تو مشن کہ پیٹے اور مشترکہ رجحان رکھنے والے لوگ منظر عام پر نمودار ہونے لگے اور انہوں نے ملک میں ایک نمایاں سماجی اور معاشی طبقے کی داغ بیل ڈالی۔

کلکتہ کا پھیلاؤ

کلکتہ کا پھیلاؤ اُن کی حیثیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس وقت سراج الدولہ نے اُس شہر پر قبضہ کیا تھا (1756ء) اُس وقت کلکتہ ایک خاصا بڑا شہر تھا جس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ چھبیس ہزار کاقدیم گاؤں سڑکوں، گلیوں اور کوچوں کی بھول بھلیاں میں تبدیل ہو چکا تھا جہاں خوبصورت کچے مکان اور نفیس باغات تھے۔ اُن میں بہت سے مکان اور باغ نئے طبقے کے مالدار اراکین کی جائیداد تھے۔

III ذات کے اعتبار سے نئے طبقے کی بناوٹ اور سماجی رویہ

سماجی نقطہ نظر سے سب سے بڑی تبدیلی، جو نئے طبقے کو پرانے طبقے سے ممتاز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ ذات پات کے سماجی کاموں سے معاشی کاموں کو علیحدہ کیا جانے لگا۔ نیا متوسط طبقہ محض ویشہ ذات یا قدیم کاروباری برادری تک محدود نہیں تھا۔ ہر ذات کے لوگ تجارت اور ملازمت کرنے لگے تھے۔ تاجروں، بینکاروں، دلالوں اور حاکموں میں برہمنوں کے ساتھ، جو اعلیٰ ترین ذات سے تعلق رکھتے تھے، کا ساتھ اور ویدیا بھی تھے۔ چلی ذاتوں میں سے سو برتا جانک، سدگوپ اور دوسرے لوگ تھے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ایک دھوبی تھا۔ (1) ایک نئی سماجی حرکت پذیری نے ذات پات سے مملو ہندوستانی سماج کو ہلادیا۔ کم سے کم شہری علاقوں میں یہ ضرور ہوا۔ حالانکہ کھانے پینے اور بنیادشادی کو ایک مخصوص طبقے تک محدود رکھنے میں

(1) لیکن، لچپ بات یہ ہے کہ اس تبدیلی کو وہ لوگ پسند نہیں کرتے تھے جو پرانے خیال کے تھے۔ مرشد آباد کے سیٹھ، جو جینی تھے، دوسری ذاتوں کے لوگوں کو باہمی اور نہیں بناتے تھے۔

راخ عقیدہ رکھنے والوں نے ان ہندوؤں کو توڑنے کی مدت تک مخالفت کی۔

رہن سہن کی سہولتوں میں خاص تبدیلیاں ہونے لگیں۔ شہروں میں یورپیوں کے قریب رہنے والے ہندوستانی مغربی انداز کے گھر اور باغات پسند کرنے لگے۔ ان کے گھروں کی بناوٹ، داخلی ساز و سامان اور اشیائے ضرورت سے مغربی اثر ظاہر ہونے لگا۔ اُس زمانے میں کانٹنہ چھری، پستول، سینکوں، میزوں اور کرسیوں، چائے دانوں اور پلیٹوں وغیرہ کا بڑھتا ہوا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ وہ نئے طریقے سیکھ رہے تھے۔

ہندوستانی نو دو لینے اُن بدیسوں کی نقل کرتے تھے جن کے وہ مددگار و خلام تھے۔ چنانچہ تاجروں کے قدیم طبقے کے ہندوستانی اطوار و اخلاق ختم ہو گئے اور عہد وسطی کے منکسر المواج اور خائف تاجر کے برعکس، جو ہمیشہ بادشاہ اور اُس کے حاکموں سے ڈرتا رہتا تھا اور اپنی حیثیت کو ظاہر نہ کرنے پر مجبور تھا، اُس کا جانشین اپنی دولت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ وہ ہانکی میں سفر کرتا تھا، منکن اور بھگتی رکھتا تھا اور ملازموں میں گھرا رہتا تھا۔ وہ عورتیں کرنے کا شوقین تھا۔ خصوصاً یورپی مہمانوں کو وہ اپنے گھر بلا تا تھا اور اُس کے سامنے اپنی اہمیت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ تجارت کے معاملے میں وہ زیادہ دیانت داری سے کام نہیں لیتا تھا۔ اُس کی نظر میں منزل یعنی دولت کی فراہمی راستہ کا جواز تھی۔ اُس نے پیٹے کی روایتی پابندیاں توڑ دی تھیں اور ہر اُس تجارتی سرگرمی میں حصہ لینے کی صلاحیت پیدا کر لی تھی جس میں تیزی کے ساتھ بڑا منافع کمایا جاسکے۔

نئے ماحول میں پرورش پانے والے یہ لوگ اپنی نئی حیثیت کے تحفظ میں بڑے چوکس رہتے تھے۔ وہ اُن حالات کے حامی تھے جنہوں نے انہیں دولت جمع کرنے، دولت سے مستفید ہونے اور اپنی اہمیت کو محسوس کرنے کا موقع دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس پرانے نظام سے اُن کا لگاؤ ختم ہوتا گیا جس کے تحت انہوں نے زندگیاں بسر کی تھیں اور جو نئے نظام کے برعکس انہیں قدیم و فرسودہ معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کمپنی کا بھگڑا مغل حکومت سے شروع ہوا تو انہوں نے بدلیسی کی حمایت کی جس کی پر امن اور منظم حکومت کو وہ مغل مطلق العنان بادشاہوں کی ذاتی حکومت پر ترجیح دیتے تھے۔ جب الوطنی کے جذبات ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے اور فوری ذاتی نفع کا خیال اُن کے احساسات پر چھایا ہوا تھا۔

اُس ابتدائی زمانے میں بنگال پر پڑنے والے برطانوی اثرات نے اُس رجحان کو ظاہر کر دیا تھا جو برطانوی حکومت کی پوری تاریخ کا ایک نمایاں عنصر رہا ہے یعنی کچھ لوگوں کی ہمت افزائی کرنا اور انہیں آگے بڑھانا اور زیادہ تر لوگوں کو نظر انداز کرنا۔ اس نے متوسط طبقے اور دانشوروں میں انقلابی، سماجی اور ذہنی رجحانات کو جنم دیا لیکن فی الجملہ ملک کی معاشی اور سیاسی ترقی پر توجہ نہیں دی جو عام لوگوں کا معیار بلند کرنے اور عہد وسطی سے جدید عہد کی طرف بلا رکاوٹ اور عملی عبور کا واحد ذریعہ ہو سکتی تھی۔

IV مدراس اور بمبئی میں ہونے والی تبدیلیاں

جو تبدیلیاں بنگال میں ہو رہی تھیں وہی تبدیلیاں مدراس اور بمبئی میں بھی ہو رہی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہاں تبدیلیاں کسی قدر پھونے پیانے پر ہوئیں۔

حالانکہ مدراس کی نوآبادی کلکتہ سے پچاس سال پہلے، جو دمیں آئی تھی اور پہلے ہوئے سمندر

کے ساحل اور مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال کو جانے والے راستوں پر واقع ہونے کی بنا پر اُس کو کئی فوائد بھی حاصل تھے پھر بھی وہ مغربی اثرات کے ایک مرکز کی حیثیت سے کلکتہ کا مقابلہ نہ کر سکی۔

اُس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُس علاقے کے سیاسی حالات زیادہ سازگار نہیں تھے۔ صدی کے ختم ہونے سے پہلے انگریز وہاں اپنی حکومت قائم نہ کر سکے۔ بنگال کے برعکس مدراس کے آس پاس کا علاقہ قریب قریب اٹھارہویں صدی کے اختتام تک ہندوستانی حکمرانوں کے زیرِ نگیں رہا۔ اُس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے طریقوں اور مقاصد میں بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ چنانچہ مدراس کو غیر مضبوط سامراج کی اُس طوائف الملوکی اور انتشار کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو دیوانی کے بعد برسوں میں بنگال میں دیکھنے میں آیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہاں کا سامی ماحول، جس میں اُنہیں کام کرنا پڑا، بنگال میں پائے جانے والے ماحول سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مدراس بھی اُس طرح کا نیا شہر تھا جیسے کلکتہ پھر بھی کلکتہ میں غیر کاروباری ذاتوں کو تجارت میں داخل ہونے کے مواقع ملے لیکن جو لوگ مدراس آئے وہ رہائشیوں میں زیادہ بندھے ہوئے تھے اور سامی تبدیلی کے لیے تیار نہیں تھے۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کی ذاتوں میں ہونے والے جھگڑے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاروبار میں برہمنوں کو شامل کرنے کے خلاف تاریکی کا اظہار بظاہر کرتا ہے کہ شمال کے مقابلہ میں وہاں سامی بندشیں زیادہ تھیں۔

لیکن مختلف ماحول اور مختلف سیاسی حالات کے باوجود مدراس میں ہونے والی تبدیلیوں کی نوعیت اور سمت بنگال ہی کی طرح کی تھی۔ یورپی تاجروں یعنی پرتگالیوں، ڈچوں، فرانسیزیوں اور انگریزوں کی قائم کی ہوئی فیکٹریوں کی باہمی رقابت اور یورپی تجارت کے فروغ کے ویسے ہی سامی نتائج سامنے آئے جیسے بنگال میں دیکھے گئے۔

مدراس میں قلعہ سینٹ جارج کی تعمیر کے بعد انگریز اپنی تجارت کو فروغ دینے میں مصروف رہے۔ انہوں نے تجارت کے وہی طریقے استعمال کیے جو بنگال میں کیے گئے تھے۔ تجارت اور حاصل کیے ہوئے علاقے کے انتظام کے معاملات میں اُن کی ضروریات یکساں تھیں۔ تجارت کرنے اور شہروں اور گاؤں کا انتظام سنبھالنے کے لیے انہیں ہندوستانیوں سے مدد لینا پڑی۔ اس نے ہندوستانیوں کے ایک ماتحت طبقے کو جنم دیا جو دولت اور حیثیت رکھتا تھا اور بنگال کے متوسط طبقے کے مشابہ تھا۔

ہندوستان سے برآمد کیے جانے والے مال کی خرید اور انگلستان سے درآمد کی جانے والی اشیاء کی فروخت کے لیے کمپنی نے ادنیٰ تاجروں کی خدمات حاصل کیں۔ مدراس میں انہوں نے چیف مرچنٹ کا دفتر قائم کیا جو دوسرے تاجروں اور گمشدوں کے ساتھ مل کر اُن کو مال مہیا کرتا تھا اور انگلستان سے آئے ہوئے زر نقد اور تجارتی مال کو فروخت کرتا تھا۔ انہیں کمپنی پیسگی رقم دیتی تھی وہ یہ رقم بنگال، رومنگریزوں اور ہسپانیائی کرنے والوں کو دیتے تھے جو مال مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتے تھے۔ بہت سے دوسرے تاجر بھی اس کام میں شریک تھے اس لیے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کے علاوہ بہت سے کمپنی کے ملازمین، بغیر اجازت تجارت کرنے والے اور دوسرے قسمت آزمائی کرنے والے بھی جو مدراس آگئے تھے خاصے بڑے پیمانے پر فوجی تجارت کرتے تھے۔ عام ہندوستانی تاجر جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور اُس کے ملازمین کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا وہ وہاں کہاں تھا ایسی دوز بامیں جانے والا، تاجروں میں کچھ کو ٹھیکیدار مقرر کیا جاتا تھا جنہیں پان اور

تباہی کی اجارہ داری کا ٹھیکہ دیا جاتا تھا یا وہ کمپنی کی زمینات کا لگان وصول کرتے تھے یا مثال کے طور پر حرق بتانے کا لائسنس حاصل کر لیتے تھے (1)

مدرس کی ابتدائی تاریخ میں دو باتوں نے اہم رول ادا کیا۔ شروع میں وہ یورپی لوگوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مترجم کا کام کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تجارت میں حصہ لینے لگے اور دلال بن گئے۔ کاروباری پچھلیوں کی حیثیت سے انہوں نے اثر اور وقار حاصل کر لیا۔

بہت سے ہندوستانی کمپنی کے عہدہ دار تھے۔ شہر میں تین بڑے حاکم تھے (1) سر براہیادھی کاری جس کا کام تھا امن و امان بحال رکھنا، مالگواراری وصول کرنا، جمسٹریٹ کے فرائض ادا کرنا اور پولٹری میں مقدمات کی سماعت کرنا (2) محاسب یا کنٹراپلے جو ادھیکاری کا مددگار تھا (3) کو تو ال یا پداناٹک جو سڑکوں اور میلوں کی نگرانی کرتا تھا اور ان پر نظر رکھتا تھا اور چوروں کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرتا تھا۔

کچھ ہندوستانیوں کو دیہی حکمرانوں اور سرداروں کے درباروں میں ایجنسی یا وکیل کے طور پر مقرر کیا جاتا تھا۔ کچھ دوسروں کو انتظامی کاموں یا مگر یڈوں کے قائم کیے ہوئے اداروں میں ملازمت مل گئی تھی۔ 1689ء میں جب عدالت قائم کی گئی تو گورنر کو جیٹو کیٹ کا عہدہ دیا گیا جس کی مدد چارج کرتے جن میں سے ایک ہندوستانی تھا۔ اسی طرح مدرس کی کارپوریشن میں تین ہندو ایملڈر مین تھے۔ ایک اور اہم خدمت اُس وقت ہندوستانیوں کو ملی جب ہندوستانی سپاہی بھرتی کیے گئے اور ان کے کمانڈنگ افسر ہندوستانی مقرر کیے گئے۔

چنانچہ مدرس پریسڈنسی میں کاروباری طبقے سے تعلق رکھنے والے اور دوسرے ہندوستانیوں کو دولت کے ساتھ اثر و رسوخ حاصل کرنے کے مواقع ملے۔ حالانکہ وہاں کے حالات بنگال سے مختلف تھے پھر بھی جنوب مشرقی علاقے میں برطانوی تجارت کے فروغ نے متوسط طبقے کے نشوونما میں مدد دی۔ بنگال اور مدرس کی تجارت کے اعداد کا مقابلہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی راج قائم ہونے سے پہلے مدرس کو بنگال سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ (2)

پاؤنڈ	پاؤنڈ	پاؤنڈ
19,36,275	9,33,139	1708ء لغایت 1717ء
15,65,208	15,58,652	1718ء لغایت 1727ء
21,50,019	15,74,794	1728ء لغایت 1737ء
24,95,249	23,46,386	1738ء لغایت 1747ء
31,33,150	26,62,454	1748ء لغایت 1757ء
1,15,69,901	90,74,465	میران کل

(1) 1724ء میں جب کمپنی نے چٹاردی بناد حاصل کیا اور وہاں بٹروں کو آباد کیا تو محکمہ مالیہ اور ٹولاز انجنینی نے اپنی کو بنانے کے لیے رقم دی۔ یورپی لوگوں نے ساتھ تجارت اور صنعت میں شرکت کرنے کے نتیجے میں دولت حاصل کرنے والے خاندانوں کی تعداد پورے ملک میں بہت تھی۔

(2) بال کرشن، محول، صفحہ 817-1757ء کے بعد حالات بدل گئے۔ مدرس نے مقابلے میں برطانوی تجارت زیادہ تیزی سے ساتھ بڑھی جس کی وجہ سے جنوب کے مقابلے میں بنگال میں زیادہ حاکم و متوطن طبقہ وجود میں آیا۔

ہمسائی میں معاشی ترقی اور نیا طبقہ

ہمسائی کا زیرہ جو پرنگالیوں نے 1534ء میں گجرات کے بہادر شاہ سے حاصل کیا تھا 1661ء میں انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اور 1668ء میں ہمسائی کو منتقل ہو گیا تاکہ وہ "آس پر آزادی کے ساتھ جاگیردار کے لگان اور کی حیثیت سے قابض رہے۔ اور ہر سال 30 ستمبر کو اس پاؤنڈ بطور لگان ادا کرے۔"

انگریزوں کے تحت اس شہر نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ ایک چھوٹی سی نوآبادی سے بڑھ کے اس نے ایک پرلمنی بندرگاہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ 1668ء میں اس کی آبادی تقریباً دس ہزار تھی جو 1675ء میں بڑھ کے ساٹھ ہزار اور 1701ء میں ڈیڑھ لاکھ ہو گئی۔ آبادی میں اضافے سے زیادہ اہم تھی وہاں ہونے والی نوعی تبدیلی۔ جس وقت یہ شہر ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کیا گیا تھا اس وقت اس کی آبادی کچھ آدمی و اسیوں (کولی اور ہندوستانی)، خالص پرنگالیوں، تھوڑے سے نیم پرنگالیوں، جو توپا کہاتے تھے، ہندوستانی عیسائیوں (زیادہ تر نیچے ذاتوں کے ہندوستانی جنہوں نے مسیحی مذہب قبول کر لیا تھا)، کننیوں، دھیدوں، مہاروں، کچھ باہر سے آکر بسنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں اور ایک دوپارسیوں پر مشتمل تھی۔

انگریزوں نے تجارت کو فروغ دیا تو اس کے نتیجے میں بنگروں، دست کاروں اور تاجروں کا ایک نیا طبقہ بڑی تعداد میں وہاں آکر آباد ہو گیا۔ آنے والے سبھی لوگ کم حیثیت نہیں تھے۔ گجرات سے بنیا تاجر آئے اور آس پاس کے علاقوں سے بنجارے، سنار، لوہار اور دست کار وہاں آکر آباد ہو گئے۔ پارسیوں کی آمد کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔

اس طرح وہاں کے اصلی باشندوں میں، جو غالباً در اوڑی نسل کے لوگوں کے آنے سے پہلے سے وہاں آباد تھے، نہ صرف آس پاس کے علاقوں بلکہ شمالی اور جنوبی ساحلی علاقوں سے آنے والے لوگوں کا اضافہ ہو گیا جن میں در اوڑی نسل کے لوگ بھی تھے اور مرہٹے اور گجراتی بھی۔ ان کے علاوہ جشہ، عرب اور مدغاسکر سے آنے والے غلام بھی تھے۔ ہندو مسلم، پارسی اور عیسائی مذاہب کی اچھی نمائندگی تھی۔ ہندوستان کے کاروباری ذاتوں میں سے گجراتی، بھائیہ اور پارسی تاجروں نے شہر کی سماجی اور معاشی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ (1)

ہمسائی کے کاروباری فریقے کی جو فہرست مل بورن نے تیار کی تھی اس میں 16 پارسی، 15 ہندو، 4 مسلمان تاجر، 2 پارسی چینی اسٹیٹ اور 6 پارسی جہاز سازوں کے نام درج ہیں جو انیسویں صدی کی ابتدا میں وہاں تھے۔ جہازوں کے مالکوں میں اس نے 9 پارسیوں اور ایک مسلمان کا ذکر کیا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں ہمسائی کی تجارت نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ 1708ء لغایت 1717ء اور 1748ء لغایت 1757ء کی دس سالہ مدتوں کے درمیانی زمانے میں در آمد کیا جانے والا مال بہ اعتبار مالیت دیکھا ہو گیا تھا یعنی تقریباً دس لاکھ پاؤنڈ سے بڑھ کر اس کی مالیت میں اسٹاک پاؤنڈ ہو گئی تھی۔ ہمسائی ایک پھلتے پھولتے تجارتی طبقہ کا گھر بن گیا تھا۔ اس طبقے کے اراکین مختلف ذاتوں اور مذاہبوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن

(1) ہمسائی کے کسٹم ماسٹر نے 1759ء میں مختلف فرقوں کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ اس میں مندرجہ ذیل شامل ہیں۔ برہمن، رگ ویدی، گجراتی، بیکرویدی اور وشنو، برہمن، سنکار، سنار، تانبے کا کام کرنے والے، لوہار، خیر و خچ، گھنٹی، ہندواری، عیسائی، پارسی اور مسلمان۔ ان کے علاوہ نیچے ذاتوں کے بہت سے لوگ۔

اُن کے معاشی مفادات مشترک تھے۔

لیکن بمبئی کے فروغ نے مد راس اور کلکتہ سے مختلف راستہ اختیار کیا۔ آخر الذکر دونوں شہر محض داخلی اور خارجی تجارت کے بندرگاہ ہی نہیں تھے بلکہ مقامی صنعت کے بڑے مراکز بھی تھے۔ اُن کے گوداموں میں علاقے کی پیداوار اکٹھا کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس بمبئی محض ایک بندرگاہ تھا جہاں مال آتا تھا اور آگے بھیج دیا جاتا تھا۔ وہاں کوئی مصنوعات تیار نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ مد راس اور کلکتہ کی آبادی قریب قریب ایک نوعی تھی لیکن بمبئی کی آبادی کا بڑا حصہ اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو باہر سے آکر وہاں آباد ہو گئے تھے اور اس لیے مختلف سلیس اور ذاتیں پائی جاتی تھیں۔

شہری آبادی اور روایتی سماج کی تبدیلی

تینوں شہروں یعنی کلکتہ، مد راس اور بمبئی کی موبکیاں خطوط پر ہوئی۔ اُن کی داخلی ترقی کے ساتھ تینوں پریسڈنسیوں کو جوڑنے کا عمل بھی شروع کر دیا گیا۔ جوں جوں ساحلی اور سمندری تجارت بڑھتی گئی ہندوستانی تاجر اُس میں زیادہ حصہ لینے لگے۔ بنگالی مد راسی، پارسی اور گجراتی تاجروں میں روابط قائم ہوئے اور مفادات کی ہم آہنگی کا احساس پیدا ہونے لگا۔

تجارت کے ان مرکزوں کا قیام ایک روایتی تبدیلی نہیں تھی انہوں نے اُن نئی طاقتوں کی علامت کی شکل اختیار کر لی تھی جو مشرق اور مغرب کے باہمی روابط کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی تھیں۔ یہ نئے شہر یورپ اور ہندوستان کے درمیان بڑھتی ہوئی تجارت کے فعال مرکز بن گئے تھے بلکہ تجارت کے نئے دستور ایک نئی سماجی معاشی تنظیم اور رہن سہن اور کاروبار کے نئے طریقوں کی مثالیں بھی پیش کرتے تھے۔ ہندوستانی تاجر بدیس کی کاروباری لوگوں سے تعاون کرتے تھے اور اس طرح انہیں جو نئے مواقع ملتے تھے اُن سے فائدہ اٹھا کر دولت حاصل کرتے تھے دوسری طرف وہ لوگ تھے جو وقت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوئے اور پرانے رسم و رواج سے چپے رہے رفتہ رفتہ وہ ختم ہو گئے اور اُن کی جگہ تجارت، صنعت پیشوں اور ملک کے نظم و نسق میں نئے داخل ہونے والوں نے لے لی۔ قدیم ہندو سماج میں کسی شخص کے چپے اور کاروبار کا تعین وہ ذات کرتی تھی جس میں وہ پیدا ہوا تھا لیکن نئے حالات میں پیشے اور کاروبار کے انتخاب کی حد تک ذات کی بندشیں ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ غیر کاروباری ذاتوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ تجارت کرنے لگے تھے۔

V قدیم اثر افیہ اور کاروباری طبقات کا زوال

متوسط طبقے کے ارتقا کا دوسرا مرحلہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی ابتدا 1757ء میں جنگ پلاسی سے ہوئی۔ برطانوی فتح نے نئے سماجی رجحانات کو تقویت پہنچائی اور نہ صرف ہندوستانی معیشت بلکہ ہندوستانی سیاسی نظام میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا۔

بنگال کی محفل حکومت کا تخت الٹ دیا گیا اور اُسے اختیار و اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ حکمران طبقے سے جس کا انحصار سرکاری ملازمت پر تھا حقوق و حیثیت چھین گئی اور اس طرح ہندوستانی سماج متنبہ افراد سے محروم ہو گیا۔

مالکان اراضی سے سیاسی کام چھین لیے گئے۔ انہیں عوامی، سیاسی اور انتظامی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا۔ سیاسی طاقت کے تمام مرکز ختم کر دیئے گئے اور ہندوستانی سیاسی نظام کی جڑیں کاٹ دی گئیں۔ سیاسی رجحان رکھنے والے سماج کے بالائی طبقے کے فنا ہو جانے کا اثر ہندوستانی سماج کی طبقاتی ساخت پر پڑا۔ ہندوستان کی سیاسی بالائی طبقے کی جگہ بدیسوں نے لے لی یعنی برطانوی حکمران قدیم کاروباری طبقہ جزوی طور سے نئے تجارتی طبقے میں ضم ہو گیا جو یورپ کے ساتھ ہندوستان کی تجارت سے اپنی روزی کما رہا تھا اور نئے متوسط طبقے کا بنیادی جز تھا۔ کسان اور دست کار بد حالی کے شکار تھے اور بے مہارت مزدور دن کے ساتھ سب سے نچلے طبقے سے متعلق تھے یعنی محنت کش غریبوں کے طبقے سے۔ چنانچہ ہندوستان کی آبادی دو طبقوں میں بٹ گئی۔ یعنی ایک مجموعہ سا متوسط طبقہ جو مندرجہ بالا مختلف عناصر پر مشتمل تھا اور محنت کش عوام جو آبادی کا بڑا حصہ تھے۔ پہلا طبقہ رفتہ رفتہ باحیثیت طبقہ بن گیا جس میں باصلاحیت لوگ تھے۔ دوسرا طبقہ یعنی شہری اور دیہاتی محنت کش عوام زیادہ غربت و افلاس کے شکار ہوتے گئے۔ متوسط طبقے نے فائدہ اٹھایا لیکن فی الجملہ عام لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوئی گئی۔ ان متضاد تبدیلیوں نے سماجی طور طریق اور اخلاقی اور ذہنی رویوں کو متاثر کیا۔

فتح کا زراعت پر یہ اثر پڑا کہ لگان داری کی کچھ ظاہری اشکال تو باقی رہیں لیکن نئے نظام نے قدیم اداروں کے کردار اور روح کو پوری طرح بدل دیا۔ زمینداروں، جاگیرداروں، اور تعلقہداروں کا اراضی رکھنے والا قدیم طبقہ اثر افروز ایک ایسی تنظیم تھی جس کی بنیاد تھی ملازمت حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ انھارہویں صدی میں اس کی نوعیت بہت واضح نہیں رہی تھی۔ زمینداری کا نیا نظام محض ایک تجارتی کاروبار تھا جس میں دیہی رشتوں کا انحصار ملازمت کے بجائے منافع پر تھا۔ زمیندار محض ایک منافع خوار ہو کر رہ گیا تھا۔

تجارت اور صنعت کے میدان میں جو انقلاب آیا وہ یہ تھا کہ پوری کی پوری بڑی تجارت اور خصوصیت کے ساتھ وہ بڑی تجارت جس کا تعلق بیرونی کاروبار سے تھا بدیسوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ہندوستان کے آزاد تاجر، بینکار اور سرمایہ کار ختم ہو گئے۔ لیکن درمیانی حیثیت کا کاروبار کرنیوالوں کا ایک بڑا گروہ وجود میں آ گیا جو تاجروں کے علاوہ گھاسٹوں، ذیلی ٹھیکیداروں اور امدادی کام کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ قدیم ہندوستانی صنعت کے زوال اور بدیسی صنعت کے مقابلے کا اثر ہندوستان کی کاروباری برادری کے بالائی حصے کی آمدنی پر پڑا۔

تجارتی طبقے کے نشیب و فراز

بنگال کے تجارت کے تین حصے تھے یعنی داخلی، ساحلی اور سمندری یا یورپ اور مشرق بعید کی تجارت۔ 1757ء تک داخلی تجارت پوری کی پوری ہندوستانی تاجروں کے ہاتھوں میں تھی۔ بری یا بحری راستوں سے آنے والے مال کو ہندوستانی تاجر خرید لیتے تھے اور بنگال میں فروخت کیا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں اور سرحد پار کے ملکوں کو بنگال کا مال بھیجا کرتے تھے۔ برآمد کرنے کے لیے ہندوستانی اشیاء حاصل کرنے میں وہ یورپی کمپنیوں کی مدد کرتے تھے۔

اس وقت ہندوستان کی ساحلی اور سمندری تجارت زیادہ تر بدیشیوں کے ہاتھوں میں آچکی تھی جنہوں نے سمندروں پر اقتدار حاصل کر لیا تھا اور عربوں اور دوسرے بحری تاجروں کو نکال باہر کیا تھا۔ ہندوستان کے مغربی اور مشرقی ساحلوں پر واقع زیادہ تر بندرگاہوں میں انہوں نے اپنی فیکٹریاں قائم کر لی تھیں۔ لیکن 1757ء تک یورپین محض دو قسم کی تجارت کرتے تھے۔ یعنی ساحل اور بحری، کشم ڈیوٹی کے تعلق سے انہوں نے ہندوستانی حکمرانوں سے اہم رعایتیں حاصل کر لی تھیں۔ مثال کے طور پر کینچی کی سند کی بنا پر اُس کا مال ہندوستانی حکام کے کشم کے معائنے اور کشم کی اداکاری سے محفوظ رہتا تھا۔ اس طرح تجارت منافع بخش بن گئی اور سال بہ سال بڑھ رہی تھی۔

1757ء کے بعد انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت یک لخت بدل گئی۔ جس ملک کے ساتھ ابھی تک وہ محض تجارت کرتی رہی تھی اب اس کی مالک بن بیٹھی۔

فتح کے نشے نے اُنہیں سرشار کر دیا اور آسانی اور تیزی کے ساتھ حاصل کی جانے والی دولت کا خیال بڑا دلکش تھا۔ چنانچہ کمپنی کے ملازمین نے تمام معاہدوں اور سمجھوتوں کو پس پشت ڈال دیا نواب کے ساتھ زلت آمیز برتاؤ کرنے لگے اور عام لوگوں کے حفاظت کو بڑی بے دردی کے ساتھ نظر انداز کر دیا۔ داخلی تجارت پر وہ بالآخر قابض ہو گئے۔

کلانٹون نے 1765ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو لکھا تھا، ”اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ دولت کی حرص نے اُس کو حاصل کرنے کے پیش بافتادہ ذرائع کو قبول کر لیا یا یوں کہے کہ آپ کی طاقت کو آلہ کار بنا کر انہوں نے اختیار حاصل کر لیا کہ جہاں معمولی بددیانتی اُن کی انتہائی حرص کا ساتھ نہ دے سکے۔ تو وہ بالآخر دولت حاصل کریں۔“ (1) ورلڈ نے کہا ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولت کی لالچ میں ہمارے سب ملازمین اس حد تک مبتلا ہیں کہ ملک کی حکومت کی طرف متصفانہ رویے اور ملک کی طرف اپنے فرض کو بیکر بھول بیٹھے ہیں۔“ (2)

میر جعفر کی یادداشتوں اور میر قاسم کے احتجاجوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میر قاسم نے شکایت کی ”ہر پر مٹنے، ہر گاؤں اور ہر فیکٹری میں وہ (برطانوی گماشتے) نمک، پان، گھی، چاول، پیال، بالاس، مچھلیاں، ترکاریاں، اور ک، شکر، تمباکو، قیم اور دوسری بہت سی اشیاء خریدتے اور بیچتے ہیں۔“ (3)

انگریزوں نے چار سو سے زیادہ فیکٹریاں کھول لی تھیں اور اُن کے گماشتے نہ صرف تجارت میں مداخلت کرتے تھے بلکہ زمینداروں کے ساتھ برابر برتاؤ کرتے تھے اور کسانوں اور دست کاروں پر مظالم توڑتے تھے۔ وہ انہیں زیادہ قیمتیں ادا کرنے پر مجبور کرتے تھے اور منڈی کی قیمت سے 30 سے لے کر 40 فیصد تک کم پر اُن کا مال خریدتے تھے۔

حالانکہ وارن ہسٹنگز اور ہسٹنگز کو یقین تھا کہ نواب لی شکایتیں حق بجانب ہیں پھر بھی کونسل کی اکثریت نے انصاف پر حرص کو ترجیح دی اور شکایتیں رد کر دیں۔ اُس لے جواب میں میر قاسم نے ہندوستانی تاجروں کے مال پر چٹکی منوخت کر دی تاکہ اُن پر انگریز تاجروں سے زیادہ بار نہ پڑے۔ اپنی رمایا کے مفادات کے تحفظ کی بنا پر اُسے تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اُس کے وارثوں کے سامنے اس کے علاوہ

(1) کلانٹون کا خط، کورٹ کے نام، مورخہ 13 جنوری 1765ء، H.C. third report select committee, 1772-73, صفحہ 391

(2) ورلڈ، View of Bengal, H.C. صفحات 128-129

(3) چٹائی، نام میر قاسم کا خط، اقتباس ایمن کے ہند Economic History of Bengal جلد I، صفحہ 69

کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اُن حقوق کی تصدیق کریں جو ہندوستانی تاجروں کے لیے مہلک اور ہندوستانی حکومت کے مالی نقصان کا باعث تھے۔

کمپنی کے ڈائریکٹروں نے نجی تجارت کی غیر منصفانہ نوعیت کو سمجھا اور کلائمو نے کوشش کی یہ تجارت ایک سوسائٹی کے ذریعہ کی جائے۔ ڈائریکٹروں کے احکام کی تعمیل میں سوسائٹی ختم کر دی گئی۔ لیکن قیادت نہیں ختم کی جا سکی اس لیے کہ کمپنی کے تمام اعلیٰ عہدہ دار اس میں ملوث تھے۔ انگریزوں کی دیکھا دیکھی دوسرے یورپین بھی نجی تجارت کرنے لگے جن سے کمپنی کے ملازمین ملے ہوئے تھے اور انگریز ملازمین کے کئی منافع اُن کے گھروں تک پہنچانے کے عوض اُن سے ساز باز کرتے تھے۔ اُن دونوں نے ملکر ہندوستانی تاجروں کو تباہی کی حد تک پہنچادیا۔

چنانچہ 1757ء کے بعد انگریزوں کی سمندری تجارت داخلی تجارت کے ساتھ گنڈم ہو گئی اور کمپنی کی سرکاری تجارت اُس کے ملازمین کی نجی تجارت کے ساتھ مل گئی۔ اس سے کمپنی کو بھی بہت نقصان ہوا۔ اور آزاد ہندوستانی تاجروں کو بھی۔ لیکن نجی تجارت کرنے والے یورپین تاجروں نے دولت حاصل کر لی اور اُن کے ہندوستانی گماشتے خوشحال ہو گئے۔ ان میں کمپنی کے گماشتے اور انفرادی تاجروں کے بائیان شامل تھے۔

کاروبار میں بچولیوں کی بڑھتی تعداد کی وجہ یہ تھی کہ کمپنی نے مال حاصل کرنے کے طریقے بدل دیے تھے۔ 1753ء ہی میں کمپنی تجارت کے پُرانے طریقے ترک کر چکی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام اور داؤنی تاجروں دونوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہندوستانی تاجر بہت آزاد و سخت گیر ہیں اور اپنے معاہدوں کی پابندی کرنے کے لیے، آمادہ نہیں ہیں۔ ہندوستانی تاجروں کا خیال تھا کہ تجارت کی شرائط غیر اطمینان بخش ہیں، کمیشن ناکافی ہے اور ڈپوں اور فرانسیزیوں کے برعکس انگریز تحکم پسند اور لالچی ہیں۔ 1749ء میں ان میں سے کچھ تاجروں نے بڑی بڑی پیشگی رقمیں لیے بغیر مال دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُن پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ مختلف اشیاء کی قیمتیں مقرر کرنے کے سلسلے میں وہ سازش کرتے ہیں۔ کمپنی کی تجارت کا لحاظ کیے بغیر اپنا نجی کاروبار رکھتے ہیں۔ اور ڈپوں کو مال مہیا کرتے ہیں جو انگریزوں کے تجارتی رقیب تھے۔ چنانچہ 1753ء میں داؤنی تاجر کی جگہ گماشتے نے لے لی جو کمپنی کا ملازم تھا اور محض کمپنی کا کام کرتا تھا۔ رقیب اسکے ذریعہ سے لی جانے لگیں۔ وہ نقد رقم لے کر فوراً کمپنی میں مال خریدتا تھا، کوٹھوں میں اُن کی پرتال اور درجہ بندی کرتا تھا اور اس کے بعد کلکتہ کے گودام کو مال بھیج دیتا تھا۔ نئے نئے مقرر ہونے والے گماشتوں کے علاوہ تاجروں کا ایک اور گروہ تھا جو بائیان کہلاتے تھے اور زیادہ تر کمپنی کے ملازمین اور آزاد یورپین تاجروں کی نجی تجارت اور گھریلو معاملوں میں مدد کرتے تھے اور ہر قسم کا کام کرتے تھے۔

بائیان مترجم تھا، حساب رکھتا تھا، اعلیٰ سکرٹری تھا سب سے بڑا دلال تھا، رقم مہیا کرتا تھا اور مجموعی اعتبار سے رازدار تھا۔ گھریلو ملازم اسکے ذریعہ نوکر رکھے جاتے تھے اور وہ اُن میں نظم و ضبط قائم رکھتا تھا۔ وہ اپنے مالک کا ہر طرح کا کاروبار چلایا کرتا تھا۔ مختصر اُکھا جاسکتا ہے کہ اپنے مالک پر اُسے وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو ملک میں تنظیم املاک، ساہوکار اور داشتہ کو مجموعی اعتبار سے حاصل تھے اور بڑی آسانی کے ساتھ وہ عام بات چیت میں وہ کچھ بہدیا کرتا تھا جو اُس کا مالک اپنی زبان سے کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

یہ حیثیت اتنی منافع بخش تھی کہ بھرتین، ہندو خاندان کے افراد بھی یورپین لوگوں کی ملازمت

کرتے تھے اور اس ملازمت کو حاصل کرنے کی خاطر رشوت بھی دیتے تھے۔ جسکی بنا پر انہیں بہت سے فوائد حاصل ہو جاتے تھے۔ یعنی یورپیوں پر اثر، خود اپنی سماج میں بڑی حیثیت اور اپنے مالک کے دستخط سے فائدہ اٹھا کر کسٹم ڈیوٹی ادا کیے بغیر تجارت کرنے کے مواقع۔

وہ ادنیٰ تاجر جو انگریزی کمپنی کی سرپرستی سے محروم ہو چکا تھا دوسرے یورپی تاجروں کو مال مہیا کر رہا۔ یعنی فرانسیسیوں، ڈچوں اور جنگ آزادی تک امریکیوں کو اور اپنے نقصان کی صفائی دوسرے طریقوں سے کرتا رہا یعنی ملک کی داخلی تجارت کو ترقی پونے کر کمپنی کے باغیوں کاٹ کر کے اور اونچی شرح سے سود لیے جانے والے کمپنی کے قرضوں میں روپیہ لگا کے۔

1757ء سے پہلے نوابیوں کے نافذ کردہ ضابطوں کی رو سے کمپنی کے ملازمین کی نجی قیادت کم ہو گئی تھی۔ کسٹم ڈیوٹی صرف کمپنی کے در آمد اور برآمد کیے ہوئے مال پر نہیں لگتی تھی۔ اس کا اطلاق نہ تو ملک کی داخلی تجارت پر تھا اور نہ نجی تاجروں کی خرید و فروخت پر 1757ء کے بعد گماشتوں اور بانیوں کو بڑی آزادی مل گئی تھی اور انگریز تاجروں کے ایجنٹوں کی حیثیت سے ان کے سامنے بڑا میدان کھل گیا جو ہر قسم کی تجارت کے لیے کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہونے کے دعویدار تھے۔ اور اس پر عمل کیا کرتے تھے چاہے وہ کمپنی کا مال ہو یا نجی تاجروں کا۔ اس اجازت نامے کا جس کی رو سے کمپنی کا مال معائنے اور کسٹم ڈیوٹی ادا کرنے سے مستثنیٰ ہو تا تھا، اور ہر قسم کے کاروبار کے لیے آزادی سے استعمال کیا جاتا تھا۔

صدر سے لے کر ایک چھوٹے سے خُحر تک کمپنی کا ہر ملازم اپنا حق سمجھتا تھا کہ وہ اجازت نامے کو استعمال کرے۔ اور اُس کے ہندوستانی ایجنٹ اس لوٹ کھسوٹ میں شامل ہوتے تھے۔ وہ تجارت کرنے میں اپنے مالک کے نام سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ حالانکہ تجارت خود ان کے سرمائے سے ہوتی تھی کبھی کبھی اجازت نامے کے حق کو قابلِ فروخت شے سمجھا جاتا تھا۔ جس کی قیمت 25 روپے سے 200 روپیہ تک وصول کی جاتی تھی۔ اجازت نامے کے غلط استعمال نے نجی تجارت کو بہت بڑھا دیا اور بنگال کی کاروباری سرگرمی میں ہندوستانیوں کے حصے میں اضافہ کر دیا۔ حالانکہ ہندوستان کی حیثیت ایک غلطی کی تھی۔ پھر بھی بہت سی صورتوں میں اس سے اُسے بہت فائدہ ہوتا تھا۔

ہندوستان کی تجارت کے فروغ اور اس کی بناوٹ میں ہونے والی تبدیلی کے جو نتیجے سامنے آئے ان میں سے ایک تھا حیدر علی اور نیپو سلطان کے ساتھ جنگ جو مالابار اور کار و منڈل کی سلطوں پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے غلبے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرا نتیجہ تھا یورپی جہاز رانی اور ہندوستان میں مقامی جہاز سازی کی صنعت کا فروغ اس صنعت میں بھی سب سے پیش پیش تھا۔ جس کو فروغ دینے میں پارسیوں نے اہم رول ادا کیا۔ لوجی واڈیا (1735ء) پہلا جہاز ساز تھا۔ ملک کے بیڑے کے بہت سے جہاز سورت، دمن اور بمبئی میں بنائے گئے تھے۔ بنگال اس میدان میں کچھ بعد میں داخل ہوا یعنی 1760ء نے لگ بھگ۔ بنگال میں پہلا جہاز 1769ء میں سمندر میں اتارا گیا تھا۔ امریکہ کی جنگ نے نئے عوامل مہیا کر دیے اور 500 شون کائناتج 1781ء میں بھگلی میں اتر 1781ء اور 1803ء کی درمیانی مدت میں 56 جہاز اور 92 کشتیاں بنائی گئیں۔ اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہندوستان نے بنے ہوئے ایک ہزار اور تیرہ سو نئے جہاز سمندروں میں پھل رہے تھے۔

بنگال میں جہاز سازی کی صنعت پر انگریز تاجروں نے اجارہ داری حاصل کر لی تھی اور یہ قدرتی

اسر تھا کہ ملک کی تجارت کے لیے مال کی بار برداری کا کام بھی ان کے ہاتھوں میں آسک۔ مغربی ایشیائی ممالک اور چین کو برآمد کیے جانے والے مال کے سلسلے میں یورپوں نے غالب حیثیت حاصل کر لی تھی۔ تجارت کے اس منافع بخش شعبے سے بڑی حد تک ہندوستانی نکال دیئے گئے تھے۔

ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے تین علاقے یعنی بنگال، مشرق ساحلی علاقہ اور مغربی ساحلی علاقہ ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے۔ 1790ء میں ہندوستان کے بندرگاہوں کے درمیان آزاد تجارت شروع ہو گئی جس کی وجہ سے وہ معاشی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

اگرچہ بنگال اور مغرب ساحل کے درمیان تجارت کم ہو گئی مگر کارومنڈ ساحل کے ساتھ تجارت بڑھ گئی۔ مہاراشٹر نہ صرف برہماور ملایا کو کیے جانے والے برآمدات کا اہم مرکز بن گیا بلکہ یسٹ انڈیا اور چین سے ہونے والی بڑھتی ہوئی تجارت کا مستقر بھی بن گیا۔ لیکن تجارت میں اضافے سے فائدہ ہندوستانیوں کے بجائے انگریز تاجروں کو ہوا۔

ان تبدیلیوں کا مندر اثر بنگال کی حیثیت پر پڑا۔ کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کی نوعیت بدل گئی۔ اب ہندوستانی اشیاء کی برآمدات کے لیے رقم اُس بلین کے ذریعہ مہیا کی جاتی تھی۔ جو انگلستان سے آتا تھا۔ بلکہ مال خریدنے کے لیے بنگال کے صوبے کی آمدنی استعمال کی جاتی تھی۔ اس طرح استعمال کی جانے والی رقم کا اندازہ دس سے لیکر پندرہ لاکھ پاؤنڈ سالانہ تک لگایا جاتا ہے۔ کچھ برسوں میں ہندوستان میں کمپنی کے علاقے کی توسیع ہو گئی جس پر فاضل آمدنی خرچ ہونے لگی اور مال خریدنے کے لیے کمپنی کو قرض لینا پڑا۔ یہ قرض سال بہ سال بڑھتا رہا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں زر نقد آنا کم ہو گیا۔ اس زمانے کے معاشی نظریوں کے مطابق زر نقد برآمد کرنا بہت برا سمجھا جاتا تھا اور چونکہ تجارت کرنے کے لیے ایک نیا راتل مل گیا تھا اس لیے ہندوستان کو زر نقد بھیجنا ضروری نہیں تھا جب تک کہ خصوصی حالات اُس کے منافی نہ ہوں۔ 57-1756ء میں ہندوستان بھیجے جانے والے بلین کی مالیت تقریباً 8,00,000 پاؤنڈ تھی۔ اگلے سال وہ آدھا رہ گیا اور 1781ء تک اُس کی مالیت گھٹ کے محض 5,000 پاؤنڈ رہ گئی۔

نہ صرف یہ کہ بنگال میں چاندی آنا بند ہو گئی بلکہ اس کے برعکس وہاں سے چین کو برآمد کی جانی لگی۔ اگر پلاسی سے پہلے درلٹ کے مطابق کسان آرام سے تھا، دستکار کی ہمت افزائی ہوتی تھی، تاجر دولت مند تھے، اور دیسی حکمران مطمئن تھا۔ (1) تو غیر منضبط سامراج (1757ء لغایت 1785ء) کے تاریک دور میں حالات یکسر بدل گئے تھے۔

مقامی بینک کاری کا زوال

ہندوستان کی بدقسمتی تجارت کی ساخت بدلنے کا ایک اور نتیجہ ہو یعنی ہندوستانی بینک کاری اور صرافوں کے طبقے کا زوال۔ ملک کے قدیم معاشی نظام میں وہ ایک ضروری اور مفید کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ملک کے اندرونی حصوں سے مرکز کو آمدنی کی رقمیں بھیجا کرتے تھے۔ ہڈیاں جاری کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے تجارت کرنے میں سہولت ہوتی تھی اور حاجت مندوں کو، جن میں حکومت اور زمیندار

دونوں شامل تھے قرض دیا کرتے تھے۔ زر کا مبادلہ کرنے والے کرنسیوں کا مبادلہ کرنے کی ضروری خدمات سر انجام دیتے تھے اور ہنڈیوں کی دلالی کرتے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں بنگال کا اہم ترین بینک کار تھا۔ جگت سینھوں کا خاندان جو نواب کی زر کی پالیسی کنٹرول کرتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے تجارتی حالات کے پیش نظر ہر سال بیجور آبادی مقدار میں بلین در آمد کیا کرتی تھی۔ لیکن وہ صرف ان کو بیٹا مبادلے کا کمیشن نہیں ادا کرتا چاہتی تھی۔ اس لیے اُس نے معیاری سکتے ڈھالنے کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مہاراس میں تو یہ اجازت جلدی مل گئی مگر بنگال میں یہ اجازت 1756ء میں مل پائی۔ لیکن 1763ء کے بعد کرنسی کا سوال اپنی اہمیت کھو چکا تھا، اس لیے کہ میر قاسم کی معزولی کے بعد نظم و نسق انگریزوں کے ہاتھوں میں رہ گیا تھا اور کرنسی پر جگت سینھوں کا کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔

دھرن ہسٹنگز نے کوشش کی کہ کلکتہ کی نکسال کے علاوہ تمام دوسری نکسلاؤں کو ختم کر دیا جائے تاکہ سکہ سازی میں یکسانیت پیدا ہو جائے۔ مگر اس میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نکسال اندرونی ملک کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی تھی اور مالکان آراضی اور کسانوں کو دوسری کرنسیوں پر بہت زیادہ فائدہ دیکر معیاری کرنسی حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ استعمال ہونے والی کرنسیوں کے تعلق سے ہر ضلع کو کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ 1787ء میں کلکٹروں نے اپنی رپورٹوں میں کہا تھا کہ صوبے بھر میں قریب قریب ہر ضلع اور پورے گئے کی کرنسی مختلف ہے۔ (1) ان حالات سے صرف فائدہ اٹھاتے تھے۔ انہوں نے ملک کے زرنقہ پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ ہر ضلع میں اپنی ایجنسیوں کا جال بچھادیا تھا اور صوبے کی معیشت میں بڑا اثر ڈال رہے تھے۔ وہ وقت پر روپے کی صورت میں مالگوار کی ادا کرنے کے سلسلے میں زمینداروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ زمینداروں کی طرف سے حکومت کو ادا کی جانے والی رقموں پر وہ سود لیتے تھے۔ اگر زمیندار مقررہ وقت کے اندر رقم واپس نہیں کرتا تھا تو اسے مزید رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔

اندرون ملک مبادلے میں استحکام پیدا کرنے اور مالگوار کی ادا کیلئے کو آسان بنانے کے لیے ہسٹنگز نے ایک اور کوشش کی جس کے نتیجے میں 1773ء میں جزل بینک کا قیام عمل میں آیا جس کا انتظام حصوری مل اور دیوان چند کے سپرد تھا۔ کلکٹروں کے حکم کی تعمیل میں یہ بینک ختم کر دیا گیا۔

لیکن اندرون ملک سے آمدنی کی رقموں کو بھیجنے کا مقول و مناسب ذریعہ صرف نہیں تھے۔ جگت سینھوں کے زوال کے بعد ہندوستانی بینک کار بھی اس فرض کو پوری طرح ادا کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ پہلی بات یہ تھی کہ انگلستان میں تجارت کی عام کساد بازاری نے بینک کاری کے کاروبار کو بھی متاثر کیا تھا۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ ہسٹنگز کے زمانے میں یورپی تاجروں نے اپنی کمپنیاں قائم کر لی تھیں۔ 1770ء میں مسز الکوینڈر اینڈ کمپنی نے بینک آف ہندوستان قائم کیا۔ اس کے لیے کمپنی کے ملازمین نے رقیس دیں۔ جب اُن کی نجی تجارت ختم ہونے لگی تو انہوں نے یا تو ملازمت سے استعفیٰ دیکر ایجنسیوں کا کاروبار شروع کر دیا اس کام کے لیے اپنی رقیس دوستوں کو دیدیں۔ یورپی بینکوں اور ایجنسیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے ہندوستانی بینک کاروں کا کاروبار ختم کر دیا۔ نجی بینکوں نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو دھرن ہسٹنگز کے ضابطوں سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ (2)

چنانچہ ہندوستان کے متوسط طبقے کی تاریخ میں 1757ء اور 1785ء کی درمیانی مدت کو بیک وقت عروج و زوال کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ کچھ پُرانے گواہوں نے اپنے قدیم پیشے کھودیے۔ اور معاشی اعتبار

(1) ہبتا ہے۔ Economic Annual of Bengal صفحہ 142

(2) ہبتا۔ Early European Banking in India لندن 1927ء صفحات 84، 165، 175

سے وہ گرجئے۔ دوسروں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور سامی اور معاشی اعتبار سے ترقی کر گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ٹھیکیداروں کی حیثیت سے قدیم کاروباری طبقے کا کام ختم ہو گیا اور اس کے رکن جلد ہی تاجر ایجنٹوں کی حیثیت سے محض ایسٹ انڈیا کمپنی کا مال انحصار کرنے کا کام کرنے لگے۔ ہندوستان کی داخلی تجارت درہم برہم ہو چلی تھی۔ اس لیے کہ کمپنی نے نمک اور انیم کی تجارت پر اجارہ داری حاصل کر لی تھی اور کالیو نے بہار میں شورہ بنانے کا اجارہ میر قاسم سے حاصل کر لیا تھا۔ جب نیل درآمد کیے جانے والے مال کا ایک اہم حصہ بن گیا تو یورپیوں نے اُس کے ٹھیکے محض اپنے لیے حاصل کر لیے ہندوستان کے متوسط طبقے کا بڑی ساحلی تجارت میں اب بہت کم حصہ رہ گیا تھا۔ ایجنٹوں کا کام کرنے کے علاوہ زیادہ تر کمپنی کے بانڈ اور قرض کا کام کرتے تھے۔ اور مبلولہ زر کرتے تھے۔ 1769ء میں جب کمپنی نے ہندوستانی بچوں کے ذریعہ تجارت کرنے کا طریقہ ختم کر دیا تو تجارت کے اور دروازے اُن پر بند ہو گئے ورلسٹ کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”بہت سے لوگوں نے تجارت میں روپیہ پھسانے سے انکار کر دیا۔“ خوش قسمتی سے اُن کے لیے سرمایہ کاری کا ایک اور راستہ کھل گیا اور وہ زمین میں روپے لگانے لگے۔

IV زرعی معیشت میں تبدیلی اور آراضی رکھنے والے متوسط طبقے کا عروج

مال گزاری کے برطانوی نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں بنگال کی زرعی معیشت میں بنگال کی زرعی معیشت میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کی کہانی بار بار سننا ضروری نہیں۔ لیکن اُن کے سماجی عواقب کو ظاہر کرنے کے لیے جو انقلابی نوعیت کے تھے اس تبدیلی کے خاص واقعات پر غور کر لیتا چاہیے۔

ہندوستان کے نظام آراضی سے انگریز اس وقت واقف ہوئے جب انہوں نے تین گھوڑوں یعنی کلکتہ، گوندپور اور سلطانتی کے زمیندارانہ حقوق حاصل کر لیے۔ بعد میں انہوں نے کچھ اور گاؤں بھی حاصل کر لیے تھے۔ 1757ء میں چومیس پرگنہ کا ضلع اُن کے حوالے کر دیا گیا اور وہ ایک انگریز زمیندار فریک لینڈ کے ذریعہ اس کی مال گزاری وصول کرنے لگے۔ 1759ء میں ضلع سے نیاہہ مالگواہی وصول کرنے کی نیت سے انہوں نے نیلام عام کے ذریعے زمینداروں کا ٹھیکہ دینا شروع کر دیا۔ حقیقت میں یہ ایک ایسی جدت تھی جس کے دور رس نتائج سامنے آئے۔ درلست نے کہا ہے کہ ہندوستانی اس کو ”ایک ظالمانہ فعل اور ہندوستان کے راجوں کے خلاف“ سمجھتے تھے۔ نیلام عام کے ذریعہ آراضی کی فروخت نے زمیندارانہ بازوں کو مختل کر دیے۔ جو کسانوں کا خون چوسنے لگے اور طرح طرح کے بھانسنے دیئے لگے۔ پرانے زمینداروں پر اعتماد و اعتبار نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس بات کے تجربے کیے گئے کہ ان کی وصول کی ہوئی لگان کی رقم کی تصدیق جوتے داروں سے کی جائے۔ کمپنی نے اپنے ملازمین کے ذریعے براہ راست جو انتظام کیا وہ اس قسم کی اطلاعات حاصل کرنے میں ناکام رہا اور سرورے اور دستاویزات کے معائنے کا کام دیر طلب تھا۔ چنانچہ اس مسئلے کو آسانی کے ساتھ ٹھیکہ دیکر حل کر لیا گیا۔ لیکن ٹھیکہ کمپنی کے ملازم اور پانیان تھے جو محض منافع میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ زمینداروں سے بڑے زمیندار بن گئے اور مالکان آراضی کی وسطی تنظیم میں انہوں نے رخت ڈال دیا۔ قدیم زمیندار طبقے کے خصوصی میدان میں ایک نیا سماجی عنصر داخل ہو گیا۔

جو کام ایک ضلع کے محدود علاقے میں کیا گیا تھا وہ پورے بنگال میں پھیل گیا۔ 1765ء میں میر قاسم نے بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ کے تین ضلع انگریزوں کے حوالے کر دیئے لیکن شرط یہ تھی کہ قدیم زمینداروں اور اجارہ داروں کو بحال دیر قرار رکھا جائے۔ پھر بھی بردوان میں انگریز ریزڈنٹ نے نیلام عام کے ذریعے مال گزاری کا ٹھیکہ دینا شروع کیا جس نے جلہ کن نتائج ہوئے۔ بہت کم قدیم زمینداروں بلکہ باحیثیت اور بارگروہ لوگوں نے بھی بولی لگائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکمہ مال کے محاسبوں اور محوروں نے منافع بخش زمینداروں کا ٹھیکہ لے لیا۔ درلست نے ”ماریس بد بخت“ سے تعبیر کیا ہے۔ ان میں کمپنی کے بہت سے ملازم شامل تھے۔ یعنی جان اسٹون، ہوئل، اور بوتلر۔

کمپنی نے جو مثال قائم کی تھی اس پر عمل میر قاسم نے اُن علاقوں میں کیا جن پر اُس کی حکومت تھی۔ وہ مالی مشکلات میں گرفتار تھا جس کی بڑی وجہ تھی انگریز اعلیٰ عہدہ داروں کی تحفوں اور

معاونوں کے لیے ہوس اور کمپنی کے ملازمین کی نجی تجارت اپنے مالی نقصان کو پورا کرنے کے لیے اس نے زمین سے زیادہ سے زیادہ مالگوری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بچوں کو ہر طرف کر دیا، عامل مقرر کیے اور انہیں غریب کسانوں کے ساتھ من مانی کرنے کی اجازت دیدی۔ قانون گویوں اور فن کی دستاویزات کو نظر انداز کر دیا گیا اور تشخیص مال گزوری لوٹ مار بن گئی۔ میر قاسم کی عہدوی نے ایک ایسے عمل کو جنم دیا جس کے نتیجے میں بنگال کی دیہی معیشت بدل کے رہ گئی۔

اس کی جگہ انتظام سنبھالنے والے انگریزوں نے نہ صرف اس طریقے کو جلدی رکھا بلکہ مطالبے میں اضافہ کر دیا اور وصول میں زیادہ سختی برتنے لگے۔ 1764ء میں انہوں نے تین سال کے لیے زمینوں کا ٹھیکہ دینے کا رواج شروع کیا اور بے حیثیت اور بے کردار لوگوں کو نیلام میں بولی بولنے کی اجازت دی۔ بقول ورسٹ "اتحادہ و خنوخور عرفیوں کو لوٹ مار کی اجازت دی گئی۔ جنہوں نے غلوں سے چور لوگوں سے روپے چھین کر پہلے سال کا مطالبہ لوا کیا۔" دوسرے نیلام میں صرف زمین کا 2/5 حصہ فروخت کیا جا سکا۔ لیکن یہ حصہ یورپی عہدہ داروں اور فن کے باغیوں نے مختلف ناموں سے خریدا تھا۔

اس کی بنا پر کسانوں پر ظلم توڑے جانے لگے۔ جب کمپنی نے بنگال کی دیوبنی حاصل کر لی تو مظالم میں اور اضافہ ہو گیا۔ ملک کی بڑی دولت مند، بھوت کمپنی کے سر پر سوار تھا وہ اپنے حصہ داروں اور ملازموں کے لیے اور انگلستان کے لیے بھی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ہندوستان میں مقیم کمپنی کے ملازمین پرانی حکومت کے حکام کی دیات اور عہدوی پر یقین نہیں رکھتے تھے، زمیندار اجارہ دار، قانون گو، عامل اور چودھری ناقابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ کمپنی کو سب سے زیادہ فکر تھی حزم اور بے احتیاطی کی لیکن ابتدا میں پرانے حکام کو ہر طرف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہندوستانی حکام بھی محسوس کرتے تھے کہ وہ اپنے عہدوں پر صرف اس صورت میں قائم رہ سکتے ہیں اگر وہ نئے مالکوں کو مطمئن رکھ سکیں۔ چنانچہ اپنے بڑے بڑے مطالبوں کو وصول کرنے کے لیے پہلے کمپنی نے عاملوں کو استعمال کیا۔ جنہیں ماتحتوں کا تقرر کرنے اور بڑی بڑی مالگوری لدا کرنے پر ذمہ داروں کو مجبور کرنے کے لیے اختیار دے دیئے گئے۔ 1769ء میں عاملوں کی دیکھ بھال کے لیے نگرہاں مقرر کیے گئے اور سرکاری حکام کو حکم دیا گیا کہ وہ مالگوری کے ٹھیکوں سے دست بردار ہو جائیں۔ لیکن تمام خرابیوں کی جز یعنی بڑے بڑے مطالبوں کو جوں کا توں رکھا گیا۔ جبکہ علی وردی خاں کا مجموعی مطالبہ جس میں مالگوری اور دوسرے محاصل دونوں شامل تھے۔ 1755ء میں 1,76,68,166 روپے تھا اور حقیقی وصولی غالباً اس سے بھی بہت کم لیکن کمپنی نے عظیم قسط 71-1770ء کے سال میں جو مطالبہ وصول کیا وہ 1,94,61,684 روپے تھا (1)

اس خیال کے پیش نظر کہ بنگال کی خرابیوں کی وجہ ہی ہر سال کیا جانے والا قلیل المالدتی بندہ دست اور مال گزوری وصول کرنے کا طریقہ دارن ہسٹنکر نے 1772ء میں پانچ سالہ بندہ دست کا فیصلہ کیا۔ چارلس گرانٹ کے مطابق اس خیال سے کہ ملک میں بچھے ہوئے وسائل وجود میں آئے اور اس

(1) اس قسط کے، جس میں بہت سے لوگ مرے اور بڑی تباہی ہوئی، بڑے دور رس نتائج ہوئے۔ فوراً تقریباً ایک تہائی آبادی ختم ہو گئی۔ کسانوں اور دیہاتوں اور خصوصیت کے بکروں کی ایک بڑی تعداد موت کے گھاٹ اتر گئی۔ اس کا امکان ہے کہ ان میں سے نچاس فی صدی مر گئے۔ بنگال کا ایک تہائی علاقہ پھر جنگل بن گیا جہاں جنگلی جانور رہنے لگے۔ محنت کش طبقے، زمین اور صنعت میں جو بیک وقت ملی ہوئی اس کا اثر بنگال کی معیشت پر پڑتا ضروری تھا۔ پھر بھی اس تباہی کو اس قدر کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ کمپنی کی مالگوری میں کمی نہ کرے۔

خیال سے بھی کہ مالگوری کے اضافہ کو لوگ آسانی سے برداشت کر لیں گے یہ فیصلہ کیا گیا بنگال کی زمینات کو پانچ سال کے لیے ٹھیکے پر دیا جائے۔ اور ان کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے کے لیے ان ٹھیکوں کا عام نپام کیا گیا۔ کلکتہ کیے بایان، ساہوکار اور مہم جو سب سے زیادہ بولیاں لگانے والوں میں تھے۔“ (1)

مالگوری وصول کرنے کا طریقہ بھی بدل دیا گیا۔ 1770ء میں ہٹا دیئے گئے تھے اور انہیں، جنہیں بعد میں کلکٹر کا ہم دیا گیا تھا، دیونوں کی مدد سے وصولی کا کام کرنے لگے تھے۔ 1773ء میں کلکٹروں کی جگہ صوبائی کونسلوں نے لے لی جن کی مدد لیٹن کرنے لگے۔

دولن ہسٹنگز کے فیصلے نے مختلف قسم کے لگان دلوں کو مختلف انداز سے متاثر کیا۔ حقیقی کھیت جوتے والوں میں تین قسم کے کاٹھکڑے تھے۔ (1) وہیں کے رہنے والے کسان جو اپنی زمین جوتے تھے۔ (خود کاشت) جس کا لگان وہ زمیندار کو ہوا کرتے تھے (2) وہ کسان جو اپنے ایک گھوں میں تھے اور دوسرے گھوں کی لگان پر لی ہوئی زمین میں کھیتی کرتے تھے۔ (پائے کاشت) (3) ان کے علاوہ وہ کسان تھے جو ٹھیکے پر زمین جوتے تھے (کھار)۔

زمین یا تو ریاست کی ہوتی تھی جو خالصہ کہلاتی تھی۔ یا حکومت کی زیر نگرانی ہوتی تھی یا جاگیر ہوتی تھی۔ یعنی ایسی زمین جس کی مالگوری تنخواہ یا مدد معاش کے عوض دی جاتی تھی اور جس کا کچھ فی صدی حصہ حکومت کو ہوا کیا جاتا تھا۔ یا زمیندار ہوتی تھی جو موروثی جائیداد تھی اور خرچ ہوا کرتی تھی۔ یا تعلقہ جائیداد ہوتی تھی۔ جو زمینداروں میں سے کٹ کر نکالی جاتی تھی اور جاگیرداروں اور زمینداروں کے ماتحت ہوتی تھی۔ آخر الذکر کی دو قسمیں ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک حضوری کہلاتی تھی جو اپنی مالی گزاری برقرار رکھتی تھی اور مرکزی حکومت کو ہوا کرتی تھی اور دوسری مذکورہ کہلاتی تھی جس پر اصل زمیندار کو اختیار حاصل ہوتا تھا۔ پھر کئی قسم کی خیراتی جائیدادیں ہوتی تھیں جو مذہبی اور تہذیبی مقاصد کی لیے وقف ہوتی تھیں اور اخراج یعنی ہر قسم کے بدلے مستثنیٰ کہلاتی تھیں۔

زمین کے ٹھیکے کے نظام نے ان رشتوں میں انتشار پیدا کر دیا جو حکومت، درمیانی ایجنٹ اور رعیت کے درمیان مدتوں سے چلے آ رہے تھے۔ زمیندار، تعلقہ دار اور شے باز سب ٹھیکیدار بن گئے۔ جن زمینداروں نے اپنی جائیدادوں کا ٹھیکہ حاصل کر لیا وہ معاہدے کی شرائط پوری نہیں کر پائے۔ ان کے ٹھیکے سزاوولوں (ایجنٹوں) کے سپرد کر دیئے گئے۔ جو کم حیثیت لوگ تھے اور زمینداروں اور کسانوں دونوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ راج شاہی کی رانی بھوانی نے اپنے ٹھیکیداروں دواال روئے اور امریت سنگھ اور پورینا کی رانی نے اپنے ٹھیکیداروں حضوری مل اور دون دت اور ان کے ایجنٹوں کے خلاف جو شکایتیں کیں وہ اس قسم کے برے سلوک کی مثالیں ہیں۔ تشخیص مالگوری کی بہت اونچی شرح کی بنا پر بہت سی زمینداریاں وقت پر مالگوری ادا نہ کر سکیں اور کئی زمینداروں کے مطالبوں میں تحفیف کی گئی۔ ٹھیکوں کی بنا پر تعلقہ دار نے زمینداروں سے پھٹکارا پالیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے زمیندار خود اپنی جائیدادوں کے ٹھیکیداروں کے ہتھی بن گئے، ٹھیکے پہ دی جانے والی بھی زمینات کو ہتھقل کے

سلطے میں تہی سے مستثنیٰ کر دیا۔ اس لیے کہ حکومت اس لین دین کو ٹھیکیدار کا نجی معاملہ تصور کرتی تھی۔ چنانچہ آزاد جائیدادیں کلڑے کلڑے ہونے لگیں۔ اور زمین جائیداد قابل فروخت شے بن گئی۔ اس صورت حال سے کمپنی کے ملازمین اور ان کے "بانیان" کو فائدہ ہوا۔ سلطت کے ٹھیکرے اور موٹیکر کے بیٹ بین کی طرح کے کلکڑوں اور دوسرے کلکڑوں نے خود اپنے غلطوں میں کبھی مصنوعی ناموں سے اور کبھی اپنے "سیلائیجنٹوں" کے ناموں سے جائیدادوں کے ٹھیکے لیے۔

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے لیے رشوت کا بڑا ذریعہ ٹھیکیدار بن گئے۔ باروئل نے دکن شہر باڑپور کے نمک کے ٹھیکے کے جوڑ توڑ میں تقریباً 1,00,000 روپے بنائے۔ سرکٹ کی کمپنی کے دوسرے اراکین نے بھی اس طرح فائدہ اٹھایا۔ ہندوستانیوں میں کانتی بابو (دوران مسٹرکٹر کا "بانیان") 40,432 روپے سانسٹی رام کو (میڈلٹن کا دیوان) 47,000 روپے اور بھوانی متر کو (گرام کا دیوان) 34,000 روپے دربار خرچ کے طور پر دینی بھوانی کے پسر مستثنیٰ راج شاهی کے راجہ رام کو شل سے ملے۔ اس امر کا تخمینہ لگا گیا کہ جن حکام پر بندوبست کی ذمہ داری تھی۔ انہیں ملنے والی مجموعی رقم 42,00,000 روپے تک پہنچتی ہے۔ (1)

بڑے مطالبے کو پورا کر سکتے کے بہانے ٹھیکیدار کمپنی کے حکام سے چھوٹ لے لیا کرتے تھے۔ وہ ان معاہدوں سے خفیہ طور سے مستفید ہوتے تھے اور اس لیے بڑی خوشی سے چھوٹ دیدیتے تھے کچھ ٹھیکیدار اس حیثیت سے کام کرتے تھے لیکن بہت سے تو ایسے تھے جنہوں نے کچھ رقوں کے عوض اپنے نام دیدئے تھے کچھ بانیان زمینداروں کے ضامن بن جاتے تھے اور جب کوئی زمیندار مالگوری ہوا انہیں کرتا تھا تو ضامن کو ٹھیکیدار بنادیا جاتا تھا اور زمیندار اس کا ٹھیکہ ٹھیکیدار بن جاتا تھا۔ جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا ان کا جتنا بھی خیال کیا جاتا تھا یا ان کے ساتھ جتنی بھی ہمدردی دکھائی جاتی تھی اس کے مقابلے میں ان کے دکھ بہت زیادہ تھے۔ ٹھیکیدار کوئی ایسی چیز برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے جس کا اثر ان کے منافعوں پر پڑے۔ عامل ناموں نے انہیں اختیار دیا تھا کہ وہ زمینداروں کے پٹوں کو ختم کر دیں اور نئے پٹے کر لیں اور زمیندار کو محض ایک ناگوار حیثیت دار انسان بنا دیں جو صرف مشاہرہ حاصل کرنے کا حقدار تھا۔ قانون گو اطلاعات حاصل کرنے اور زمینات پر حکومت کا کنٹرول برقرار رکھنے کا سب سے زیادہ قابل اعتماد ذریعہ تھا جو لو ایگی اور بھلیا کے حسب اور حقوق اور رسیدات و مطالبات کا ریکارڈ رکھتا تھا اور جائیداد اور اس کے انتقال کا کھاتا تیار کرتا تھا۔ نئے انتظامات کے تحت ان کی افادیت اور ملازمت ختم ہو گئی اور زمینداروں کی جو نگہداشت وہ کرتے تھے وہ قصہ پارینہ بن گئی۔ پٹداروں پر جب قانون گویوں کی مگرانی ختم ہو گئی تو انہوں نے روپے کمانے اور کسانوں پر مظالم توڑنے کی غرض سے ٹھیکیداروں کے ایجنٹوں کے ساتھ ساز باز کرنی شروع کر دی۔ ایجنٹ اور زمینداروں کے چھوٹے موٹے حاکم ان پر جبر و ظلم کرتے تھے۔ اور حاکموں کی طرف سے ان پر جو دباؤ پڑتا تھا وہ اس دباؤ کو کسانوں کے کندھوں پر ڈال دیا کرتے تھے۔

ٹھیکیداروں کی بنا پر دیہی معیشت کی تباہی کے خطرے اور حکومت کی آمدنی کے اصل ذریعے کے ختم ہو جانے کے خوف کی بنا پر دوران مسٹرکٹر نے 1776ء میں ایک آئینی کمیشن مقرر کیا جس کے

(1) دوران مسٹرکٹر نے دہلی سے ایک لاکھ مالودہ کے نوایوں اور بنارس کے راجہ سے سولہ لاکھ اور پٹنہ ہزار

روپے حاصل کئے اور ولسی ملٹ نے تین لاکھ روپے لئے۔

پہرہ تحقیقات کرنے اور تدار کی اقدامات کی سفارش کرنے کا کام کیا گیا۔ اس کی سفارش پر ٹھیکیداری کا طریقہ ختم کر دیا گیا اور زمینداری کے منصوبے کی تجدید کی گئی۔ لیکن اس وقت تک بہت نقصان ہو چکا تھا اور زمینداری کے روایتی ورے کی تشکیل ممکن نہیں تھی۔ اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ اس ورے کی وہ قدیم اور لازمی خصوصیت ختم ہو چکی تھی جنہوں نے اسے زندگی اور وقار عطا کیا تھا اب زمیندار پر جان و مال کے تحفظ کرنے، بھوکوں والوں کے حقوق کی حفاظت کرنے اور جھگڑے چکانے کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اب وہ دیہی سماج میں اتھلا کرنے والا عنصر نہیں رہا تھا اس کا کام کسانوں سے لگان وصول کرنے اور حکومت کو تنفیض شدہ مالگوداری ہوا کرنے تک محدود ہوتا جا رہا تھا اب بھوکوں کے لوگ اسے اپنا ایسا سرپرست نہیں سمجھتے تھے جسے ان کی فلاح و بہبود کی فکر ہو، جو ان کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہو، جو ان کے میلوں اور تہواروں کا انتظام کرے اور جو ان کی تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیوں پر توجہ دے۔

دوسری بات یہ تھی کہ بدیسوں کے ہاتھوں میں سیاسی طاقت آجانے کے بعد، جنہوں نے ہندوستانی سماج کے بجائے بدسی ذرائع سے اپنے اختیارات حاصل کیے تھے، اس کی حیثیت بہت کم ہو گئی تھی۔ ٹھیکیداری کے طریقے کے رواج نے اس نظام کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ ٹھیکیدار اس پہ حکم چلاتا تھا اس کے ماتحت اب نئے مالکوں کی اطاعت کرنے لگے تھے۔ تعقدہ حکومت کو براہ راست مالگوداری ہوا کرتے تھے تیسری بات یہ تھی کہ کسینی کے بڑے بڑے مطالبوں نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ بہت سی زمینداریاں اور تعقدہ میاں جو مطالبات روانہ کر سکیں تقسیم ہو گئیں اور بائیاں، حکام مال اور مہاجنوں کے طبقوں سے تعلق رکھنے والے ٹھیکیداروں کے ہاتھوں میں آ گئیں۔ ان کی غربت و افلاس کی بنا پر ان کی افلاہیت اثر اور ساکھ ختم ہو گئی۔

اس کے علاوہ مالگوداری کے انتظامی ڈھانچے میں اکثر ہونے والی تبدیلیوں، تنفیض اور وصولی کے طریقوں اور خصوصیت کے ساتھ زمین جاہلو کی طرف نئے حکمرانوں کے روپنے نے، ایک ایسا نجی معاملہ سمجھتے تھے، جس کا فیصلہ عدالتیں کر سکیں، اس میں اختلاف پیدا کر دیا رہا، بیج اور ہبہ روزمرہ کے معمول بن گئے اور زمین جاہلو ایک ایسی شے بن گئی جس پر رسد اور مالک کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ آخری بات یہ کہ روایتی بالاائی طبقے کی زمین کی ملکیت کی اجادہ داری ختم ہو گئی۔ اب زمین کو جنگی خدمات یا علم و پاکبازی یا برکت ہرزدی حاصل کرنے کے لیے عداوت کا انعام نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اب دستاویزات ملکیت چمکتی ہوئی تلوہوں سے نہیں لکھی جاتی تھیں بلکہ کھوٹے سکوں کے ذریعہ مرتب کی جاتی تھیں۔ جس زمینداری نظام کا ابتداء 1777ء میں کی گئی وہ قدیم ورہ محض عکس تھا اس نظام کے تحت ٹھیکہ دار ختم کر دیئے گئے اور جہاں تک ممکن ہو سکا زمین کا بندوبست زمینداروں کے ساتھ کیا گیا انہیں نئی سندیں دی گئیں جن میں لگان داری کی شرائط درج تھیں۔ ایک شرط یہ تھی کہ بھلیا کی صورت میں حکومت کے مطالبے کی وصولی کے لیے زمین کے حصے فروخت کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ بد انتظامی کی صورت میں مالگوداری وصول کرنے کے لیے حکومت سزواہل مقرر کرے گی۔ پچھلے تین سال کی توسط وصولی کی بنیاد پر مال گزری تنفیض کی جاتی تھی۔ چنانچہ پچھلی صورت سے زیادہ تنفیض سے زمینداروں کا پیچھا نہیں کٹا اور حکومت کی مقرر کی ہوئی تاریخوں پر مال

گزارہی کی قسط ادا کرنے کے لیے انہیں مجبوراً مہاجروں پر انحصار کرنا پڑا۔ انہیں روپیہ حاصل کرنے کے لیے یا تو زمینداری کو رہن کرنا پڑتا تھا یا ٹھیکے پر دینا ہوتا تھا۔ زمینداروں کی مالی حالت خراب ہونے کے باوجود تاجر انہیں قرض دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے اس لیے کہ ملک کے ہر حصہ میں ان کی تجارت کم ہو گئی۔ اور روپے کو استعمال کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ ان کے پاس نہیں تھا۔ 1777ء سے 1785ء تک اصولاً موروثی زمینداروں کو تسلیم کیا جاتا رہا اور ہر سال یہ سمجھ کر ان کے ساتھ بندوبست کیا جاتا رہا کہ وہ اس وقت تک زمین کے مستقل مالک سمجھے جائیں گے جب تک وہ حکومت کے ساتھ اپنے عہد و پیمان پورے کرتے رہیں۔

انتظامیہ میں دارن سسٹم نے جو آخری تبدیلی کی وہ یہ تھی کہ 1781ء میں صوبائی کونسلوں کو منسوخ کر دیا اور کلکٹر بحال کر دیے گئے۔ بندوبستوں کی نگرانی کرنے کے لیے پانچ اراکین پر مشتمل ایک مالگوار کی کمیٹی تشکیل کی گئی جس کا صدر مقام کلکتہ تھا۔ اس کے مباحث کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ تین سو مال گزارہ میں 26,00,000 روپے کا اضافہ کر دیا گیا۔ مدت ختم ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ حکومت کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ مالگوار کی نظام ملک کے لیے تباہی کا باعث ثابت ہو رہا تھا۔ مالگوار کی انتہائی بڑے مطالبے، جن پر ہر سال نظر ثانی کی جاتی تھی، اور یہ سخت شرط کہ وقت پر روپیہ ادا کیا جائے زمینداروں کو تباہ کر رہے تھے اور ان کی زمینداروں پر قرض کا ناقابل برداشت بوجھ بڑھتا جاتا تھا۔

کارنوالس۔ بندوبست استمراری اور دوسری اصلاحات

اس اچھے ہوئے ملک مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ داری کارنوالس پر ڈلی گئی۔ اس نے اصلاحات کا بیڑا اٹھایا تاکہ معیشت اور تجارت کی توسیع کر کے کمیٹی کی سادہ بحال کی جائے اور ملازمین کی دہشت داری اور کارکردگی کی بنیاد پر ایک باقاعدہ انتظامیہ کا نظام قائم کیا جائے۔ انگلستان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے وہ برطانوی حکومت کی بندوبستی ریلیا کے لیے ایک پاک و صاف انتظامیہ مہیا کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برطانوی حکومت کا وقار و استحکام اسی حد تک فوجوں پر منحصر ہے جس حد تک سول ملازمین کی کارکردگی۔ اس کا کردار ایوں کا اثر سرگرمیوں کے تین اہم شعبوں پر پڑا یعنی مل گزارہ، عام انتظام، اور تجارت۔ جن وجوہ کی بنا پر کارنوالس نے بندوبست استمراری نافذ کرنے کا فیصلہ کیا وہ حفاظتی بھی تھیں اور سیاسی بھی۔ ایک معاشی وجہ یہ تھی کہ کمیٹی کی تبدیلی سرگرمیوں کا انحصار تھا زمین سے ہونے والی یقینی آمدنی پر اس لیے کہ اس طرح مل خریدنا ممکن نہیں تھا جیسے پہلے باہر سے آنے والے ملین اور تبدیلی مل کی بنیاد پر خریدنا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہندوستان سے انگلستان کو فاضل آمدنی بھیجنے کا واحد ذریعہ تھہ برآمدات۔ سر جان شور نے کہا تھا کمیٹی تاجر بھی ہے اور اس ملک کی غلریں بھی۔ لول الذکر دیشیت سے وہ پوری تجارت اپنے ہاتھ میں لیتی ہے اور آخر الذکر دیشیت سے ملک کی آمدنی اپنے مصرف میں آتی ہے۔ یورپ کو آمدنی ملک کی ان اشیاء کی شکل میں بھیجی جاتی ہے جنہیں وہ خریدتی ہے۔ (1)

لیکن آمدنی کو یقینی بنانے کے لیے ضروری تھا کہ تخصیص مالگوری اور وصولی کے طریقے میں بدلاؤ ہونے والی تبدیلیاں روکی جائیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں زمین کی ملکیت اور اُس کی ذمہ داریوں کا تعین کیا جائے۔ مال گزری کے نظام میں کیے جانے والے تجربوں اور کمپنی اور نجی تاجروں کی تجارت میں ہونے والی تبدیلیوں نے بنگال کو بہت نقصان پہونچایا تھا۔ بنگال کو سکھ چین کی بڑی ضرورت تھی۔ کارنوس کو اس کا یقین تھا کہ بنگال کی تجارت کو توسیع دینے سے پہلے وہاں کی زراعت کو ترقی دینی چاہیے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دو باتیں ضروری تھیں۔ پہلی بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں کے ایک ایسے نئے طبقے کی تلاش کی جائے جو فن زمینوں کو حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہوں جن سے پرانے زمیندار بے دخل کیے جاسکے تھے۔ اور دوسری یہ کہ اس قسم کے عوامل فن کے سامنے رکھے جائیں جو زمینوں میں روپیہ لگانے پر انہیں آمادہ کر دیں۔ نیا طبقہ پہلے سے ہی موجود تھا۔ یہ طبقہ ان تاجروں پر مشتمل تھا جنہوں نے تجارت سنے اور دوسرے طریقوں سے خاص سرمایہ اکٹھا کر لیا تھا اور ہندوستانی تجارت کی کشش بازاری کی بنا پر وہ روپیہ منافع بخش انداز سے نہیں لگا سکتے تھے۔ ہندوستان استرادی نے روپیہ لگانے کے لیے نئے راستے کھول دیئے۔ کارنوس نے دہاکروں کو لکھا تھا کہ حکومت چونکہ اپنے قرضوں کا چھوٹا کر رہی ہے اس لئے اس کا خیال ہے کہ حاصل ہونے والے سرمائے کو استعمال کرنے کے دوسرے ذرائع موجود نہ ہونے کی بنا پر حق ملکیت کے تحفظ کا اعلان ہو جانے کے بعد وہ روپیہ زمین چاند خریدنے پر صرف کیا جائے گا۔⁽¹⁾ اُسے یہ بھی توقع تھی کہ جن لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ مال گزری کا ایسا تعین ہو گیا ہے جس میں آئندہ کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی تو نقد روپیہ نہ صرف زمین خریدنے پر خرچ کیا جائے گا بلکہ زراعت کی ترقی کا باعث بھی بنے گا جس کی وجہ سے پیداوار بڑھے گی اور برطانوی تجارت کو فائدہ ہوگا۔

زمینداروں کے ایسے طبقے کی تشکیل کے سیاسی فوائد بھی بہت تھے جن کو زمین پر مطلق حق ملکیت حاصل ہو۔ توقع کی جاتی تھی کہ دولت مند ہندوستانیوں کا ایک ایسا طبقہ معرض وجود میں آجائے گا جو برطانوی حکمرانوں کا وفادار ہوگا اور سیاسی عزائم سے نمٹا۔ کارنوس کو امید تھی۔ جب زمینداروں کے قبضے میں منافع بخش ذمہ داریاں ہوں گی جب تاجر اور صنعت کار منافع بخش تجارت میں مصروف ہوں گے اور جب ہر قسم کے لوگ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مذہبی رسوم بوا کر سکیں گے تو مدتوں سے چلنے والی ہندوؤں کی تمام نسلیں اور ان کو کچلنے والے مسلمان اس حکومت کی تبدیلی کو یکساں طور سے پسند کریں گے جس کے تحت انہوں نے یہ بے حساب فوائد حاصل کیے اور آئندہ بھی حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔⁽²⁾

لیکن اس کے نتائج توقع کے مطابق نہیں ہوئے۔ اُس کی کئی وجہ تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ کمپنی کو چونکہ زیادہ سے زیادہ مال گزری حاصل کرنے کی ضرورت تھی اس لئے کارنوس کو بہت زیادہ مالگوری تخصیص کرنی پڑی۔⁽³⁾ دوسری بات یہ کہ اُس نے وصولی کے جو طریقے مقرر کیے وہ سخت

(1) کارنوس بنام گورٹ آفیس، 6 مارچ 1792ء۔

(2) 4 فروری 1893ء، کی روداد، مذکورہ اسپیال 'A' in Bengal Cornawas' صفحات 73-172۔

(3) 1720 مالگوری کا مطالبہ 1,40,11,339۔ 1790 مالگوری کا مطالبہ 2,59,28, 208۔ 1793

مالگوری کا مطالبہ 2,28,00,989۔

اور ظالمانہ تھے تیسری بات یہ کہ اُس نے بڑے بھلائے جن کا قاعدہ ختم کر دیا اور جامدو کے تیزی کے ساتھ نکلے۔ غرے ہوئے لگے آخری بات یہ کہ حق ملکیت کو مطلق بنادیتے اور زمینداروں کو کسانوں کی مِلّاک کی ترقی اور فروخت کے اختیارات عطا کرنے کی بناء پر زمین پر حق ملکیت کی لازمی نویت بدل گئی۔

کارنواں نے جو انتظامی اقدامات کیے ان کے پیچھے ہندوستانوں پر مکمل عدم اعتماد کا جذبہ کارفرما تھا اُس نے لکھا تھا "حکامکہ ہمدی توقع ہے کہ ہمدی رعایا ہندوستان کے سب سے زیادہ خوش و خرم لوگ ہوں پھر بھی میں اس امر کی سفارش کسی طرح نہیں کر سکتا ہوں کہ دیسی لوگوں کو ضوابط کی تکمیل میں حصہ لینے کی اجازت دیدی جائے" (1) جس نظام کی دلخ بیل اُس نے بیل اُس میں تمام معاشی اور انتظامی پالیسیاں بنانے کا کام انگریزوں کے سپرد کیا گیا تھا اور اُن کے عمل درآمد کے اختیارات بھی انہی کو سونپے گئے تھے۔ اُس نے کورٹ آف ڈائریکٹرز سے کہا تھا "میں بات کو تسلیم کیا جلتا چاہیے کہ یورپیوں کی ایک بڑی وڈم جماعت کے بغیر ان پیش بہا علاقوں پر ہمدی اقتدار غیر محفوظ رہے گا" (2) اس پالیسی کا اطلاق فوج اور سول خدمت دونوں پر کیا گیا۔

پہلی کی فتح کے بعد زیادہ تر اعلیٰ عہدوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے یورپین ملازموں کو منتقل کر دیا گیا۔ 1760ء اور 1786ء کے درمیانی عبوری دور میں جو عہدے ہندوستانوں کے پاس تھے رفتہ رفتہ وہ بھی پھین لیے گئے بالآخر کارنواں نے ان عہدوں کے بلکہ کئی ماتحت عہدوں کے بھی دروازے ہندوستانوں کے لیے بند کر دیے۔

کارنواں کے نظام کی بنیاد مفروضوں پر قائم تھی پہلی بات تو یہ تھی کہ اس کا خیال تھا کہ ایشیائی لوگوں پر انگریزوں کو برتری حاصل ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر وہ سمجھتا تھا کہ ہر چیز کو زیادہ سے زیادہ انگریزی رنگ دیا جائے۔ اُسے یہ بھی خطرہ تھا کہ ذمہ دار عہدوں پر ہندوستانوں کا تقرر کرنے کی بناء پر سلطنت کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہے۔ گلا اُس نے اعلان کیا تھا "میں ان ذمہ داریوں کے لیے بنگال کے لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا" (3)

لیکن دوسری وجہ سے قطع نظر معاشی بنیاد پر بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ماتحت عہدوں پر یورپیوں کا تقرر کیا جاسکے۔ انگریزوں نے جس قسم کا انتظام قائم کیا تھا اُس میں عدالت اور پولیس کے فرائض اور دوسرے کام زمینداروں سے سرکاری ملازمین کو منتقل کر دئے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے انتظامیہ کے ماتحت شعبوں یعنی شعبہ مال، عدلیہ، پولیس، تعمیرات عام وغیرہ میں اس قسم کے ملازمین کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی جیسے امین، منصف، تھانیدار، تحصیل دار وغیرہ جن کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ 250 روپے ماہوار ہوتی تھی۔ بہت سے ہندوستانوں کا تقرر دہلی، آغا، یوان، گماشتہ، ہیڈ محرر، سرشتہ دار، بمعدل وغیرہ کی حیثیت سے کیا گیا جن کی تنخواہیں 3 روپے 8 آنہ ماہوار سے لے کر 100 روپے ماہوار تک تھیں۔

ہندوستانی وکیلوں کا تنظیم سرکاری روزگار شروع کیا گیا جنہیں عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کرنے کی اجازت دی گئی اور جن کی فیس حکومت نے مقرر کی۔

(1) 'پینال A' محول بالا، صفحہ 172 11 فروری 1793ء، ملی روداد

(2) 'بلر ڈیو، ویلو، لارڈ کارنواں Ruler of India Series صفحہ 89

(3) 'پینال A' محول بالا صفحہ 169

اس ملک کے باسیوں پر اس پالیسی کا مضر اثر پڑا بالائی طبقتوں کے لیے روزگار کے پرانے راستے بند ہو چکے تھے اور اعلیٰ انتظام کے طریقوں کا تجربہ حاصل کرنے اور حکومت کی وسیع پالیسیاں تشکیل کرنے کے مواقع انہیں ملتے نہیں تھے اس کی وجہ سے متوسط طبقے کا کردار اور نقطہ نظر محدود ہو کر رہ گیا اور زمیندار قیوت کے نمونوں رکھتے پر گئے۔ اسپیل نے کلارنواس کی انتظامیہ کے متعلق لکھتے ہوئے کہا تھا اس لیے کلارنواس کے نظام نے ان لوگوں کو ابھرنے کے بجائے جو کمپنی کی حکومت میں آگئے تھے اور حقیر بنا دیا۔ (1)

تجداتی شعبوں میں جس پالیسی پر عمل کیا گیا اس کے نتائج بھی کچھ اس قسم ہوئے۔ کئی نظاموں کا تجربہ کیا گیا لیکن کوئی کلیتہً اطمینان بخش نہیں ثابت ہوا۔ دولتی تاجروں، گمشدوں اور والوں کی ہندوستانی ایجنسیوں کی بنا پر خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کا تدارک کرنے کے لیے یورپی تاجروں پر مشتمل ایک بورڈ آف ٹریڈ قائم کیا گیا۔ پھر اس کی جگہ فیکٹریوں کے یورپی سربراہوں کو ٹھیکہ دینے کا طریقہ شروع کیا گیا۔ وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ 1787ء میں کلارنواس نے ایجنسی کے طریقے کو رواج دیا اور دو سال بعد اسے عمومی بنادیا۔ انگریزوں نے ایجنسی ہاؤس بنائے جس میں بہت سے کمپنی کے ملازمین شامل ہو گئے۔ کچھ ملازم تو اپنے کاموں سے سبکدوش ہو گئے تاکہ ایجنسی ہاؤس کے منیجر یا ڈائریکٹر بن سکیں۔ ایجنسی ہاؤس کے لیے خاص بڑی رقبے کمپنی کے ملازموں کی یافت میں سے آئیں۔ جنہوں نے اپنی بچت کی رقبے ان میں سے لگا دیں۔ ان میں ہندوستانیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس نئے نظام کی حمایت میں کہا جاتا تھا کہ ہندوستانیوں میں روپیہ لگانا نہیں چاہیے۔ یا ان کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ روپیہ لگا سکیں۔ یہ بات غلط تھی۔

جب 1788ء میں کمپنی کی ملازمین کی نجی تجارت ختم کر دی گئی تو 13 سو ملازمین تجارت سے محروم ہو گئے۔ ایجنسی ہاؤسوں کو اس سے فائدہ ہوا۔ اس لیے سنجیدگی سے مقابلہ کرنے والوں کا کردار ختم ہو گیا۔

1789ء میں ایجنسی ہاؤسوں کی تعداد اور انکی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ وہ ملک کی تجارت کو کنٹرول کرنے لگے، نیل اور شکر کی صنعت میں سرمایہ کاری کرنے لگے، سرکاری ٹھیکے حاصل کرنے لگے۔ سرکاری سکھروں کا سنا کرنے لگے، اور بینک کاری اور بیسے کا کاروبار کرنے لگے۔ انگلستان جانے والے جہازوں کے افسروں کے نجی مال کی دیکھ بھال کا کام انہوں نے سنبھال لیا، ہڈیوں کا لین دین کرنے لگے اور بدلی کمپنیوں کی وکالت کرنے لگے۔ انہوں نے لندن میں اپنے دفاتر کھول لیے جو ان کی چینی ہوئی رقبوں کو وصول کرتے تھے اور انہیں رقبے مہیا کرتے تھے۔ ملک کی تجارت خاص طور سے ان کی گرفت میں آگئی تھی۔

اس نئے نظام کو رواج دینے کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کی بدلی تجارت سے ہندوستانی محروم ہو گئے۔ گمشدے، دال، اور پانگل بے روزگار ہو گئے اور مال کی فہرستوں سے ہندوستانیوں کے نام مٹ گئے۔ ان کے لیے روزگاری کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک سو ایٹ بے روزگار ہو گئے جو 1789ء میں ڈھاکہ میں کام کرتے تھے۔ جوں جوں ایجنسی کا طریقہ فروغ پاتا گیا اور تجارت اور بینک

کاری کے زیادہ تر کاموں پر کنٹرول حاصل کرنا گیا ترقی کا یہ راستہ ہندوستانوں پر بند ہوتا گیا۔
 انہیں ہوتے متوسط طبقے کو ان دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس لیے کہ دوسرے یورپین
 تاجر ان سے کام لیتے رہے۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں پلاسوں کے مقابلے میں ہندوستانی ایکٹ کم خرچ
 بھی تھے اور زیادہ پاموت بھی، ایٹ ہنڈلنگ مین کے ساتھ ان کی رقابت سے بھی انہیں کو فائدہ پہنچا۔
 دوسرے طریقوں سے بھی ہندوستانی اپنے نقصان کی تلافی کر لیتے تھے، ایک بات تو
 یہ تھی کہ تجارت کا مطلق حجم اور اُس کی مالیت بڑھتی رہی۔ حالانکہ ہندوستان کے برآمدات کی
 نوعیت بدلنے لگی۔ خام ریشم حاصل کرنا برطانیہ کا ایک قوی پراجیکٹ بن گیا۔ ٹیکس پر بنوائے ہوئے
 مال کی جگہ کپاس، خام ریشم، شکر، نیل، پٹن اور دوسرے خام مال نے لے لی۔ تیار شدہ ریشم کا
 انگلستان میں داخلہ ممنوع تھا اور اُس کے لیے سخت سزا میں مقرر کی گئیں تھیں۔ اُس کی جگہ کمپنی
 کی خرید میں سب سے اہم شے نیل بن گیا۔

برطانیہ کے آزاد تاجروں نے، جو بڑے پیمانے پر ہندوستانی تجارت میں حصہ لیتے
 تھے، ایٹ اٹھیا کمپنی کی اجارہ داری پر اعتراضات شروع کیے۔ آزاد تاجر ہندوستانی مال زیادہ
 قیمتوں پر خرید سکتے تھے۔ اس کی ذمہ یہ تھی کہ کمپنی کے مقابلے میں وہ زیادہ آسانی کے ساتھ
 اپنا مال یورپ کے براعظم میں فروخت کر سکتے تھے۔ اُن کا زیادہ مال سستے بدلے کی جہازوں کے
 ذریعہ براہ راست کوپن ہیگن، اmsٹرڈام اور لگ ہارن کی طرح کے یورپی بندرگاہوں کو بھیجا جاتا تھا۔
 چنانچہ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ 1790ء کے لگ بھگ ڈھاکہ سے ہونے والے نجی برآمدات کی
 مالیت تھی 14 لاکھ روپے (سکہ وقت) جب کہ کمپنی کے برآمدات کی مالیت تھی، صرف سات لاکھ
 روپے۔ اس زمانے میں نجی تجارت نے بڑا فروغ پایا۔ 1781ء اور 1790ء کی درمیانی مدت میں
 ہندوستان کے برآمدات میں کمپنی کا حصہ کل کا 14 فیصدی تھا اور درآمدات میں تقریباً 18 فیصدی۔
 دوسری طرف نجی برآمدات 10 فیصدی سے بڑھ کے 43 فیصدی ہو گئے۔

تجارت کے فروغ کے واقعات دلچسپ ہیں 1776-77ء میں ہندوستان کو ایٹ اٹھیا
 کمپنی کے برآمدات کی مالیت تھی 6,26,893 پاؤنڈ (مال، اسباب اور بطین) 1785-86ء میں وہ بڑھ کے
 12,53,482 پاؤنڈ ہو گئی۔ (مال، اسباب اور بطین) اور 1793-94ء میں 13,46,104 پاؤنڈ یورپ سے
 ہندوستان کو ہونے والے مجموعی برآمدات (1781ء لغایت 1791ء) کی مالیت تھی 23,93,610 پاؤنڈ
 جس میں کمپنی کا حصہ 3,46,770 پاؤنڈ یا 14 فیصدی تھا۔ اسی مدت میں ہندوستان سے آنے والے
 مغل مال کی قیمت فروخت تھی 73,31,669 پاؤنڈ جس میں سے کمپنی کا حصہ 19,62,95 پاؤنڈ تھا
 یورپ سے ہندوستان کو ہونے والے مجموعی برآمدات (1781ء لغایت 1791ء) کی مالیت
 تھی 23,93,610 پاؤنڈ جس میں کمپنی کا حصہ تھا 3,46,770 پاؤنڈ یا 14 فیصدی۔ اسی مدت میں
 ہندوستان سے آنے والے مغل مال کی قیمت فروخت تھی 73,31,669 پاؤنڈ جس میں سے کمپنی کا
 حصہ تھا 1,96,295 پاؤنڈ یا تقریباً 27 فیصدی۔ (1)

بدیسوں کی ساحلی اور بری تجارت کی ہندوستانی تاجر طبقے کے فروغ کا باعث ہوئی۔ در آمد اور بر آمد کے لیے مال میں اضافہ ہو گیا جس نے مال کی مانگ اور رسد میں اور اندرون ملک اس کی تقسیم میں اضافہ کر دیا۔ چونکہ سرکاری حکام کے علاوہ کسی اور یورپین کو ملک میں رہنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے زیادہ تر تجارت ہندوستانوں کے ہاتھ میں آگئی۔

تجارت کے طریقوں میں جو تبدیلی ہوئی اسی قسم کی تبدیلی بینکاری اور قرض کے میدانوں میں بھی ہوئی۔ کمپنی کے ابتدائی برسوں میں (1788ء تک) ہندوستانی بینکاروں اور صرافوں کا کاروبار بہت اچھا تھا۔ اس لیے کہ انگریزی تجارت کا انحصار تھا انگلستان سے لائی جانے والی جنس زر پر اور مختلف قسم کی کرنسیوں کے استعمال پر کمپنی نے بڑی کوشش کی تھی کہ منحل حکومت اُسے اپنا سکہ ڈھالنے کی اجازت دیدے تاکہ مختلف قسم کے سکوں کی تعداد کم کی جاسکے۔ لیکن 1757ء کے بعد ہی وہ سکہ ڈھالنا شروع کر سکی۔ 1757ء کے بعد بلین کی درآمد بند ہونے جتنی مفاد میں بنگال سے جنس زر کے نکاس، مدراس اور بمبئی پریسیڈنسیوں سے خسارہ کو پورا کرنے کی خاطر دی جانی والی لدا اور برآمد کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ اشیاء خریدنے کے کمپنی کے ملازمین کے بڑھتے ہوئے مطالبوں نے کرنسی کی ادائیگی اور گردش زر کے مسائل پیدا کر دیے۔ اُن کو حل کرنے کی کوشش میں تجربے کیے گئے۔ لیکن وہ بے سود ثابت ہوئے۔ 1786ء میں سکوں کے لیے سونا استعمال کرنا شروع کیا۔ لیکن تین سال بعد اُس کو ترک کر دیا۔ نیک سالیں بند کر دی گئیں۔ صرف ایک کو سکتے بنانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن اُس کے بنے ہوئے سکوں کی گردش محدود تھی اور اضلاع کو اپنے لیے کرنسی کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ ان مواقع سے صرافوں نے فائدہ اٹھایا اور کرنسی اور مبادلہ کا اجارہ حاصل کر لیا اور اضلاع میں اپنی ایکسیاں قائم کر دیں۔ وہ ایک ایسا طبقہ بن گئے جو زمینداروں کے لیے بڑا کار آمد تھا جن کے لیے نقد لگان وصول کرنا اور وقت پر مال گزاری اور کاروبار ہوجا کر نواس نے اُن کا اثر بھی کم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے افراتفری کو دور کرنے کے اقدامات کیے جس نے انھیں پھلتے پھولنے کا موقعہ دیا تھا۔ اُس نے کئی شہروں میں نکسالیں کھولیں اور کرنسی کی اصلاح کی سونے اور چاندی کا تناسب سولہ اور ایک مقرر کیا گیا اور دو دھاتیت کا تجربہ کیا گیا۔ کوڑی کی جگہ جو سب سے کم قیمت کی روایتی کرنسی تھی، تانبے کے پیسے کو رواج دیا گیا۔ اُس کی جڑی وجہ تھی کہ کرنسی میں اصلاح کے خواہش اور جڑی وجہ تھی انگلستان سے اور زیادہ تانپلا و آمد کرنا جس سے ظاہر ہے کہ انگلستان کے تاجروں اور جہازی کمپنیوں کو فائدہ ہوا۔ ان اصلاحات نے مقامی بینکاروں کے کاروبار کو بڑا دھکا پہنچایا اور اُن کا زیادہ تر کاروبار بینکی ہوسوں اور جدید بینکوں کو منتقل ہو گیا جو وجود میں آ گئے تھے۔

مقامی بینکاروں اور نئے بینکوں مثلاً بنگال بینک اور بھڑل بینک کے درمیان مقابلہ برابری کا نہیں تھا۔ آخر الذکر کو حکومت کی سرپرستی اور حمایت حاصل تھی۔ وہ ہندوستانی بینکوں پر بہت لے گئے۔ اس لیے کہ وہ کاندھ کی کرنسی کو جاری کرنے اور اُس کا انتظام کرنے کے کاموں سے واقف تھے۔ یہ طریقہ حقیقت میں یورپی طریقہ تھا اور ہندوستانی اسے پوری طرح سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس کے علاوہ دہلی اور بڑی حد تک داخلی تجارت میں بدیسوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی جس کے نتیجے میں مقامی بینکوں کا بہت سا کاروبار ختم ہو گیا۔

لیکن بنک کاری کے کاروبار کی کمی کی جڑی تلانی کمپنی کو مال مہیا کرنے کے طریقے نے کر دی۔ پراسی کیم بعد کچھ مدت تک مال خریدنے کے لیے بنگال کی آمدنی استعمال کی جاتی رہی۔ لیکن انتظامی اخراجات اور جنگ وغیرہ کے لیے روپے کی مانگ بڑھ جانے کے بعد معلوم ہوا کہ بنگال کی آمدنی اُن سب اخراجات کیے لیے کافی نہیں ہے۔ اُس کے بعد کمپنی کی تجارت کے لیے قرض لینے کا طریقہ شروع کیا گیا۔ دوسرے اخراجات کے لیے بھی خزانے کے سرٹیفکیٹ اور بانڈ جاری کیے جانے لگے۔ اُس وقت جس قسم کے حالات تھے ان میں قرض صرف اونچی شرح سود پر ہی مل سکتا تھا۔ 12 فی صدی سود غیر معمولی سود نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان سرٹیفکیٹوں اور بانڈ پر کمیشن بنگال میں 18 فی صدی سے لے کر دہراس اور بمبئی میں 30 سے 40 فی صدی تک تھا۔ اُس نے اُن ہندوستانی تاجروں کے جو بدھسی اور ساطلی تجارت اور مبادلے کے کاروبار سے محروم کر دیے گئے تھے ایک موقعہ فراہم کر دیا کہ وہ کمپنی کے قرضوں اور بانڈوں میں اپنا روپیہ لگائیں۔

”رپورٹر آن اسٹریٹ کمرس آف بنگال“ میں کہا گیا تھا۔ ”پہلے کا بڑا ہندو باد دور دراز کے سمندری سفر کے جواب دہ کی حیثیت سے روپیہ قرض دیتا ہے۔“ دنیا کے مختلف ملکوں میں سڑ کر تاپے اور بیسے کے مختلف دفاتروں میں غیر فروخت شدہ حصص کی خریداری کا ذمہ لینے والے کی حیثیت سے بنگال کے مختلف حصوں میں نیل کی کوشیاں شروع کرتا ہے اور کاروبار کے تعلق سے برطانوی قوانین سے اتنی ہی واقفیت رکھتا ہے جتنی عام طور سے یورپی تاجر رکھتے ہیں“ (1) کارنوالس کو معلوم ہوا کہ زیادہ تر سرکاری سکورٹیاں ہندوستانی تاجروں کے ہاتھوں میں ہیں۔ چنانچہ انتظامی اور تجارتی طریقوں کی تبدیلی نے ہاتھوں کے ایک ایسے طبقے کو جنم دیا جو انتظامی اور معاشی دونوں میدانوں میں یورپین مالکوں کی خدمت کرتے تھے۔ ایسے ملازمین کا ایک خاصہ بڑا گروہ جو دس آگیا جو مغربی انتظامی طریقوں اور امور عامہ کے کاموں سے واقف تھے۔ وہ قوانین اور ضوابط کے نفاذ میں مدد کرتے تھے اور حکومت کے جدید اور دور رسلی کے اصولوں کے فرق سے واقف تھے۔ حکمرانوں کی تہذیب اور طور طریقے اور خود اپنے طور طریقوں کے فرق نے اُن کے ذہن میں قومیت اور نسل کے اختلافات کا شعور پیدا کیا۔ اُن میں سے کچھ کے پاس کافی دولت جمع ہو گئی تھی اور دوسروں نے اپنی سرکاری حیثیتوں کو استعمال کر کے غیر متعلقہ جائداد حاصل کر لی یعنی ملکات اور دوسرے شہروں میں مکانات اور باغات اور دیہات میں زمین۔ وہ اعلیٰ تجارت، کاروبار یا ملازمت بھی کرتے رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوہرے فرائض ادا کرنے کے لیے کارنوالس نے جو انتظامی ڈھانچہ بنایا تھا وہ بغیر کسی تبدیلیوں کے 40 سال تک جاری رہا۔ 1830ء تک ہریم کو نسل کی مگرانی میں بورڈ آف ٹریڈ تجارتی فرائض سرانجام دیتا رہا۔ جس نے اصطلاح میں تجارتی پریزنٹ مقرر کر دیے تھے۔

1813ء کے بعد بھی جب ہندوستانی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری ختم ہو گئی تھی اور تجارت بہت کم ہو گئی تھی۔ صرف ریزیڈنٹوں کی تعداد میں ترمیم کی گئی۔ اور اُسے کم کر دیا گیا۔ عام انتظامی ڈھانچے یعنی مال گزاری، پولس اور عدالتوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کی گئی انتظامی اور عدالتی اختیارات کی علیحدگی میں کمی کی گئی اور کلکٹر کے اختیارات میں خاصہ اضافہ کر دیا گیا جو ضلع میں حکومت کا سب سے بڑا نمائندہ بن گیا۔ عدالت اور پولس کے حکمرانوں کی بھی تنظیم نو کی گئی اور اُن میں بڑی بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ خصوصیت کے ساتھ فوج داری کے میدان میں قانون اور نظم و نسق کے اُس ڈھانچے کے اندر کمپنی کی حکومت کام

کرتی رہی اور ملک کی معاشی اور دوسری سرگرمیاں جاری رہیں۔

1793ء میں کلر نو اس کی سبکدوشی اور 1813ء میں کمپنی کے چارٹ کی تجدید کی درمیانی مدت بڑی کشمکش کا زمانہ تھا۔ یورپ میں برطانیہ عقلی کو فرانس کے ساتھ قریب قریب مسلسل جنگ کرتی پڑی۔ یورپ کی یورپ کی فوجیت اور براعظم کے اپنے نظام کی تشکیل نے، جس میں برطانیہ کو یورپی تجارت سے کاٹ دیا گیا تھا، ہالینڈ کی طرح کے یورپی ملکوں کو انگلستان کے خلاف کر دیا تھا۔ بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی کھل کر مخالفت کرنے لگا۔ ہندوستان میں میسور کے حکمرانوں اور مرہٹہ وفاق سے جنگیں ہو رہی تھیں۔

مغرب اور مشرق میں برطانیہ کے اہم مفادات کے لیے جو خطرہ پیدا ہو رہا تھا اس کے دو مقاصد تھے۔ یعنی برطانیہ کی سیاسی قیادت کو ختم کرنا اور مشرق کی تجارت پر اس کی اجارہ داری کو مٹانا۔ اس زمانے کے گورنر جرنل یعنی ویلزلی، منڈو اور ملکہوز آف بنگلہو ان مسائل کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے اور انھیں جب بھی محسوس ہوا کہ کمپنی کے ڈائریکٹر معاشی وجوہ کی بنا پر سامراجی مفادات کو نظر انداز کرنے لگے تو انھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایسے اقدامات کیے جو ان کے مالکوں کی خواہشات کے منافی تھے۔

اس قسم کی صورت حال میں یہ بات ناگزیر تھی کہ تجارتی اور سامراجی امور گڈنڈ ہو جائے اور یہ کہ ایک کے تقاضے دوسرے پر اثر انداز ہوں۔ ان امور کی بنا پر ہندوستان میں کمپنی کی نوآبادیات اور مقبوضات کی معیشت میں تبدیلیاں ہوئیں جن سے ہندوستان کے لوگوں کے لیے اہم نتائج برآمد ہوئے۔

تجارت کے میدان میں کئی میلانات نمایاں ہو گئے۔ یورپ اور ہندوستان میں لڑی جانے والی جنگوں کے باوجود ہندوستان کی مجموعی تجارت یعنی داخلی، ساحلی اور بد کسی تجارت میں اشیاء اور ریلیت دونوں اعتبار سے اضافہ ہوا تاہم انگلستان کے علاوہ کئی دوسرے یورپی ممالک بھی ہندوستان کے درآمدات و برآمدات میں ساجھی دھرتے۔ ان میں اہم تھے فرانس ہالینڈ، پرنگال اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ برطانیہ کی پالیسی تھی یورپ کے ممالک کے بندرگاہوں سے پوری تجارت کو لندن کی طرف موڑ دیا جائے۔ اور جو جوں جنگ میں شدت پیدا ہوتی گئی اور لڑنے والی قوموں کے شہری ہندوستانی تجارت سے کٹتے گئے برطانیہ کا حصہ بڑھتا گیا۔ یوں بھی ہوا کہ جہاں تک برطانوی تجارت کا تعلق تھا اس میں اس امر کا میلان پایا جاتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی سے آزاد تاجروں کو منتقل کی جائے اور اس طرح اجارہ داری آزاد تجارت میں تبدیلی ہوئے گی۔

تجارت میں روپیہ لگانے کے طریقوں کے تعلق سے اختلافات بھی تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے تو انگلستان سے آنے والی جنس زر کے ذریعے باہر لے جانے کے لیے مال خریدنے کی کوشش کی اور 1757ء کے بعد اس کے لیے بنگال کی فاضل آمدنی استعمال کی۔ لیکن جب جنگوں اور بڑھتے ہوئے انتظامی ملے کی وجہ سے فاضل آمدنی بہت کم ہو گئی تو اسے برطانوی مال کے درآمدات کو فروخت کر کے اور قرض لیکر اس آمدنی میں اضافہ کرتا ہوا۔

کچھ برس تو ایسے آئے کہ اسے خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرنے کے لیے انگلستان سے بلین ملگنا پڑا۔ چونکہ اس تمام مدت میں کمپنی کو بڑھتی ہوئی مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی تو اس کی خرید کی مقدار دس لاکھ پاؤنڈ سالانہ سے کم ہو گئی۔ جس کا اس نے منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس پر قرض تیزی سے بڑھتا گیا اور سود کی بوجھ شرح، جو کمپنی کو مجبوراً اور کرنی پڑتی تھی آمدنی پر ایک ہزار بائیس گنی

اور مال خریدنے کے لیے حاصل کی جانے والی رقم کو اُس نے کم کر دیا۔

برطانوی کمپنی بڑی حد تک انگلستان سے آنے والے مال تجارت پر اس کے لیے انحصار کرتی تھی۔ کہ ہندوستان سے برآمد کرنے کے لیے مال حاصل کرنے اور جہاں تک ممکن ہو تھا انگلستان سے بلین لانے سے بچتی تھی۔ لیکن دوسری بدیسی کمپنیاں اپنے خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرنے کے لیے بڑی تعداد میں بلین درآمد کرتی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ سے زیادہ انجینیئری ہاؤسوں پر انحصار کرتی تھیں۔ لیکن دوسری بدیسی کمپنیاں رقیب اور مال دونوں چیزیں حاصل کرنے کے لیے ہندوستان تک کاروں اور تاجروں کی سرپرستی کرتی تھیں۔

برطانیہ کے نجی تاجروں کی سرگرمیوں کا مضامین کمپنی کی تجارت پر بڑا جو اس کی اجارہ داری کے خلاف تھے۔ اور مندرجہ طریقوں سے اس میدان میں اُس کے اقتدار کی سطح کو کم کر رہے تھے۔ سالانہ حاصل کرنے کی حد تک وہ زیادہ قیمتیں دے کر کمپنی سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے پھر دوسرے ملکوں کے جہاز اور ترسیل زر کے ذریعے استعمال کر کے اس کی طاقی کر لیتے تھے تاکہ یورپ میں کمپنی کے مقابلے میں سستا مال فروخت کر سکیں۔ کمپنی کے جہازوں کے مال کے کرائے کو کم کر دینے کے لیے انھوں نے اپنے جہاز بنائے تھے۔ کمپنی کی تجارت کی تنظیم میں ہونے والی تبدیلی اور نجی تاجروں کی بڑھتی ہوئی تجارت نے ہندوستان کے تجارتی طبقے کے کاروبار کو متاثر کیا۔ برطانیہ کی بدیسی تجارت میں اُس کا حصہ کم ہو گیا اور ساحلی تجارت بڑی حد تک اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جس چیز نے اُسے زندہ رکھا وہ داخلی تجارت پر اُس کی گرفت تھی۔ اس کے علاوہ یورپی اور امریکی تاجروں کی سرپرستی کرتے تھے۔ برطانیہ کے قائم کردہ بینکوں اور یکساں کرنسی نے ہندوستانی بینک کاروں اور صرافوں کو متاثر کیا۔ لیکن دوسری طرف انھیں کمپنی کے بانڈوں اور قرضوں میں روپیہ لگانے اور بدیسی تاجروں کو روپے قرض دینے کے مواقع ملے۔ پھر بھی اُن کی حیثیت کم ہو گئی اور وہ برطانوی اور یورپین کمپنیوں کے بچھ لیے، دلال اور ہر کارے بن کر رہ گئے۔ جب 1792ء میں کارنو اس نے تقریباً بارہ لاکھ پاؤنڈ کا کمپنی کا قرض چکا دیا تو زمین اور جائیداد میں لگانے کے لیے ایک بڑی رقم اُن کے ہاتھ آگئی۔ بندوبست استمراری، جن کا اعلان 1793ء میں کیا گیا تھا، اُن تاجروں اور نئے بازوں کے لیے ایک بروقت نفع ثابت ہوا۔

نمو کے اس مرحلے میں متوسط طبقے کی حیثیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس زمانے کے ہندوستانی تجارت اور مالیات کے کچھ واقعات پر غور کر لیا جائے۔ پچھلی چوتھائی صدی (1766-67ء لغایت 1792-93ء) کے مقابلے میں دو چار ٹریڈنگ کمپنیاں (1793ء اور 1813ء) کے درمیانی برسوں میں ہندوستان کے ساتھ برطانوی تجارت کا اضافہ مندرجہ ذیل اعداد سے دیکھا جاسکتا ہے۔

زمانہ 1766-67ء لغایت 1792-93ء

انگلستان سے ہونے والی برآمدات 8.1 ملین پاؤنڈ سالانہ انگلستان میں ہونے والے درآمدات

3.8 ملین پاؤنڈ سالانہ

زمانہ 1793-94ء لغایت 1909-10ء

انگلستان سے ہونے والے برآمدات 2.35 ملین پاؤنڈ سالانہ انگلستان میں ہونے والے

درآمدات 6 ملین پاؤنڈ سالانہ۔ پچھلے دور کے مقابلے میں 1793ء اور 1810ء کی درمیانی مدت میں تجارت

تقریباً گنتی تھی۔ پہلے دور میں ہر سال اوسطاً 27 چہار بار برداری کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ لیکن دوسرے دور میں اُن کی تعداد بڑھ کے 49 ہو گئی تھی۔ (1) صرف بنگال سے برآمدات جو 1796ء میں 1.5 ملین پاؤنڈ کے بقدر تھے 1806ء میں بڑھ کے 4.2 ملین پاؤنڈ ہو گئے اور در آمدات اسی مدت میں 8. ملین پاؤنڈ سے بڑھ کے 3.15 ملین پاؤنڈ ہو گئے۔ (2)

کمپنی کی درآمدی اور برآمدی تجارت نجی تاجروں کے جن میں برطانوی اور دوسرے یورپین تاجروں شامل تھے، مقابلے میں کیسی تھی۔ وہ 1802ء 1806ء تک کے برسوں کی ذیل میں دکھائی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں ہونے والے در آمدات - ہندوستان سے ہونے والے برآمدات

پاؤنڈ	پاؤنڈ	ایسٹ انڈیا کمپنی
46,01,224	40,23,552	لندن کے آزاد تاجر
46,01,391	23,60,653	دوسرے یورپین تاجر
14,71,771	13,54,62	امریکہ
30,27,233	30,65,287	برطانوی ایشیا
41,75,855	9,46,431	غیر برطانوی ایشیا
54,93,922	40,90,645	کل میزان
2,21,01,396	1,58,40,630	

چنانچہ ہندوستان کے در آمدات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا حصہ تقریباً ایک چوتھائی تھا اور ہندوستان سے ہونے والے برآمدات میں پانچویں حصے سے بھی کم۔

ان برسوں میں (1802ء تا 1608ء) پوری دنیا کو برطانوی نوآبادیات کے برآمدات 38,34,532 پاؤنڈ سے بڑھ کے 90,99,841 پاؤنڈ ہو گئے (3) اور پوری دنیا سے نوآبادیات میں در آمدات 75,11,878 پاؤنڈ سے بڑھ کے 93,13,73 ہو گئی۔ (4) 1796-97 اور 1813-14ء کی درمیانی مدت میں صرف کلکتہ کی بندرگاہ سے ہونے والے برآمدات میں دو سو تیس فی صدی کا اور در آمدات میں تین سو تیس فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔ نجی تاجروں کا کلکتہ سے لندن کو ترسیل زر 1796-97ء میں ایس۔ آر۔ 5,07,910 سے بڑھ کر 1814,15ء میں 1,21,42,283 ہو گیا تھا۔ (5) اُن کے در آمدات میں ایسی رفتار سے اضافہ نہیں ہوا۔ 1796-97ء میں مال تجارت اور بلین کی مالیت تھی۔ ایس۔ آر۔ 50,60,53 اور 1813-14ء

(1) یہ اعلان ایٹن کی History of England upto 1500 کے اعداد کے ضمیمے سے لئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دیکھئے

Report of Select committee on East India Affairs 1830 جلد 2 صفحہ 786

(2) بلورن Oriented commera جلد 2 صفحات 51-150

(3) بلورن بحوالہ جلد 2 صفحہ 180

(4) ایضاً صفحہ 152۔

(5) 1813-14ء کے سال کے اعداد تھے۔ ایس۔ آر۔ 3,54,79,688 لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ غیر معمولی برس تھا۔ اسلئے جو اعداد

دئے گئے ہیں وہ 1814-15ء کے ہیں۔

میں تھی۔ 53,76,775 (محض مالی تجارت) (1)

حالانکہ اس بڑھتی ہوئی تجارت سے منافع زیادہ تر برطانوی اور دوسرے بدھسکی تاجر کمارہے تھے پھر بھی اُس سے ہندوستان کے تجارتی طبقے کو بھی فائدہ ہوا اور اُن کی تعداد اور دولت میں اضافہ ہو گیا۔ ہندوستانی تاجروں میں سے جنہوں نے حکومت کے مالی لین دین سے فائدہ اٹھایا اور اپنا روپیہ باغڈوں اور سیکورٹیوں میں لگا دیا انہوں نے بڑا منافع کرایا۔ جنگوں نے کبھی کو مجبور کر دیا زیادہ شرح سود پر روپیہ قرض لے اور سود کی شرح بڑھکے ۱۲ صدی ہو گئی۔ اُس کے علاوہ منہائی کی شرح و قفاؤ قفا بدلتی رہتی تھی۔

قرضوں کے تعلق سے جب حکومت کی پالیسی بدلتی تو اُس کا اثر ہندوستانی اصل کاروں پر پڑا۔ انجینیئرس کی حمایت کرنے کے لیے حکومت نے فیصلہ کیا کہ نہ صرف اصل رقم بلکہ ہندوستانی قرضوں کا سود بھی انگلستان میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرض اُن کے ہاتھوں میں آنے لگے اور اُن میں ہندوستانیوں کا حصہ کم ہونے لگا۔ پھر بھی 1801ء میں ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں ایس۔ آر۔ 1,89,45,000 کی مالیت کی دستاویزات تھیں اور یورپیوں کے پاس ایس۔ آر 6,69,20,000 کی۔ (2)

جس وقت کارنوالس نے اپنے عہدے کا جائزہ لیا اُس وقت ہندوستانی قرض قریب قریب آٹھ ملین پاؤنڈ کا تھا۔ اُس کے بعد وہ کچھ کم ہوا۔ لیکن میسور کی جنگ کی وجہ سے پھر بڑھ گیا اور 1792ء میں 9.1 ملین پاؤنڈ ہو گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ پھر کم ہو کر 9.7 ملین پاؤنڈ رہ گیا۔ لیکن ویلزلی کی توسیع پسندانہ پالیسی نے اسے پھر تیزی کے ساتھ بڑھایا۔ 1798ء میں وہ گیارہ ملین پاؤنڈ سے زیادہ تھا اور 1799ء میں تقریباً 13 ملین پاؤنڈ ہو گیا تھا۔ 1801ء تک یہ بڑھ کے 18.5 ملین ہو گیا تھا اور 30 اپریل 1804ء کو اس کی رقم تھی 27 ملین پاؤنڈ۔ (3)

قرض کی کمی زیادتی کا اثر ملک کی معاشی زندگی پر پڑا۔ پہلی بڑی کمی 1792ء میں ہوئی اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، بندوبست استمراری کا نفاذ بھی اُس وقت کیا گیا۔ اُس کے بعد اُس میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کی بناء پر یا تو نئے زمینداروں کو یہ الچ ہوئی کہ وہ زمین بیچ کر قرض میں روپیہ لگائیں جس میں زمین کے مقابلے میں زیادہ منافع تھا، یا جب قرض پر سود کی شرح کم ہو گئی تو انہوں نے قرض کا پکوتا کر کے دوبارہ روپیہ زمین میں لگایا۔ اس کارروائی نے زمین کو قابل فروخت شے بنادیا۔ یہ ایسا واقعہ تھا جو ہندوستان کی سماجی زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

بنگال میں زمینداروں کے نئے طبقے کی ابتدا

ہندوستان استمراری کے نتائج اُس کے نفاذ کے فوراً بعد کے برسوں میں ظاہر ہونے لگے۔ اٹھارہویں صدی میں ذرا معنی پیداواروں کی قیمتیں بڑھنے لگی تھیں۔ مثال کے طور پر اول درجے کے چاول

(1) 1833, Select Committee Report on East India Affairs, جلد ۱۰، صفحہ 99-1796ء کے اعداد و ارقام

کرٹیل رپورٹ 1795ء-1801ء سے لئے گئے ہیں۔

(2) 'A' Trade and finance in the Bengal Presidency، صفحہ 81

(3) 1833, Select Committee Report East India Affairs، نمبر 42، جلد صفحہ 42

کی قیمت پچاس سال میں (1728-1776) ایک من 10 سیر فی روپیہ کے بجائے سولہ سیر فی روپے ہو گئی۔
 مونے چاول کی قیمت تین من کے بجائے 32 سیر فی روپے ہو گئی تھی۔ اور کھجی کی قیمت ساڑھے دس سیر کے
 بجائے تین سیر ہو گئی تھی۔ (1)

جہاں تک بنگال کا تعلق تھا 1770ء کے قحط کی تباہ کاری کی صفائی کی جا چکی تھی۔ اور 1713ء سے
 آبادی بڑھنے لگی تھی۔ زمین اور جو تنے والے کا تناسب کسان کے خلاف جارہا تھا یہ رجحان اُس کے بعد ہمیشہ
 جاری رہا۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور بڑھتی ہوئی آبادی کی بنا پر زمین کی قیمتیں بھی بڑھتی چلی گئیں۔ لیکن
 بڑی عجیب بات یہ ہے کہ بڑھنے کے بجائے زمین کی قیمت گری۔ 1796-97ء میں زمین کی قیمت 15 سال کی
 خرید کے برابر تھی، 1796-97ء میں گھٹ کے 12 سے 13 سال تک کی فروخت کے برابر ہو گئی اور
 1797-98ء میں اُس میں اور گراوٹ آئی اور وہ ساڑھے نو سال کی خرید کے برابر رہ گئی۔ (2) اس کی وجہ یہ
 بیان کی جاتی ہے کہ مالگوار کی انتہائی اونچی شرح تشخیص نے زمین کو غیر منافع بخش بنادیا تھا۔ نئے بازوں نے
 زمینوں کو سستے داموں پر اُن پرانے زمینداروں سے خرید لیا جو سرکاری مالگوار کی ادائیگی کے قابل نہیں
 تھے اور زمینوں کو کم قیمت پر بیچنے کے لیے مجبور تھے۔

نئے خریدار بھی وقت پر حکومت کا مطالبہ ادا نہ کر سکے اور اُن کی زمین نلام ہو گئیں۔ جولوگ
 مالگوار کی وقت پر ادا نہ کر سکے اُن میں سب سے بڑے زمیندار شامل تھے۔ یعنی تادیا، راج شاهی، دیباپور
 بشنوپور اور کوسی جو راجہ کے کچھ زمیندار یوں کی خاصی قیمتیں کم ہو گئیں اور کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔
 بہت زیادہ مطالبے کے خلاف عام طور سے لوگ چیخ و پکار کرتے تھے جس کی وصولی میں بڑی سختی
 برتی جاتی تھی۔ ابتداء میں زمینداروں کے ساتھ تو ہین آ میز برتاؤ کیا جاتا تھا، انھیں حراست میں لے لیا جاتا
 تھا اور دوسرے طریقوں سے پریشان کیا جاتا تھا۔ بعد میں مالگوار کی ادائیگی کرنے کے سلسلے میں سزائے قید کا
 طریقہ ترک کر دیا گیا۔

1796-97ء میں جو زمین فروخت کی گئی اس کی مالگوار 14 لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ اُس
 کے دوسرے برس جو زمین فروخت کی گئی اُس کی مالگوار تقریباً 23 لاکھ روپے تھی۔ اس امر کا تخمینہ لگایا
 گیا ہے کہ ”بنگال کی کل زمین کا ایک تہائی سے لے کر آدھا تک حصہ فروخت میں برتی جانے والی تختیوں کے
 ساتھ بچ دیا گیا۔“ (3) پکائن نے اپنے سفر کے دوران دیکھا کہ پرانے زمینداروں کی جگہ نئے مالکان آرائشی
 لے رہے ہیں۔ جو تاجر، ایجنٹ اور سرکاری حکام کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

نئے لوگوں میں مالکان آرائشی کے ایجنٹ بہت دلچسپ لوگ تھے۔ ایک ضرورت کے نتیجے میں
 وہ ظہور میں آتے تھے۔ زمینداروں کو جب یہ محسوس ہوا کہ وہ کسانوں سے لگان آسانی کے ساتھ وصول
 نہیں کر سکتے ہیں لیکن سرکاری مطالبہ بہر حال ادا کرتا ہے اور قرضی اور نپائی کا سامنا کرتا ہوگا تو انھوں نے
 زمینداروں کو بیٹوں میں تقسیم کر دیا اور انھیں ان لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جنہیں مالک کی تعین کردہ

(1) Select Committee of the House of Commons, 1782-83 (1) دیکھئے بی۔ بی۔ متر۔

Middle Classes صفحہ 93۔

(2) گورنر جنرل بہ اصلاح کو نسل کا مکتوب کورٹ (مالگوار) کے نام 23، ستمبر 1798ء۔

(3) Bengal Ms records تصنف

مالگوار ادا کرنی تھی۔ بپے داروں نے انھیں اور چھوٹے چھوٹے کلڈوں میں تقسیم کیا اور کلڈے درپے داروں کے ہاتھوں فروخت کر دیے۔ درپے داروں کے تحت اور ذیلی ایجنٹ تھے۔

اس طرح سے درمیانی لوگوں کا ایک جوا طبقہ وجود میں آ گیا جو کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ اسلئے کہ یہ فروخت کا کام صرف کلکتہ میں کیا جاتا تھا اور بغیر کسی اطلاع کے اور سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ کیا جاتا تھا۔

زمیندار یوں کے کلڈے ہو چکے تھے اور 1872ء تک ان کی تعداد 1,54,200 ہو گئی تھی (1) زمینداروں میں بہت کم تعداد ایسے دولت مند لوگوں کی تھی جن کے پاس 20,000 ایکڑ سے زیادہ زمین تھی۔ تقریباً 10 فی صدی زمیندار باثبات تھے۔ لیکن تقریباً 90 فی صدی چھوٹے چھوٹے مالکان تھے۔

جوابات انھیں عہد و سلی کے زمینداروں سے غیر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ انھیں زمیندار یوں میں محض معاشی دلچسپی تھی۔ مالکوں کو ان زمینوں پر مطلق حقوق حاصل تھے۔ جو ان کے قبضے میں تھیں۔ انہوں نے کسانوں کے قریب قریب تمام حقوق ختم کر دیئے تھے اور انھیں اختیار حاصل تھا کہ عدالت میں چارہ جوئی کیے بغیر لگان وصول کر سکیں۔ ان میں سے بہت سے عائب باش مالکان آراضی تھے جو گاؤں میں اپنے اور گاؤں والوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے کے بجائے کلکتہ کے محلوں میں آرام و آسائش کی زندگی گزارتے تھے اپنے منافعوں سے زراعت کو ترقی دینے کے بجائے وہ انھیں تجارت اور لین دین کے کاروبار میں لگاتے تھے۔ وہ انگریزوں کے رہن بہن کی نقل کرنے لگے اور انگریزی تعلیم کے حامی ہو گئے۔ جس کی وجہ سے ان کے بیٹوں اور عزیزوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھل گئے تھے اور انگریز حکام اور تاجروں سے تعلقات بڑھانے میں آسانی پیدا ہو گئی تھیں۔ ہڈانے رسم درواج سے انھوں نے بالکل منہ موڑ لیا۔ سماج میں حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ حیثیت کی جگہ معاہدے رہا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ زمیندار اپنی دولت صنعتیں قائم کرنے کے لیے استعمال کرتے۔ لیکن کاروباری جذبے کی کمی ایک انجانے کام میں روپیہ لگا کر اسے خطرے میں ڈالنے کے خیال اور انگریز حکمرانوں کی پالیسیوں کی بنا پر (2) جو اس میں مانع آتی تھیں۔ ان میں سے کوئی صنعت کاروں کا طبقہ وجود میں نہ آ سکا۔

بنگال کے صوبے میں متوسط طبقے کا سب سے بڑا حصہ تھا وہاں کے زمیندار۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب رفہر فتنہ مالگوار ی کا پھلنے والا دباؤ کم ہوا تو ان کی فاضل آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ گاؤں کی پیداوار کی قیمت مسلسل بڑھتی رہی، آبادی میں اضافہ ہوتا رہا، اور زمین کی قیمت چڑھتی رہی۔ بندوبست استعماری، جو ابتدا میں انتشار پھیلانے والا اقدام تھا، اس کے بعد استحکام کا سبب بن گیا۔

بد قسمتی سے کسانوں کے لیے اس کے نتائج خراب ثابت ہوئے اور ان کی معاشی حالت بری طرح خراب ہو گئی۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی تادمی پالیسی اور انگلستان میں ایسی سرمایہ دارانہ

(1) شرابی۔ پی۔ محولہ بالا صفحہ 131۔

(2) ان میں سے سب سے اہم تھی۔ مالیاتی پالیسی۔ سب سے پہلے بری تجارت کے راہداروں حمل نہ صرف فی صنعتوں کی نشوونما میں مانع آئے بلکہ موجودہ صنعتوں پر بھی بھاری ضرب لگائی 1848ء کے بعد جب انگلستان نے آزاد تجارت کا طریقہ اختیار کیا تو ہندوستان کو بھی تجارت میں مدد ملت نہ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ حالانکہ اس وقت انگلستان ایک ترقی یافتہ ملک تھا۔ اور ہندوستان غیر ترقی یافتہ ملک۔ اس قسم کی ملک دشمن اور ناقابل پالیسی کے تحت صنعت ترقی نہیں کر سکتی تھی۔

صنعتوں کی نشوونما نے جن میں مشینوں کا استعمال ہوتا تھا دست کاروں اور صناعتوں اور خصوصیت کے ساتھ سوت کاٹنے والوں اور بنکاروں کی ایک بڑی تعداد کو بے روزگار بنادیا۔ اُن کی وجہ سے زمین پر بوجھ بڑھ گیا اور کھیت مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں متوسط طبقہ

1813ء تک ہندوستان کے خاص خاص خُدد خال نمایاں ہو چکے تھے۔ سماجی منظر پر جو چیز نمایاں تھی وہ تھی بد سیوں کی ایک چھوٹی سی ادلی گار کی جو بلا شرکت غیرے طاقت، دولت، اور وقار کی مالک تھی اور حکومت کے تمام فرائض ادا کرتی تھی۔ لیکن اس بات کو ناپسند کرتی تھی کہ ملک کے باشندے طاقت یا ذمہ داری میں شریک کیے جائیں۔ حکمران ادلی گار کی سستی، طاقت اور استحکام کا انحصار برطانوی لوگوں کی طاقت اور ہمت پر اور ہندوستان کے لوگوں کے عدم اتحاد اور سستی پر تھا۔ انگلستان میں اُن کی حیثیت کچھ سہی لیکن ہندوستان میں انگریز ایک ایسا طبقہ اشرافیہ تھے۔ جو دوسروں سے الگ تھلگ رہتے تھے، امن و امان بحال رکھنے میں مستعدی سے کام لیتے تھے، لیکن فطری طور سے اپنی رعایا کے مفادات کو ترقی دینے کے بجائے اپنے ملک کے مفادات کو ترقی دینے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ ہندوستانی سماج اُن تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے لاکھوں انسانوں پر مشتمل تھا جو ہندوستان کے گاؤں میں رہتے تھے۔ اُن کا معیار زندگی حد درجہ نچلا تھا اور اُن کی زندگی کی غمناک حقیقتیں تھیں غربت، بیماری، جہالت اور توہم پرستی۔ برطانوی حکومت میں اُن کی تعداد میں اضافہ ہوا لیکن اُن کی معاشی حالت خراب تر ہو گئی۔

بدلی حکمرانوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان تھا متوسط طبقہ جو مشتمل تھا زمیندار شرفاء، تاجروں اور پیشہ دارانہ گروہوں پر۔ حالانکہ شروع میں وہ ایک منظم گروہ نہیں تھے۔ پھر بھی زمیندار شرفاء دانشوروں یعنی آزاد پیشہ اختیار کرنے والوں اور سرکاری ملازموں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ بہت سے زمیندار بھی تجارت کرتے تھے۔ اس معنی کردہ متوسط طبقہ تھے کہ حکمران ادلی گار کی اور ہندوستانی عوام کے درمیان اُن کی جگہ تھی۔ اس حد تک وہ ایک نیا طبقہ تھے کہ وہ تختی کے ساتھ باقاعدہ ذاتوں میں بنے ہوئے نہیں تھے۔ حالانکہ اُن میں قدیم بالائی طبقے کو غلبہ حاصل تھا۔ اُن میں حرکت تھی۔ جس کی بناء پر پیشہ اور کام بدل سکتے تھے۔ شروع میں اُن کی تعداد کم تھی۔ لیکن وہ بڑھتے اور یکجا ہوتے گئے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف گروہوں اور فی الجملہ اس طبقے کی طاقت یکساں نہیں تھی۔ لیکن سماج پر اُن کا اثر ان کی تعداد کے تناسب سے زیادہ تھا۔ اس طبقے کے آگواہ تھے۔ تعلیم یافتہ لوگ۔

VII نئے متوسطہ طبقے کا نمو (1813ء تا 1833ء)

1813ء اور 1833ء کے چار ٹریڈنگ کمپنیوں کی بنا پر نجی تاجروں نے کمپنی کی اجارہ داری پر فتح حاصل کر لی۔ پہلے ایکٹ کی رو سے کبھی ہندوستانی تجارت سے محروم ہو گئی۔ اور دوسرے ایکٹ کی رو سے اُس کی تمام تجارتی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔

اس دوران ہندوستان کی بدلتی تجارت کی نوعیت بالکل بدل گئی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس کے دروازے سب کے لیے کھل جانے کی وجہ سے اس کا حجم اور مالیت بہت بڑھ گئی تھی۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ سوئی کپڑے اور ریشم کی مصنوعات برآمد کرنے کی بجائے اب ہندوستان خام مال اور زرعی پیداواریں برآمد کرنے لگا۔ ”1799-1800ء میں ہندوستان نے 6,587 من کپاس برآمد کی تھی۔ لیکن 1829-30ء میں اس کی مقدار بڑھ کر 1,34,933 من ہو گئی اس طرح 1799-1800ء میں 35,509 من نیل باہر بیجا گیا تھا۔ لیکن 1829-30ء میں یہ مقدار بڑھ کر 1,35,399 ہوئی اسی کے ساتھ ہندوستان میں کپڑے کی درآمد جو 1815ء میں 18,308 گز تھی۔ 1831ء میں بڑھ کر 52,19,844 گز ہو گئی۔ تجارت کی ساخت میں جب تبدیلی ہوئی تو ہندوستانی بچوں کے کاموں میں بھی تبدیلی ہوئی انھوں نے بدلتی تجارت میں اپنا حصہ کھودیا جو پوری کی پوری یورپیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

اس قسم کی دشواریوں کا سامنا ہندوستانی بینک کاروں کو بھی کرنا پڑا۔ یورپین بینکوں نے جو داخلی تجارت میں روپیہ لگانے کے غرض سے قائم کیے گئے تھے، (1)

اُس نے مخصوص میدان تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھنے سے انکار کر دیا۔ اپنے منافع بڑھانے کی غرض سے انھوں نے داخلی تجارت میں روپیہ لگانے کے ساتھ ترسیل زر کے میدان میں مقامی بینک کاروں کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ شروع میں اُن کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں اور 1791ء میں کارنواس اور اُس کے بورڈ نے مقامی اور اُن کی موجودگی میں یورپین بینکوں کی افلاطیت پر شبہ ظاہر کیا۔ (2) لیکن دونوں میں مقابلہ برابری کا نہیں تھا۔ یورپین بینکوں کو ریاست کی سرپرستی حاصل تھی اور اُن کے پاس سرمایہ بھی بہت زیادہ تھا۔ بحران کی صورت میں حکومت اُن کی مدد کرتی تھی۔ مثال کے طور پر 1791ء میں جب بینک کاری کے کاروبار کی عام ناکامی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا حکومت نے انھیں قرض دیئے۔ اب انھیں بدلتی تاجروں کی سرپرستی بھی حاصل ہونے لگی تھی جو ہندوستانی بینک کاروں کے بجائے اُن کے ساتھ کاروبار کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1813ء تک یورپین بینک نہ صرف بدلتی تجارت میں پوری طرح جم گئے تھے بلکہ داخلی تجارت میں روپیہ لگا کر ترسیل زر کر کے اور سرکاری قرضوں کی حمایت کر کے اپنی تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ کرنے لگے۔ اس دوران ہندوستانی بینک کاروں کی سرگرمیاں کم ہوتی گئیں۔ کرنسی کی اصلاح نے ہندوستانی بینک کاروں پر آخری ضرب لگائی۔ 1815ء میں کمپنی نے چاندی کا روپیہ بتانا شروع کیا اور 1835ء تک یہ معیاری سکہ تمام برطانوی مقبوضات میں رائج ہو گیا۔ مبادلہ زر، نجی ٹکسوں اور مختلف

(1) بنگال بینک کا قیام 1784ء میں عمل میں آیا۔ اور تزل بینک نے 1781ء میں کاروبار شروع کیا۔

(2) سنہ 1840ء کا سال 134

قسم کے سکنوں پر بنائے گئے کے دون ختم ہو گئے اور صرافوں کے ہاتھوں سے یہ کام نکل گئے۔ کچھ برس پہلے تک ہندوستانی بینک کارکنوں کے قرضوں میں روپیہ لگا کر منافع کھاتے تھے۔ مثال کے طور پر 1790-91ء کی جنگ میسور اور 3-1802ء کی جنگ مرہٹہ کے دوران انھوں نے سرکاری کانٹہ خریدے تھے۔ اور کمپنی کے سب سے بڑے لین دین بن گئے تھے۔ لیکن 1813ء کے بعد اگرچہ 16-1815ء اور 29-1828ء کی درمیانی مدت میں اگرچہ 17-18 ملین پاؤنڈ کا اضافہ ہوا مگر اس میں ہندوستانیوں کا حصہ بہت کم ہو گیا۔

ان جدید بیسوں کا مضمر اثر تجارتی اور مالیاتی طبقوں پر پڑا۔ ان میں کچھ نے مجبوراً زرعی پیداواروں کی تجارت شروع کر دی اور دوسرے گاؤں میں لین دین کا کاروبار کرنے لگے۔ لیکن کچھ نے برطانوی مقبوضات کے باہر کے ہندوستانی علاقوں میں تجارت و صنعت شروع کر کے یا زمینات میں اپنا روپیہ لگا کے خود کو بچالیا۔ (1)

تجارت میں نئے نئے مواقع سامنے آنے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تجارت کی آزادی کے ساتھ اس کا حجم بڑھ گیا تھا۔ مثال کے طور پر صرف کلکتہ کے درآمدات 14-1813ء میں ایک کروڑ پچیس لاکھ معیاری روپے کے تھے 29-1828ء میں بڑھ کر 3 کروڑ معیاری روپے کے بقدر ہو گئے۔ سوئی کپڑے کے درآمدات 14-1814ء میں 1,09,480 پاؤنڈ کے بقدر تھے 28-1828ء میں 16,21,650 پاؤنڈ ہو گئے۔

اس کے علاوہ اور اشیاء بھی درآمد کی جاتی تھیں۔ مثلاً بیر اور شیشاں، لوہے کی سلاخیں اور بولٹ، مٹی کے برتن، شیشے، چمڑا، گھوڑے کا سارا، مشینیں، لوہے کے برتن، بھڑی، کانٹے، دوائیں، جست کے برتن، ہندو قیس اور پستول۔ (2)

حالانکہ درآمد کی تحریک تجارت پر یورپیوں کی اجارہ داری تھی لیکن اندرون ملک ان اشیاء کی تقسیم کا کام زیادہ تر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ بدیہی تجارت سے ان کی بے دخلی کی اس سے کچھ تخفیف ہو گئی اور پریسڈنسی ملاؤں کے تاجروں اور اندرون ملک کے کاروباری طبقے کو اس سے فائدہ ہوا۔

کچھ شعبوں میں ہونے والے نقصانات کے باوجود وہ طبقہ مجموعی اعتبار سے خوش حال تھا جو تجارت اور کاروبار کر رہا تھا۔

زمین رکھنے والا متوسط طبقہ بھی اس دوران بڑھتا رہا۔ مالگوار کی کے ناقابل برداشت بوجھ کی بنا پر زمینداروں کا پرانا طبقہ بے دخل کیا جا چکا تھا اور ان کی جگہ تاجروں، سرکاری ملازمین، پانیانوں اور گماشتوں نے لے لی تھی۔ یہ لوگ شہری تھے اور ان کے مفادات اور نقطہ نظر بھی شہری تھے۔ ان کے لیے زمین ایک پیسے کے بجائے منافع حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ خوش قسمتی سے جلد زرعی حالات بہتر ہونے لگے۔ 1820ء کے گنگ جھگ زمین کی قیمت بڑھنے لگی اور 1821ء کے ضابطوں نے صورت حال کو اور بہتر بنا دیا۔ مالگوار کی ادا کرنے کی صورتوں میں زمین کی فروخت کا زواج کم ہونے لگا۔ لیکن لگان داریوں میں بھی اضافہ ہو گیا جن کی وجہ سے پچھلیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی جو خود بھی نئے زمینداروں کی طرح شہر کے رہنے والے تھے۔

لاخراج (لگان معاف) زمینات پر دوبارہ قبضہ ہو جانے اور شہری خریداروں کے قبضے میں

(1) ہذا آر۔ ایم، سلسلہ کمپنی کے سامنے شہادت، پلاس آف کانٹر Outter Territories Report from Select

Committee، صفحات 32۔

(2) سلسلہ کمپنی (1833ء)، شہادت، جلد دوم، مسٹر رافورڈ کی شہادت صفحہ 511۔

آجائے کی بنا پر، جو بہت سے عالموں اور مذہبی رہنماؤں کی گذر بسر کا ذریعہ تھیں، زمین رکھنے والے طبقے کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ حالانکہ اس سے اُن لوگوں کو بڑی تکلیف اور دکھوں میں مبتلا کر دیا جو مذہب اور علم کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس کا مضراثر دواجی تعلیم اور اخلاق پر پڑا۔

بنگال کے دیہی علاقے میں جو تبدیلی ہوئی وہ اُس تک محدود نہیں رہی۔ اڑیسہ کے پڑوسی صوبے پر بھی اسی کا اثر پڑا جو اس وقت بنگال کا حصہ تھا۔ اڑیسہ میں زمین کلکتہ کے تاجروں نے خرید لیں، اور صوبے کے زیر کاشت علاقے کا بڑا حصہ غیر حاضر ذمہ داروں کے ہاتھ آ گیا جن کو محض اُن سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے سے دلچسپی تھی۔“ (1)

چنانچہ زرعی سماج کی ساخت میں بڑی تبدیلی ہو رہی تھی، فرین آف انڈیا نے 1839ء میں اسکے متعلق لکھا تھا ”دیہی کلکٹر نے صرف علاقے کا مالک بن بیٹھا، بلکہ بار بار اس کو تبدیل کیا گیا ہے، یہاں تک کہ دیہاتی آبادی کے بالائی اور زیریں طبقوں کا ہر رشتہ اگر ٹوٹا نہیں ہو تو ذلیلہ ڈھالا ضرور ہو گیا ہے۔ چھوٹا مالک آراخی اپنے حقوق باپنی بے وقوفی اور اپنی حساس ازادی کے ساتھ اب صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ اب صرف بڑے زمیندار اور عظیم غلام کسان باقی رہ گئے ہیں۔“ (2)

مدرسہ اور بمبئی میں دیہاتی سرمایہ داروں کی ابتداء

رعیت داری دہست کے مضبوط نظام کی بنا پر مدرسہ اور بمبئی کی پریسیڈنسی میں زمینداروں کا طبقہ وجود میں نہیں آ سکا لیکن ان علاقوں میں بچوں کا ایک نیا طبقہ ظاہر ہوا۔ یہاں بندوبستوں میں زمین کو چھوٹے چھوٹے کسانوں میں بانٹ دیا گیا تھا جو اُسے سدھانے کے لیے وسائل اور موسمی حالات کی بنا پر نمودار ہونے والے حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ضرورت کے وقت قرض دینے والوں کی موجودگی تا کر یہ تھی۔ اور بمبئی کے دکن کے اضلاع کے گاؤں میں قرض دینے والا مارواڑی آ گیا۔ مدرسہ میں اس ضرورت کو قرض دینے والے برہمنوں نے پورا کیا۔

چنانچہ دیہاتی سرمایہ داروں کا ایک طبقہ وجود میں آ گیا۔ جو زمینداروں، مالکان اراضی اور لین دین کا کاروبار کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ وہ کسانوں کی ضرورتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس طبقے نے انگریزی تعلیم کی مانگ کو بڑھایا۔ جس کی وجہ سے منافع بخش روزگار کے راستے کھل جاتے تھے۔ ایلن برڈ نے کہا تھا۔ انگریزی کے معنی ہیں روپیہ۔

(1) فیس لیٹن 1867ء، بنگال، بہار اور اڑیسہ کے متعلق رپورٹ جی آر اف 44۔

(2) مای فرینڈ آف انڈیا، 17، جنوری 1824ء، صفحہ 34۔

VIII 1833ء کا چارٹر ایکٹ اور متوسطہ طبقے کا فروغ

1833ء کے چارٹر ایکٹ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کی کاروباری سرگرمیاں ختم کر دی گئیں۔ ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کا انتظام کرنے کے لیے اب اُسے برطانوی تاج کا ایجنٹ بنادیا گیا۔ لیکن اس تبدیلی کا نہ انتظام کی نوعیت پر کوئی اثر پڑا اور نہ ہندوستانی سماج کی ساخت پر۔ تبدیلی کے رجحانات تو وہی رہے۔ لیکن اُن کی رفتار بڑھ گئی۔ سماجی تبدیلی کی بنیاد 1833ء تک مستحکم ہو چکی تھی۔ لیکن بڑھتی ہوئی تجارت اور باغات، ریلوں اور دوسرے ہندوستانی کاموں میں برطانوی سرمائے کی اصل کامیابی کے نتیجے میں اور روز وسیع تر ہوتے ہوئے علم و فنس کے مطالعوں نے اُسے اور ترقی دی۔

اُن برسوں میں ہندوستان کی بدیسی تجارت میں بڑا اضافہ ہو گیا۔ ہندوستان نے انگلستان کو ہونے والے برآمدات کی مالیت جو 1840ء میں 12.60 ملین پاؤنڈ تھی۔ 1860ء میں بڑھ کے 27.96 ملین پاؤنڈ ہو گئی اور انگلستان سے ہندوستان میں ہونے والے درآمدات کی مالیت اسی مدت میں 5.832 ملین پاؤنڈ سے بڑھ کے 24.28 ملین پاؤنڈ ہو گئی۔ ہندوستان سے ہونے والے برآمدات میں کپاس کی مالیت تھی۔ 5.64 ملین یعنی کل برآمدات کا چوتھا حصہ، انیم 9.05 ملین یا تیسرا حصہ اور غلہ 3.59 ملین یا تقریباً آٹھواں حصہ۔ اس تجارت میں ہندوستانیوں کا راست حصہ کم ضرور تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اُسے نظر انداز کیا جاسکے۔ پچھ ہندوستانی از خود یا یورپی برآمد کنندگان کے ذیلی ایجنٹوں کی مشیت سے زرعی پیداوار برآمد کرتے تھے۔ اس تجارت کا اہم حصہ بھی انیم جس میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ 7 دسمبر 1846ء سے 12 جولائی 1847ء تک کے مندرجہ ذیل اعداد اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

5,715	یورپیوں اور امریکیوں نے
5,150	بنگالیوں نے لیکن غالباً یورپیوں کے لیے بنگال
1,505	بنگالیوں نے غالباً اپنے حساب میں
7.94	مارواڑیوں، مغلوں اور پارسیوں نے
	یہودیوں نے انیم کی پینیاں خریدیں۔

2,175

کل تعداد 21,639

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارواڑیوں، مغلوں، اور پارسیوں کے ہاتھوں میں تقریباً کل ایک تہائی تجارت تھی۔ مارواڑیوں، مغلوں اور پارسیوں نے بعد اس تجارت میں بنگالیوں کا نمبر تھا۔ (1) برطانوی مال کے بڑھتے ہوئے درآمدات نے تقسیم کے ذرائع کو ضروری بنادیا تھا۔ پریڈنسی مشین اور بڑی بڑی پھاونوں میں، جہاں یورپین خریدار پائے جاتے تھے۔ انگریزی مال کا اسٹاک رکھنے والے زیادہ تر یورپین تھے۔ ہمیشی میں پارسیوں اور گجراتیوں نے اور کلات میں پارسیوں اور بنگالیوں نے اس تجارت میں

تھوڑا بہت حصہ پایا تھا۔ لیکن اندرون ملک مالی تجارت کی تقسیم کا کام ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اُن ہندوستانی تاجروں کی سماجی حیثیت جلد بڑھ گئی۔ جنہوں نے اس نئے کاروبار میں روپیہ لگایا تھا اور ایم۔ برڈ نے شمال مغربی صوبجات کے کاروباری طبقے کی دولت کی تصدیق مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

(1) شمال مغربی صوبجات کے حصوں میں ہندوستانیوں نے پندرہ سو سالہ جمع کر لیا ہے۔ وہ کئی اشیاء کا ذخائر تھے ہیں۔ سرزاپور اپنی دولت کے لیے بدنام ہے۔ اور اسی طرح بنارس بھی بدنام ہے۔ جہاں تک آگرے کا تعلق ہے۔ میں نے دولت کی اس سے بڑی علامت اور شہر کی خوشحالی کہیں نہیں دیکھی۔ جیسی آگرے میں نظر آئی۔ لیکن کہیں بھی وہ لوگ اپنی دولت کا کوئی حصہ مصنوعات کے لیے استعمال نہیں کرتے ہیں۔“ مزید سوال کے جواب میں مسٹر برڈ نے بنارس کے موتی رام کے خاندان اور لکھنؤ کے شاہوں کا ذکر کیا جن میں سے ہر ایک کے پاس چالیس لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ ہیں۔ (1)

ہندوستانیوں نے یورپین تہذیبی کمپنیوں اور بینکوں میں بھی تھوڑا سا حصہ کر لیا۔ مثال کے طور پر مسٹر لانگرویل کلارک کے ساتھ دو لاکھ پانچ سو روپے بھی یونین بینک کا ڈائریکٹر بن گیا تھا۔ اسی طرح کلکتہ کے یورپین اور ہندوستانی تاجروں نے 1840ء میں ایسٹ انڈیانوی کیسین کمپنی لندن کے صدر مسٹر۔ ٹی۔ اے۔ کورس کو دعوت دی تھی کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان سمندری سفر کی خاطر ہندوستان میں ایک جہاز کمپنی بنائیں۔“ (2)

1833ء تک انگلستان صنعتی اعتبار سے دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بن چکا تھا۔ صنعتی انقلاب جو دوسرے ملکوں سے پہلے انگلستان میں آیا تھا، پچھلے لین کے خلاف جنگوں میں اُس کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ تھی۔ اس نے پوری دنیا میں سلطنت کو پھیلانے کے لیے عوامل پیدا کر دیے تھے۔ اور انگلستان کو اتنا دولت مند بنادیا تھا کہ وہ تمام تر اعظموں میں اپنا سرمایہ لگا سکتا تھا۔ مصنوعات اور سرمائے کی برآمد کا دور شروع ہو چکا تھا

یورپیوں کی صنعتی سرگرمیوں کی نمو

اٹھارہویں صدی کے آخری ربع میں برطانوی سرمایہ ہندوستان کے مصنوعات کی صنعت میں داخل ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر جب انگلستان اور یورپ کی دوسری صنعتیوں میں نیل کی مانگ بڑھی تو 1779ء میں اُس کی پیداوار برطانوی سرمائے سے شروع کی گئی۔ 1780ء اور 1802ء کی درمیانی مدت میں کمپنی نے نیل کی خرید و بڑی بڑی رقمیں خرچ کیں اور اس کا کھ پاؤنڈ بیسگی ادا کر دیے۔“ (3) اس کے بعد سوئی پڑانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ کچھ عرصہ بعد ختم کر دی گئی (4) اس کے بعد یورپین مشینوں اور یورپین

(1) Fourth Report from the Select Committee on Indian Territory, 1853, صفحات 42-43

(2) دی انکوائری، اینڈ پلری کرٹ 27 رائلٹ 1840ء

(3) انون فونڈر۔ Detachment of Overseas Empire, صفحہ 294

(4) انون فونڈر، انکوائری، 27 رائلٹ 1840ء Report of a Committee, 1854, صفحہ 265, 266

ٹیکٹک کی مدد سے بنگال میں چھپائی اور لکھنے کا کاغذ بنانے کی بھی کوشش کی گئی۔ (1)

لیکن 1833ء تک منصوبہ بند طریقہ سے اصل کاری کی گئی نہ اس کی سرگرمی کی سمت کا تھیں کیا جا رہا۔ 1833ء میں چارٹرڈ کی تجدید کے وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات کے متعلق تفتیش کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کی جو سلیکٹ کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے سامنے جو شہادتیں پیش کی گئیں جن میں انگلستان کی تجارتی اور صنعتی انجمنوں کی شہادتیں شامل تھیں۔ اُن سے ہندوستان میں سرمایہ لگانے اور یورپوں کی بستیاں بنانے کی خواہش ظاہر ہوئی۔ کہا گیا تھا کہ مالی فائدہ کے علاوہ اصل کاری اور یورپیوں کی آبادی کی وجہ سے ہندوستان پر انگلستان کی معاشی اور سیاسی گرفت مضبوط تر ہو جائے گی۔ (2)

اب قومی پالیسی کی صراحت کی جا چکی تھی۔ ہندوستان کو ایسی شکل دینی تھی کہ وہ برطانوی سلطنت کی نوآبادی بن سکے اُس کے سپرد برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال پیدا کرنے اور برطانویوں کی پیدا کردہ اشیاء صرف کی کھپت کرنے کا کام کیا گیا۔

اُن مصنوعات کے لیے برطانوی سرمائے کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا جو برطانوی مصنوعات سے مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اور اس لیے طے کیا گیا کہ سرمایہ باغات (نیل۔ چائے۔ کافی، بریلوے جہاز رانی کمپنیوں، بنکوں اور بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں میں لگایا جائے۔

کمپنی نے اس پالیسی کے عمل درآمد میں مدد دی۔ یورپوں کو زمین حاصل کرنے اور اُس پر قابض رہنے، مزدور بھرتی کرنے اور باغات کو ترقی دینے کے لیے ہر قسم کی سہولیت مہیا کی گئی۔ ڈاکٹر والک نے 1822ء میں کافی کے باغدار کی حیثیت سے دوسروں کی رہنمائی کی اور 1824ء میں کافی کے یورپین باغداروں کو اپنے نام سے زمین پر قابض ہونے کا حق دیدیا گیا۔ (3)

دوسرا بڑا ہوتا ہوا کاروبار تھا چائے کا۔ برطانیہ کو چین سے جب چائے کی درآمد غیر یقینی ہو گئی تو انگریزوں نے ہندوستان میں چائے کی کاشت کے امکانات پر غور کرنا شروع کیا۔

ڈاکٹر والک نے 1832ء ہی میں کہا تھا۔ ”مگر ہم سامنے آنے والے تمام حالات پر غور کریں تو ہم یقینی اس قسم کی امید کر سکتے ہیں کہ اچھا انتظام کرنے کی صورت میں عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں جلد ہی چائے کے پودے کی کاشت وسیع پیمانے پر کی جاسکتی ہے اور ہمیں متمدن زندگی کے سب سے بڑے آرام و آسائش کے لیے ایک مطلق العنان قوم کی مرضی اور مکون مزاجی پر انحصار نہیں کرنا پڑے گا۔“ (4) 1834ء میں کورٹ نے ایک کمیٹی کے تقرر کی اجازت دیدی تاکہ وہ غور و خوض کے بعد ہندوستان میں چائے کی کاشت کو رواج دینے کے لیے منصوبہ تیار کرے۔ 1838ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان

(1): ڈاکٹر والک ایضاً

(2) سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش کی جانے والی شہادت، جلد دوم، حصہ اول مزید دیکھئے صفحہ 8 برائے چارلس۔ کان کی روداد مورخہ 19 فروری 1829ء اور لیمٹڈ کمپنی کی روداد 30 مئی 1829ء۔

(3) حکومت بنگال تقریر، 7 مئی 1824ء مزید ڈاکٹر والک کا خط سینٹ جارج کے نام Report (1833) Select Committee، تہذیب 2 صفحہ 665۔

(4) ڈاکٹر والک کی رائے مورخ لندن 3، فروری 1832ء جو ہندوستان کے پہلوؤں پر تجارتی مقاصد سے چائے کے پودے کی کاشت کے امکانات کے متعلق پورڈاکٹر والک اور جیمز انڈین افیئرز کے صدر عزت مآب چارلس مرگٹ کی فرمائش پر مضبوط تحریر میں آئی ہے۔

کی چائے بازار میں آئی۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی تیزی کے ساتھ کی گئی۔ 1850ء میں 1876ء ایکڑ میں چائے کے باغات تھے جن کی سالانہ پیداوار 2,16,000 پاؤنڈ تھی۔ 1859ء میں یہ اعداد بڑھ کے بائیس 7,599 ایکڑ اور 2,05,689 پاؤنڈ ہو گئے تھے۔ صنعت میں تیزی کے ساتھ ہونے والی ترقی کی بنا پر آسام میں زمین کے لیے باغداروں میں مقابلہ بڑھ گیا اور زمین کی قیمت میں اضافہ ہو گیا۔

ایک اور چیز کپاس تھی۔ جس کی ہندوستان میں کاشت کی بڑی بہت افزائی کی گئی۔ لیکن کپاس کی کاشت میں نجی برطانوی سرمائے نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس کی کاشت میں اضافہ کرنے کی ذمہ داری کبھی پر ڈال دی گئی۔ اس لیے کہ کپاس کی کاشت کی بہت افزائی برطانیہ کے اس منصوبے میں پوری طرح آتی تھی کہ ہندوستان میں نو آبادیاتی معیشت قائم کی جائے۔ 1829ء میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کی توجہ ”خصوصیت کے ساتھ اس موضوع کی طرف مبذول کرائی گئی۔ (ہندوستان میں پیدا ہونے والی کپاس کو بہتر بنانے کی طرف) اور اس طرف بھی کہ برطانیہ عظمیٰ کو اُس خام مال کے لیے، جس پر اُس کی سب سے بیش قیمت مصنوعات کا انحصار ہے، بدیہی ملکوں سے آزلا کرانے کے لیے ہندوستان کی طرف دیکھا جائے۔“ (1)

لیکن اس میں شک نہیں کہ کپاس کی کاشت میں اضافہ ہو جانے سے انگلستان اور ہندوستان دونوں کو فائدہ ہو جیسا کہ بمبئی کے گورنر سر جان مالکم نے کہا تھا ”ہمارے کچھ بہترین اضلاع کی خاص پیداوار ہے کپاس۔ ہمیں اپنے مقبوضات کے زرعی وسائل میں اضافہ کرنے اور اُسکے نتیجے میں سرکاری آمدنی بڑھانے کے لیے اس کو ترقی دینے پر خصوصی طور سے غور کرنا چاہیے۔“ (2) کپاس کی کاشت کی ریاستی بہت افزائی کی پالیسی پر عمل ہندوستان میں کبھی کی حکومت کی بقیہ مدت میں ہو تا رہا بلکہ اُس کے بعد بھی جاری رہا۔ 1862ء کی امریکہ کی خانہ جنگی نے، جس کی وجہ سے اُس ملک سے انگلستان آنے والی کپاس کی دور آمد ختم ہو گئی اس پالیسی کو اور تقویت دی۔ جنگ کے دوران ہندوستان سے کپاس کے برآمدات بڑھ گئے اور اُن کی وجہ سے کچھ دن کے لیے غیر متوقع طور پر کپاس پیدا کرنے والے علاقے کے کسان خوش حال ہو گئے۔

اندرون ملک کپاس کی پیداوار اور اس کی خرید و فروش ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں رہی۔ اس کی وجہ سے بچوں کا ایک ایسا کردہ وجود میں آ گیا جو خصوصیت کے ساتھ بمبئی پریسڈنسی کے وکن کے اضلاع میں صوبجات متوسط میں اور برار میں کپاس کی کاشت اور تجارت میں روپیہ لگاتے تھے۔ وہ لوگ بھی جن کے پاس سرمایہ کم تھا کپاس کا کاروبار کرنے لگے اور اُس کی کاشت اور تجارت دونوں سے بہت دولت کمائی۔

اٹھارہویں صدی کے آخر سے بنگال میں ریشم کی صنعت کا زوال شروع ہو گیا۔ لیکن اٹلی کے کچھ باشندوں اور خاص طور سے مسرتو کی کوششوں سے پچھلی صدی کی تیسری دہائی کے دوران بمبئی وکن میں کامیابی کے ساتھ ریشم کی پیداوار کو ترقی دی گئی ایک دفعہ پھر سرمائے کے دیسی لوگ ”اُس کی طرف کھینچے۔ داس تجارت کی حمایت کرنے کے لیے آگے بڑھے جس کے متعلق فن کا خیال تھا کہ اس میں کامیابی ہو گی۔“ (3)

کپاس، نخل، انجم، چائے، اور کافی کی کاشت بڑھی تو زمینداروں اور چمورے تاجروں کو بھی فائدہ ہوا۔ یہ وجہ تھی کہ ہندوستان کی رائے عامہ کے روشن خیال رہنماؤں مثلاً رام موہن رائے اور دارا کا تھ

(1) بمبئی کورٹ آف ڈائریکٹرز کا سر ایڈ مورڈ 18، فروری 1829ء۔

(2) بمبئی پریسڈنسی کے اس کے انتظام پر عام راول مورڈ 30، نومبر 1830ء۔

(3) ایضاً جگراف 198۔

ٹیکور نے بھی اس کی حمایت کی۔ ٹیکور نے کہا ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ نیل کی کاشت اور یورپوں کے قیام سے عام ہندوستانیوں کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ زمیندار دولت مند اور خوش خیال ہو گئے ہیں اور کسانوں کے ملاوی حالات میں سدھار آیا ہے اور انھیں اتنی سہولتیں حاصل ہو گئی ہے جتنی میرے عام ہم وطنوں کو ان علاقوں میں نصیب نہیں جہاں نیل کی کاشت اور تیاری کا کام نہیں کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ (1)“ اس طرح رام موہن رائے نے تصدیق کی کہ بنگال کے سفر کے دوران انھوں نے دیکھا کہ ”نیل کی کوشیوں کے آس پاس رہنے والے دیسی لوگ ان لوگوں کے مقابلے میں جو وہاں سے دور رہتے ہیں۔ زیادہ بہتر کپڑے پہنتے ہیں اور بہتر حالات میں زندگی گزارتے ہیں۔۔۔۔۔ مجموعی اعتبار سے انھوں نے (نیل کے باغداروں نے) اس ملک کے عام لوگوں کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچایا جتنا یورپوں کے کسی دوسرے طبقے نے پہنچایا۔ چاہے وہ ملازمت میں ہوں یا نہ ہوں۔“ (2)

انتظامیہ اور ہندوستان کے متوسط طبقے کی نمو 1833ء تا 1858ء ہندوستانی متوسط طبقے کے وجود میں آنے میں جس نے وہ محض بڑھتی ہوئی تجارت نہیں تھی۔ اس کی تعداد بڑھانے اور اس میں اتحاد پیدا کرنے میں برطانوی عوامی اور انتظام اور انگریزی تعلیم نے بھی اتنا ہی اہم رول ادا کیا۔ ہندوستانیوں کو تمام اعتماد اور ذمہ داری کے عہدوں سے علیحدہ رکھنے کی کارنواس کی پالیسی کی بنا پر ان کو ملک کے سول انتظامیہ میں محض ماتحت اور کم تنخواہ والے عہدوں پر تقرر کیا جاتا تھا۔

لیکن محض یورپوں کے ذریعہ ملک کا انتظام چلانا، نہ صرف مہنگا بلکہ مصلحت کے خلاف بھی تھا۔ چنانچہ بنارس اور اُس کے آس پاس کے اضلاع میں قانون گوار و نائب تحصیلدار کا عہدہ بحال رکھا گیا تھا اور ان پر ہندوستانیوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ اس طرح بجٹی اور مدد اس کی پریسڈنسیوں میں پڑنے کی سطح کے حکام مال ہندوستانی تھے۔ 1803ء میں صدر امین کا عہدہ شروع کیا گیا اور اُس سال ہندوستانی صنعتوں کے اعتبارات بڑھا دیے گئے۔ لارڈ ویسٹمنگر نے ان حکام کو باضابطہ سرکاری تنخواہ دار حکام بنادیا اور ان کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا۔ بیٹک کے زمانے حکومت میں سب جج کا عہدہ شروع کیا گیا۔ اس طرح اس کے زمانہ حکومت میں شمال مغربی صوبجات کے محکمہ مال میں ڈپٹی کلکٹروں کی حیثیت سے ہندوستانیوں کا تقرر کیا گیا۔

روزگار کے معاملے میں ہندوستانیوں کے خلاف امتیاز کی پالیسی 1833ء میں باضابطہ طور سے ختم کر دی گئی۔ نئے چارٹر کی ایک دفعہ میں کہا گیا تھا کہ آئندہ ریاست کے کسی عہدوں پر تقرر کے لیے کسی شخص کو رنگ، ذات، مذہب جانے پیدائش کی بنا پر تامل نہیں قرار دیا جائیگا۔ جہاں تک اقرار نامے کی پابندی اور ملازمتوں کا تعلق تھا یہ اصول محض ایک نیک خواہش کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ لیکن کمپنی کی مالی دشواریوں نے بیٹک کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ ماتحت ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھلائے۔ 1828ء میں حکومت ہند کی ملازمت میں مجموعی طور سے 1,97 ہندوستانی تھے 1849-50ء میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھ کر 2,813 ہو گئی تھی۔

تعداد کے علاوہ ہندوستانی حکام کی تنخواہ 250 ماہوار سے زیادہ نہیں تھی۔ بیٹک نے صدر امین کی تنخواہ 250 500 روپے اور اعلیٰ صدر امین کی 500 600 مقرر کی۔ 1813ء میں پہلی مرتبہ فیصلہ کیا گیا کہ

(1) پانچویں، اٹلیش، نولہ بالا، صفحہ 234۔

(2) دس آف کامنٹی سلٹس لینٹی کی رپورٹ 1833ء، صفحہ 10، ہندوستان میں یورپوں کا طریقہ کار۔

اُن حکام کو، جو اقرار نامہ کے پابند نہیں ہیں، ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدوں پر مقرر کیا جائے۔ 1849ء میں تقریباً 493 حکام کو 240 پانڈ فی سال یا 300 روپیہ ماہانہ مل رہے تھے (1835ء سے 1849ء تک شرح مبادلہ تھی 15 روپے فی پانڈ)

تعلیمی نظام کو انتظامی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا گیا۔ وہ وکیل جو صدر دیوانی عدالت میں مقدمات کی جیروں کرتے تھے، اور وہ بھی جو ضلع کی عدالتوں میں پریکٹس کرتے تھے، گلگت، مدراس اور بنارس سنکرت کالج کے طالب علموں میں سے ہوتے تھے۔ بعد میں دیوانی عدالتوں میں پریکٹس کرنے کے لیے فارسی اور سنکرت کا جاننا ضروری نہیں رہا۔ صرف اسکی ضرورت تھی کہ وہ کمپنی کے نئے ضوابط سے واقف ہوں۔ اور انگریزی زبان جانتے ہوں۔ جس میں زیادہ تر ضوابط بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ 1826ء میں فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری ادارے کے پڑھے ہوئے دیسی طالب علم جو اس امر کی باضابطہ سند رکھتے ہوں کہ ہندو اور مسلم قوانین، برطانوی حکومت کے ضابطوں سے اچھی طرح واقف ہیں انہیں کسی شہریا ضلع کی عدالت میں وکیل کی حیثیت سے مقدمات کی جیروں کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اس طرح کسی سرکاری ادارے میں حاصل کی جانے والی تعلیم نے دیسی لوگوں کے لیے نہ صرف سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھول دیئے بلکہ قانون کا پیشہ بھی اُن کے لیے کھل گیا۔ جو اُس وقت تک اُن لوگوں کا خصوصی اجارہ سمجھا جاتا تھا جو اُن دو کالجوں کے طالب علم ہوتے تھے۔ جہاں مشرقی زبانوں اور ہندو اور مسلم قوانین کی تعلیم دی جاتی تھی۔

بیس سال تک 1833ء کے چارٹر کی دفعات پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔ اُس کے بعد 1853ء میں جب پارلیمنٹ میں 1853ء کے انڈیا بل بحث ہوئی تو بلیکٹ اور جان براونٹ نے کمپنی کی ملازمتوں میں ہندوستانوں کو لینے کا سوال اٹھایا۔ بلیکٹ نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ اگرچہ 1833ء کے چارٹر ایکٹ کو منظور کرتے وقت اس کی وضاحت کر دی گئی تھی پھر بھی ہندوستانوں کو اقرار نامہ کی پابند ملازمتوں سے عدا علیحدہ رکھا گیا۔ اُن دونوں نے کیرن کا حوالہ دیا جو اُس وقت ایگزیکٹو کونسل کا ممبر اور لائیکیشن کا صدر تھا۔ اُس نے 1848ء میں کہا تھا۔ ”موجودہ چارٹر ایکٹ کو ہندوستان کے لوگ ایک مذاق سمجھتے ہیں۔“ (1) اُن دونوں نے ڈاکٹر چکرورتی کا ذکر کیا جو اُن چار ہندوستانوں میں شامل تھا جنہیں دوار کا تھ 1844ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا تھا۔ ڈاکٹر چکرورتی نے طب میں انگلستان میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ مسٹر کیرن اور سر اے رپانی نے کورٹ آف ڈاکٹر کز کو ایک خط لکھا جس میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ ڈاکٹر چکرورتی کو اقرار نامے کی پابندی میں طبی ملازمت کے لیے ماحدود کر دیا جائے۔ کورٹ آف ڈاکٹر ویلٹر اقرار نامہ کی پابند ملازمت میں ڈاکٹر چکرورتی کے تقرر کی درخواست کا جواب دینے سے بچا اور جن لوگوں نے فشارش کی تھی انہیں صرف اتنی اطلاع دی کہ اس کا تقرر ایک ایسے عہدے پر کر دیا گیا ہے جو اقرار نامے کی پابندی ملازمت سے مشاہر کی حد تک اگر برتر نہیں ہے۔ تو براہِ ضرور ہے۔“ (2)

یہ کہا گیا کہ اس صورت حال کی طرف فوری توجہ دی جانی چاہیے۔ اس کو جب صرف اتنی نہیں تھی کہ ہندوستانوں کے ساتھ ناانسانی ہو رہی تھی بلکہ یہ صورت حال خود انگلستان کے لیے خطرناک امکانات کی حامل تھی۔ جیسا کہ کرمل سائیکس نے 1849ء میں کہا تھا۔ ”میں نہایت دیانتداری اور خلوص

نیت کے ساتھ اپنے اس خیال کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ہماری حکومت اور ملی خوش حالی کے لیے یہ بات انتہائی خطرناک ہے کہ ہم لگاتار انصاموں اور لگان مساف زمینوں پر قبضہ کر کے عام لوگوں کو اس خطرے میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ہم ایک طرف تو حکومت کو نوکر شاہی کی حکومت بنانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف انھیں غلاموں کی قوم بنانا چاہتے ہیں۔⁽¹⁾

روشن خیال انگریزوں کے احتجاج کے باوجود ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں سے علیحدہ رکھنے کی پالیسی پر 1858ء کے ملکہ کے اعلان کے بعد بھی عمل ہو رہا۔ لہذا ہندو جیڑیاٹ کے ایک نامہ نگار نے 1860ء میں لکھا تھا: ”یہ عجیب بات ہے کہ آپ (یعنی انگلستان) ہندوستانیوں کو یورپ کی تاریخ اور فلسفہ پڑھاتے ہیں۔ لیکن اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لینے کی انھیں اجازت نہیں دیتے“⁽²⁾ اُس نامہ نگار نے انگلستان کو رومن سلطنت اور غدر کی بھی یاد دلائی اور اُس سے کہا کہ اس سلسلے میں اپنی غلطیوں کا تدارک کرے۔

اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں سے ہندوستانیوں کو علیحدہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کو ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں تھا۔ 1861ء کے سول سروس بل کے متعلق فرینڈ آف انڈیا کی مندرجہ ذیل رائے اعلیٰ عہدوں کے لیے ہندوستانیوں کے مطالبے کی طرف حکومت اور یورپین حکام کے روپنے کو ظاہر کرتی ہے۔

”تمام باعزت دہلی لوگوں کی تنخواہوں میں اضافے کے لیے، جو اس وقت عہدوں پر فائز ہیں، اور ہر ہائی کورٹ میں ایک ہندوستانی جج کے لیے ہم لڑتے رہے ہیں۔ لیکن جب تک نصیحت کو قبول کر کے ہندوستان کے لوگ یہ ثابت نہ کریں کہ وہ اعلیٰ عہدوں کے لیے اخلاقی صفات رکھتے ہیں سر چارلس ٹریوین کی طرح کے ضدی حکمران کے لیے ممکن ہو گا کہ وہ ایک ایسے طبقے کو جنم دے جو سپاہیوں کی فوج سے زیادہ ریاست کے لیے خطرناک ہو گا اور جن سے خود ان کے ملک کے لوگ اُس سے زیادہ نفرت کریں گے۔ جتنی اس وقت وہ پولس اور محلے سے کرتے ہیں۔ جس مقامی شریف آدمی کے پاس دولت اور اہلیت ہے اُسے عزت تنخواہ اور حیثیت سے مستفید ہونے دیا جاسکتا ہے۔ لیکن کبھی اس کے ہاتھ میں طاقت نہیں دی جانی چاہئے“⁽³⁾ (من ہندوستانیوں پر اس عدم اعتماد اور جائز حق سے انھیں محروم رکھنے کی پالیسی، جو تعلیم و تربیت کی بنا پر حکومت کے تحت اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیے جانے کے اتنے ہی اہل تھے جتنے یورپین، ایک ایسا اہم عنصر تھا جن سے ملک کے مختلف حصوں کے لوگوں میں اتحاد کا رشتہ استوار کر دیا۔ اُن میں یکا گت پیداکردی اور قومی احساس کو تیز بنایا۔

شمالی ہندوستان میں متوسط طبقہ

شمالی ہندوستان میں متوسط طبقے کے ارتقاء نے اُس سے مختلف راستہ اختیار کیا جو بمبئی مملکت اور مدراں کے ہندو گھری شہروں میں کیا تھا جہاں سب سے پہلے اس ملک میں یورپیوں کی تہذیبی سرگرمیاں شروع ہوئی تھیں۔ برطانوی فتح کے بعد مدت تک وہ علاقے جو اب برطانیہ اور دہلی پر مشتمل ہیں ملک کی

(1) ڈاکٹر والک کا خط، ایضاً

(2) ہندو جیڑیاٹ میں 7 جنوری 1860ء کو چھپنے والا ایک خط جس پر ڈی۔ ایم۔ ڈی کے تحت ہے۔

(3) فرینڈ آف انڈیا 25 جولائی 1861ء صفحہ 815

بوصفی ہوئی بدھسی تجارت میں شریک ہو سکے نہ سانبھی وار بن سکے۔ لیکن انگریزوں کے آنے سے پہلے ان علاقوں میں ایک چھلتا پھوٹا تجارتی طبقہ تھا اور مرزاپور، آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کی طرح کے شہر نہ صرف اہم تجارتی مرکز تھے بلکہ ان شہروں میں ایک دولت مند اور بااثر متوسط طبقہ پیدا جاتا تھا جو تاجروں اور کاروبار کرنے والوں (جو اندرون ملک تجارت کرتے تھے)، بینکاروں انتظامی افسروں، درباریوں اور درس و تدریس کا کام کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ پلاسی کی جنگ کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں نے اندرون ملک کی تجارت کا احاطہ حاصل کر لیا اور اس کے بعد 1803ء میں جب انگریزوں نے آگرہ کا الحاق کر لیا تو شمالی ہند کے تجارتی طبقوں پر کاری ضرب لگی۔ بمبئی اور ملکنہ تجارت اور کاروبار کے نئے مرکز بن گئے اور گنگا جمن کے کناروں پر واقع اندرون ملک کی تجارت کے مرکزوں نے اپنی سابق اہمیت کھودی۔ جب تاجروں کا سابق پیشہ ختم ہو گیا تو انھوں نے زمین، لین دین اور کاروبار اور سٹ بازی کی طرف توجہ کی۔ (1) حکومت کو روپیہ قرض دینا اور اس کے عوض زمینوں پر قبضہ دخل پانا اس علاقے کے تجارتی طبقے کا پرانا دستور تھا۔ برطانوی علاقوں میں یہ بات ممکن نہیں رہی تھی۔ اس لئے تاجروں نے ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں اور امر لو کو روپیہ دینا شروع کیا۔ اور نظام دوسرے دہلی حکمرانوں کے علاقوں میں روپیہ قرض دیکر اور اس کے عوض زمینوں پر قبضہ دخل حاصل کر کے انھوں نے بڑے منافع کمائے۔ اسکے علاوہ آگرہ اور دہلی کے تجارتی خاندانوں نے لشکر، کپاس، مشینی اشیاء، دھاتیں، اور دوسری بہت سی چیزوں کی تجارت کرنے لگے۔ (2) موتی رام لکھنؤ کے شاہ اور دہلی کے سری کرشن گزوالے کے خاندان 1857ء کی بغاوت تک اپنی دولت کے لیے مشہور تھے۔ 1853ء میں موتی لال کی املاک کی مالیت چالیس لاکھ پاؤنڈ (3) سمجھی جاتی تھی اور اس وقت کے برطانوی حکمران دہلی کے گزوالا خاندان کو شمالی ہندوستان کا اچھا چاہیلا سمجھتے تھے۔

جیسا کہ بحال میں ہوا تھا اتر پردیش کی کچھ بڑی بڑی بینکاری اور تجارتی فرمیں یورپی بینکوں اور تجارتی کمپنی کے مقابلے کی وجہ سے جب تجارت سے نکال دی گئیں تو انھوں نے ہندوستانی ریاستوں میں بڑی بڑی زمینداریاں حاصل کر لیں۔ دہلی کے گزوالوں کی طرح کے دوسرے تاجروں کو جنہوں نے بغاوت کے دوران منغل شہنشاہ کی مدد کی تھی سزا دی گئی اور انگریزوں نے اُسے ختم کر دیا۔ (4) کچھ ایسے بھی تھے

(1) دیکھئے ہندوستان کے مصلحت کے متعلق سلیکٹ کمیٹی کے سامنے آر۔ ایم۔ برڈی شہادت دیکھئے From the Report

Select Committee on Indian Territories.

(2) ایضاً

سوال۔ مسٹر بیکس اس تجارت کی نوعیت کیا ہے جس سے وہ اتنے بڑے بڑے منافع کماتے ہیں۔ جواب۔ مسٹر برڈی پہلے وہ حکومتوں کو بہت روپیہ قرض دیتے تھے اور اسکے عوض زمین حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن ابھی بہت سے خاندان ان علاقوں میں بڑا روپیہ کما رہے ہیں۔ بدھلی بدھلی علاقہ کہا جاتا ہے۔ نظام کے علاقے میں اور دوسرے علاقوں میں روپیہ کمائے کا حاصل ذریعہ تو یہ ہے یعنی کوئی شرح سود پر حکومت کو روپیہ قرض دینا اور اس کے عوض زمیناں پر قابض و دخل ہو جانا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آگرہ میں لشکر، کپاس مشینی اشیاء، دھاتوں اور بہت سے دوسری چیزوں کی تجارت کی جاتی ہے۔

(3) ایضاً

(4) 1857ء میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے غلوں سے بھری کشتیوں کے علاوہ سیٹھ رام جی اس گزوالا نے منغل شہنشاہ کو بڑے بڑے قرض دیے۔ لیکن جن انگریز حکام نے اُس سے اس قسم کی درخواست کی تو اُس نے انکار کر دیا۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے اسکے گھر کو تخت و تاج کر ڈالا اور ہاکم اوضبط کر ڈیا۔

جنہوں نے لین دین کا کاروبار یا چھوٹی چھوٹی دوکانیں شروع کر دی۔ جو متوسط طبقہ پریڈنسی۔ شہروں میں وجود میں آگیا تھا ویسا اُس زمانے میں اتر پردیش میں نہ ابھر سکا۔

آگرہ اور اودھ میں مغربی تعلیم کا رواج بھی آہستہ آہستہ ہو سکا۔ بغاوت کے بعد بھی اودھ کے زمیندار مدت تک انگریزی تعلیم سے متغیر تھے۔ تجارتی طبقوں نے بھی ان تھوڑی بہت تعلیمی سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جو حکومت نے مہیا کی تھیں۔ 61-1860ء میں شمال مغربی صوبجات میں ایک گورنمنٹ اسکول تھا جس میں 127 طالب علم تھے۔ اسکے برعکس بنگال میں 145 اسکول تھے۔ جن میں 5,309 طالب علم تھے۔ پنجاب میں 21 اسکول تھے۔ جن میں 1,714 طالب علم تھے، مدراس میں گیارہ اسکول تھے جن میں 2,027 طالب علم تھے اور بمبئی میں دو اسکول تھے جن میں 618 طالب علم تھے (1) 62-1861ء میں شمال مغربی صوبجات میں 5 گورنمنٹ کالج تھے۔ لیکن اس سال کی تعلیم کے متعلق سرکاری رپورٹ میں کہا گیا ہے۔ کہ لیکن ان کو کالج کا نام دینا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ دستور اور نصاب تعلیم وغیرہ کے اعتبار سے ان پر اسکول کا نام زیادہ صادق آتا ہے۔ (2)

تجارت اور اعلیٰ تعلیم دونوں کے اعتبار سے حالات بہت سازگار نہیں تھے اُن عناصر میں سے ایک قانون تھا جنہوں نے ہندوستان کے مختلف خطوں میں پائے جانے والے متوسط طبقے میں یکجہتی کا احساس پیدا کیا اور قومی شعور کی نشوونما کی۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پورے ہندوستان کے لیے یکساں قوانین اور ضوابط بنائے گئے۔ اور فوجداری قوانین کے ضابطے اور عدالتی کارروائی کے قوانین تیار کیے گئے اور تمام صوبوں میں اور سب فرقوں کے لیے اُن کا نفاذ کیا گیا تو سب ہندوستانوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک مشترکہ نظام میں شریک ہیں۔ ان قوانین کے عمل درآمد میں ہندوستانی صرف اس وجہ سے شریک نہیں تھے کہ فریقین کے مقدمات پر اُن کا اطلاق ہوتا تھا۔ بلکہ اُن کی شرکت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے عمل درآمد میں ہندوستانی افسر حصہ لیتے تھے اور ہندوستانی وکیل اُن کی تشریح میں عدالتوں کی مدد کرتے تھے۔ جب موکل ہو سکیں اور جج یکساں قوانین کا عمل درآمد یکساں انداز سے کرنے لگے تو اُس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ اُن کے مفادات روپے بھی یکساں ہو گئے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی تحریک میں دکیوں کا طبقہ پیش پیش تھا ایک طرف تو قانون، نظم و نسق، تعلیم، اخبارات اور ادب قومی یکجہتی کے آکر کار تھے۔ دوسری طرف مواصلات کی ترقی کل ہند سطح پر اسکی کامیابی کی ضامن بن گئی۔

ریلیں اور قومی اتحاد

بمبئی، مدراس، اور بنگال کے متوسط طبقوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ لیکن جب تک وہ آسانی اور تیزی سے ایک دوسرے کے ساتھ روابط پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ اس وقت تک مشترکہ قومی جذبات پیدا ہو سکتے تھے نہ مشترکہ رائے عامہ وجود میں آسکتی تھی اور نہ اُن پر اتحاد عمل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ

(1) ہندوستان میں تعلیمی حالت کے متعلق نوٹ از۔ ای۔ ایم۔ منڈا تھ دیکھئے Selector from Educational

Records of the Govt of India جلد اول تعلیمی رپورٹ (این۔ اے۔ آئی 1960ء) صفحہ 40

(2) ایضاً صفحہ 30

ریلوں کی ترقی کو قومی شعور کے ارتقاء و ترقی میں ایک اہم سنگ میل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جس کی بنا پر ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں میں مواصلات اور ایک دوسرے سے میل جول ممکن ہو سکا۔

ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر، جو 1853ء میں شروع کی گئی، یورپ، کناڈا اور امریکہ میں ریلوں کی گرم بازاری کے بعد ہوئی۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک انگلستان دوسرے ملکوں کو سرمایہ برآمد کر رہا تھا۔ یہ سرمایہ زیادہ تر امریکہ اور کناڈا کو ریلوں کی تعمیر کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ ان اصل کاریوں کی وجہ سے نہ صرف سرمایہ کو منافع بخش طریقے سے استعمال کیا جاسکا جو بصورت دیگر بیکار رہتا، بلکہ برطانوی تکنیکی مہارت اور برطانوی صنعت کے لیے نئی نئی منڈیاں بھی کھل گئیں۔ ریلیں بن جانے کی وجہ سے انگلستان زیادہ آسانی کے ساتھ اور کم خرچ پر غذائی اجناس اور زرعی خام مال حاصل کر سکتا تھا اور زیادہ آسانی سے اپنی مصنوعات امریکہ اور کناڈا کی منڈیوں تک پہنچا سکتا تھا۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا ریلوں کی تعمیر سے ایک اور فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا تھا جیسا کہ لارڈ ڈلہوزی نے 1853ء میں اپنی مشہور روداد میں اس کے متعلق لکھا تھا اور جس کی تصدیق 1857ء کی بغاوت کے دوران پیش آنے والے واقعات نے گہری، سول شورش یا برطانوی حکومت کی سیاسی طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی صورت میں فوجوں کو تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے کے لیے ریلیں ضروری ہیں۔ اس ملک میں ریلیں تعمیر کرنے کا کام نجی کمپنیوں کے سپرد کر دیا گیا جو انگلستان میں بنائی گئی تھیں۔ تعمیر کے لیے انھیں ٹھیکے دیے گئے جن میں دوسری رعایتوں کے علاوہ یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ حکومت سرمائے پر 5 فی صدی منافع کی ضمانت ہوگی۔ 49-1848ء میں ضمانت شدہ سرمایہ محض ایک لاکھ روپے تھا۔ 52-1851ء میں وہ بڑھ کر ایک کروڑ تین لاکھ ہو گیا اور 61-1860ء میں 34 کروڑ 16 لاکھ روپے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے بڑھنے لگا۔ ملک میں پہلی ریلوے لائن 1853ء میں بنائی گئی۔ 54-1853ء میں صرف 21 میل لمبی ریلوے لائنیں پر مسافر سفر کر سکتے تھے۔ اس کی لمبائی 61-1860ء میں 839 میل اور 70-1869ء میں 4,265 ہو گئی۔ 1872ء تک تینوں پریسڈنسی شہروں کو ریلوں سے جوڑا جا چکا تھا اور تینوں پریسڈنسیوں کی شہری آبادی کے لیے اندرون ملک راست ریلوں کا سلسلہ مہیا کیا جا چکا تھا۔ پریسڈنسی شہروں کو جوڑنے والی ریلوں کا اثر قومی اتحاد کے عمل پر بڑا اور اگلے تیس سال میں جو ذیلی ریلوے لائنوں کا جال بچھادیا گیا اس نے اس عمل کو مکمل کر دیا۔ صدی کے اختتام تک ملک میں 23,783 میل لمبی ریلوے لائن بچھائی جا چکی تھی۔

چوتھا باب

نئی تعلیم اور مغربی تہذیب کا اثر

سیاسی طاقت رکھنے والے قدیم بالائی طبقے کے ختم ہونے کے بعد نیا متوسط طبقہ پیش پیش ہو گیا۔ یہ فطری امر تھا کہ ابتداء میں اس طبقے کے مختلف حصے سمجھتے تھے کہ انہیں انگریزی حکومت سے فائدہ ہوا۔ تاجروں کی دولت زمینداروں کی آمدنی، سرکاری ملازمین کی تنخواہیں اور پیشہ ور لوگوں کی یافت کے ذرائع زیادہ تر انگریزوں کی دین تھے اور اس لئے وہ اپنے فائدہ پہنچانے والوں کے لئے جذبہ احسان مندی رکھتے تھے لیکن جوں جوں وقت گزر تا گیا اور حکمرانوں نے ہندوستان کے سابق فاتحین کی پیروی کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا، جو اس ملک میں آباد ہو گئے تھے، اس کو اپنا مستقل گھر بنالیا تھا، یہاں کے سانج میں محل مل گئے تھے۔ اور جنہوں نے یہاں کی تہذیب کو اپنالیا تھا تو رفتہ رفتہ وہ ایسی کا شکار ہونے لگے۔

ایک طرف تو برطانوی فتح کے نتیجے میں بالائی طبقہ ختم ہو گیا اور دوسری طرف برہمن یا قدیم دانش ور طبقہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس کی جزوی وجہ تھی سر پرستی کے ذرائع یعنی بادشاہوں کے، صوبیداروں کے، سرداروں کے اور زمینداروں کے درباروں کا ختم ہو جانا اور دوسری وجہ تھی کمپنی کا لگان معاف زمینوں پر دوبارہ قبضہ کر لینا جو مذہبی عالموں کی گذر بسر کے لئے دی گئی تھیں۔ گذر بسر کا روایتی ذریعہ کھودینے کے بعد وہ، جہاں بھی انہیں مل سکا کوئی دوسرا کام یا روزگار ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے۔ بقول ایس۔ کے۔ ڈی ”قدیم تہذیب اور قدیم علم کی جڑوں پر کلہاڑی چلائی گئی۔ وہ اثرات ناپید ہو گئے، جنہوں نے ہندو تہذیب کے اعلیٰ ترین تصورات کو جنم دیا تھا۔ وہ اثر بڑھ گیا جو تو ہم پرستی اور مضحکہ خیز تصورات کو رواں دواں ہے (1)“

فتح کے معاشی نتائج نے بھی تبدیلی کی وجہ کو تقویت پہنچائی۔ زرعی میدان میں زمیندار اور کسان کے درمیان ایک نئے قسم کا رشتہ قائم ہو گیا تھا اور زمین پر ملکیت سے رشتوں کی نوعیت بدل گئی تھی۔ زرعی لین دین میں بھی روپے اور مقابلے کا استعمال ہونے لگا تھا۔

صنعت کے میدان میں روایتی مصنوعات کی بنا اور ہندوستان کو ایک ایسی منڈی میں تبدیل کر دینے کے نتیجے میں جہاں انگلستان کے کارخانوں کے بنے ہوئے سامان کا بادل ہندوستان کے خام مال سے کیا جاتا تھا، یہاں ایک مثالی نوآبادیاتی معیشت اپنی تمام تر سماجی برائیوں کے ساتھ قائم ہو گئی۔

ان تبدیلیوں نے ابتدائی پیداواروں کے لئے مطالبہ بڑھا دیا۔ اس لئے کہ آبادی بڑھ رہی تھی اور درآمدات اور گھریلو اخراجات کے لئے رقمیں ادا کرنی تھیں۔ مال تقسیم کرنے کا کاروبار تیز تر ہو گیا اور داخلی اور خارجی دونوں قسم کی تجارتوں کا مجموعی حجم بڑھ گیا۔ جس نے متوسط طبقے کو تقویت پہنچائی۔

ملی جلی معاشی اور سیاسی تبدیلی نے ہندوستان کے لوگوں کے اتھارو کی بنیاد ڈالی۔ مواصلات یعنی سڑکوں، ریلوں، ڈاک اور تار کی توسیع کی بنا پر مختلف علاقوں کے ہندوستانی ایک دوسرے کے بہت نزدیک

آگئے انہوں نے مختلف علاقوں کے نئے سماجی گروہوں کو ایک دوسرے سے منسلک کیا اور ایک منظم اکائی کی تشکیل کی طرف مائل ہوئے۔

اس طرح عملی یعنی سیاسی اور معاشی زندگی کے میدان میں مغرب کا قدیم مشرق سے بواخت تصادم ہوا۔ اس کے ساتھ ذہنی اور اخلاقی سطح پر بھی اس نے طبع سازی کی۔ اقدار کا وہ بڑا نظام جسے صدیوں سے ہندوستانی اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے یعنی مذہبی، اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کو لٹکارا گیا۔ اور ان تمام میدانوں میں ہندوستان میں رد عمل ہوا۔ جواب تین قسم کے تھے۔ پرانے خیالات رکھنے والوں نے انہیں حق بجانب قرار دیا، لبرل ذہن رکھنے والوں نے ان کی اصلاح کرنی چاہی اور شدت پسندوں نے انہیں رد کر دیا لیکن کسی کا نقطہ نظر کچھ سخی اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے جو اسلحہ استعمال کئے گئے یعنی تنقید اور معقولات کے اسلحہ وہ زیادہ تر مغرب سے مستعار لئے گئے تھے۔ اس طرح وہی ایجلا کی ایک زیریں لہر کو فروغ ہوا۔

ایک طرف تو اس تصادم نے ہندوستان اور غیر ہندوستان کے درمیان دوری کا احساس پیدا کیا اور دوسری طرف یہ شعور پیدا کیا کہ ان کا تعلق ایک سیاسی برادری سے ہے جو نوعیت کے اعتبار سے دور وسطیٰ کے نظام سے مختلف ہے۔ جس سے فرد کو قربت و اداری یا کسی مذہبی فرقے سے جوڑا جاتا تھا۔ اس تصادم نے ایک ایسے سیاسی اتھار کا احساس پیدا کیا جو ذات اور مذہب سے ماورا تھا۔ اور ایک ایسی مشترک قوم کے تصور سے وابستہ تھا۔ جو مشترک وطن رکھتی ہے۔ اس طرح ایک ایسی قوم کا تصور پیدا ہوا۔ جو دوسری قوموں سے مختلف ہے اور ایسی علاقائی برادری کا تصور وجود میں آیا جس میں تمام گروہ اور فرقے شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابتداء میں یہ شعور غیر منظم تھا اور اس کا مفہوم واضح نہیں تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کے خدوخال زیادہ واضح ہونے لگے اور اس کی چاہت کا یقین ہو گیا۔

II علم کار وایتی تصور

قومی شعور کی تشکیل میں ماضی نے عجیب و غریب مگر دلچسپ رول ادا کیا۔ ماضی طویل بھی تھا اور ثقیب و فراز سے بھرا ہوا بھی سوال یہ تھا کہ ہندوستان کو ماضی کے کس حصہ کو زندہ اور بیش بہا سمجھنا چاہئے۔ اس کا انتخاب آزادی کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسکے یقین کا انحصار کئی باتوں پر تھا۔ یعنی سوچنے کے رواجی طریقے مغرب کا اثر اور نئی زندگی کے شدید مطالبات۔ اس کے فیصلے میں لاشعوری اور نیم شعوری عوامل بھی شامل تھے اور بالخصوص فیصلے کا راہ وہ بھی۔ قومی شعور کو ماضی اور حال کے تانے بانے سے بنایا گیا تھا۔

قومی شعور کس طرح وجود میں آیا، اپنی خصوصی انفرادیت کو ابھارا اور ادب، فن، سماجی اور مذہبی اصلاحات اور راہ و رسم کی نئی شکلوں میں کس طرح اظہار پایا۔ کس طرح تعلیم، اخبارات اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع سے اس کا پرچار کیا گیا۔ کس طرح اس کی بنا پر سماجی اصول اور سیاسی تصورات وجود میں آئے۔ ان موضوعات کا جائزہ آئندہ ابواب میں لیا گیا ہے۔

اُن تہذیبی عناصر میں جنہوں نے ہندوستانی ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اور زندگی کے نئے ذہنی، جمالیاتی، سماجی، اخلاقی اور مذہبی مسائل کے طرف نئے رجحانات کو جنم دیا، مغربی علم کی اشاعت کو اونچی جگہ دینی پڑے گی۔ اس تصادم کی پوری اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ

اٹھارہویں صدی کے آخر میں جو مغربی علم ہندوستان پہنچا وہ نوعیت کے اعتبار سے اُسے روایتی ہندوستانی علم سے بہت مختلف تھا۔ جو یہاں اُس وقت پایا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ علم کا تصور اور علم کی تلاش کا مقصد دونوں نظاموں میں یکساں نہیں تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ مغربی علم ایک نطلے سامان کا کام تھا اور کسی مخصوص طبقے تک محدود نہیں تھا۔ مشرق میں علم ہند گروہوں تک محدود تھا۔

ان اختلاف کی جزئیات کا جائزہ لینے کی کوشش ضروری نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہیے کہ جدید مغربی علم لازمی طور سے سائنسی، معروضی، تنقیدی اور غیر حکمی ہے اور اُسے عقلی اور استدلالی طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے لیکن قدیم ہندوستانی دانشمندی کی بنیاد تھی، وجدان، ہدایت، موضوعی بصیرت، مراقبہ اور دھیان جو آخر میں روشنی اور یقین کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ اس دانشمندی کے مطابق علم دو قسم کا ہو اعلیٰ اور اعلیٰ۔ اعلیٰ علم کے مقابلے میں جس کا تعلق حقیقت مطلق سے ہے۔ ادنیٰ علم کی قدر و قیمت کم ہے۔ اس لیے کہ اس کا موضوع بدلتا رہتا ہے اور عارضی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا مقصد ہے اپنی خودی کو پہچاننا جو شعور کا موضوع اور ثانوی حیثیت سے معروض ہے۔ یہ اُس میں مصروف ہے جو وقت، مکان اور علیت سے باور ہے۔ اس لیے وہ مظہر کی طرف توجہ دینے کے لیے وقت نکال نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ ہندوستان میں ریاضیات، فلکیات اور طب کی طرح کی طبیسی سائنسوں میں کچھ ترقی کی گئی اور منطق، صرف و نحو، فن خطابت، قانون، فلسفہ وغیرہ کے متعلق کچھ طبع زاکتابیں بھی پیدا کیں۔ لیکن تجرباتی مطالعے اور تجربی سائنس کو بقدر ضرورت ترقی نہ دے سکا۔

روایتی علم کو ایک مکمل وحدت تصور کیا جاتا تھا۔ اس کو حاصل کرنے میں اُس کی بنا پر اور دشواری پیدا ہو گئی کہ اس کے لئے منسکرت کا علم ایک ضروری شرط تھا اور لغظیات کی بہتات اور الجھی ہوئی صرف و نحو کی وجہ سے اُس کا پڑھنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ اس علم کو حاصل کرنے کے لئے جو شرطیں ضروری تھیں انہوں نے اس امر کو نگاہ پر لیا کہ چین کے مان دانیوں کی طرح اس کے پرستاروں کا حلقہ بھی چھوٹا اور منتخب ہو۔ انہیں اپنی گذر بسر کے لئے کام کرنا ضروری نہیں تھا اس لیے کہ حکومت یا سامان کا یہ فرض تھا کہ ان کی جزا گیری کرے۔ حالانکہ دنیاوی اعتبار سے وہ غریب تھے۔ لیکن روحانی اعتبار سے وہ دولت مند تھے اور سامان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ سب تو نہیں مگر اُن میں سے زیادہ تر برہمن تھے اور کچھ ہندو کی دوسری ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن پر عالموں کا طبقہ مشتمل تھا۔ حالانکہ اعلیٰ تعلیم کے جو یا اور استاد کسی ذات یا فرقے سے متعلق ہو سکتے تھے۔

تعلیم یافتہ مسلمان بھی برہمن ذہن کی کچھ صفات کے حامل تھے۔ مسلمانوں کے لئے دو قسم کے علم تھے یعنی علم معرفت اور دنیاوی علم۔ پہلا علم لاڈنی، وجدانی اور دل پر اثر ڈالنے والا تھا۔ داخلی نظم و ضبط کے دشوار طریقے سے اس کو حاصل کیا جاتا تھا جس میں روحانی ترقی کے کئی مراحل تھے۔ اسی میں ترک خواہشات، حواس پر قدرت حاصل کرنا اور دنیاوی اشیاء سے قطع تعلق کرنا شامل تھا۔ اُن شرائط کو زیادہ لوگ پورا نہیں کر سکتے تھے اس لیے اعلیٰ علم کے حقیقی پرستاروں کی تعداد کم تھی۔

دوسرے قسم کے علم کی حیثیت کم تھی۔ لیکن مسلمان عالم اُسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ابتدائی مراحل میں انہوں نے یونانی تصورات کے مطالعہ پر بڑی توجہ دی تھی اور سائنس کے مختلف شعبوں میں اپنی طرف سے اضافے بھی کئے تھے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں وہ تجربی اور دنیاوی علوم کے مطالعے میں

زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور زیادہ مستعد تھے۔ ریاضیات اور حیاتیات کی سائنسوں اور تکنیکی دریافتوں میں وہ ہندوؤں سے آگے نکل گئے تھے۔ تاریخ کی تحقیق و تفتیش پر انہوں نے بہت توجہ دی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ فن تاریخ نویسی، سوانح نگاری اور جغرافیہ میں انہوں نے یونانیوں اور رومنوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ طبی سائنسوں میں وہ یورپ کے استاد تھے۔

باطنی علم اور مافوق التجربہ فلسفے میں ہندو ذہن زیادہ درک رکھتا تھا۔ اور اس کی دین بہت زیادہ تھی۔ مگر فطرت اور مظاہر کے متعلق اُس کا علم بہت محدود تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی سے بہت پہلے ہندو اور مسلمان دونوں اُس منزل تک پہنچ چکے تھے، جہاں طبی علم کے فروغ کا سلسلہ رک گیا تھا۔ سائنسوں یعنی طب، ریاضیات، فلکیات، کیسے وغیرہ میں ہندوؤں کا علم محض لکیر کا فقیر بن چکا تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن کے مفکر، موجد اور معیاری کتابوں کے مصنف قریب قریب سب غیر ہندوستانی مسلمان تھے جو چودھویں صدی سے پہلے گذرے تھے ہندوستان میں انہوں نے محض شادھین اور حاشیہ نویس یا تلخیصات کے مرتبین پیدا کئے۔

خلافت پر ترکوں کے غلبے اور اُس کے بعد مشرق میں مشکلوں کے ہاتھوں ہندوؤں کی فتح و تاخت اور اُمیریا کے جزیرہ نما میں عیسائی ریاستوں کے قیام نے اسلامی ممالک میں سائنسٹوں کی ترقی پر مہلک ضرب لگائی۔ اس کے بعد کی مسلم ریاستوں مثلاً ایران کے صوفیوں اور ہندوستان کے مغلوں نے، جو اپنی دولت اور شان و شوکت کے لئے دور دور تک مشہور تھے، ان سائنسٹوں کی ترقی کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔

ہندو اور مسلمان عالموں کے طبقے زیادہ تر اپنے اپنے محوروں پر گھومتے رہے۔ کچھ کو چھوڑ کے انہوں نے آپس میں علم کا لین دین نہیں کیا اور اس طرح ایک دوسرے کے ذہنوں پر جلا کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے علاوہ اٹھارہویں صدی سیاسی طوائف الملوکی اور ذہنی انتشار کی صدی تھی اُس پر آشوب زمانے میں، جب جنگ اور تشدد کا رواج عام تھا سائنس کا فروغ ممکن نہیں تھا۔ لیکن برطانوی فتح نے جب امن و امان قائم کر دیا تو علم کے فروغ کی ابتدائی شرط پوری ہو گئی۔ فاتحین اپنے ساتھ ایک نئے قسم کا علم لائے تھے جس کے چچ زر خیز ذہنوں پر گرے۔

III عیسائی مشنوں کی ابتدائی سرگرمیاں

پلائی کی جنگ سے پہلے کے زمانے میں ذہنی تبدیلی کی دو خاص خاص لہجئیاں تھیں۔ کاروباری لین دین اور انتظامی کاموں میں ہندوستان پر یورپی تاجروں کا اثر۔ یورپیوں کے رہن مہن کے طریقے اور تجارت کرنے کے انداز نے ہندوستانی ذہن کو متاثر کیا اور اُن کے ساتھ رہ کر کچھ ہندوستانیوں نے انگریزی زبان سیکھ لی۔ لیکن اُن کی تعداد محدود تھی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُس ابتدائی دور میں جو انگریز ہندوستان آئے تھے اُن کے لئے یہ بات زیادہ مفید تھی کہ وہ ملک کی زبانیں اور خصوصیت کے ساتھ فارسی زبان سیکھیں جو اُن حکمرانوں کی زبان تھی جن سے اُن کا سابقہ پڑتا تھا اور جن سے وہ اجازت نامے اور دوسری مراعات حاصل کرتے تھے۔

عیسائی مشنری ہندوستان میں دین عیسوی کی تبلیغ کرنے کے لئے آئے اور مسیحی ماحول میں

ہندوستانی بچوں کو تعلیم دینے کے لئے انہوں نے اسکول کھولے۔ ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی تاریخ بہت پرانی ہے جس کی ابتداء پہلی صدی عیسوی سے ہوتی تھی۔ لیکن جدید عہد میں اُس کی تجدید اُس وقت ہوئی جب پرنگلی بالابار کے ساحل پر اترے۔ اٹھارہویں صدی میں جب یورپ کی پروٹسٹنٹ ریاستیں استعماری طاقتوں کی حیثیت سے اُبھریں تو رومن کیتھولک سرگرمیوں کا زوال شروع ہو گیا۔

جب رومن کیتھولک مشنوں کا کام ختم ہونے لگا تو یورپ کی پروٹسٹنٹ ریاستوں نے اپنے عقائد کے مطابق دین عیسوی کی ترویج و اشاعت میں دلچسپی لیتی شروع کی یورپ کی پروٹسٹنٹ ریاستوں میں اس قسم کی انجمن، فرقے اور مذہبی گروہ معرض وجود میں آگئے جنہوں نے دینی کام میں بڑا جوش و خروش دکھایا۔ پروٹسٹنٹ یورپ میں مذہبی احیاء نے ڈنمارک کے باوشلہ فریڈرک ولیم چہارم کو باہر کے ملک کو مشن بھیجنے کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اُس نے اسپنر کی تحریک سے متعلق دو جرمن پادریوں رکن ہالگ اور پلوٹسٹیم کو ہندوستان جانے کی دعوت دی۔ زکین ہالگ 1706ء میں ہندوستان پہنچا اور ٹرانکو بار میں اُس نے دینش تامل مشن کی بنیاد ڈالی۔ اُس نے تامل زبان سیکھی، تامل کتابیں چھاپنے کے لئے ایک پریس اور آرم کیلورا انجیل کا ترجمہ چھاپا۔ اُس نے ہندوستانی اور دو غلط پوریتن بچوں کے لئے ایک اسکول بھی قائم کیا۔ پروٹسٹنٹ مشن کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ اُس نے چنگی ذاتوں کے بہت سے لوگوں کو عیسائی بنالیا، ہندوستانی پادریوں کی ایک جماعت کو جنم دیا اور مدراس (نورث سینٹ جارج) اور کڈالور (نورث سینٹ ڈیوڈ) میں مشن کے مرکز کھول دیے۔

عیسائی مشن تعلیمی میدان میں

جہاں تک ہندوستان میں مغربیت کی نشر و اشاعت کا تعلق ہے جنوب میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں قسم کے مشنوں کا کام کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

عیسائی مذہب کی تبلیغ اور تعلیم دونوں کے اعتبار سے مشنریوں کی سرگرمیاں بڑی حد تک ہندوؤں کے غلط طبقوں تک محدود تھیں اور بااثر بالائی طبقے پر اُن کا اثر بہت کم پڑا جب توہل نے دعویٰ کیا کہ وہ برہمن اور پانچویں وید کو ظاہر کرنے والا ہے تو اُس کی اُن عجیب و غریب طریقوں کا برہمنوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ نیا متوسط طبقہ ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

لیکن بنگال میں صورت حال مختلف تھی۔ اٹھارہویں صدی کے وسط تک ہندوستانیوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو چکا تھا جو اُن انگریزوں کے طریقوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ جو اُن کے درمیان رہتے تھے۔ جب 1757ء میں بنگال میں انگریزی حکومت قائم ہو گئی اور کچھ برسوں بعد جب برطانوی نظم و نسق میں تنظیم پیدا کی گئی تو حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ ایسے نئے گروہ معرض وجود میں آگئے جو کام تو مختلف کرتے تھے لیکن انھما عکسوں پر رکھتے تھے۔

ابتدائی مراحل میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تبلیغ دین کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ حالانکہ 1798ء کے چارٹر میں فیکٹریوں کے پادریوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ ”وہ مقامی زبانیں سیکھیں تاکہ اُن

ہندوؤں کو پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم اچھی طرح دے سکیں۔ جو کمپنی کے ملازم یا غلام ہوں گے۔“ (۱) پھر بھی کمپنی منافع کمانے میں اتنی زیادہ مصروف تھی کہ اس ہدایت پر دھیان نہیں دیا گیا۔

پلاہی کے بعد بنگال میں پروٹسٹنٹ مشنریوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ ڈینش مشن کا کیرسدر 1758ء میں کلکتہ پہنچا اور کلاہونے اُسے مشن شروع کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن اُس کا کام بڑی حد تک انگریزوں بلور اُن دونوں تک محدود رہا ”جو پور تو کیز“ کہلاتے تھے۔ پھر بھی اُس نے ایک اہم ہندو دہلی کے گیش داس کو عیسائی بنالیا جو کلکتہ کے سپریم کورٹ میں فاری کا مترجم تھا۔

انگلش چرچ کے مشنریوں کی آمد سے پہلے کمپنی کے پلوری بھی ہندوستان میں تبلیغ دین کا کام شروع کر چکے تھے۔ وہ برطانوی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے اور اُس کی بنا پر تعلیمی مہملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ مثلاً ڈیوڈ براؤن (متوفی 1812ء) فورٹ ولیم کالج کا پروووسٹ مقرر کیا گیا تھا۔ اُس نے کلکتہ کے ہندو نوجوانوں کے لئے ایک اقامتی اسکول بھی کھولا تھا۔ میزمارش (متوفی 1812ء) نے کلکتہ، دیرپور اور کانپور میں کام کیا۔ اُس نے نئے عہد نامے کا ترجمہ اردو، فارسی اور عربی میں کیا اور اسکول قائم کئے۔ ڈیٹیل کوری نے، جو آگرہ اور اُس کے بعد بنارس میں تعلیمات کیا گیا تھا، راجہ جے نرائن گھوسال کو اسکول کھولنے پر آمادہ کر لیا جو اتر پردیش میں پہلا اسکول تھا جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔

مشنریوں کا دوسرا اہم گروپ وہ تھا، جس میں ولیم کیری اُس کے دو ساتھی شامل تھے۔ کیری 1793ء میں اسوقت کلکتہ پہنچا جب مشنوں کی طرف سے کمپنی کا رویہ واضح طور سے مخالفت ہو چکا تھا۔ برنگالیوں کا شہر وہ کچھ بچے تھے اور اس کو سمجھتے تھے کہ تبلیغ مذہب کے کام کو بڑھانے کا نتیجہ بنات، خانہ جنگی اور عام بے چینی کی صورت میں سامنے آئے گا۔ سب سے زیادہ اس بات سے خائف تھے کہ اونچی ذات کے کسی دیسی سپاہی نے اگر مذہب تبدیل کیا تو اُس کا لازمی نتیجہ ہو گا فوج کی برطرنی اور ہندوستان میں انگریزی راج کا زوال۔“ (2)

رتھو کے مطابق اس تبدیلی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ دارن ہسٹنگز اور قلب فرانسس کی طرح کے انگریز حکام نے سبکی اخلاق کو خیر باد کہہ دیا تھا، مستشرقین مشرقی مذہب اور فلسفے کی تعریف کرتے تھے۔ اور کمپنی نے اُن پورپوں کو رہنے کی ممانعت کر دی تھی جو اُس کی ملازمت میں نہیں تھے یا اُس کا جاری کردہ پاسپورٹ نہیں رکھتے تھے۔

چنانچہ کیری کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن 1798ء میں جب جان مارش مین اور ولیم دارڈ بھی آگئے تو وہ سب سپریم پور میں آباد ہو گئے جو اس وقت کلکتہ سے شمال کی طرف بیس میل کی دوری پر ایک ذخش نو آبادی تھی۔ نئے بنگال کے ذہن کی تشکیل میں اُن کی مشترکہ کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ بنگال میں بیداری پیدا کرنے میں، جس کا مقابلہ کچھ پہلوؤں کی حد تک یورپ کی نشوونما نے کیا گیا ہے سپریم پور کے مشنریوں کا حصہ کم نہیں ہے۔

کیری کا علم حاصل کرنے کا بے اندازہ شوق اور سائنسی مہملات میں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اُس نے سنسکرت، بنگالی، مراٹھی، ہندی وغیرہ میں دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے نئے عہد

(1) لکشر، جے History of missions in India ۸ ترجمہ ایس مور (1908ء)، صفحہ 129۔

(2) ٹیلن ٹشر نے 1802ء میں ہندوستان میں پائے جانے والے عام احساس کے متعلق جو کچھ بیان کیا، ۶۷، محول، صفحہ 131۔

نامے کا ترجمہ بنگالی میں کیا اور جلد ہی ایک باصلاحیت زبان دان کی حیثیت سے شہرت پائی۔ دہلیزی نے ہندوستانی سول اور مغربی ملازمتوں کے امیدواروں کو تربیت دینے کے لئے 1801ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس میں بنگالی کے اُستاد کی حیثیت سے اُس کا تقرر کیا گیا۔ اُس ملازمت نے اُس کی ادبی اور سائنسی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ اُس نے صرف و نحو کی ایک کتاب اور ایک مسکرت کی لغت تیار کی اور والسیکی رامائن اور دوسری مسکرت کی قدیم کتابوں کے نئے اڈیشن مرتب کئے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی نباتات کا بڑا ہی سرگرم طالب علم بن گیا۔

جدید بنگالی کی ابتدا کے سلسلے میں کیری نے جو بڑے بڑے کام کئے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ جدید بنگالی نثر کی بنیاد اُس نے ڈالی۔ کیری سے پہلے بنگال میں شاعری کا بیش بہا خزانہ موجود تھا، لیکن اٹھارہویں صدی میں اس میں زوال کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ جہاں تک بنگالی نثر کا تعلق تھا اُس میں کوئی بیش بہا کام نہیں ہوا تھا۔ کیری نے بنگالی صرف و نحو لکھی جو اس موضوع پر پہلی کتاب تو نہیں تھی لیکن حقیقت میں سائنسی بنیادوں پر ضرور لکھی گئی تھی۔ یوں بالائیڈ اُس سے پہلے بنگالی صرف و نحو کے متعلق ایک کتاب لکھ چکا تھا۔ ان دو کتابوں نے بنگالی نثر کی شکل کا تعین کیا۔ صرف و نحو اور لغت کے علاوہ اس کی تحریروں میں کئی نصابی کتابیں شامل ہیں۔ مثلاً کتوپ کاتن (گنگو) اور اتھاس بالا (کہانیاں)۔

کیری محض ایک مصنف ہی نہیں تھا بلکہ اُس نے اپنے گرد مصنفوں کا ایک طبقہ بنالیا تھا۔ مثلاً مری تیون جیہارم رام پور، راجیو لوجن، چندری چرن، موہن پرشاد ٹھاکر اور دوسرے مصنف۔

یہ پنڈت اور فنی بنگال کے ادبی نشاۃ ثانیہ کے آگواستے تھے کیری کی سرگرمیاں محض ادب تک محدود نہیں تھیں۔ وہ اصلاحات کا پر جوش حامی بھی تھا۔ عام ہندو دھرم میں بہت سی شرمناک خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ جنہیں دور کرنا ضروری تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو اُس نے بہت بڑھایا۔

کیری کے دو ساتھیوں یعنی مارش مین اور وارڈ نے بڑے پر جوش انداز میں اسکی حمایت کی۔ مارش مین منظم تھا اور اُس نے اور اسکی بیوی نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اسکول شروع کئے جو جدید تعلیم کے مرکز بن گئے۔ مسر ہٹا مارش مین نے سیرم پور میں اور دوسرا کلکتہ میں لڑکیوں کا اسکول قائم کیا۔ سیرم پور کے مشنریوں کے قائم کی ہوئی بیٹھ بمیل اسکول سوسائٹی نے لڑکیوں کے لئے کلکتہ، ڈھاکہ، چنگانگ اور دوسرے شہروں میں اسکول قائم کئے۔

دارڈ طباعت کا کام چاہتا تھا اور اُس نے پہلا چھاپا خانہ قائم کیا۔ جس نے بنگالی حروف کے لئے ٹائپ تیار کئے۔ اُس نے سیریم پور میں ایک بڑا چھاپا خانہ قائم کیا جس میں ایک کاغذ سازی کا خانہ اور ایک ٹائپ ڈھالنے کا خانہ بھی شامل تھا۔ اس چھاپے خانے میں نہ صرف سیریم پور کے مشنریوں اور فورٹ ولیم کالج کے اُستادوں کی تیار کی ہوئی کتابیں چھاپی جاتی تھیں بلکہ کول بروک جیسے عالموں اور اس برغ جیسے سائنس دانوں کی بھی۔ اس چھاپے خانے کی وجہ سے ممکن ہو سکا کہ سیریم پور سے بنگالی اور انگریزی کے اخبارات اور رسائل شائع کئے جائیں۔

چنانچہ سیریم پور کے مشنریوں کے پہلے گروہ نے ہندوستان کو مغربی فکر سے روشناس کرانے کے لئے کئی طرح کی کوششیں کیں۔ اُن کے جانشین تھے۔ جان ٹاکسارٹ مین (1794ء تا 1877ء) جو ہندوستان کی تاریخ کے متعلق ایک کتاب کا مصنف اور فلکیات اور جغرافیہ کی ایک کتاب کا مترجم تھا۔

فیلکس کیری (1726-1822ء) ولیم کیری کا بیٹا۔ اُس نے پہلی بنگالی انسائیکلو پیڈیا تیار کی جس میں انسانی جسم کی ساخت، طب اور کیمیا پر ابواب اور تکنیکی اصطلاحات کی فہرست شامل تھی۔ ولیم ٹیس (1792ء-1845ء) جس نے بنگالی میں طبعی فلسفے اور طبعی تاریخ پر کتابیں لکھیں اور دو جلدوں میں بنگالی زبان کا جائزہ لیا۔

بہت سے دوسرے مشنریوں نے بنگال میں مغربی علم کے بڑے ہوئے حجم میں اضافہ کیا یعنی انگریزی کتابوں اور سائنسی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کے ترجمے کئے۔ اُن کے ادبی کارناموں کا معیار جو بھی ہو لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی فکر کو نئے عوامل مہیا کئے اور قرون وسطیٰ کے بندھنوں کو توڑنے میں ہندوستانی ذہن کی مدد کی۔

IV مشنریوں کے سرگرمیوں کا نیا دور۔ انگریزی تعلیم کا رواج

1813ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک نیا چارٹر دیا گیا۔ جہاں سے ہندوستان میں مشنریوں کی سرگرمیوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ چارلس گرانٹ اور ولیم ویر فورس کی طرح کے مشنریوں کے طاقت ور دوستوں نے پارلیمنٹ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ چارٹر میں ایک ایسی دفعہ کو شامل کر لیا جائے جس کی رو سے ”ان لوگوں کو از روئے قانون سہولتیں فراہم کی جائیں جو اُن فیض رساں ارادوں کو پورا کرنے کی خاطر ہندوستان جانا چاہتے ہیں۔ یاد رہاں رہنا چاہتے ہیں۔“ یعنی مفید علم کو رواج دینے اور مذہبی اور اخلاقی سدھار کی خاطر۔ اُس میں یہ بھی کہا گیا کہ کلکتہ میں اُسقف کا حلقہ اختیار قائم کیا جائے جس کے اخراجات کے لئے ہندوستان کی علاقائی آمدنی میں روپیہ دیا جائے۔

چارلس گرانٹ، جو ہندوستان میں کمپنی کے تحت اہم عہدوں پر فائز رہ چکا تھا اور جس نے بہت دولت پیدا کی تھی، کچھ برسوں کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا صدر ہو گیا تھا۔ اُس نے 1792ء میں ہندوستان کے لوگوں اور تہذیب کے خلاف فرد جرم تیار کی تھی، جو 1797ء میں شائع کی گئی اور اُس وقت بڑے پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت کی گئی جب چارٹر زیر غور تھا۔ سر جان شور اور کلفام فرے کے دوسرے بااثر اراکین حمایت اور غلامی کی مخالفت کے لئے مشہور ولبر فورس کی پر جوش وکالت کی بنا پر انگلش مشنری سوسائٹیوں کو اس امر کی اجازت مل گئی کہ پورے برطانوی علاقے میں بلا کسی رکاوٹ کے اپنا کام جاری رکھیں۔ بہت سے مشنری اور پوری بلا تاتخیر ہندوستان بھیجے گئے اور انہوں نے شمال اور جنوب میں کئی مقامات پر اپنے مرکز قائم کر لئے۔ تعلیم پھیلانے کے کام میں یورپ اور امریکہ کی سوسائٹیوں نے بھی برطانوی مشنوں کا ہاتھ بٹایا۔

1813ء کے چارٹر کے بعد جو سب سے اہم پوری ہندوستان آیا وہ الگوینڈر ڈف تھا۔ 1806ء-1878ء) اُس کے ساتھ ہندوستان میں مشنریوں کے کام کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا اور دوسرے مشنریوں کے مقابلے میں اُس نے گہرے نقش چھوڑے۔ بنگال کو مغربی طور طریق سے متعارف کرانے میں بھی اس کا حصہ اتنا ہی اہم ہے۔ 1830ء میں جب وہ ہندوستان پہنچا تو ڈف نے دیکھا کہ یہاں مشنریوں کا کام سنست ہے۔ عیسائی مذہب قبول کرنے والے محض غریب اور کچلے ہوئے لوگ تھے۔ ”ڈف کے سامنے اہم سوال یہ تھا کہ ”بااثر طبقوں“ یعنی ہندوستان کی بالائی ذاتوں تک رسائی حاصل کرنے کا کوئی امکانی ذریعہ ہے کہ

نہیں؟“ اس کا جواب اُس کی سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ اس کام کا کافی ذریعہ ہے تعلیم اور یہ کہ ہندوستانیوں تک مغرب کی عیسائی تہذیب کا پیغام پہنچانے کے لئے محض انگریزی زبان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ (1) اس نے کہا ”میں ایک وفد بھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ انگریزی زبان وہ ذریعہ ہے جو ہر قسم کی تریل کے آلاکار کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں حرکت پیدا کر دے گی۔“ (2) اس لئے انگریزی زبان جانا ہندوستانیوں کے لئے بہت ضروری ہو گا۔ کیا ہندوستان کے وہ بالائی طبقے جنہوں نے ابھی تک علم و حکومت کے میدان میں دوسروں کی قیادت کی ہے ”انگریزی کی طرف بے نیازی کا رویہ اختیار کریں گے“ اس کا جواب ہے ”نہیں۔“ قدیم بالائی طبقات ممکن ہے بدھ کی زبان کو حقیر سمجھیں لیکن نیا متوسط طبقہ ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے بے چین ہے جو نیا نظام انہیں دے رہا ہے۔ انگریزی اُس تصویر کی طرح جو دولت اور اثر کے نئے نئے میدان کھول دیتا ہے۔ بلائی نوآبادیاتی حیثیت اور ذاتی و ہمد میں اضافہ کر دیں گے۔

ڈف نے فیصلہ کر لیا کہ مشنری کام کا نیا رخ ہوتا چاہیے اسکولوں اور کالجوں کے ذریعہ ہندوستانی نوجوان کو مسیحیت کے زیر اثر لانا۔ اسے اُمید تھی کہ اُس کے ذریعہ وہ ہندوستانی سماج کے بالائی طبقوں تک رسائی حاصل کر سکے گا ہندوستان کے لوگوں کو مسیحیت کے متعلق عام معلومات فراہم کر سکے گا اور بہترین ہندوستانی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو عیسائی بنا سکے۔

ڈف نے رام موہن رائے سے ملاقات کی۔ مغرب کے نمائندے اور انگریزی تعلیم کے ذریعہ ہندوستانی توہم پرستوں کو عیسائی بنانے کی پر جوش حامی کی ملاقات اُس زمانے کے سرکردہ ہندوستانی سے ہوئی جو نئے دور کا نقیب تھا اور خود بھی بڑی سختی کے ساتھ اس خیال پر قائم تھا کہ مادروطن کی کوئی عظمت کو بحال کرنے کے لئے جدید علم کا پھیلا نا ضروری ہے۔ دونوں کے مقاصد میں بعد ایشرفین تھا۔ اول الذکر اس اقدام کو ختم کرنا چاہتا تھا جنہیں ہزاروں سال سے ہندوستان اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے اور آخر الذکر چاہتے تھے کہ قدیم دین کو صدیوں کی خرابیوں اور برائیوں سے پاک کر کے جاوداں بنادیں۔ پھر بھی فوری مقصد کو پورا کرنے یعنی مغربی تعلیم کو پھیلانے کی خاطر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہو گئے۔ 1830ء میں ڈف نے اپنا اسکول کھولا جہاں انجیل کی تعلیم کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔

اس میں شک نہیں کہ الگوینڈر ڈف عجیب و غریب انسان تھا جس کا حکومت اور ہندوستانی سماج پر دور رس اثر پڑا وہ انگریزی تعلیم کی رو روا دالات کرتا تھا۔ اُس نے مشن اسکولوں کا ایک جال بچھا دیا جہاں عیسائی مذہب کی تعلیم کے ساتھ مغربی علم پڑھائے جاتے تھے۔ کلکتہ کے اہم خاندانوں یعنی کمرہ، بیترہ، جی، پلکورتی، گھوش، مجمدار، دت، سرکار، تاتہ، گنگولی وغیرہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے میں اُس نے کامیابی حاصل کی۔ اُن میں سے کچھ نے بنگال میں خاص اہمیت حاصل کر لی مثلاً کرشن موہن بھٹنجر، گوپال ناتھ منڈی، بیش چندر گھوش، آنند چندر مجمدار اور الال بھاری ڈے۔

انگریزی تعلیم کے لیے ڈف کی حمایت ہی اہم وجہ تھی، جس نے بنگلہ کو 7 مارچ 1835ء کی مشہور تجویز جاری کرنے پر آمادہ کیا۔ جس میں انگریزی تعلیم کی موافقت میں حکومت کی نئی پالیسی کا اعلان

(1) سچو۔ بے محلہ بال، صفحہ 177

(2) انگریز ڈف کی تقریر جنرل اسٹینلی میں 25 مئی 1835ء دیکھئے سین۔ بی۔ Western Influence in Bengal

literature (کلکتہ یونیورسٹی 1932ء، صفحہ 75)

کیا گیا تھا اور اس فیصلے کا بھی اعلان کیا گیا تھا کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے جو رقم منظور کی ہے وہ یورپین سائنس اور ادب کی ترویج اور برطانوی تہذیب کو ترقی دینے پر صرف کی جائے گی۔

اُس کے کام ہندوستان میں مشعوں کی پالیسی پر بھی اثر انداز ہوئے۔ پورے ملک میں مشنری سوسائٹیوں کی مدد سے ایسے کالج وجود میں آ گئے جہاں مغربی اور مغربی ادب سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بمبئی میں دکن کالج 1832ء میں اس میں کرچن کالج (1837ء) تانپور میں مسلوپ کالج (1844ء) آگرہ میں سنت ہائس کالج (1853ء) اور سوئم میں نوبل کالج (1841ء) لڈ کی "جنرل اسمبلی کے ادارے (1830ء) کے خطوط پر قائم ہوئے جو بعد میں 1908ء کا کنش جرجیز کالج کلکتہ میں ضم ہو گئی۔

انیسویں صدی کے وسط میں مشنریوں نے جو کام کئے اُن کا جائزہ لیتے وقت اُن کی دوہری یعنی تعمیری اور تخریبی نوعیتوں کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔ تعمیری کاموں میں اہم ہیں۔ تعلیمی ادبی کام، سماجی اصلاح اور طبی سہولتیں۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ جدید ابتدائی اسکولوں کا قریب قریب پورا انتظام عیسائی مشعوں کی مدد سے چل رہا تھا، یہ کہ ہائی اسکولوں میں تعلیم پانے والے طالب علموں کی نصف تعداد اُن کے اسکولوں میں پڑھتی تھی اور یہ کہ کالجوں کی بڑی تعداد کے اخراجات وہ برداشت کر رہی تھی۔ عورتوں کی تعلیم اور اُن کے رہنے کے لئے اقامات گاہوں کا انتظام بڑی حد تک اُن کی مذہبی تھی۔

اس کے علاوہ مشنری اسلوب اور مشنری ادب کی تخلیق بڑی حد تک مشنریوں کی دین ہے۔ جدید ہندوستانی زبانوں میں ایسے لکھنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جنہوں نے سنجیدہ خیالات کے اظہار کے لئے نثر کا مناسب اسلوب پیدا کر لیا ہو۔ اس میدان میں اولیت کا سہرا مشنریوں کے سر ہے۔ نثر کی تخلیق کرنے والوں میں وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے انجیل کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں کیا یعنی کیری، براؤن، نیولن، اسکر، بیلی، کروں ڈٹ وغیرہ انہوں نے صرف و نحو کی کتابیں اور لغت تیار کئے اور اس طرح زبانوں کی ہیئت اور موضوع کا تعین کیا۔ اُن کی ادبی کاوشیں محض مذہبی رسالوں اور کتابوں تک محدود نہیں تھیں بلکہ انہوں نے اسکولوں کے لئے نصابی کتابیں تیار کیں۔ بین کے پلگر مس پروکرس کی طرح کی کتابوں کے ترجمے کئے اور ہندوستان کے مذہب، مذاہب، مذاہب، مذاہب اور دیوا داؤں کا بیان کتابوں میں کیا۔

تعلیم کے میدان میں ہندوستان میں عورتوں کے لئے اسکول، کالج اور اقامت گاہیں کھولنا خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ وسطی دور کے ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم پوری طرح نظر انداز کی گئی تھی۔ گھروں اور سماج میں اُن کا جو اثر ہے اُس کے پیش نظر اُن کی تعلیم کی قدر و قیمت اُس سے کہیں زیادہ ہے جو اُن کی تعداد ظاہر کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ عورتوں نے ملک کی عوامی زندگی میں روز افزوں حصہ لیا اور آزادی کی جدوجہد میں پوری طرح شریک ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی بیداری کا پہلا مرحلہ عیسائی مشعوں کا سر ہون منت تھا۔

اگر اُن کے مثبت رول سے نظر ہٹا کر مشنریوں کے دوسرے کاموں پر توجہ دی جائے، تو یہ معلوم ہو گا کہ نتائج کی حد تک وہ بھی اتنے ہی موثر تھے لیکن وہ نتائج مختلف قسم کے تھے۔ یہ تھے اُن کے تبلیغی کام جن میں عیسائی مذہب کے عقیدوں اور اصولوں کی تبلیغ اور دوسرے ہندوستانی مذہب پر اُن کے خطیاتیہ حملے شامل تھے۔ تعلیم میں بھی اُس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ "جب کوئی استاد

چاہے وہ ہندو ہو، مسلمان ہو یا عیسائی ہو سائنس اور ریاضیات کا درس دیتا ہے۔ تو وہ لوہے کی ایک سلاخ سے ہندو دھرم کے مٹی کے بنے ہوئے برتنوں کو پاش پاش کرتا ہے۔“ (1)

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں کے نصف اوّل کے پروٹسٹنٹ مشنری مذہب میں آنے والے انقلاب کے دور کے پیداوار تھے جس کی ابتدا پیرام اور مورونیرم سے ہوئی اور میٹھاڈائزم تک پھیل گیا۔ یہ اچیاور جذبات کے افراط کا زمانہ تھا۔ اُن کے عقیدہ تھا عیسائی اخلاق اور راست بازی کے ذریعہ ترقی کرنا اور مسیحی اصولوں کے ذریعہ سماج کی اصلاح کرنا اور دنیا کو سدھارتا۔ کلیسیا فرقہ کے اراکین کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اسکول، جیل کا نظام و ضبط، بچت کے بنک، راستے، گاؤں کے کتب خانے، گاؤں کی آمد و رفت اور گرچا کی عمارتیں ان میں سے ہر ایک کچھ زمانے کے لئے اُن کے وسیع الشرب پروجیکٹوں میں تھے۔ انسانی دلچسپی کے ہر کام کی کوئی نہ کوئی نگرانی کرتا تھا اور دنیا کے ہر خطے میں اُن کے نمائندے تھے۔ (2)

اچیا پرستی کی شراب تیز ہے اور جو پروٹسٹنٹ مشنری ہندوستان آئے انھیں اس نے سرشار کر دیا تھا۔ اُن میں عیسائی مذہب کی اصلاح کرنے والوں کا شدید تعصب اور سختی سرایت کر گئی تھی۔ دلیر فورس کی طرح وہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندوستان ”ہندیکینوں کا مسکن اور پست و ذلیل علاقہ ہے اور ہندوستان کی توہم پرستی کے بے اندازہ گہرائی پر شدید کراہیت کے اظہار میں“ اس کے ہموار تھے۔ چنانچہ ہندو دھرم، اسلام اور ہندوستان کے دوسرے مذہب کی مذمت کرنے میں وہ احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے۔ اُن کی تقریریں اور تحریریں ہندوستانی مذہب و اخلاق کی طور طریق، ردواجوں، تہاڑوں، تقریوں اور رہن بن بن کے خلاف گالیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی کو نہیں بخشتے تھے واقعہ یہ ہے کہ اگر مذہب کی حیثیت سے وہ اسلام پر زیادہ تنقید نہیں کر پاتے تھے۔ تو وہ اُن کی سیاست کی مخالفت کر کے اس کی کوپوراکر لیتے تھے۔ بہر حال انگریزوں نے ہندوستانی سلطنت مسلمانوں سے جیتی تھی اور انھیں اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اُس وقت اُن دنوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ ہندوؤں کو وہ زیادہ چالاک اور نرم تصور کرتے تھے اور مسلمانوں کو زیادہ جھمکنڈی اور ہمت والے۔

v تعلیم کی طرف حکومت کا رویہ

اپنی برائیوں کے باوجود مشنریوں کی تعلیمی سرگرمیوں نے وہ ضرورت پوری کر دی جس کو ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے نئے طبقے محسوس کر رہے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ افادیت اور سماجی و قاری دونوں کے اعتبار سے انگریزی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ تجارتی کاموں میں انھیں انگریز تاجروں سے سابقہ پڑتا تھا اور اُن سے خود انہی کی زبان میں بات کرنا ظاہر ہے کہ زیادہ مفید تھا۔ اس کے علاوہ ملازمت کے تعلق سے بھی چاہے وہ بدیسوں کی محلی کہنیوں میں ہو یا کمپنی کے انتظامیہ میں انگریزی سے تاملد ہندوستانی کے مقابلے میں انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کو ترقی کے زیادہ مواقع ملتے تھے۔ انگریزی جاننا ایسے بھی مفید تھا۔ اسلئے کہ اُس کی بنا پر ایک ہندوستانی آسانی کے ساتھ انگریزوں سے راجہ رسد پیدا کر سکتا تھا اور اس طرح خود اپنے طبقے کے لوگوں میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر سکتا تھا۔ انگریزوں کو بھی اس میں سہولیت تھی اگر

(1) مشرک، بے، اے۔ South India Mission (دیسٹ فشر 1710ء) صفحہ 227

(2) رٹون ہے۔ ایچ The Franghehra revival in the 18. Century (تاریخ کلیسیا کے دور صفحہ 48)

وہ کسی ہندوستانی تاجر ایجنٹ یا ماحت کے ساتھ انگریزی زبان میں کاروباری گفتگو کر سکتے تھے۔

پہلے کچھ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے ساتھ روابط کی بنا پر انگریزی سیکھ لی۔ اس کے بعد ان نئی اسکولوں میں انگریزی سیکھی جو انگریز چلا رہے تھے۔ کمپنی کے فوج سے بھاگے ہوئے لوگوں اور انگریز تاجروں نے بہت سے ہندوستانیوں کو انگریزی سکھائی۔ ابتدا ہی میں مشن اسکول قائم ہو چکے تھے انہوں نے انگریزی میں تعلیم دی۔ جوں جوں یہ زبان پھیلتی گئی ویسے ویسے اسکی مانگ بڑھتی گئی۔ جب کمپنی بنگال کے صوبے کی حکمران بن گئی تو انگریزی کی تعلیم کے لئے محرکات پیدا ہو گئے۔ جن انگریز افسروں پر انتظام کی ذمہ داری ہوتی تھی انہیں فارسی سیکھنی پڑتی تھی۔ ان کے لئے فارسی سیکھنا خاصہ دشوار کام تھا۔ اس لئے وہ ملازمت کے تعلق سے انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ چنانچہ دونوں میں انگریزی زبان کو رواں دواں بننے کی خواہش پائی جاتی تھی۔

جب انگریزی زبان کے کے متعلق ہندوستانیوں کی معلومات میں اضافہ ہوا تو وہ انگریزی ادب اور سائنس کی بھی قدر و قیمت سمجھنے لگے۔ افادیت کے تصور میں ذہنی تلاش کا اضافہ ہو گیا جس نے انگریزی سیکھنے کی خواہش اور بڑھادی۔

فارسی کا استعمال بہر حال ختم ہوتا تھا۔ اب وہ حاکموں کی زبان نہیں رہی تھی۔ وہ محکموں کی بھی زبان نہیں تھی۔ مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی عربی اور ہندوؤں کی سنسکرت۔ اس میں شک نہیں کہ کئی سو سال تک تعلیم یافتہ مسلمانوں اور تعلیم یافتہ ہندوؤں نے فارسی کی آبیاری کی تھی لیکن نئی حکومت کے زمانے میں اسکی افادیت کا زمانہ ختم ہو رہا تھا۔

انگریزی حکومت کے ابتدائی برسوں ہی میں یہ خیال تقویت پارہا تھا کہ انگریزی کو حکومت کی زبان ہونا چاہیے۔ چارلس گرانٹ کی طرح کے لوگ اس خیال کی وکالت کر رہے تھے اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ ”قلمت زدہ“ ہندوستانیوں کی تجارت کا واحد ذریعہ ہے مغربی علم کی روشنی اُن تک پہنچانا اور وہ ذریعہ جس سے یہ روشنی پہنچائی جاسکتی ہے انگریزی زبان ہے۔ گرانٹ نے کہا ”ہمارے مشرقی مقبوضات..... وہ ہمارے ہیں ہم ان پر مدتوں سے قابض ہیں۔ بہت سے انگریز وہاں کے مقامی لوگوں کے درمیان رہتے ہیں۔ ہماری زبان وہاں اجنبی نہیں اور اُس کو زیادہ پھیلانا ایک قابل عمل امر..... سب سے پہلے انگریزی سکھائی جانی چاہیے جو دوسرے علوم کو سکھانے کا ذریعہ ہے..... محکموں کو حاکموں کے معاملے بنانے کا مین ذریعہ ہے حاکموں کی زبان کو رواں دواں کرنا۔“ (1)

اس کی کچھ اور وجوہ بھی تھیں۔ حکام کا کہنا تھا کہ مالگوار یا سیاسی انتظام کے معاملات میں محکوم لوگوں کی اصلاحات استعمال کرنا، حاکموں اور محکموں کے درمیان ترسیل خیالات کے ایک آسان راستے کو نظر انداز کرنا اور ایسے اعلیٰ عہدیداروں تک رسائی حاصل کرنے سے انہیں محروم رکھنا، جو ان کی زبان میں جانتے ہیں، محض حماقت ہے۔

آخری بات یہ تھی کہ مغربی ادب اور سائنس کا علم نہ صرف اُن کی ذہنی غلامی کو ختم کر دے گا

(1) گرانٹ، سی. Observation on the State of Society Among the Asiatic Subjects of Great Britain

(دیکھئے) Report of the Committee of House of common on the Affairs of the East

India Company 16 اگست 1832ء، صفحہ 1

بلکہ تمام معاملات میں مقبولیت پسندی کو رواج دے گا، زمین، آب و ہوا اور حالات سے مناسب انداز میں فائدہ اٹھانے کی اہلیت بڑھائے گا اور زندگی کی آسائشوں اور آسائشوں میں اضافہ کر دے گا۔

کرائٹ کو یہ خوف بھی نہیں تھا کہ تعلیم کا فروغ برطانوی سلطنت کے خاتمے کا باعث ہوگا۔ اُس کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم کی بنا پر حکمران اور محکوم ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ سکیں گے۔ ہندوستان کے لوگوں میں جذبہ احسان مندی پیدا ہو گا اور ہندوستان میں برطانوی تجارت بڑھ جائے گی۔

لیکن جہاں تک کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کا تعلق تھا اُن دلیلوں میں سے کسی کا اثر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ وہ اپنی حکومت کے استحکام پر تعلیم کے مضر اثرات سے خائف رہے۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر انگریزی حکومت خود انگلستان کے لوگوں کی تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کر رہی ہے تو ہندوستانی رعایا کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنا کمپنی کے لئے قبل از وقت ہے۔

چنانچہ 1765ء سے 1813ء تک کمپنی نے عام تعلیم کی اہمیت افزائی کرنے کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ لیکن کمپنی کا یہ خیال ضرور تھا کہ ہندوستانی حکمرانوں کے ہاتھوں سے اختیارات منتقل ہونے کے بعد اُس کے پیش روؤں کے کچھ فرائض ادا کرنے کی ذمہ داری اُس پر ہے یعنی عالموں کی سرپرستی اور مدرسوں اور نولوں میں اعلیٰ تعلیم کے لئے اوقاف کی۔ اس کی ضرورت بڑھ جانے کی ایک وجہ یہ بھی کہ قانون کے نفاذ اور انصاف کرنے کے لئے ایسے عالموں کی ضرورت پڑتی تھی جو ہندو اور مسلم قوانین سے اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔

چنانچہ دارن ہیسٹنگز نے 1780ء میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اُس کا مقصد تھا کلکتہ کے مسلمانوں کو خوش کرنا (1) اور ریاست کے ذمہ دار اور منافع بخش عہدوں کے لئے مسلمان شرفاء کے بیٹوں کو تیار کرنا۔ جن پر اس وقت بھی زیادہ تر ہندو فائز تھے اور عدالت کے لئے بلاصلاحیت حکام پیدا کرتا۔

اُس کے بعد ریزیدنٹ جو تھن ڈکن نے 1791ء میں بنارس سنسکرت کالج قائم کیا اُس کے مقاصد کچھ اُسی قسم کے تھے جیسے کلکتہ مدرسہ کے یعنی ہندوؤں کو خوش کرنا۔ ویلزلی کے فورٹ ولیم کالج کا مقصد، جو 1801ء میں کھولا گیا تھا کمپنی کے انگریز سول ملازمین کو تعلیم دینا تھا۔ لیکن اس کے اساتذہ سے درسی کتابیں، صرف و نحو کی کتابیں اور ہندوستانی زبانوں کی نصاب تیار کرنے اور دوسری زبانوں میں کتابوں کے ترجمے کرنے کا بھی کام لیا گیا۔ اس کا اصل کارنامہ تھا ہندوستانی ادب اور خصوصیت کے ساتھ نشر کو ترقی دینا۔

کلکتہ مدرسہ اور بنارس ہندو کالج کے قیام، ہندوستان کی کلاسیکی زبانوں میں دلچسپی لینے والے انگریز عالموں مثلاً وگلنس، ولیم جونس، کولبروک وغیرہ کی تحقیق و تفتیش اور انگلستان میں تعلیم کے متعلق بڑھتے ہوئے جوش کا اثر ہندوستان کے حاکموں کے خیالات پر بھی پڑا۔ 1811ء میں لارڈ منٹون نے ایک ردو اوپنٹیشن جس میں ہندوستان کے لوگوں میں ادب اور سائنس کے روز افزوں زوال کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جس کی وجہ اُس کے بقول تھی، ”اُس قسم کی ہمت افزائی کی کمی جو مقامی حکومتوں کے تحت والیان ریاست، سرداروں اور دولت مند افراد کی طرف سے کی جاتی تھی۔“ (2) اور اُس نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ

(1) ہوویل کرتے Educational in British India (کلکتہ 1872ء)

(2) لارڈ منٹون کی روداد مورخہ ۲۶ مارچ دیکھیے یو۔ ایس۔ اینڈ۔ Indian Education in Parliamentary

برطانوی حکومت ہندوؤں کے ادب کی آبیاری میں ناکام تھی۔

1813ء تک انگلستان کی رائے عامہ اس حد تک بیدار ہو چکی تھی کہ چارٹر میں ایک دفعہ شامل کی گئی کہ ”دور رقم ایک لاکھ روپے (10,000 پاؤنڈ) سے کم نہیں ہوگی جو ہر سال ادب کی ترقی، ہندوستانی عالموں کی بہت افزائی اور ہندوستان میں برطانوی علاقوں کے باشندوں میں سائنسوں کے علم کے رواج اور ترویج کے لئے مختص کی جائے گی۔“ (1)

لیکن اس دفعہ پر 1823ء تک عمل نہیں کیا گیا۔ 1813ء سے 1833ء تک کسی ایک سال میں 10,000 پاؤنڈ کی پوری رقم خرچ نہیں کی گئی۔ اُس کے بعد تعلیم کے اغراض و مقاصد اور طریقوں کے متعلق کمپنی کے حاکموں میں اختلافات رونما ہو گئے۔ بالآخر میکالے کے مشورہ پر بیچلک نے 7 مارچ 1835ء کی تجویز منظور کر کے اس نزاع کو ختم کیا۔

VI غیر سرکاری اجنسیوں کا کام

عام تعلیم کی طرف سے کمپنی اور اُس کو فروغ دینے کی خواہش کے باوجود درمیانی زمانہ محض بے کاری کا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے تعلیم کے میدان میں مشنریوں نے تھوڑا بہت کام کیا تھا۔ مشنریوں کے علاوہ خود ہندوستانی بھی جدید تعلیم کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے تھے۔ حالانکہ اُن کے پاس وسائل کم تھے اور مواقع بھی انہیں زیادہ حاصل نہیں تھے۔ لیکن ہندوستانی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مغربی تعلیم کا انتظام کرنے کے سلسلے میں خوش قسمتی سے انہیں سرکاری اور غیر سرکاری انگریزوں کا تعاون حاصل تھا۔

اس تعاون کا سب سے پہلا نتیجہ تھا 1817ء میں ہندو کالج یاد دیا لے کا قیام۔ ہندوستان میں مغربی تعلیم کے سب سے بڑے حامیوں میں شامل تھے رام موہن رائے اور ڈیوڈ ہیئر جو گھڑی سازی اور زیورات بیچنے کا کام کرتا تھا اور کلکتہ میں آباد ہو گیا تھا تاکہ اپنی زندگی تعلیم، سماجی اصلاح اور برل اداروں کے لیے وقف کر دے۔ ڈیوڈ ہیئر کی بڑی خواہش تھی کہ وہ انگریزی زبان و ادب اور یورپین سائنسوں کی تعلیم دینے کے لئے ایک کالج قائم کرے۔ اپنے سیکولر نقطہ نظر اور شکریت کو نظر انداز کرنے کے باوجود اسے بہت سے اہم ہندوؤں کا اور سر ایڈورڈ ڈی بائڈ ایسٹ کی حمایت حاصل ہو گئی جو کلکتہ چیف کورٹ کا چیف جسٹس تھا۔ اُن کی مدد سے اُس نے ایک کمپنی بنائی اور روپیہ جمع کیا۔ رام موہن رائے نے اس کمپنی سے علیحدہ رہنا مناسب سمجھا اس لئے کہ ہندو دھرم اور سماجی اصلاح کے تعلق سے اُن کے ترقی پسند خیال کو لوگ ناپسند کرتے تھے۔

اس طرح جو کالج معرض وجود میں آیا وہ محض ہندو طالب علموں کے لئے تھا۔ اُس کے طالب علموں کی تعداد جلد بڑھنے لگی اور 1828ء تک اُس میں 436 طالب علم ہو گئے تھے۔ اس دوران اس کا انتظام ناکارہ لوگوں کے ہاتھوں میں آ گیا جس کی وجہ سے جزل کمپنی کو مداعت کرنی پڑی اور ایک وزیر مقرر کر دیا گیا۔ بالآخر حکومت نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور 1855ء میں پریسڈنسی کالج میں ضم کر دیا۔

رام موہن رائے جو انگریزی تعلیم کے بڑے پر جوش حامی تھے، 17-1816ء میں اپنے خرچ

سے ایک انگریزی اسکول قائم کر چکے تھے جہاں اُن کے بیٹے رام پرساد اور اُن کے دوست مہارشی دوارکاتھ ٹیکور کے بیٹے دیندر ناتھ ٹیکور نے تعلیم پائی۔ اسکول کے علاوہ انہوں نے ویدانت کالج بھی قائم کیا جہاں جدید فکری روشنی میں ہندو فلسفے اور دوسرے علوم کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔

ہندو کالج کے ابتدائی زمانے میں عقیدہ و نظریہ کے متعلق اُس کے طالب علم ہندوؤں کے پرانے خیالات کی ضرورت سے زیادہ کھلم کھلا عدول صحتی کے لئے بدنام ہو گئے تھے۔ تئیر کی ہوا چلنے لگی تھی۔

ایک اور غیر سرکاری ایجنسی جو تعلیمی کام کر رہی تھی کلکتہ اسکول سوسائٹی تھی جو 1819ء میں ابتدائی تعلیم کے لئے اسکول قائم کرنے اور استادوں کو تربیت دینے کی خاطر قائم کی گئی تھی۔ 1823ء میں اُسے حکومت کی طرف سے مالی مدد ملی۔

جدید تعلیم پھیلانے کے سلسلے میں نجی کوششوں کی کامیابی نے ظاہر کر دیا کہ تعلیم کی مانگ تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی کمپنی کی حکومت کو جو ابھی تک تعلیمی معاملات میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی مجبوراً اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرنی پڑی۔

VII انگریزی تعلیم کی کامیابی

اڈم نے جو عارضی طور سے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھا 1823ء میں تعلیمات عامہ کی ایک عام کمیٹی مقرر کی۔ جس کے دس رکن تھے۔ جن میں ایچ۔ آئی پرنسب اور ایچ۔ ایم ولسن بھی شامل تھے اور اُنکے ہاتھوں میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی گرانٹ بھلیا جات اور اُس وقت موجود اداروں کے لئے منظور ہونے والی رقمیں دیں۔

اس کمیٹی کے سامنے دو سوال تھے۔ پہلا تھا دی جانے والی تعلیم کے نوعیت کا فیصلہ کرنا اور دوسرا تھا اس امر کا تعین کرنا کہ یہ تعلیم کس کو دی جائے۔ سوال یہ تھا کہ تعلیم کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے روایتی علوم تک محدود رکھا جائے جو سنسکرت اور عربی زبانوں میں پائے جاتے ہیں یا اس کی توسیع مغربی سائنسوں اور مغربی زبان اور ادب تک کی جائے۔ دوسرا سوال تھا کہ آیا تعلیم کو مختلف بالا اعلیٰ طبقوں تک محدود رکھا جائے یا اس سیکیم میں عام لوگوں کو بھی شامل کیا جائے۔

کمپنی میں مختصر قین کو غلبہ حاصل تھا جو بڑی سختی سے اس رائے پر قائم تھے کہ ”یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں ابھی تک اس قسم کے میلانات پائے جاتے ہیں اور کسی مفید بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ذرائع موجود نہیں ہیں اس لئے مدد کے خیال میں یہ بات ضروری ہے اور سرکاری ادارے بالترتیب ان طبقات کو ہمیں امید ہے (زیادہ ان تک نہیں) مسلم اور ہندو ادب سائنس کی تعلیم دیں گے۔“ (1)

اُن کی مخالفت کورٹ آف ڈائریکٹرز کر رہا تھا۔ جو پیچھے کم کے شاگرد جیمس مل ہیش ہیر اور انگریز انڈوڈف کی طرح کے کئی عیسائی مشنریوں اور رام موہن رائے کی قیادت میں ہندوؤں کے ترقی یافتہ طبقے کے زیر اثر عمل کر رہا تھا۔ رام موہن رائے نے اور ڈائریکٹرز کو ایک سخت خط لکھا تھا جس میں کلکتہ کے

سنسکرت کالج کی مخالفت کی تھی اور سنسکرت پڑھانے کی مذمت کی تھی۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے کہ نوجوان کی زندگیوں کے بہترین بارہ سال بیکرن (ویا کرن) اور سنسکرت کی صرف و نحو کی باریکیوں کو سمجھنے میں صرف ہو جائیں“ (۱) یادیدانیت کے یاسینانایا کے خیالی گھوڑے دوڑائے جائیں جو نوجوانوں کے سانچے کے اچھے رکن بننے میں معاون نہیں ہوتے ہیں۔ رام موہن رائے نے مزید کہا۔ ”لیکن چونکہ حکومت کا مقصد ہے مقامی آبادی کی ترقی اس لئے اسکو تعلیم کے زیادہ لبرل اور روشن خیال نظام کو فروغ دینا چاہیے۔ جس میں ریاضیات، طبعی فلسفہ، کیمیا، انسانی جسم کی ساخت کا علم اور دوسری مفید سائنس شامل ہے۔ یہ کام معینہ رقم سے کیا جاسکتا ہے۔ یورپ میں تعلیم پائے ہوئے باصلاحیت اور با علم حضرات کو ملازم رکھا جاسکتا ہے، اور ایسا کالج قائم کیا جاسکتا ہے جس میں ضرورت کی کتابیں۔ آلات اور دوسری اشیا موجود ہوں۔“ (2)

گورنر جنرل کی کونسل کے نئے قانون ساز ممبر کی حیثیت سے جب میکالے 1834ء میں ہندوستان آیا تو اس مخالفت کو اور تقویت مل گئی۔ وہ تعلیم کی کونسل کا صدر مقرر کیا گیا اور اس کے اختیارات و اثرات کی بنا پر انگریزی تعلیم کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اس نے 2 فروری 1935ء کو اپنی مشہور روداد گورنر جنرل لارڈ ولیم بیٹک کو پیش کی اس کی دلیلوں اور متوازن جملوں کے اسلوب سے متاثر ہو کر بیٹک نے اس پالیسی کو منظور کر لیا جس کی سفارش میکالے نے کی تھی۔ اس کے علاوہ میکالے نے وہ واقعات پیش کئے تھے جو اس طریقے کار کی حمایت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ کہ ہندوستانی انگریزی تعلیم کے حامی ہیں اور اس کو حاصل کرنے کا خرچ برداشت کرنے کو تیار ہیں جبکہ سنسکرت اور عربی پڑھنے کے لئے انہیں رقیں دینا ہوتی ہیں اور ان کے نوجوانوں نے کمپنی کے سامنے عرضداشت پیش کی ہے جس میں اپنی زبوں حالی کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اسلئے سنسکرت کالج میں مدد توں وہاں کے وسیع لغات کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی اس کی کوئی امید نہیں کہ ان کے حالات بہتر ہو سکیں جبکہ اسکول بک سوسائٹی کی چھاپی ہوئی 31,000 انگریزی کی کتابیں دو سال میں بک انہیں سنسکرت اور عربی کی اتنی کتابیں تین سال میں نہیں کی ہیں ان کی طباعت کے اخراجات تو درکنار ان کو دو مہینے تک گودام میں رکھنے کے اخراجات بھی نہیں نکل سکیں۔“ (3)

بیٹک اس پر آمادہ ہو گیا کہ حکومت جو رقم خرچ کرنا چاہتی ہے وہ مفید علم کی تعلیم دینے پر صرف کی جائے اور اس طرح وہ اس خیال سے متفق ہو گیا کہ ہندوستانوں کے ابھرتے ہوئے طبقے کو تعلیم دینے کا مقصد ہے مغربی علوم کو روانہ دینا۔ جس کی وجہ سے ایک ایسا طبقہ وجود میں آجائے گا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو گا لیکن مذاق، رائے اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو گا۔ ”یا معمولی لفظوں میں کہا جاسکتا ہے۔ کہ جدید ذہن رکھنے والا ہندوستانی ہو گا۔

یہ فیصلہ ہندوستان کی رائے عامہ کے مطابق تھا۔ جو جنگ اور امن کے معاملات اور انتظام و صفت کے طریقوں میں مغربی فاتحین کی سلسلہ برتری سے متاثر تھی۔ ان کے صحت مند طبعی میلانات نے

(1) The English work of Raja Ram Mohan Ray (تبدوین کوش ہے۔ سی۔ جلد (تھکے 1901ء) صفحہ 326)

(2) ایضاً صفحہ 327

(3) ٹرو لین، سی۔ ائی۔ On the Education of the People of India (اگست 1838ء) صفحہ 9

اُن پر یہ بات روشن کر دی کہ ترقی کی منزل تک پہنچنے کا راستہ زندگی کے متعلق نئے نقطہ نظر، نئے انداز فکر اور نئے طور طریق کا راستہ ہے۔ نئے طبقے کی توقعات کے سب سے نمایاں شارح تھے رام موہن رائے۔ لیکن بہت سے کٹر اور دقیانوسی خیالات رکھنے والے ہندوستانی بھی اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے۔ اور انہوں نے بھی مغربی تعلیم اور علم کے پرچار کی اسکیموں کی حمایت کی۔

ہندوستانیوں میں انگریزی تعلیم کے رواج نے برطانوی انتظامیہ کی ضرورتیں بھی پوری کر دیں۔ ماتحت خدمات پر بہت سے ہندوستانیوں کا تقرر ایک انتظامی ضرورت تھا۔ مغربی انداز سے سوچنے کی تربیت نے ایک مغربی انتظامی ڈھانچے کا کام آسان بنا دیا۔ اس کی وجہ سے اعلیٰ برطانوی نظام کو رعایا کی زبان سیکھنے کے دشوار عمل سے بڑی حد تک نجات مل گئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں مغربی ادب و سائنس کا مذاق بڑھے گا اور مغربی علم کی جو قدر اُن کے دلوں میں پیدا ہوگی اُس کی وجہ سے اُن میں ان لوگوں کے لئے دوستانہ جذبہ احسان مندی پیدا ہو جائیگا جنہوں نے جدید علم کا تحفہ اُن میں دیا ہے۔ اس خطرہ کو وہ محض مبالغہ آرائی کرنے پر غیر حقیقی خطرہ سمجھتے تھے کہ تعلیم انہیں آزادی کا مطالبہ کرنے پر اکسائے گی۔ انگریزی تعلیم کو رواج دینے کی وجہ ظاہر تھی۔ انفسٹن نے لکھا تھا کہ ”مقامی باشندوں کے مذہبی جذبات کی نزاکت نے ہمارے سامنے اس خطرے کو اکھڑا کیا ہے اور ہمارے رعایا کے درمیان مکمل علاج گدی کے بنا پر ہماری حکومت کی بنیاد جس حد تک کمزور ہے اُس کا تقاضہ ہے کہ ہم اس خامی کو دور کرنے کی خاطر کچھ اقدامات کریں۔ ہمارے سامنے واحد راستہ یہ ہے کہ معقول تعلیم کا انتظام کر کے ہم اُن کے تحصیلات کو دور کریں اور اپنے اصول اور خیالات اُن تک پہنچائیں، (1) ہمیں کے گورنر سر جان مالکم نے 1838ء میں لکھا تھا۔ ”میری رائے میں ہندوستان کے باشندوں میں تعلیم پھیلانے کا ایک بڑا مقصد ہے اپنی انتظامیہ کے ہر شعبے میں انہیں شامل کرنے کے لئے زیادہ محجاش نکالنا، اخراجات کو کم کرنے، انتظام کو بہتر بنانے اور تحفظ کے لئے میں اس کو ضرور سمجھتا ہوں۔ (2)

کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اپنے خط مورخہ 5، ستمبر 1827ء میں انگریزی تعلیم کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔ ”ملک کے کاروبار اور حکومت کے اہم حکموں میں مقامی باشندوں کو ملازم رکھنے کی روز افزوں مانگ کے پیش نظر بہتر تعلیم کا پہلا مقصد ہونا چاہیے ایسے لوگوں کی ایک جماعت تیار کرنا جو سرکاری فرائض سرانجام دے سکیں ہمیں یقین ہے کہ تعلیم کا مجوزہ نصاب نہ صرف اعلیٰ قسم کی ذہنی صلاحیت پیدا کرے گا بلکہ جو اس سے مستفیض ہوں گے اُن کا اخلاقی معیار بھی بلند ہو جائے گا اور آپ کو ایسے ملازم مل جائیں گے جن کی راست بازی پر آپ زیادہ اعتماد کر سکیں اور ذمہ داری کے عہدے اُنہیں سونپ سکیں۔“ (3)

اس کے بعد اپنے خط مورخہ 29، ستمبر 1830ء کو کورٹ آف ڈائریکٹرز نے ایک دفعہ پھر تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جس کا مقصد ”ایسے لوگوں کا طبقہ بنانا ہے جو اپنی ذہنی صلاحیت اور اخلاق کی بنا پر ہندوستان کے سول انتظام میں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کئے جانے کے قابل ہوں۔“ (4)

(1) انفسٹن کی رد و رد مورخہ 13 دسمبر 1823ء دیکھئے پوائے۔ این محولہ بالا صفحہ 209

(2) ایسا صفحہ 223

(3) بنگال کے گورنر جنرل اجلاس کو نسل کے ہم کورٹ آف ڈائریکٹرز کا خط مورخہ ستمبر 1837ء ایسا صفحہ 160

(4) ایسا، صفحہ 169

چنانچہ 1835ء تک ہندوستانوں کی ذہنی بے چینی، انتظامی ضرورتوں، عیسائی مشنریوں اور سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں میں لبرل افرو کی ترقیب اور اُن کے قائم کئے ہوئے انگریزی کے اسکولوں کی مقبولیت نے گورنر جنرل کو میکالے کی خاص خاص تجویز منظور کرنے پر آمادہ کر دیا۔

لیکن اگرچہ بیلک نے پورچین لوب اور سائنس کا انتخاب کر لیا اور انگریزی تعلیم کے لئے رقم منظور کر لی لیکن اُس نے مشرقی علوم کی تعلیم دینے والے اداروں کو ختم کرنے کی سفارش نہیں منظور کی۔ وہ کلکتہ اور بنارس کے سنسکرت کالجوں کو ہلی امداد دیتا رہا۔ لیکن مشرقی علوم کے طالب علموں کو دینی دینے اور مشرقی کتابوں کی طباعت پر روپیہ خرچ کرنے کا طریقہ اُس نے ختم کر دیا۔

اسکول نے مشرقی کتابیں چھاپنے کا طریقہ جاری رکھا۔ مشرقی اور مغربی تعلیم کے حامیوں کا جھگڑا اس کی 24 نومبر 1839ء کی روداد نے ختم کر دیا جس میں کہا گیا تھا کہ مشرقی تعلیم کے موجودہ ادارے جاری رکھے جائیں گے اور اس امر کا یقین دلایا گیا تھا کہ منظور شدہ رقم کی حد تک مشرقی زبان کی کتابیں تیار اور طبع کی جاتی رہیں گی۔ اسی کے ساتھ اُس میں بیلک کے اس فیصلے کی دوبارہ تصدیق بھی کی گئی تھی کہ مغربی علوم کی تعلیم کو فروغ دیا جائیگا۔

اس زمانے میں دو اور متعلقہ مسائل نے بڑی زور مئی شکل اختیار کر لی تھی۔ پہلے کا تعلق تھاذریعہ تعلیم سے اور دوسرے کا عام لوگوں میں تعلیم پھیلانے سے۔ ان دونوں کے فیصلوں کے دور رس قسم کے تہذیبی، سماجی اور سیاسی نتائج ہوئے۔

جہاں تک ذریعہ تعلیم کا تعلق تھا اُس کے متعلق تین رائے پائی جاتی تھی۔ ایک مدرسہ فکر کے لوگوں کا خیال تھا کہ ہائی اسکول اور یونیورسٹی کی تمام تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دی جائے۔ دوسرے کتب فکر کے لوگوں کا خیال تھا کہ علم کے مغربی شعبوں کی تعلیم کا ذریعہ ہندوستان کی کلاسیکی زبانیں یعنی سنسکرت، فارسی اور عربی ہونی چاہئیں۔ تیسرے مدرسہ فکر کے لوگ اس مقصد کے لئے بولی جانے والی زبانوں یعنی بنگالی، ہندی اور اردو کو مناسب، موزوں سمجھتے تھے۔

پہلے قسم کے لوگوں میں پیش پیش تھا چارلس گرانٹ اُس کا خیال تھا کہ فائدہ کے لحاظ سے انگریزی زبان کو فوقیت حاصل ہے۔ انگریزی نہ صرف نئے تصورات کی کلیہ ہے بلکہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ غلطیوں کے اُس پلندے کا شیرازہ بھی بکھیر دے گی جس کو ہندوہرم کہا جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فاتحین کی زبان کی تعلیم مفتوح لوگوں کو اپنے ماحول بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن حکومت کو انگریزی کے حق میں تیار میکالے کی وکالت نے کیا۔ اُس نے بولی جانے والی زبانوں کی مذمت کی اور کہا کہ ادبی اور سائنسی علوم کی ترسیل کی اُن میں صلاحیت نہیں ہے اور اس لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے اُن کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں۔ سنسکرت اور عربی کے متعلق اُس کے خیال کا اظہار اس پر مبنی مگر جہالت اور حقارت پر مبنی خطے سے ہوتا ہے۔ ”کسی بھی یورپین لائبریری کی ایک الماری قدر قیمت کے اعتبار سے ہندوستان اور عرب کے تمام مقامی ادب کے برابر ہے“ (۱) انگریزی زبان کی تعریف و ستائش کرنے کے بعد اُس نے انگریزی کے استعمال کی سفارش کی اس لئے کہ ”ہندوستان میں انگریزی ہوزبان ہے جو حکمران طبقہ بولتا ہے۔ حکومت کے صدر مقامات پر مقامی لوگوں کا بالائی طبقہ بھی اسے بولتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ یہ زبان مشرق کے تمام

سندروں میں کاروباری زبان بن جائے۔“ (1)

سر چارلس ٹریولین نے، جو تعلقات عامہ کی کمپنی کارکن اور میکالے کا برادر نسبی تھا انگریزی کو استعمال کرنے کے حق میں دو دور و لیلیں دیں۔ اُس کا خیال تھا کہ انگریزی کی تعلیم کا اثر یہ ہو گا کہ ہندوستانی زبانیں مالا مال ہو جائیں گی۔ اُن میں اتحاد پیدا ہو گا اور اس طرح ہندوستان کے تہذیبی اتحاد کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ اُس نے کہا ”سر جیسے سے کتاب فیض کر کے، ایک ہی سانچے میں دو بارہ وصل کے مشترک سائنس، مذاق کا مشترک اصلاحات کے ساتھ قومی زبانوں اور قومی مزاج میں استحکام پیدا ہو جائے گا۔ قوم کا ہر حصہ جو بولی کتابت کرے گا وہ سب کے فائدے کی خاطر مشترک ذخیرے میں بلاتا خیر شامل کر لئے جائیں گے اور ہم ایک متحد اور روشن خیال قوم وہاں پھوڑیں گے جہاں ہمیں فرقوں میں بے ہوئے لوگ ملے تھے جنہیں ذات پات کے نظام نے علیحدہ علیحدہ کامیوں میں بھی بدحواس کر رکھا تھا اور اُس بولی نظام نے اُن کے جذبات کو پست کر دیا تھا جس کا مقصد انسانی ذہن کو فروغ دینے کے بجائے اُس کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنا تھا۔“ (2)

اُسے امید تھی کہ انگریزی تعلیم ہندوستانیوں کو انگریزی حکومت کے نہ جوش حامی بنا دے گی۔ ”ہماری طرح تعلیم پائے ہوئے ایک ہی طرح کی چیزوں میں دلچسپی لینے والے اور ہماری طرح کے کاموں میں لگے ہوئے لوگ ہندوؤں سے زیادہ انگریز بن جائیں گے۔ جس طرح روس صوبے دار فرانسیسیوں اور اٹلیوں سے زیادہ روس بن گئے تھے۔“ (3)

اُس کی پیش گوئی کے پہلے حصے کو واقعات نے بڑی حد تک صحیح ثابت کر دیا۔ لیکن اُس کا دوسرا حصہ ٹریولین توقع سے کسی قدر مختلف ثابت ہوا۔ پھر بھی میکالے اور ٹریولین کی پیش گوئی مجموعی اعتبار سے حیرت انگیز حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ پھر بھی یہ کہنا شاید زیادہ صحیح نہ ہو کہ اپنی کمال کے رنگ کے علاوہ ہندوستانی ہر اعتبار سے انگریز کا چرہ بن گیا۔ یا یہ کہ انگریزی تعلیم نے برطانوی راج کے تعلق سے ہندوستانیوں کی وفاداری میں اضافہ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صورت حال اس کے برعکس ثابت ہوئی۔

مشرق جو سنسکرت اور عربی کے استعمال پر زور دے رہے تھے وہ ہمارے ہوئے مقدمے کی وکالت کر رہے تھے۔ ان زبانوں میں ادب اور فلسفے کا کتنا ہی سرمایہ کیوں نہ ہو اور اُن کی مقدس تحریروں کی بنا پر لوگ اُن کا کتنا ہی احترام کیوں نہ کرتے ہوں پھر بھی اُن کے استعمال کا کوئی امکان نہیں تھا۔ انہیں ہندوستانیوں کا کوئی بڑا فرقہ نہیں بولتا تھا اُن کا علم تھوڑے سے لوگوں تک محدود تھا اور اُن پر قدرت حاصل کرنے کے لئے بہت مدت اور محنت و کار ہوتی تھی جس کے لئے نہ حکمران تیار تھے نہ مخلوق۔

ہندوستانی زبانوں کو نظر انداز کیا گیا

بہت سے حلقوں نے مغربی علوم سکھانے کے لئے بولی جانے والی زبانوں کے استعمال پر زور دیا۔ دلسن اور شیکنپیر کی طرح کے کچھ عام کمپنی کے اراکین اس کی موافقت میں تھے۔ مالک، منز و اور الفنسٹن

(1) ایضاً کورٹ آف ڈائریکٹرز کا خط، صفحہ 110

(2) ٹریولینسی۔ نول ہال، صفحہ 135

(3) ٹریولینسی۔ نول ہال، صفحہ 190

نے اس کی حمایت کی۔ کلکتہ کی ورناکولر سیمینڈی نے، جسے کچھ بااثر ہندوستانیوں نے قائم کیا تھا، اس وقت بھی ہندوستانی زبانوں کے فروغ پر زور دیا جب بھلک انگریزی کے حق میں فیصلہ کر چکا تھا۔ انہوں نے اس امر کی دلیلیں دیں کہ ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ سینکڑوں اسکولوں کے نصاب کی تعلیم دی جاسکتی ہے اور یہ کہ ہندوستانی ادب کی ترقی پر اس کے معجز اثرات پڑیں گے۔ بمبئی کی مثال ان کے سامنے موجود تھی جہاں زیادہ تر سینکڑی اسکولوں میں ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی۔

یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہ ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ تعلیم پر خرچ بھی کم ہو گا اور ہندوستانی ماسٹروں کے روزگار کے نقطہ نظر سے یہ زیادہ مفید بھی ہے آکلیڈ نے اس سفارش کو اس بنا پر منظور کرنے سے انکار کر دیا کہ ”ہندوستانی نوجوان ہمارے اسکولوں میں اس لئے نہیں آئیں گے کہ ہم انہیں دیسی زبانوں کی ساخت کی تعلیم دیں۔“ (1)

1847ء میں ذریعہ تعلیم کے سوال پر بمبئی میں جدوجہد ہوئی جس میں ایک طرف انگریزی ہائی کورٹ کا جج اور بورڈ آف ایجوکیشن کا صدر سر لٹکن پیری تھا اور دوسری طرف کرئل جروس، جگن ناتھ، فکٹر شیٹ اور بورڈ کے ہندوستانی اراکین تھے۔ جگن ناتھ فکٹر شیٹ نے بورڈ کو یکم مئی 1847ء کو پیش کی جانے والی اپنی رپورٹ میں کہا تھا اگر ہمارا مقصد ہے تعلیم پھیلاتا اور ایک قوم کی حیثیت سے ہندوستان کے باشندوں کے ذہنوں پر اجالا کرنا ہے تو میرا خیال یہ ہے کہ خود ان کی زبان میں انہیں تعلیم دے کر یہ مقصد حاصل کیا جانا چاہیے۔ ہم اپنی عورتوں تک تعلیم کے فوائد پہنچانے کے لئے کون سا دوسرا ذریعہ تعلیم استعمال کر سکتے ہیں میں ایک دفعہ پھر کہتا ہوں کہ میں انگریزی کی تعلیم کے خلاف بالکل نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ عام لوگوں کی رسائی اس حد تک نہیں ہو سکتی ہے (2) اور اس بات کی وضاحت بھی کی گئی کہ تعلیم حاصل کرنے کے ذریعہ کی حیثیت سے ہندوستان کی بولی جانے والی زبانیں انگریزی کے مقابلے میں زیادہ مفید ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت سے رجوع کیا گیا۔ جس نے ایک حکم کے ذریعہ انگریزی کو کالج کی سطح پر ذریعہ تعلیم بنادیا اور مادری زبان کو ثانوی سطح پر ذریعہ تعلیم پر قرار رکھا۔ 1833ء کے بعد بمبئی اور مدراس پریسیڈنسیوں پر گورنر جنرل کی نگہداشت و نگرانی کے اختیارات میں اضافہ ہو گیا اور بمبئی کے نظام تعلیم کو بنگال کے نظام کے مطابق بنانے کے لیے انہیں استعمال کیا گیا۔

چنانچہ بولی جانے والی زبانوں کو دھکا پہنچا اور انگریزی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنادی گئی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو، جن کی مادری زبانیں مختلف ہیں۔ ایک ایسی مشترک زبان مہیا کر دی جسے وہ مشترک مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور اس طرح ہندوستان کے تمام حصوں کو اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا ایک ذریعہ مل گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انگریزی تعلیم نے مشترک ذہنی رویوں اور زندگی کے مسائل کے متعلق ایک مشترک نقطہ نظر کو جنم دیا اور اس طرح وہ ہندوستانی اتحاد کو فروغ دینے اور ہندوستانی قومیت کے شعور کو تقویت پہنچانے میں معاون ثابت ہوئی۔ یہ بتانا دشوار ہے کہ ذریعہ تعلیم کے طور پر اگر انگریزی کے ساتھ مادری زبان بھی استعمال کی گئی ہوتی تو یہ مفید نتائج سامنے آتے یا نہیں۔ بہر حال اس پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا۔ زبان کے سوال پر زیادہ تر افادیت کے نقطہ نظر

(1) آکلیڈ کی رپورٹ، مورخہ نومبر 1839ء، ص 271 (ٹپ ایچ، نول، صفحہ 163)

(2) جے۔ بی۔ اے۔ تعلیمی ریکارڈوں کے انتخابات، حصہ دوم 1840، 1859، (کلکتہ، 1922ء)

نے غور کیا گیا۔ جس کے معنی ایک طرف تو تھے حاکموں کی سہولت اور دوسری طرف ملازمتوں کے لئے لوگوں کو بھرتی کرنا۔

انتظامی سہولت کی خاطر حکومت نے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پر توجہ دینے اور فی الجملہ ہندوستان کے تمام لوگوں کی تعلیم کو نظر انداز کرنے کا رویہ اختیار کیا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ اپنی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایسے عالموں کی خدمت حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی جو ہندو اور مسلم قانون سے واقف ہوں۔ چنانچہ تعلیمی پالیسی میں تصورات کو غلبہ حاصل تھا۔ اس کے بعد ایک تبدیلی ہوئی اور مقصد یہ قرار پایا کہ عدالت، مال اور پولیس کے محکموں میں نئے نئے عہدوں کے لئے تعلیم یافتہ ماتحتوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اُن بالائی طبقتوں کو مطمئن اور آسودہ خاطر بنانا قرین مصلحت سمجھا گیا۔ جو اپنے آبائی روزگار سے محروم ہو چکے تھے اور تعلیم کے ذریعہ اپنے کو ملازمت کا اہل بنانا چاہتے تھے۔ یہ توقع کی جاتی تھی کہ تہذیب و تعلیم کے اثرات تعلیم یافتہ بالائی طبقتوں سے عوام تک پھیل جائیں گے۔

ان نظریات کے زیر اثر اور حسب ضرورت رقوم نہ ہونے کی وجہ سے کمپنی نے عام تعلیم کے منصوبوں کو رد کر دیا جو انفسن ار منزدونے بنائے تھے۔ انفسن نے 1823ء کی اپنی روداد میں اسکول کی تعلیم کی ایسی توسیع کی تجویز کی تھی۔ ”جو مقامی آبادی کے ذریعہ تعلیم کو اس امر کی امید دلا سکے کہ (اسکولوں کی زیادہ تعداد) اُن کے لئے تعلیم کے ذرائع فراہم کریں گی (1) منزدونے زور دیکر کیا تھا۔“ اگر ہم لوگوں کو تعلیم دینے کا تہیہ کر لیں اگر ہم اس راہ میں ثابت قدم رہیں اور اگر ہم اسکولوں کو تحصیلداروں تک محدود نہ رکھیں بلکہ اُن کی تعداد اتنی بڑھا دیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے رقبوں میں بھی ہوں تو مجھے یقین ہے کہ ہماری کوششیں بالآخر کامیاب ہوں گی۔ (2)

یہ بڑی بد قسمتی کی بات تھی کہ لوگوں کی عام تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا گیا۔ اس نے وقت کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس فیصلے کا مضمر اثر مقامی تعلیمی نظام پر پڑا۔ اڈم نے اُن واقعات کی روشنی میں جو، اُس نے جمع کئے تھے، زور دیکر یہ بات کہی کہ انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں بنگال میں بہت سی پانچہ مثالائیں اور کتب موجود تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قریب قریب ہر گاؤں میں پڑھنا لکھنا سکھانے کا کوئی نہ کوئی انتظام موجود تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ڈیونگر نے 1815ء میں لکھا تھا ”اس بات کا ثبوت کہ مقامی حکومتیں تعلیم عامہ کے اہم مقصد سے بے خبر نہیں تھیں بہت سی معافیاں اور کسی خاص نوعیت کے طالب علموں کی تعلیم کے لئے عام مدارس میں دیئے جانے والے عطیات پیش کرتے ہیں۔ لیکن قائم شدہ اداروں کو نظر انداز کرنے کے عام رویے کے بنا پر جو ابھی تک انگریزی حکومت کا طریقہ رہا ہے ان رقوم کے استعمال پر نظر نہیں رکھی جاسکتی اور اس بے توجہی کی بنا پر مقامی افراد نے اُن رقوم کو ذاتی ملکیت میں تبدیل کر لیا۔“ (3)

دوسری بات یہ کہ حکومت چونکہ عام لوگوں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر چکی تھی جو محض بولی جانے والی زبانوں کے ذریعہ دی جاسکتی تھی اس لئے زبانوں کو ترقی دینے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی گئی۔ خصوصاً جب چٹک نے یہ فیصلہ کر دیا اور مکلف اور آکلینڈ نے اس کی تصدیق کر دی کہ ثانوی اور کالج کی سطح پر انگریزی ذریعہ تعلیم ہوگی۔ ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ہڈ ڈنچ نے اقدامات کئے اُن میں کامیابی نہیں ہوئی۔

(1) انفسن کی روداد، مورخہ 13۔ دسمبر 1823ء۔ پو۔ لے۔ این۔ محولہ بالا صفحہ 197

(2) X منزدونہ، ملی روداد، مورخہ 10۔ مارچ 1826ء، شارب، ایچ۔ محولہ بالا صفحہ 72۔

(3) لارڈ ڈیونگر کی روداد، مورخہ 2۔ اکتوبر 1815ء، شارب، ایچ۔ محولہ بالا۔ صفحہ 26

انگریزی تعلیم کا فروغ

1835ء کے بعد مجوزہ خطوط پر سرعت کے ساتھ ترقی ہوئی۔ انگریزی پھیلنے لگی۔ 1835ء اور 1838ء کے درمیان مدت میں تعلیمی کمپنی کی نگرانی اور اداروں کی تعداد بڑھ گئی اور طالب علموں کی تعداد قریب قریب گنتی ہو گئی۔

سر چارلس ٹریولین نے لکھا ”انگریزی تعلیم کی حمایت کی زور دار لہر آگئی ہے۔۔۔ اسکول قائم کرنے کے لئے اتنی درخواستیں آئیں کہ ہمارے لئے سب کو پورا کرنا مشکل ہو گیا۔ جو اسکول قائم کئے جاسکے ہیں ان میں سے بہت سوں میں داخلے کے لئے اتنے امیدوار سامنے آئے کہ ہم سب کے لئے جگہ نہیں نکال سکے“ (۱)۔ ساچا درپن کے مطابق کلکتہ میں دو سو ہندوستانی اتنی اچھی طرح انگریزی استعمال کر سکتے تھے۔ جیسے خود اپنی مادری زبان۔ جے سدھر لینڈ، سر جان شور ہولٹ میکری اور دوسروں نے اس کی مقبولیت کی شہادت دی ہے۔ مشنری رجسٹر نے لکھا تھا کہ تینوں پریسڈینسیوں میں اُس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ چار ہزار ہندوستانیوں نے پارلیمنٹ کو ایک عرضداشت پیش کی تھی جس میں حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ سول ملازمتوں کے لئے انگریزی کو لازمی بناوے۔ ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے 1832ء میں تجویز پیش کی کہ انگریزی پر قدرت حاصل کرنا ملازمت کے لئے ایک ضروری شرط قرار دی جائے۔

1833ء کے چارٹر میں ایک دفعہ شامل تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ بلا لحاظ مذہب، پیدائش، سلسلہ نسب یا رنگ ہر عہدہ حاصل کرنے کے مستحق ہوں گے۔

بیٹک سمجھتا تھا کہ کمپنی کو مالی خسارہ سے بچانے اور ایسے لوگوں کے ذریعہ انتظام چلانے کے لئے ہندوستانیوں کو ملازم رکھنا ضروری ہے جو یہاں کے لوگوں کے مزاج اور رسم و رواج سے واقف ہوں۔ چنانچہ اُس نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے لئے ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ کھول دیا۔ جس کی تنخواہ 500 روپے تک ہوتی تھی۔ 1836ء میں لارڈ آکلینڈ اور اس کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ فوج داری دیوانی اور مال کے مقدموں میں کاروائی فارسی کے بجائے لوگوں کی اپنی زبانوں میں کی جانی چاہیے اور 1837ء کے ایکٹ نمبر 29 کے ذریعہ فارسی کا استعمال ختم کر دیا گیا۔ 1844ء میں انگریزی کو ملازمتوں کے لئے ایک ضروری شرط بنایا گیا اور احکام جاری کیے گئے کہ اچھے طالب علموں کی فہرستیں تیار کی جائیں اور عہدے پر کرنے کے لئے سرکاری دفتر میں انہیں گشت کروایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے انگریزی کو اور تقویت ملی۔

متوسط طبقوں میں تعلیم کا فروغ محض جن کی ذمہ داری حکومت نے قبول کی تھی، بنگال میں بہت ہوا۔ اور اتنا ہی برطانوی حکومت میں شامل ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہوا۔

بھینی میں تعلیم

بھینی پریسٹنسی میں انگریزی تعلیم نے جو راستہ اختیار کیا وہ بنگال سے مختلف تھا۔ وہ علاقہ جس پر یہ پریسٹنسی مشتمل تھی زیادہ تر 1818ء کی آخری مرہٹہ جنگ کے بعد انگریزوں کے زیر نگین آیا تھا۔ اس سے پہلے پوراہین اور عیسائی بچوں کی تعلیم کے لئے بھینی کے جزیرے میں اسکول قائم کئے جا چکے تھے۔ لیکن مرہٹوں کے علاقہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد حکمرانوں کو ہندوستانیوں کی تعلیم کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ مائونٹ اسٹورڈ الفنسٹن نے محسوس کیا کہ لوگوں کے اخلاق اور مادی حالات کو سدھارنے کے لئے تعلیم ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے سروے کروایا جس نے ظاہر کیا کہ صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ اُسوقت سوال یہ تھا کہ ابتداً کسے کی جائے اور لوگوں میں مغربی تعلیم کو کیسے رواج دیا جائے۔

الفنسٹن کی رائے تھی۔ چونکہ انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی مانگ محض بھینی کے شہر تک محدود ہے اس لیے مغربی علوم کو پھیلانے کے لئے ہندوستانی زبانوں کو استعمال کیا جائے گا۔ (2) یہ کہ ابتدائی تعلیم کا منصوبہ بند نظام قائم کیا جائے کہ یہ انگریزی تعلیم پھیلانے سے زیادہ مفید ہے۔ اور (3) یہ کہ اعلیٰ مشرقی علوم کا مناسب انتظام کیا جائے۔ (1)

پہلا قدم تھا ان اعلیٰ طبقوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو چشمہ اکادہ بار ختم ہو جانے کی وجہ سے سرپستی سے محروم ہو گئے تھے۔ 1821ء میں پونا میں ایک سنسکرت کالج کا قیام، اُس کے بعد 1832ء میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے بھینی نو اسکول اینڈ یک سوسائٹی قائم کی گئی۔ 1827ء میں اُس کا نام بدل کر بھینی نیو ایجوکیشن سوسائٹی کر دیا گیا۔ اس سوسائٹی نے جدید ہندوستانی زبانوں کی نصابی کتابیں تیار کر کے، استادوں کو تربیت دے کے اور انگریزی پڑھانے کے لیے اسکول کھول کر قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ اس سوسائٹی کی کوششوں سے بھینی تھاں میں سول اور پونے میں چار ضلع انگریزی اسکول کھولے گئے جن کے ہیڈ ماسٹر یورپین تھے اور مختلف اضلاع میں تقریباً 15 ابتدائی اسکول شروع کئے گئے جن میں انگلستان اور ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ، حساب، الجبرا، جو میٹری، ٹریگونیومیٹری، فلکیات اور طبیعی فلسفہ کی طرح کے مضامین طالب علموں کی مادی زبان کے ذریعہ پڑھائے جاتے تھے۔

نیو ایجوکیشن سوسائٹی کے علاوہ حکومت خود بھی کالج چلاتی تھی۔ اُن میں سے ایک تھا پونے کا سنسکرت کالج جس کی 1837ء میں تنظیم نو کی گئی اور تمام ذاتوں کے طالب علموں کے لئے اُس کے دروازے کھول دیئے گئے۔ دوسرا تھا۔ بھینی کا الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ جس کے لئے روپیہ جزوی طور سے بھینی کے لوگوں نے جمع کیا تھا اور جزوی طور سے 1834ء میں کمیٹی کے ڈائرکٹروں نے دیا تھا۔ اس کالج کا مقصد تھا۔ سول ملازمتوں کیلئے ہندوستانیوں کو ترقیب دینا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے لئے طالب علم ضلع انگریزی اسکول مہیا کرتے تھے۔

1840ء میں نیو ایجوکیشن سوسائٹی ختم کر دی گئی اور تمام تعلیمی اداروں کی نگرانی کے لئے ایک بورڈ آف ایجوکیشن قائم کیا گیا جس کے ساتھ کن تھے جن میں سے تین ہندوستانی تھے۔ اس بورڈ نے جس کا صدر بھینی ہائی کورٹ کا جج جسٹس سرائسکن پیری تھا، ایک وفد پھر انگریزی تعلیم کا سوال اٹھایا۔ اس نے

جو پالیسی اختیار کی وہ تھی، اسکولوں میں ہندوستانی اور انگریزی ہی زبانوں کی مشترکہ تعلیم نگر اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی رہی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ ہر ضلع کے صدر مقام اور دوسرے شہروں میں، جہاں اس کو حق بجانب سمجھا جائے اچھے انگریزی اسکول قائم کرنے پر ردِ پیہ خرچ کیا جائے۔ ہیری کی پسندیدہ پالیسی اور بنگال کے دباؤ کی بنا پر ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ مغربی علوم کو مقبول بنانے کا تجربہ ترک کر دیا گیا اور انگریزی کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینے کے معاملے میں ہمیشہ بھی بنگال کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ اس کے باوجود ہمیشہ بورڈ آف ایجوکیشن بہت سے ایسے اسکول چلا تا رہا۔ (1853ء میں 216) جہاں ہزاروں طالب علم (1853ء میں 12000) اپنی مادری زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ہمیشہ میں انگریزی تعلیم کو رواج دینے میں مشنریوں کی کوششوں کو بھی دخل تھا۔ مشنوں نے بہت سے شہروں میں سکول پونے، احمد نگر، سورت اور راج کوٹ میں انگریزی پڑھانے کے اسکول کھولے اور ہمیشہ میں دلن کالج قائم کیا۔ جہاں 1852ء میں تقریباً چار سو طالب علم تھے۔ ابتدائی برسوں میں انگریزی تعلیم کے معاملے میں سب سے پیش پیش تھاپاری فرقہ جیسا کہ ہاؤس آف کوئٹس کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے گواہوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ”قریب قریب سبھی پاری انگریزی بولتے ہیں۔ وہ عام طور سے اپنے بچوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں اور اُن میں سے بہت یورپوں کی طرح خزانے سے انگریزی بولتے ہیں“ (1)

مدرسہ اس پریسیڈنسی میں تعلیم

مدرسہ اس پریسیڈنسی میں مغربی تعلیم پھیلانے والی تین ایجنسیوں یعنی مشنریوں، حکومت اور ہندوستانی عوام میں سے اس میدان میں سب سے پہلے عیسائی مشنریوں نے قدم رکھا۔ پروٹسٹنٹ مشنریوں اور سوسائٹی فار پروموتنگ کرچن کالج نے مختلف مقامات پر یعنی مدرسہ اس، کٹولہور۔ تجور اور شرچنپلی میں اسکول کھولے۔ جن میں ہندوستانی بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی اسکولوں کو ایٹ انڈیا کمیٹی کی طرف سے تھوڑی تھوڑی مدد ملتی تھی۔

انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مشنریوں نے پوری پریسیڈنسی میں انگریزی پڑھانے کے لئے اسکول قائم کرنا شروع کئے۔ انکے علاوہ انہوں نے ایسے ابتدائی درجہ کے اینگلو اور نا اسکول بھی قائم کئے جن میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ ڈیولپمنٹ کے مطابق 1838ء تک ”انگریزی نئی چیز نہیں رہی ہے۔ اس کی مانگ بہت ہے۔ اور ہزاروں آدمی اُسے جانتے ہیں“ (2) اس میدان میں مشنریوں کی سرگرمیاں اتنے وسیع پیمانے پر تھیں کہ 1854ء میں پورے ملک کی تعلیم مشنری سوسائٹی کے ہاتھ میں تھی۔ صرف تین ادارے تھے۔ اور کچھ دیسی اسکول۔“ (3)

(1) ایم ایل نیوی دستاویزات 32-1831ء، کالم 9 ضمیمہ 85-311۔ ٹی۔ اینگلی۔ English Education and Oregon

India Nationalists (نویں اپریل 1944ء) صفحہ 61

(2) ڈیولپمنٹ۔ ایس۔ بحوالہ صفحہ 179

(3) آرکیٹائٹ۔ بی۔ جے۔ Selection From The Records Of The Modern Govt۔ صفحہ 127۔ میک کلی۔

B.I بحوالہ صفحہ 124

ان اسکولوں کے علاوہ مشنریوں نے سیکرٹریز بھی قائم کیں جو اسکول اور کالج کے درمیان تھیں جہاں انگریزی ادب میں پورچین سائنسوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن عیسائی درسیات اور مقدس کتابوں پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

انہیں ہندوستانی مناظر استوار مشنریوں کی تربیت گاہیں سمجھا جاتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ان کا حصہ تھا جزل اکیلی ادارہ جس کی بنیاد انڈرس نے مدراس میں ڈال دی تھی۔ (جس کا نام بعد میں مدراس کرچین کالج ہو گیا)۔ کائنات پبلیکیشنز چرچ اور لندن مشنری سوسائٹی نے دوسرے اداروں کی بنیاد ڈالی۔

دوسری انجینی یعنی کمپنی کی حکومت نے سرٹاس منزو کی گورنری کے زمانے میں اس پر توجہ دی۔ اس نے محسوس کیا کہ پریسیڈنسی میں اگرچہ اسکول تو بہت سے ہیں لیکن ان کا معیار بہت پست ہے سرپرستی اور روپیہ کی کمی کی بنا پر وہ زوال پذیر ہیں۔ وید کپاٹھ شلاؤں کی نگرانی برہمنوں کے سپرد تھی۔ جسکے پاس عوامانہ زمینداروں یا سابق حکومتوں کی دی ہوئی معافیاں تھیں۔ تعلیم کے فوائد سے زیادہ تر برہمن فرقہ مستفید ہوتا تھا۔ حالانکہ ان کی آبادی ہندوؤں کی مجموعی آبادی کا بارہواں 12 حصہ تھی۔ پھر بھی ہر چار زیر تعلیم طالب علموں میں سے ایک برہمن ہوتا تھا۔ (1) 1826ء میں منزو نے تعلیم عامہ کا ایک بورڈ قائم کیا تاکہ ہر کلکٹریٹ میں دو بڑے اسکول اور ہر تعلقہ میں ایک چھوٹی حیثیت کا اسکول کھولا جائے۔ اس تحقیقات کے نتیجے میں "جو اس نے شروع کرائی تھی۔ معلوم ہوا کہ پریسیڈنسی میں ہر پانچ سو لڑکوں کیلئے ایک دیسی اسکول ہے اور یہ کہ اسکول جانے کی عمر کے بچوں کی ایک تہائی تعداد ان دیسی اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہے (2) تعلیم کے اخراجات و مقاصد کے تعلق سے منزو کا خیال تھا کہ بلوری زبان کے ذریعہ عام لوگوں کی تعلیم کی بہت افزائی کی جانی چاہئے بد قسمتی سے اس کی اسکیم کامیاب نہ ہو سکی۔ اور 1836ء میں اسکول ختم کر دئے گئے اور منزو کے بورڈ کی جگہ کمپنی آف نیو ایجوکیشن تشکیل کی گئی۔

بیگل کی پالیسی کے مطابق جس کی حمایت کورٹ آف ڈائریکٹرز نے کی تھی از سر نو کام شروع کیا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ سب سے موثر انداز کی تعلیم ہی اعلیٰ درجے کے تھڑے سے اسکولوں کے ذریعہ دی جانی چاہئے۔ عام تعلیم دینے کا منزو کا خیال ترک کر دیا گیا۔ تو 1840ء میں سرکاری ملازمتوں میں تقرری کے امیدواروں کے عام امتحانات کی تنظیم و نگرانی اور تعلیم کے لئے ایک کونسل تشکیل کی گئی۔ اس کونسل کو ہدایت کی گئی کہ وہ روپیہ اس کالج پر جو مدراس یونیورسٹی کے نام سے مشہور تھا، اور 1841ء میں قائم ہوا تھا اور کچھ ضلع اسکولوں اور نجی اسکولوں پر خرچ کرے۔

کونسل کے منصوبے کی حمایت ایک یادداشت کے ذریعہ کی گئی جس پر تقریباً ستر ہزار ہندوستانیوں کے دستخط تھے اس کالج کا نصاب کلکتہ کے ہندو کالج کے نصاب کے مطابق تھا جس میں مغربی سائنس، فلسفہ اور تاریخ شامل تھے۔ 1854ء میں اس میں پانچ سو سے زیادہ طالب علم تعلیم پا رہے تھے۔ اس کے طالب علموں نے ملازمت اور مفاد عامہ کے کاموں میں امتیاز حاصل کیا۔ ترچناٹی، سونی پٹنم، ویلیور اور کالی کٹ یعنی دروازی زبان کے علاقے میں ایک اعلیٰ صوبائی اسکول کھولنے کا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ 1853-54 میں صرف دو انگریزی اسکول کھولے جاسکے یعنی ایک کڈالور میں اور دوسرا راجہ مندری میں۔

تیسری ایجنسی یعنی ہندوستانی عام لوگوں نے 1842ء میں مدراس میں باجپاکا کالج کے قیام سے اپنی کوششوں کی ابتدا کی۔ اس کالج کے لئے روپیہ ایک خیراتی وقف سے حاصل کیا جسے ایک دول مند ہندو باجپاکا نے قائم کیا تھا۔ متولیوں نے کوٹھی درم اور چدم برم میں بھی اسکول قائم کئے جو اس کالج کی شاخیں تھیں۔

شمالی ہندوستان میں تعلیم

شمالی ہندوستان کے صوبوں میں جن کا نیا الحاق کیا گیا تھا۔ تعلیم کی رفتار سست تھی جو حالات بنگال میں تعلیم پھیلانے میں معاون ثابت ہوئے تھے وہ بڑی حد تک شمال مغربی صوبجات اور بودھ میں نہیں پائے جاتے تھے۔ کلکتہ روز افزوں بدیسی تجارت کا مرکز تھا اور وہاں بہت سے انگریز تاجر آباد تھے۔ سرکاری محکموں اور تجارت میں ملازمت کے بہت سے مواقع تھے۔ ہندوستانی مغربی علوم سیکھنے کے خواہش مند تھے اور اس مانگ کو پورا کرنے کے لئے بہت سی ایجنسیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

بنگال کے باہر یہ حال نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجموعی اعتبار سے لوگ انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزی تعلیم کو عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا جز سمجھتے تھے اور اسکولوں کو تبدیل مذہب کے ذرائع تصور کرتے تھے۔ بہار میں انگریزی کے لئے لوگوں میں کوئی جوش نہیں پایا جاتا تھا۔ اور اس لئے اسکول کھولنے کی کوششوں میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بنگال کے گورنر جرجل کی روداد مورخہ 19 نومبر 1858ء کے مطابق اسکولوں کے انسپکٹر جنرل کے دفتر کو شیطان کا دفتر خاند کہا جاتا تھا۔

شمالی مغربی صوبجات میں تعلیم کی ترقی کا کام 1843ء تک کلکتہ کی تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی کے سپرد رہا۔ حالانکہ اس سے سات سال پہلے بنگال پریسڈنسی سے اُس صوبے کو علیحدہ کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ اُس کی مانگ بہت کم تھی انگریزی تعلیم کو فروغ دیا جاتا رہا۔ بنارس کے ششکرت کالج میں انگریزی کی تعلیم شروع کی گئی۔ آگرہ میں 1824ء میں کالج قائم کئے جا چکے تھے اور 1835ء سے پہلے ہی اُن میں انگریزی تعلیم دی جانے لگی تھی، گورکھپور سے اجیر تک چودہ انگریزی اسکولوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا۔ لیکن 1823ء میں جب ٹامسن شمالی مغربی صوبجات کا لٹیفٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ تو اس نے

پالیسی کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے دیکھا کہ اسکولوں کا طالب علم انگریزی کے حق میں نہیں ہیں۔ چنانچہ اُس نے اُس میں سے آٹھ کو بند کرنے اور اہم مراکز یعنی آگرہ، بنارس اور دہلی میں کالج اور بریلی، اجیر اور ساگر میں اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان کالجوں اور اسکولوں کی بھی پذیرائی نہیں ہوئی۔ لٹیفٹ گورنر نے لکھا کہ بالائی طبقات یا حکومت کے مختلف محکموں میں ہندوستانی اعلیٰ افسروں میں سے بہت کم نے ابھی تک تعلیم کے فوائد کو اس حد تک پہچانا ہے کہ وہ حکومت کے تحت چلنے والے انگورو ناظر کالجوں میں اپنے بچوں کو بھیجنے کے لئے آمادہ ہو جائیں (1) اُن کے بجائے سماج کے زیریں طبقوں سے آنے والے طالب علموں سے اسکول کالج بھرے ہوئے تھے۔

ٹامسن تعلیم کے دینی نظام کے حق میں تھا۔ اور اُس کو سدھارنا چاہتا تھا۔ اُس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی روپیہ کی کمی۔ چنانچہ اُس نے ابتدائی اسکولوں کو چلانے کے لیے زمینداروں کے ساتھ

کئے گئے رضاکارانہ معاہدوں کی رو سے مقامی محصول عاید کئے اور اس کے بعد روپیہ سرکاری خزانے سے ادا کیا۔ اس کے بعد تجویز کیا گیا کہ ہر تحصیل میں ایک سرکاری اسکول کھولا جائے۔ جن میں مادی زبان کے ذریعہ ہندی، اردو، حساب، تاریخ، جغرافیہ، جو میٹری اور دوسرے مضامین پڑھائے جائیں۔ معائنے اور ہدایت کاری کا ایک تفصیلی نظام بنایا گیا جسے اس زمانے کے گورنر جنرل ڈیوڈ ہوزی اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کی منظوری حاصل ہو گئی۔ یہ نظام دوسرے صوبوں میں محکمہ تعلیم کی تشکیل کے لئے ایک مثال بن گیا۔

لیکن ”قدر شروع ہونے سے کچھ پہلے تک لوگ پڑھتے تھے کہ انگریزی ایک مرد زبان ہے جسے کالج کی دیواروں کے باہر شادی کوئی بولتا ہو“ (1) حکومت بھی تعلیم پھیلانے کی زیادہ کوشش نہیں کر رہی تھی۔ جہاں جہاں حکومت اسکول کھولنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی وہاں اسکول کھول کے مشنریوں نے حکومت کے کام میں مدد دی۔ امریکن پریسیرین بورڈ نے لدھیانہ، سہارن پور، جالندھر، انبالہ، لاہور اور فرخ آباد میں اسکول کھولے جن میں انجیل کے ساتھ انگریزی ادب، سائنس اور دوسرے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ انہوں نے الہ آباد کا گورنمنٹ اسکول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے کالج بنا دیا۔ دوسری مشنری سوسائٹیوں نے بھی کام دوسرے مقامات پر کیا۔ چرچ مشنری سوسائٹی نے آگرہ میں سینٹ جانس کالج قائم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1854ء تک مشنری اداروں کی تعداد بائیس ہو گئی۔ جن میں تقریباً ساڑھے سترہ سوطال علم تعلیم پاتے تھے۔ یہ تعداد قریب قریب اتنی ہی تھی جتنی تمام سرکاری اداروں میں تعلیم پانے والے طالب علموں کی۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ پنجاب میں پائے جانے والے دینی تعلیم کے نظام میں وہاں کے رہنے والے تینوں فرقوں کے لئے تین قسم کے اسکول تھے۔ ہندوؤں کو ہندی پڑھائی جاتی تھی، مسلمان عربی میں قرآن کے علاوہ فارسی ادب کی تعلیم پاتے تھے اور سکھ کرکھی میں گرد گتھ صاحب پڑھتے تھے۔ اس قسم کے اسکول لڑکیوں کے لئے بھی تھے جہاں اُستائیاں اُن کو تعلیم دیتی تھیں۔ جب انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کیا تو امرتسر میں ایک انگریزی اسکول قائم کیا گیا اور مشنریوں نے کئی اہم شہروں میں اسکول کھولے۔

VIII دہڑکا 1854ء کا مراسلہ

بورڈ آف کنٹرول کے صدر کے 1854ء کے مراسلے نے تعلیم کی بوسیدہ عمارت کی بنیاد مضبوط کر دی۔ اس مراسلے کی بنیاد تھی ہندوستان میں تعلیم کی فروغ کے تعلق سے ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کی تحقیق و تفتیش اس میں اس بات کو دہرایا گیا تھا کہ تعلیم کا مقصد ہے اخلاقی اور مادی خوشحالی، اعلیٰ درجہ کی اہلیت پیدا کرنا اور قابل اعتماد سرکاری ملازمت حاصل کرنا، ملک کے وسائل کو ترقی دینے اور دولت اور تجارت میں اضافہ کرنے کی خواہش پیدا کرنا اور اس کے ساتھ اُن بہت سی اشیاء کا بڑی مقدار میں حصول جو ہماری مصنوعات کے لئے ضروری ہیں اور جنہیں ہماری آبادی کا ہر طبقہ بڑے پیمانے پر صرف کرتا ہے۔ اور برطانوی مزدوروں کی پیداوار کی قریب قریب بھی نصف ختم ہونے والی ملک (2)

تعلیم کی نوعیت کے متعلق نزاع کو دھڑے سے ان الفاظ کے ساتھ ختم کر دیا ”ہمیں پرزور الفاظ میں

اعلان کر دینا چاہیے۔ کہ ہم ہندوستان میں جس تعلیم کو فروغ دینا چاہتے ہیں وہ ایسی تعلیم ہے۔ جس کا مقصد ہے ترقی یافتہ قنون، سائنس، فلسفہ اور یورپ کے ادب کی ترویج یا مختصر کہا جاسکتا ہے۔ یورپی علوم کی ترویج۔ (1) کس زبان کے ذریعہ تعلیم دی جائے کے متعلق مراسلے میں کہا گیا تھا۔ ”چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ انگریزی زبان کے ساتھ ہندوستان کی دیسی زبانوں کو بھی یورپی علوم کے پھیلانے کے ذریعہ بنایا جائے“ (2) عملاً اس کے معنی تھے۔ اعلیٰ جماعتوں میں انگریزی کا استعمال اور عام لوگوں کیلئے ہندوستانی زبانوں کا استعمال۔

جہاں تک تعلیم کی توسیع کا تعلق تھا۔ مراسلے کی بنا پر (1) 1857ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں لندن یونیورسٹی کے نمونے کی تین یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جو امتحان لینے کا ادارہ تھا۔ (2) کورناٹکر اور انگلو کورناٹکر اسکولوں کی تعداد بڑھ گئی اور (3) شمالی مغربی صوبجات کے لئے ٹامس کے منصوبے کے مطابق دیسی قسم کے اسکولوں کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کی توسیع ہوئی۔

اس مراسلے میں اس امر کا انتظام کیا گیا تھا کہ ہر صوبے میں ایک ڈائریکٹر کے تحت، جس کی امداد کے لئے معائنہ کرنے والا عملہ حسب ضرورت مقرر کیا جائے، محکمہ تعلیمات قائم کئے جائیں تاکہ اسکول کی تعلیم کی اسٹیم پر اچھی طرح عمل کرنے کی اس تجاویز کا مناسب طور سے عمل درآمد کیا جاسکے۔ لیکن دڈنے حسب ضرورت رقیں فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اسکے بار کا ایک حصہ عام لوگوں اور نجی ایجنسیوں کے شانوں پر ڈال دیا۔ اس مقصد کے لئے انگریزی نظام کے خطوط پر امدادی عطیوں کا طریقہ شروع کیا گیا جس سے بڑی حد تک اُس وقت مشن اسکول مسخید ہوئے۔

ہندوستانی تعلیم کے رجحانات

1813ء سے 1858ء تک تعلیم میں بڑی توسیع ہوئی۔ 1813ء میں جو رقم منظور ہوئی تھی۔ وہ دس ہزار پاؤنڈ یا ایک لاکھ روپیہ تھی۔ لیکن 57-1856ء میں بنگال، مدراس، بمبئی، شمالی مغربی صوبجات اور پنجاب کے پانچ صوبوں میں ہونے والا خرچ بڑھ کے دد لاکھ پاؤنڈ یا بیس لاکھ روپے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس کا بہت بڑا جز بنگال کے حصے میں آیا۔ اسے چورانوے ہزار پونڈ سے زیادہ تعلیم پر خرچ ہونے والی کل رقم کا تقریباً نصف حصہ ملا۔ اس توسیع کے نتیجے میں 1854ء میں تقریباً 180 انگریزی ادارے ہندوستان میں تھے۔ جن میں 30,000 طالب علم تعلیم پا رہے تھے۔

چنانچہ چار دہائیوں میں جو تعلیمی نظام قائم کیا گیا۔ اس کی کچھ نمایاں خصوصیاتیں ہندوستان کے لوگوں کے ارتقاء پر بہت اثر انداز ہوئیں۔ اہم ترین خصوصیات تھیں۔ (1) سماج کے بالائی طبقوں تک تعلیم محدود رہی اور عام لوگوں کو نظر انداز کیا گیا۔ (2) اسکولوں اور کالجوں دونوں میں اعلیٰ تعلیم میں ذریعہ تعلیم کے طور پر انگریزی زبان کا انتخاب کیا گیا۔ (3) تعلیم کا بڑا مقصد یورپی علوم سیکھنا سمجھا گیا اور (4) تعلیم کی نوعیت محض علمی رہی۔ عملی اور تکنیکی تربیت کو نظر انداز کیا گیا۔

یہ درست ہے کہ تعلیمی پالیسی کے تعلق سے تمام اطلاعات میں کہا گیا تھا کہ تعلیم کا مقصد ہے ملک کی اخلاقی اور مادی ترقی لیکن اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ تعلیمی ایجنسیوں کے فوری مقاصد

مختلف تھے۔ حکومت ماتحت ملازمتوں کے لئے رگروٹ تیار کرنا چاہتی تھی، مشنری تعلیم کو ہندوستانی سماج تک رسائی حاصل کرنے اور اُن تک صرف حق پہنچانے کا ذریعہ سمجھتے تھے، انگریزی کے لئے ہندوستانوں کی خواہش کی بنیاد بڑی حد تک مادی مفادات تھے۔ اُن کے لئے انگریزی کے معنی تھے روپیہ اس میں شک نہیں کہ حکومت کے مطالبات اور رقم کی کمی اصل وجہ تھی لوگوں کے ایک پھوٹے سے چلتے تک تعلیم کو محدود رکھنے کی پھر بھی پالیسی سازوں کے ذہنوں کو کم حیثیت طبقوں کو نظر انداز کرنے کے عام رجحانات نے بھی متاثر کیا تھا۔ اگر دیہی سماج میں کسان کو مالکان اراضی اور صرافوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ اور شہروں میں دست کاروں اور مزدوروں پر توجہ نہیں دی گئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی تعداد اور افلاس کو اُن کی تاحیات جہالت کے لئے اچھا بھانا سمجھا گیا۔

نئی تعلیم کی خرابیاں

اس طرح ہندوستانی متوسط طبقے کو تعلیم کی توسیع سے فائدہ ہوا جو سماج میں باحیثیت سمجھے جاتے تھے۔ بہت دن تک تعلیم یافتہ طبقے کی اہلیت محض دو میدانوں تک محدود رہی یعنی پیشے اور سرکاری ملازمتیں۔ آزاد پیشوں میں شامل تھے۔ وکالت، ڈاکٹری اور معلمی۔ حالانکہ اس بات کا بہت چرچا تھا کہ ذات، رتھ اور مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ اور 1833ء کے چارٹر میں ایک دفعہ شامل تھی جس میں یکساں مواقع کا یقین دلایا گیا تھا۔ پھر بھی ملازمتوں میں جن اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچنے کی توقع ہندوستانی کر سکتے تھے وہ تھے سب جج اور ڈپٹی کلرک کے عہدے۔ اقرار نامے کی پابند ملازمتوں کے متعلق تو وہ سوچ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

عام لوگوں کی بے اندازہ جہالت کا بڑا سبب یہ سلیبی معاشی اور سیاسی ترقی کے رستے میں حائل تھا۔ یہ بڑی بد قسمتی کی بات ہے کہ لوگوں کے لئے جدید تعلیم کی قیمت دیکھی نظام تعلیم کی جتنی کی صورت میں ہوا کرنی پڑی جو کتنا ہی مہلوی کیوں نہ سہی پھر بھی بہت سے لوگوں کو حرف شناس بنانا تھا۔ دور وسطیٰ سے باہر قدم رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ جدید علم حاصل کیا جائے اور اس حق کے لئے ہندوستان کو ممنون ہونا چاہیے لیکن جہالت کے جس اندھیرے میں عام لوگ کھڑے رہے اس کے جدید کاری کے اثر کو بڑی حد تک کم کر دیا۔

اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ کی حیثیت سے انگریزی کا استعمال کچھ ایسے سوالوں کو جنم دیتا ہے جن کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ سرکاری کام کے لئے فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ یعنی ایک بدلیسی زبان کی جگہ دوسری بدلیسی زبان آگئی۔ جس کی بین وجہ یہ تھی کہ بولی جانے والی کوئی دوسری زبان کل ہند حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ شمال دکن اور جنوب کے شہروں میں اردو اچھی طرح جانی جاتی تھی۔ لیکن اُس کے پاس نثری ادب بہت کم تھا۔ ہندی کی بولیوں اور خصوصیت کے ساتھ برہمچاشو کا وسیع علاقے میں فروغ دیا گیا تھا۔ لیکن تجارتی یا دفتری کاموں کے لئے کوئی معیاری زبان یا نثری اسلوب پیدا نہیں ہوا تھا۔ بولی جانے والی زیادہ تر دوسری زبانیں بھی اسی طرح کے تشکیلی مرحلے سے گزر رہی تھیں جسکرت بہت ترقی یافتہ تھی وہ کسی علاقے میں نہیں بولی جاتی تھی اور عالموں نے ایک پھوٹے سے چلتے تک محدود تھی۔ مغربی علوم کی سنسکرت کے ذریعہ ترسیل میں ناقابلِ مہور عملی دشواریاں حائل تھیں۔ برہمانوں حکمرانوں کی دلیل تھی کہ اگر وہ خود ریاست کی زبان ہو سکتی تھی، اور اُس کو مختلف فرقوں کے لوگ بڑھ سکتے تھے جو حکم و نسق میں

دلچسپی رکھتے تھے۔ تو نے حکمرانوں کی زبان انگریزی اُس کی جگہ کیوں نہیں لے سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ تمام دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں وہ جدید علم، کی دولت زیادہ رکھتی ہے اور اُن پر اُسے فوقیت حاصل ہے۔ اس وجہ سے بہت سے ہندوستانی بھی اُس کی قدر کرتے تھے اور اپنی کلاسیکی زبان پر ترجیح دیتے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر نئے حکمرانوں کے سامنے کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہا۔ اس فیصلے کے نتائج و عواقب اچھے بھی تھے اور بُرے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کے ہر حصے میں جب ہندوستانیوں نے انگریزی زبان سیکھ لی تو مواصلات میں آسانی پیدا ہو گئی اور یک جہتی کے عمل کی رفتار تیز ہو گئی۔ یہ ایک نیا تصور تھا، مغربی ادب کے زیر اثر تقویت ملی۔ اُن یورپیوں کی مثال نے ہندوستانیوں کو بھی متاثر کیا۔ جو جنگ اور امن کے کاموں میں اپنے ملک کے مفادات کو سامنے رکھتے تھے اور اپنی ماورِ وطن کی کامیابی اور ناموری کے لئے کوشاں رہتے تھے، انگریزی ادب اور تاریخ کے مطالعے نے جو وطن پرستار جذبات اور خیالات سے بھرے ہوئے ہیں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا۔

انگریز حکمرانوں نے ہندوستان میں جس انتظامی اور معاشی اتحاد کو جنم دیا اُس نے اتحاد کے احساس کو ابھارا اور انگریزی زبان اور تعلیم نے اُس کو جلد بالغ نظری عطا کر دی۔

پھر بھی انگریزی زبان کے غلبے نے ہندوستانی زبانوں کی ترقی روک دی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے جو انگریزی پڑھتے تھے، لکھتے تھے اور بولتے تھے، توں تک اپنی مادری زبانوں کو نظر انداز کیا۔ یہ درست ہے کہ تمام زبانوں میں ایسا ادب پیدا ہوا۔ جس کا انحصار بڑی حد تک فطری صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ لیکن کسی ادب یعنی سائنس، فلسفہ اور تاریخ سے اُن کے دامن خالی رہے۔ یوں تو ہندوستانی تعلیم ہمیشہ بڑی حد تک علمی رہی لیکن جب بولی جانے والی ایک زبان (سنسکرت، عربی اور فارسی) کی جگہ نہ بولی جانے والی دوسری زبان (انگریزی) نے لے لی تو اُس نے ذہن کے لفظی اور نظریاتی رجحان میں اضافہ کر دیا۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کا دوہرا اثر ہوا۔ یعنی دانشوروں اور جاہل عوام کے درمیان باہمی شناخت کی خواہش بھی پیدا ہو گئی۔ اور تعصبانی دوری بھی۔ اس دورے اثر کا نتیجہ ہے گھر کے اندر اور گھر کے باہر کسی فرد کے طور طریق اور قومی یکجہتی میں پائی جانے والی کوتاہیوں کی ذمہ داری بڑی حد تک اس پر ہے۔ جب آپ باہر ایک زبان استعمال کریں۔ اور گھر میں دوسری تو ذہنی دیانتداری کا باقی نہ رہنا ایک تاثر پر عمل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قومی یکجہتی ضرور مجروح ہو گی۔ جب آپ اہم معاملات کے لئے وہ زبان استعمال کریں گے جو عام لوگوں کی زبان نہیں ہے۔ ایسی صورت میں شناخت کا احساس و ہند لاپز جاتا ہے۔ جہاں تک باہری طبقوں کی تعلیم پر اصرار کا تعلق ہے۔ یہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سامی معاشی ساخت کا ایک حصہ تھا۔ 1857ء کی عظیم بغاوت تک برطانوی پالیسی کا مقصد تھا۔ بالائی طبقوں کو اپنے ساتھ لانا۔ چنانچہ کسانوں کی قسمت پر مالکان اراضی کی خوشنودی حاصل کی جاتی تھی۔ اور جو طبقہ طاقتور روزگار سے محروم ہو گیا تھا۔ اُن کی خواہشوں کو پورا کرنے کے اقدامات میں بڑا جوش دیکھا جاتا تھا۔ یہ بات اس رجحان سے مطابقت رکھتی تھی کہ محض انگریزی اور چند حقوق یافتہ لوگوں کی تعلیم کو اہمیت دی جائے۔ آبادی کے بہت بڑے حصے کو جہالت کے اندھیروں میں گھو کر رکھ کر کھانے اور قدیم زبانوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی روایات میں غرق کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی حد تک قدیم ہندو بالائی طبقے پر مشتمل تھا۔ بنگال میں برہمنوں اور کاسٹھوں کی اکثریت تھی، بمبئی میں برہمنوں، کاسٹھوں اور پارسیوں کی اور مدِ اس میں محض برہمنوں کی فی الحال مسلم بالاطبقہ دور رہا۔

مسلمانوں کے پس ماندگی کے اسباب

1845ء میں 17,350 (1) طالب علموں میں سے جو برطانوی ہند کے سرکاری اداروں میں تعلیم پا رہے تھے کم سے کم 13,699، ہندو تھے۔ مسلمانوں کی تعداد تھی 236 اور 1,789 طالب علموں کا تعلق دوسرے مذاہب سے تھا۔ یہ اعتبار پریسڈنسی 8,138 طالب علم بھیجی کے اسکولوں میں اور کالجوں میں تھے۔ 7,536 زیریں صدی صوبجات میں اور 2,186 شمال مغربی صوبجات میں (2) 1856-57ء میں سب سے زیادہ روپیہ بنگال میں خرچ کیا جا رہا تھا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتا ہے۔ (3)

صوبہ	کل آمدنی پاؤنڈ	تعلیم پر ہونے والا خرچ	تعلیمی خرچ کل آمدنی کے فی صد کی حیثیت
بنگال	1,12,02,641	94,322	.841
مدرا	47,18,036	34,222	.725
بھینچی	46,00,478	35,243	.766
شمال مغربی صوبجات	27,24,141	33,060	1.213
پنجاب	10,57,987	14,487	1.369

تعلیم پر خرچ ہونے والی رقم (مطلق اعداد میں) بھینچی اور مدراسی پریسڈنسیوں کے مقابلے میں بنگال میں تین گنا تھی۔ 1861ء میں بنگال کے اسکولوں میں جو طالب علم پڑھتے تھے۔ اُن کے مندرجہ ذیل تعداد میں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی تعلیم سے زیادہ فائدہ بنگال ہند نے اٹھایا۔

لکھتہ یونیورسٹی کے 1861ء کے انٹرنس امتحان کے نتائج (4)

اسی یونیورسٹی کے اس سال کے بلوائے کے امتحان میں 99 طالب علم شریک ہوئے جن میں 13 کامیاب ہوئے کامیاب ہونے والے طالب علموں میں سے 11 ہندو تھے مایک عیسائی تھا۔ اور ایک مسلمان تھا۔ (5) جب بھی موقع ملتا تھا۔ ہندو اور پارسی بڑی آسانی کے ساتھ انگریزی پڑھنے کے لئے تیار

(1) ان اعداد میں وہ طالب علم شامل نہیں ہیں جو مدراس ہائی اسکول میں تعلیم پا رہے تھے، وہاں اس سال 133، ہندو 21 مسلمان اور 12 عیسائی پڑھتے تھے۔

(2) تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی تعداد اور ذاتوں کا نقشہ جسے سرکھری خرچ پر تیار کیا جاتا تھا ہاؤس آف کامنز کو پیش کیا۔

(3) 1847-48 Parliamentary Paper (20)

(4) وی ٹریڈ آف انڈیا، 7 فروری 1861ء صفحہ 144

(5) ایضاً 31 جنوری 1861ء صفحہ 119

(5) ایضاً 31 جنوری 1881ء صفحہ 119

ہو جاتے تھے۔ اس کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ پریسڈنسی شہروں پر ہوتا تھا۔ لیکن مسلمان اور خاص طور سے اندرون ملک کے مسلمان اس کی طرف عموماً غفلت برتتے تھے۔ بہار اور اودھ میں، جہاں کے مسلمان مالکان اراضی اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے وسائل رکھتے تھے۔ انگریزی تعلیم کو خصوصیت کے ساتھ ناپسند کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر 1867ء میں لکھنؤ میں ہونے والے دوائے سرائے کے دربار میں 260 تعلقہ موجود تھے۔ جب کہ 1769ء میں تعلقہ اور گھرانوں کے صرف 70 بچے اسکولوں میں پڑھتے تھے (1) مسلمانوں میں انگریزی اسکولوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ بنگال میں بھی انگریزی تعلیم سے مستفید ہونے کے متعلق سے وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ 1860ء میں کلکتہ میں مسلمانوں کے دو تعلیمی ادارے تھے۔ یعنی لونگامدرسہ اور طلعت الہ لاہری بری سوسائٹی۔ جہاں تک طالب علموں کی تعداد اور تعلیم کے معیار کا تعلق تھا۔ یہ ادارے ہندو اسکولوں اور کالجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمان رہنما اس پس ماندگی کے دو اسباب بتاتے تھے (1)۔ یعنی مسلمانوں کا تعصب جو انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں مانع آیا۔ اور (2) حکومت کی بے توجہی (2)۔ بسنئی اور مدراس میں بھی انگریزی تعلیم سے زیادہ فائدہ پارسیوں اور ہندوؤں نے اٹھایا خاص طور سے برہمنوں کا کستھوں، سرسولوں اور دوسری کاروباری ذاتوں نے 1860ء میں ہندوستانی متوسط طبقے کا تعلیم یافتہ حصہ زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ اور مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔

متوسط طبقہ مغربی قسم کے اسکول میں گیا مغربی تصورات حاصل کئے اور ایک مشترک زبان یعنی انگریزی کا استعمال کیا۔ یکساں معاشی اور سیاسی حالات تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ اُن کی تعلیم مشترک شہریت کی پہچان میں معاون ہوئی۔ وقت گزرتا گیا اور اس تعلیم یافتہ طبقہ کی، جو مشترک قومیت کا احساس رکھتا تھا تعداد اور اثر میں اضافہ ہوتا رہا اور اپنے حقوق سے واقف ہو چکا تھا۔ اور جلد ہی اُس نے اپنی تنظیم شروع کی تاکہ حکمرانوں کے سامنے مانگیں پیش کر سکیں۔

پانچواں باب

اخبارات اور رائے عامہ

I ہندوستان میں صحافت کی ابتدا

ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے مختلف حصوں میں ایک طرف ایسے کردہ معرض وجود میں آرہے تھے جنکے مفادات اور رہن سہن کے طریقے نئے تھے۔ اور تعلیم کا ایک نیا نظام اُنکے خیالات احساسات کو نئے سانچوں میں ڈھال رہا تھا۔ اور دوسری طرف ملک ان مغربی ذرائع اور طریقوں میں متعارف ہوتا جا رہا تھا۔ جو ان خیالات کے پرچار میں معاون ہو رہے تھے۔ جو جوں وقت گزرتا گیا۔ یہ کردہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور اُس کے نتیجے میں ہندوستانی رائے عامہ شکل پاتی گئی۔ ان خیالات کا اظہار جدید مظہر انداز سے اخباروں میں ہوا۔ سیاسی انجمنوں کے ذریعے حکومت کو پیش کی جانے والی یادداشتوں اور عرضداشتوں سبوں اور عام لوگوں کے حقوق کو عدالتی کاروائی کے ذریعہ تسلیم کروانے کی کوششوں سے ہوا۔ ابھی پلاس کی جنگ کو مشکل سے ساٹھ سال ہوئے تھے اور ہندوستان کا بڑا حصہ قدیم حکومتوں کی گرفت میں تھا کہ نئے خیالات کی لہر اس اُنھن شروع ہو گئیں۔ نئے طریقوں میں سب سے اہم تھا چھاپہ خانہ اور ذرائع میں مواصلات کا فروغ یعنی ریلیں، سڑکیں، نہریں، ڈاک اور تار۔

ہندوستان میں چھاپہ خانے شروع کرنے کا سہرا پرنگلیوں کے سر ہوا۔ جنہوں نے 1550ء میں دو چھاپہ خانے درآمد کئے۔ اُنھیں مذہبی کتابیں چھاپنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جنوب میں اور چھاپہ خانہ قائم کئے گئے۔ سترھویں صدی میں بھیمن جی پارکھ نے بمبئی میں ایک چھاپہ خانہ درآمد کیا۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1674ء میں بمبئی میں چھاپہ خانہ کھولا۔ اٹھارہویں صدی میں مدراس، کلکتہ، بنگلہ اور بمبئی کے علاوہ ایک دو مقامات پر شمال ہندوستان میں بھی چھاپہ خانے قائم کئے گئے۔ چھاپہ خانے قائم ہو جانے کے بعد کتابیں، کتابچے اور رسالے چھپنے لگے۔ کچھ افراد اور مشنری سوسائٹیوں نے اُن کے فوائد کو سمجھا اور اپنے اپنے چھاپہ خانے شروع کر دیے۔

1766ء میں ولیم بوٹ نے اعلان کیا وہ ایک آزاد اخبار نکالنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن اخبار جاری نہ ہو سکا۔ چودہ سال بعد 1780ء میں جے۔ اے۔ بکلی نے اپنا ہفتہ وار رسالہ ریگال کڑٹ شروع کیا جو کلکتہ جرنل اڈورٹائزر بھی کہلاتا تھا۔ اور بکو کڑٹ کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ بکلی نے کچھ یورپوں اور وارن سسٹنر اور ایچ اسپہ کی طرح کے بڑے بڑے حاکموں پر ایک جیسے لکھ کر حکومت کو ناراض کر دیا۔ اُس کے خلاف پہلا قدم تو یہ اٹھایا گیا کہ حکمہ ڈاک کی خدمات سے اُسے محروم کر دیا گیا۔ پھر اُس کا پریس ضبط کر لیا گیا۔ اس کے بعد اُس کی صحافتی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد اور اخبارات نکلے۔ وہ اکثر اُن انگریزوں کے حق میں آواز اٹھاتے تھے جو حکومت سے غیر مطمئن ہوتے تھے۔ حکومت کی پالیسی اور کاروائیوں پر تنقید صاحبان اقتدار کی ناراضگی کا باعث ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی اُن کی شائع کردہ خبریں خاص طور سے قومی خبریں مصلحت کے منافی،

اور حکومت کے مفادات کے خلاف سمجھی جاتی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ابتدائی اخبارات کے ساتھ حکومت کے مراسم میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ان میں کئی حکومت کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور کچھ ہیروں کو سرسری کارروائی کے بعد ہندوستان سے نکال دیا گیا۔ مثلاً ولیم ڈومین، چارلس میکگن اور کچھ مدت بعد جیمس سلک بنگھم۔ ویلزی ان کاروائیوں سے مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے اخبارات کا سختی کے ساتھ سینسر کیا۔ اور لارڈ ہسٹنگز کے زمانے تک حالات اخبارات کے لیے سازگار نہیں تھے 1818ء میں ہسٹنگز نے اخبارات کو سینسر کرنے کا حکم توڑ دیا۔ لیکن اخبارات کے تعلق سے مندرجہ ذیل ضابطے بنائے۔

اخبارات کے ہیروں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت آنے والی خبروں کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی۔

نمبر 1۔ آرمیبل کورٹ آف ڈائریکٹرز یا ہندوستانی حکومت سے تعلق رکھنے والے انگلستان کے دوسرے کسی حاکم کے اقدام اور کارروائی کے خلاف سنجیدہ یا مقامی حکومت کی سیاسی کاروائیوں پر تبصرہ یا کونسل کے اراکین سپریم کورٹ کے ججوں یا کلکتہ کے لارڈ بیچپ کے کسی سرکاری اقدام کے خلاف اہانت آمیز رائے زنی۔

”نمبر 2۔ مباحثے جن سے مقامی آبادی کے دلوں میں ہنگامہ یا خوف پیدا ہو کہ ان کے مذہبی تصورات یا رواجوں میں مداخلت کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔

”نمبر 3۔ انگریزی یا دوسری اخبارات کے ایسے نکلنے کی نقل جو مندرجہ بالا عنوانات کے تحت آتے ہیں یا کسی اور طرح ہندوستان میں برطانوی طاقت یا شہرت کے لیے مضر ہیں۔

نمبر 4۔ کسی شخص کی ذاتی زندگی کے برے پہلوؤں کو پیش کرنا اور کسی کے متعلق اس قسم کی باتیں کہنا جو سماج میں فتنہ و فساد پیدا کریں۔“

ان پابندیوں سے ظاہر ہوتا ہے، لارڈ ہسٹنگز یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اخبارات کے سینسر کو بالکل ختم کر دینے کی منظوری کورٹ آف ڈائریکٹرز کو نہیں دے گا۔ اُس نے اپنی روداد میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ رائے عامہ کی طرف حکومت کے ذمہ دارانہ رویے کی نشوونما کی اہمیت نے اُسے متاثر کیا ہے۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے گورنر جنرل کی کارروائی کو ناپسند کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اشاعت سے پہلے سنسر کرنے کا پرائیمریقہ جاری رہنا چاہئے۔ لیکن بورڈ آف کنٹرول نے یہ مراسلہ روک لیا۔

اُس سال جیمس سلک بنگھم نے کلکتہ جرنل شروع کیا جس نے اپنے مضامین کی عہدگی اور ہلکٹگی کی بنا پر اور بڑی جرأت کے ساتھ سرکاری کپنیوں کو تشدد کا نام کر کے اچھل چلا دی۔ یہ پرچہ نہ انگریزوں بلکہ ہندوستانوں میں بھی مقبول ہو گیا۔ ہم عصر پرچوں میں غالباً یہ سب سے زیادہ ہلکا تھا۔ اُس کی صاف گوئی نے آڈم، بیلی اور لارڈ ہسٹنگز کی کونسل کے دوسرے اراکین کو بہت ناراض کر دیا۔ جون ہی ہسٹنگز اپنے عہدے سے ہٹاؤ آڈم نے انتظام سنبھالا اس نے حکم جاری کیا کہ ہر اخبار کے ناشر کو لائسنس لینا چاہئے جب یہ کارروائی بھی بنگھم کی سرگرمیوں کو نہ روک سکی۔ تو اُسے ہندوستان چھوڑنے کا حکم دیدیا گیا۔

اس کی تفصیلات بیان کرنا ضروری تھیں کہ کس طرح اخبارات کے ان ہیروں اور ایک ضرورت سے زیادہ حساس مطلق العنان حکومت کے درمیان اخبارات کی آزادی کے لیے کشمکش ہوئی جو اُس کی کاروائیوں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور صاحبان اقتدار پر تنقید کرتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اُس

زمانے کے انگریزی کے اخباروں میں ہندوستانیوں کی دلچسپی کا مواد بہت کم ہو تا تھا۔ اُن کے پڑھنے والوں کا طبقہ بہت محدود تھا۔ اور اُن ہندوستانیوں کی تعداد تو بہت ہی کم تھی جو انھیں پڑھا کرتے تھے۔ پھر بھی عام لوگوں کی تعلیم کے لیے اخباروں کے استعمال کے تصور نے دوسروں کو بھی متاثر کیا۔ لارڈ ہسٹنگز اور بی فروغ کا حامی تھا۔ وہ اخبارات کی افادیت کا قائل تھا۔ وہ شادیاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھیں جنہوں نے صحافتی سرگرمیوں میں روک لگا رکھی تھی اور ہندوستانیوں کا ایک ایسا حلقہ معرض موجود میں آگیا تھا جو اپنے ہم وطنوں کو تربیت دینے کی ضرورت کو محسوس کر تا تھا۔

ہندوستانی اخبارات کی ابتدا

مشرقی بنگالی زبان میں ایسے نثری اسلوب کو جنم دینے کی کوشش کر رہے تھے جو سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کرنے میں معاون ثابت ہو سکے۔ 1816ء میں گنگادھر بھٹاچاریہ اور ہر چندر رائے نے کلکتہ سے ایک اخبار نکالا جس کا نام تھا بنگال گزٹ۔ بد قسمتی سے یہ پہلا اخبار زیادہ دن تک نہ چل سکا۔ ہندوستانی زبان میں اخبار نکالنے کے سلسلے میں حقیقی پہل سیرم پور کے مشنریوں نے کی 1818ء میں رگدرشن ڈوٹے نے نکالا گیا جو بنگالی زبان کا پہلا ماہانہ رسالہ تھا۔ اس میں محض ادبی، سائنسی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے اور انگریزی اور بنگالی دونوں زبانیں استعمال کی جاتی تھیں۔ لیکن یہ رسالہ صرف تین سال تک چل سکا۔ بنگالی کا ایک ہفتہ وار پرچہ سچا درمہن بھی 1818ء میں شروع ہوا۔ جسے ڈاکٹر بادش من کچھ بنگالی ادیبوں کی مدد سے مرتب کر تا تھا۔ یہ پرچہ 1818ء سے 1841ء تک ہر سچر کو شائع ہوا تاہم اس کے بعد وہ بند ہو گیا۔ اور 1851ء میں دوبارہ نکلا شروع ہوا۔ لیکن اُس کے کچھ دن بعد اس کی اشاعت ختم ہو گئی۔ اس میں بہت سے موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ جس نے اس کے قارئین کو ایک نئی دنیا سے حواریں کر دیا تھا۔ یعنی یورپی اور امریکی معاملات کے متعلق اطلاعات، غبارے، دو خلی جہاز اور پودوں کے متعلق سائنسی معلومات اور سوانح۔ لیکن اس کی خصوصی نوعیت تھی ہندو اور عیسائی مذاہب پر مباحث۔ اسی سال (1818ء) سیرم پور مشن نے ایک انگریزی کا اخبار نکالا جس کا نام تھا فرینڈ آف انڈیا مشنریوں کی سرگرمیوں نے اخبار نکالنے کے سلسلے میں دوسروں کی بھی بہت افزائی کی۔ جن لوگوں نے مواقع سے فائدہ اٹھایا۔ اُن میں جیمس سلک بنگھم کے علاوہ تارا چندت اور بھولنی چرن بندوپادھیائے نام لیے جاسکتے ہیں۔ آخر الذکر ایک بنگالی ہفتہ وار سوسلا کوٹری نکالتے تھے۔ اس کا پہلا شمارہ 4 دسمبر 1821ء کو شائع ہوا تھا۔ رام موہن رائے کا قریبی تعلق کوٹری سے تھا اور وہ اُس میں برابر لکھتے رہتے تھے۔ انھوں نے اس پرچے کو ہندوؤں کی سماجی اور مذہبی اصلاح کا مقصد بنایا۔ اُن کے وہ مضامین اس میں شائع ہوئے جن میں انہوں نے سنی کی رسم کی مذمت کی تھی۔ ان مضامین نے ہندوؤں میں اشتعال پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے پرچے کو نقصان ہوا۔ کلکتہ جیل نے 14 فروری 1823ء کے شمارے میں لکھا تھا ”وہ پرچہ جو اتنا خطرناک سمجھا جاتا تھا اور جس کے متعلق خیال تھا کہ بارود کی سرنگ میں چنگری کا کام کر کے پورے ہندوستان میں دھماکے کا باعث بن جائیگا۔ آج بے یار و مددگار ہے اور زمین پر پڑا ہوا ہے۔ ہادی رائے میں اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کے رسم و رواج اور خاص طور ہندو بیویوں کو چلانے کی رسم کی مخالفت کر کے اُس نے مقامی لوگوں کو نادم کر دیا۔“ (1)

(1) ہندو پادھیائے چندر ناتھ بنگلہ نایک پتر لا بنگلہ سائیتھ پریشڈ (کلکتہ 1948ء) صفحہ 10 ماہرہ 4۔

سموا کو ٹری وقفے وقفے سے تقریباً اسی سال تک لکھا رہا۔ اس کا جو مشر ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں اصلاحات کا راستہ کتنا دشوار راستہ تھا۔

سموا گوڈی کے علاوہ رام موہن رائے ہندو دھرم کو عیسائی مشنریوں کے حملوں سے بچانے کے لیے ایک اور پرچہ نکالنا شروع کیا۔ یہ پرچہ برہمنی رسالہ یا برہمنی سیوا دھمی کہلاتا تھا۔ اس میں بیگانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے صرف تین شمارے شائع ہوئے۔ اس کے بعد یہ بند ہو گیا۔ ان شماروں میں رام موہن رائے نے ہندو اور مسلم مذہب کے خلاف مشنریوں کے الزامات کا جواب دیا اور ان کی سرگرمیوں کی مذمت کی۔ انھوں نے سڑکوں پر کھلم کھلا تبلیغ کرنے اور طرح طرح کے لالچ و دلا کر غریبوں کو عیسائی بنانے کی مخالفت کی۔ انھوں نے بڑے غصے کے ساتھ لکھا کہ مشنری حکمران طبقے کی رکبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان حکومتوں کے درمیان تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ جو ماتحتوں سے بہت خائف ہیں۔ دو قاری کی اخبار بھی لکھتے تھے یعنی جام جہاں نماء، مرات الکبیر۔ یہ اخبار بھی رام موہن رائے کے اشارے پر نکالے گئے تھے۔ ان تمام اخبارات میں زیادہ تر مذہبی مسائل پر بحث کی جاتی تھی۔

رام موہن رائے کے پرچوں کے 1- ایسی نوعیت نے رجعت پرست اور رسم و رواج سے لپیٹے لوگوں کو ان کا مخالف بنادیا۔ اور انگریز مشنریوں نے اور ہندو دھرم کے ہندوستانی مخالفوں کی بحث نے حکمرانوں کو خائف کر دیا۔ گورنر جنرل کی کونسل کے کچھ اراکین نے روڈوائس لکھیں۔ جن میں اخباروں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی سفارش کی گئی۔ انھیں یہ ڈر تھا کہ رائے عامہ میں خلل پڑ رہا ہے۔ اور عمل کی فکر تھی مختلف طبقوں کے درمیان پائے جانے والی بے چینی کوئی بری شکل نہ اختیار کر لے۔ ترقی پسند اخبارات خصوصی پریشانی کا باعث تھے اور ان پر حکومت نے خاص طور سے توجہ دی۔ ولیم بوڈو تھ بیلے نے اپنی روڈواں مورخہ 10، اکتوبر 1822ء میں لکھا ہے ”لیکن اخبارات کی آزادی چاہے کسی آزادی ریاست کے لیے وہ کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ میرے خیال میں اس ملک میں ہمارے لوگوں اور ہندوستان میں ہماری حکومت کی غیر معمولی نوعیت سے مطابقت نہیں رکھتی ہے۔“ (1) بیلے کا خیال تھا۔ ”یہ بات نہ قرین عقل ہے نہ سیاسی اعتبار سے درست کہ ہندوستانی رعایا کو اس امر کی اجازت دی جائے کہ آزادی کے ساتھ ہندوستان کی زبانوں میں انگریز حکمرانوں کے کردار یا سرکاری کارروائیوں پر ان مختلف مذاہب کی تقابلی خوبیوں پر جن میں ہر ہندوستانی کی آبادی کے مختلف الخیال لوگ عقیدہ رکھتے ہیں، تقریباً تحریر کے ذریعہ رائے زنی یا اعتراض کریں۔“

چنانچہ 1823ء جان ایڈم بیٹھا محکم گورنر جنرل کی حیثیت سے ایک ضابطہ کاغذ کیا جس میں اخبارات کی آزادی کم کر دی یہ حکم دیا گیا کہ کوئی اخبار کتابچہ یا کتاب جس میں سرکاری اطلاعات درج ہوں یا سرکاری اقداموں اور کارروائیوں پر اعتراض کیا گیا ہو۔ بغیر لائسنس حاصل کئے شائع نہیں کی جاسکتی ہے۔ لائسنس حاصل کرنے کے لیے ایک طرف نامہ داخل کرنا پڑتا تھا۔ جس میں ناشر طالع اور مالک کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ اور مندرجات کے متعلق اطلاع فراہم کی جاتی تھی۔ لائسنس منسوخ کیا جاسکتا تھا۔ اور بغیر لائسنس کے چھاپنے کی صورت میں 400 روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ حکومت کی اجازت کے بغیر کتاب یا اخبار چھاپنا اور چھاپے خانے کو استعمال کرنا ایک قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا۔

آزادی اخبارات کے متعلق رام موہن رائے کی رائے

رام موہن رائے نے اس ضابطہ کے خلاف احتجاج کیا اور سپریم کورٹ میں ایک عرضداشت پیش کی جس میں ضابطہ کی منسوخی کی درخواست کی گئی تھی انھوں نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ یہ ضابطہ نہ صرف علم کی نشر و اشاعت میں معیائے گالک اسی کی وجہ سے لوگ افسروں کی تانہائیوں اور غلطیوں کو حکومت کی نظر میں لا سکیں گے۔ انھوں نے یہ لکھا تھا کہ ”ہر اچھا حکمران جو انسانی کوتاہیوں کا قائل ہو اور دنیا کے دائمی حاکم کا احترام کرتا ہو۔ بڑی سلطنت کے نظم و نسق میں غلطیوں کے امکان کا احساس ضرور رکھتا ہو گا اور اس لیے اسے یہ فکر ہوگی کہ ایسے تمام معاملات کی طرف اس کی توجہ دلانے کے مواقع ہر فرد و بشر کو حاصل ہونا چاہیے۔ جن میں اس کی مداخلت ضروری ہو۔ اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے واحد موثر طریقہ ہے۔ اشاعت کی مکمل آزادی“ (1)

سپریم کورٹ نے یہ درخواست خارج کر دی رام موہن رائے نے اجلاس کو نسل کو اپیل بھیجی۔ انہوں نے کو نسل کی توجہ اس تکفیدہ صورت حال کی طرف دلائی جو ہندوستان کی حکومت نے پیدا کر دی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا ”مقامی انتظامی حکام نے ایک اہم ترین معاملہ میں قانون سازی کے اختیارات یکجہت حاصل کر لیے اور اس بات کی نشان دہی کئے بغیر کہ ہم نے ان سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ ہمیں قدیم قانونی حقوق سے محروم کر دیا۔ اور ہمارے سول حقوق پر اس قسم کا حملہ کیا جس کی نظیر پچال میں انگریزی راج کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لیے ایسا اقدام کیا گیا۔ جس سے یا تو ملک معظم کی وفادار رعایا کے سول حقوق اور استحقاق کی طرف ان کی مکمل بے توجہی ظاہر ہوتی ہے یا موجودہ حکومت سبہارے لگاؤ کے متعلق بے بنیاد مشکوک و شبہات کو ہوا دینے کا ارادہ۔“ (2)

اس مدلل اپیل کا بھی وہی حشر ہوا۔ کو نسل نے مداخلت کرنے سے انکار کر دیا۔ اسکے باوجود یہ اپیل ایک دلچسپ دستاویز کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے متعلق مس کوٹ نے کہا ہے۔ اسکو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم استعارہ کہنا چاہیے۔ اپنے اسلوب اور استدلال کی بنا پر یہ دستاویز مشرق میں انگریزی تہذیب کے فروغ میں ایک باوقار سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔“ (3) اس نے ان خطوط کا یقین کرایا ان پر پوری کی پوری انیسویں صدی میں ہندوستانی حکومت کی سیاسی تحریک چلنے والی تھی۔

(1) The English Works of Raja Ram Mohan Ray (1) ترویج ہے۔ کی کھوش۔ جلد ۲ (کلکتہ)۔

ایس۔ کے۔ لائبریری اینڈ کو 1910ء صفحہ 286۔

(2) ایضاً صفحات 287-288۔

(3) سو تریڈ کوٹ Life and Letters of Raja Ram Mohan Ray (تیسرا ایڈیشن 1962ء) صفحہ 177

II ہندوستانی اخبارات اور ان کی محدود نشوونما

حکومت کی پالیسی تبدیل کرانے میں ناکامی کا زیادہ اثر اخبارات پر نہیں پڑا ہندوستانی رائے عامہ اخبارات کی قدر و قیمت سے واقف ہو گئی تھی۔ اور پابندیوں کے باوجود جو 1835ء تک جاری رہیں بہت سے اخبارات معرض وجود میں آ گئے۔ جن کی ادارت ہندوستانیوں اور یورپوں کے سپرد تھی۔ ہندو پادھیائے نے تقریباً تیس بنگالی اخباروں کی فہرست دی ہے۔ جنہیں اس زمانے میں لائسنس ملا۔⁽¹⁾ ان میں سے کچھ ماہوار تھے۔ لیکن زیادہ تر ہفتہ وار تھے۔

ہندوؤں کے قدامت پرست گروہ کی طرف سے جو اخبارات نکالے گئے ان میں سماچار فیدرکا شامل تھا۔ جس کی ادارت سمبونی چرچ ہندو پادھیائے کے سپرد تھی جو سمواد کوٹری کے مدیروں میں شامل رہ چکے تھے۔ 1823ء میں یہ اخبار سنی کے خلاف رام موہن رائے کی تحریک کی مخالفت میں نکالا گیا تھا۔ یہ اخبار رجعت پسند و حرم سبکا کا حامی تھا۔ کسی نہ کسی طرح یہ 1857ء تک جاری رہا۔ لیکن سبکا کے ختم ہوجانے کے بعد اس کا اثر کم ہو گیا تھا۔ دوسرا اخبار سمواد پور ناچندر رودا لیا جو کئی سال تک جاری رہا۔ ابتدا میں ایک ماہوار اور اپنی اور سیاسی رسالہ تھا۔ لیکن بعد میں ہفتہ وار ہو گیا۔ پور پھر ہفتہ میں تین مرتبہ نکلنے لگا اور بالآخر روزنامہ ہو گیا۔ ایک اہم ادیب اور شاعر امیشور چندر گپتا ہفتہ وار سمواد پر بھا کر کام پر تھا جو بعد میں روزنامہ ہو گیا۔ یہ اخبار ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت کے تعلق سے پر انجیالات کا اظہار کرتا تھا۔ کئی جانے پہچانے ادیب اس کے لکھنے والوں میں شامل تھے۔ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی زمانے میں راجا کاکا، دیب پرناکمار نیگور، جے گوپال ترک کم، ناول ٹھاکر بیکم چندر پٹری اور نخل درپن کے مصنف دین بندھو متراس میں لکھا کرتے تھے۔ پرانے خیال کے کئی اور اخبار بھی نکالے گئے۔ لیکن وہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکے۔

روشن خیال اخباروں میں سمواد کوٹری کے علاوہ بنگال ہیرالڈ بھی تھا۔ اس کا پہلا شمارہ 1829ء میں شائع ہوا۔ اس میں چار زبانوں میں مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ یعنی انگریزی، فارسی، ہندی، بنگالی میں۔ اس کے معاونوں میں تھے آر۔ ایم۔ مارٹن، موہار کانتا تھ نیگور، پرناکمار نیگور، رام موہن رائے وغیرہ۔ ہیرالڈ کے بانیوں کی سرپرستی میں 1830ء میں بنگادوت بھی نکالا گیا۔ گیانند دیش ایک روشن خیال مہتمم اور تھا۔ جس میں مذہب اور سائنس کے متعلق مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ روبرٹ مانگری۔ مارٹن اور نخل رتن۔ ڈی۔ اس کے مشترکہ مدیر تھے۔ اس پر حکومت کا عذاب نازل ہوا۔ اور سرکاری احکام کے خلاف رائے ظاہر کرنے کے تعلق سے اسے جیل کی نئی۔

گیانند دیش بنگال کا آرگن تھا۔ یہ گروہ ہندو کالج کے سابق طالب علموں اور دہرو زیو کے طالب علموں پر مشتمل تھا۔ وہ ایک اخبار انگریزی میں بھی شائع کرتے تھے۔ جس کا نام تھا انکوائئر۔ یہ دونوں اخبار بنگال میں نشاۃ ثانیہ کے عیش رو تھے۔

دیگبان سمواد میں جو ماہوار رسالہ تھا۔ سائنس پر مضامین کے تراجم چھاپے جاتے تھے۔ مشترقی۔ ایچ ولسن نے پٹنوی کو جنم دیا۔ جو ایک سائنسی رسالہ تھا۔ اور طبی تاریخ پر مضامین شائع کرتا تھا۔

فارسی کے اخبار

کلکتہ سے دوسری زبانوں کے اخبارات بھی نکلتے تھے۔ فارسی میں کئی اخبار نکلتے جو اس وقت سرکاری زبان تھی اور بالائی طبقے میں بڑے پیمانے پر سمجھی جاتی تھی۔ رام موہن رائے کا مراۃ الکبر 1822ء میں شروع ہوا۔ اپنی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے اس نے لوگوں کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی طرف دلائی۔ کلکتہ میں پائی جانے والی آزادی اور تحفظ حقوق کی برابری جو قوانین نے اونچے اور نیچے کے درمیان قائم کر دی ہے۔ اور عام لوگوں کو تعلیم دینے، سماج کو سدھارنے اور ان کی شکایتوں کے تدارک کے لیے حکومت تک لوگوں کے احساسات اور جذبات کو بھونچانے کے لیے اخبار نکالنے کی ضرورت کی وضاحت کی۔

فارسی کا دوسرا اخبار تھا جام جہاں نما اُس کا مدیر تھا فاش سداسکھ اور نائرو ولیم پیٹرس ہاپ کزاور اینڈ کمپنی کچھ برسوں تک اسکو ایٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی حاصل رہی۔ لیکن اس کے بعد یہ سرپرستی نامعلوم اسباب کی بنا پر ختم ہو گئی۔ فارسی کے ساتھ اُس کا اردو ضمیمہ بھی شائع کیا جاتا تھا۔ اُس کا نام بھی جام جہاں نما تھا۔ اس میں مضامین کے علاوہ انگریزی فارسی اور نظموں کے ترجمے بھی شائع کئے جاتے تھے۔ اُن کے علاوہ کئی اور فارسی کے اخبار تھے۔ مثلاً شمس الکبر جس کے بانی تھے منی رام خاکر نور مآثر موہن (1823ء) سپرم پور کے عیسائی مشنریوں کا سپریم پور اخبار ”1826ء“ آئینہ اسکندر (1831ء) ملا عالم افروز (1832ء) جس کا مدیر تھا ایم ہاج الدین۔ سلطان اخبار 1835ء جسے لکھنؤ کا جب علی شائع کرتا تھا۔ اور مہر چند 1841ء جو ہفتہ میں تین مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ کچھ فارسی اخبار حکومت پر سخت تنقید کرتے تھے۔ اور اُن امور کی مذمت کرنے میں نہیں ہچکچاتے تھے جن پر اعتراض کرنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ انگریز حکام کے خلاف ہندوستانی ابتدا میں اپنے غصہ کا اظہار کس طرح کرتے تھے اس کی کچھ مثالیں قابل غور ہیں۔ ملا عالم افروز میں ایک انگریز افسر کی خبر شائع کی گئی جو شکار کھیلنے گیا تھا اور غلطی سے ایک عورت کو گولی مار دی تھی۔ مجسٹریٹ نے اُسے رہا کر دیا اور تنبیہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا اخبار نے لکھا تھا مجسٹریٹ نے نسلی پابندی سے کام لیا اور قاتل کو رہا کر دیا۔ جو ایک دولت مند انسان ہے۔ ایک بے گناہ شخص کی موت کے لیے نہ اُسے مجرم گردانا نہ قصور وار ٹھہرایا۔ سلطان اخبار نے عدالت کے چھوٹے موٹے اہلکاروں کی شکایت کی جو اپنی بد اطواری کی بنا پر لوگوں کی تکلیفوں کا باعث تھے لیکن انگریز افسران کے خلاف شکایتوں پر توجہ نہیں دیتے تھے۔

سلطان اخبار نے برطانوی سلطنت اور اودھ کے حالات کا موازنہ کیا اُس نے بتایا کہ برطانوی حکومت کے ذمہ دار تکلیفوں میں مبتلا ہیں یہ کہ کلکتہ کے شہر میں جتنے قتل ہوئے ہیں اتنے قتل اودھ کی پوری سلطنت میں نہیں ہوئے ہیں اور یہ کہ ہر برطانوی عدالت میں رشوت کا بول بالا ہے۔ حکمرانوں کی طرف ہندوستانیوں کی بے جا بات کیا تھی۔ اس کی تصدیق اُن خیالات سے ہوتی ہے جو کریم خاں کی پھانسی کی خبر پر ظاہر کئے گئے تھے۔ جسے دہلی کے رہنما ولیم فریزر کے قتل کی پاداش میں (1834ء) میں پھانسی دی گئی تھی۔ لوہا رو کے نواب شمس الدین کو بھی مجرم گردانا گیا تھا۔ لیکن جس دن اسے پھانسی دی گئی کوئی مرد، عورت اور بچہ، امیر یا غریب پھانسی کا منظر دیکھنے کے لیے نہیں آیا اور اس طرح دہلی کے شہریوں نے نواب کے ساتھ ہمدردی اور اسکو دی جانے والی سزا کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا۔

ہندی کے اخبار

کچھ بنگالی کے اخباروں نے بنگالی کے ساتھ ہندی میں بھی خبریں اور مضامین شائع کرنے کی کوشش کی لیکن پہلا ہندی کا اخبار 1826ء میں شروع ہوا۔ اس کو کان پور کے پرنٹ جمل کشور شکلا نے شروع کیا۔ جو صدر دیوانی عدالت میں ایک ماتحت اہلکار تھا یہ پرچہ ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اُسکے بعد حمایت کی کمی کی بنا پر ختم کر دیا گیا۔

1830ء کے ختم ہونے تک صرف کلکتہ میں بنگالی کے تین روزنامے ایک ہفتے میں تین مرتبہ شائع ہونے والا اخبار دو ہفتے میں دوسرے شائع ہونے والے اخبار۔ سات ہفتے وار اور ایک ماہنامہ شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں 13 اخبار نکلتے تھے۔ انگریزی کے اخبار وہاں کے یورپین باشندے خریدتے تھے۔ لیکن اُن کے قارئین میں تھوڑے سے ہندوستانی بھی شامل تھے۔ ان میں سے کچھ اخباروں نے طوفانی زندگی گزاری اس لیے کہ وہ نہ صرف ہر کاری کاروائیوں پر تنقید کرتے تھے بلکہ سرکاری احکام پر ذاتی جمع بھی کیا کرتے تھے۔ مکی اور جیس سلک بنگلہمکی روداویں حکومت اور تنقید کرنے والے اخباروں کے تصادم کو ظاہر کرتی ہیں۔

اخبارات کی آزادی کی بحالی

بنگلہم کا اخبار کلکتہ جرنل نہ صرف آزادی رائے کا حامی تھا بلکہ سرکاری کاروائیوں پر بڑی بڑی تنقید کے ساتھ تنقید بھی کرتا تھا۔ یہ اخبار ہندوستانی اخبارات کی شہرت اور اُن میں سے کچھ کے مندرجات کی فہرست بھی شائع کرتا تھا۔ بنگلہم سے رام موہن رائے کی دوستی تھی۔ اُس کی مثال نے ہندوستانی اخبارات کی خاصی ہمت افزائی کی۔

حکام کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اور بیلک کی جزوی نے جو اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ اُسکی وجہ سے گورنر جنرل کے لبرل خیالات کے باوجود کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اٹھایا جاسکا۔ کلکتہ کے کئی صحافیوں کی طرف سے جن میں زیادہ ہندوستانی تھے ۱۹ فروری 1835ء کو گورنر جنرل اجلاس کو نسل کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی گئی۔ جس میں 1823ء کے ضابطے اور اس کے تحت بنائے جانے والے قاعدوں کو منسوخ کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ بیلک نے تسلیم کیا کہ اخبارات کے تعلق سے قانونی حیثیت قابل اطمینان نہیں اور اس کو بدلنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ کرنے سے پہلے دیر تا زور ہو گیا اور مشکاف نے مدداری سنبھال لی۔

ملک کے زمانہ حکومت میں ہندوستان کے حالات میں ایک نیا موڑ آ گیا۔ اب برطانوی سرمائے اصل کاری زراعت اور صنعت میں ہونے لگی تھی اور ہندوستان کو اس طرح ترقی دی جانے لگی تھی کہ وہ لگھتان کو خام مال مہیا کر سکے اور اُس کی مصنوعات خرید سکے۔ حکومت کی سول ملازمتوں میں زیادہ ہندوستانی مرتی گئے جانے لگے تھے۔ سنی کی رسم ختم کرنے کی سماجی اصلاحات کی جاچکی تھیں انگریزی تعلیم تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ جس کے نتیجے میں سرگرمیاں بڑھ گئیں تھیں اور زیادہ بحث و مباحث ہونے لگا تھا اور

کئی اخبارات شروع ہو چکے تھے۔ پہلی قدروں پر نظر ملتی کی جارہی تھی۔ پرانے سماجی رواجوں اور مذہبی عقیدوں پر تنقیدی نظر ڈالی جارہی تھی۔ اور ادبی اظہار کی حیثیت و مواد بدل رہے تھے۔

سر چارلس مکلف نے 1835ء میں ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور اخبارات کی آزادی بحال کر دی جس کی وجہ سے کورٹ آف ڈائریکٹرز اس سے ناراض ہو گیا۔ بظاہر سرکاری حکام و گروہوں میں بے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک گروہ بقول سر تھامس منزہ سمجھتا تھا کہ ”آزاد اخبار اور پریسیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جن میں کوئی مطابقت نہیں اور جو زیادہ مدت تک دوسرے کے ساتھ نہیں دے سکتے۔“ (1) اُن کے مطابق ”آزاد اخبار آزادی اور لازم و ملزوم ہیں۔ اس کے برعکس آزاد اخبار ایک مطلق العنان اور اُس سے زیادہ ایک بدلیسی حکومت کے قدرتی طور سے مخالف ہوتے ہیں۔“ (2)

دوسرے گروہ کی رائے مختلف تھی۔ اُن میں سر چارلس ٹریولین شامل تھا۔ جو خود بھی انڈیو قیوس کے فرضی نام سے اخبارات میں مضامین لکھ چکا تھا۔ اور اس کا قائل تھا کہ سرکاری حکام پر رائے عامہ کا چھاپہ ٹرپڑنا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نمائندہ اسمبلی کی عدم موجودگی میں خرابیوں کو ظاہر کرنے اور عام لوگوں کے احساسات کو جاننے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

ہندوستانی اخبارات پر سے پابندیاں ہٹانے کے متعلق جو شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ مکلف نے انھیں پس پشت ڈال دیا اور کہا۔ ”ہندوستان کو برطانوی حکومت کا جز بنائے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے باشندوں کو جہالت کے اندھیرے میں رکھا جائے تو ہماری حکومت اس ملک کے لیے ایک لعنت ہے اُسے ختم ہونا چاہیے۔“ (3)

چنانچہ اس طرح شروع ہونے والا آزادی کا یہ دور راجہ عامہ اور اخبارات کی ترقی میں برا معاون ثابت ہوا۔ بہت سے اخبارات وجود میں آ گئے۔ حالانکہ اُن میں سے اکثر تھوڑے دن کے بعد ختم ہو گئے۔ ان اخبارات میں روزنامے، ہفتے میں دو بار اور تین بار شائع ہونے والے اخبار، ماہنامہ اور سال میں چار دفعہ شائع ہونے والے مجلے شامل تھے۔ ابتدائی دنوں میں اُن کے پڑھنے والوں کی تعداد کم تھی۔ لیکن اُن کا اثر اس سے کہیں زیادہ تھا۔ جتنا اُن کتھ حد سے معلوم ہوتا ہے۔

1835ء اور 1857ء کی درمیانی مدت میں ایک سو سے زیادہ اخبار لکنا شروع ہوئے۔ اُن کے مندرجات فکر و عمل کے ہر میدان پر محیط ہوتے تھے۔ یعنی مذہب، اخلاق، رسم و رواج، ادب، سائنس، عالمی حالات، تاریخ، معاشیات اور سرکاری انتظام۔ اگر جمہوری عمل کی روح ہے بحث و مباحثہ اور دلیل دے کر لوگوں کو آگاہ کرنا تو ہندوستانی تیزی کیساتھ اُس حق کو سیکھتا رہا تھا۔ یہ بات تاؤ بر تھی کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں پائے جانے والے حالات میں یہ عمل متوسط طبقے تک محدود رہا۔ اور یہ کہ سہافت کے علاوہ تعلیم و ادب کے میدان میں بھی بنگال پورے ہندوستان سے آگے رہا۔

(1) ایم برنس، محولہ بالا، صفحہ 251، بمبئی کے گورنر ڈاکٹر فیلکس کی روداد مورخہ 24 جون 1857ء کا اقتباس۔

(2) ایضاً۔

(3) ایضاً، صفحہ 252۔

بمبئی پریسٹنسی کے اخبارات

بمبئی میں اخبارات نکلنے کے بعد شروع ہوئے۔ پہلا انگریزی کا اخبار ہفتہ وار بمبئی ہیرالڈ 1789ء میں شروع ہوا اور اُس کے ایک سال بعد بمبئی کرپر شروع ہوا۔ بمبئی گزٹ، جو سرکاری اخبار بن گیا 1791ء میں نکلتا شروع ہوا اور 1792ء میں اُسے ہیرالڈ میں ملا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی زبان کے اخبارات میں وہ خبریں شائع ہوتی تھیں جن سے انگریزوں کو دلچسپی ہوتی تھی۔ مثلاً برطانوی پارلیمنٹ کی نشستیں، انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے کوائف، ہندوستان حکمرانوں کے منصوبے اور یورپین لوگوں کی سماجی خبریں۔ ان اخبارات کو حکومت ریکارڈ کے طور پر اپنے اعلانات کی اشاعت کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اُس زمانے کی برطانوی حکومت پر ان لوگوں کی تنقید بھی شائع کرتے تھے جو کمپنی کے اعلیٰ حکام کے حقوق یافتہ طبقے کے باہر ہوتے تھے۔ اُن کی تنقید کا کچھ اثر حکومت کی کاروائیوں پر پڑتا تھا۔

ہندوستانیوں کے اخبار کی بمبئی میں 1812ء میں داغ بیل پڑی جب فریدون جی مرزبان نے گجراتی ساچار پریس قائم کیا۔ پہلا گجراتی اخبار بمبئی ساچار 1822ء میں اس چھاپ خانے میں چھاپا۔ 1837ء میں وہ روزنامہ ہو گیا۔ اخبارات کی طرف حکومت بمبئی کا رویہ اتنا ہی غیر ہمدردانہ تھا جتنا بنگال میں۔ خاص طور سے الفنسٹن سختی کے ساتھ اخبارات پر کنٹرول رکھنے کا حامی تھا۔ بمبئی گزٹ نے سپریم کورٹ کی کارروائی پر اعتراض کر کے حکومت کو ناراض کر دیا۔ چنانچہ اُس کے مدیر سی۔ جے۔ فیرکولک بدر کر دیا گیا۔ 1825ء میں وہ مضابطہ منظور کیا گیا جس کی رو سے اخبارات کے مالکوں، مدیروں اور ناشرین کو اپنے نام درج رجسٹر کرانے پڑے۔ پھر بھی اخبارات کی تعداد بڑھتی رہی۔ اپنے فرائض کی تعلیم کے لیے پارسیوں نے دو اخبار شروع کئے۔ ان کے کیلنڈر کے سوال نے اُن میں اشتعال پیدا کر دی تھی۔ ان کا ایک گروہ، جو قدیم کہلاتے تھے۔ اور دوسرا ملائیروز کے حامی تھے، یہ تسلیم کرتا تھا کہ ہندوستان کے پارسی جس کیلنڈر کو استعمال کرتے ہیں اُس میں ایک مہینے کی غلطی ہے۔ دوسرا گروہ، جو شاہنشاہی کہلاتا تھا۔ رائج الوقت کیلنڈر کا حامی تھا۔ ان اخبارات کے کالموں میں اس مسئلے پر بحث ہوتی رہتی تھی۔

1830ء میں نوروجی دوراب جی چندا رو نے گجراتی کا ایک ہفتہ وار اخبار بمبئی ورتمان شروع کیا۔ تیرہ مہینے کے بعد وہ ہفتہ میں دوبار شائع ہونے لگا۔ 1831ء میں پرسنن جی مالک کے موتی والا نے گجراتی میں ایک ہفتہ وار اخبار جام جہاں نما نکالتا شروع کیا جو کچھ مدت بعد روزنامہ ہو گیا۔

بمبئی کے اخبارات میں ایک دلچسپ اضافہ اس وقت ہوا جب 1801ء میں 15 روزہ راست گرفتار نکلتا شروع ہوا جس کے مدیر تھے دادا بھائی نوروجی اور مالی امداد کر رہے تھیں رشیڈ جی گاما۔ اگلے سال دادا بھائی کاؤس جس نے اخبار سوداگر نکالتا شروع کیا سرہئی کا پہلا اخبار تھا۔ بمبئی درپن جسے 1832ء میں بال شاستری جھمبیکر نے شروع کیا، اس کے دستور عمل میں کہا گیا تھا ”اپنے ہم وطنوں میں انگریزی ادب سیکھنے کی خواہش پیدا کرنے کے خیال سے اور ملک کی خوشحالی اور اس کے باشندوں کی آسودہ حالی کے تعلق سے آزاد مباحثہ عامہ کا میدان کھولنے کی غرض سے کچھ مقامی لوگ جو بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ ایک اخبار نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس کا نام ہو گا بمبئی درپن اس اخبار کو نکالنے کا بڑا مقصد ہے ہندوستانیوں میں یورپین ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور یورپین علوم کی اشاعت کرنا۔ اس کی افادیت بڑھانے کے لیے اس کے ہر صفحہ

پردہ کالم ہوں گے ایک انگریزی میں دوسرا مراٹھی میں اس اخبار نے اپنا عہد پورا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن 1840ء میں جب وہ بند ہوا تو اس نے اعلان کیا۔ ”اس اخبار کی اشاعت کے اسباب تھے۔ مراٹھی میں اخبار کا شوق پیدا کرنا اور مذہب اور سیاست کے معاملات میں اپنے روشن خیالی پر مبنی جذبات پیدا کرنا۔ جو ہمارے ہم وطنوں کی ترقی کا باعث ہو۔“

1840ء میں بال شاتری نے ایک ماہوار رسالہ کت درشن نکالنا شروع کیا۔ جس کا مقصد تھا۔ تعلیمی تہذیبی اور سائنس موضوعات پر بحث کرنا۔ قریب قریب اس زمانے میں اس کے ساتھی بھاؤ مہاس نے پر بھا کر نکالنا شروع کیا۔ 1842ء میں مشنریوں نے دتناوایا خرید لیا۔ پونے سے نکلنے والا اخبار تھاویتان پرکاش جو 1829ء میں شروع ہوا۔

مدراس پریسٹنسی کے اخبار

مدراس پریسٹنسی سے نکلنے والا پہلا انگریزی کا اخبار تھا۔ مدراس کوائر جو 1780ء میں شروع ہوا، اس کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ اور اُس میں سرکاری اعلانات چھپنے لگے۔ 2 سال بعد اسکے خذیر یوین نے اُس سے قطع تعلق کر لیا۔ اور ہر کارو شروع کیا۔ اس کے بعد 1897ء میں ہفتہ وار مدراس گزٹ شروع ہوا اور ایک مستند اخبار انڈین ہرالڈ کچھ دن بعد شائع ہونے لگا حکومت مداس نے بھی اخبارات کی طرف شک و شبہ کا دیباہی رویہ اختیار کیا۔ جسے دوسری پریسٹنسیوں میں شروع کیا گیا۔ اخبارات پر کنٹرول رکھنے کے لیے لائسنس اور سنسر شپ کے طریقے پر عمل کیا گیا اور نا فرمان ایڈیٹروں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ مدراس میں اخبار کی ترقی کی رفتار سست تھی۔ 1808ء تک ہندوستانی زبانوں میں نکلنے والے اخبارات کی تعداد کم تھی۔ 1877ء تک 126 اخبار نکلنے لگے تھے۔ مدراس سے کئی اردو اور فارسی کے اخبارات بھی شائع ہوتے تھے۔ مثلاً ازل الاخبار، ناشر الاخبار۔ آفتاب عالم تاب، جامع الاخبار وغیرہ۔

شمالی ہندوستان کے اخبار

شمالی صوبے انگریزی حکومت میں کچھ مدت بعد شامل ہوئے۔ اور انیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد وہاں اخبارات نکالنا شروع ہوئے کانپور انگریزوں کا ایک اہم فوجی مرکز بن گیا تھا۔ کانپور ایڈورٹائزر 1822ء میں اور آئین بس 1828ء میں شروع ہوا۔ 1835ء میں میرٹھ سے یونیورسل میگزین شائع ہونا شروع ہوا۔ 1832ء میں انگریزی کا ہفتہ وار اخبار دہلی گزٹ شروع ہوا۔ اور اس کے بعد 1838ء میں دہلی ایڈورٹائزر نکلا جس نے 1806ء میں اپنا نام بدل کر انڈین ٹائمس رکھ لیا۔ بنارس سے ریکارڈر شائع ہوا۔

اس علاقے میں اردو اور فارسی کے اخبار تھے۔ فارسی زبان کے اخبار میں شامل تھے زیدۃ الاخبار (1823ء)، مہر میتر (1841ء) سر ارج الاخبار (1841ء) اور احسن الاخبار (1844ء) وغیرہ۔ اردو کے اخباروں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں آگرہ اخبار۔ دہلی اخبار۔ سید الاخبار۔ صادق الاخبار۔ کریم الاخبار۔ اسد الاخبار۔ بنارس اخبار آفتاب ہند، کوہ نور وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ 1848ء تک شمال مغربی صوبجات میں تقریباً ڈیڑھ درجن چھاپے خانے قائم ہو چکے تھے۔ اور دو کے علاوہ سب کے سب اخبار چھاپتے تھے۔

فارسی کے اخباروں میں سرانج الاخبار دہلی کے بادشاہ کے دربار کا ایک طرح کا گزٹ تھا۔ زید الاخبار جس کا مالک اور مدیر فشی واجد علی خاں تھا بہت ذمہ دار اور باخبر اخبار تھا۔ لیکن اس کا جھکاؤ قدامت پرستی کے طرف تھا۔ حالانکہ وہ اپنے خیالات کا اظہار بڑی احتیاط کے ساتھ اور متوازن زبان میں کرتا تھا۔

ہندوستانی زبان کے دوسرے اخباروں میں پنجاب کا کوہ نور اہم تھا جسے فشی ہر سکھ رائے نے شروع کیا تھا، بتارس کے باغ و بہار میں طب، تاریخ، فلکیات اور دوسرے موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ فشی سدا سکھ لال نے دو اخبار نکالے۔ ایک اردو میں (نور انبہاد) دوسرا ہندی میں (یدھ پرکاش) دونوں کی ادارت بڑی قابلیت کے ساتھ کی جاتی تھی۔

دو ماہناموں کا ذکر بھی کر دیا جائے یعنی قرآن المسدین اور فوائد الناظرین، جو دہلی کے مطلع العلوم پریس میں چھپتا تھا۔ اُن میں یورپین سائنسوں پر بحث ہوتی تھی۔ اخباروں کے رول کے دو پہلو تھے۔ ایک طرف وہ حکومت کی پالیسیوں اور کاروائیوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف عام لوگوں میں روشن خیالی اور تعلیم پھیلاتے تھے۔

III اخبارات اور حکومت

شروع شروع میں ہندوستانی اخبارات حکومت پر اعتراض کرنے سے بچے۔ لیکن رفتہ رفتہ کارنواں اور اس کے چائنیوں کی پالیسیوں کا اثر ظاہر ہونے لگا اور ہندوستانیوں کو اس بات سے تکلیف ہونے لگی کہ ہندوستانی حکمرانوں کے زمانوں میں انھیں جو سرپرستی حاصل تھی اس سے وہ محروم ہو گئے تھے۔ مالگوار کی کے تعلق سے تخت پالیسیوں اور معافی کی زمینوں کو واپس لینے کی بنا پر بڑی بے چینی پھیل گئی۔ عام بے اطمینانی میں سب سے زیادہ اضافہ ہندوستانی سرحدوں پر نمودار ہونے والے حالات نے کر دیا۔ مثلاً ایرانی فوجوں نے ہرات کا محاصرہ کر لیا تھا۔ نیپال اور برما کے خلاف فوجی کاروائی کی جارہی تھی، اور ہندوستانی حکمرانوں کے درباروں میں نیپال کے اپنی خفیہ طور سے آرہے تھے۔

اس بے اطمینانی کے انعکاسات اخباروں میں نظر آنے لگے۔ خاص طور سے ہندوستانی زبانوں اور بالخصوص اردو اور فارسی کے اخباروں میں۔ حکومت پر صاف صاف مگر معتدل انداز سے اعتراض کرنے کا سلسلہ جام جہاں نمائے شروع کیا۔ ریفارمر کے صفحات حکومت کی کاروائیوں پر اعتراضات سے بھرے ہوتے تھے۔ 1845ء میں اس اخبار کی سرگرمیوں کی وضاحت اس طرح کی گئی تھی ”سیاست میں ریفارمر نے پہلے برطانوی حکومت کے خلاف معاندانہ، اور غیر امتیازی تشدد کا رویہ اختیار کیا اور ان علاقوں میں پائی جانے والی انتہائی شدت پسندی پر بھی فوقیت لے گیا۔ اُس نے ہندوستان کی تمام خرابیوں کا علاج یہ تجویز کیا کہ جمہوریت اور ایک ناگفتہ بہ قسم کی ایسی ادلی گار کی کامیزہ بنایا جائے۔“ (1)

نی الجملہ ہندوستانی اخبارات کا لہجہ معتدل ہوتا تھا۔ لیکن وہ حکومت پر اعتراض کرتے رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی سلامت طبع اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ اور وہ صاف گوئی پر اتر آتے تھے۔ اس قسم کا ایک موقع اُس وقت آیا جب حکومت نے اُس قانون میں ترمیم کرنا چاہی جس کی رو سے ہندو کی جائیداد ضبط ہو جاتی تھی جو عیسائی مذہب قبول کر لیتا تھا۔ ہندوؤں نے 1845ء میں ایک عرضداشت حکومت کو پیش کی جس میں سخت الفاظ استعمال کئے گئے تھے لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اُس پر بہت ہنگامہ ہوا اور ہندوستانی اخبارات کے متعلق کہا گیا کہ ”وہ بہت گندہ ذہن ہیں اور حکومت اور تمام حکام کے خلاف دشنام طرازی کرتے ہیں۔ وہ تو جن آمیز مضامین شائع کرتے جو کبھی کبھی تو لوگوں کو بغاوت پر اکساتے ہیں۔“ (1)

ان دہشت انگیز اور مبالغہ آمیز خیالات کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستانی اخبارات کا سیاسی اثر محدود تھا۔ حکومت جانتی تھی کہ کلکتہ میں اخبار پڑھنے والوں کا حلقہ چھوٹا سا ہے۔ اور اُس کے باہر تو اور بھی چھوٹا ہے۔ زمینداروں کو اُن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ برہمنوں کو حق تعالیٰ تحائف دینے اور توہم پرستی پر بہت روپیہ خرچ کرتے تھے۔ لیکن اخبار کی قیمت اور ڈاک خرچ پڑ بڑھ روپے مہیہ صرف کرنے کو تیار نہیں تھے، عام لوگ سیاسی معاملات سے بے خبر تھے۔ حکومت کا خیال تھا کہ ہندوستان کی رائے عامہ میں اتفاق نہیں ہے۔ اور اس لیے ”اس بات کا خطرہ بہت کم تھا کہ تمام مذہبوں، ذاتوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی آپس میں تعاون کر سکیں۔“ (2)

پھر بھی ہندوستانی سراج میں اخبارات کا اثر بڑھ رہا تھا۔ فرینڈ آف انڈیا نے اپنے 8 نومبر 1838ء کے شمارے میں لکھا تھا۔ ”ان کا (ہندوستانی اخبارات کا) اثر تہذیب کا ایک طاقتور کار بن گیا ہے۔ جب کوئی قوم بد توں سے مخواب ہو تو ترقی کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے انھیں نیند سے جگانا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی اخبارات اس وقت یہ کام پہلے کے مقابلے میں زیادہ سرانجام دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی یہ اثر بڑھتا رہا جب اُن پر پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی اخبارات ان مسائل پر بحث کرتے تھے جو لوگوں کے مفادات پر اثر انداز ہوتے تھے۔ لیکن وہ سیاسی یا اصطلاحی مسائل پر نہیں۔ اس لیے کہ برطانوی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہندوستانی متوسط طبقہ برطانوی اقتدار کو چیلنج کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سرکاری کاروائیوں اور پالیسیوں پر رائے زنی کرتے وقت وہ بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ لیکن مذہب سماجی، رسوم، اور تعلیم کے مسائل پر بحث کی جاتی تھیں اور اُن کے اچھے اور بُرے پہلوں پر کھل کر بات کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والی واقعات پر کئے جانے والے اظہار خیال نے ایک نیا شعور پیدا کر دیا۔ جس میں ایشیا اور یورپ کے ممالک اور بالخصوص انگلستان سے آنے والی خبروں سے تقابلی گہرائی پیدا کرتا تھا۔

بیچک کے بعد کے زمانے میں ہندوستانی اخبارات اور بالخصوص فارسی اخبارات زیادہ صاف گوئی سے کام لینے لگے۔ جام جہاں نما کے متعلق فرینڈ آف انڈیا نے شکایت کی تھی کہ ہندوستانی اخبارات کی وفاداری ترقی روا داری کی عام روش کے خلاف مضحکہ کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے شہروں میں اس اخبار کے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ اور زیادہ تر ہندوستانی والیان ریاست اسکے خریدار تھے۔ 1840ء میں فرینڈ

(1) ایڈیٹل۔ آر۔ اےس آف انڈیا کی سلیکٹ میسج کے سامنے شہادت، 15، جن 1852ء، (2604)

(2) ایڈیشنبر 2701۔

آف انڈیا نے فارسی اخبارات کی انتہا پسندی کا مقابلہ ہندو اخبارات کی دوستی اور وفاداری سے کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ان میں زیادہ تر ملک کے موجودہ حکمرانوں پر نہایت رکیک مصلے ہوتے ہیں۔“ (1) 1857ء میں بمبئی کے اخبارات کے متعلق اظہار کرتے ہوئے فرینڈ آف انڈیا نے لکھا تھا۔ ”اس عہد کا خاصہ یہ ہے کہ انگریز صحافیوں کو یہ شبہ ہونے لگا کہ ہندوستانی مدیر بھی ہندوستان کے حالات کے متعلق قریب قریب اتنی ہی واقفیت رکھتے ہیں جتنی خود دیکھتے ہیں اور یہ کہ کبھی کبھی ان کی رائے پیش کرنا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔“ (2)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ عام ہندوستانی اخباروں کا اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کی تحریروں میں زیادہ تنجید کی پیدا ہو گئی تھی اور وہ دلائل سے کام لینے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے اخبارات کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ولیم ڈیگنی نے کہا تھا کہ ہندوستانی اخبارات کو ”ان ہندوستانی عام لوگوں کا اعتماد حاصل ہو گیا ہے جن سے ان کا ربط قائم ہے اور ان اخبارات کا لکھنؤ میں جو کچھ لکھا جاتا ہے۔ اس کو اس احساس کا اظہار سمجھنا چاہیے جس کو پس پشت بڑی طاقت ہے۔“ اس نے مزید کہا ”بالواسطہ سے ان کا بہت اثر پڑتا ہے۔ حقیقت میں یہ اخبارات ابھی بہت کم عمر میں۔ لیکن ان میں غیر معمولی حد تک امکانات پائے جاتے ہیں۔“ (3)

ہندوستانی سماج پر ان اخبارات کا اثر اور بھی زیادہ پڑا۔ انہوں نے ان برائیوں کا پردہ فاش کیا جو ایک تائید کی طرح ملک کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ ایسا کر کے انھوں نے لوگوں میں ایک نیا احساس پیدا کیا۔ اور سماجی خرابیوں اور انفرادی برائیوں کے مضر اثرات کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔

58-1857ء کی بغاوت کے دوران پریسڈنسی شہروں کے وہ اخبارات متاثر نہیں ہوئے جنہیں نئی تعلیم پائے ہوئے لوگ نکال رہے تھے۔ اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ لوگوں کی ترقی کے لیے برطانوی ادارے ضروری ہیں۔ لیکن اردو اور فارسی اخباروں اور خاص طور سے دہلی اور پنجاب کے اردو اور فارسی اخباروں نے برطانوی کے خلاف جذبات ابھارنے اور حکومت کے خلاف لوگوں کو مشتعل کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ”پنسلویو کوئٹل“ کے اجلاس منعقد 13 جون 1857ء میں لارڈ کیننگ نے من جملہ دیگر امور یہ کہا ”غالباً یہ بات پوری طرح سمجھی نہیں گئی ہے اور نہ لوگوں کو معلوم ہے کہ پچھلے کئی ہفتوں میں مقامی اخبارات نے اطلاعات کے بہانے کس حد تک ہندوستان کے مقامی لوگوں میں بغاوت کا زہر بھردیا ہے۔ یہ کام بڑی جفاکش، چالاک اور مکاری کے ساتھ کیا گیا۔“ (4)

(1) فرینڈ آف انڈیا، 20 دسمبر 1840ء۔

(2) ایضاً، 19، ستمبر 1850ء۔

(3) کوئٹل رپورٹ، 1877ء، صفحات 365-364۔

(4) ایضاً، اپریل 1908ء، صفحات 209-208۔

چھٹا باب

سامی اصلاح

۱ جدید تہذیب کا اثر

پچھلے ابواب میں ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور سماجی اداروں پر برطانوی حکومت کے انتظام اور معاشی اقدامات کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تبدیلیوں کا ایک نتیجہ تھا متوسط طبقے کا وجود میں آنا۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس طبقے نے تعلیم کے مختلف ذرائع سے جدید نقطہ نظر کس طرح حاصل کیا۔ یعنی اُن اسکولوں اور کالجوں سے جہاں مغربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تہذیبی انجمنوں، کتابوں، اخباروں اور رسالوں سے اور یورپین، مشنریوں، تاجروں، حاکموں وغیرہ کے ساتھ راست روابط سے یہ اداریاتی اور نظریاتی اثرات حکمران طبقے یعنی سول اور فوجی حاکموں، گورنروں اور گورنر جنرل، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں، بورڈ آف کنٹرول کے نمکراں دزیوں کا بینہ، پارلیمنٹ اور اُن انگریزوں کے رویوں اور عقیدوں کا نتیجہ تھے۔ ہندوستان کی سلطنت کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ یہ قدرتی امر ہے۔ کہ اس قسم کے رویے حکومت کے معاملات میں دخل ہوتے تھے اور اُس کی پالیسیوں اور کاروائیوں کی نوعیت کا تعین کرتے تھے۔

ان رویوں کی اصل بنیاد تھی۔ سامراجی مفادات کا ادراک جو ہندوستان میں برطانوی حکمرانوں کی تمام کاروائیوں کی اصل وجہ بھی تھا۔ اور پورے کے پورے اُن کے دور حکومت میں تحریک عمل کا اصل ماخذ بھی۔ لیکن اس بڑے سبب کے علاوہ مختلف افراد اور گروہ ہندوستانی تہذیب کے متعلق ہندوستانی کردار کے متعلق محکموں کی طرف حاکموں کے فرائض کے متعلق اور حکومت کی پالیسیوں اور کاروائیوں کے متعلق مختلف تصورات رکھتے تھے۔ یوں تو ہر نسل سیاق و سباق میں مختلف خیالات کا ذکر کیا جائیگا۔ پھر بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں پر حکومت کی پالیسی کی تشکیل کی ذمہ داری تھی۔ اُن کے عام رویوں پر غور کر لیا جائے۔

ہندوستان کی فتح نتیجہ تھی اٹھارہویں صدی میں تجارت پر اصول نفع رسانی کے اطلاق کا۔ ایسی نفع رسانی جس کا مقصد تھا قومی طاقت کی نمو اور ضرورت پڑنے پر جنگ کے ذریعہ تجارت کی توسیع۔ تجارت کے مفادات کے لیے ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد یہ قدرتی امر تھا کہ برطانوی معیشت کے مفاد میں اُس کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ ہندوستان میں برطانوی راج کا بڑا مقصد تھا سامراجی مفادات کو فروغ دینا۔

ابتدائی زمانے میں یعنی فتح بنگال کے فوراً بعد کے برسوں میں سامراجی مفادات کو کمپنی کے ملازمین کے نجی اور ذاتی فوائد کے برابر گردانا گیا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی کمپنی کو اپنے منافعوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ دولت حاصل کرنے کی کھلی چھٹی دیدی گئی۔ جس نے ہندوستان میں نرہابی کیفیت پیدا کر دی اور انگلستان کی عوامی زندگی میں بددیانتی کا خطرہ پیدا کر دیا۔

برک کی وجہ سے اس سامراجی بد نظمی کی جگہ زیادہ ذمہ دار محتاط سامراج نے لٹی شروع کر دی جن

نے انگلستان کے طویل المدت مفادات پر توجہ مرکوز کی۔ یہ تبدیلی اُس وقت ہوئی جب منافع رسانی سے صنعت کاری کی طرف، محفوظ تجارت سے آزاد تجارت کی طرف، مطلق العنانی سے بورڈ حکومت کی طرف اور اٹھارہویں صدی کی اخلاقی بے اعتدالی اور مذہبی بے حسی سے اخلاقی اصلاح اور مذہبی جوش کی طرف سماج سفر کر رہا تھا۔ اس مرحلے میں برطانوی حکمرانوں کا اصل مقصد تھا۔ حکومت کا پائدار ڈھانچہ بنانا اور ہندوستانی معیشت کو برطانوی مقاصد کے تابع کر کے انگلستان کے معاشی مفادات کو فروغ دینا۔ چارلس گرانٹ نے، جو 1794ء سے 1823ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے مشیروں میں اصل اختیارات کا مالک تھا، معاشی سامراج کے اصولوں کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی تھی ”محکوم علاقے کو وہ نظام نظم و نسق اپنانا چاہیے۔ جس کو اقتدار اعلیٰ رکھنے والی ریاست اپنے عام مفادات کے پیش نظر مجموعی اعتبار سے بہترین سمجھتی ہو۔“ (۱)

اسی زمانے سامراجی مزاج کا اظہار تو سیج پسنڈی کے ذریعہ ہوا۔ دیسی حکمرانوں کو جنگوں پر مجبور کیا گیا اور وسیع علاقوں کا الحاق کر لیا گیا۔ لیکن یہ بھی محسوس کیا گیا۔ کہ اگر ہندوستان سے زیادہ نفع حاصل کرنا ہے اگر برآمد کرنے کے لیے یہاں زیادہ خام مال پیدا کرنا ہے۔ اور اگر انگلستان کے مصنوعات کی کھیت یہاں بڑھانی ہے تو یہ ضروری ہے کہ ملک کی مادی اور اخلاقی ترقی کے لیے اقدامات کئے جائیں اور مال گزاری کے نظام عوامی نظام اور تعلیم وغیرہ کی تنظیم کی جائے۔ الغرض حکومت کا باضابطہ نظام قائم کیا جائے۔

دوسرے مرحلے میں کمپنی کا اجارہ دارانہ کاروبار پوری طرح ختم کر دیا گیا۔ اور سرکاری عدم مداخلت کا دور شروع ہوا۔ لیکن عدم مداخلت کے اصول کا اطلاق صرف اُن صورتوں میں کیا جاتا تھا جو انگلستان کی معیشت کے لیے مفید ہوتی تھیں۔ جہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حکومت کی مداخلت ضروری ہے۔ وہاں یہ اصول بالائے طاق رکھ دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ہندوستان آنے والے برطانوی مال پر کشم ڈیوٹی کم کر دی گئی۔ لیکن انگلستان جانے والے ہندوستانی مال پر بھاری ڈیوٹی بحال رہی۔ نجی صنعتی کاروبار میں مداخلت نہیں کی جاتی تھی۔ پھر بھی حکومت اس قسم کے اقدامات کرتی تھی جس سے انگلستان کی ضرورت کے خام مال کی ذرائع پیداوار کی ہمت افزائی ہو۔

اینکو، امریکی جنگ کے دوران (1812ء-1814ء) ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں بہتر کہاس کی پیداوار میں اضافہ کیا۔ اُس کے بعد اُس نے آسام میں چائے کے باغات لگانے شروع کئے۔ اور پھر انھیں نجی تاجروں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح ریاست نے ریلوں میں نجی سرمایہ لگانے کی ہمت افزائی کرنے کی خاطر پانچ فی صدی منافع کی ضمانت کی۔ اس طرح دونوں نظاموں کے تحت ہندوستانی مفادات قربان کر دئے گئے۔ منافع رسانی کے دور میں ہندوستان صنعت کے مقابلے میں برطانوی صنعت کا تحفظ کیا گیا۔ اور عوام مداخلت کے زمانے میں برطانوی مصنوعات کے مقابلے میں ہندوستانی مصنوعات کا تحفظ سے انکار کر دیا گیا۔

یہ دور 1857ء کی عظیم بغاوت تک جاری رہا۔ اور انگلستان میں لبرازم کی فتح کے دور سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں شمالی مغرب کی طرف ملک کی قدرتی سرحد تک مشرق میں برما تک انگریزی حکومت کی سرحدوں کو پھیلا کر اور ہندوستانی حکمرانوں کے علاقوں میں تخفیف کر کے انگلستان کے سامراجی مفادات کی توسیع کی گئی۔

(۱) دیکھئے بریس، جی۔ ڈی۔ British Attitudes Towards India 1748-1858 (آکسفورڈ 1961ء)

معاشی میدان میں اس زمانے میں دو قسم کی تبدیلیاں ہوئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ زیادہ تر ریلوں اور باغات میں برطانوی سرمایہ لگانے کا منافع بخش کاروبار ہندوستان نے مہیا کر دیا۔ دوسری بات یہ کہ معیشت کا نوآبادیاتی نظام قائم ہو گیا۔ جس کی بنا پر ہندوستان ابتدائی اشیاء پیداوار مہیا کرنے لگا اور برطانوی مصنوعات کی منڈی بن گیا۔

اس زمانے کا سامراج روشن خیال مطلب پرستی پر مبنی تھا۔ بیکک نے دور رس سماجی اصلاحات کیں۔ انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کا فیصلہ کر کے مغربی تصورات کو بڑھا دیا۔ اور ماتحت ملازمتوں کے لیے انھیں بھرتی کر کے ہندوستانوں کی دلجوئی کی۔ اُس نے قوانین کو منصفی کر کے اور ہندوستانوں اور انگریزوں کے خلاف عدالتی کارروائی میں پائے جانے والے بین اختلافات کو دور کر کے ایک بہتر حکومت کی طرح ڈالی۔

ڈلہوزی نے جو پروگرام شروع کیا اُس کے دو مقاصد تھے۔ یعنی ہندوستان کی معاشی ترقی اور برطانوی راج کی بنیادوں کی مضبوطی۔ مفاد عامہ کے کام بڑے پیمانے پر شروع کئے گئے۔ جن میں سڑکیں، نہریں اور آبپاشی کے ذرائع تعمیر کرنا شامل تھا۔ اندرون ملک سے بندرگاہوں تک خام مال لانے، ملک کے اندر برطانوی مال تقسیم کرنے اور فوجوں کو بے آسانی ایک جگہ سے دوسرے جگہ لے جانے کے لیے ریلیں شروع کی گئیں۔ دُکے مراسلے نے تعلیم کی توسیع کے لیے نئے عوامل مہیا کر دیئے۔

1858ء تک قدیم ہندوستان سیاسی اعتبار سے مرچکا تھا۔ اور نئے ہندوستان کے خدو خال ابھرنے لگے تھے۔ جو ایک تازہ قوت کے مظہر تھے۔ یہ ضروری معلومات ہو تاکہ ہم اُس جذبے کو ابھی طرح سمجھ لیں جس نے نئے سماج میں جان ڈالی تھی۔ اور اس نئی زندگی کے اُن تجربانوں کی نشوونما پر نظر ڈالیں جن کے ذریعہ سماج نے اپنے مناصب پورے کئے۔ اس صورت حال کی تشکیل میں دو قسم کے عناصر کا فرما تھے۔ یعنی ایک بدلیسی تہذیب کا اثر اور ہندوستانی کی داخلی زندگی کی حرکت۔

مغرب کا اثر معمول کے مطابق اور پر امن انداز سے نہیں پڑا۔ بلکہ ایک فوجی فتح کا نتیجہ تھا۔ جس نے دو تہذیبوں کے نمائندوں کے درمیان رشتوں کا تعین کیا۔ فتح کا لازمی نتیجہ تھا کہ قاتحین میں ایک سلطنت رکھنے کا غرور اور برتری کا احساس پیدا ہوا۔ اور مفتوحوں میں ناراضگی۔ مزاحمت یا اطاعت مندی کا جذبہ ابھرا۔ اُس نے اُن میں احساس کسری اور خود اظہاری کی خواہش بھی پیدا کر دی۔ ان حالات میں یہ ممکن نہ تھا کہ معمول کے مطابق انسانی تعلقات اُن میں قائم ہو سکیں۔ اس جنگِ آمیز دعوے نے لوگوں کی خوشحالی کے لیے اقدامات کرنے کے تعلق سے وہ عقل کل رکھتے ہیں۔ اور ملک کے باشندوں کی طرف اُن کے ناقابل برداشت حکمرانہ رویے نے لوگوں میں اُن کے خلاف تعصب رازداری اور غیر معمولی شک و شبہ کے جذبات پیدا کر دیئے۔

یہ حالات ایک پرسکون، مربوط اور مکمل سماجی ارتقاء کے لیے سازگار نہیں تھے۔ بد قسمتی سے مغرب اور مشرق کا ملن ہندوستان میں تشدد و تصادم کے حالات میں ہوا۔ اور جدید تصورات حاصل کرنے اور بالآخر آزادی پانے کے عمل میں آج روی پیدا کر دی۔

سامراج کی برتری کے ہمیشہ کئے جانے والے دعوے اور اس کے خلاف ہندوستان کے رد عمل کی طویل اور تکلیف دہ کہانی لوگوں کے لیے ناقابل یقین ہوتی اور مسلم واقعات اُس کی شہادت پیش کرتے۔

اے ڈوبو کا چٹلا کہ ”جہاں ہر چیز دل کو خوش کرتی ہے وہاں محض انسان برا ہوتا ہے۔ ساسر اہی روپنے کی اجمالی تعریف کرتا ہے۔ جو برطانیہ کے حکمرانوں کے حلقوں میں قریب قریب عام تھا۔ ہر قسم کے خیالات رکھنے والے لوگ یعنی کنزرویٹو لیبرل، مسیحی، انسان دوست، حکام، تاجر، سیاست داں، پیشہ ورانہ طبقوں کے اراکین غرض کہ انگریزوں کے تمام فرقے، کچھ قابل تعریف مستثنیات کے علاوہ، ہندوستان کے لوگوں اور اُن کی مذہبی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی رسوم کے حلق جو خیالات رکھتے تھے وہ سر پر ستانہ ستائش سے شدید مدت تک حاوی ہوتے تھے۔

لیکن برطانوی حکومت کے ابتدائی زمانے میں کچھ حکام نے ہندوستان کے فلسفے اور ادب کی تعریف بھی کی تھی۔ مثال کے طور پر دو لکسن کے بھگوت گیتا کے ترجمے کے پیش لفظ میں وارن مسٹر نے لکھا تھا۔ ”مجھے یہ کہنے میں ہوا تذہب ہے کہ گیتا بڑی اختراع و ایجاد کا کام نہیں ہے۔ ایسی کتاب جس میں بے مثال اعلیٰ تصورات برہمن دلائل اور اسلوب پایا جاتا ہے۔ انسانوں کے تمام معروف مذاہب میں یہ دینیات کا واحد نمونہ ہے جو مسیحی دینیات سے بڑی مطابقت رکھتا ہے۔ اور اُس کے بنیادی عقائد کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔“ (1)

لیکن وارن مسٹر کے زمانے میں بھی، جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے۔ ہندوستانوں کے متعلق انگریزوں میں جو رویہ پایا جاتا تھا وہ انھیں ”ایسے لوگ سمجھتا تھا جو حشاشہ زندگی کی سطح سے شاذ ہی اونچے تھے۔“ (2) لیکن مسٹر کے ہم عصروں میں اہم لیکن قدامت پرست فلسفی برک بھی شامل تھا۔ وہ تاریخی عمل کا احترام کرتا تھا اور اداروں کو اضافی سمجھتا تھا۔ اُس نے ہندوستانی معاشرے اور اُس کے قوانین پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا۔ اور ہندوستانی تہذیب کی اعلیٰ قدر کو پہچانا۔ اُس کے پیرو بھی ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی اداروں کی عزت کرتے تھے۔ لیکن اُن کی تعداد کم تھی اور ہندوستان کے معاملات پر اُن کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

قدامت پرست کتب خیال کے تصورات سے ملنے جلتے تصورات مستشرقین بھی رکھتے تھے۔ جن میں چارلس ولکسن اور بنگال کی ایشیائیٹک سوسائٹی کا بانی سروپیم جونس بھی شامل تھا۔ جس نے کالی داس کی شکستہ، منوسکھا تہوپ اور شاو اور دوسری کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور سنسکرت زبان کی خوبیوں کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ اُس نے سنسکرت کی عجیب و غریب ساخت کی تعریف کی جو یونانی سے زیادہ مکمل، لاطینی سے زیادہ جامع اور دونوں سے زیادہ نفیس و لطیف ہے۔

مستشرقین کے علاوہ کئی حکام نے بھی ہندوستانی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو منرو کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوں کہ اگر دونوں ملکوں کی تہذیبوں کا تبادلہ کیا جائے تو انگلستان کو بڑا فائدہ ہوگا۔

(1) بھگوت گیتا وارنن کے ساتھ کرشن کا مکالمہ، انھارہ پبلیکیشنز میں ۱۹۸۱ء کے ساتھ جس کا سنسکرت تیار ہونے کی قدیم زبانوں سے ترجمہ کیا گیا، لاچارلس ولکسن (لندن ۱۷۷۵ء، ملی کلکٹر، ریو، جلد 3، 1845ء صفحہ 234۔
(2) ایبنا۔

II۔ برطانوی حکام کا رویہ

اُن لوگوں کے برعکس جو ہندوستانی تہذیب کے متعلق اچھا خیال رکھتے تھے۔ بڑی تعداد اُن لوگوں کی تھی جو اُس کی خدمت کرتے تھے۔ اُن میں سامراجی سیاست والے جین تھلہ، مانٹ برل، عیسائی مشتری اور اُن کے دیوار پیر واور انسان دوست شامل تھے۔

کارنوالس سے کیلک تک شاید ہی کوئی گورنر جنرل ایسا ہو جس کا ہندوستانیوں کے متعلق اچھا خیال ہو۔ کارنوالس تو ہندوستانیوں کو اتنا ذلیل سمجھا تھا کہ اُس نے ذمہ دار عہدوں کے دروازے ان پر یکسر بند کر دیے تھے۔ ویلزلی ایسی شاندار سلطنت کی تصدیق پیش کرنا چاہتا تھا جس کے سامنے مغلوں اور رومنوں کی شان و شوکت ماند پڑ جائے۔ چھوٹی چھوٹی مقامی ریاستوں کی آزادی ختم کرنے میں اُسے ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہندوستانی حکمرانوں کی مطلق العنانی اور تاجپٹی کے مقابلے میں برطانوی نظام بہتر ہے۔

منٹو اور ہینکلر دونوں سلطنت کو تقویت دینا چاہتے تھے۔ دونوں نے اُس کو توسیع دینے اور ہندوستان کے دکھی لوگوں کے دکھ دور کرنے کی خاطر فوجی مہمات میں حصہ لیا۔

بیلک، مکاف اور میکالے پیرو تھے جیتھم کے اور تیزی کے ساتھ ہندوستان کو فنی شکل دینے کی وکالت کرتے تھے۔ جس کو وہ لوگ اوحام اور مطلق العنانی کی سر زمین میں تصور کرتے تھے۔ اصلاح پسند بیلک برطانوی حکومت کے نظام سے غیر مطمئن تھا اور اُس کو سدھارنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ہندوستان کے لوگوں سے اور بھی زیادہ غیر مطمئن تھا۔ اُس کے مطابق ملک ”ایک سرے سے دوسرے تک بُرائی، جہالت، مظالم، مطلق العنانی، وحشیانہ اور ظالمانہ رسم و رواج کی لعنت میں مبتلا تھا۔ جو ہر قسم کی انیشیائی بد نظمی کے تحت موتوں سے نمودار ہے تھے۔“ (1)

یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ میکالے ہندوستانی ادب کے متعلق کتنی حقارت آمیز رائے رکھتا تھا۔ اُس نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ اس امر کا اقبال کیا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو ”ایسی نسل سمجھتا ہے۔ جسے تین ہزار سال کی مطلق العنان پجاریوں کے جھکنڈوں نے غلامی اور اوحام پرستی کے گڑھے میں ڈھکیل دیا تھا۔“

فروٹس نے اپنے افادیت پسندانہ اصولوں کی بنا پر ہندوستانی سانج کو برے رواجوں سے پاک کرنے کی کوشش کی جتنی بیواؤں کو جلانے، بچوں کو قربان کرنے، غلامی اور چرک پوجا کے ظالمانہ رسوم سے۔ اُن کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم ہندوستان کو اخلاقی اعتبار سے سدھار دے گی اور بقول سرچارلس تریو لین ”ہندو دھرم اور اسلام کی چولیس ہلا دیں گی۔ اور ہندوستان میں ہی ہماری زبان، ہمارے علوم اور بالآخر ہمارے مذہب کی جڑیں مضبوط کرے گی۔“ (2) انہوں نے اختیارات پر پابندیاں کم کر دیں۔ اور آزادی اظہار کی ہمت افزائی کی۔ انھوں نے سرکاری اداروں کو جیتھم کے فلسفے کے مطابق ڈھالنے اور اس نظم اور اچھی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی سماجی اور سیاسی

(1) بیلک، مختلط، عام جھکے کی راولو میں، صفحات 50-51، 249، 14، اکتوبر 1833، اقتباس، بیر، جی۔ ڈی، محول بالا صفحہ 162۔

(2) بیر، سنائی، ایضاً، صفحہ 161۔

اداروں کے لیے اُن کے دلوں میں شدید حقارت کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد ہندوستان میں مغربی تصورات کو رواج دیں۔ ایلین برو کے ساتھ امن و اصلاح کا لبرل دور ختم ہو گیا۔ اور نئی نئی فوجی امہوں اور سلطنت کو توسیع دینے کا دور ایک دفعہ پھر شروع ہوا جو اُس وقت تک جاری رہا جب تک ڈلہوزی نے اس کام کو مکمل نہیں کر دیا۔

ایلین برو ایک ٹوری ساسر امی تھا۔ اور روس کے خطرے کے خلاف برطانوی سلطنت کی حفاظت کو اپنا سب سے اہم کام سمجھتا تھا۔ اُس زمانے میں روس تیزی کے ساتھ ایشیائے وسطیٰ میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ وہ پانچ سو سن کا پیر و تھا جو کہ سکون اور سکھوں کو برطانوی سلطنت کی سرحدوں سے زیادہ سے زیادہ دور رکھنا چاہتا تھا۔

دونوں کا خیال تھا کہ ہندوستان کو ساسر امی تحفظ کی عظیم فوجی حکمت عملی میں اپنا جو زور دل ادا کرتا چاہیے ایلین برو کی نظر میں تمام دوسرے امور اس بڑے مقصد کے تابع تھے۔ اُسے اُن اصلاحات سے کوئی کچھ نہیں تھی جن کی وکالت لبرل کرتے تھے۔ وہ ہندوستانوں کو تعلیم دینے کے خلاف تھا۔ دوار کا ہاتھ ٹیگور کے ساتھ تنقید کے دوران اس نے کہا تھا ”آپ جانتے ہیں۔ اگر اُن حضرات کی خواہش پوری ہو جائے جو ہندوستان کے لوگوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ تو ہم تین مہینے بھی اس ملک میں نہیں رہ سکیں گے۔“ (۱) اگر لوگوں کو تعلیم دی گئی۔ انھیں سول ملازمین دی گئیں سول انتظام اُن کے سپرد کیا گیا اور آزاد اخبارات اور مواصلات ان کے تعاون کے لیے رہیں اور تار برقی سہولتیں انھیں مہیا کی گئیں تو وہ انگریزی حکومت کی اطاعت نہیں کریں گے۔ یہ باتیں تھیں جن سے ایلین برو مخالف تھا۔

ڈلہوزی ایک سر کردہ ساسر امی تھا۔ لیکن وہ ایلین برو کے مقابلے میں زیادہ معتدل تھا اور اُس کی نظر دور تک جاتی تھی۔ سلطنت کی شان و شوکت اور طاقت کا جہاں تک تعلق تھا وہ کس طرح ایلین برو سے کم نہیں تھا۔ جس کا ثبوت الحاق کی پالیسی اور وہ اقدامات پیش کرتے ہیں جو اس نے سلطنت کے استحکام اور ہندوستان کی معیشت کو ترقی دینے کے لیے کئے۔ لیکن ہندوستان کے لوگوں کے احساس کا وہ بالکل پاس نہیں کرتا تھا اور نہ اُس ملک سے اُسے محبت تھی۔

لبرلوں کا رویہ

لبرل فلسفی بھی، جو جرمی بینٹھم کے جانشین تھے، اس قسم کے تصورات رکھتے تھے۔ جیمس مل نے 1817ء میں اپنی صحیح تاریخ ہندوستان کی لکھی اور 1819ء سے 1839ء تک کمپنی کے معاملات میں بڑا اثر رکھتا تھا۔ وہ بھی ہندوستان کے مسائل کی حد تک آزادی، مساوات اور نمائندہ حکومت کے اصولوں سے بڑی حد تک مغرور ہو گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کی مخالفت کر کے، آزاد تجارت کی پالیسی کی وکالت کر کے، ہندوستان کی حکومت پر یہ اعتراض کر کے کہ ”وہ مطلق العنانی سے زیادہ

(۱) کیرون، سی۔ ایچ۔ The Address to Parliament on the duties of Great Britain in India (لندن)

۱۸۵۳ء، صفحہ ۱۹۔

دور نہیں ہے۔“ اصلاحات کی سفارش کر کے اور سب سے بڑھ کے جدید تعلیم اور خاص طور سے یورپین سائنسوں کی تعلیم کی افادیت پر زور دے کر اُس نے لبرل تصورات کا اظہار کیا۔ لیکن ہندوستانی سماج اور ہندوستانی تہذیب کو مل اسی حد تک ناپسند کرتا تھا کہ ہندوستانیوں کے لیے اُس کی نظر میں سب سے بہتر حکومت تھی ”ایک سیدھی سادی مطلق العنان حکومت جس میں یورپین احساس عزت اور یورپین دانش آمیز ہو۔“ وہ ہندوستانی سماج کو غیر متمدن سمجھتا تھا۔ جو عہد وسطیٰ کے یورپین سماج سے حقیر تر قادر پجاریوں اور اوصاحم پرستی سے بھرا ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں ہندو قانون غیر واضح، فضول اور الجھا ہوا تھا۔ ہندو مذہب دہشت ناک، کفاروں اور فضول اور نقصان رسائی رسوم کا مجموعہ تھا۔ اور ہندو علوم میں دلیل و برہان کا فقدان تھا۔

اپنے باپ کے برعکس جان اسٹورٹ مل اذعایت کا حامل نہیں تھا۔ اور زیادہ لگ دار ذہن رکھتا تھا۔ اُس نے کئی اہم امور میں متعصبانہ کے فلسفے سے اعتراف کیا اور ہندوستان کے اداروں اور تہذیب کے تعلق سے جیسے مل سے اُسے اختلاف تھا۔ ہندوستانی علوم کے متعلق سے اُسے میکالے کے خیالات سے بھی اختلاف تھا کہ اخلاق و علوم کی تعلیم محض افادی مقاصد کے لیے دی جائے۔ یعنی ملازمتوں کے لیے رگروٹ بھرتی کرنے کیلئے اور تعلیم کا مقصد محض تعلیم حاصل کرنا نہ ہو یا یہ کہ عام لوگوں کی زبان کے بجائے انگریزی کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی قوم کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی تہذیب دوسروں پر توہے۔ ہندوستان کی معاشی ترقی کے لیے اُس کی تجاویز اُس کے باپ کے مقابلے میں لبرلزم سے زیادہ مطابقت رکھتے تھے۔ وہ اس بات کا حامی تھا کہ رنگ کے تعصب کی بنا پر ہندوستانیوں کو جو قانونی حقوق حاصل نہیں تھے۔ وہ انھیں ملنے چاہئیں۔ اور اسے برطانیہ کا اخلاقی فرض سمجھتا تھا کہ وہ ہندوستان کو جدید اداروں اور بالاخر حکومت خود اختیاری کے لیے تیار کرے۔ 1858ء میں کی جانی والی زیادتیوں اور بے دردیوں نے اُسے دھکا پہنچایا اور وہ اُس نے سامراج کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ جس کی وضاحت دیکھنے نے Great Britain یا گوچیوں نے Essai Surtmegatti des races dumanairs میں کی تھی۔ وہ عقل، علم اور روشن خیالی اوروں کی نوبت میں یقین رکھتا تھا۔ نہ کہ رنگ و نسل پر برتری میں۔

حالانکہ اس کے دل میں ترقی کی حقیقی خواہش تھی پھر بھی جان اسٹورٹ مل اُس زمانے میں پائے جانے والے تصورات سے اپنا چچا نہیں کٹا۔ یعنی یہ کہ مغربی تہذیب ہندوستانی تہذیب سے بہتر ہے۔ ہندوستانی حکومت خود اختیاری کے اہل نہیں ہیں۔ ہندوستانی سماج زوال پذیر ہے۔ اپنے باپ کی طرح اُس کا بھی خیال تھا کہ ہندوستان کے لیے بہترین دستور حکومت ہے ایک سخت مطلق العنانی۔ لیکن اسی میں علم و مذہب داری کے عناصر ہونے چاہئیں۔

ہندوستانی سماج کے متعلق مشنری تصور

لیکن ہندو دھرم اور اسلام کو سب سے زیادہ بدنام کیا عیسائی مشنریوں اور اُن کے حلیفوں یعنی کلپنا ہٹوں اور انسان دوستی کا دم بھرنے والوں نے۔ چارلس گرانٹ کا یہ خیال تھا، جو ہندوستان سے رٹائر ہونے کے بعد کورٹ آف ڈائریکٹرز کا بااثر رکن بن گیا تھا۔ اور کلپنا فریڈرک کا خیال تھا، کہ ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ سے برطانیہ کے سامراجی مفادات پورے ہو گئے۔ یعنی سلطنت کی حفاظت ہو گی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ خوشحال ہو سکے گی۔ اور ہندوستانوں میں سلطنت سے لگا پیدا ہو جائے گا۔ وہ اس کی وکالت کرتا تھا کہ سلطنت کو تقویت پہنچانے کے سب سے بڑے ذریعے کی حیثیت سے مغربی تعلیم کو رواج دیا جانا چاہئے۔ اُس نے لکھا تھا:

”اپنے ایشیائی علاقوں میں اپنی زبان، اپنے علم، اپنے خیالات اور اپنے مذہب کی جڑیں مضبوط کر کے ہم اس عظیم کام کو حالات سے محفوظ کر لیں گے“۔ (1)

ہندوستان کے متعلق اُس کے خیالات بہت برے تھے۔ ہندو سماج کے لیے اُس نے لکھا تھا ”وہ انسانی کردار کی بہت پست اور ذلت آمیز تصویر پیش کرتے ہیں، (2) اور ”جہاں تک اخلاق و ادب کا تعلق ہے مسلمانوں کے متعلق بھی اکثر اسی قسم کی رائے ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ جو اُن میں ملے ہوئے ہیں۔“ (3) اُس کے مطابق بنگالیوں میں ”راست بازی، دیانت داری اور صدق دلی کی بڑی کمی ہے۔“ اور یہ کہ ”زندگی کے ہر شعبے اور ہر پٹے میں مسلسل دھوکے بازی، دغا بازی، میلہ بازی، اور تاخیر و تصدیق سے بغیر کسی پس و پیش کے کام لیا جاتا ہے۔“ (4) ہندو دھرم کا تو اُس نے بڑا مذاق اڑایا ہے۔ اور اُس کو برا بھلا کہنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اُس نے ہندو دھرم کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔ ”بت پرستی جس کی بنا پر ناپاک دیوتاؤں کا جوم پیدا ہو گیا ہے۔ لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے راکشش ہیں۔ اس کے اصول غلط اور رسم و رواج بددیانتی پر مبنی ہیں۔ اس کی توقعات بھی غیر حقیقی ہیں اور خطرات بھی، اس کی رسمیں مضحکہ خیز اور توہمات ذلت آمیز ہیں۔ اور اس کے اساطیر جھوٹ پر اور طور طریق مکرو فریب پر مبنی ہیں۔“ (5)

غلامی کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کا رہنما ولیم برنہوس پارلیمنٹ کا بااثر رکن تھا۔ اور چارلس گرانٹ کارنٹن کارنٹن کارنٹن 1813ء کے چارٹر میں مشنریوں کے داخلے اور تعلیم کے متعلق دفعات کے اضافے پر پارلیمنٹ کو آمادہ کرنے والا وہ تھا۔ اُس کا خیال تھا۔ سلطنت کا مقصد ہے ہندوستان کے کافروں کو جہالت کے اندھیروں سے نجات دلانا۔ اُس کے سامنے اُن نے ہندوستانی سماج اور مذہب کی تصویر بہت افسردہ کن رنگوں میں پیش کی۔ اُس نے پارلیمنٹ میں کہا ”ہمارا مذہب ارفع و اعلیٰ پاکیزہ

(1) گرانٹ، سی، Observation on the State of Society among the Asiatic Subject of Great Britain Particularly with Respect to Moraletic (مترجمہ 1792ء)۔

(2) ایضاً، 20۔

(3) ایضاً۔

(4) ایضاً۔

(5) ایضاً، صفحہ 62

اور اچھا ہے۔ ان کا مذہب رکیک، عیاشانہ، ظالمانہ ہے“ (1) مزید کہا کہ ”اس دوران (1793ء لغایت 1813ء) میں نے جو کچھ سنا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے۔ اس نے ہندوستان کے متعلق میرے خیالات میں اضافہ کر دیا ہے۔“

مشری ایک طرف تو عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ اور دوسری طرف سامراجی جھنڈے کو سر بلند رکھتے تھے اور برطانوی تجارت کی حمایت کرتے تھے۔ وہ ہندوؤں کی عبادت، رسوم اور عقاید یعنی ذات پات کے نظام اور عورتوں کے ساتھ برے سلوک کی مذمت کرتے تھے۔

مثال کے طور پر کیری نے لکھا ہے۔ ”میرا خیال ہے کہ عقل و فہم سے اس حد تک دست بردار کوئی قوم نہیں ہوتی ہے۔ جیسے ہندو ہوتے ہیں۔ (2) وارڈ نے ہندوستانی عورتوں کے متعلق کہا ”وہ دکھوں سے چور اور غیر تعلیم یافتہ ہیں ایسے جانوروں کی طرح جن پر یا تو بوجھ لاداجاتا ہے یا ذبح کیا جاتا ہے۔“ (3)

مشریوں کی دشنام طرازیوں کی اور مثالیں دینا ضروری نہیں ہے۔ لیکن الگوینڈرف انگلستان سے آنے والے عیسائی معلموں میں بہت اہم ہے۔ اور ہندوستان میں ہونے والے مشری کاموں پر اس کا گہرا اثر پڑا تھا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعد میں آنے والے مشریوں کے رویوں کی مثال کے طور پر اس کی تحریروں کے کچھ اقتباس پیش کئے جائیں۔ اُس نے ہندوستانیوں کے لیے کہا ”وہ دنیا کے سب سے زیادہ عیاش اور پست ذہنیت کافر ہیں۔“ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ”اس ملک میں غلط کاروں کا ایک عظیم نظام پایا جاتا ہے۔ جس کو رد کیے بغیر یہاں راست بازی کا نظام قائم نہیں کیا جاسکتا ہے“ (4) اُس نے اپنی کتاب *India and Indian Mission* (ہندوستان اور ہندوستانی مشن) میں لکھا ہے ”غلط مذہب کے تمام نظاموں میں، جن کی تشکیل پست ذہنیت انسان کی گمراہ قوت اختراع نے کی۔ ہندو دھرم بلاشبہ سب سے عظیم نظام ہے“ (5) اُس کے نزدیک مشرقی علوم ”وصول البعد الطبیعیاتی موشگافی اور شکی کی مثالیں ہیں جیسی کہ قرون وسطیٰ کے یورپ کی یونیورسٹیوں کے معلم پیش کیا کرتے تھے۔“ (6)

ایف۔ ایس۔ شور کے مطابق جو کئی حیثیتوں سے ہندوستان میں کام کر چکا تھا۔ یعنی سیشن جج، سول کمشنر اور ایجنٹ ہندوستانیوں کے متعلق انگریزوں کی رائے تھی کہ وہ ”پست ذہنیت اور ذلیل تھے۔ جن میں بہت کم خوبیاں تھیں۔ اور جن کے اوپرے رواج اور حکومت خراب تھی۔“ ہندوستانیوں سے انگریز نفرت کرتے تھے اور اسکے ساتھ تکبر اور نخوت سے پیش آتے تھے۔ اور انھیں حقیر سمجھتے تھے۔ اسی قسم کے برہمنوں کی متعدد مثالیں ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رام موہن رائے کی طرح کی اونچی حیثیت رکھنے والے ہندوستانی بھی اس سے محفوظ نہیں تھے۔ اُس کا خیال تھا۔ ”اس کے برعکس ہم اور ہمارے لوگ خوبیوں کے مجسمے ہیں۔“ (7)

(1) ہنر XXVI: 831-1832 مورخہ جون 1813ء۔

(2) ایس۔ جی۔ ڈی۔ کول ہال صفحہ 83۔

(3) ایسا صفحہ 81۔

(4) انجمہ جلد 4: Life of Alexander Duff صفحہ 135۔

(5) ایس۔ ایس۔ جی۔ ڈی۔ کول ہال (1960ء) صفحہ 87۔

(6) ایس۔ جی۔ ڈی۔ کول ہال صفحہ 227۔

(7) شور۔ ایف۔ جے۔ Notes of Indian Affairs (لندن 1837ء) صفحہ 4۔

اس سرنامہ مدت میں کبھی کبھی ایسی آوازیں بھی سننے میں آتی تھیں۔ جو اتنی لرخت نہیں تھیں اس قسم کی ایک آواز تھی پشت ہیر کی۔ اُس کے خیال میں ہندوؤں کی پوجا پات یونانیوں کی ظلمت پرستی سے برتر نہیں تھی۔ اور ہندوؤں کا ذات پات کا نظام رد من کیسہ کہیں اس کے نظام سے زیادہ مطلق العنان نہیں تھا۔ اُس کے خیال میں ہندو فطرتاً ہی دل، جفاکش، سنجیدہ اور امن پسند تھے۔ اور اسی کے ساتھ موقع پڑنے پر وہ بہادر اور بہت والے بھی ثابت ہوتے تھے (۱) وہ سفید قام لوگوں کی برتری کا قائل نہیں تھا، اور انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان شادیوں کی بہت افزائی کرتا تھا۔ اُس نے اس امر کی کوشش کی کہ دوسرے مشنری ایسی زبان استعمال نہ کریں جس سے ہندوستانیوں کی قومی خودداری مجروح ہو یا وہ جن کی پوجا کرتے ہیں اُن کی توہین و تذلیل ہو۔ پھر بھی ہندوستانیوں کے ادب کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ اس کے لیے ”بڑی محنت سے سنسکرت اور اُن کے اسلاف کا فضول بلکہ فضول سے بھی بدتر ادب پڑھنا ہوتا ہے“۔ (۲) اس قسم کا رویہ تھا تو سب کا لیکن اعلیٰ افسروں کا رویہ عام ہندوستانیوں تک اُن کے تعبیر کے ذریعہ بالواسطہ پہنچتا تھا۔ لیکن مشنریوں کا رویہ صاف صاف ان پر ظاہر ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشنری تبلیغ کرتے تھے۔ اور وہ اسکولوں، انجمنوں اور بازاروں میں اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ اور کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ذریعے مسلسل پرچار کرتے رہتے تھے۔ وہ بڑی بدتمیزی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ اور وہ جس طرح اپنی بات کہتے تھے اُس کی وجہ سے نہ صرف ہندوستانیوں میں غم و غصہ پیدا ہوتا تھا۔ بلکہ اعلیٰ حکام کے لیے بھی وہ پریشانی کا باعث بن جاتی تھی۔ سکرٹری آف انٹیلیجنس برائے ہند، چارلس ڈوئے ارل گینگ کو لکھا تھا ”جہاں تک مشنریوں کا تعلق ہے وہ بڑی گزبوا بچارے ہیں۔ میں انھیں بلاوجہ مشتعل کرتا نہیں چاہتا ہوں اس لیے کہ وہ یہاں (انگلستان) میں چیخ پکار کریں گے۔ جن کو وہ لوگ اچھا اور غیر مفر تصور کرتے ہیں۔ جو ہندوستان کے حالات سے واقف نہیں ہیں (۳) مشنریوں کے ساتھ سول اور فوجی حکام کی ہمدردیاں تھیں اور اکثر اوقات وہ کھل کر اُن کی طرفداری کرتے تھے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ تبدیلی مذہب کے سوال پر حکومت کے ارادوں کے متعلق ہندو اور مسلمان دونوں میں خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔

(۱) نیر آف انڈیا، Narrative of a Journey through the upper Provinces of India، جلد ۱، لندن

۱۸۳۸ء، صفحہ ۲۷۰۔

(۲) Nebrs Indian Journal، انتخاب جس کا تصدیق پی۔ آر کرشنا سوامی نے لکھا (اکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۳ء)۔

صفحہ ۲۱۸

(۳) چارلس ڈوئے کے خطوط، جلد چہارم، خط مورخہ ۱۰ اگست ۱۸۶۰ء کی۔ (انڈیا آفس لائبریری)۔

III مغربی چینج کا ہندوستانی جواب

اقتدار حاصل کرنے کی جو راست اور بالواسطہ مثالیں سامنے آئیں۔ وہ ہندوستان کے لیے چینج کا حکم رکھتی تھیں۔ اس کی وجہ ہے دونوں نسلوں کے درمیان باہمی احترام کے رشتے کی نشوونما قریب قریب ناممکن ہو گئی۔ رواجی اعتبار سے ہندوستانی میں سیاسی شعور تھانہ نسل احساس۔ لیکن اس کے برعکس انگریزوں میں بڑا سیاسی شعور پایا جاتا تھا۔ اور وہ اپنے قومی مفادات اور نسل پرستی کا شدید احساس رکھتا تھا۔۔۔ دونوں کے تہذیبی اختلافات نے ان کی اتحادی میں اضافہ کر دیا تھا۔ مغرب کے حملے نے ہندوستانیوں کو مقابلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے رد عمل نے کئی شکلیں اختیار کیں۔ (I)

قدیم نظام کار و عمل

ان حلقوں کے لیے جو قدیم نظام کی نمائندگی کرتے تھے۔ انگریزی حکومت کے سیاسی اور مذہبی پہلو سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ وہ مغرب پر الزام لگاتے تھے کہ اُس نے دیسی حکمرانوں سے ان کے ملاتے، طاقت اور آزادی چھین لی اور لوگوں نے آبائی مذہب کے لیے خطرہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ اس نظام نے بار بار برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام کوششیں لیں۔ جن کا نقطہ عروج تھا 1857ء کی عظیم بغاوت۔ برطانوی حکومت کے خلاف خطرناک ترین کوششوں میں سے ایک تھی وہ تحریک جو دہائی تحریک کے نام سے مشہور ہے اور اس کے وسیع تر اثرات۔

متوسط طبقے کا رد عمل

نئے متوسط طبقے کا رد عمل اس سے بہت مختلف تھا۔ جن میں کئی گروہ تھے یعنی قدامت پسند، لبرل اور شدت پسند۔ قدامت پرست ہندو مذہب اور سماجی رواجوں میں کسی تبدیلی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ قدیم روایت ان کی تقدیس کی ضامن ہے اور مذہبی کتابوں نے اور دوسرے لوگوں کے مسلمانوں نے مذہبی رسوم کے تحفظ کے عزم میں اور استقامت پیدا کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ بظاہر چاہے وہ کتنی خراب کیوں نہ ہوں لیکن مذہبی رسوم ادھام خداوندی کے مطابق ہیں اور گہری روحانی معنویت رکھتی ہیں۔ اگر تبدیلی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو پھر جانے کہاں ختم ہو۔ چنانچہ مسلمان رواجوں میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی مذہب کے پورے وجود کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ قدامت پسند اپنے عیسائی مخالفین کا مقابلہ کرتے تھے۔ اور معلمین کی کوششوں کی مداخلت کرتے تھے۔ مغرب کے حملے میں بعضی شدت پیدا ہوئی اتنا ہی شدید رد عمل رجعت پسندوں میں ہوتا اور وہ اپنے مہوطنوں میں مقبولیت حاصل کرتے جو انھیں مذہب کے محافظ اور دیش بگت سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی قوم پرستی کے نمو میں رجعت پرستوں کا بڑا حصہ تھا۔

قدامت پرست

اس گروہ کے زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ رہنما حالانکہ مذہبی معاملات میں قدامت پرست تھے۔ لیکن تعلیمی، سیاسی اور معاشی معاملات میں خاصے ترقی پسند بھی تھے۔ ان میں سب سے اہم تھے گوبی موہن دیب کے بیٹے راواہاکانت دیب جو کالپو کے مشہور خوشی ناکارشن دیب کے پوتے تھے وہ 1784ء میں پیدا ہوئے۔ اور بنگھم کی کلکتہ اکیڈمی میں انھوں نے تعلیم پائی تھی۔ وہ پانچ زبانیں یعنی بنگالی، فارسی، عربی، سنسکرت، اور انگریزی جانتے تھے اور مصنف اور عالم کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ ان کی ادبی دلچسپیاں بہت وسیع تھیں اور سنسکرت سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے سنسکرت میں ایک قاموسی لغت تریپ دی جس کا نام تھاشب کلب ورم اس کے سات حصے اور ایک ضمیمہ تھا۔ اور چالیس سال میں مکمل ہوئی تھی۔ انھوں نے اسکولوں کے لیے کئی داری کتابیں بھی لکھیں اور انگریزی اور فارسی سے ترجمے کئے۔

وہ کئی علمی انجمنوں کے رکن تھے۔ ہندوستان کی زراعت اور باغبانی کو سوسائٹی (اگر ٹیکچرل اینڈ ہڈیکچرل سوسائٹی آف انڈیا) کے نائب صدر تھے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ کے کارسیائٹگ ممبر تھے اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ ہندو کالج کونسل اور کلکتہ اسکول سوسائٹی کے بھی رکن تھے۔ 1822ء میں انھوں نے تعلیم اور علم کے فروغ کے لیے ”گودیا سماج“ کی بنیاد ڈالی۔ 1830ء میں سٹی کے رواج کو ختم کرنے کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے ”دھرم سماج“ قائم کیا۔ گورنر جنرل اور ڈولیم بیٹک کو 1840ء کو ایک یادداشت پیش کی گئی۔ جس پر مہاراجہ سری گریٹ چندر راواہا لاہب، نربئی، کاشی ناتھ، نربئی وغیرہ کے دستخط تھے۔ اس میں ہندوؤں کے مذہبی رواجوں میں حکومت کی مداخلت کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ تصورات اور رسم و رواج ان کی نظر میں مادی تقدس رکھتے ہیں۔ اور برہمن پنڈتوں کے علاوہ مذہبی کتابوں کی شرح کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ بیٹک نے مذہبی اور انسانی بنیادوں پر یہ عرضداشت رد کر دی۔ اس کے بعد دھرم سبھانے ملک معظم اجلاس کو نسل سے رجوع کیا۔ لیکن وہاں بھی اس کا وہی حشر ہوا۔

حکومت نے 1838ء میں جب اخراج زمینات پر قبضہ کرنا شروع کیا تو مالکانہ حقوق کے تحفظ کے لیے زمینداروں کی ایسوسی ایشن وجود میں آئی۔ 1851ء میں راواہاکانت برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے صدر چنے گئے جو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے شکایتیں پیش کرنے کی غرض قائم کی گئی تھی۔

بنگال کے عوامی کارکنوں میں راواہاکانت سب سے اہم تھے۔ صوبے کی تمام تعلیمی سرگرمیوں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا شہد ہندو کالج کے بانیوں میں تھا۔ اور 1817ء سے 1850ء تک تیس سال سے زیادہ وہ اس کی رہنمائی کرتے رہے۔ انگریز صدر سے اختلاف کی بنا پر ہندو کالج کی انتظامیہ کمیٹی سے مستعفی ہونے کے بعد 1851ء میں انھوں نے سنسکرت کالج اور 1853ء میں ہندو میٹروپولیٹن کالج قائم کئے۔ انھوں نے بنگال پانٹھ سالانہ قائم کرنے میں بھی مدد دی۔ اور تکنیکی تعلیم کی بڑی حمایت کی۔ وہ تعلیم نسوان کی وکالت کرتے تھے۔ اور عورتوں میں بھی تعلیم پھیلانے کی ہر کوشش کی انھوں نے پرزور حمایت کی چاہے وہ حکومت کی طرف سے کی کئی بھی یا مشنریوں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے اپنی تمام تر

سرگرمیوں میں راہحاکانت کے پیش نظر دو خیال اپنے تھے۔ یعنی ہندو مذہب کا تحفظ اور عام ہندوستانوں کی خوش حالی۔ پہلا مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ ایک ہندو قدامت پرست کی حیثیت سے کام کرتے تھے ان کی رہنمائی میں ہندو کالج کمپنی نے فیصلہ کیا کہ محض ہندوؤں کو کالج میں داخل کیا جائے، رام موہن رائے کو کمپنی سے درخواست کیا جائے۔ راموہن رائے کے پیرو ولیم اڈم کالج میں استاد کی حیثیت سے تقرر نہ کیا جائے۔ اور دیروزیو کو ملازمت سے برطرف کیا جائے جس کی وجہ سے طالب علموں میں آرزو خیالی پھیل رہی تھی۔ جب ایک پروفیسر نے، عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ایک طالب علم بھی عیسائی ہو گیا تو انھیں اس سے بڑی تکلیف ہوئی۔ لیکن اس کی وجہ سے کمپنی کے صدر ڈرنک وائرمیدن اور راہحاکانت دیب میں اختلافات رونما ہو گئے۔ اور بالآخر انھیں استعفیٰ دینا پڑا۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ راہحاکانت دیب کو ہندو دھرم سے کتنا لگاؤ تھا۔ وہ تہذیبی مذہب کے ہر واقع کو ہندو دھرم پر ایک ضرب تصور کرتے تھے۔ اور اس کو رد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ انھوں 1851ء میں جیت اودھ سبھا قائم کی جس کا مقصد تھا عیسائی ہو جانے والے ہندوؤں کو دوبارہ ہندو دھرم میں داخل کرنا۔ اُس زمانے کے سرکردہ ہفتہ وار انگریزی اخبار ”فرینڈ آف اٹھیا“ نے اس سوسائٹی کے قیام کو موجودہ صدی میں رونما ہونے والے اہم ترین واقعات میں سے ایک سے تعبیر کیا تھا۔

راہحاکانت کا انتقال 1867ء میں ہوا۔ انھوں نے ہندو فرقے میں عزت نفس اور اپنی قدیم تہذیب پر فخر کا جذبہ میراث کے طور پر چھوڑا۔

شدت پسند

دوسرا گروہ انگریزی پڑھتے ہوئے لوگوں کی پہلی جڑھی پر مشتمل تھا۔ جن میں پیش پیش تھے ہندو کالج کے سابق طالب علم وہ نوجوان جو بانیئے بنگال کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ انھوں نے یورپ کے معقولات پر دسترس حاصل کر لی تھی۔ اور لاک، ہیوم، ریڈ، اسٹورٹ، براؤن۔ اور پیٹھم کی طرح کے فلسفیوں، نام چین، والٹیر اور اڈم اسمتھ کی طرح کے سماجی مفکرین اور ڈیوی اور نیوٹن کی طرح کے سائنس دانوں کا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے رائے رائٹس اور گیلن کی طرح کے انگریز مورخوں، رومانی شاعروں اور نثر نگاروں کو پڑھا تھا۔ کتابوں میں انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا۔ اُس کے علاوہ انگریزی کے نوجوان لائق پروفیسر ہنری ڈیروزیو کی تعلیم نے ان کے ذہنوں کی ساخت بدل دی تھی۔

دیروزیو غلط نسل کا تھا، اُس کا باپ پرنگالی اور ماں ہندوستانی تھی۔ لیکن وہ اپنے کو پوری طرح ہندوستانی سمجھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ غیر معمولی اوصاف کا مالک تھا۔ چودہ سال کی عمر میں اُس نے ڈاروین کی نگرانی میں اسکول کی تعلیم مکمل کر لی اور 1823ء میں بھاکل پور میں ایک انگریز کمپنی میں کلرک ہو گیا۔ 1827ء میں کلکتہ واپس آنے کے بعد صحافت اور ادب میں دلچسپی لینے لگا۔ اُس نے جن رسالوں کی ادارت میں ہاتھ بٹایا وہ تھے انڈیا کڑٹ، کلکتہ لٹریچر سوسائٹی بنگال انیول اور کلید و سکوپ۔ اُس نے 1827ء میں نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا اور اسی سال ہندو کالج کے سیریز ڈپارٹمنٹ میں اسٹیٹ بائرن کی حیثیت سے اُس کا تقرر ہو گیا۔ ایک سال بعد اُس کو ترقی دے کر انگریزی ادب اور تاریخ کا لیکچرار بنا دیا گیا۔ اُس کی حیثیت سے

اُس کے طالب علم اُس سے بڑی محبت اور لگاؤ رکھتے تھے۔ اور وفاداری کے جذبات کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ اُس کے لکچرار تھے دلچسپ ہوتے تھے کہ نہ صرف اُس کے کلاس کے طالب علم بلکہ کالج کے اونچے درجوں میں پڑھنے والے طلباء بھی انھیں سنے کے لیے آتے تھے۔ پڑھانے کے علاوہ کالج کے اوقات سے پہلے اور بعد طالب علموں کے مختلف گروہوں سے ملتا تھا۔ اور مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتا تھا۔ طالب علموں کو یہ جیسے اتنے پسند آئے کہ انھوں نے ایک باضابطہ انجمن بنائی جس کا نام تھا۔ ”اکادمک ایسوسی ایشن“ (تعلیمی انجمن) اس میں اخلاقیات مذہب اور سیاست کے بارے میں مکمل کر گفتگو کی جاتی تھی۔ ہفتہ وار جلسوں میں کبھی کبھی اہم مضمینیں بھی شرکت کرتی تھیں مثلاً ڈیوڈ ہیر، سپریم کورٹ کے سرائیڈون ریان اور بشپ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مل۔ وہ ہر ہفتہ ڈیوڈ ہیر کے اسکول میں بھی اخلاقیات و ادبیات پر تقریر کرتا تھا۔

ڈیوڈ یو اُس قسم نادر روزگار استاد تھا جس کا تعلیم سے بے لوث لگاؤ حقیقت سے بیدار اور برائی سے نفرت ہر اُس شخص کو بڑا متاثر کرتی تھی جو اُس کے قریب آتا تھا۔ ستر لاکھ کی طرح وینسج سے بے نیاز ہو کر سچائی کے راستے پر چلتا تھا۔ اور ستر لاکھ کی طرح اُس میں یہ صلاحیت بھی تھی۔ اپنا جیسا جوش نوجوانوں میں بھی پیدا کر دے۔ ستر لاکھ کی طرح نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا لہرام اُس پر لگایا گیا۔ اور ستر لاکھ کی طرح اُس کو سزا دی گئی۔ جب اُس کو کالج سے برطرف کر دیا گیا تو اُس نے اپنے کردار کے جواز میں ایک خط ہورس ہلیمین وٹس کو لکھا تھا۔ خط میں اُس نے لکھا تھا کہ فلسفے کا درس دیتے وقت وہ لیکن کا طریقہ اختیار کرتا تھا۔ اور زیر بحث موضوع کی موافقت میں اور اُس کے خلاف تمام دلائل پیش کرتا تھا۔ یعنی خدا کے وجود پر بحث کرتے وقت وہ خدا کے وجود کے خلاف ہوم کی وہ دلیلیں پیش کرتا تھا۔ جو فلسفہ اور فلسفہ کے مکاتھمیں درج ہیں۔ اور ان مشکوک کے ابطال میں ڈیوڈ گلد ایسٹورٹ اور ایڈ کی دلیلیں پیش کرتا تھا۔ اُس کے تنقیدی طریقے کے نتیجے میں نوجوان طلباء کے ذہنوں میں کشادگی پیدا ہوتی تھی۔ اور پھولوں کی طرح اُن کے ذہنوں کو کھلتے ہوئے۔ اور اُن کی ذہن صلاحیتوں کو ادھام سے نجات پاتے ہوئے دیکھ کر اُسے خوشی ہوتی تھی۔ انھوں نے سچائی کو ہر چیز پر ترجیح دینا سیکھ لیا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو طالب علم اُس کے قریب آتے تھے۔ اُن نوجوانوں میں وہ ہندوستان کی محبت کا شدید جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔ اس کی گفتگو اور اس قسم کے شعر۔

میرے وطن تری گزشتہ شان و شوکت کے زمانے میں تیرے چہرے کے گرد ایک دلکش ہالا تھا۔ ان کے ذہنوں میں اعلیٰ جذبات اور ارفع خیالات کو جنم دیتے تھے۔

ڈیوڈ یو کے بہت سے طالب علم متوسط طبقے کے اُس حصے سے تعلق رکھتے تھے جو دولت مند نہیں تھے۔ اور کالج کی فیس ادا کر نہیں سکتے تھے۔ اور تعلیم جاری رکھنے کے لیے انھیں کالج یا راجرام موہن رائے اور ڈیوڈ ہیر کی طرح کے امیر اور دولت مند اشخاص سے مالی مدد لینی پڑتی تھی۔ لیکن وہ صلاحیت اور پاکیزہ نوجوان تھے۔ انھوں نے اپنے زمانوں کو متاثر کیا۔ ڈیوڈ یو کی قیادت میں انھوں نے پارٹھی تن (پارٹھسینم) اور بنگال اسکینر کی طرح کے جریدے شائع کئے جو نیا بنگال کہلائے جانے والے گُر دپ کے آرگن بن گئے۔ اُن جریدوں میں لکھنے والے ہندو مذہب اور سماجی رواجوں پر تنقید کرنے میں بڑی صاف گوئی سے کام لیتے تھے اور عقاید کے اعلان میں نڈر تھے۔ وہ حکومت کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔

آزادی، تحقیق اور آزادی فکر کے اس جذبے نے، جس کو اٹھارہویں صدی کی یورپی فکر کی

مقبولیت نے تقویت پہنچائی اور ہندوستانی سماج کی ادھام پرستی، بیدردانہ اور غیر معقول رداجوں اور عام اخلاقی گراؤٹ کے مقابل کھڑا کر دیا۔ ایسی نفرت کو جنم دیا جس نے کبھی کبھی عجیب و غریب شکیلیں اختیار کر لیں۔ ان میں سے کچھ نوجوانوں نے کٹر پن کے خلاف احتجاج کے طور پر کھانے پینے میں بندشوں کو توڑنا شروع کیا۔ ان میں سے کچھ نے محض ذات پات، بت پرستی، سنی، عورتوں سے بیوپار اور دوسری سماجی خرابیوں کی مذمت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نوجوانوں کے جوش میں خود ہندو دھرم کی بھی مذمت کرنے لگے۔ کچھ عیسائی ہو گئے۔ کچھ نے دین فطرت میں پناہ لی اور کچھ نے سب مذاہب کو رد کر دیا۔

مذہب پر ان کے حملے نے پرانے خیال کے لوگوں کو سر اسیمہ کر دیا۔ لیکن اُس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ اس نے پرانے خیال کے لوگوں کو اپنے بنیادی عقیدوں اور اصولوں پر نظر ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ جس کا نتیجہ ہوا فکر کا انقلاب۔

اس کے علاوہ اُن پر جوش نوجوانوں کی دیانت داری اور باوقار طرز عمل، احساس اور ذہنی صلاحیت نے سماج میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔ اور اُس کا اخلاقی معیار بلند کر دیا۔ وہ برگزیدہ اشخاص تھے جن میں قومی جذبہ یعنی ہندوستان کا پیار سب سے پہلے ظاہر ہوا۔

ذیروز یو کی شاعری نے اُن کے دلوں کے تاروں کو چھوا۔ جس میں ہندوستان کے شاندار ماضی اور افسوسناک حد تک پست حالی کا ذکر تھا۔ عصری سماج کی شرمناک اور ذلت آمیز حالت کو انھوں نے محسوس کیا اور مختلف طریقوں سے وہ لوگوں کو ابھارنے اور دیرینہ شوکت کو بحال کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اُن میں سے کچھ نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ سماجی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ کچھ نے ادب کے میدان میں شہرت پائی کچھ نے سائنس کو ترقی دی اور کچھ اچھے باصلاحیت اور دیانت دار انتظامی حاکموں کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ نئے بنگال کے ان شدت پسند معماروں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔ کرشن موہن بن دھوپا اسکا کرشن ملک، رادھانا تھ ہکٹور، دکھنار بجن کھوپا دھیلیا، پیارے چند مہترا، رام تواری وغیرہ۔

IV۔ راجہ رام موہن رائے کے کام

بنگال کے قدامت پرست اور شدت پسند عناصر کے نظریات کے درمیان راجہ رام موہن رائے نے اپنا راستہ بنایا۔ اُن کی زندگی کا تکنیکی اور دھندلے اور فساد کے زمانے میں گزرا جب بنگال معاشی اور سیاسی انقلاب سے گزر رہا تھا، مشرق کی زوال پذیر تہذیب ترکی اور ترقی پسند مغرب کے عظیم فتوحات نے اُن کے حلسہ ہمن پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔

اٹھارہویں صدی میں بالائی طبقے کے ہندوؤں کا مذہب اپنی قدیم بنیادوں سے ہٹ چکا تھا اُن میں سے کچھ ہی لمبی عرصہ اور درشن پڑھتے تھے۔ اور وہ بھی بُرائوں میں درج عقیدوں اور رسوں کو نہ صرف برداشت کرتے تھے۔ بلکہ اُن میں عملی حصہ لیتے تھے۔ اعلیٰ و ارفع وحدانیت بھلائی چاہی تھی اور کئی خداؤں اور بندوں کی پوجا کا رواج تھا۔ لاکھوں دیوی دیوتاؤں میں تین یعنی برہم، وشنو اور مہیش اور اُن کی بیویاں سب سے اہم سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ اوتاروں اور مقامی دیوتاؤں اور دیویوں پر اُن کا اعتقاد تھا۔ مختلف دیوی دیوتاؤں کے مسلکوں کی بنیادوں پر بہت سے فرقے بن گئے تھے۔ بائیس ہاتھ کے تانترک مسلکوں سے تعلق رکھنے والی رسوں کی طرح کی کچھ رسوم انتہائی خرب اخلاق تھیں۔ خبیث روحوں اور بھوتوں کا خوف بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ اُنھیں منانے، خوش کرنے اور اُن کا غصہ دور کرنے کا عام رواج تھا۔ انسانی معاملات پر ستاروں کے اثر کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کیا جاتا تھا اور ہر کام شروع کرنے سے پہلے جوتشی سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ زندگی میں تہوار اور یاترائیں اہم رول ادا کرتی تھیں۔ دیوی دیوتاؤں کے علاوہ سانپوں، بندروں، درختوں، دریاؤں، اور پتھروں کی طرح جاندار اور غیر جاندار اشیاء کی پرستش کی جاتی تھی۔ چرک پوجا کی طرح کی ظالمانہ رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اور پرستش کی دوسری مکروہ شکلیں اختیار کی جاتی تھیں۔

ذات پات کے بندھنوں میں سب جکڑے ہوئے تھے اور سماجی نابرابری کو حکم خداوندی سمجھا جاتا تھا۔ بنگالی برہمنوں کو کئی بیویاں رکھنے کا حق حاصل تھا۔ سماج میں عورت کی حیثیت نیچی تھی۔ بیویوں کو جلاتا، بچوں کو دریاؤں میں پھینکنا اور جلگن ناتھ کے رتھ کے پہیوں کے نیچے دب کر جان دینا اچھے عمل سمجھے جاتے تھے۔ نیگور کے الفاظ میں ”ہندوستان کی تاریخ مدتوں تک ایک جگہ ٹھہری رہی۔ تھک کر سچائی کی آزاد کوٹھن کا جذبہ ختم ہو گیا۔ زندگی کی ہر مہم ختم ہو گئی اور اُس کو اندر اور باہر سے صاف کرنے کی ذہنی سرگرمی رک گئی۔ زوال کا احترام کیا جانے لگا۔ اور بدلنے ہوئے وقت کا ساتھ دینے کی ہر کوشش ترک کر دی گئی۔ صحت کی خرابی اور علم کی کمی نے اُس کی زندگی کے قریب قریب ہر چراغ کی روشنی مدھم کر دی تھی“ (1)

رام موہن رائے، جنہوں نے ان حالات کو بدلنے کے بڑے کام کا بیڑا اٹھایا تھا، 1774ء میں رادھا نگر میں پیدا ہوئے تھے (2) اُن کی ماں اور باپ برہمن تھے۔ اُن کے باپ زمیندار تھے۔ اُن کے باپ، دادا اور پردادا، جنہیں رائے رایاں کے خطاب سے نوازا گیا تھا، بنگال کے نوابوں کی ملازمت میں رہ چکے تھے،

(1) بھارت یو، ستمبر 1928ء، صفحہ 338

(2) اُن کی تاریخ پیدائش کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ 1772ء میں پیدا ہوئے اور کچھ دوسروں کی

رائے میں وہ 1774ء میں پیدا ہوئے۔

اُن کی ابتدائی زندگی کے حالات ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہیں۔ غالباً اُن کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور مقامی اسکول میں ہوئی۔ جہاں انھوں نے سنسکرت، بنگالی اور فارسی پڑھی۔ اُس کے بعد وہ فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کی غرض سے پٹنہ اور بنارس گئے۔ اُن کی عمر سولہ سال کی تھی۔ جب وہ تلاش حق میں گھر سے نکلے جو گھر وہ کے انھیں نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور شمالی ہندوستان اور ہمالیہ کا سفر کیا۔

غالباً اس سفر کے درمیان انھوں نے بودھ اور لامائی عقائد کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے راجا گھر میں اپنے سنسکرت کے استاد سے تاتسریک فلسفہ پڑھا تھا۔ اور فارسی اور عربی کے استادوں سے اسلامی دینیات اور تصوف کا درس لیا تھا۔ ان مذاہب کا تقابلی علم وہ پوری طرح حاصل کر چکے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مطالعے نے اُن کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ لگتا ہے کہ انھوں نے عربوں کی منطق کا مطالعہ کر کے، جسے دوسروں کے منطق سے بہتر سمجھتے تھے، خود کو مناظروں کیلئے تیار کیا۔ (1) ”معتزلہ کے فلسفے نے اُنھیں متاثر کیا تھا۔ اور وہ حافظہ اور جلال الدین رومی کے اشعار پڑھنے کے شائق تھے۔

1803ء میں اپنے باپ کے انتقال کے لگ بھگ وہ کبھی کی ملازمت میں داخل ہوئے اور ڈگری کے دیوان بن گئے۔ جس کے ساتھ انھوں نے 1814ء تک کام کیا۔ ڈگری سے اُن کی دوستی ہو گئی اور اُس نے اُنھیں انگریزی پڑھائی۔ ڈگری کے ساتھ انھوں نے جو دس سال گزارے تھے۔ اُس کے دوران انھوں نے مغربی فکر و ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور ایک ایسا انداز نگارش پایا جس کی تعریف کرتے ہوئے بیچیم نے کہا تھا۔ ایسا اسلوب جس کے ساتھ اگر ایک ہندو کا نام جڑا نہ ہوتا تو میں اُسے زیادہ بہتر پائے ہوئے کسی انگریز کے رشتہات قلم سے تعبیر کرتا“ (2) 1814ء میں ڈگری کے انگلستان واپس جانے کے بعد انھوں نے کلکتہ میں رہائش اختیار کی۔ یہاں انھوں نے عوامی خدمات اور اصلاح کا کام شروع کیا۔ ان میں حیرت ناک قوت عمل بھی اُن کی دلچسپیاں وسیع تھیں۔ انھوں نے مذہب، سماج اور اخلاقیات کے بڑے مسئلوں کے تعلق سے اپنے ذہن کو تیار کر لیا تھا۔ اور اُن کے خلاف جن کو وہ تاریکی اور عدم مقبولیت کی طاقتیں تصور کرتے تھے۔ معقول عقیدے کی فتح کے لیے جنگ شروع کر دی۔

کلکتہ میں سیرم پور کے مشنریوں سے اُن کے روابط ہو گئے۔ ہندو دھر پر اُن کی تنقید نے، جس سے موجودہ عقائد اور رواجوں کی حد تک وہ متفق تھے۔ انھیں عیسائی مذہب کے مطالعہ پر اکسایا۔ انھوں نے عیسائیوں کی مقدس کتابوں اور کلیساؤں کی تشکیل کردہ دینیات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے لیے یونانی، اطالوی اور عبرانی زبانیں سیکھیں اور عیسائی مذہب کے عالموں کی کتابیں پڑھیں۔ یسوع مسیح کی تعلیمات انھیں پسند آئیں۔ لیکن انجیل کی ادعائیت اور فوقیت کو انھوں نے رد کر دیا۔ انھوں محض ہندو دھرم کا تحفظ ہی نہیں کیا بلکہ معجزوں، سحریت اور معصومیت کے تصور پر حملے کر کے انھوں نے اس قسم کی غیر منطقی باتوں کے لیے اپنا تحفظ کرنے پر مشنریوں کو مجبور کر دیا۔ جیسا کہ بنگال پر کارو کے اڈیٹر کے نام اُن کے خط کے مندرجہ ذیل ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ہندو دھرم کو عیسائی مذہب سے کم تر نہیں سمجھتے تھے۔

”اگر عقل کی روشنی سے جس کے لیے کہ سچن کے کہنے کے مطابق ہمیں انگریزی کا ممنون

(1) اُسے کہ گھر ایک فرانسیسی آپاٹے میں دیکھئے۔ The Father of Modern India, Ram Mohan Ray.

Centenary Commemoration Volume حصہ دوم، صفحہ 29۔

(2) برہمی بیچیم کا گھر رام موہن رائے کے نام، ایسا صفحہ 33۔

احسان ہونا چاہیے۔ اُس کا مقصد ہے۔ مفید میکانیکی حقوق کار و واج تو میں اُس کی بات سے اتفاق اور جذبہ احسان مندی ظاہر کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن جہاں تک سائنس، ادب اور مذہب کا تعلق ہے۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا ہوں کہ ہم پر اُن کا کوئی احسان ہے۔ تاریخ کا مطالعہ اس کو ثابت کر سکتا ہے کہ علم کی پہلی شعاعوں کے لیے دنیا ہمارے بزرگوں کی ممنون احسان تھی۔ جو مشرق سے پچیسویں اور علم و عقل کی دیوی کی کربا سے آج بھی ہمارے پاس ایک فلسفیانہ اور وسیع زبان ہے، جو ہمیں دوسری قوموں سے ہم عصر کرنی ہے جو بدلی زبانوں سے لفظیات مستعار لیے بغیر سائنس یا مطلق تصورات کو ظاہر کر سکتی ہیں، (1) چنانچہ انھوں نے فکر و تفاوت کے ایک اہم شعبے میں مغرب کی برتری کے کھوکھلے دعووں کی تردید کی اور اُن ہندوؤں میں خود اعتمادی ایک دفعہ پھر پیدا کر دیا جو مشرعوں اور اُن کے حلیوں کے حلیوں سے گھبرا گئے تھے۔ یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا کہ مغربی تعلیم اور عیسائی تعلیمات کی بنا پر ہندوستانی عیسائی ہو جائیں گے۔

اپنی ابتدائی اور اصل شکل میں ہندو دھرم کا تحفظ کرنے کے ساتھ انھوں نے خرابیوں اور غیر انسانی رواجوں کی اس مضبوط دیوار پر شدید حملہ شروع کیا جو صدیوں کی لاپرواہی اور گروٹ کی بنا پر دین کے گرد کھری ہو گئی تھی۔ اور جس کو مہار کرنے کی کوشش کبیر، نانک، وادو وغیرہ جیسے مصلحین کر چکے تھے۔ انھیں اس بات کی بڑی تکلیف تھی کہ ”ہندو سماج جو ذات پات، بہت سی بیویاں رکھنے، سنی، بچوں کے قتل اور دوسری خرابیوں سے برا تھا۔ اپنی گروٹ کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اخلاق کا معیار انتہائی پست تھا۔ لوگ اپنا وقت فق اور معجزوں اور کالمی میں گزارتے تھے۔ اور سماجی جھگڑوں اور پارٹی بازیوں میں مصروف تھے“ اور ”جہالت اور اداہم پرستی ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھی ملک پر اندھیرا اچھایا تھا۔ اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کب دور ہوگا۔“ (2)

ملکت کے قیام کے پندرہ سال میں اُن کی سرگرمیوں نے سماج میں غیر معمولی تحریک پیدا کی جس نے شدت پسندی اور قدامت پسندی کی تحریکوں کے ساتھ مل کے متوسط طبقے اور خصوصیت کے ساتھ اُس کے تعلیم یافتہ حصے کے رویوں میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ جامع رسم پرستی قرون وسطیٰ کے نقطہ نظر کی جگہ فکر و عمل کی ایک نئی قوت نے لے لی۔ اس تبدیلی کی ذمہ داری بڑی حد تک رام موہن رائے کی ہمہ گیر تحریک پر تھی۔ قومی زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں تھا۔ جس کو انھوں نے متاثر نہیں کیا ہو۔

اُن کے مذہبی تصورات

اُن کے پیش نظر ایک بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ اٹھارویں صدی کے مغربی مفکرین کے معروض، سائنس اور مقبولیت پسند تصورات میں اور حقیقت کے وجدانی، ذاتی اور راست تجربے کے تصور میں، جسے مشرق کا اعلیٰ و ارفع علم سمجھا جاتا تھا، کوئی سمجھوتا کریں۔ مغرب کی تجربیت نے ہیوم کے تشکک اور سائنسی تجربہ کو جنم دیا تھا۔ جو مادی کائنات کے دعوے کی نفی کرتی تھی۔ اُس کی رو سے علم حواسی اور انفرادی فضائل تک محدود تھا۔ اس کے برعکس عہد و وسطیٰ کا ہندوستانی فلسفہ ذہن کو موضوعات سے خالی قرار دیتا تھا۔ اور مطلق عینیت اور ایسے باطنی علم میں پناہ دھونڈتا تھا۔ جس کی بنیاد محض نفی تھی۔ اور جو اختلاف و انفرادی

(1) جنہیں پانچویں آفس، ال آف نے The English works of Raja Ram Mohan Ray تحت المودعین

لے انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ (1906ء)، صفحہ 948۔ (2) ایضاً، جلد 1، صفحہ VII۔

کا ذکر تھا۔ اس مسئلے کا حل سماجی تنظیم اور تعلیم کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

انھوں نے اپنے فارسی کے کتابچے تحفۃ الموحدین میں لکھا تھا جو 1903-4ء میں شائع ہوا تھا۔
 ”ہر مسئلے میں یہ ضروری ہے کہ صحیح اور غلط (اچھے اور بُرے) میں تمیز کرنے کے لیے علم کے اصولوں کی مدد سے دلیل دی جائے اس لیے کہ ہمارے فیاض خالق (خدا) نے علم کی جو دولت دی ہے۔ اُسے غیر ضروری سمجھا نہیں جاسکتا ہے“ (1)

کیناؤنپنڈ کے ترجمے کے تعارف میں روایت اور دلیل کی نزاع کا ذکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے ”غالباً بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہمیں اُن میں سے کسی کی بھی رہنمائی پر عمل انحصار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ دونوں کی مہیا کی ہوئی روش کو مناسب انداز سے استعمال کر کے اپنی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے“ (2)

اُس کے بعد آسانپنڈ کے ترجمے کے پیش لفظ میں انھوں نے اپنے قارئین سے کہا ”عقل کے مناسب اور اعتدال پسندانہ استعمال کو نظر انداز کئے بغیر اُن کے مقدس کتابوں کے مقصد کا جائزہ لیا جائے۔ اور اُن کی ہدایتوں پر پوری توجہ دی جائے“ (3) انھوں نے بتایا کہ رومی مذہب اور الوہی دین میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے کہ اول الذکر کا مایاتہ تکمیل کا نتیجہ ہے۔ اور آخر الذکر کا خرج ہے ”روحانی استاد اور صحیح استاد ال۔“ پہلا نور ہے محروم ہے اور منطقی ضابطہ اس میں راہ پاسکتے ہیں۔ یعنی قبضے سے نیچے کی مطابقت، ممکن اور ناممکن کے فرق کو نظر انداز کرنا، اتصال و تفاوت، رسم کے حوالے سے ثابت کرنا یا مرجع کے بغیر ترجیح دینا۔ آخر الذکر کی بنیادی اس واقعہ پر قائم ہے۔ کہ ”ہر شخص میں یہ بیدائش استعداد ہوتی ہے کہ کسی کی ہدایت اور رہنمائی کے بغیر فطرت کے رازوں کو سمجھ کر اور اُن پر عمل کر کے یہ نتیجہ اخذ کر سکے کہ ایک ایسی ذات موجود ہے جو (اپنی عقل و فہم سے) پوری کائنات پر حکومت کرتی ہے“ (4)

رام موہن رائے باضابطہ فلسفی نہیں تھے۔ اور انھوں نے روحانی بصیرت اور ذہنی استنباط میں احتراز کی جو تجویز پیش کی اُس کے عملیاتی اور منطقی مضمرات کا جائزہ نہیں لیا۔ اُس کے باوجود انھوں نے اس راستے میں چراغ جلا دئے۔ اُس کے زمانے سے ہندوستان کے مفکرین جمل رہے ہیں۔ جب کہ شدت پسند بت شکنی کے جوش میں ہندوستانی روایت کی مخالفت میں ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ گئے اور قدامت پرستوں نے ترمیم کی ضرورت کے جدید تعلیم کے مطالبوں پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ رام موہن رائے نے ایک ایسے حل کی طرف اشارہ کیا جس میں ہندوستان کی تہذیب کا امتیازی رول بحال رکھا گیا تھا۔ اور اُس کے قدیم جذبہ آزادی کی تصدیق نوکی گئی تھی اور اُس میں مغرب کے مقبولیت پسندانہ نقطہ نظر سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

رام موہن رائے نے ہندو دھرم اور اسلام کے مذہبی عقائد اور روحانی نقطہ نظر کے مطابق

(1) رام موہن رائے، تحفۃ الموحدین، 1950ء صفحہ 13۔

(2) The English work of Raja Ram Mohan Ray، جلد 1 صفحہ 50۔

(3) ایضاً، صفحہ 100۔

(4) The English work of Raja Ram Mohan Ray، جسے تحفۃ الموحدین کے انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا

نیا پابلیکیشنز، آل آباد، (1906)، صفحہ 948۔

اپنے پیش کردہ حل میں انسان کی باطنی زندگی کی حد تک اُس کے وجود کی آزادی پر ایک دفعہ بھر زور دیا۔ لیکن انھوں نے معروضی کائنات تک اس کو پھیلا کر آزادی کی توسیع کر دی جس کی تعلیم مغربی فلسفہ دیتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے داخلی اور خارجی دنیا میں انسان کا وقار برعادیا اور اُس کے وجود کو اعتبار و انکار بخشا۔ اس کا منطقی نتیجہ تھا کہ آزادی معروضی آزادیوں کی شکل اختیار کرنے لگے یعنی آزاد سماج اور آزاد ریاست کی۔

آزادی کے اس اصول کا اطلاق قومی زندگی کے تمام شعبوں پر کیا گیا۔ یعنی مذہبی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی حالانکہ رام موہن رائے نے اس آزادی کی جڑیں ہندوؤں کے مقدس کتاہوں اور خاص طور سے اپنشد میں مس تلاش کیں۔ لیکن انھوں نے بلا پس و پیش تمام مذہب سے اصول مستعار لیے جہاں جہاں وہ اُن کے نقطہ نظر کے حامی نظر آئے۔ واقعہ یہ ہے مذہبی اور اخلاقی مسائل میں اُن کی ہمدردیاں سب کے ساتھ تھیں اور اُن کا نقطہ نظر بہت وسیع تھا۔ وہ ہر مذہب کی سچائی پر یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ اسلام سے انھوں نے وحدانیت، بت پرستی کی مخالفت، سماجی مساوات خدا اور اُس کی صفات کے باہمی رشتے کا نظریہ اور زندگی گزارنے کے طریقوں کو متاثر کرنے والی دوسری چھوٹی باتیں لیں۔ مسیحیت میں وہ اُس کے اخلاقی نظریوں کے معترف تھے اور مسیح کی تعلیمات کا بڑا احترام کرتے تھے۔

حق کی تلاش میں انھوں نے تختہ الملوحدین لکھی (11) جس میں اسلامی فکر اور یسوع کی اُن نصیحتوں سے استفادہ کیا ہے۔ جو عیسائی مذہب کے اختلافی اصولوں کی بنیاد ہیں۔ اُن کے ترجموں کا جن میں کنیا، آساکھا، مندو کیا اور مندو کا اپنشدوں کی شخصیتیں شامل ہیں۔ مقصد تھا۔ ہندوؤں کے اصل مذہب کو دوبارہ زندگی دینا انہوں نے انسانوں کو تمام مذہب کا احترام کرنے اور کسی کو برائے کہنے کی تعلیم دی۔ ان کا کہنا تھا کہ مختلف مذہب کو سورج کی سفید روشنی، کے مختلف رنگ کی شعاعوں میں سمجھنے سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ اس طرح انھوں نے ہندوستان کے اُس بنیادی اتحاد کا خاکہ پیش کیا جس کی اساس ہونی چاہیے مختلف فرقوں کے باہمی اعتماد اور تمام مذہب کو سمجھنے کی کوشش پر۔

صد سالہ جشن کے موقع پر رام موہن رائے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے رائے اربند راتھ ٹیگور نے کہا تھا۔ ”رام موہن رائے ہماری تاریخ کے عہد جدید کی ابتدا میں اُس وقت پیدا ہوئے۔ جب ہندوستانی اور بدیس میں تمیز کرنے کا شعور کم ہی تھا۔ لیکن اُن ابتدائی دنوں میں بھی وہ سمجھ گئے کہ اُن کے دور کا چیلنج تھا۔ اتحاد کا عظیم چیلنج۔ اُن کے فیاض دل کی کشادگی میں جو علم کی روشنی سے منور تھا، سب فرقوں یعنی ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے جگہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کا دل ہندوستان کا دل تھا۔ اور ہندوستان کی حقیقت کی آئینہ داری وہ کرتے تھے۔ اُن کی نظر میں صرف وہ ہندوستانی کہلانے کا مستحق تھا۔ جو ہر مذہب کے ماننے والے کا احترام کرے اور سب کو قبول کرے“ (2)

بد قسمتی سے سیاسی حالات اور تہذیبی تبدیلیوں نے اتحاد کی تحریک کی نشوونما کو روک دیا اور ملک میں علیحدگی پسندی کا رجحان بڑھ گیا۔

مذہب کے میدان میں رام موہن رائے کے دو کارنامے ہیں۔ انھوں نے مذہب کے لازمی اجزاء کو اُن اجزاء سے علیحدہ کیا جو لازمی نہیں ہیں اور اخلاقی مذہبی فکر کا مقول نظام پیش کیا۔ انھوں نے وہ

(1) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مذہبی مسائل میں مذہب کے متعلق ایک اور کتاب لکھی۔ جس کا نام تھا۔ مناظرات الادیان۔

(2) The English works of Raja Ram Mohan Ray جلد 6، صفحہ 6۔

معز اور زہریلی جھاڑیاں کاٹ دیں جن کی وجہ سے ہندو سماج کا دم گھٹ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے کام کے تعمیری حصے کے تعلق سے بڑی معقولیت پسندی ہے کام لیا۔ لیکن برائیوں کو ختم کرنے کے پروگرام میں وہ بڑے غر سے، اور صاف گوئی سے کام لیتے تھے۔ براہعکس اچے بغیر انھوں نے منطقی استدلال سے کام لیکر ہندوؤں کے غیر معقول رواجوں، پوجا کے طریقوں، رسموں اور تقریروں کی مذمت کی۔ وہ بت پرستی کو ایسی پوجا سمجھتے تھے کہ جو سماج کی بناوٹ کو تباہ کر دیتی ہے اور ویدوں کے متوں اور لٹھندوں کے مدد سے بتاتے تھے کہ اگرچہ رسم پرستی کی اجازت ہے لیکن وہ لازمی نہیں ہے اور یہ کہ وہ احکام، احتیاط اور عمل کے ضابطے میں جو عام معقول اصولوں کے منافی ہیں۔ ہندو دھرم سے انھوں نے یہ اصول اخذ کیا کہ انسان اصل میں جڑو آمیز دی ہے۔ یعنی اتحاد کی برہما اور یہ کہ انسانی زندگی نظم و ضبط کا ایک طریقہ ہے جو انسان کے فرد حیثیت سے ترقی کر کے انسان سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں سے اُن کا کہنا ہے کہ خدا کی وحدت کے پرانے مسلک، جس کی تعلیم وید دیتے ہیں پھر قبول کریں۔ اور رسم پرستی کی جگہ، جس کا مفہوم کچھ چکا ہے۔ وہ طریقہ اختیار کریں جو انسان کا حقیقی رشتہ خدائے مطلق سے قائم کر دیتا ہے۔ یعنی مطالعے کے مقدس طریقوں سرودن، من اور ندھنا سن پر عمل کریں۔ انھوں نے بلا اختیار، رنگ، نسل اور مذہب پر انسان سے محبت کرنے پر زور دیا۔ اور انسانی خوف کو زندگی کا اعلیٰ ترین اصول ٹھہرایا۔ انھوں دین کے نظم و ضبط کے پرانے طریقے کی سفارش کی جس سے انسان برے خیالات اور خود غرضی پر قابو پالیتا ہے۔

ایک طرف رام موہن رائے نے ہندوؤں کو نہیں بخشا تو دوسری طرف انھوں نے مسیحیت اور اسلام میں بھی اُن باتوں کو رد کر دیا جو اُن کی رائے میں قرین عقل نہیں تھیں۔ یسوع مسیح کی تعلیمات کی وہ بڑی قدر کرتے اور صلب کے عقیدے کے بڑے معترف تھے۔ یعنی انسانوں کے لیے تکلیفیں برداشت کرنے کے عقیدے کے لیکن وہ یسوع مسیح کی بلوہیت، مشیت، فرشتوں اور معجزوں کے قائل نہیں تھے، وہ اسلام کی اس غیر ردواری کو ناپسند کرتے تھے کہ اُس نے انسانوں کو وہ حصوں میں تقسیم کر دیا پہلے ”مومن“، جو محض اسیلے جنت کے حقدار ہیں کہ وہ خدا کی وحدانیت اور محمد کی رسالت کے قائل ہیں۔ اُن کے اعمال کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ دوسرے ”کافر“ جو کہتے ہیں۔ اچھے اور مذہبی کیوں نہ ہوں، مگر چونکہ وہ مقدس کلمہ نہیں پڑھتے ہیں اور محمد کو ”قائم المرسلین“ تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے وہ دوزخ کے ایندھن میں جلیں گے۔ وہ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ دیوتاؤں، دیویوں، فرشتوں اور مافوق الفطرت انسانوں میں ایزدی صفات ہوتی ہے۔

سماجی اصلاح کے تصورات

سماجی عمل کے میدان میں رام موہن رائے کے آزادی پسند ذہن کی خواہش تھی کہ غیر معقول طریقوں اور برے رواجوں سے ہندو سماج کو پاک کیا جائے۔ عہد وسطی کے سماج کی بدترین کاروائیوں میں سے ایک تھی، عورتوں کے ساتھ کیا جانے والا سلوک۔ وہ حق ملکیت سے محروم تھیں۔ انھیں پوری زندگی یا تو بیوہ کی طرح رہنا پڑتا تھا یا مہر حوم شوہر کی چٹا پرستی ہونا پڑتا تھا اور کثرت ازواج کے تکلیف دہ نتائج کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ تعلیم اُن کے لیے شجر ممنوع تھی۔ زنان خانے کی چار دیواری میں قید رکھی اور مردوں کے تابع اور اُن سے کمتر سمجھی جاتی تھیں۔ اور ان کی حیثیت غلاموں سے کسی طرح بہتر نہیں تھی۔ رام موہن رائے

نے ان حالات کو یکسر بدلنے کی وکالت کی تاکہ عورتیں بھی آزادی کے ساتھ اور باوقار زندگی بسر کر سکیں۔ وہ اُن کے حق میں قانونی ملکیت میں ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ اور سستی کی بجائے اور غیر انسانی رسم کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بیوہ کی شادی کی اور کئی بیویاں رکھنے کی ممانعت کی وکالت کی۔ سب سے زیادہ زور انھوں نے تعلیم نسواں پر دیا۔

ہندو سماج کی ایک اور برائی تھی ذات پات کا نظام جس پر ماضی کی کئی خرابیوں کی ذمہ داری تھی۔ اور جس کی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ ذات پات کے نظام نے سماج کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اور ان حصوں کی بالائی اور زیریں سطحوں کی درجہ بندی کر دی تھی۔ اُس کی بنیاد تھی پیدائش کا حوالہ جس کے پیچھے نہ کوئی دلیل تھی۔ اور نہ جس کی پیش گوئی کی جاسکتی تھی۔ اُس نے سماجی ڈھانچے کو پست ترین فرقے کی شکل دیدی تھی۔ جس کا مقصد تھا محض حیاتیاتی عمل۔ اس میں پائی جانے والی شدید تفریق محض ذہنی و مادی یک جہتی کی اجازت دیتی تھی۔ چنانچہ اپنی پوری تاریخ میں ہندو سماج بیرونی حملوں کی مزاحمت کی زیادہ سکت نہ دکھاسکا۔ حالانکہ ایک قدیم نظام کی طرح اُس نے طویل عمر پائی۔

رام موہن رائے نے محسوس کیا کہ آزادی برابری اور مساوات کی بنیاد پر جمہوری سماج صرف اُس وقت قائم کیا جاسکتا ہے جب ذات پات ختم دی جائیں۔ انھوں نے لکھا تھا "ذاتوں کی تفریق نے اُن میں (ہندوؤں میں) بہت سے فرقے اور ذیلی فرقے بنا دیے ہیں۔ اور انھیں حب الوطنی کے احساس سے یکسر محروم کر دیا ہے" اور مزید لکھا "تقریباً نو صدیوں سے ہم ان ذلتوں کا سامنا کر رہے ہیں اور ہمارے زوال۔۔۔ ذات پات کی تقسیم جس کی وجہ سے ہم میں اتحاد نہیں ہو سکا۔" (1)

ذات اور نسل کی تفریق کو ختم کر نیکی لیے انھوں نے شادی کے سیواسطریئے (2) کی سفارش کی جس کا ذکر مہاتراناں منتر میں کیا گیا ہے۔

اُن کے سیاسی تصورات

اُن کا زیادہ وقت اور جوش عمل مذہبی اور سماجی اصلاحات میں صرف ہوا۔ لیکن رام موہن رائے کی سرگرمیاں صرف انھی تک محدود نہیں تھیں۔ انفرادی اور اجتماعی کار پر آزادی کے اصول کے اطلاق کا منطقی نتیجہ تھا کہ اُس کی توسیع سیاست تک کی جائے۔ ظاہر ہے کہ رام موہن رائے کا آزادی سے پیار محدود نہیں تھا۔ وہ ہندوستان کے ساتھ اُس کا اطلاق پوری دنیا پر کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک خود اُن کے ہونٹوں کا تعلق تھا۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اُن کی ترقی کے لیے کام کیا اور اصلاح کے لیے اُن کی ہر کوشش کا مقصد تھا آزادی۔ مسٹر ارنوٹ نے انگلستان میں، راجہ موہن رائے کا سیکریٹری تھا، راجہ کی اس رائے کا ذکر کیا ہے کہ ہندوستان چالیس سال میں آزاد ہو جائے گا۔ اور یہ کہ برطانیہ کے زیر تعلیم ہندوستان دنیا کے

(1) The father of Modern India، یادگار جلد، حصہ دوم صفحہ ۷۵۔

(2) اُس میں معلقہ مدعہ ہے "وہ دونوں۔ آئندہ دو ہیں" "دونوں، ذات یا عمر کا کوئی سوال نہیں ہے۔ مہاتراناں منتر 279، 18۔ اگر اس طرح کی شادی سے بچے ہوں تو انھیں حق وراثت کے معاملے میں برہمن شادی کے بچوں پر ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی۔ لیکن وہ اخراجات زندگی کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

متمدن اور آزاد ملکوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ 1827ء کے جیوری ایکٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے، جس نے عدالتی نظام میں مذہبی اختیارات کو رواج دیا تھا۔ انھوں نے لکھا۔

”اگر ہندوستان کے پاس اُس ملک (آئرلینڈ) کے علم اور جوش کا ایک چوتھائی حصہ بھی ہو تا تو وہ اپنی دور دراز کی جائے وقوع، اپنی دولت اور اپنی بڑی آبادی کی بنا پر ظاہر کر دیتا کہ وہ برطانوی سلطنت کا ایک مفید اور منافع بخش صوبہ، ایک حلیف ہے۔ یا ایک دشمن کی طرح اس کو تکلیف پہنچا سکتا ہے اور اُس کے لیے دشواریاں پیدا کر سکتا ہے“ (1)

انھوں نے وکٹرل جک مال سے کہا تھا۔ ابھی ہندوستان کو بہت برسوں تک انگریزی حکومت میں رہنا ہے تاکہ جب وہ سیاسی آزادی ایک دفعہ پھر حاصل کر لے تو اسے بہت کچھ کھونا پڑے (2)۔ سیاسی رجحان کے تعلق سے پیٹھم کے پیر اور سیاسی تحریک کے برطانوی طریقوں کے شاہد کی حیثیت سے انھوں نے خرابیوں کا تدارک کرنے کے لیے سیاسی جدوجہد کا راستہ دکھایا۔ اُن کی پہلی احتجاجی تحریک تھی 1823ء کے آؤم کے پریس آرڈیننس کے خلاف جس نے اخبارات کی آزادی بہت کم کر دی تھی۔ انھوں نے حکومت کو پیش کرنے کے لیے ایک یادداشت کا مسودہ تیار کیا جس کو ملٹن کے ایویاکیہ کا کے معاملے میں پیش کیا جاتا ہے۔ 1827ء میں انھوں نے جیوری ایکٹ کے خلاف احتجاج کیا جس میں مذہبی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز کیا گیا تھا۔ اور اُس کو منسوخ کرنے کے لیے پارلیمنٹ کو ایک عرضداشت بھیجی۔ تین سال بعد انھوں نے اُن زمینوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کی تباہ کن کاروائی کے خلاف اپنی آواز بلند کی جو خیراتی مقاصد کے لیے معافی کے طور پر دی گئی تھیں۔ انگلستان کے قیام کے دوران انھوں نے لوگوں کی شکایتوں اور کمپنی کے انتظام کی خرابیوں کے متعلق ایک یادداشت پیش کی اور اُن کو دور کرنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رام موہن رائے نے سب سے پہلے احتجاج کرنے کا دستوری طریقہ اختیار کیا جس پر تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کے سیاسی رہنما کاربند رہے۔

رام موہن رائے یہ جانتے تھے کہ ہندوستان کی صورت حال متناقص ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی آزادی کی شدید خواہش اُن کے دل میں تھی۔ لیکن ہندوستانی سماج کمزوریوں اور خرابیوں کا احساس بھی اُنھیں تھا۔ انھوں نے حکمرانوں کی قوت کا دامن پکڑا۔ اُنھیں توقع تھی کہ لبرل ترقی پسند اور اصلاح شدہ انگلستان کی تربیت سے ہندوستان کا اخلاقی معیار بلند ہو جائے گا۔ عوامی جذبہ بڑھے گا اور وہ آزادی کے قابل بن جائے گا۔

رام موہن رائے نے جن سیاسی اصلاحات کی سفارش کی اُن کا مقصد تھا۔ اس منزل تک پہنچنا۔ وہ آزادی کے فوری مطالبے کے حق میں نہیں تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کمپنی کی حکومت کی تنظیم زیادہ معقول اصولوں پر کی جانی چاہئے۔ اس دستوری حکومت میں قانون کی عملداری کو سب سے اونچی حیثیت ملنی چاہئے۔ اور سول آزادیوں اور انفرادی حقوق کی ضمانت کی جانی چاہئے اُن میں زندگی اور آزادی کا حق اور اظہار رائے اور مذہبی عبادت کی آزادی شامل ہونی چاہئے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ جاندا پر فرد کی مطلق ملیت ہونی چاہئے۔

(1) ایضاً حصہ دوم، صفحہ 24۔

(2) ایضاً حوالہ دہی۔

اس حکومت میں قانون سازی کے اداروں کا جہاں تک تعلق تھا رام موہن رائے علیحدگی اختیارات کے حق میں تھے۔ لیکن ہندوستان میں مجلس قانون ساز کے قیام میں انھیں ناقابل تفسیر دشواریاں نظر آئیں۔ چونکہ ہندوستان کے نمائندوں کے انتخاب کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے وہ ہندوستان کا نمائندہ ادارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ قانون ساز اسمبلی یا کونسل قائم کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس میں حکام غلبہ حاصل کر لیتے۔ یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ قانون سازی کا کام کمپنی کی حکومت کے سپرد کر دیا جائے جو ایک تجارتی ادارہ تھی۔ اور کاروبار اور منافعوں میں دلچسپی رکھتی تھی جس کا دور نزدیک کا تعلق عام لوگوں کی بھلائی سے نہیں تھا۔

ان حالات میں انھیں سب سے کم نقصان اس میں نظر آیا کہ قانون سازی کے اختیارات بادشاہیہ اجلاس پارلیمنٹ کے سپرد کر دئے جائیں۔ لیکن یہ ضروری تھا کہ قانون سازی کے اختیار پر تقریبات کا انتظام کیا جائے۔ خاص طور سے ایسی حالت میں جب کہ قانون سازی کرنے والوں اور رعیت کے درمیان نسل و تہذیب کے اختلافات اور جغرافیائی دوری حاصل تھی۔ اس کا تدارک کرنے کے لیے ضروری تھا کہ آزادی اختیارات ہوں جو بلا خوف و خطر اور آزادی کے ساتھ لوگوں کے احساسات کو ظاہر کر سکیں۔ مجوزہ قانون کی دفعات کا جائزہ لینے کے لیے عدالت اور مال کے محکموں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن ہو اور اس کی چانچ پڑتال دولت اور ذہنی صلاحیت رکھنے والے زمیندار اور تاجر کریں چنانچہ ان قانونوں کے مسودے کو ہندوستان میں حکومت تیار کرے، حکام اور باحیثیت ہندوستانی ان کا جائزہ لیں اور پارلیمنٹ انھیں منظور کرے۔

کمپنی کی حکومت کے دوران کمپنی کا عدالتی نظام ناپسندیدہ گئی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ہر طرف سے اس پر اعتراضات کئے جاتے تھے۔ ملک کی روایتوں کے وہ خلاف تھا۔ عدالتیں ناقص، مقدموں کے فیصلے ہونے میں دیر لگتی تھی اور رشوت کا عام رواج تھا۔ اس کی اصلاح کے لیے رام موہن رائے نے جامع اصلاحات کا مشورہ دیا یعنی عدالتی فرائض کی انتظامی فرائض سے علیحدہ کیے۔ ایماندار اور باصلاحیت ججوں کا تقرر جو لوگوں کی زبان سے واقف ہوں، ہندوستانیوں کو زیادہ سمجھاؤں دینا، جعل سازی اور دزدانہ چوری کی وجوہ کا تدارک، جوری کا طریقہ شروع کرنا، نئے طریقے سے قائم کی گئی چنانچوں کو بحال کرنا اور عدالت کی کاروائی کی نگرانی لوگوں کے سپرد کرنا۔

حکومت کے انتظامی ادارے جہاں تک تعلق تھا۔ رام موہن رائے اس کے حق میں نہیں تھے کہ وہ کمپنی سے تاج کو منتقل ہو جائے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ہزاروں میل کے فاصلے اس وقت راست حکومت ایک خطرناک عمل تھا۔ جب آمدورفت کے ذرائع ترقی یافتہ نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی مناسب نہیں تھی کہ جو قانون سازی کرے وہی انتظامی فرائض بھی ادا کرے۔ انہوں نے کام کی سمن مانی کے روایتوں کے خلاف کچھ حفاظتی تدابیر کی جانی چاہیے تھیں۔ مثلاً حکام کی قانونی ذمہ داری جس کا عمل درآمد ججوں کے ذریعہ کیا جائے۔

ریاست کے فرائض کے تعلق سے موہن رائے کا وہ یہ تجربے پر مبنی تھا۔ وہ انفرادی ملکیت کے حق میں یقین رکھتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ زمین فرد کی ہوتی ہے نہ کہ ریاست کی۔ چونکہ ایک مضبوط متوسط طبقے کے حق میں تھے۔ اس لیے زمینداروں کو رعیت داری پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ان طرف تو وہ یہ چاہتے تھے کہ بندوبست استراحدی کی توسیع کی جائے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کسانوں کا

لگان بھی اسی طرح مقرر کر دیا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ فوجیت اور انگلستان میں کئے جانے والے اخراجات میں تخفیف کر کے عوامی صرف میں کمی کی جائے۔

اصول عدم مداخلت کے نظریے کے برعکس اُن کی خواہش تھی، کہ ریاست لوگوں کو تعلیم دے کر اور سستی کی طرح کی سماجی خرابیوں کے خلاف قانون بنا کر سماجی بھلائی کے ثبوت اقدامات کرے۔

قومی یکجہتی میں گہری دلچسپی رکھنے والے مریہ کی حیثیت سے اُنھوں نے بغیر کسی تعصب کے اور بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ ہندو مسلم تعلقات کے سوال پر غور کیا۔ مسلمانوں کے ہندوستان کو فتح کرنے کے بارے میں اُنھوں نے لکھا ”غزنی اور غور کے مسلمانوں نے ملک کو سیکڑوں چھوٹی بڑی سلطنتوں میں بٹاوا دیکھ کر، جن سے اُن کی رعایا نفرت کرتی تھی۔ باری باری سے اُنھیں فتح کر لیا۔ اور اپنی حکومت کے ظالمانہ نظام کو رد و اج دیا۔“ مسلم حکومت کی انفرادی اور من مانی نوعیت کو ناپسند اور اُس کی غیر قانونی اور ظالمانہ کاروائیوں کی مذمت کرنے کے باوجود اُنھوں نے تسلیم کیا ”کہ سابق مسلمان حکمرانوں کے زمانوں میں اسی ملک کے باشندوں کو مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کا سیاسی حق حاصل تھا۔ ریاست کے اعلیٰ ترین عہدوں کے لیے اُن کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔ فوجوں کی کمانڈر اور صوبوں کی حکومتیں اُن کے سپرد کی جاتی تھیں اور اکثر وہ حکمرانوں کے مشیر مقرر کئے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کے مذہب یا جائے پیدائش کی بنا پر کوئی ذلت آمیز امتیاز نہیں برتا جاتا تھا اُنھیں معافی کی آرازی جس پر کوئی مال گزاری نہیں دینی پڑتی تھی اور حکومت کے تحت بڑی سے بڑی تنخواہوں کے ساتھ وہ ملک کے اُن بڑے بڑے علاقوں سے بھی کوئی رقم ادا کئے بغیر مستفید ہوتے تھے۔ جو اعلیٰ اور قابل اعتماد عہدوں سے منسلک تھے۔ اور باطمینان اور باصلاحیت لوگوں کو بڑی تنخواہوں اور حیثیت کے عہدے دیکر نواز جاتا تھا“ لیکن مسلمانوں کی حکومت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ترجیح کی وجہ یہ تھی کہ ”سیاسی حیثیت اور طاقت کھو دینے کے باوجود وہ (ہندوستانی) اپنے باوجوداد کے مقابلے میں اس بات سے زیادہ خوش ہیں کہ اُنھیں سول اور مذہبی آزادی حاصل ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کے متعلق اُن کی اس رائے کو اُن کے موجودانہ مذہب اور مساوات پر مبنی سلامتی نظام سے تقویت پہنچائی۔

اُن کی بین الاقوامیت

سیاست میں رام موہن رائے تک نظر نہیں تھے۔ چاہے اُن کے ہم وطن ہوں یا دوسرے ملکوں کے لوگ وہ سب کے لیے آزادی کے خواہاں تھے۔ اُن کے لیے تمام انسان ایک خاندان کی طرح تھے۔ اور وہ ایک قوم کی خوشی یا غم کو پوری دنیا کی خوشی یا غم سمجھتے تھے مثال کے طور پر آسٹریا کے لوگوں نے اُنہیں کے پاسپورٹ کی آزادی چھین لی۔ تو اُنھیں اتنا دکھ ہوا کہ ایک دوست کی دعوت میں شرکت کرنے سے اُنھوں نے انکار کر دیا۔ جب اُنھوں نے سنا کہ اسپین میں دستوری سلطنت قائم ہو گئی تو اُنھوں نے ناؤں حال میں ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا۔ 1830ء کے انقلاب فرانس کی خبر سنا کر وہ اتنے زیادہ خوش ہوئے کہ ان کے باوجود سر رنگ بھندہ اڑانے والے فرانسیسی نریکٹ پر گئے جو فینچ ہل میں ٹکرا اڑا تھا۔ انگلستان میں ان وقت فرام میں (اصلاحات کے بل) پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا۔ اور یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس کا شہر کیا

ہو گا۔ اُس وقت انھوں نے عہد کیا کہ مل اگر نامنکور ہو گیا تو انگلستان کے ساتھ وہ اپنے تعلقات ختم کر دیں گے۔ فرانس کے امور خارجہ کے وزیر کے نام ایک خط میں انہوں لکھا تھا۔ تمام انسان ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت سی موجودہ قومیں اور قبیلے محض اُس خاندان کی شاخیں ہیں“ (۱) اُس خط میں انھوں نے تمام قوموں کی کانگریس منعقدہ کرنے کا منصوبہ بھی پیش کیا تھا۔ جس میں تمام اختلافات چاہے وہ سیاسی ہوں یا تجارتی سمجھوتے کے لیے پیش کئے جائیں۔ یہ بات صرف وہی شخص کر سکتا تھا۔ جس کی ہمدردیاں سب کے ساتھ ہوں۔ اور جو انسان کے مقدر میں بڑی دلچسپی اور دور تک دیکھنے والی نظر رکھتا ہو اور لیگ آف نیشنز سے دو سال پہلے ایک ایسا عالمی تنظیم کا منصوبہ بنا سکتا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ”نسل بعد نسل پر قرار رہنے والی امن اور دوستانہ جذبات“ کا رام موہن رائے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ لیکن آئندہ کی تباہی کے خطرے کے خلاف انسان کے پاس اگر کوئی اُمید کا چراغ ہے تو وہ یہی تصور ہے۔

برہموسماج

رام موہن رائے محض تقریر و تحریر کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی مذہبی اور سماجی اصلاحات کو دوائی شکل دینے کے لیے انھوں نے ایک انجمن بنانے کا منصوبہ تیار کیا جس کے پابندیوں کے ساتھ چلے ہوں۔ اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں درج اصولوں کے مطابق باجماعت عبادت کی جائے یعنی مقدس منتر اور بھجوں کو پڑھنا اور سنا، مذہب کی عظیم حقیقت کو بیان کرنا اور اُس پر عذر کرنا، خدا کی اچھائی اور طاقت پر غور و فکر کرنا، دوائی جذبات اور اُس کا دور مطلق کا قرب حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرنا جو کائنات کا حاکم ہے۔ اس سلسلے میں پہلا تجربہ تھا۔ 1816ء میں الٹہ سہا کا قیام۔ اس انجمن کی رکنیت ہر مذہب کے سامنے والوں کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ اس کے جلسوں میں وید کی مناجاتیں پڑھی جاتی تھیں اور بھجن گائے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ساز ایک مسلمان غلام عباس بھلیا کرتا تھا۔ تاہم اسانہ تقریروں کے لیے عالموں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ 1826ء میں تجربے کا مرحلہ ختم ہو گیا۔ اور برہموسماج کی بنیاد پڑ گئی۔ وقت کی دستاویز میں جس کی رو سے سہا کا قیام، عمل میں آیا اور عطیات دینے والوں یعنی رام موہن رائے، دواریا ناتھ ٹیگور پرسانکار ٹیگور، کالی ناتھ رائے اور رام چندر دیو لکشمی کی جائداد سوسائٹی کے تین متولیوں کے سپرد کر دی گئی۔ سماج کے اغراض و مقاصد اور وقف کی شرائط کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نے ہندوؤں کی مذہبی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ جس کا مقابلہ سولہویں صدی کی بھگتی تحریک کے غیر معمولی واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔ اس سماج کا مقصد تھا۔ ”اُس دوائی ناقابل تلاش اور ناقابل تغیر بات کی عبادت جو کائنات کی خالق اور نگہبان ہے۔“ اُس کے حدود میں کوئی شیعہ، مورتنی یا بت۔ پتھر یا لکڑی کی بنی ہوئی شکل، مصوری کا نمونہ، تصویر یا کسی کے شاہد کوئی چیز لانے کی اجازت نہیں تھی اور کسی جاندار کی قربانی، کھانے پینے اور کسی مذہب کو بُرا بھلا کہنے کو برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔

برہموسماج کے عقائد اور اس کی عبادت اور خدا کی خدمت کا طریقہ کچھ اس نوعیت کا تھا کہ اُس میں محض بنگال کے دانشوروں کے لیے کشش تھی۔ لیکن متوسط طبقے کے اُن حصوں میں زیادہ مقبول نہیں

تھی۔ جو جدید خیالات سے زیادہ متاثر نہیں تھے۔ اور غیر تعلیم یافتہ عام لوگوں میں تو بالکل مقبول نہیں تھے۔ حالانکہ یہ تحریک عوامی نہیں تھی۔ پھر بھی اُس کا اثر دور تک سرایت کر گیا۔ اسلئے کہ اس کے پیر و بنگال کے سرکردہ اشخاص تھے۔ جن کی سماج میں اونچی حیثیت تھی۔

رام موہن رائے نے اپنی زندگی کے آخری تین سال یورپ اور زیادہ تر انگلستان میں گزارے جہاں وہ نیا مذہبی اور سیاسی کام کرتے رہے۔ ایک عظیم ہندوستانی رہنما کی حیثیت سے انگلستان میں سماج کے مختلف حصوں نے اُن کا خیر مقدم کیا 1833ء میں برٹش میں اُن کا انتقال ہندوستان کے لیے ایک بڑا سانحہ تھا جس نے کارہائے نمایاں کا سلسلہ ختم کر دیا۔ جن سے ہندوستان کی توقعات وابستہ تھیں۔

ان کی تحریک اور قیادت سے محروم ہونے کے بعد برہمن سماج پستی کا شکار اور بھگتوں میں جلا ہو گیا۔ دوار کا تھ ٹیگور، جن کے سپرد اس کا انتظام تھا، پوری توجہ نہیں دے پائے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے بیٹے رابندر ناتھ ٹیگور 1843ء میں برہمن سماج میں شامل ہو گئے۔ لاکھنؤ میں انھوں نے رام موہن رائے کو متاثر کیا تھا۔ اور نوجوانی میں اس قسم کی انجمنوں کی رکیعت قبول کر کے جیسے عام معلومات حاصل کرنے کی انجمن اور نوابو دہنی سجا، عوامی سرگرمیوں میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے اسکو نئی زندگی عطا کر دی۔ انھوں نے بنگال کے اضلاع میں اُس کی شاخیں قائم کیں۔ اہم شہروں میں منبلوں کا تقرر کیا اور اسکے کمارت کی ادارت میں سماج کے ارگن کے طور پر ٹڈا بودھنی پتریکا کی اشاعت شروع کی۔

سماج میں فرقہ بندی

رام موہن رائے کے انتقال کے بعد الگوینڈر ڈوف کی قیادت میں عیسائی مشنریوں نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی نظروں میں ہندو دھرم کو گرانے کی کوشش بڑھادی۔ اور عیسائی بنانے کی مہم تیز کر دی۔ سماج اور پتریکا نے اس چوٹی کا مقابلہ کیا۔ برہمن مذہب پر ذہنی پستی کا جو اثر ام لگایا جاتا تھا اُس کو دور کرنے کے لیے راج نرائن بوس نے اُس کی عبادت میں مذہبی جوش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سماج کے عقائد اور اصولوں کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اُن کی حمایت میں مضامین اور کتابیں شائع کی گئیں۔ اور رسوم کی وضاحت کرنے کے لیے عہد و پیاں کا تعین کیا گیا۔ لیکن عیسائیوں کے ساتھ نزاعی بحث کی وجہ سے دیدوں کے غلطی سے بری ہونے کے سوال پر سماج فرقوں میں بٹ گیا۔ دہند رنا تھ چاہتے تھے کہ سماج کا وہ بنیادی کردار باقی رہے جو رام موہن رائے نے متعین کیا تھا۔ اے کے دت وغیرہ کی طرح کے زیادہ شدت پسند عناصر سے انھیں اختلاف تھا۔ انھوں نے اُس کے رسموں کو ایسی شکل دی جو کہ ہندو طریقوں سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی۔

نوجوان شدت پسندوں کو کیپٹ چندر سین 1858ء میں سماج کے رکن بن گئے تھے۔ ایک ایسا رہنما مل گیا جو اُن کے سماجی اور مذہبی اصلاحات کے مطالبے سے ہم ردی رکھتا تھا۔ سماج نے اعتدال پر مبنی جو پروگرام منظور کیا تھا وہ اُس سے بہت آگے بڑھ گئے۔ 1866ء میں فرقے نمودار ہوئے اور رابندر ناتھ ٹیگور کا فرقہ، جو آدمی برہمن سماج کہلاتا تھا۔ کیپٹ چندر سین کے فرقے سے علیحدہ ہو گیا۔ جس نے ہندوستان کا برہمن سماج یا نوودھیان کا نام اختیار کیا۔

V ہندوستان کا جدید ذہن اور سیاسی سرگرمی کی ابتدا

قدامت پسندوں، شدت پسندوں اور لبرلوں نے اپنے اپنے طریقے سے ہندوستان کے لوگوں کے ذہنوں میں جدید رجحانات پیدا کرنے میں مدد دی۔ ہندوستانیوں کے روایتی انداز فکر و عمل اور مغربی تہذیب کے گہراؤ سے جو مسائل پیدا ہوئے اُن کو اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق حل کرنے کی کوشش انھوں نے کی لیکن اس کی وجہ سے خود تنقید کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوستان کی انفرادیت کا شعور پیدا ہوا جو مغربی فوجوں کی انفرادیت سے مختلف تھی۔ اس اختلاف کے علم کے ساتھ ہندوستانی نظریے کی مذہبی بنیاد کی آزادی اور ہندوستانی سماج کے آزاد ذہن پر اُس کے اثرات سے بھی آگاہی ہوئی۔

چنانچہ نئے متوسط طبقے کے دانشوروں کی اگرچہ اصل دلچسپی تو اس دنیا اور اُس دنیا میں انسان کے مقدر کے بنیادی مسائل پر مرکوز تھی پھر بھی ملک کے سماجی اور سیاسی مسائل سے اُن کی وابستگی ناگزیر تھی سماجی مسائل کے حل کے تعلق سے ان میں نقطہ نظر کا اختلاف تھا۔ لیکن جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق تھا یہ اختلافات بہت زیادہ نہیں تھے۔

اُن میں سے زیادہ جو شیلے اور سب سے زیادہ صاف گوئی سے کام لینے والے تھے۔ شدت پسند اُن میں یکساں روئی پائی جاتی تھی اور سیاسی سماجی اور مذہبی اصلاحات کے معاملے میں وہ بڑی سختی سے کام لیتے تھے۔ وہ رجعت پرستی قدامت پرستی کی مخالفت میں، چاہے وہ ہندوستانی ہو یا برطانوی، کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ وہ پچھتم کے اصول آزادی میں یقین رکھتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر وسیع اور سیکور تھا۔ اور وہ جمہوری طریقوں کو ترجیح دیتے تھے۔ معاشی پالیسیوں میں وہ عوامی مداخلت کے حق میں تھے۔ اور تجارت کے کاروباری طریقوں کے خلاف تھے۔ وہ جولائی 1830ء کے انقلاب فرانس کے مداح تھے۔ اور ہندوستان کے لیے بھی ایسا ہی انقلاب چاہتے تھے۔ اُن کے ذہنوں نے ہندوستان کو ایک مجموعی اکائی کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اور اُن کے دل وطن پرستی کے جذبات سے لبریز تھے۔ شدت پسند شاعر کاشی پرشاد گھوش کے لیے ہندوستان ”دیوتاؤں کی سرزمین“ تھا۔ اور ”میرا وطن“ تھا۔ اور وہ مبارک آزادی کی منزل تک ہندوستان کے پہنچنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔

شدت پسندوں کی سرگرمیاں بہت پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے ایک تھی۔ اکاذم ایسوی ایشن جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ جس کے صدر تھے تار چند چکرورتی۔ اس انجمن کے دوسرے عہدہ دار تھے رام گوپال گھوش، پیارے چند مرزا اور رام تولابری اس کے جلوس میں بہت سے موضوعات پر بڑے بڑے جاتے تھے۔ جن میں سیاست بھی شامل تھی۔ ان میں ایک پرچے ”ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالت فوجداری اور پولس کی موجودہ حالت“ پر خاصہ ہنگامہ ہوا۔ پرچے میں کئی جانیوالی باتوں پر پرنسپل رچرڈسن نے احتجاج کیا اور انجمن کے صدر تار چند چکرورتی نے اُسے رد کر دیا۔ ایک اور انجمن تھی۔ تھیوفیلن تھریڈیک سوسائٹی کشور چند مرزا نے اس کو 1843ء میں قائم کیا تھا“ (1)

ایسے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے شدت پسندوں نے دوسرا طریقہ استعمال کیا وہ تھا، رسالوں

اور اخباروں کی اشاعت۔ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اُن کے علاوہ تھے۔ یار تھمن، گیاد سال بنگال اسپیکر ہندو پانیز انگو ائزر اور کوئل۔ اُن کے مضامین نے بنگال میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں بڑی مدد دی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1833ء کے چارٹرائٹ اور بیلک کی لبرل پالیسی نے دستور کی تحریک اور حکمرانوں کے اچھے ارادوں کے متعلق رام موہن رائے کے خیال کی تصدیق کر دی۔ لیکن بیلک کے بعد رد عمل شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ سیاسی شعور کھٹے والے گروپ مایوس ہونے لگے۔ حکومت کے اقدامات کی تنقید اور خود کفالت کے مطالبے میں شدت پیدا ہونے لگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی طاقت کو ختم کرنے، ہندوستانی مجلس ساز قائم کرنے اور عدالتی نظام میں اصلاح کرنے کے لیے آوازیں اٹھنے لگیں۔ تعلیم پھیلانے اور تکنیکی اسکول قائم کرنے، سول آزادی کا تحفظ کرنے، زمینداروں کی مداخلت بچانے کے خلاف کسانوں کے حقوق کا دفاع کرنے اور اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانوں کا تقرر کرنے کے مطالبے بڑھ گئے۔ رعایا کی طرف حکومت کے فرائض یاد دلانے جانے لگے۔ جن کی خوشحالی کا انحصار اُس کی کاروائیوں پر تھا۔ لوگوں کے قدرتی حقوق پر زور دیا جانے لگا اور اس پر بھی زور دیا جانے لگا کہ حکومت لوگوں کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ حکومت کے اختیارات کو عام لوگ تصدیق کرتے ہیں۔ اور اس لیے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کا ایک نمائندہ مجلس قانون سازی کے ذریعے حکومت کے کاموں میں حصہ لیں۔

اکٹھ کمار کی جو شدت پسندوں کے ارگنٹ ڈاؤن مینی پٹر کا کے مدد تھے۔ وطن کی محبت سے سرشار تھے۔ اُن کا ذہن مغربی فلسفے اور ادب سے بھرا ہوا تھا ریاستی سرگرمی کے متعلق وہ ترقی یافتہ تصورات رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ حکومت سماج کا ایجنٹ ہوتی ہے۔ اور محاصل وصول کرنے کے اس کے حق کی بنیاد ہے افراد کی جان، عزت اور جائیداد کی حفاظت اور مادی، اخلاقی اور روحانی طور سے سماج کی ترقی۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ غربت کو دور کرے، دو سال سے چندہ سال کی عمر تک مفت اور جبری تعلیم مہیا کرے اور شادی، خاندان وغیرہ کی طرح کے سماجی روابط میں اصلاح کرے۔

دست حکومت پر شدید تنقید کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کمپنی کی حکومت میں جرائم بڑھ گئے۔ لوگوں کی تندرستیاں خراب ہو گئیں۔ مذہب کی تضحیک ہوئی تیسریں بڑھ گئیں۔ اور عام لوگ دکھوں میں مبتلا ہو گئے۔ لوگوں کے دکھوں کا سبب تھا بدلی حکومت۔

رام موہن رائے کے شاگرد سماج میں بڑا اثر رکھتے تھے۔ اُن میں سب سے اہم تھے ٹیکور خاندان کے افراد (دو اور کانا تھ اور اُن کے بیٹے دیندر ناتھ اور ہرشا کمار) سینئر ابراہارن (پیارے چند اور کشوری چند)، ہندو بیڑیات کے دو مدد گر (گریٹ چندر گھوش اور ہریش چندر گھری) اور رام گوپال گھوش سیاسی میدان میں اچھے اور لوگ بھی اُن کے ساتھ کام کرتے تھے۔

مجموعی اعتبار سے رام موہن رائے کے تصورات کے حالی تھے۔ حالانکہ کچھ معاملات میں انھیں اختلاف بھی تھا۔ مثلاً ہندوستان میں مجلس قانون ساز کا قیام یا ملک میں یورپین لوگوں کی آباد کاری۔ لیکن کام کرنے کے طریقوں میں وہ بڑی وفاداری کے ساتھ اپنے رہنما کی پیروی کرتے تھے لوگوں کی شکایتوں کو دور کرنے کے لیے وہ جلدی کرتے تھے۔ اور عرضداشتیں اور یادداشتیں پیش کرتے تھے۔

اپنی سرگرمیوں میں انھیں قدامت پرستوں کی نہایت بھی حاصل ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر راجا سائکانت دیب رام کل سین اور بھولائی چرن بندیا۔ جیہ نے انجمنوں کے کام میں حصہ لیا قومی معاملات

میں لوگوں کی، لچھی بوحانے کے لیے انھوں نے تحریر و تقریر سے کام لیا۔
 بنگال کے جو اخبار شدت پسندوں اور لبرلوں کے تصورات کی اشاعت کرتے تھے وہ تھے۔ سولا
 کوٹری، گیان و شان، سمبر پر بھاکر، بنگال اسکلیئر، شند ابو دھینی پتریکا وغیرہ۔
 انگریزی زبان کے اخباروں میں ریفاہر، ہندو ٹیلی جنس اور بنگال ریکارڈر 1848ء نے اس
 سلسلے میں بیش بہا خدمات سر انجام دیں۔

VI مغربی ہندوستان میں سماجی اصلاح

مرہٹوں کے تحت مغربی ہندوستان کے سیاسی تاریخ بنگال کی تاریخ سے مختلف تھی۔ اٹھارہویں
 صدی کی ابتدا کی دہائیوں میں پیشواؤں نے اپنی حکومت کی توسیع نہ صرف مرہٹوں کے سر زمین بلکہ وسطی
 ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر بھی کر لی تھی۔ اُس کے بعد دہلی دو آجے کے معاملات میں دخل دیا شروع
 کیا اور ایک وقت تو پنجاب تک بھی پہنچ گئے۔ لیکن 1761ء میں مرہٹہ سلطنت کو دھاکا پہنچا اور سرداروں پر اُس
 کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ آپسی جھگڑوں کی بنا پر انگریزوں کو مداخلت کرنے کا موقع مل گیا اور 1818ء تک اُن
 علاقوں کا الحاق انگریزوں نے کر لیا جن پر پیشوا حکومت کرتا تھا۔ اور خود مختار مرہٹہ سرداروں نے ایسٹ انڈیا
 کمپنی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر لیا۔ چنانچہ انگلستان کی فتح کے پچیس سال بعد مرہٹوں کے علاقوں پر انگریزوں کی
 حکومت ہو گئی۔

لیکن پیشواؤں کی سولہ سالہ حکومت نے لوگوں کے حالات میں کوئی واضح تبدیلی نہیں کی تھی۔
 معاشی اعتبار سے مہاراشٹر کی حالت بنگال سے بدتر تھی۔ صنعت اور زراعت دونوں میں وہ پس ماندہ تھا۔ اور
 اُس کی تجارت چاہے۔ وہ بدیسی ہو یا داخلی بہت محدود تھی۔ اس کے باوجود حکمرانوں اور رعایا میں کوئی نسلی،
 لسانی اور مذہبی اختلافات نہیں تھے۔ سماج پر جمود طاری تھا۔ فکر میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ اور عقائد اور
 اداروں میں کوئی ترقی نہیں تھی۔ لوگ ادھام پرستی میں مہملا تھے اور ذات پات کے معاملے میں بڑی سختی برتی
 جاتی تھی۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد حیات میں سماج اور ریاست کی کمزوری پوری طرح ظاہر ہو گئی۔

انگریزوں کی فتح کا اثر مہاراشٹر پر اتنا انقلابی نہیں تھا۔ سیاسی اعتبار سے بالائی حکمران طبقے کے جو
 زیادہ تر برہمنوں پر مشتمل تھا، ان کے ہاتھوں سے طاقت نکل گئی۔ اُس علاقے کی معیشت میں زمین کے رعیت
 داری نظام کی بنا پر بالکان آراضی کا بالائی متوسط طبقہ وجود میں نہ آ سکا۔ زمین زیادہ زرخیز نہیں تھی، جس کی بنا پر
 تجارت نہ بڑھ سکی۔ صرف کپاس ہی ایک ایسی پیداوار تھی۔ جس نے مفت کے فروغ میں مدد دی۔ تعلیم پھیلنے
 کی رفتار سست تھی۔ اور ایک ایسے سماج میں مغربی اثر زیادہ سراپت نہ کر سکا۔ جس میں متوسط طبقہ کمزور تھا۔

1818ء میں لوگوں پر مغربی اثرات پڑنے کے لیے میدان تیار ہو گیا۔ مفتوحہ علاقے پر حکومت کا
 برطانوی نظام قائم ہو گیا۔ ملک کی آمدنی کے ذرائع کے متعلق تفتیش و تحقیق کی جانے لگی۔ عدالتوں کا قیام
 عمل میں آیا۔ اور ان کی ہدایت کے لیے ضوابط تیار کئے گئے۔ تعلیمی حالات کے بارے میں بھی تحقیق کی گئی
 اور گورنر کی صدارت میں 1822ء بمبئی یونیورسٹی اسکول اینڈ کالج سوسائٹی قائم کی گئی۔ انجمن، جو بمبئی پریسنگ سوسائٹی کا

نیا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ (1819ء تا 1827ء)، جانتا تھا کہ نئے حکمرانوں کے تحت تبدیلی نامگزیر ہے۔ لیکن اس کی خواہش تھی کہ ماضی سے رشتہ یک لخت نہ توڑا جائے۔ اور اس نے مانجوں کو رائے دی کہ جن لوگوں کی دیکھ بھال اُن کے سپرد ہے۔ اُن کے جذبات کا احترام کیا جائے۔

انفلسن کی احتیاط اور مہاراشٹر کے تمام قدامت پسندانہ ماحول نے سماج ترقی کی رفتار سست کر دی۔ لیکن برطانوی حکمرانوں نے جس نئی تعلیم کو رواج دیا اُس نے اور مشنریوں کی سرگرمیوں نے لوگوں کے ذہنوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔ اور وہ اپنے قدیم اواروں پر شک و شبہ کرنے لگے۔ مہند عالموں کی نئی نسل مغرب کی معنویت پسندی سے طبعی سانسوں میں اُس کی ترقی سے اور اُس کی صنعت و تکنیک اور سیاسی اور انتخابی تنظیم سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ فرکس، کیمسٹری، جغرافیہ، تاریخ انگلستان، جنسانی ساخت کی تشریح کے علم وغیرہ کے مطالعے نے تعلیم یافتہ لوگوں کو اظہار رائے کے لیے معیارات مہیا کر دیے۔ وہ سماجی تاثر پذیری، اُس کے تہذیبی جہود اور اخلاقی گراؤت کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ عیسائی مذہب کی تبلیغ کے جوش میں عیسائی مشنری ہندو دھرم کے طریقوں پر حملے کرتے تھے۔ اور تعلیم یافتہ لوگ اس پر مجبور ہو جاتے تھے کہ وہ اپنے قدیم مذہبی تصورات سماجی رواجوں اور اواروں کا جائزہ لیں۔ انھوں نے اپنی سماجی زندگی کو معنویت کی روشنی میں دیکھنے، تاثر پذیری کو دور کرنے اور مذہب اور رواجوں میں اصلاح کرنے کی کوشش کی۔

اعتدال پسند مصلحین

اصلاح کی تحریک میں جتن تاتھ شکر شیٹ، بال شاستری جمبیک، دشنو شاستری باپت اور کرشنا شاستری چپ نکر وغیرہ پیش پیش تھے۔ بال شاستری کے آباؤ اجداد پڑھے لکھے پجاری تھے جو دولت مند خاندانوں میں پران پڑھ کر نسیا کرتے تھے۔ 1812ء کے اواخر میں بال شاستری پیدا ہوئے اپنے والد کی نگرانی میں انھوں نے جلد ہی مرہٹی اور سنسکرت پڑھا اور سیکھ لیا۔ 1835ء میں اس کم عمر لڑکے کو اُن کے رشتہ دار مزید تعلیم کے لیے بمبئی لے گئے۔ اور نئے قائم ہونے والے انگریزی اسکول میں بھرتی کر دیا۔ وہ نہایت ذہین اور مخلص تھے۔ جلد ہی انھوں نے تمام مضامین میں دسترس حاصل کر لی اور تمام انعامات جیت لیے۔ سترہ سال کی عمر تک پہنچنے پہنچنے انھوں نے نہ صرف مرہٹی اور سنسکرت بلکہ انگریزی، گجراتی، بنگالی اور فارسی بھی سیکھی۔ اسکول میں ان کے شاندار کارناموں کی بنا پر وہ 1830ء میں اسکول بک سوسائٹی میں نیا اسٹنٹ کے عہدے پر تعینات ہو گئے۔ اور اپنے روزی و رسالوں کے ذریعہ وہ بمبئی کے یورپین عالموں کے سب سے ترقی یافتہ حلقے سے متعارف ہو گئے۔ اُن کے وسیع مطالعے اور مغربی عالموں کے ساتھ اُن کے ربط و ضبط نے اُن کی نظر میں وسعت پیدا کر دی اور اُن کے سماجی شعور کو بیدار کر دیا۔ انھوں نے طالب علموں کے لیے اخلاقی اور عام معلومات کی کتابوں کے ترجمے کئے اُس کے بعد انھوں نے ایک زیادہ حوصلہ مند انداز مفید اقدام کیا، مرہٹی میں ایک ہفتہ وار اخبار بمبئی واپرین نکالنا شروع کیا۔ جس کا پہلا شمارہ 12 نومبر 1832ء کو شائع ہوا۔ اور پھر انھوں نے رگ درشن 1840ء میں شروع کیا۔

درپن کے پہلے شمارے میں بال شاستری نے لکھا ”اُس ملک میں جہاں سے ہمارے حکمران

آتے ہیں اُس عجیب و غریب مشین کی طاقت سے کام لیا جاتا ہے جس کو اخبار کہتے ہیں۔ یہ لوگوں کے ذہنوں سے غلطی اور جہالت کے اندھروں کو دور کر رہے ہیں۔ انھیں علم کی روشنی بخش رہے ہیں اُن تمام ملکوں میں جہاں وقفے وقفے سے چھپنے والے جریدے خریدے اور پڑھے جاتے ہیں۔ لوگوں نے اُن سے بہت فوائد حاصل کئے ہیں۔ انھوں نے ادب اور سائنس کو فروغ کیا ہے۔ اور اُن کی ہمت افزائی کی ہے۔ اُن کی وجہ سے لوگوں کے اخلاق سدھرے ہیں۔ ایک طرف انھوں نے رعایا کو اطاعت کا سبق دیا ہے۔ اور دوسری طرف حکمرانوں کو مطلق العنان اور من مانے طریقے اختیار کرنے سے باز رکھا ہے“ (1) اُس مضمون میں انھوں نے مزید لکھا ”ہندوستان کے اس حصے میں بھی انگریزی حکومت کے قیام کو زیادہ مدت نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو جہالت اور اندھیرے یہاں مدتوں سے چھائے ہوئے تھے۔ وہ دور ہوئے لگے ہیں اور وہ دن دور نہیں ہے۔ جب ہم اُن تمام خوبیوں میں اپنے مغربی بھائیوں کا مقابلہ کر سکیں گے جن میں آج وہ ہم سے آگے ہیں (2)“ انھوں نے کہا کہ درشن کو شروع کرنے کا مقصد تھا ”ذہنوں کو سدھارنا اور منہ پر علم کی ترویج میں مدد دینا“۔

ہمارا اثر میں مغرب کی لبرل تعلیم کی پہلی پید اور تھے بال شاستری۔ وہ صرف 34 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اُن کی عمر نے وفا نہیں کی۔ اور اُن کی ذہنی صلاحیتیں پوری طرح نشوونما نہ پاسکیں۔ لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انھوں نے مغربی تعلیم کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے سماجی اصلاح کا کام بھی کیا۔ بیواؤں کی شادیوں، عورتوں کی تعلیم اور دوسرے مذاہب اختیار کر لینے والوں کی دوبارہ ہندو دھرم میں شامل کرنے کی وکالت کی۔ لیکن بال شاستری اور اُن کے ساتھیوں نے اپنی روایت کو ترک نہیں کیا۔ انھوں نے ایسی تبدیلیوں کی سفارش کی جو طریقہ کار اُن مذہبی حکام کے مطابق بنادیں جن کو رواجوں کے دباؤ میں آکر بھلا دیا گیا تھا۔

شدت پسند

نئی تعلیم پانے والوں میں شامل کچھ باغی اُن اعتدال پسند اصلاحات میں مطمئن نہیں تھے جن کی وکالت شاستری کا کتب فکر کرتا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ قدیم ہندو روایت اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ جدید ضروریات کے مطابق قدیم روایتوں کی تشریح کو وہ غلط اجتہاد سے تعبیر کرتے تھے۔ عیسائی مذہب کی اخلاقی تعلیمات سے وہ متاثر تھے۔ چونکہ کائنات کا خالق خدا ہے۔ اس لیے کرشن، بودھ، یسوع اور محمد اُس کے شارح ہیں۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا میں انسان کا صرف ایک مذہب ہونا چاہیے۔ جس کی بنیاد ہوں تمام مذاہب کی اخلاقی تعلیمات۔ رام بال کرشن جیکر، وادو باپنڈو رنگا تارکھڑ اور اُن کے بھائی آتمادام پنڈورنگا نے 1850ء کے لگ بھگ بمبئی میں پرمنس منڈلی قائم کرنے میں پہل کی۔ اس انجمن کے بنیادی اصول تھے خدا کی وحدانیت اور انسانی برابری۔ منڈلی فرد کے اخلاق کو سدھارنے میں دلچسپی لیتی تھی اور قدیم رواجوں اور رسموں کی مذمت کرتی تھی۔ انسانی زندگی کے رہنما اصولوں کی حیثیت سے یہ خیرات سیائی سے پیار، پاک بازی اور رواداری پر زور دیتی تھی۔ حالانکہ وہ متاثر تو تھے عیسائی مشنریوں کے کام سے۔ مگر وہ اپنا پیغام

پھیلاتے تھے مرہٹہ سنتوں کی زبان میں۔ لیکن اس کے اراکین رسوائی سے خائف تھے۔ اور خفیہ طور سے کام کرتے تھے۔ اس تحریک کی آزاد فلسفیانہ بنیاد کبھی نہیں بن سکی۔ اور وہ عیسائی رسوم کی ضرورت سے زیادہ نقل کرتے رہے۔ اس کے بانیوں میں مشنریوں کی طرح کا کردار اور لگاؤ نہیں تھا۔ اور عام لوگ ان کی طرف سے مشکوک ہو گئے۔ 1818ء میں یہ انجمن ختم ہو گئی۔

مہاراشٹر میں سماجی اصلاح کے ایک بلند قامت جیمین تھے۔ گوپال ہری دیش لکھ جو اپنے اس نام سے زیادہ مشہور ہوئے جو وہ تحریک میں استعمال کرتے تھے۔ یعنی ”لوک ہت وادی“۔ 1833ء میں وہ ایک چھوٹے سے جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور زوال پذیر حالات کے تحت پوتائیں پرورش پائی۔ شہر کی پمیلی ہوئی خوشحالی ختم ہو چکی تھی۔ اور برہمنوں اور جاگیرداروں کا خصوصیت کے ساتھ برا حال تھا۔ بالائی طبقوں میں اس پر بحث ہوتی رہتی تھی کہ انگریزی حکومت ہمیشہ قائم رہے گی یا چوتھا ایک دفعہ پھر حکمران بنے گا۔ سماج میں قسمت پر شاکر رہنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے بے حسی پیدا کر دی تھی۔ ”لوک ہت وادی“ کے سپرد فطرت نے یہ کام کیا کہ وہ ان بے معنی تصورات اور بچکانہ خوابوں کو ختم کریں۔ لوگوں کے اندر خود کفالت اور نئی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کریں اور ان میں عقل پرستی اور برطانوی فحش کی اہمیت کو سمجھنے کا احساس جگائیں۔

گوپال ہری بنی منزل اور مغربی تعلیم کے پیداوار تھے۔ پونا کے نئے گورنمنٹ اسکول کے وہ ایک ذہین طالب علم تھے اور انھوں نے انگریزی اور تاریخ میں مکمل دسترس حاصل کر لی تھی۔ جس وقت وہ کن کے سرداروں کے ایجنٹ کے عہدے پر فائز تھے اُس زمانے میں انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور 1852ء میں منصف مقرر ہوئے۔ 1856ء سے 1861ء تک وہ انام کمیشن میں اسٹیٹ کنشٹر کے فرائض ادا کرتے رہے۔ اُس کے بعد انھوں نے احمد آباد اور ناسک میں جج کی حیثیت سے کام کیا۔ 1876ء میں انھیں دہلی دربار میں مدعو کیا گیا۔ 1878ء میں یونیورسٹی کے فیلو کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ اور 1880ء میں وہ گورنر کی کونسل کے رکن مقرر کئے گئے۔ 1884ء میں تقریباً ایک سال تک انھوں نے ریاست رستام کے فرائض ادا کئے 1892ء میں ان کا انتقال ہوا۔

1828ء سے گوپال ہری نے ہفتہ وار اخبار پر بھاکر میں اُس زمانے سماجی اور سیاسی مسائل پر مضامین لکھنے شروع کئے جو ”شت پرن“ یا، سو خطوط کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا مقصد تھالوگوں کو نیند سے جگانا۔ انھوں نے نئی تعلیم حاصل کرنے اور ملک کے مسائل کو حل کرنے پر زور دیا۔ اُن کے مضامین فکر انگیز ہوتے تھے۔ اور بہت پڑھے جاتے تھے۔ 1877ء میں انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا ”جانی بھید“ اس میں ذات پات کی مذمت کی گئی تھی۔ انھوں نے گیتا کی تعلیمات کو مقبول بنانے کے لیے 1878ء میں گیتا تبو اور سو بھاشائے کیں۔ 1880ء میں ہندوؤں کی مذہبی رسوم کی تنقیدی وضاحت کرنے کے لیے انھوں نے سوادھیا اور ایشو لیا ناگرہید سو تر لکھے۔ گرامر چنایا گاؤں کا نظام میں انھوں نے گاؤں کے حالات کا جائزہ لیا۔ تاریخ اور تاریخی تفتیش و تحقیق میں اُن کی دلچسپی کی مظہر کتابیں ہیں۔ تاریخی قصے اور متفرق اطلاعات (تین جلدیں)، راجستھان کی تاریخ، گجرات کی تاریخ، سورا شتر کی تاریخ اور سری لنکا کی تاریخ گجرات کی تاریخ کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل ہے جس میں برطانوی حکومت کا مقابلہ دینی حکومت سے کیا گیا ہے اور اُن کی تقابلی اچھائیوں سے بحث کی گئی ہے۔

”لوگ بہت دہلے“ سماجی اصلاح کی وکالت کرتے تھے۔ اُن کے قریبی روابط مغربی ہندوستان کی پراختیا سماج، آر۔ یہ سماج اور تھیوسوفیکل تحریک سے تھے۔ وہ عورتوں کے حقوق کی حمایت کرتے تھے۔ تعلیم نسوان کا حامی تھے۔ مہاراشٹر کے دو اہم اخبار دیانند پرکاش اور اندھ پرکاش اور گجرات کے بچے کی انھوں نے بڑی بہت افزائی کی دکن ورنارٹر اسٹیشن سوسائٹی اور گجرات میں اُس ہی کی طرح کی تنظیم کی بھی انھوں نے بڑی سرپرستی اور بہت افزائی کی۔ چندھرپور کے تپیم خانے کے بانی اراکین میں سے ایک وہ بھی تھے۔

”لوگ بہت دہلے“ مہاراشٹر کے وہ پہلے مصلح تھے۔ جنہوں نے قدیم عقیدوں اور قدیم رسموں کو چیلنج کیا اور اُن نے بنیادی تصورات اور نئی وفاداریوں کو صدق دل سے قبول کیا۔ جن کا تقاضہ بدلتا ہوا وقت کر رہا تھا۔ عام لوگوں کی بھلائی کے لیے اُن کی خواہش، اُن کی بے لوثی اور سچائی کے لیے اُن کے پیار نے مہاراشٹر کی تحریک اصلاح میں انھیں حقیقی پیش رو بنادیا ہے۔ ”لوگ بہت دہلے“ بالائی طبقوں کی جہالت، سستی اور خود غرضی سے نالاں تھے۔ اور اپنے مضامین میں اُن کی مذمت سخت لفظوں میں کرتے تھے۔

انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے اُن تھوڑے سے لوگوں میں اُن کا شمار تھا۔ جو جدید عہد اور اُس کو برقرار رکھنے والے بنیادی تصورات کی اہمیت سے واقف تھے۔ وہ پہلے انسان تھے۔ جنہوں نے مہاراشٹر کی شکست اور اُن کے سماجی زوال کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی انھوں نے بتایا کہ سماج کو اگر ترقی کرنی ہے، تو اُسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ انھوں نے برطانوی کامیابی کے اسباب کا تجزیہ کیا۔ ان کے مطابق انسان دوستی اور سماجی خدمت اور طاقتیں تھیں جو برطانوی حکومت کی بھائی فاسن تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان بھی اُن کو قبول کرے۔ ماضی کا بھاری بوجھ اُن کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ پرانی وفاداری مضر ہیں۔ پرانے طبقے سماجی دولت میں اضافہ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن انگریزی حکومت کو پسند کرنے کے باوجود انھوں نے اُس کی عملی خرابیوں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیں۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگوں میں شراب خوری کی بڑھتی ہوئی لٹ کی ذمہ داری حکومت پر ہے“ (1) اسی طرح حاصل لگانے اور انصاف کے تعلق سے پورچوں کی طرف امتیازی رویہ اختیار کرنے پر بھی انھیں اعتراض تھا۔“ (2) ہندوستان کے لوگوں کی سیاسی توقعات پر بحث کرنے کے تعلق سے وہ اپنے وقت سے بہت آگے تھے۔ ”اُس ملک کے رئیس اور غریب سب کو مل کر ملک کے سامنے یہ عرضداشت پیش کرنی چاہئے کہ موجودہ حکومت لوگوں کی خوش حالی کی طرف غفلت برت رہی تھی۔ انگریزی اور ہندوستانی میں بہت اور پرانی تعلیم بے سود تھی۔“ اُن کی رائے میں ترقی کی پہلی شرط یہ تھی کہ معقول اصولوں اور مغربی سماجی قدروں کی بنیاد پر ہندوستانی سماج کی تنظیم نو کی جائے لیکن ہندوستان میں سماج اور معاشی زندگی اور اخلاق مذہب کے تابع تھے چنانچہ اُن کی کوشش یہ تھی کہ مذہب کو دنیاوی امور سے علیحدہ رکھا جائے۔ ”یہاں کے لوگوں کے عجیب و غریب خیالات ہیں۔ وہ تمام سماجی رسم و رواج کو مذہب سے جوڑ دیتے ہیں۔ خدا کی محبت اور کپڑے پہننا بھی مذہب ہے“ (3)

انھوں نے اگر برطانوی حکومت کو قبول کیا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جمہوری حکومت کے

(1) ایضاً، صفحہ 264۔

(2) گجرات کی تاریخ، ”لوگ بہت دہلے“ صفحہ 38۔

(3) شپٹرن، مڈن ایس۔ آر۔ کیلکر (1940)، صفحہ 71۔

اصولوں پر قائم تھی۔ جس میں انھیں ملک کی نجات نظر آئی۔ بہت زیادہ مایوسی پائی جاتی ہے۔ اس مایوسی کو دور کرنے کے لیے ہندوستان میں ایک پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ اس میں ہر شہر اور ہر ضلع کے دو نمائندے ہوں۔ اُن کا انتخاب سب لوگ اپنی مرضی کے مطابق کریں۔ اس کی بنا پر اس ملک کے لوگوں کے خلاف برطانوی مصیبت ختم ہو جائیگی۔ اور حکومت میں ہم جیتی ترقی ہوگی لوگ مطلق العنان حکومت اور ذمہ دار حکومت کے فرق کو سمجھ لیں گے۔ سب کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ جمہوریت میں غریب اور امیر اونچی ذات اور نیچی ذات دونوں سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جانا چاہیے۔ اراکین کا انتخاب بلا امتیاز ذات کیا جانا چاہیے۔ چونکہ برہمنمغرور و متکبر ہوتے ہیں۔ اس لیے اُن کے نمائندوں کی تعداد کم ہونی چاہیے۔

”جب لوگوں میں سمجھ بوجھ پیدا ہو جائے گی۔ تو وہ برطانوی پارلیمنٹ کی طرح کی اسمبلی کا مطالعہ کریں گے۔ اور اُس کے بعد انگریز اس ملک میں تاجروں کی طرح رہیں گے۔“

”اگر وہ ظلم و زیادتی کریں گے یا ایسے قوانین بنائیں گے۔ جن کی لوگ مخالفت کریں گے تو جس طرح امریکہ کے لوگوں نے کہلوہ بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیں گے۔ اور انگریزوں سے نہیں گئے کہ وہ ملک سے چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں دو سو سال لگیں۔ لیکن اس آخری منزل کی متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ (1)

جس سیاسی مستقبل کی انھوں نے بشارت دی تھی۔ وہ محض خنیل کی پرواز نہیں بلکہ سوچ بچار کا نتیجہ تھی۔ جتنی کم حکومت ہو اتنی ہی لوگوں کے لیے اچھا ہے۔ انھوں نے کہا ”پس ماندہ ملک میں حکومت مطلق العنان ہوتی ہے یا پدری لیکن متمدن ممالک میں وہ لوگوں کی خادم ہوتی ہے۔“

ہمارے سماجی زوال کو انھوں نے سائنس اور تعلیم کو نظر انداز کرنے کے نتیجے سے تعبیر کیا۔ ”ہم وہی چکی استعمال کرتے ہیں جو دیاس کے زمانے میں استعمال ہوتی تھی۔ اور اس بل سے زمین جوتے ہیں جس سے پائو کے زمانے میں جوتی جاتی تھی۔ (2)۔ برہمنوں کی کاہلی کی انھوں نے مذمت کی ”بھٹ (پجاری) محض ناکار لوگ ہیں۔ وہ خیرات پر زندگی گزارتے ہیں اور ہمارے سماج میں اس کو قابل قدر سمجھا جاتا ہے یہ دولت کو برباد کرتا ہے۔ اس طرح ہم بے وقوف مدعیان علم کی حمایت اور جہالت کی ہمت افزائی کرتے ہیں اس سے بہتر ہے کہ ان لوگوں کو درزی یا بڑھی کے حرفے کی تربیدی جائے۔ اس کے بعد وہ باعزت زندگی گزار سکیں گے۔“

اُن کی رائے میں ”شکرت پڑھنا فضول ہے۔ اس سے ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ہال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ وہ انسان کو کال بنا دیتی ہے۔ اور بے مقصد کاموں میں الجھا دیتی ہے۔ اُس کے پاس وہ علم نہیں ہے جس کی جدید عہد کو ضرورت ہے۔ (3) انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا کہ اُس علم کا خیر مقدم کریں جس کے ذریعہ انگریزوں نے اپنے ہندوستانی مخالفین پر فتح پائی۔

انھوں نے قدیم مذہبی عقائد اور رواجوں پر حملے کئے۔ انھوں نے کہا کہ سماجی روپے پر استدلال اور سماجی افادیت کے اصولوں کا اطلاق کیا جانا چاہیے۔ قدیم ہندو سماجی نظام میں فرد سماجی فرائض کے نتیجے دبا

(1) ایسا صفحات 79-80

(2) ایسا صفحہ 109

(3) ایسا صفحات 146, 148, 150

ہوا تھا۔ ”لوگ بتا دی“ چاہتے تھے۔ کہ فرد کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے اور اپنی عقل اور مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

انھوں نے ملک کی بڑھتی ہوئی غربت کے مسئلہ پر بھی توجہ دی۔ ”ملک میں غربت و افلاس بڑھتا جا رہا ہے اور لوگوں کے لیے روزگار حاصل کرنا دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کی وجہ سے ملک کی صنعت و تجارت کی تباہی۔ انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک اس ملک میں مال بیچتے ہیں اور چونکہ وہ سستا ہے اس لیے لوگ اسے خریدتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس امر کا عزم کر لیں کہ بدیسی مال کے بجائے سودیشی مال خریدیں گے، یہاں بنائے جانے والی چھتریاں استعمال کریں گے تو ملک کے باسیوں کو روزگار مل جائے اور وہ خوش رہیں۔ ہندوستانوں کو صرف مصنوعات فروخت کرنی چاہیے اور خام مال بیچنے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس وقت یہاں کے لوگ باہر کا مال خریدتے ہیں۔ اور اپنے دست کاروں کو قاتل دیتے ہیں۔ انگریز ہماری منڈیوں میں شیشے کا سامان، کپڑا، کانٹے وغیرہ گھڑیاں اور مشینیں بیچتے ہیں۔ ہمارے دستکاروں کو یہ چیزیں بنانا سیکھنا چاہیے۔ اور گھریلو صرف کے بعد جو کچھ بیچے ہیں اس کو برآمد کرنا چاہیے۔ ہمارے مال انگلستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی جانا چاہئے۔ اس طرح ہم اپنی صنعتوں کی مدد کر سکیں گے اور سب کو روزگار مہیا کر سکیں گے۔ (1) ہم کہہ سکتے ہیں۔ ”لوگ بتا دی“ ایک طرح سے راناؤے اور جوشی کے پیش رو تھے۔ جنہوں نے مہاراشٹر میں سودیشی کی تحریک کو جنم دیا۔

اپنی ایک تحریر میں انھوں نے اپنے مسلک کی مندرجہ ذیل وضاحت کی۔

- (1) ہر شخص کو خلوص قلب میں خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔
- (2) مذہب میں داخل کرنے، شادی اور موت کی رسموں کے علاوہ تمام دوسری رسمیں ختم کر دینی چاہیے۔ اپنی زبان میں رسمیں ادا کی جائیں اور دعائیں پڑھی جائیں۔
- (3) ہر شخص کو اپنے رائے کے مطابق عمل، تقویٰ اور تحریر کی آزادی ہونی چاہیے۔
- (4) سماجی اور مذہبی معاملات میں عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں۔
- (5) رسم کی ادائیگی سے زیادہ اہم ہے اخلاق۔
- (6) کسی شخص کے ساتھ عقارت کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ ذات کی بنیاد پر غرور مستحق ہے۔ سب لوگوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا جائے۔ سب کے ساتھ اچھائی کی جائے۔
- (7) وطن کی محبت اور ملک کی بھلائی کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔
- (8) لوگوں کے حقوق حکومت کے حقوق سے برتر ہیں۔
- (9) حکومت کے ضوابط اور عقل کے قواعد کی پابندی کی جانی چاہیے۔
- (10) ہر شخص کو علم کے فروغ کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔
- (11) انسانی کردار کا ہمیشہ برقرار رہنے والا اصول ہونا چاہیے، ”چائی“ (2)

ذات پات کے نظام کے خلاف بغاوت

پیشواؤں کے دور حکومت میں برہمنوں نے مذہبی اور سماجی معاملات میں اور ملک کے انتظام میں غالب حیثیت حاصل کر لی تھی۔ کسانوں اور دست کاروں کو عداوت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کو عام طور سے ہنسیان مل چلانے والے اور ہڈیاں چبانے والے کہا جاتا تھا۔ برہمن اُن کے ساتھ کھاتے بیٹے نہیں تھے اور انھیں یہ اجازت بھی نہیں تھی کہ سماجی تقریبات میں وہ برہمنوں سے آزادی کے ساتھ مل سکیں۔ سنسکرت کی تعلیم برہمنوں کے لیے مختص تھی۔ وہ اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ مرہٹے بچے نئے اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں۔

یہ قدرتی امر ہے کہ انگریزی حکومت کے ابتدائی دنوں میں سماجی برتری کے برہمنوں کے دعووں کے خلاف محاسمانہ رویہ پایا جاتا تھا۔ جو تیار پھولے، جنہوں نے برہمنوں کے ان دعوؤں کے خلاف ایک طاقتور تحریک شروع کی 1828ء میں ایک مالی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ چلی ذات سے اُن کے تعلق نے اُن کی تعلیم میں بڑی رکاوٹیں ڈالیں۔ اُس کے بعد پندرہ سال کی عمر میں ایک عیسائی مشنری کی مہربانی اور مدد سے وہ تعلیم حاصل کر سکے۔ لیکن سماجی تقریبات میں برہمن اُن کی تذلیل کرتے تھے۔ اس توہین آمیز رویے نے جو تیار کو برہمنوں کے دعوؤں کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے ہندو دھرم کے متعلق پروفیسر ولسن اور سر ولیم جونس کی تحریریں پڑھنے پر اکسایا اُن کے مطالعے، ذاتی تجربے اور عیسائی مشنریوں کے ساتھ روابط نے انھیں اُس دور کے ہندو دھرم اور رواجوں کے خلاف تنقید پر آمادہ کر دیا۔

عام مخالفت کے باوجود انھوں نے اکیس سال کی عمر میں لڑکیوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔ 1854ء میں انھوں نے اچھوتوں کے لیے ایک اسکول شروع کیا۔ ہندو بیواؤں کی بے بسی اور دکھوں نے انھیں متاثر کیا اور انھوں نے تکلیفوں میں مبتلا بیواؤں کی مدد کرنے کی غرض سے ایک نئی خیم خانہ شروع کیا۔

لیکن اُن کی زندگی کا مقصد تھا برہمنوں کے اقتدار کو ختم کرنا۔ اُس کے لیے انھوں نے عام لوگوں کی تعلیم کی وکالت کی۔ تنقیدی کتابیں سارو جنگ ستیہ دھرم پشک اور غلام گیر لکھیں۔ اور برہمنوں کے خلاف منظم انداز سے سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے ستیہ شودھک سماج قائم کیا۔

پھولے کی تحریریں تنقیدی نہیں ہیں۔ اور انھوں نے جن نظریات کی تشکیل کی اُن کی بنیاد واقعات پر قائم نہیں ہے۔ لیکن اُن کی آواز پکچے ہوئے طبقوں کی کراہ ہے۔ جو صدیوں کے بعد اپنی حیثیت دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لیے پھولے نے یہ مضحکہ خیز مشورہ دیا کہ ایسے انگریز اور اسکاچ مشنری جو مرہٹی زبان جانتے ہیں گھوٹ میں سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کئے جائیں تاکہ وہ گھوٹ کے گلہروں اور دوسرے برہمن حکام پر نظر رکھیں۔ اور ہر سال حکومت کو رپورٹ بھیجیں۔ اُن کا اصلی کام تھا عام لوگوں کو بیدار کرنا۔ اور پجاری طبقے کے غیر معمولی دعوؤں کی منظم حراست پر انھیں آمادہ کرنا۔ آج سے ایک صدی پہلے سماجی بغاوت کا تصور مایوسی کا پیدا کردہ جرات مندانہ عمل تھا۔ جس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت تھی۔ یہ ہے پھولے کی عظمت کا راز اُن کے مقصد کی وضاحت ستیہ شودھک سماج کی ایک رپورٹ کے اس اقتباس سے ہو جاتی ہے۔ ”ہزاروں سال سے اپنی کتابوں کی مدد لیکر برہمن عام لوگوں کو کم تر قرار دے رہے ہیں۔ اور اُن کا استعمال کر رہے ہیں ستیہ شودھک سماج کا قیام 24 ستمبر 1873ء کو عمل میں لایا گیا تاکہ عام لوگوں کو پروہتی اقتدار کی

غلامی سے نجات دلایا جائے۔ اور انھیں تعلیم دے کر اُن کے اندر اُن کے حقوق کا احساس پیدا کیا جائے۔“
 ہو سکتا ہے کہ جو تپا پھولے کے دل میں تحریک برہمن پجاریوں کے خلاف اُن کی شدید نفرت کا نتیجہ ہو۔ لیکن اُن کی کتابوں سے نفرت ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ انھوں نے مرد کو وہ قدر بخشا جو ذات پات کے نظام نے اُس سے چھین لیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا ”تمام انسان ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں پھر کوئی ایک ذات اپنے کو دوسری ذاتوں سے برتر کیوں سمجھے۔ وہ پہلے شخص تھے جس نے ہندوستانی تنظیم میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جو ذاتوں کی بنا پر فرقوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ غیر برہمن اور اچوت میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ وہ غریبوں کو اتنا عزیز رکھتے تھے کہ جب ڈپوک آف پارک سے ملے تو اُس وقت ایک لنگوٹی میں تھے۔ تاکہ انھیں غربت و افلاس میں جلا کسانوں کا صحیح نمائندہ تصور کیا جائے۔“

پارسی فرقے میں اصلاح

برطانوی مائٹری بنا پر مغربی ہندوستان میں پہلچ پیدا ہوئی۔ وہ محض مرہٹوں تک محدود نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کو سب سے پہلے پارسیوں نے خسوس کیا جن کے انگریزوں کے ساتھ تجارتی روابط زیادہ پُرانے تھے۔ چونکہ ذات اور کھانے پینے کے معاملے میں وہ چھوت چھات سے آزاد تھے۔ اس لیے وہ نئے نئے آنے والے بدیہیوں کی خدمت منڈیوں کے علاوہ اپنے گھروں میں کرتے تھے۔ انگریز کا ملازم ہی نہیں پارسی اُس کا بانیان بھی بن گیا۔ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان بچو لیے کے فرائض ادا کرنے لگا۔ اور بعد میں مغربی اور مشرقی تجارت میں کمیشن ایجنٹ بن گیا۔ انگریزوں کے ساتھ اپنے روابط کی بنا پر پارسیوں نے ابتدا ہی سے انگریزی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ ابتدائی دنوں میں القسطن انٹرنیٹ کی مختلف جماعتیں پارسیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مشنریوں نے جو کالج اور اسکول شروع کئے تھے۔ اُن میں بھی اُن کی تعداد بہت تھی۔

اس فرقے میں بڑھتی ہوئی انگریزی تعلیم کے انکسارات سماجی اصلاح کی تحریک اور اُن کی سیاسی دلچسپیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بمبئی میں شائع ہونے والا پہلا اخبار یہی سماچار ایک پارسی نے شروع کیا۔

1828ء میں دوا بھائی نوروجی کی صدارت میں اسٹوڈینٹ لٹری ایریز سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ہفتہ وار جلسوں میں ادبی، سائنسی اور سماجی موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔ اس انجمن کی ہندوستانی زبانوں کی دو شاخیں تھیں۔ دوا بھائی گجراتی شلخ کے صدر تھے۔ اور انجمن کے مباحثوں کو دنیا پر اسلک میں شائع کرتے تھے۔ ان جلسوں میں سماجی سوالوں پر بڑی گرمگرمی کے ساتھ بحث کی جاتی تھی۔ دوا بھائی نے اپنے پارسی دوستوں کے ساتھ مل کر لڑکیوں کے کئی اسکول بھی شروع کئے جو اُس زمانے میں بڑی عجیب بات سمجھی جاتی تھی۔

ہندوستان میں مدتوں تک رہنے کی وجہ سے پارسیوں نے بہت سے ہندو رواج اختیار کر لیے مثلاً ہولی پر تاریل نذر دینا۔ یا ہنومان پر تیل کے پیالے چڑھانا۔ نئے اثرات کے تحت وہ ہندو رواجوں سے بچھا کٹانا چاہتے تھے۔ اور انھوں نے حقیقی زرتشتی مذہب کی تلاش شروع کی۔ اس مذہب ہی اصلاح کی انجمن کا مقصد، جس کا قیام 1851ء میں عمل میں آیا زرتشتی مذہب کی اصل شکل کو بحال کرنا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے زنداوستا کے مطالعے اور مذہبی تحریروں کی تحقیق کی ہمت افزائی کی گئی۔

گجراتیوں میں سماجی اصلاح

گجراتیوں کے بھائیافرتے نے نئی تعلیم اور اُس کی بنا پر جنم لینے والے نئے تصورات میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ لیکن اصلاح کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ دو شتو اور دلجو آچاریہ کے پیرو تھے۔ اور اپنے ”مہاراجوں“ یا مذہبی رہنماؤں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اُن مہاراجوں کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ اس لیے کہ وہ اپنے پیروؤں کو بُت کے حضور میں حاضر نہ ہو سکے سے لے کر برادری سے خارج کرنے تک کی سزا دے سکتے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ بھگوان کرشن کے اوتار میں۔ اور اپنے پیروؤں کی نجی زندگیوں پر انھیں بڑا اختیار حاصل تھا۔ اُن کے منہ اوباشی اور عیاشی کے مرکز بن گئے تھے اور اُن کے تحت مطالبوں نے اُن کے پیروؤں کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ جیسا کہ دلا باری نے کہا تھا۔

دو شتو مہاراج ”کھونا سکھ ہے۔ اُن دانش ور خواتین کے محلوں میں اُس کا حکم چلتا ہے جن کے شوہر بڑے روشن خیال ہوتے ہیں۔ مہاراجہ دوسروں سے فائدہ اٹھانے کے اعلیٰ ترین تخیلات رکھتا ہے۔“ اس کے بعد وہ مختلف قسم تپسیوں وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ یعنی اُس کے کوڑے اور لاتیں کھانے اور اُس کے ساتھ نہ سن کر لد اکرنے کی فیس۔^(۱)

الفنٹن انٹرنیٹ کے طالب علم اور لٹرییری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی کے رکن کرشن داس نے بھی مہاراجوں کو بے نقاب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اُس نے پہلے تو سماجی اصلاح کے حلقے راست گفتار میں مضامین لکھے۔ اور اُس کے بعد خود اپنا اخبار ستیہ پرکاش شروع کیا۔ اُس نے اُن کی ”پیشروی، چالاکی، بے حیائی، بد معاشی اور دھوکے بازی“ کا بھانڈا پھوڑا۔ کرشن داس کے خلاف ازالہ حیثیت عربی کا دعویٰ کیا گیا۔ چیف جسٹس نے ہنگ عزت کو تسلیم کیا۔ لیکن اُس کے جواز میں جو کہا گیا تھا اسکو صحیح قرار دیا۔ جج اور عام لوگ کرشن داس کی ہمت اور جذبے کے مداح تھے۔ اُس نے ایک مثال قائم کر دی تھی۔ جس سے متاثر ہو کر اور لوگوں نے بھی گجراتیوں کی اصلاح کا کام شروع کر دیا۔

چنانچہ پیشواؤں کی حکومت کے ختم ہونے کے چالیس سال کے اندر ایک نئی تہذیب شکل اختیار کرنے لگی۔ پرانے نظام کی گرفت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک نئی معیشت رفتہ رفتہ ملک میں تبدیلی آ رہی تھی۔ ریل کی پٹریاں بچھائی جا رہی تھیں۔ اور 1854ء میں بمبئی میں پہلا سوتی کارخانہ شروع ہو چکا تھا۔ ان تبدیلیوں کے اثرات آئندہ برسوں میں رونما ہوئے۔

کسی بھی سماج میں اُبھرنا یا طبقہ بدلتی تہذیب سے نئے تصورات آسانی کے ساتھ آمد کر لیتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ تصورات پوری طرح قبول کئے جائیں اُسے قدامت پرستوں کی مخالفت کا سامنا کرنے اور اُس پر قابو پانے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ زیر مطالعہ دور میں (1818 لغایت 1857ء) مہاراشٹر میں قدامت پرستوں کے قدم اتنے جیسے ہوئے تھے کہ ”مغربی تعلیم کے خطرے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ 1857ء کی شورش کے بعد ہی، جب قدیم سیاسی نظام جل کر خاک ہو چکا تھا۔ مرہٹہ سماج میں ترقی پسند عناصر کو قدیم دبستان فکر سے لچکیا لیا پڑا۔

ساتواں باب

ہندوستانی قوم پرستی کا معاشی پس منظر

I-ہندوستانی معیشت پر برطانوی اثر

1857ء کی بغاوت کے بعد کے پچاس سال میں قومی شعور میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ اُن میں ایک اہم عنصر تھا۔ ہندوستانی معیشت میں ”جدید تصورات کی تفریق و توسیع“ ایک طرف تو ہندوستان کی معیشت کے کچھ شعبوں مثلاً تجارت، پار برداری اور مواصلات میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف اس کے اصل شعبے یعنی زراعت پر جمود طاری تھا۔ جوں جوں آبادی اور زمین پر بوجھ بڑھتا رہا ویسے ویسے ہندوستان کے عام لوگ دکھوں میں مبتلا ہوتے گئے جو قلت اور قحط کے زمانوں میں بڑی شدت اختیار لیتے تھے۔

دیہات کے لوگوں کو جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اُن کا معثر اثر داخلی تجارت پر پڑتا تھا۔ اور تاجر، بنک کار اور دیکلوں کی طرح چمٹے دارانہ طبقے بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے تھے۔ دیہات کی بے چینی سیاسی شعور رکھنے والے شہریوں تک پہنچتی تھی۔ جو اس کے خلاف آواز اٹھاتے تھے اور معاشی پالیسیوں اور انتظامی طریقوں کو بدلنے کے لیے حکومت پر زور ڈالتے تھے۔

تجارت اور صنعت میں کچھ ترقی ضرور ہوئی جو معیشت میں مقابلہ کم تر حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن ترقی کی رفتار سست اور غیر متوازن تھی۔ انگریز زیادہ تر ریلوں اور باغات میں سرمایہ لگاتے تھے۔ ریلوں کی حد تک اُن کا اصل مقصد تھا فوجی ضرورت پوری کرنا اور استعماری معیشت کو تقویت پہنچانا۔ باغات کی صنعت پر بڑی حد تک یورپیوں کی اجارہ داری تھی۔ جو زیادہ تر منافع کھاتے تھے۔ سوئی کپڑے کے علاوہ بڑی صنعتوں پر توجہ نہیں دی گئی اور اس لیے انہوں نے ترقی نہیں کی۔ اس کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام تک ایک لاکھ سے زیادہ آبادی والے شہروں میں رہنے والے لوگوں کی مجموعی تعداد کل آبادی کی 32 فی صدی تھی۔ شہری آبادی میں امریکہ سے ہندوستان تقریباً 75 سال پیچھے تھا۔ داخلی اور خارجی تجارت کا فروغ برطانوی اور ہندوستانی تاجروں کے تعاون اور ایسی کاروباری تنظیموں کی ترقی کا نتیجہ تھا جنہوں نے سرمایہ دارانہ پیداوار کو بڑھلادیا۔ مثلاً کپاس صاف کرنا بدیسی تجارت کے اضافے نے ہندوستانی معیشت کی استعماری شکل کو زیادہ واضح کر دیا۔ انگلستان سے مشینیں سے بنے ہوئے سامان کی درآمد میں اور خام مال کی برآمد میں بڑا اضافہ ہو گیا جس میں بڑی مقدار میں غذائی اجناس شامل ہوتی تھیں۔

اس تجارت میں حصہ لینے والے ہندوستانی منافع کھاتے تھے۔ اُن کا تعلق سرمایہ دار طبقے سے تھا۔ جس کی دولت نور اثر بڑھتا گیا۔ اُس طبقے کی خواہش تھی کہ صنعتوں کو ترقی دے اور ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے کام میں اپنا سرمایہ لگائے۔ برطانوی سامراجی مفادات اُس کے راستے میں رکاوٹ ڈال رہے

تھے۔ جس کی بنا پر اُسے حکمرانوں کے غلوں نیت پر شبہ ہونے لگا۔ کچلے ہوئے عوام کے ساتھ اُس کو جو ہمدردی تھی۔ اُس کی بنا پر وہ اُس نظام سے دل برداشتہ ہو گیا جس پر وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے دکھوں کی ذمہ داری تھی۔

انگریزوں نے جن تکنیکی تبدیلیوں کو رواج دیا اُن کی بنا پر قومی معیشت وجود میں آگئی۔ یعنی ایک معاشی نظام کے تحت ہندوستان متحد ہو گیا۔ اس تبدیلی کی بنیاد تھی، مواصلات اور بارداری میں نئے طریقوں کو رائج کرنا۔ ریلوں اور تار برقی نے نہ صرف شہری کاروباری مراکز کی سرگرمیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ بلکہ دیہی معیشت کی بھی شکل بدل دی۔ ہندوستانی گاؤں میں جٹولہ اشیاء کی جگہ زر کے ذریعے خرید و فروخت کی جانے لگی۔ اپنی گذر بسر کے لیے کاشت کرنے کے طریقے کو چھوڑ کر منڈی کے لیے پیداوار کی جانے لگی۔ اور صدیوں پرانی خود کفالت کے بجائے پورے ملک میں پھیلی اور پوری دنیا میں پھیلی منڈیوں پر اشیائے صرف خریدنے اور اور گاؤں کی پیداوار بیچنے کے لیے انحصار کیا جانے لگا۔

عام حالات میں ان تبدیلیوں سے ملک کو فائدہ پہنچنا چاہیے تھا۔ اور لوگوں کو خوش حال ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دو وجوہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کا یہ عام تجربہ ہے کہ جدید اور انجان تھنیکوں، طریقوں اور معاشی تنظیموں کو اگر بیک رائج کر دیا جائے تو ابتدائی مرحلے میں قدم طرز زندگی نئے حالات سے سمجھوتا نہیں کر پاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ استعماری معیشت کی نمایاں خصوصیت ہے محکموں کا استعمال۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جس نئی معاشی تنظیم کو رواج دیا وہ بعض پیداواری نوعیت کی نہیں تھی۔ نئی تبدیلیوں سے فوائد بدیسیوں نے حاصل کئے یعنی حکمرانوں، صنعت کاروں، اصل کاروں نے یا پھر اُن ہندوستانیوں نے جن کا تعلق دولت مند طبقات سے تھا۔ اور جو بدیسی اور گھریلو تجارت، لیکن دین کے کاروبار اور ملک کے انتظامی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ کسانوں، دست کاروں، کھیتیہ مزدوروں اور شہری مزدوروں پر بڑھتی ہوئی قیمتوں اور پھلتی پھولتی تجارت، صنعت کی لائی ہوئی خوش حالی کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن تبدیلیوں کی بنا پر اُن کے دکھوں میں اضافہ ہو گیا۔ اُس کے ثبوت میں واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں کہ 1860ء کے بعد ملک میں زیادہ قحط پڑے، دیہات میں قانون اور بیمار یوں سے بڑی تعداد میں لوگ مرے اور پورے ملک میں دیہی قرض بڑھ گیا۔ اُجرتوں کے مقابلے میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا اور آبادی تو بڑھتی گئی لیکن روزگار کے مواقع نہیں بڑھے۔ صنعت اور تجارت کے جدید شعبوں کی توسیع ہوئی لیکن ان پر بدیسی سرمائے کا غلبہ بھی بڑھتا گیا۔ ملک کا نظم و نسق بہتر ہو گیا۔ لیکن وہ قریب قریب پورا اکاؤر ابدیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ جو حکومت کے تمام شعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ حالانکہ قومی آمدنی میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن محاصل کا بوجھ بڑھ گیا۔ ہندوستانی معیشت کے ان متضاد رجحانات نے آبادی کے غریب حصوں کو بڑے دکھوں میں مبتلا کر دیا۔ اور متوسط طبقے اور خصوصیت سے تعلیم یافتہ لوگوں میں بے چینی اور سیاسی بے اطمینانی پیدا کر دی۔

II ہندوستانی معیشت کی ساخت

نئی معیشت کی عمارت اس بنیاد پر تعمیر کی گئی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ڈالی تھی۔ کمپنی کے دور حکومت میں ہندوستانی معیشت کے دیہی اور شہریوں دونوں شعبوں میں اس طرح کی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ 1892ء سے پہلے ہندوستان کی قومی آمدنی کے اندازے محض برائے قیاس لگائے جاسکتے ہیں۔ قابل اعتبار سالانہ حسابات کی عدم موجودگی میں یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اُس دور میں فی کس آمدنی بڑھی، کم ہوئی یا جوں کی توں رہی۔ 1892ء کے بعد کے زمانے کے قلعے سے بھی، جس کی قومی سالانہ آمدنی کے حسابات کا سلسلہ امریکہ کے ملین اور ہندوستان کے سیراٹیم نے تیار کیا ہے۔ عالموں میں اس پر اتفاق رائے نہیں ہے، کہ فی کس آمدنی جوں کی توں رہی، بڑھی یا کم ہوئی۔ دیکھئے کنزنس۔ ایس وغیرہ

Economic Growth Brazil, India and Japan مضامین از ڈنیل تھررر، ہندوستان کی پیداوار میں طویل المدتی رجحانات اور تکنیکی ڈیوس، ہندوستان کی معاشی ترقی کے سماجی اور نسلی پہلو۔ (ایکویسٹے 1866ء کے قلعہ بنگال کے متعلق ہنر کی رپورٹ 1780ء کے قلعے کے حالات سے 1866ء کے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہنر نے لکھا "بنگال کے موجودہ پور پچھلے قلعوں میں فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں انہیں روٹی کھلانے میں زمین اور منافع بخش تجارتی فصلوں کی مانگ بڑھ گئی۔ ان حالات کے نتیجے میں دیہی سرمایہ داروں اور زمینداروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جو زمین کے لگان اور کسانوں کو دیئے جانے والے قرض کے سود سے منافع کماتا تھا۔

کمپنی نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں تین قسم کی لگان داری کو رواج دیا تھا۔ لیکن وہاں لگان داری کا کوئی نظام سبکی ملک کے مختلف حصوں کے دیہی رشتوں میں انقلابی تبدیلیاں ہو گئی تھیں اور کمپنی کے دور حکومت کے اختتام تک دیہات میں ایک ناکارہ اور خون چوسنے والا متوسط طبقہ وجود میں آچکا تھا۔ جو درمیانی لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ نیا طبقہ دیہی قرضوں کے سود اور زرعتی زمین کے لگان پر گذر بسر کرتا تھا۔ لیکن زراعت کو ترقی دینے اور پیداوار بڑھانے کے لیے کچھ نہیں کرتا تھا۔ کمپنی کی حکومت کے دوران کسان کو زمیندار اور مہاجنوں کے مطالب سے نجات دلانے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ (1) اس کے لیسر مایہ داری کا ایک طبقہ موجود تھا۔ کسانوں کو بھوکا مارنے اور اُس کی زمین کو بیچ نہ ہونے کی وجہ سے غیر مزدور بنانے کے بجائے قرض دینے والے کھانے پینے کی لیے قرض دینے کو آمادہ رہتے تھے۔ اور زمیندار اس شرط پر لگان معاف کرنے کو تیار رہتے تھے کہ اگلی فصل کے موقع پر اُس کا ایک حصہ اُنہیں دیا جائیگا۔

بمبئی پریسڈنسی، پنجاب اور مدرا اس کے رعیت داری علاقوں میں جہاں حق ملیت کسان کو حاصل تھا۔ زمین مہاجنوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ دکن رائٹس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق 1850ء اور 1858ء کی درمیانی مدت میں دکن کی دیہی معیشت کی ایک اہم نوعیت تھی۔ ایک پھوٹے سے سرمایہ دار طبقے کی موجودیت کا کاروبار کرتا ہے۔ (رپورٹ پیرا گراف 46) شمال مغربی صوبجات کے متعلق 1861ء میں کرل پیر ڈاسٹھ نے لکھا۔ "رفتہ رفتہ دولت مند طبقہ وجود میں آرہے ہیں۔ اور زمین میں روپیہ لگانے کا

رہنجان ان طبقوں میں بڑھتا جاتا ہے۔ (شمال مغربی صوبجات کے خطہ کی رپورٹ (1861ء) حصہ دوم پیرا گراف 48)۔ مصنوعات کی برآمدی تجارت کو قسم کر کے مقامی دست کاروں اور شہری تجارتی کرنے کو برباد کر دیا گیا تھا۔ تجارت اور صنعت کے پھلتے پھولنے میں مرکز اپنی سابق خوش حالی اور اہمیت کھو چکے تھے۔ اور لوگوں کے روزگار سے محروم ہو جانے کی بنا پر ترک وطن کرنے کے نتیجے میں وہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں تبدیل ہو گئے تھے (1) ان کی جگہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی طرح کے نئے شہروں نے لے لی تھی۔ جو حکومت کے صدر مقام ہونے کے علاوہ یورپین نوآبادیات اور تجارت کے بھی مرکز تھے۔ ان شہروں میں کپہنی کے یورپین ملازموں اور بدیسی تاجروں کی سرگرمیاں زندگی کے مرکز بن گئی تھیں۔ حالانکہ ان کی تعداد کم تھی۔ پھر بھی ان شہروں کی آبادی معیشت کے غالب عنصر تھے یورپین۔ نوآبادیات دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح ہندوستان میں بھی استبدادیت کے پہلے مرحلے کی خصوصیت تھی بلوری ملک کے تجارتی سرمائے کے ہاتھوں ملک کا استحصال (2)

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک کی وسائل کو ترقی دینے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مغلوں عامہ کے کاموں اور خاص طور سے سڑکوں اور آبپاشی کی نہروں کو نظر انداز کیا گیا۔ ملک کی دست کاریاں تلو ہو چکی تھیں۔ جیسا کہ ٹامسن نے کہا تھا ہندوستان کی زمین کو معلوم ہوتا تھا کہ کسی کی بدعالمگہی ہے اور مال گزاری کی اونچی شرح قانون پر زمینداروں کا مظالم اور زراعت کو ترقی دینے کے کاموں کی طرف غفلت برتنے کی وجہ سے پیداوار روز بروز کم ہوتی تھی، جیکسن (3) کے الفاظ میں ”کمپنی اپنی سلطنت میں ایک مشرقی مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کرتی تھی۔ جو اپنی سلطنت کا استحصال کرنا چاہتا ہے، لیکن اسے ترقی نہیں دینا چاہتا ہے۔ ایک اہم معاشی فرق یہ تھا کہ ان چٹر کے مقابلے کی بنا پر سوتی کپڑے کی صنعت تباہ ہو گئی۔ صنعت سے زراعت کی طرف مزدور جانے لگے اور خود زراعت میں غذائی اجناس پیدا کرنے کے بجائے تجارتی اجناس پیدا کی جانے لگیں۔ زمین کا محصول نقد کی شکل میں لیا کر کے کاٹا پر کسان اس پر مجبور تھے کہ مال گزاری لیا کر کے کے لیے چاندی حاصل کرنے کی خاطر اپنی سالانہ پیداوار کا بڑا حصہ منڈی میں فروخت کرے۔“

1858 میں ہندوستانی معیشت ترقی کے بنیادی عناصر سے خالی تھے۔ زراعتی ترقی رکی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ کسان کے پاس زمین کو ترقی دینے اور زراعت کا جدید سامان خریدنے کے لیے وسائل نہیں تھے۔ زمین کی مالگاری لیا کر کے اور کبھی کبھی تو اپنی گذر بسر کے لیے بھی اسے مہاجن سے قرض لینا پڑتا تھا۔ تجارتی طبقوں کے پاس اتنی ہمت (4) تھی نہ وسائل کہ وہ بڑی بڑی صنعتیں شروع کرتے ان کی سرگرمیاں مقامی تجارت، انجمنی، دلالی، دوکاندازی اور مقامی بینکاری تک محدود تھیں۔ پہلے حکومت

- (1) نگر، جینری کی سینٹ جارج، ہندوستانی حکومت کی یادداشتیں جو سینٹ جارج نگر کے رپوزٹس نے انتخاب پر مشتمل ہیں۔ صفحہ 494۔
- (2) ٹمکٹ تہ Structured basis of India Economy، باب 4 مقابلہ نیچے دیے گئے۔ جی۔ ایچ۔ Economic Court policies of dualistic societies صفحہ 190 انڈونیشیا کی سر دہری معیشت کے نمونے رائے ذنی کر تے ہوئے پروفیسر پیو کے نے لکھا ہے کہ ابتدائی دور میں بلوری ملک کا تجارتی سرمایہ تھامس اس کا منتفی سرمایہ آئیہ اور آخر میں خود آبادی میں حال میں لگایا جانے والا سرمایہ، ہندوستان کے حالات بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔
- (3) جیکسن ایل۔ ایچ Migration of British Capital to 1875 صفحہ 209
- (4) دیکھا جائے گی کہ اس طرح کے کچھ مستحیات بھی تھے جنہوں نے پچھلی صدی کی پوٹھائی دہائی میں آئیہ کو نئے کان شروع کی اور شکر صاف کرنے کا جدید کارخانہ قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا۔

نے انگلستان کے مفاد میں بے دردی کے ساتھ ملک کا استحصال کیا۔ اس کے بعد اُس نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی جو تجارتیت کی ایک نئی شکل تھی اور جس نے ترقی میں رکاوٹ ڈالی اور استعماریت کو فروغ دیا۔ چنانچہ جب ”پھوٹ نکلنے کی منزل اور اُڑن کا سرِ حلہ“ آیا تو ہندوستان اپنی معیشت کی ساخت کی خرابیوں اور کمیوں کی بنا پر اور صنعتی ترقی کی راہ میں سیاسی طاقت کے ذریعے رکاوٹیں ڈالنے کی بنا پر بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ بدیسی منڈیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بدیسی تجارت کے فروغ کی بنا پر کچھ مدت بعد اس قسم کا موقع ہندوستان کو ملا تھا۔

III۔ صدی کے نصف آخر میں ہونے والی معاشی تبدیلیاں

1858ء کے ایکٹ کی رو سے جب حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج کو منتقل ہو گئی۔ تو اس کی بنا پر ہندوستانی لٹرم و نسق، حکمرانوں کے معاشی مقاصد اور پالیسیوں میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود تاج کو حکومت منتقل ہونے کے بعد کی نصف صدی میں ملک کے معاشی میدان میں بڑی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اس تبدیلی کی بڑی نوعیت یہ تھی کہ ہندوستان معیشت کے کچھ شعبوں کو جدید بنادیا گیا۔ اس کی وجہ سے سماجی تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کا بڑا اثر ہندوستانی تھیلے نظر پر پڑا۔ اُس زمانے میں تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے قومی جذبے کا سبب بڑی حد تک دو عنصر کہے جاسکتے ہیں۔ اُن میں سے ایک تھا۔ عام لوگوں کی بگڑتی ہوئی معاشی حالت اور دوسرا متوسط طبقات کی غیر اطمینانی۔ چنانچہ ہندوستان میں سیاسی شعور کی ابتداء اور فردِ فرد اور اُس کی خصوصی نوعیتوں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس معاشی منظر کا جائزہ لیا جائے جو برطانوی تاج کی حکومت کی پہلے پچاس سال میں نمودار ہوا۔

معاشی تبدیلی کی بڑی نوعیت یہ تھی کہ آہستہ آہستہ دولت کی پیداوار اگر بڑھی تو آبادی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اور دولت کی تقسیم اور زیادہ غیر مساوی ہو گئی۔ کچھ لوگ زیادہ دولت مند ہو گئے۔ لیکن اُن کی بہت بڑی اکثریت زیادہ افلاس اور دکھوں میں مبتلا ہو گئی۔ فی الجملہ حکومت کی پالیسیاں معاشی ترقی میں معاون نہیں تھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی پیداوار اور قومی آمدنی کیلئے زیادہ تر معزز تھیں۔ انہوں نے تجارت کو فروغ دیا۔ لیکن صنعت کاروں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ بچوں اور بدیسی اصل کاروں کو فائدہ پہنچایا۔ لیکن اصل پیداوار کرنے والوں کی حالت اور خراب کر دی۔ برطانیہ کے صنعتی سامراج نے ہندوستان کے ساتھ نوآبادی کا سا برتاؤ کیا۔ اور اُس کی معیشت کی ساخت استعماری نوعیت کی ہی بنادی اس نے ایک شیطانی چکر شروع کر دیا۔ جو استعماری نظاموں کی ایک نمایاں خصوصیت ہوتی ہے۔ ایک طرف تو اُس نے دیہی نظام کو جو بڑی حد تک غیر سرمایہ دارانہ تھا اور جس کی پیداوری صنعت میں اصل کاوی کرنے کے لیے ضروری فاضل سرمایہ نہیں کر سکتی تھی۔ غیر متحرک بنادیا اور دوسری طرف اُس نے جدید بڑی بڑی صنعتوں کے فروغ میں رکاوٹ ڈالی۔ سرمایہ داری سے پہلے کی پس ماندہ صنعت اتنی فاضل دولت نہیں پیدا کر سکتی تھی کہ وہ زراعت کو جدید بنانے اور صنعت نو کے لیے سرمائے کی محل اختیار کر سکے۔ جو

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روزگار فراہم کر سکے اور زمین پر بوجھ کم کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متوسط طبقے کی تعداد اور دولت میں تواضافہ ہوا۔ لیکن عام لوگ تکلیفوں اور دکھوں میں مبتلا رہے۔ اول الذکر کی سرگرمیاں مذہبی اور سماجی اصلاح، تعلیم، سیاست، فنون و ادب میں بڑھ گئی۔ لیکن عام لوگوں کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ وہ جہالت کے اندھیروں میں جھکتے اور بیماری اور قلت کے شکار تھے۔

اس تمام مدت میں (1858ء لغایت 1905ء) ہندوستان کی 90% فی صدی سے زیادہ آبادی گاؤں میں رہتی تھی۔ اس زمانے میں آبادی میں تقریباً 50 فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔ (1) لیکن مصنوعات کی صنعت اور غیر زراعتی پیشوں میں بڑھتی ہوئی تعداد کی تناسب سے روزگار کے مواقع نہیں بڑھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بڑھتی ہوئی تعداد کا سارا بوجھ زراعت پر پڑا جس میں عہد وسطی کی تکنیک استعمال کی جاتی تھی۔ اس نے جس صورت حال کو جنم دیا ہے وہ بالکل ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ”مغرب میں عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ محض زراعت سے فی مربع میل تقریباً 250 اشخاص سے زیادہ کی گذر بسر نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان کے بڑے بڑے دیہی علاقوں میں اوسطاً مربع میل 600 سے زیادہ اشخاص آباد ہیں۔ (2)

آبادی کا تقریباً 3/5 حصہ ملک کے پانچویں حصے میں آیا تھا۔ (3) دیہی صنعتوں کے زوال نے زمین پر بوجھ بڑھا دیا تھا۔ اس کی وجہ سے پیشہ وارانہ ذاتوں سے تعلق رکھنے والوں کو اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے کاشت شروع کرنی پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت غیر منافع بخش بن گئی۔ کسان کی زمین کے اوسط رقبہ میں تخفیف ہو گئی۔ اور بہت سے ہندوستانیوں کو افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس نصف صدی میں بار بار پڑنے والے تباہ کن قحط اس امر کا ثبوت ہیں کہ ملک کو روگ کھائے جا رہا تھا۔

IV زراعت اور کسانوں کی حالت

یہ بات بڑی عجیب ہے کہ جس وقت زراعت کے فردغ کے لیے سازگار حالات پائے جاتے تھے۔ کسان کی حالت خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ مثال کے طور پر زیر زراعت مجموعی رقبہ جو 92-1891ء میں اٹھارہ کروڑ ستر لاکھ ہیکٹر ہزار ایکڑ تھا۔ وہ 2-1901ء میں بڑھ کے انیس کروڑ نوے لاکھ اکتھ ہزار ایکڑ اور 11-1910ء میں بائیس کروڑ تیس لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ اس قسم کی اور زیادہ قابل زراعت زمین میں زراعت نہیں کی جا رہی تھی۔ کاشت کی جانے لگی۔ اور سیپائی کی سہولتوں یعنی کنوؤں اور نہروں کا اضافہ کیا گیا۔ اس کو بڑھتی ہوئی خوشحالی سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔ اور کچھ لوگوں نے کیا بھی۔ لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب میں یہ اضافہ کافی نہیں تھا۔ زیادہ بری بات یہ ہوئی کہ غذائی اجناس اور دوسری قسم کی فصلوں میں اس کی متصفانہ تقسیم نہیں کی گئی۔ حالانکہ 2-1901ء میں ختم ہونے والے دس سال میں اس رقبہ میں جس میں فصلیں بوئی گئیں۔ ایک کروڑ تیس لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہو گیا۔ لیکن غذائی فصلوں میں محض ستائیس لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ 1891ء اور 1911ء کی درمیان میں برسوں میں غذائی فصلوں میں 3 فی

(1) 1872ء میں آبادی 30 کروڑ 60 لاکھ تھی 1911ء میں بڑھ کے تقریباً 31 کروڑ پچاس لاکھ ہو گئی۔

(2) انیسے۔ ڈی۔ The Economic Development of India، صفحہ 40

(3) گیان چند Indian's Teeming Millions صفحات 90-91

صدی کی کمی ہو گئی۔ مندرجہ ذیل نقشے (1) سے ظاہر ہوتا ہے کہ غذائی فصلوں کی جگہ کس طرح غیر غذائی فصلیں لے رہی تھیں۔

نقشہ

برطانوی ہند میں زیر کاشت مجموعی رقبے میں مختلف فصلوں کے رقبے کا فی صد تناسب (اس میں برما شامل نہیں ہے)

پانچ سالہ مدت

1890-91	1895-96	1900-1	1905-6		
تا	تا	تا	تا	تا	تا
1894-95	1899-99	1904-5	1909-10	1910-11	1911-12
غذائی 81.3	81	80.4	79.4	79.3	78.2
تلہن 6	5.5	5.7	5.4	5.6	6.5
پس 1	1	1.1	1.4	1.2	1.4
کپاس 4.6	4.4	5.1	5.7	5.9	6

لیکن کل ہند اعداد و شمار سے پوری کہانی نہیں معلوم ہوتی ہے، کچھ صوبوں میں غذائی فصلوں کی جگہ تجارتی فصلیں اتنی زیادہ بوئی جانے لگیں کہ ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ مثال کے طور پر شمالی اور مشرقی بنگال میں 1890-91ء اور 1894-95ء کی درمیانی پانچ سالہ مدت میں وہ رقبہ جس میں غذائی فصلیں بوئی جاتی تھیں 71.48 فی صدی تھا۔ 1911-12ء میں گھٹ کے 67.7 فی صدی ہو گیا۔ اور جس میں پٹ سن بویا جاتا ہے وہ اسی مدت میں 11.28 فی صدی سے بڑھ کے 14.1 فی صدی ہو گیا۔ جنوبی مدراس میں غذائی فصلوں کا رقبہ 82.78 سے گھٹ کر 76.8 فی صدی رہ گیا۔ اور تلہن کی کاشت کا رقبہ 6.71 سے بڑھ کے 10.6 فی صدی اور کپاس کا 4.8 سے بڑھ کے 7 فی صدی ہو گیا۔ اسی طرح سندھ میں 1894-95ء میں ختم ہونے والی پانچ سالہ مدت میں کپاس کی کاشت کا علاقہ 3.06 فی صدی تھا۔ جو 1911-12ء میں بڑھ کے 10.3 فی صدی اور برابر میں 33.6 سے بڑھ کے 46.1 فی صدی ہو گیا تھا۔ (2) اس میں شک نہیں کہ تجارتی فصلوں کی مانگ اور پیداوار کی بنا پر ان فصلوں کی علاقوں کے کسان زیادہ خوش حال ہو گئے تھے۔ لیکن ملک کو اس کی قیمت غذائی قلت اور غذائی اجناس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی شکل میں ادا کرنا پڑی۔ گھتتیر مزدور طبقہ کو جن کی تعداد بڑھ رہی تھی اس کی نتیجے میں بڑے دکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔

زراعتی پیداوار اور اس سے آمدنی میں زیادہ اضافہ نہ ہونے کی ایک وجہ اور بھی تھی پنجاب کی بڑی آراضی اور ملک کی ایسے دوسرے حصوں کے علاوہ جہاں سینچائی کی سہولتیں موجود تھیں۔ زیر کاشت لائی جانے والی زیادہ تر بنجر اور عام طور سے خراب قسم کی زمین تھی۔ ان علاقوں میں اسی آراضی کی پیداوار اُن زمینوں سے کم تھی جن پر پہلے سے کاشت کی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اور پیداوار کی بچھری ہوئی

(1) اے۔ کے۔ ایل، رپورٹ on the Enquiry in to the rise of prices of India، (1914ء) صفحہ 64

(2) کم پیداوار اور چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے باہمی رشتے کے لئے دیکھئے اردن بے لانگ The economic basis of

تکنیک اور کھیتوں کے چھوٹے رقبوں کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا۔

غذائی پیداوار کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1905-6ء میں ختم ہونے والی پوری مدت میں اوسط پیداوار بدستور رہی۔ یعنی تقریباً سات کروڑ بیس لاکھ ٹن سالانہ۔ اس مجموعی پیداوار میں سے کچھ حصہ برآمد کیا جاتا تھا۔ صارفین کی تعداد برابر بڑھ رہی تھی۔ اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے فی کس غذا کے صرف میں کمی ہوئی یا نہیں۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کے مطابق ”بڑے بڑے علاقوں میں جہد حیات اُس سے زیادہ بڑھ گئی ہے جتنی اُس وقت تھی۔ جب وہ علاقے ہمارے ہاتھوں میں آئے۔“ (1) اُس نے اضافہ کیا کہ اس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ ہم زمین چاہے مالکان آراغی کو دیں۔ جیسا کہ بنگال میں ہوا جنوبی ہند کی طرح اپنے ہاتھوں میں رکھیں زیادہ تر لوگوں کے لیے جہد حیات مشکل تر ہو جاتی ہے۔ (2) اُس کا خیال تھا ”زمین سے اتنی غذائی اجناس پیدا کی جا رہی ہیں جتنی پہلے نہیں کی جاتی تھیں۔ لیکن غذائی اجناس میں اضافے کی شرح سے زیادہ تیز ہے آبادی میں اضافے کی شرح۔“ (3) یہ خرابی کس حد تک بڑھ گئی ہے۔ اس کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ برطانوی ہندوستان کے 2/5 لوگ جتنے خوشحال ہیں جتنے وہ پہلے مقامی حکمرانوں کی حکومت میں سمجھے نہیں تھے۔ دوسرے 2/5 کسی نہ کسی طرح اپنی گزر بسر کر لیتے ہیں۔ لیکن آبادی کا بقیہ پانچواں حصہ یا چار کروڑ انسان پیٹ بھر کے روٹی نہیں کھاتے ہیں۔ (4)

اس میں شک نہیں کہ حکومت نے زراعت کو ترقی دینے کی کوشش کی 1870ء اور 1880ء کی درمیانی مدت میں جدید طریقوں اور ذریعوں کا مظاہرہ کرنے کیلئے تجرباتی رفاہ شروع کئے گئے۔ 1880ء کے قیمت کمیشن کی سفارش پر ایک جملہ زراعت قائم کیا گیا۔ لیکن ابتدائی کچھ برسوں میں اُس نے محض زراعت کے متعلق اعداد و شمار جمع کئے۔ 1889ء میں ایک زراعتی کمسٹ ڈاکٹر وکٹر ہندوستان آیا۔ اور بہت تحقیق و تفتیش کے بعد اُس نے ایک جیش بہار رپورٹ پیش کی۔ 1901ء میں صوبوں کے زراعتی محکموں میں تال میل پیدا کرنے کے لیے ایک زراعت کا انسٹیٹوٹ جنرل مقرر کیا گیا۔ ایک معتبر امریکی مسٹر فلپس کی فیاضی کی بنا پر حکومت کو پوسا ریرج انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کا موقع ملا۔ زراعت تعلیم کے لیے کچھ اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ لیکن ان اقدامات نے پیداوار کی طریقوں یا زراعت کی پیداوار میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی۔ زیادہ تر تحقیق اتفاقی نوعیت کی تھی۔ (5) اور اگر اس کے نتائج نکلیں بھی تو اُن سے کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

زراعت اور وقت اور مواصلات کی ترقی ایک اور ایسا عنصر تھا جسے کسان کی خوشحالی میں معاون ثابت ہونا چاہیے تھا۔ منڈیاں بڑھ گئیں تھیں۔ بدیس میں بہتر قیمتیں مل رہی تھیں اور ملک کے اندر بھی قیمتیں اُن کے برابر ہوتی جا رہی تھیں۔

ریلوں نے ہندوستان کی معاشی ترقی میں کوئی اہم رول ادا نہیں کیا اس بات کو ہیلن ایپ نے

(1) ہنٹر۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ The Indian of the Queen (1903ء) صفحہ 99

(2) ایضاً، صفحہ 147

(3) ایضاً، صفحہ 147

(4) ایضاً، صفحہ 151

(5) Moral and Material Progress During '951-52، صفحہ 329

ان الفاظ میں کہا ہے۔ ”ہندوستانی ریلوں کی ترقی کے خطروں کو اگرچہ ریاست نے برداشت کیا اور 1901ء میں جب ریلوں سے منافع ہونے لگا تھا۔ حکومت پر پانچ کروڑ پاؤنڈ کا بار پڑ چکا تھا۔ پھر بھی ہندوستانی ریلوں کے جال نے فی الجملہ اور مجموعی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہندوستان نے کچھ نقصان تو اٹھائے لیکن ریلوں کی ترقی کی ریاستی ذمہ داروں سے کئی بڑے فائدے حاصل نہیں ہوئے۔ ریلوں کا کوئی منصوبہ بنایا گیا تھا۔“ ہندوستانی ریلوں کے وکیل اور معمار آر۔ ایم۔ اسپونس کے مطابق یہ مقصد دو تھے۔ پہلا مقصد فوجی یعنی کم سرمایہ لگا کر پورے علاقے کا بہتر دفاع کرنا۔ اور دوسرا ہے تجارتی جس کی بڑی غرض ہے ملک کے طرح طرح کی پیداواروں کو اندرون ملک سے قریب ترین بندرگاہ تک پہنچانا اور اس کے بدلے میں انگلستان کا بننا ہوا سامان نمک وغیرہ وہاں پہنچانا۔ (1) دوسرا سازگار عنصر جو ہندوستانی معیشت کے لیے معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ تھا دنیا میں عام طور سے قیمتوں کا بڑھنا جس کی ابتدا 1861ء میں ہوئی اور پوری کی پوری انیسویں صدی میں جاری رہی۔ (2) 1891ء سے قیمتیں تیزی کے ساتھ بڑھنے لگیں۔ اور 1905ء کے بعد تو وہ اڑنے لگیں۔ کے۔ ایل۔ وٹ کے تخمینوں کے مطابق ایر مطالعہ یعنی 1890ء سے 1912ء تک قیمتوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ پانچ سالہ مدتوں کے اعتبار سے کچھ خاص خاص غذائی اجناس کی حد تک 1865ء سے 1905ء تک کے چالیس سال میں قیمتوں میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں ہوئیں۔

سال	دھان	گیہوں	چنا	باجرا	راگی
1865ء	25.8	22.6	29.1	23.7	28.2
1885	13.2	14.3	16.6	18.5	22
1905	8.4	11.5	13.5	13	20

پورے ہندوستان کے اشد یہ اعداد و ظاہر ہوتا ہے کہ 1900ء سے 1904ء تک کی پانچ سالہ مدت میں روپے کی شکل میں قیمتوں میں 8 فی صدی اور 1905ء سے 1909ء تک کی پانچ سالہ مدت میں 31 فی صدی کا اضافہ ہوا (3) غذائی اجناس کی قیمتوں میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ اضافہ ہولت کے خیال میں اس اضافہ کی داخلی اور خارجی وجوہ تھیں۔ اس کی رائے میں اول الذکر میں مندرجہ ذیل شامل تھیں۔ غذائی اجناس کی پیداوار میں مقابلہ کمی، آبادی میں اضافہ اور ہندوستان اور بدیسی ملکوں میں بھی غذائی اجناس، غیر غذائی اجناس اور خام مال کی بڑھتی ہوئی مانگ، آمدورفت کے سستے ذرائع روپے کا پھیلاؤ اور بینکاری کی سہولتوں میں اضافہ عالمی وجود میں مندرجہ ذیل اہم تھیں۔ سونے کی بڑھتی ہوئی سپلائی، قرض

(1) جوش دی۔ دی تقریر اور تحریر، صفحہ 600

(2)	غذا (60 مدات)	(خام مال 29 مدات)	کل قیمتیں	(100 مدات)
1867-1870	100		100	100
1840ء	104		103	105
1880ء	108		108	106
1890ء	118		108	114
1900ء	102		120	139
1905ء	139		116	130

(3) ایل، کے، ایل، Report on enquiry into the rise of Prices، صفحہ 46

کا پھیلاؤ، جنگوں کی لائی ہوئی تباہی اور جنگی تیار یوں کی طرح کی غیر پیداوار سرگرمیوں کی طرف محنت اور سرمائے کی منتقلی۔ (1)

لیکن محض تھوڑی مدت کے لیے پچھلی صدی کے ساتویں دہائی میں کہاس کی اونچی قیمتوں نے بہت سی، دکن اور برابر کے کسانوں کو خوش حال بنادیا اور نہ قیمتوں میں اضافہ کی بنا پر ہندوستانی کسانوں کی حالت نہیں متبیل اس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ کسان کے کھیتوں کا رقبہ کم تھا اور پیداوار کم ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے ایک اوسط کسان کی فاضل پیداوار جو منڈی میں لائی جاسکتی بہت کم ہوتی تھی اور جزوی وجہ تھی حکومت کی محاصل کی پالیسی اور تقسیم کا غیر منصفانہ نظام۔

مالگوار ی

مالگوار ی کے دو خاص خاص نظام رائج تھے۔ ایک تو وہ تھا جس میں کسان اور حکومت کے درمیان مالک آراضی کے طور پر ایک درمیانی طبقہ تھا جس کو زمیندار ی نظام کہا جاتا تھا۔ اور دوسرا وہ جس میں حکومت برادر است کسانوں سے معاملہ کرتی تھی اور جو رعیت دار ی نظام کہلاتا تھا۔ زمیندار ی نظام کی ایک قسم کی محال دار ی تھی جس میں پورا گاؤں یا زمینداروں کا ایک کردہ مجموعی اعتبار سے زمین کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

زمیندار ی نظام 48 فی صدی علاقے میں رائج تھا۔ جس میں سے 29 فی صدی میں پنجپیں یا تیس سال کے لیے عارضی بندوبست تھا۔ اور 19 فی صدی میں بندوبست استمراری تھا۔ جس علاقے میں بندوبست استمراری تھا۔ اس کے علاوہ جو علاقہ تھا۔ وہاں مال گزاری کی شرح اتنی اونچی تھی کہ زمین کو ترقی دینے کے لیے اُن کے پاس کچھ نہیں بچتا تھا۔

پنجال کے جن اضلاع میں بندوبست استمراری تھا۔ وہاں مالگوار ی کل پیداوار کی 11 فی صدی سے کچھ زیادہ تھی۔ لیکن گجرات میں جہاں عارضی بندوبست تھا۔ مالگوار ی پیداوار کی 20 فی صدی یا پنجال کی شرح کی تقریباً گنتی تھی۔ شمالی ہندوستان میں لگان کا 50 فی صدی مالگوار ی کے طور پر ادا کیا جاتا تھا۔ لیکن مالک آراضی کا حصہ دوسرے فاضل (لگان کے 8 فی صدی) اور گاؤں کے چوکیدار اور ملکھیا کو ادا کی جانے والی رقوم کی بنا پر اور کم ہو جاتا تھا۔ (2) پنجاب میں محاصل لگان کے 121/2 فی صدی ہوتے تھے۔ صوبجات متوسط میں اگرچہ حکومت کا حصہ لگان کا 40 سے 50 فی صدی تک مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن حقیقت میں سرکاری مطالبہ 50 سے 79 فی صدی تک ہوتا تھا۔

جس علاقے میں رعیت دار ی نظام رائج تھا۔ وہ زیر کاشت زمین کے 52 فی صدی رقبہ پر مشتمل تھا۔ بہمنی اور مدراس کے رعیت دار ی علاقے میں حالات بدتر تھے۔ بہمنی پریسڈنسی میں 1866ء کے بندوبست میں مالگوار ی کے شرح میں اتنا اضافہ کر دیا گیا کہ اُسے ”بدترین معنی میں خون چوسنا کہا جاسکتا تھا۔“ واقعہ یہ تھا کہ کاشت کے لاکھت اور سرکاروں کے مطالبے کے بعد اُن کے پاس کچھ بچتا ہی نہیں تھا۔ (3)

مدراس میں مال گزاری کا نیا بندوبست کیا گیا۔ جس نے بقول دت محصول کا بوجھ بڑھا دیا۔ اس

(1) ایضاً صفحہ 6۔

(2) دت، مدیش، عہدہ کنوریہ میں ہندوستان کی معاشی تاریخ (1906ء، ایڈیشن)، صفحہ 469۔

(3) ایضاً صفحہ 332۔

نے لکھا ہے۔ ”صوبے کی مجموعی پیداوار اور اس پیداوار کی قیمتوں کے تناسب میں اگر سرکاری مطالبے پر غور کیا جائے تو بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ 1875ء میں 1860ء کے مقابلے میں لوگوں پر محصول کا زیادہ بوجھ ڈالا گیا۔“ اس زمانے کی انٹر سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی طرح کے اعلیٰ حاکم سرز جیمس ملیٹ نے خود اعتراف کیا ”اس میں شک نہیں کہ جو شرح لگائی گئی وہ اگر پورے لگان پر مشتمل ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ منافع بھی کم کر دیتی ہے۔“ (1)

جن علاقوں میں مالکان آراضی کے لگان کی بنیاد پر تشخیص کی شرحیں مقرر کی جاتی تھیں۔ وہاں تاج کو حکومت ہندوستان منتقل ہونے کے بعد کے پچاس برسوں میں یہ رجحان تھا کہ مالکان آراضی زمینوں کے لگان میں اضافہ کر دیتے تھے اور جن علاقوں میں عارضی بندوبست تھا۔ وہاں تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد بندوبست کے موقع پر حکومت مالگوداری کی شرحوں پر نظر ثانی کرتی تھی اور انہیں بڑھاتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد ہونے والے بندوبستوں کے نتیجے میں کساد بازاری آتی تھی۔ اس لیے کہ کسان اضافہ سے بچنے کے لیے دوسرے بندوبست سے دو ایک سال پہلے اپنی زمینوں میں کاشت کر دیتے تھے۔

اس کے باوجود 1850-61ء سے 1904-5ء تک مالگوداری کی وصولی میں 50 فی صدی کا اضافہ ہو گیا۔ (2) اس میں کچھ اضافے کے ان اعداد میں وہ اضافہ شامل نہیں ہے جو 78-1877ء کے بعد آپاشی کی بنا پر ”مالگوداری“ کی حد میں ہوئی اور اس لیے صحیح صورت حال پیش کرتے ہیں۔ یہ اعداد statistical based abstracts of British India کے مختلف شماروں سے لی گئی ہیں۔

بنگال	کر دڑ روپے
1793ء	3.13
1885ء	16
1858ء سے 1879ء تک ہونے والا اضافہ	فی صدی
شمال مغربی صوبجات	14.1
اودھ	17
متوسط صوبجات	13.8
پنجاب	3.9
اڑیسہ	4.3
مدراں	5.5
بھٹی	23.3
میسور	10
برار	22

لگان میں اضافہ کی وجہ تھی اس زمانے میں زیر کاشت آنے والے رقبے کی توسیع لیکن یہ واحد وجہ نہیں

(1) ایضاً صفحہ 319

(2) ہندوستان کی حالت پر سر جان کیرڈ کی رپورٹ، صفحہ 39

تھی۔ قیمتوں میں اضافے سے جو فائدہ ہو اودہ حکومت نے حاصل کیا اور کسان تک نہیں پہنچ سکا۔ کسان کی افلاس اور کاشت کی پس ماندگی کی بنیادی وجہ تھی۔ زمین کی لگان داری اور مالگوار کی کا نظام تانواؤتی اور انجاریا کی الفاظ میں ”بند دست استمراری میں لگان داری کے نظام کی بنا پر بہت سی خرابیاں وجود میں آگئی تھیں۔ مثلاً غیر حاضر زمینداری، انتہائی لگان، کسانوں کی معاشی نیم غلامی وغیرہ۔ دوسرے قسم کی لگان داریوں والے علاقے بھی اُن خرابیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ واضح مسئلہ اصولوں کے کسی واحد نظام کی عدم موجودگی نے مالگوار کی کے نظام کو جنم دیا ہے۔ اُس نے انہیں اور کنگال بنا دیا ہے۔ اور اُس کے نتیجے میں زمین کو اپرواہی کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔ (1)

اوسط لگان داری کے چھوٹے رقبے کی ایک اور اہم وجہ تھی جس کی وجہ سے زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں اضافے اور اُن کی بدیسی ملکوں میں مانگ سے کسان فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ معقول اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں یہ تو شواہد ہے کہ انیسویں صدی میں لگان داری کے مسلسل کم ہوتے ہوئے رقبے کے متعلق کوئی بات و ثوق سے کہی جاسکے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی دکن کی صورت حال پورے ملک کے حالات کی طرح تھی۔ ہر لڈمان کے مطابق دکن میں کسان کی اوسط لگان داری کا رقبہ 1771ء میں 140 ایکڑ تھا۔ جو 1818ء میں 17½ ایکڑ، 1820ء اور 1840ء کے درمیان 17 ایکڑ اور 1910ء میں 17½ ایکڑ ہو گیا۔ ان میں سے 11 ویں صدی 15 ایکڑ سے کم کے تھے۔ ان کا رقبہ غیر معاشی تھا۔

برج نرائن نے لکھا ”یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ پورے پنجاب میں (اور پنجاب کا معاملہ مستحکمیت میں شامل نہیں ہے) اُن اضلاع کے علاوہ جہاں سیپانی کی نہروں کی بنا پر بہت سی نئی زمین زیر کاشت آگئی ہے لگان داری کا اوسط رقبہ، جو پہلے ہی کم تھا۔ تعداد بڑھنے کے ساتھ اور پھوٹا ہوا تاجا رہا ہے۔ (2) ان لگان داریوں کے بنوارے کی ایک اور تکلیف دہ نوعیت یہ تھی کہ اُن کے نکلے دور دور بکھرے ہوئے تھے۔ اوسطاً ہر لگان داری 5 سے لیکر 8 تک ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ اس وجہ سے زراعت کی پیداوار کی نسبت سے لاگت بڑھ گئی۔ کسان کو زیادہ محنت اور زیادہ وقت صرف لرنات پڑتا تھا اور زراعت کی غیر معاشی نوعیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

لگان داریوں کے بنوارے کی خرابی کی جڑیں ہندو اور مسلم قوانین وراثت میں پیوست تھیں۔ لیکن آبادی کے اضافے اور مقامی صنعتوں کے زوال نے اس خوبصورتی میں شدت پیدا کر دی تھی اور اسکی رفتار بڑھا دی تھی۔

کسان مالکان آراضی کے آہستہ آہستہ کم ہو تارقبہ اور درمیانی لوگوں کو نقد یا جنس کی شکل میں لگان ادا کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ معمولاً ادا کئے جانے والے لگان کی جگہ نقدی لگان اور زمینداروں کے من مانے انداز سے کسانوں کو بیدخل کرنا وہ مزید امور تھے۔ جنہوں نے زراعتی آبادی کو دیکھوں میں جتا کر دیا تھا۔

تھورٹر کے مطابق ”انیسویں صدی میں اور غالباً پچھلی صدی کے رابع آخر میں بھی ہندوستان

(1) تانواؤتی اور انجاریا، تحول بالا صفحہ 42

(2) برج نرائن، Indian Economic life (1929) صفحہ 35

برج نرائن کے مطابق 1927ء میں پنجاب میں 29.7 ملین ایکڑ زمین زیر کاشت تھی۔ ان میں 16.5 ملین ایکڑ اُن کسانوں کے پاس تھی جو نقد یا جنس کی شکل میں لگان دیتے تھے۔ اتر پردیش میں 1920ء میں 28.5 ملین ایکڑ میں سے 21.9 ملین ایکڑ اور اودھر میں 11 ملین میں سے 4.8 ملین ایکڑ نقد یا جنس کی شکل میں لگان پراٹھے ہوئے تھے۔

کی زراعت میں فیصلہ کن عنصر یہ تھا کہ زیادہ تر لسانوں کے پاس سرمایہ نہیں تھا۔

غذائی صورت حال

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان معیشت کا ایک اہم عنصر تھا۔ غذائی قلت۔ اس کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ آبادی میں اضافے کی مناسبت سے مجموعی طور سے زیر کاشت رقبے میں اضافہ نہیں ہوا اور جزوی وجہ تھی کہ غذائی فصلوں کی جگہ تجارتی فصلوں کی کاشت۔

1892-93ء سے 1904-5ء تک مجموعی اعتبار سے زیر کاشت رقبے میں 17.4 ملین ایکڑ یا 8 فی صدی کا اضافہ ہوا۔ لیکن غذائی فصلوں کے رقبے میں 15.39 لاکھ یا 3 فی صدی کا اور غیر غذائی فصلوں کے رقبے میں 12 ملین ایکڑ یا 29 فی صدی کا اضافہ ہوا۔ چونکہ اسی مدت میں آبادی میں تقریباً 15 ملین کا اضافہ ہو گیا جس کے لیے 10.5 ملین ایکڑ اور چاہیے تھے۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ 5.39 ملین ایکڑ بڑھی ہوئی آبادی کے محض نصف حصے کی ضرورت پوری کر سکتی تھی۔ (1)

زراعتی پیداوار میں تبدیلی اتفاقاً نہیں ہوئی تھی۔ اس کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ دنیا کی منڈیوں میں ہندوستان کے نام مال کی مانگ بڑھ گئی تھی اور جزوی طور سے یہ نتیجہ تھا حکومت کی پالیسی کا۔ جہاں تک صنعتوں کا تعلق تھا۔ حکومت ہندوستان 1919ء تک عدم مداخلت کی اصول پر کاربند رہی لیکن زراعت کے معاملے میں اس نے ایسی فصلوں کو فروغ دینے کے عملی اقدامات کئے جو یا تو انگلستان کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی تھیں۔ (مثلاً کپاس اور پٹ سن) یا جن سے ہندوستان کے لیے زر مبادلہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ مثلاً چائے اور سنکوتا۔

امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد صوبجات متوسط اور برار کے لیے ایک کاشن کمشنر (کپاس کا کمشنر) مقرر کیا گیا۔ اور شمال مغرب صوبجات (اتر پردیش) میں کپاس کی کاشت کو توسیع دینے کے اقدامات کئے گئے (2) 1862ء میں اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا گیا کہ ہندوستان استراری کو توسیع دی جائے۔ اور کپاس کی کاشت کو فروغ دینے کے لیے آپاشی کے ذرائع کو ترقی دی جائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں نخل کی کاشت کی اہم افزائی کی گئی اور مالو اس میں فیم کی کاشت کے لیے تعاون دی گئی۔ جس کی وجہ سے اس علاقے سے آنے والی غذائی اجناس میں کمی آگئی (3) 1893ء سے 1906ء تک غذائی فصلوں کی اوسط سالانہ پیداوار کا اشاریہ 100 سے گھٹ کر 96 ہو گیا۔ اور تجارتی فصلوں کا اشاریہ 100 سے بڑھ کر 105 ہو گیا۔ اسی زمانے میں غذائی اوسط پیداوار 73.9 ملین ٹن سے گھٹ کر 71.5 ملین ٹن رہ گئی۔ چنانچہ کسی سالانہ غذائی 5871 پاؤنڈ سے گھٹ کر 5660 پاؤنڈ رہ گئی فصول اور غذائی قلت کے باوجود بد قسمتی سے حکومت نے غذائی پیداوار بڑھانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ ان فصلوں کو بڑھا دینے کے لیے عملی کوشش کرتی رہی جن کی مانگ بد قسمتی منڈیوں میں تھی۔

(1) دیکھیے جوش۔ جی۔ دی تقریریں اور تحریریں صفحات 6-8-4-7

(2) -مانڈر کی شمال مغربی صوبجات میں تجارت، دکان داریوں اور کپاس کی کاشت کی حالت کے متعلق رپورٹ 1961-62ء دیکھئے (داخلی دہان) روداد نمبر 1، اکتوبر 1861ء

(3) یونائیٹڈ پریسین پرچائے ڈائریکٹ گل کا خطنامہ نیلبرٹری آف ایسٹ مورچہ 17 1870ء دیکھیے مراسلات (خط)

از سرکاری آف ایسٹ انڈیا عام حکومت ہندوستان 1869ء 1905ء (غیر مطبوعہ مراسلات)

مقرضیت

برطانوی ہندوستان میں جس نظام آراضی کو رواج دیا گیا۔ اس کی بنیاد تھی، جائداد اور مالکانہ حقوق کا مغربی تصور۔ اس کی وجہ سے زرعی معیشت میں منافعوں کی تقسیم کے جس طریقے نے رواج پایا وہ غیر منصفانہ اور ظالمانہ تھا۔ اس کے نتیجے میں عام لوگ غربت و افلاس کے شکار اور مقروض ہو گئے۔

مالگوباری اور دوسرے کے بندہ بستوں کے حقوق کی دستاویزوں، عدالتی نظام اور دیوانی عدالتوں نے زمین کو ایک بیش بہا اور آزادی کے ساتھ منتقل کی جانے والی جائداد بنا دیا تھا۔ جب بڑھتی آبادی اور دوسرے پیشوں میں گھٹتے ہوئے روزگار کے مواقع کی بنا پر زمین کے لیے مقابلہ بڑھا اور اس کے نتیجے میں زمین کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ (1) تو مالک آراضی کے پاس ایسی چیز آگئی جس کی ضمانت پر آسانی سے قرض لیا جاسکتا تھا۔ اُس نے جو قرض لیا۔ اُسے بغیر سوچے سمجھے خرچ کیا۔ شہر کے سرمایہ دار طبقے نے جب یہ محسوس کیا کہ اصل کاری کے دوسرے تمام راستے بند ہو چکے ہیں تو اُس نے نقد قیمت ادا کر کے یا زمین اور اس کی پید اور کی ضمانت پر قرض دیکر زمین حاصل کرنے پر توجہ دی۔ جب کسان قرض واپس نہ کر پاتا تھا تو وہ زمین پر قبضہ کر لیتے تھے۔

جب قرض کا بوجھ بڑھ گیا تو مجبور اکٹمانوں کو اپنی زمینیں یا تو خوشحال زمینداری اور کسانوں کے یا شہری اور مقامی مہاجروں کے ہاتھ فروخت کرنی پڑیں۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو ناکارہ و درمیانی لوگوں اور سود خوروں کی تعداد بڑھ گئی۔ اور دوسری طرف مزارع، فحشی کسانوں اور کھیتی پر مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ پورے ملک میں چاہے وہاں زمینداری نظام رائج ہو یا محال داری یا رعیت داری غریب اور امیر میں فرق بڑھ گیا اور وہ کسانوں جو زیر کاشت علاقے کے 75 فی صدی میں کاشت کرتے تھے۔ صرف اپنی گذر بسر کے لیے پیداوار کرتے تھے۔

موٹے طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیہی مقرضیت نتیجہ تھی فیوڈل اور دوسری سماج سے تجارتی سماج کی طرف مکمل عبور کا۔ اس کی وجہ سے جلاوہ اشیاء اور جنس کی شکل میں ادائیگی کی جگہ زر کی معیشت نے لے لی۔ رواج کی جگہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ اور انتشار و ملیحہ گی کے بجائے ارتکاز و اکثریت نے رواج پایا۔ یہ نتیجہ تھا واسم دہیت (2) کی طرح کے مفید رواجوں کے ختم ہو جانے کا اور گاؤں کی برادری کے زوال کا جو مقامی مہاجروں کے چنگل سے کسان کو محفوظ رکھتی تھی۔ اور اپنے قدیم سماجی رشتوں اور ملکیت کے پرانے طریقوں

(1) پنجاب میں 1849ء میں ایک ایکڑ زمین کی قیمت مالگوباری کی چھ گنا تھی 39-1938ء میں یہ قیمت بڑھ کے 283 گنا ہو گئی تھی۔ دیکھئے: *Indian rural problems* صفحہ 203 ایک تحقیق میں یہ دلچسپ اطلاع سامنے آئی کہ زمین کی قیمت ہر طرح کی زمین کی اوسط قیمت چاہے وہ سیٹھانی کی زمین ہو یا بنگر 50-1840ء میں 3.5 روپیہ فی ایکڑ تھی۔ 61-1850ء میں 7.5 روپیہ فی ایکڑ اور 70-1860ء میں

(2) یہ ہندوستان کا ایک قدیم رواج تھا۔ جس کی رو سے مقروض اپنے قرض کو جو رقم واکر تا تھا وہ کسی صورت میں اصل رقم کی دہائی سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

کو برقرار رکھتی تھی۔ دیہی آبادی میں اضافے نے اس خرابی کو اور بڑھا دیا۔⁽¹⁾ ان حالات کی بنا پر ذہن قدیم کا شکاری خاندانوں سے نکل کر نئے نئے دولت مند طبقوں کے ہاتھوں میں آگئی۔⁽²⁾

بلاشبہ دیہی عہد و نصیب محض ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کاشت بھی ایک صنعت ہے اور دوسری صنعتوں کی طرح اُسے بھی قرض کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں جس بات نے قرض کو خصوصی اہمیت دی وہ یہ تھی کہ قرض کا خاصا حصہ غیر پیداواری نوعیت کا تھا۔ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے کسانوں کی طرح ہندوستان کے کسان بیج، کھاد، جالور، اوزار، مشین، زمین یا کنویں وغیرہ کھود کر زمین کو مستقل طور سے ترقی دینے کے لیے قرض نہیں لیتا تھا۔ وہ عام طور سے زمین کا محصول لوار کرنے قلت کے برسوں میں اپنی اور اپنے خاندان کی گذر بسر کرنے یا شاہی، بچے کی پیدائش اور موت وغیرہ کی طرح کی سماجی تقریبات کی لیے مہاجن سے قرض لیتا تھا۔ کسان کے سالانہ پیداوار اتنی کم ہوتی کہ وہ محض اس کی گذر بسر کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ جب وہ قرض لے لیتا تھا تو آئندہ برسوں کی فصلوں سے اُس کی ادائیگی ممکن نہیں ہوتی تھی۔ قرض کسان کی زندگی کا ایک مستقل عنصر بن جاتا تھا۔ بلنک انکوائری کمیٹی کو معلوم ہوا تھا کہ بمبئی میں زیادہ تر دیہی قرض غیر پیداواری مقاصد کے لیے لیا گیا تھا۔ اُتر پردیش میں محض 30 فی صدی قرض، کسان کی کاشت کی ضرورتوں کے لیے تھا۔ بقیہ 30 فی صدی غربت کی بنا پر اور 36 فی صدی سماجی، مذہبی اور قانونی رواجوں کے لیے لیا گیا تھا۔ صوبجات متوسط میں 26 فی صدی غیر پیداواری مقاصد کی لیے لیا گیا تھا۔ پنجاب میں زیادہ تر قرض اس لیے لیا گیا تھا کہ خراب فصلوں کے زمانے میں کسان زندہ رہ سکے۔ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں کر سکے اور اپنے مردوں کو جلا سکے یا دفن کر سکے۔⁽³⁾

ان حالات میں قرض کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ کسان کو زندہ رکھ سکے۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ترقی کے لیے اصل کاری کی جاسکے۔

ڈارلنگ نے پنجاب کے متعلق لکھے ہوئے کہا تھا۔ 1880ء تک کسان مالک اور مہاجن کی تاب راہر جنگ مہاجن کی مکمل فتح میں ختم ہو چکی تھی۔ اگلے تیس سال میں مہاجن اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گیا تھا اور اُن کی تعداد اور خوشحالی میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ بینکاروں اور مہاجنوں کی تعداد (جن میں اُن کے لواحقین بھی شامل تھے) جو 1866ء میں 53,263 تھی۔ 1911ء میں بڑھ کے 1,93,890 ہو گئی۔⁽⁴⁾

(1) نہ صرف مجموعی اعتبار سے آبادی میں اضافہ ہو گیا۔ بلکہ اس سے بڑھکے یہ ہوا کہ زراعت پر انحصار کرنے والی آبادی کا تناسب تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ مندرجہ ذیل اعداد اسے ظاہر ہوتا ہے۔

1819ء۔ 61 فی صدی آبادی کسانوں کی

1901ء۔ 66 فی صدی آبادی کسانوں کی

1911ء۔ 71 فی صدی آبادی کسانوں کی

1921ء۔ 73 فی صدی آبادی کسانوں کی

(2) ڈارلنگ کے مطابق ”پنجاب میں جو مہاجن کسان بن گئے۔ وہ زرعی معیشت میں واحد ترقی پسند عنصر تھے۔ وہ چاروں طرف بکھری ویرانی میں تھا گلستان نظر آتا ہے۔“ اور ”اگر کہیں تجربہ کیا جا رہا ہے تو ایک روپے کے خلاف دس روپے کا سرمایہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کے پاس پشت کوئی کردار ہو گا۔“ ڈارلنگ The Punjab peasant صفحہ 101

(3) ڈارلنگ، ای۔ ایضاً، صفحات 19-20

(4) ایضاً، صفحہ 73

1880ء کے قسمن کیشن جب تحقیق و تفتیش کی اس وقت مقروضیت کتنی پھیل چکی اس کے متعلق تمام صوبوں کی سرکاری رپورٹوں میں کہا گیا تھا کہ کسانوں کا بہت زیادہ بوجھ پایا جاتا ہے۔ (1) مسٹر نکلسن نے لکھا تھا کہ صوبیات متوسط میں ”بامعوم کسان نہ صرف بچ کے لیے بلکہ غذا کے لیے بھی زمینداروں سے ملنے والی پیشگی رقموں پر انحصار کرتے تھے۔“ (2) بنگال میں مسٹر (2) اسکرٹن کو معلوم ہوا کہ ضلع بادیا کے تمام کسانوں کی پچھتر فی صدی تعداد مہاجنوں کے جنگلوں میں بھنسی ہوئی تھی۔ بسنٹی میں مسٹر پیلے (3) کے تخمینے 75 فی صدی کسان مقروض تھے۔ جن میں 50 فی صدی ایسے تھے جن کے سروں سے پانی گذر چکا تھا۔ مدراس پریسڈنسی میں تفتیش (4) سے ظاہر ہوا کہ کرشنا ضلع کے 75 فی صدی اور ویلور کے 80 فی صدی کسان مقروض تھے۔ برار میں میجر سر نرپانسلی کو معلوم ہوا کہ جن کے پاس کچھ سرمایہ تھا۔ ان کی حالت تو اچھی تھی مگر بقیہ کسانوں کا مکمل انحصار ساہوکاروں پر تھا۔ (5)

بہار میں شاہ آباد کے کلکٹر کی رپورٹ کے مطابق 50 فی صدی کسانوں پر اس غلے کی بنا پر زمیندار کا قرض ہوتا ہے جو زمیندار انہیں دیتا ہے اور 40 فی صدی پر غلہ یاروپہ لینے کی وجہ سے مہاجن کا قرض ہوتا ہے۔ (6)

آٹھ سال بعد لارڈ ڈمرن کے حکم سے ایک دفعہ پھر تفتیش کی گئی۔ جس میں ان نتائج کی حمایت کی گئی۔ جو شہادتیں لی گئی اس سے ظاہر ہوا کہ ”ہندوستان کے تمام حصوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو روز کنواں کھود کر پانی پیتے ہیں۔ اور شادیوں اور دوسری تقریباتوں میں اصراف بچا کر نے کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہتے ہیں اور اس مقروضیت کی بنا پر اور اس واقعہ کی بنا پر کہ قرض خواہ کاشت کے منافع کا بڑا حصہ ہتھیا لیتے ہیں۔ ان کے پاس برے موسم میں گذر بسر کرنے کے لیے بہت کم یا کچھ نہیں بچتا ہے۔ (7)

انیسویں صدی میں مسلسل مقروضیت بڑھتی رہی۔ اچھے موسم اور اچھی فصلوں، خراب موسم اور قلت اور اونچی یا پانی قیوتوں کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑتا تھا 1914ء میں جب قیمتیں اونچی تھیں کے ایل۔ دت نے لکھا تھا ”اچھی فصلوں کے زمانے میں اگرچہ اس کے پاس (کسان کے پاس) قرض کا ایک بڑا حصہ ادا کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں لیکن وہ جہاں تک ممکن ہو تا ہے ادا نیگی سے بچتا ہے اور اصراف بچا کرتا ہے بری فصلوں کے زمانے میں قرض ادا کرنا تو درکنار اس کے پاس گزر بسر کے لیے کچھ نہیں ہوتا ہے اور اس طرح وہ قرض کے بوجھ کے نیچے ہمیشہ دبا ہوتا ہے۔“ (8)

ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”زیادہ تر ہندوستانی کسان مقروض پیدا ہوتے ہیں اور تر کے میں قرض

(1) نکلسن، چیمبرس گزٹ، دوموہ اور جندہ اصطلاح کے حالات کے متعلق رپورٹ۔ ضمیمہ، قسمن کیشن رپورٹ 1880ء

(2) سکون کی رپورٹ، قسمن کیشن رپورٹ (1880ء)

(3) پیلے کی رپورٹ ایضاً

(4) قسمن کیشن رپورٹ (1880ء)، صفحہ 309

(5) میجر سر نرپانسلی کا نوٹ، ایضاً صفحہ 296

(6) ڈوقل سی۔ جے۔ اومابہد کی ضرورتیں۔ کلکٹر ریویو بعد 1879ء، صفحات 47-46

(7) تجویز نمبر 40-59-96 مورے 9 اکتوبر 1888ء، یکم مئی 1888ء، دسمبر 1888ء

(8) تے۔ کے۔ ایل، بحوالہ بالا، جلد 1، صفحہ 161

پہناتے ہیں۔ (1)

بڑھتی ہوئی مقروضیت کا اہم ترین سماجی اثر یہ ہوا کہ کسان بیدخل ہو گئے اور زمین ساہوکاروں کے ہاتھوں میں پھنک گئی۔ اگر ساہوکار خود ایک نسان ہوتا تھا تو اس کی لگان داری میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ اگر کسان نہیں ہوتا تھا تو غیر حاضر زمیندار اور منافع خور بن جاتا تھا اور بیدخل ہونے والا کاشت کار کسانوں اور مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں اضافہ کرتا تھا۔ 1866ء اور 1895ء کی درمیانی مدت میں زمینوں کی منتقلی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ مندرجہ ذیل نقشہ پنجاب کی کہانی سناتا ہے۔ (2)

1866ء.....	74	88,000 ایکڑ فی سال
1875ء.....	80	93,000
1880ء.....	85	1,60,000
1885ء.....	90	3,10,000
1890ء.....	95	3,38,000

تھوربرن نے پنجاب کے پنجہ حلقوں میں تفصیلی تفتیش کی۔ اسے معلوم ہوا کہ 742 خاندانوں میں سے 566 بہت زیادہ مقروض تھے یا قریب قریب برباد ہو چکے تھے اور زیر کاشت کل زمین کے 53 فی صدی حصے کا دو تہائی ساہوکاروں کو اور ایک تہائی بڑے زمینداروں کو منتقل ہو چکا تھا۔ اس نے 474 گادوں کی پڑتال کی۔ ان میں سے 126 بری طرح قرض میں ڈوبے ہوئے تھے، 210 میں قرض کافی تھا اور 138 میں قرض کا بوجھ زیادہ نہیں تھا۔ (3)

1901ء کی مورل اینڈ پرائرس رپورٹ کے مطابق 1891-92ء کے بعد پنجاب میں مالکوں کے زیر کاشت علاقے میں صوبے کی مجموعی رقبے کے تناسب سے اور مطلقاً کی ہو گئی تھی اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ زمین غیر کاشت کار طبقوں کو منتقل ہو گئی تھی۔ صوبجات متوسط میں مقروضیت کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ مدراس میں مقروضیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وی۔ جوشی کے مطابق بمبئی میں موروثی کسانوں کی دو تہائی تعداد نے لگان داری کے حق کو دے دیے تھے اور 1894ء تک ان کی حیثیت شمس کسانوں کی ہو گئی۔ (4)

قرض کس طرح بڑھ رہا تھا اس کا اندازہ ان لوگوں کی فی صدی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے جو قرض سے بچے ہوئے تھے۔ 1901ء میں گجرات کی ریاست برودا میں 40 فی صدی مالکان اراضی قرض سے بچے ہوئے تھے۔ 1907ء میں بنگال کے فریدپور میں فیصدی تعداد تھی 55 اور 1919ء میں میسور اور پنجاب میں فی صدی تعداد تھی 37 اور 1930-17ء میں گجرات میں یہ تعداد تھی 22 اور پنجاب میں 13۔ (5)

ان حالات کے نہ صرف معاشی نتیجے سامنے آئے اور لوگوں کی بڑی تعداد کو کھوں میں مبتلا ہو گئی

(1) مدراس کو لیجے 1853ء میں کلکٹر ہے۔ ہارڈیلین نے لکھا ہے کہ کسان ہمیشہ غربت اور عام طور سے قرض میں پھنسے رہتے ہیں۔ پچھتر سال کے بعد ایک اور کلکٹر نے اسٹین نے لکھا "ایک اوسط کسان کو اچھے سال میں فاضل پیداوار نہیں ملتی ہے۔"

(2) تانواقی "تجاریا محولہ بالا صفحات 33-34۔

(3) پنجاب میں دیہی مقروضیت کی نوعیت کے متعلق تھوربرن کی تفتیشی رپورٹ گورنمنٹ آف انڈیا پابک سے حکم سے کی گئی تھی۔ دیشیہ لکھنؤ کواڑی رپورٹ جولائی 1901ء، صفحات 65-66 اور 73۔

(4) جوشی۔ جی۔ ای۔ محولہ بالا، صفحہ 351۔

(5) تھوربرن، مدراس، رپورٹ، جلد اول، صفحہ 2۔

بلکہ اس نے کچھ سیاسی سوال بھی اٹھادیے جیسا کہ ای۔ ڈی۔ میک لاگن نے کہا ”بید غلی کے مسائل کسانوں کی مقروضیت کے عام سوال کے محض ایک پہلو کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ وہ پہلو تھا جس نے سیاسی حالات کو راست متاثر کیا اور جس کا فوری تدارک ضروری تھا۔“ (1) چنانچہ حکومت کو اس پر توجہ دینی پڑی اور قانون بنانے پڑے۔

1599ء میں گورنر جنرل کی کونسل میں پنجاب لینڈ ایلیمنیشن بل (پنجاب میں انتقال اراضی کا بل پیش کرتے وقت چارلس ریواؤز نے کہا کہ اس کا مقصد ہے کہ اس سیاسی خطرے کا تدارک کرنا جو پنجاب کے صحت مند مالکان اراضی کی بید غلی کے نتیجے میں اٹھ رہے ہیں۔ ”جو ہندوستان کی نیو فوج کے بہترین سپاہی ہیں اور جو نجی زندگی کی تکلیفوں اور کامرانیوں میں یہ سوچتے ہیں کہ اپنے بوجھاپے کے دن اپنی آبائی لگان داریوں میں گزاریں گے۔“ (2)

پنجاب میں اس کے تدارک کے بد قسمتی سے فرقہ وارانہ نتائج سامنے آئے اس لیے کہ زمین میں کاشت کرنے والے زیادہ تر مسلمان کسان تھے اور ساہوکار زیادہ تر ہندو تھے۔ بنگال کی صورت حال بھی ایسی ہی تھی خاص طور سے مشرقی اضلاع کی۔ وہ دونوں صوبے بعد میں ہندو مسلم تنازعے کی بنیاد اور پاکستان کے حصے بن گئے۔ ہندوستان کی تقسیم میں دوسری طاقتوں نے حصہ لیا ہوا نہ لیا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں اور مسلم کسانوں اور مقروضوں میں جو علیحدگی پیدا ہو گئی تھی وہ ایک اہم عنصر ضرور تھا۔

برہمنی ہوئی مقروضیت اور انتقال اراضی کا تدارک کرنے کے لیے جو اقدامات کئے گئے وہ تھے۔ (ایف) لین دین کے کاروبار کو منضبط کیا گیا، (ب) زرعی جائیداد کے فیر کاشتکاروں کے ہاتھوں میں جانے میں رکاوٹ ڈالی گئی جس نے زرعی قرض کی تجدید کردی اور (ج) معاہدے اور قرض کے قوانین میں ترمیم کی گئی تاکہ قرض خواہ اور مقروض کا رشتہ زیادہ منصفانہ بنیاد پر قائم ہو سکے۔ چونکہ مالکان اور کسانوں کی بڑی تعداد کے مقروض ہونے کی ذمہ داری مالگوار کے نظام پر تھی اس لیے حالات کو سدھارنے کے لیے اُس کی اصلاح ضروری تھی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

صرف اتنا کیا گیا کہ قرض خواہ سے مقروض کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ قانون بنائے گئے۔ کسانوں کو مقروضیت اور ساہوکاروں کے استحصال سے نجات دلانے کے لیے جو سب سے پہلے اقدام کیا گیا وہ کن اگر پلچر سنس ریلیف ایکٹ 1819ء تھا۔ اس کی رو سے عدالتیں قرض کی تاریخ اور نوعیت کا جائزہ لے سکتی تھیں اور بی شرح سود کی اجازت دینے سے انکار کر سکتی تھیں، مقروض کو گرفتاری اور زمین کی فروخت سے محفوظ رکھ سکتی تھیں اگر وہ زمین مکفول نہ کی گئی ہو اور قرض وصول کرنے والے مقرر کر سکتی تھیں۔ بعد کی برسوں میں مزید تحفظ کی خاطر ایکٹ میں اور ترمیمیں کی گئیں۔ لیکن اس کے نتائج اتنے سبب ثابت ہوئے کہ بند کیننگ انکواری کمیٹی نے اس کی تفتیش کی۔ غدارش کی۔

1901ء میں پنجاب لینڈ ایلیمنیشن ایکٹ قانون بن گیا جس کی رو سے اس امر کی ممانعت کردی کہ ساہوکار کی ڈگری کے اجراء میں کاشت کاری زمین فروخت کی جائے یا 20 سال سے زیادہ مدت کے

(1) ای۔ ڈی۔ میک لاگن کا پیش لفظ، دارنگ کی پنجابی کسان، صفحہ VIII

(2) بل پیش کرنے والے سر چارلس ریواؤز کی تقریر۔ گورنر جنرل کی کونسل کی رپورٹ، 27 اکتوبر 1899ء۔

لیے اُس کا قبضہ منتقل کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے بید علی زمین کی ترقی اور قرض کے لیے اُس کے وارثوں کی واجبات کے تعلق سے اُس کی قانونی حیثیت کو تقویت بھی پہنچائی۔ اُس کے بعد پنجاب کے ایکٹ کی طرح 1903ء کا بندیل کنٹ لینڈ الیا نیشن ایکٹ، 1903ء کا تار تھ ویسٹرن پرونسز لینڈ الیا نیشن ایکٹ اور 1916ء کا سنٹرل پرونسز لینڈ الیا نیشن ایکٹ منظور کیا گیا۔

یہ اقدامات اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اس لیے کہ ساہوکاروں نے ان قوانین میں خامیاں ڈھونڈ لیں اور اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ پنجاب میں بڑے بڑے زمینداروں کو چھوٹے چھوٹے کسانوں کی قیمت پر اپنی جائیدادیں بیچانے کا موقع مل گیا۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ لینڈ الیا نیشن ایکٹ کی منظوری کے بعد کاشتکاروں کے قبیلوں کی رہن کی ہوئی زمین کے مجموعی رقبے میں اور رہن کے روپے کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ 1902ء سے 1906ء تک کے چار برسوں میں رہن کیا جانے والا زمین کا مجموعی رقبہ 1,89,810 ایکڑ پر مشتمل تھا اور رہن کی شرح تھی 62 روپے فی ایکڑ۔ 1906ء سے 1911ء تک کی مدت میں رقبہ 12,89,608 ایکڑ اور شرح ہو گئی 8.3 روپے فی ایکڑ۔ چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی پر قرض کا کتابو جہ تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ کسان جو مالگوری ادا کرتا تھا اُس کا کتنا گنا قرض تھا۔ پنجاب میں ایکٹ کے بعد بھی قرض سے دو گنا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسان پر قرض کا کتابو جہ تھا۔ جو کسان لگان ادا کرتے تھے اُن کی حالت بھی اتنی ہی خراب تھی۔ مسرتھور برن کو معلوم ہوا کہ سب سے چھوٹے مالکان زیادہ بری طرح سے پھنسے ہوئے تھے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے بد قسمتی سے چھوٹی چھوٹی لگان داریوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

زمینداری کے علاقوں میں مقروضیت سے زیادہ بڑی خرابی تھی انتہائی لگان تشخیص کیا جاتا جس پر کسان کی غربت کی ذمہ داری تھی۔ مثال کے طور پر بنگال میں ذیلی ملکیت اور انتہائی شرح لگان کا عام رواج تھا۔ ذیلی مالکان پر مشتمل حریص درمیانی لوگوں کا ایک نظام مراتب وجود میں آ گیا تھا اور قانون نے زمینداروں کو جو اختیارات دئے تھے اُن کے ذریعے مظالم توڑے جانے لگے۔ 1859ء تک حکومت نے زمینداروں کے اختیارات محدود کرنے اور کسانوں کی حفاظت کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اُس سال حکومت نے لگان کی تکلیف دہ اضافوں اور من مانی بید خلیوں کو روکنے کی کوشش کے طور پر بنگال ریٹ ایکٹ منظور کیا۔ لیکن اس سے محض ایک چھوٹے سے حصے کا تحفظ ہوا جنہیں موردی حقوق مل گئے۔ چنانچہ جہاں تک کاشتکاروں کی بڑی اکثریت کا تعلق تھا یہ ایکٹ بے کار ثابت ہوا۔ دیہات میں بے چینی بڑھتی رہی اور حکومت نے غیر موردی کسانوں کی مدد کرنے کے لیے 1885ء میں ایک اور ٹیننسی ایکٹ منظور کیا۔ لیکن یہ بھی لگان کے اضافوں کو نہ روک سکا اور کسانوں کے دکھ کم نہ کر سکا۔ ٹیننسی لگان داری اور زمین کی منتقلی میں برابر اضافہ ہوتا ہوا موردی حقوق رکھنے والے کسانوں کی تعداد ٹیننسی رہی اور کھتیر مزدوروں کی تعداد بڑھتی رہی۔

1859ء کے بنگال ٹیننسی ایکٹ کا نفاذ تمام صوبوں میں کیا گیا اور 1883ء میں صوبجات متوسط میں 1887ء میں پنجاب میں اور 1886ء میں شمال مغربی صوبجات اور اودھ میں ٹیننسی اور ریٹ ایکٹ منظور کئے گئے۔ ان اقدامات کے مقاصد تھے دیہی رشتوں کو منضبط کرنا، کسانوں کی جا بجا بید خلیوں کو روکنا، لگان کو منضبط کرنا اور کسانوں کو زمین سدھارنے کا مناسب معاوضہ دلانا۔ بد قسمتی سے کسان ان سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ ”اُن کے سامنے (حکومت کے سامنے) مسئلہ اتنا بڑا تھا کہ ضروری امور پر توجہ دینا اُن کے لیے مشکل

تھا۔ ”حکومت کی مدد کی کاروائیوں کے متعلق بنگال کمیشن برائے زراعت نے یہ فیصلہ دیا۔ (1)
 قانونی کاروائی کے علاوہ حکومت نے زرعی مسئلہ کو سلجھانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات
 کئے۔ کسان کو بارش کے غیر یقینی حالات سے محفوظ رکھنے کے لیے سیٹھانی کی سہولتوں میں اضافہ کیا گیا،
 ساہوکار کے چنگل سے کسانوں کو نجات دلانے کے لیے امداد باہمی کی انجمن بنائی گئیں، اُن کو راحت پہنچانے
 اور کاشت کے طریقوں کو سدھارنے کے لیے اُن کو مالی امداد دی گئی اور اُن کی پیداوار کی فروخت کے لیے
 منڈیوں کے نظام کی اصلاح کی گئی۔ لیکن حکومت کی کوشش کی فوجیت اور وسعت ایسی نہیں تھی کہ آبادی
 کے بڑے حصے کی مالی حالت میں کوئی بڑی تبدیلی کر سکے جو قرض، قلت اور افلاس کے شکار رہے۔

قحط اور معاشی دکھ

اس کے ثبوت میں بار بار پڑنے والے قحطوں کی افسوسناک کہانی سنائی جاسکتی ہے جنہوں نے
 انیسویں صدی میں ملک کو تباہ کر دیا۔ صرف انچاس سال میں یعنی 1860ء سے 1908ء تک میں قحط
 پڑے۔ (2) ڈیرہ اور بنگال (1866ء)، شمال مغربی صوبجات اور راجپوتانہ (1868-69ء)، بمبئی اور مدراس

(1) رپورٹ، صفحہ 7

(2) اُس زمانے کے بڑے بڑے قحط مندرجہ ذیل تھے۔

سال	قحط کا علاقہ
1860-61	شمالی، مغربی صوبجات، پنجاب، راجپوتانہ اور بکھ۔
1866-67	ڈیرہ، بنگال، بہار۔
1868-69	شمالی۔ مغربی صوبجات، راجپوتانہ، بہار۔
1873-74	بنگال، بہار، ہندیل کھنڈ۔
1876-77	مدراس، بمبئی، میسور، حیدر آباد۔
1877-78	شمالی مغربی صوبجات، کشمیر، پنجاب۔
1888-89	مغنیام (مدراس)، ڈیرہ۔
1890-92	پنجاب۔
1896-97	شمالی مغربی صوبجات، مدراس، بنگال، مدراس، صوبجات متوسط، بمبئی، پنجاب اور کئی دکنی ریاستیں۔
1899-1900	صوبجات متوسط، برار، بمبئی، پنجاب، اجیر۔
1905-06	بمبئی۔
1906-07	شمالی بہار
1907-08	اُتر پردیش، صوبجات متوسط، مدراس، بنگال، بمبئی ان کے علاوہ مقامی قحطیں
1862ء، 1876ء، 1879-80ء، 1880ء، 1884-85ء، 1886-87ء، 1888-89ء، 1890-92ء، 1905-06ء اور 1906-07ء	دکن، بنگال، شمالی مغربی صوبجات، بنگال، بمبئی اور پنجاب، مدراس، صوبجات متوسط، گزوال، اجیر، مدراس، صوبجات متوسط، بمبئی اور پنجاب، مدراس، صوبجات متوسط، بنگال، بمبئی اور پنجاب،

1876-77ء)، شمالی مغربی صوبجات، پنجاب اور کشمیر (79-1878ء)، شمالی مغربی صوبجات مدراس، بمبئی اور صوبجات متوسط (97-1896ء) اور بمبئی صوبجات متوسط، برار، پنجاب اور انہیر 1899-1900ء کی طرح بڑے بڑے قتلوں میں بہت سے لوگ مرے۔ اڑیسہ اور بنگال میں 67-1866ء میں تیرہ لاکھ انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ 77-1876ء کے قتل میں تقریباً پچاس لاکھ انسان مرے، 97-1896ء میں پینتالیس لاکھ اور 1899-1900ء میں ساڑھے بارہ لاکھ۔⁽¹⁾

1860ء کے بعد اسی جلدی جلدی قتل کرنے کے اسباب کیا تھے؟ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف بارش کی کمی نہیں تھی۔ ہندوستان کی طرح کے بڑے ملک میں بارش کی مقامی کمی زیادتی تو معمول ہے۔ لیکن شاید ہی پورے ملک میں سوکھا پڑتا ہے۔ عام طور سے ایک علاقہ کی کمی کو دوسرے علاقوں کی پیداوار سے پورا کر دیا جاتا ہے اور ایسا شہابی ہوتا ہو کہ پورے ملک میں قلت ہو جائے۔

چنانچہ ملک میں ایسے قتل جن میں لاکھوں انسان بھک مری کے شکار ہو جائیں غذا کی کمی یا اس کی غیر مناسب تقسیم کی بنا پر نہیں پڑتے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ غربت اور قیوتوں کی زیادتی کی وجہ سے غریب طبقات غذا حاصل نہیں کر سکتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جب فصلیں خراب ہو جاتی تھیں اور روزگار کے مواقع کم ہو جاتے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ معمولی حالات میں بھی 30 سے 40 فی صدی لوگ خریدنے کی استعداد نہ رکھتے کی وجہ پوری غذا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی تصدیق سی۔ اے۔ ایلینٹ⁽²⁾ اور ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر⁽³⁾ کی طرح کے تجربے کار سرکاری حاکموں نے کی تھی۔

ذفرن نے ان حالات کی تفتیش کا حکم دیا۔ لیکن اس کی رپورٹ عام لوگوں سے پوشیدہ رکھی گئی یہاں تک کہ ولیم ڈبلیو نے مسٹر بریڈلائم۔ پی کے ذریعے ان تک رسائی حاصل کی اور اپنی کتاب Prosperous British India میں دی جانے والی اطلاعات کے لیے انہیں استعمال کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس ڈور سے اس کا مطالبہ رد کر دیا گیا کہ ”اس رپورٹ سے بڑی احتیاط کے ساتھ اقتباسات نکلے جائیں گے اور انہیں ہمارے خلاف استعمال کیا جائے گا اور آئندہ برسوں تک وہ بحث کا موضوع بنے رہیں گے۔“⁽⁴⁾ کمس تفتیش سے ظاہر ہوا کہ پورے ملک میں کسان مقروض ہیں اور بہت زیادہ لگان ادا کرتے ہیں۔ اور یہ کہ کسانوں کے نچلے طبقوں کے بڑے حصوں میں انتہائی غربت اور افلاس پھیل جاتا ہے۔

کاشت اور خاندان کی بحث کے متعلق صوبائی حکموں اور حاکموں کی تفصیلی تفتیشوں نے ان نتائج کی تصدیق کی۔ ان میں سے کچھ ذیل میں درج ہیں۔⁽⁵⁾

(1) یہ اسوات کے سرحدی علاقوں جن کے متعلق عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ کم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ولیم ڈبلیو کا اندازہ تھا کہ 1899-1900ء میں ساڑھے بیس لاکھ افراد مرے تھے مقابلہ کیجئے Prosperous British India، صفحہ 13۔

(2) مدراس کانگریس کانگریس، اکتوبر 1887ء

(3) ہنٹر۔ ڈبلیو، ڈبلیو، بحوالہ، غذا کی سپلائی کا انحطاط، صفحات 133-166

(4) سکریٹری آف انڈینٹ کے نام خط، مورخہ 13 دسمبر 1902ء

(5) مالگورای، زراعت اور تجارت (قسط 4) دسمبر 1888ء، صفحات 191

”بڑا عظیم کے بڑے حصے میں پھولے پھولے کسانوں کو پانی پینے کے لیے روز کنواں کھودنا ہوتا ہے۔“
 ”پلاویوں کی حالت، جو پریسٹنٹی میں آبادی کے 25 فی صدی ہیں، عام طور سے بہت خراب ہے“ (حکومت مدراس)۔

”بہار میں مزدوروں، دست کاروں اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی مجموعی آبادی ایک کروڑ تین لاکھ ہے۔ ان میں 40 فی صدی موٹا جھوٹا کھاکر گزارہ کرتی ہے اور دن میں دو دفعہ کے بجائے محض ایک دفعہ کھانا کھاتی ہے“ (حکومت بنگال)

”لوگوں کے غریب طبقوں اور نیم بھک مری کے درمیان کچھ نہیں ہے۔“ (الہ آباد کالمیشن)
 ”غریب طبقوں کے پاس روٹی ہے نہ کپڑا۔ وہ خراب قسم کے چاولوں اور پالک کی ترکاری سے پیٹ بھرتے ہیں جس میں تیل نہیں ہوتا۔ عام طور سے وہ دن میں ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔“ (اڈیسہ کا سول سرجن)

”اچھے اور برے سال میں فرق یہ ہے کہ اچھے سال میں لوگوں کی غذا کا نصف حصہ جڑیں اور بونیوں پر مشتمل ہے اور برے سال میں تین چوتھائی حصہ“ (پنجاب مین جمبا)
 ایک ضلع افسر گلارک نے اوسط پیداوار کے پانچ ایکڑ کے کھیت کا آمدنی اور خرچ کا تخمینہ لگایا اور مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے

آمدنی	اخراجات	
خریف	لگان	75/-
ربیع	کاشت کے اخراجات	93/-
	مناافع	45/-
213/8	213	

450 روپیہ کے منافع میں سے کاشتکار کو غذا، کپڑے، گھر اور خاندان کی دوسری ضروریات پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔ کھانے پر 43 روپیہ اور کپڑے پر 8 روپیہ خرچ ہوتے تھے۔ اس کی وجہ 46 روپیہ کا خسارہ ہوتا تھا جو وہ قرض سے پورا کرتا تھا۔ مسٹر کروک نے لکھا تھا ”میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ اس طبقے کے ایک انسان کا بیلنس شیٹ تیار کروں جس کا نتیجہ یہ ہے“ (1)

اگر اُس زمانے کی فی کس آمدنی پر غور کیا جائے تو یہ بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ قحطوں میں تکلیفوں اور بھک مری کی وجہ غربت تھی۔ سرکاری اور غیر سرکاری اشتیاق نے 1868ء سے 1900ء کے برسوں کے کئی تخمینے لگائے ہیں۔ مسٹر وی۔ وی۔ بھٹ نے بڑی جدت سے کام لیتے ہوئے یہ کوشش کی ہے کہ کسی مخصوص سال یا مسئلہ برسوں کی ایک تعداد کے اوسطوں کی بنیادوں پر ان اوسطوں کے مطابق دھان کی قیمت کا حساب لگایا جائے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پچھلی صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں فی کس

آمدنی کم ہو رہی تھی اور یہ کہ اعداد و شمار سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ معاشی نمو تا کھل تھا۔ (1) ڈنیل تھورنر بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ (2) اُس نے لکھا تھا ”مگر غور کیا جائے تو برطانوی حکومت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زراعت کی سماجی بنیاد میں بڑی تبدیلی آگئی لیکن پیداوار کے بنیادی طریقوں اور تکنیک کی سطح پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔“ نئے سماجی سماج کی بالائی طبقوں نے خوب منافع کمائے۔ کسانوں کی حالت بڑی بدتر ہو گئی۔ زراعت کے ترقی دینے کیلئے جس سرمائے کی ضرورت تھی وہ نہ مل سکا اور مجموعی پیداوار کی سطح محدود کا شکار ہو گئی۔ (3)

فصلوں کے اہم نتائج ہوئے۔ اُن کا اثر آبادی کے بڑھنے کی شرح پر پڑا یعنی 1872ء سے 1889ء تک بمبئی پریسڈنسی میں 2.05 فی صدی کا اضافہ ہوا، اسی مدت میں مدراس میں 1.25 فی صدی کا اضافہ ہوا، میسور میں دس سال میں آبادی میں 17.09 فی صدی کی کمی ہوئی اور کوچین میں 6 سال میں 14 فی صدی کی کمی ہو گئی۔ آبادی کی کمی کی بڑی وجہ بلک مرئی نہیں تھی بلکہ قحط کے ساتھ پھیلنے والی وباؤں اور وسیع پیمانے پر پائی جانے والی غذا کی کمی تھی جس نے لوگوں کی صحتیں خراب کر دی تھیں۔ آبادی اور غذا کی سپلائی میں توازن برقرار رکھنے کا ایک خالصانہ نگر قد رتی طریقہ تھا قحط۔ اگر بار بار قحط پڑے ہوتے تو انیسویں صدی ہی میں آبادی اور غذا کے مسائل بڑی پیچیدہ شکل اختیار کر لیتے۔

فصلوں نے زراعت کی ترقی کو روک دیا۔ کاشت کے پرانے طریقے برقرار رہے، ترقی دینے کی خواہش پوری نہ ہو سکی اور جانوروں کی ہلاکت نے بحالی کی رفتار سست کر دی۔

بعد کے اور خاص طور سے 1895ء اور 1900ء کے درمیان پڑنے والے قحطوں میں لوگوں کی صحتیں تو خراب ہوئیں اور اُن کی اخلاقی ہمت میں کمی آئی لیکن ان کے موذی اثرات یہ ہوئے کہ دو فصلوں کا علاقہ کم ہو گیا اور صنعتی اور برآمد کی جانے والی فصلوں کے بجائے غذائی اجناس کی کاشت کی

مال	کس نے تخمینہ لگایا	کس آمدنی	دھان کی قیمت	دھان کی رو سے	فی کس آمدنی
		(روپیہ)	(مدراس اور اتر پردیش کی فی کس آمدنی)	(مدراس اور اتر پردیش کی فی کس آمدنی)	(۱۸۷۳ء کی قیمتوں کے تناسب سے)
1850ء	ڈنیل	30/-	15 آنے	32/-	x
1867-68	دوا اہائی اور ڈوئی	20/-	ایک روپے دس آنے	15/4	24/25
1875ء	انگلش	30/-	ایک روپے دس آنے	15/4	24/05
1880ء	ڈنیل	22/5	ایک روپے دس آنے	15/4	24/05
1882ء	بارنگ اور ہاپور	27/-	ایک روپے دس آنے	15/4	24/05
1895ء	انگلش	39/5	دو روپے نو آنے	12/7	23/12
1899ء	ڈنیل	18/-	دو روپے نو آنے	12/7	23/12
1900ء	کرزن	30/-	دو روپے نو آنے	12/7	23/12

(2) ڈنیل تھورنر، ہندوستان کی پیداوار کے طویل المدتی رجحانات Eco. Growth, Brazil, India, Japan (1955ء)، صفحہ 127۔
 باغیچہ کاشت و غیرہ (ایک ریویو، 1955ء)، صفحہ 127۔

(3) ایسا، صفحہ 127

(1) آر۔ گیل، "The Industrial Evaluation of India in Recent Times" صفحات 26, 28, 95, 96

جانے لگی۔ (1) جہاں تک غذائی مسئلے کا تعلق تھا اس کو ایک صحت مندر رجحان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح ظاہر ہے کہ غریب طبقوں کی حالت انتہائی غیر اطمینان بخش تھی جو ہندوستان کی آبادی کی ایک بڑی اکثریت تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اُن کی حالت یکساں رہی یا خراب تر ہو گئی لیکن اس امر کا ناقابل انکار ثبوت موجود ہے کہ ان کروڑوں انسانوں کی تباہی اور بربادی کی کوئی انتہا نہایت نہیں تھی۔ لیکن اس دائمی دکھ میں بھی وہ اتنے فرماں بردار اور صابر تھے اور اُن میں اتنی زیادہ قوت برداشت تھی کہ جب تک پانی سر سے اونچا نہیں ہو جاتا تھا اُس وقت تک وہ اپنی غیر اطمینانی کا مظاہرہ کرنے کی خاطر احتجاج بھی نہیں کرتے تھے۔ انہیں وقفاً وقفاً احتجاج کرنا پڑتا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات ناقابل برداشت تھے۔

60-1858ء میں پہلی بغاوت بنگال میں ہوئی جب باغ داروں کے مظالم کے خلاف نسل کے کاشتکاروں میں شورش پھوٹ پڑی۔ اُس کے بعد 1873ء میں پٹنہ میں فداوت ہوئے۔ 1872ء میں دکن کے کچھ ضلعوں یعنی پونا اور احمد نگر میں کسانوں کے بلوے ہوئے۔ 79-1878ء میں پارک پور اور پیک پارا کے کسانوں نے حکومت سے انتہائی اونچی شرح لگان کی شکایتیں کیں۔ اس مسئلے کی اہمیت اور دکھوں کی زیادتی کو دیکھتے ہوئے یہ حالات چھوٹے چھوٹے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے کے بعد اس قسم کے حالات بھی بہت کم ہو گئے۔ کسانوں کو کانگریس کی شکل میں ایسا فورم مل گیا جو اُس کی شکایتیں پیش کر سکتا ہے اور اُس کی حمایت کرنا ایک منظم ادارہ تھا۔

V تجارتی انقلاب (1858ء لغایت 1905ء)

ریلوے اور تار برقی

ہندوستان کی معاشی ترقی کے لیے عوامل مواصلات و بار برداری کے ذرائع میں ہونے والے انقلاب نے مہیا کر دیے جن کی وجہ سے اُس کی گھریلو اور بدیس تجارت کو فروغ ہوا۔ ہندوستان میں ریل کی پٹری بچھانے کیلئے پہلا معاہدہ 1848ء میں کیا گیا لیکن ابتداء میں اس کی رفتار افسوسناک حد تک سست تھی۔ 1853ء میں پہلے 21 میل لمبی پٹری بچھائی گئی اور 1857ء تک محض 288 میل لمبی ریلوے لائن پر لوگوں نے سفر کرنا شروع کیا۔ 1857ء کی بغاوت کے بعد سیاسی فوجی اور سامراجی ضرورتوں کے پیش نظر تیزی کے ساتھ ریلوں کی توسیع دی جانے لگی۔ (2) انکشاف دباؤ ڈال رہا تھا جس کی خواہش تھی کہ ہندوستان

(1) ڈی۔ آر۔ گینڈھل The Industrial Evaluation of India in Recent Times صفحات 26، 28، 95، 96

(2) میک فرسن۔ ڈیلیو۔ جے، ہندوستانی ریلوں میں اصل کاری، 1845ء اکٹاک ہنری راپو، سکنڈ سیریز

میں ریلوں کا جال بچھ جائے تاکہ انگلستان کو برآمد کرنے کیلئے کپاس بندرگاہ تک لائی جاسکے (1) اس کے علاوہ اس زمانے میں انگلستان بڑی مقدار میں سرمائے دنیا کے دوسرے حصوں میں بھیج رہا تھا۔ (2) اور 1875ء تک اصل کاری کی سب سے اہم مشکل تھی ریلیں۔ (3) پھر بھی ریلوں کیلئے ہندوستان کو اصل تباہ کن شرائط پر مہیا کیا گیا۔ 1869ء تک فوجی برطانوی کمپنیوں نے ریلیں تعمیر کیں جن کا حکومت سے معاہدہ تھا اور اصل پر پانچ فی صدی منافع کی ضمانت کی گئی تھی۔ ریلوں پر اخراجات اور ان میں ملازمتوں پر حکومت کا کوئی اختیار نہیں تھا اور کمپنیوں کو کم خرچ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے کہ ان کے اصل پر 5 فی صدی منافع کی ضمانت تھی۔ ہندوستان میں ریلیں بنانے کے لیے ریلوں کی کمپنیوں نے جو مجموعی طور سے ضمانت شدہ اصل حاصل کیا وہ 49-1848ء میں 42 لاکھ تھا اور 69-1868ء میں بڑھ کے 83 کروڑ 42 لاکھ ہو گیا۔ (4) اسی مدت میں جو ریلیں سواری کیلئے کھول دی گئیں وہ 49-1848ء میں صفر سے لے کر 69-1868ء میں 4016 میل ہو گئیں۔ 1862ء میں ہتر لاکھ افراد نے ریلوں سے سفر کیا۔ یہ تعداد 1869ء میں بڑھ کے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہو گئی۔

اگرچہ اپنی جگہ پر یہ کارنامہ بڑا تھا پھر بھی حکومت اس سے مطمئن نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ضمانت کا نظام ایک بڑا مالیاتی بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ لیکن کمپنیاں ضمانت کے فوائد سے مستفید ہونے کے بعد ہندوستان میں بغیر ضمانت کے اصل کاری کرنے کیلئے تیار نہیں تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1869ء کے بعد حکومت نے خود ریلیں بنانی شروع کر دیں۔ لیکن پالیسی کی یہ تبدیلی اس وقت ہوئی جبکہ حکومت پر مالیاتی

(1) ایک فرس کے مطابق جی۔ پی۔ ریلوے کی منظوری 1849ء میں اس کے بنانے والوں جیمز اس آف کلمرس، پارلیمنٹ کے ممبر اور سلیٹ کمیٹی کے ریلوے کیلئے لائن سمیٹی کے اُن اصرار سے گزرتی تھی جہاں کپاس مہیا ہوتی تھی۔ 1850ء میں بی بی سی آئی آر کی تعمیر کے لئے بھی اسی قسم کا ریلوے لائن مگریت ریلوے میں بھی کپاس کی بنا پر بننے والا ریلوے کھاسا تھا۔ ہر ایک جنگل کے دوروں انگریز تاجروں کو ہندوستانی کپاس کی بڑی فکر تھی۔ 1861ء میں پندرہ میل لمبی ٹھٹھہ والی ہندوستانی ریلوے لائن کپاس کے علاقوں کی محض سرحدوں کو چھوتی تھی اور نئی کمپنیوں کو منظوری دینے کے لئے حکومت سے درخواستیں کی جانے لگیں۔ سر گیری آف اسٹیٹ کے پاس بہت سی پیدائشی ماٹھر ریلوے کلاسوں کے آئیں۔

(2) مسٹر ڈیل نے تیس سال کے اندر (5 برسوں کے وقفے سے) انگلستان نے بدیس میں جو اصل کاری کی وہ کھائی جا رہی ہے۔

سال	خالص اصل کاری	سال	خالص اصل کاری
1852ء	218	1887ء	1,576
1857ء	270	1892ء	2,005
1862ء	394	1897ء	2,252
1867ء	523	1902ء	1,431
1872ء	764	1907ء	2,750
1877ء	1088	1912ء	3,568
1882ء	1255		

(ماخذ: Economic Elements in Pas Britanica، لبرٹ اصلاح صفحہ 180)

(3) پد منیر، رچرڈ، سلطنت کی تاریخ میں معاشی امور، اکوٹاکہ سنری ریویو پوسٹ سیریز، جلد VIII (1937ء)

(4) 31 دسمبر 1869ء کو ہندوستانی ریلوں کی لمبائی مجموعی اصل تھی 48.72 ملین پاؤنڈ اور اس پر نو اونس والے سود کی مجموعی رقم تھی 29.8 ملین پاؤنڈ، اصل کی 35 فی صدی۔

دباؤ زیادہ پڑ رہا تھا۔ 1868-69ء کے پنجاب اور راجپوتانہ کے قحط نے 1873ء کے بنگال کے قحط نے اور 1876ء کے بمبئی اور مدراس کی پریسٹنسیوں کے قحط نے حکومت کا مالیاتی بوجھ بہت بڑھا دیا تھا۔ 1872ء میں چاندی کا مین الاقوامی بھاؤ گرنا شروع ہوا اور یہ سلسلہ 1893ء تک جاری رہا جب روپے کی آزاد سکہ سازی کرنے والی ملک سالیس بند کر دی گئیں۔ اس کی وجہ سے روپیہ کی قیمت مبادلہ گر گئی اور حکومت کی مالی دشواریاں بڑھ گئیں۔ لندن کی منڈی سے حکومت ہندوستان کے قرض لینے کی حد کو سکرٹری آف اسٹینٹ نے بار بار کم کیا اور اُس کے ہاتھ باندھ دئے (1) ان دشواریوں اور بڑھتے ہوئے اخراجات کے باوجود حکومت اپنے ارادے پر قائم رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 70-1869ء میں 4,265 میل لمبی جوہری پتھر کی تھی وہ دس سال میں 79-1878ء میں 8,212 میل لمبی ہو گئی۔ لیکن ترقی کی یہ رفتار ہندوستان میں برطانوی تجارت کے نقطہ نظر سے تو اطمینان بخش تھی لیکن حکومت کی قحط کی پالیسی کے نقطہ نظر سے غیر اطمینان بخش تھی۔ 1880ء کے قمیص کمیشن نے سفارش کی تھی کہ اگر بڑے بڑے قحطوں سے بچتا ہے تو موجودہ ریلوں میں مزید 10,000 میل کا اضافہ فوری طور سے کیا جائے۔ چونکہ حکومت اپنے وسائل سے ریلوں کو اتنی توسیع نہیں دے سکتی تھی اس لیے نجی کمپنیوں کو ضمانت کا طریقہ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ پھر شروع کر دیا گیا۔ اس طریقے میں جس منافع کی ضمانت کی گئی تھی وہ پچھلے طریقے کے 5 فی صدی کے بجائے ساڑھے تین فی صدی تھا۔ پالیسی کی اس دوسری تبدیلی کا نتیجہ فوراً سامنے آیا۔ 1880ء کے بعد ملک میں تیزی کے ساتھ ریلوں کی توسیع ہوئی۔ 79-1878ء اور 90-1889ء کے درمیانی گیارہ سال مدت میں ریلوں کی لمبائی 8,212 میل کی دغنی یعنی 16,44 میل ہو گئی۔ 1900-1899ء میں اس کی لمبائی بڑھ کے 23,763 میل اور 6-1905ء میں 28,604 میل ہو گئی۔ 1869ء میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ اشخاص نے ریلوں میں سفر کیا تھا جن کی تعداد 1906ء میں بڑھ کے بیس کروڑ اکھتر لاکھ ہو گئی۔ اس طرح 1906ء میں ریلوں میں نقصان کے بجائے 24,75 ملین پاؤنڈ کا منافع ہو (2) اب ریلوں سے اصل پر تقریباً 6 فی صدی کا منافع ہونے لگا تھا۔ (3)

اس دور ان ہندوستان میں تار برقی کی لائنیں بچھانے میں بڑی زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے معلوم ہوتا ہے۔ (4)

سال	کتنے میل	دفاتر کی مجموعی تعداد	تاروں کی مجموعی تعداد	مجموعی آمدنی
1860-61ء	11,592	145	x	6
1870-71ء	12,538	197	577	13

(1) سلیکٹ کمیٹی رپورٹ مفاد عامہ کے کاموں کے متعلق، 1876ء۔

(2) ان میں سے 157655 ملین پاؤنڈ ریاست کے منافع ہوا اور بقیہ کمپنیوں کو ضمانت شدہ اور مالی ادا ہونے والی ریلوں کمپنیوں نے جو اصل لگایا تھا 1899-1900ء میں 84,84 ملین پاؤنڈ تھا۔ اُس کے بعد حکومت نے ضمانت شدہ ریلوں کو خریدنا شروع کر دیا اور اُس کے بعد کمپنیوں کا اصل 1906-7ء میں گھٹ کر 57,49 ملین پور 12-1911ء میں 40,42 ملین پاؤنڈ ہو گیا۔

(3) اصل پر خالص منافع 1903ء میں 5,54 فی صدی، 1904ء میں 6 فی صدی، 1905ء میں 6,07 فی صدی، 1906ء میں 5,96 فی صدی تھا۔

(4) کے ایل۔ رت۔ Report on enquiry into rise of prices in India (کلکتہ، 1914ء) صفحہ 23

39	1,656	254	20,346	1880-81ء
52	3,407	949	37,070	1890-91ء
93	6,449	1,936	55,055	1900-1ء
93 (کڑا)	12,090	2,856	74,828	1910-11ء

1870-71ء اور 1910-11ء کی درمیان 40 سالہ مدت میں ملک میں تارگھروں کی تعداد میں 14 گنا زیادہ کا اضافہ ہو گیا اور تاروں کی مجموعی تعداد میں پائیس گنا زیادہ کا بھی 71-1870ء میں اُن کی مجموعی تعداد میں 5,77,000 جو 1910-11ء میں ہو گئی تھی 13,090,000۔ اس کے ساتھ ملک میں ڈاک کی سہولتیں بھی بہت بڑھ گئیں۔ مختلف ڈاک گھروں میں 1812ء میں جوکل خط، اخبار اور پارسل آئے اُن کی تعداد تھی 47.14 ملین جو 81-1880ء میں ہو گئی 158.6 ملین 90-1889ء میں 312 ملین اور 6-1905ء میں 6645.13 ملین۔

داخلی مواصلات اور بار برداری کے ذرائع کو وسیع کرنے پر صغیر میں معاشی استحلا کو فروغ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے مختلف حصوں میں اشیاء کی قیمتوں کا فرق داستان پارینہ بن گیا۔ (1) بارش کی کمی کا اثر جو ملک کے ایک حصے پر پڑتا تھا وہ محض اُس حصے تک محدود نہیں رہتا تھا بلکہ پورے ملک میں محسوس کیا جاتا تھا۔ غربت و افلاس کی تقسیم زیادہ مساویانہ انداز سے ہو گئی۔ اس کے ساتھ مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے باہمی روابط اور مواصلات میں زیادہ آسانی پیدا ہو گئی جس کی بنا پر خیالات و جذبات کی یکجہتی اور ہم آہنگی ممکن ہو گئی۔

ہندوستان میں ریلوں اور تار برقی کی توسیع کے ساتھ بحری سفر میں دو اہم واقعات رونما ہوئے اُن میں سے پہلا تو تھا 1869ء یعنی نہر سوئز کا کھلنا اور دوسرا تھا ہندوستان کی جہاز رانی میں انقلاب جو اس وقت پیدا ہوا جب ہندوستان کی سمندری تجارت میں بادیانی جہازوں کی جگہ بھاپ سے چلنے والے جہازوں نے لے لی۔ نہر سوئز کے کھل جانے کی بنا پر ہندوستان سے یورپ کے فاصلے میں 3000 میل سے زیادہ کی اور سفر کی مدت میں 35 دن کی کمی ہو گئی۔ اسی کے ساتھ بھاپ سے چلنے والے جہازوں میں زیادہ مال جانے لگا جس سے بار برداری کے کرائے میں بڑی کمی ہو گئی۔ 1873ء میں کلکتہ سے لیورپول جانے والے ایک نئی زراعتی مال کا کرایہ تھا 55 شنگ۔ لیکن 1882ء میں وہ گھٹ کر 27 شنگ رہ گیا تھا۔ (2) بار برداری کے اخراجات میں اس بڑی کمی کی وجہ سے ہندوستان کا زیادہ تر مال یورپ کی منڈیوں میں روس، کننا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مال کے ساتھ موثر انداز سے مقابلہ کرنے لگا جو انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی منڈیوں کو گریہوں، کپاس اور کچھ دوسری زراعتی پیداوار سپلائی کرنے کے بڑے ذریعے تھے۔

بدقسمتی سے بار برداری کی سہولتوں میں توسیع کچھ اس طرح کی گئی کہ اُن سے برطانوی

(1) برنٹن، *India Economic life, Past & Present*، صفحہ 1109 اس کے علاوہ ہیر ڈاسمہ، شمال مغربی صوبجات کے قلعہ (1860ء) کا اثرا انجسٹر کی تجویز پر کے متعلق رپورٹ۔ اسمہ کے مطابق اُن زمانے میں بار برداری کے ذرائع اتنے خراب تھے کہ "ایک منڈی میں اگر قلعہ کی قیمت 12/4 ہٹی من تھی اور دوسرے بازار میں جو 30 میل کی دوری پر تھا، اُس چیز کی قیمت صرف 1/8 من تھی۔

(2) جوشی۔ جی۔ وی، نولہ بالا، صفحہ 628

سامراجی مفادات کو قائم ہوا لیکن ہندوستان کی معاشی ترقی کو نظر انداز کیا گیا۔ ریلوے لائنوں کے بچانے اور کرائے مقرر کرنے سے برطانوی تجارت کو فائدہ ہوا یعنی ہندوستان سے برآمدات اور ہندوستان میں درآمدات کو پورے داخلی تجارت اور ہندوستان کی صحت مند صنعت کاری کو نقصان ہوا۔

مثال کے طور پر ریل کے لائنیں اس طرح بچائی گئی تھیں کہ صنعتی مرکزوں سے منڈیوں تک مال بچانے میں وہ معاون نہیں تھیں۔ کچھ کھلوں کو جہاز کے ذریعے بچانے کے لیے جب بندرگاہ لانا ہوتا تھا تو اس پر جو کرایہ دیا جاتا تھا وہ اس کرایے کے مقابلہ میں 50 فی صدی کم ہوتا تھا جو ملک کے اندر ایک مقام سے دوسرے مقام کو بچانے میں دینا پڑتا تھا۔ ملک میں بار بار درباری کے ذرائع بنانے کی صنعت قائم کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی اور صنعت کاری کی ترقی کی مخالفت کی جاتی تھی۔ (1)

بدیہی تجارت

ذرائع آمدورفت میں جو انقلاب ہوا تھا اس کے اسلاکات ہندوستان کی ڈرامائی انداز سے بڑھتی ہوئی سمندری تجارت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ 1860-61ء میں ہندوستان کی مجموعی برآمدات کی مالیت، جن میں خزانے بھی شامل تھے، 23.97 کروڑ تھی لیکن 1906-7ء تک یہ بڑھ کے 177 کروڑ ہو گئی تھی۔ امریکہ کی خانہ جنگی کے دوران وہاں سے مال نہ آنے کی بنا پر 1862ء میں ہندوستان کی کپاس کی مانگ انگلستان میں یک لخت بڑھ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1860-61ء میں ہندوستان سے ہونے والی برآمدات کی مالیت 32.97 کروڑ تھی جو 1863-64ء میں 65.63 کروڑ اور 1864-65ء میں 68 کروڑ ہو گئی۔ 1865-66ء میں برآمدات کی مالیت تھی 65.49 کروڑ۔ امریکہ میں امن قائم ہو جانے کے بعد لنگا سٹار میں ہندوستانی کپاس کی مانگ گر گئی اور ہندوستان کی برآمدات کی مالیت 1966-67ء میں گھٹ کر 41.86 کروڑ رہ گئی لیکن 1868-69ء میں وہ بڑھ کے پھر 53 کروڑ ہو گئی۔ 1869ء میں نہر سوئز کے کھلنے اور آٹھویں دہائی میں مال کے کرائے میں کمی ہونے کی بنا پر ملک کی برآمدات کو فروغ ہوا اور 1880ء کے بعد تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے۔ 1879-79ء میں برآمدات کی مجموعی مالیت تھی 60.94 کروڑ، 1888-89ء میں وہ بڑھ کے 97 کروڑ 1898-99ء میں 115 کروڑ اور 1806-7ء میں 177 کروڑ ہو گئی۔

درآمدات میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ 1861-62ء میں درآمدات کی مالیت محض 22.23 کروڑ تھی جو 1869-70ء میں بڑھ کے 32.93 کروڑ ہو گئی۔ نہر سوئز کے کھلنے کے بعد درآمدات بڑھ کے 1880-81ء میں 53.11 کروڑ، 1890-91ء، (2) میں 71.97 کروڑ اور 1906-7ء میں 127 کروڑ ہو گئے۔

ہندوستان کی بدیہی تجارت میں اس عجیب و غریب اضافے کے نتائج کیا ہوئے؟ برطانوی حکمرانوں نے اس کو ملک کی بڑھتی ہوئی خوشحالی کا ناقابل تردید ثبوت سمجھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یورپ کی منڈیوں کو ہندوستانی زراعت کی پیداوار بھیجنے کے مواقع بڑھ گئے ہیں جس کے نتیجے میں زراعت کی آمدنی اور ملک میں زرعی آمد بڑھ گئی ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ انگلستان میں ہونے والے تکنیکی ترقی سے ہندوستانی صارفین کو فائدہ ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ برطانوی صنعتوں کی مصنوعات اس سے کم قیمت پر

(1) یوسر کے Population of India & Pakistan، حصہ ششم، جلد 22

(2) یہ قدامتال تھا اور اس لئے درآمدات اس دہائی کے اوسط سے کم تھے۔

حاصل کر لیتے ہیں یعنی قیمت انہیں اس وقت اور کرنی چتی اگر وہ اشیاء ہندوستان میں بنائی جلتھیں۔

تجارتی پالیسی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی بدلیسی تجارت کی مرکبات کو ان عناصر نے شکل نہیں دی تھی جو ان ملکوں کے معاشی رشتوں کا تعین کرتے ہیں جو کھلیسی ماہرین معاشیات کے خیال کے مطابق قدرتی وسائل اور پیداوار کی بنیاد پر آزادی کے ساتھ بین الاقوامی تجارت میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کا تعین حکمران سماجی طاقت کی ضرورتوں کے دباؤ کے تحت کیا گیا تھا۔

ایک طرف تو حکومت ہند نے ریلوں کی ترقی کے لیے خزانہ عام سے اعانت کی اور دوسری طرف ممالک غیر کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی رشتوں پر آزاد تجارت کے اصولوں کا سختی کے ساتھ اطلاق کیا۔ 1864ء میں سر چارلس ٹریوٹین نے حکومت کی تجارتی پالیسی کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ”ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ حتیٰ الوسع ہم تجارت کی آزادی میں حائل ہر رکاوٹ کو دور کریں جیسا کہ انگلستان میں اس کے تعلق سے کیا گیا۔“ (۱) لیکن انگلستان میں آزاد تجارت کو رواج دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے لیے مفید تھی۔ صنعتی اعتبار سے انگلستان بقیہ دنیا سے آگے تھا اور اپنے لوگوں کے لیے غذا اور اپنے کارخانوں کے لیے خام مال چاہتا تھا۔ اس کے برعکس ہندوستان ایک زراعتی ملک تھا جو غذائی اجناس اور خام مال برآمد کرتا تھا اور مصنوعات درآمد کرتا تھا۔ آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل کرنے میں ہندوستان کی حکومت کا مقصد ہندوستان کی پیداوار بڑھانے کے بجائے برطانوی برآمدات میں اضافہ کرنا تھا۔ سر چارلس ٹریوٹین نے کہا تھا ”ہندوستان کی تجارت میں بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ وہ اتنی مقدار میں اشیاء درآمد نہیں کر پاتا ہے کہ وہ اس کی قابل برآمد بڑی مقدار میں ہونے والی پیداوار کا بدلہ ہو سکے جو یہ ملک باہر بھیجنے کیا استعداد رکھتا ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی تجارت کو دشواریوں سے بچانا چاہتے ہیں اور اس کو مزید توسیع کے آزاد مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اس کے درآمدات کی ہر امکانی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔“ (2)

ہندوستان کی آزاد تجارت کی حمایت میں یہ عجیب و غریب دلیل دی گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ حکومت ہندوستان کی معاشی پالیسی انگلستان کے کپڑے کی صنعت کے مفادات کے پیش نظر بنائی جاتی تھی جس کے لیے ہندوستان میں سوتی کپڑے کی صنعت کی نموباعث تشویش تھی۔ مانچسٹر اور لکشاٹئر نے برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے حکومت ہندوستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس صنعت کی نشوونما کو روکنے کی ہر امکانی کوشش کرے۔ (3) چنانچہ برطانوی حکومت نے ایک تجویز کے ذریعے حکومت

(1) 1882-83ء کے لیے سر دی۔ بارنگ کا مالیاتی بیان، پیراگراف 233 (2) ایضاً

(3) جیسا کہ کانن نے کہا تھا ہندوستان کے حاصل کی تاریخ پر مانچسٹر کے سرمایہ داروں کا اثر صاف نظر آتا ہے جس طرح امریکی سرمایہ دار امریکی منڈی کو اپنے لئے محفوظ و مخصوص رکھنے چاہتے تھے اسی طرح وہ مانچسٹر کے سرمایہ دار ہندوستان کی منڈی کو برطانوی صنعت کاروں، تاجروں تک کاروں اور جہازرانوں کے لئے مخصوص رکھنا چاہتے ہیں۔ برطانوی سیاست کے ایک بااثر طبقے کے ساتھ تمام حکومتیں بھی ہیں۔ ”Development of Capitalistic Enterprise in India“ (میک ملن، نیو یارک 1934ء، صفحہ 4655) اسی طرح لارڈ کرزن نے ٹیکس، لندن، مورخہ 15 جون 1908ء ایک خط میں کلرک اعتراف کیا کہ ”1875ء میں جب ہندوستان کو درآمدات پر حاصل ٹیکس کرنے کا حکم دیا گیا اس وقت سے اسی پالیسی میں بار بار جو تبدیلیاں کی گئیں وہ زیادہ تر کاٹناٹر کے دباؤ کی بنا پر کی گئی تھیں۔“

ہندوستان سے کہا کہ ایوان کی رائے میں ہندوستان جانے والے سوتی مصنوعات پر جو ڈیوٹی لگائی جاتی ہے وہ تاریخی نوعیت کی اور صحت مند تجارتی پالیسی کے منافی ہے اس لیے جب بھی ہندوستان کی مالی صورت حال اس امر کی اجازت دے اسے بلا تاخیر منسوخ کر دیا جاتا چاہے۔⁽¹⁾

اُس وقت ہندوستان کو اپنے تاریخ کے بدترین نقطہ کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اور اس کی مالی حالت نازک تھی۔ حکومت نے محض آمدنی بڑھانے کے لیے سوتی کپڑے پر 5 فی صدی کی درآمد ڈیوٹی لگانے کا فیصلہ کیا۔ لکناؤ شائر نے اس فیصلے کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اس لیے کہ اُس کا خیال تھا کہ یہ ڈیوٹی ہندوستان کی سوتی کپڑے کی صنعت کے لیے تاریخی غایت ہوگی۔ حکومت ہندوستان کو مجبوراً ڈیوٹی کو منسوخ کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ظاہر ہے نہ آزاد تجارت کے اصولوں سے لگاؤ تھا اور نہ اُس ملک کی معیشت کے مفاد کا خیال بلکہ اس کو محض برطانوی سوتی کپڑے کے مفاد میں منسوخ کیا گیا تھا۔

ڈیوٹی کی منسوخی کے بعد بھی لکناؤ شائر مطمئن نہیں ہوا اور اُس نے ہر قسم کے سوتی کپڑے پر ہر قسم کی ڈیوٹی بنانے کا مطالبہ کیا۔ اس موضوع پر ایک مراسلے میں سکریٹری آف انڈیا نے زور دیا۔ ”اس میں کسی مبالغے کی گنجائش نہیں ہے کہ ایک اتنی بڑی صنعت کو، جیسی کہ ہندوستان کپڑے کی صنعت بالفرض دور ہو جاوے گی ایک ایسے نظام کے تحت غور کرنے کی اجازت دینا مناسب نہیں جسے ہمارا وسیع تجربہ غیر صحت مند ثابت کر چکا ہے اور جو انگلستان کی سوپی سبھی پالیسی کے منافی ہے۔ مجھے یہ بات بھی خطرے سے خالی نہیں معلوم ہوتی ہے کہ قدرتی اسباب کے نتائج کے بغیر ہی اُس تجارت کو رفتہ رفتہ ختم کیا جائے جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان خوشحالی کے سب سے استوار رشتوں میں سے ایک ہے۔“⁽²⁾ چنانچہ 1879ء میں سوتی مال پر ہر قسم کی ڈیوٹی کی منتسج کی وجہ سے سامراجی دباؤ تھا۔ حکام کو اس کا کھل کے اعتراف کرنا پڑا کہ ”ہندوستان کے علاقے کی وسعت اور سازگار حالات اس امر کے منافی ہیں کہ وہ انسان کی ضرورت کی قریب قریب ہر شے پیدا کر سکے۔“⁽³⁾ اس لیے اگر ہندوستان کی منڈیوں میں انگریزی مال کی نوبت برقرار رکھی تھی تو یہ ضروری تھا کہ مقابلے کی صنعتوں کو ترقی دینے سے ہندوستان کو باز رکھا جائے۔

آزاد تجارت کی پالیسی کو 1896ء میں اُس وقت مضحکہ انگیز شکل دی گئی جب درآمد ہونے والے سوتی مال پر لگائی جانے والی آمدنی کی ڈیوٹی کی شرح کے بقدر ہندوستان کے کارخانوں میں بنائے جانے والے تمام سوتی کپڑے پر ”مستلائی ڈیوٹی“ لگائی گئی۔ یہ ڈیوٹی ہندوستان پر اس لیے لگائی گئی تھی کہ اپنے مفاد میں ہندوستان منڈیوں کا استحصال کرنے میں وہ انگلستان کے صنعت کاروں کی مدد کرے۔

مواصلات اور آمد و رفت کے ذرائع کی توسیع اور آزاد تجارت کی پالیسی نے ملک کی بدیسی تجارت میں اضافہ کر دیا مگر ملک کی خوشحالی نہیں بڑھی۔ اس کی صراحت و شواہد نہیں ہے۔ اُس وقت ہندوستان خام مال اور غذائی اجناس برآمد کرتا تھا جنہیں غیر ترقی یافتہ زراعت کے ذریعہ پیدا کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ ایسی چھوٹی چھوٹی اشیاء درآمد کرتا تھا جیسے سوتی کپڑا اور ریشمی کپڑا جو تھوڑے سے سرمائے اور مہارت کے ساتھ خود ملک کے اندر اُس خام سے پیدا کی جاسکتی تھیں جو دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اگر اس قسم کی صنعتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو اُس کے نتیجے میں بدیسی تجارت بڑھنے کے بجائے اُس میں

(1) پہلے آف کانگریس تجویز، مورخہ 11 جولائی 1877ء

(2) ایالتی بیان، حکومت ہندوستان، 1878-79ء، (نمبر 1249، مورخہ 13 مارچ 1879ء)، بیج آف 199

(3) حکومت ہندوستان کی تجویز (مالیاتی) نمبر 1911، مورخہ 18 مارچ 1879ء، بیج آف 55

عاری طور سے کچھ کی ہو جاتی۔ (1) لیکن انگلستان چاہتا تھا کہ بدیسی تجارت کو معاشی سامراج کے مقاصد پورا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ بنائے۔ (2) اس لیے ملک کی بدیسی تجارت کے حجم میں اضافہ ملک کی بہتر معاشی صحت کے بجائے ہندوستانی معیشت پر سامراج کی بڑھتی ہوئی گرفت اور برطانوی صنعت کار اور اصل کار کے مفاد میں ملک کے وسائل اور اس کی منڈیوں کے بڑھتے ہوئے استحصال کا نتیجہ تھی۔

برطانیہ کے باہر اعداد و شمار اے۔ ایل۔ باؤلے نے 1893ء میں کہا تھا ”ہندوستان اور ہماری نو آبادیات میں تجارتی اعتبار سے کچھ باتیں مشترک ہیں۔ دونوں ہمارے خصوصی مصنوعات یعنی سوئی کپڑا اور مشینوں کی باقاعدہ منڈیوں کی حیثیت سے ہمارے لیے مفید ہیں اور دونوں نے ہماری تجارت کو نقصان پہنچائے بغیر دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے کی اس اجازت سے فائدہ اٹھایا ہے جو صدی کے وسط میں بڑی پچکاہٹ کے ساتھ دی گئی تھی۔“ (3)

چنانچہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت نے 1860ء کے بعد برطانیہ کی سامراجی معیشت میں ایک روز افزوں اہم تر جگہ بنالی۔ 1870ء یا 1875ء تک برطانیہ دوسرے یورپین ممالک کو قرض دیکر اپنے سرمائے کی اصل کا رزاکر رہا تھا۔ لیکن 1875ء کے بعد ایک بڑی تبدیلی ہو گئی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سلطنت کے ملکوں کو زیادہ سے زیادہ سرمایہ جانے لگا۔ برطانوی اصل کاروں نے اپنے روسی اور دوسری حکومتوں کے بانڈ بیچ دئے اور ریلوں کے اسٹاک خرید لیے۔ (4) کریمیں ان ملکوں میں بنائی گئیں جو برطانیہ کو زیادہ تر غذائی اجناس، کپاس اور دوسرا خام مال مہیا کرتے تھے۔ انہوں نے قرض خواہ ممالک سے برطانیہ کو ان چیزوں کی سپلائی بڑھادی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آخر تک ان ملکوں کے ساتھ توازن ادائیگی میں خسارہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہوا۔ ”خطرے سے بچنے کے لیے جس طرح ہندوستان کو استحصال کیا گیا اس سے اور بھی فائدہ ہوئے۔ جزوی طور سے

(1) جدید زمانے کے ایک سرکردہ برطانوی ماہر معاشیات ہنری ڈیڈشل کے بقول ”مکمل تجارت کے حجم سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ ملک کی بدیسی تجارت کے بڑھنے کا امکان بالبرآمد کرنے کی طاقت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ لیکن ان صنعتوں کی ترقی سے اس کی بدیسی تجارت میں کمی ہو سکتی ہے جن میں وہ مقابلہ کر رہا ہو۔ اس لیے کہ یہ ترقی اس کی درآمدات کی فروخت کو کم کر دے گی۔“ اس بیان سے ہندوستان کی صورت حال کی ابھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس میں صرف اتنی ترمیم کرنی ہوگی کہ ہندوستان کی بدیسی تجارت ”دوسرے ملکوں میں صنعتوں کی تیزی کے ساتھ ہونے والی ترقی“ کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ آمدورفت کے ذرائع میں تیزی سے ہونے والی توسیع کا نتیجہ تھی۔ اس میں بھی شک ہے کہ بدیسی تجارت کی ترقی کے نتیجے اس بات کے لیے کہ ”معیشت کی ترقی کے ساتھ قومی معیشت میں بدیسی تجارت کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔“ جس کو برصغیر عالم در سوم برٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور سوم برٹ کے قانون کا نام دیا گیا دیکھئے۔ کے۔ ڈیوش اور اے۔ اٹکین، National Industrialisation & the declining share of International Eco. Section 1890-1995ء، ورلڈ

پالیٹکس، 13 (1961ء)، صفحات 99-297

(2) پروفیسر کوچیز کا کہنا ہے ”معاشی سامراج کو محض اس وقت مفہوم ملتا ہے جب مفادات کا تعلق تجارت، صنعت اور اصل کاری کے میدانوں سے ہو۔ جب یہ مفادات سرمایہ داروں کے اپنے بین کرہوں کے ہاتھوں میں ہوں جو مخلوق سے خود مستفید ہوتا ہے۔ جب وہ معاشی مفادات کا ایسا لازمی جز ہوں جس پر وہ کم کورنسٹ کو توجہ دیتی ہے۔“ معاشی سامراج کا تصور کوہنک

ہنری ڈیوش، جلد 32، دوسرا سلسلہ (1949ء)، صفحہ 10

(3) باؤلے، اے۔ ایل، England's foreign trade (لندن 1892ء)، صفحہ 70

(4) کریں کر اس، اے۔ کے، Home & Foreign Investments، صفحہ 188

ہندوستان کے ساتھ روابط کی بنا پر انگلستان طرف کی روکوں کی ضربوں میں زندہ رہ سکا۔ برطانوی مال کے لیے ہندوستانی منڈی کھلی رہی اور اُس کے خلاف طرف پر ہندوستانی برآمدات نے قابو پالیا۔ (1) اس کی وضاحت پٹ سن کی خصوصی صورت حال سے ہوتی ہے۔ "1887-91ء سے 12-1909ء برطانیہ کے پٹ سن کے مال کی مجموعی برآمدات 250 ملین گز کے اوسط سے کم ہو کر 170 ملین گز رہ گئے اس لیے کہ "ہندوستان کے مال نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، اسٹریلیا اور اونچے طرف والی جنوبی امریکی منڈیوں کو بھی ختم کر لیا تھا۔" (2) لیکن برطانیہ کے بدلیسی منڈیوں کی ہندوستانی پٹ سن کے مال کے لیے فتح سے انگلستان کو نقصان نہیں ہوا اس لیے ہر سال ہندوستان پٹ سن اور پٹ سن کے مال کی برآمدات کے منافع میں سے دس ملین پاؤنڈ برطانیہ کے ڈالر کے حسابات کے سلسلہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ادا کرتا تھا "جو خود ڈنڈی کے اعتراف کے مطابق وہ طرف کی رکاوٹوں کی بنا پر نہیں کر سکتا تھا۔" (3)

1858ء سے پہلے ہندوستان کو ادائیگی کے بحرانی توازن کا سامنا کرنا پڑا۔ (4) اُس کی دست کاریاں تباہ ہو چکی تھیں اور وہ برطانوی مصنوعات کی بڑی مقدار درآمد کرنے لگا تھا۔ نیل کی طرح کی اشیاء درآمدات برطانوی منڈیوں میں کم ہو رہی تھیں اور اہم کی جنگوں نے اُس تہمت پر کاری ضرب لگائی تھی جو زرمبادلہ حاصل کرنا ہندوستان کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں برطانوی مال کی درآمد کے بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی ادائیگی کے توازن کی صورت، لیکن پٹ سن، کپاس اور چائے کی صنعتوں کی ترقی اور بھاپ کے ذرائع آمدورفت نے اس مسئلے کو حل کر دیا۔

VI۔ معاشی نکاس

حالانکہ درآمدات میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا جو پھر بھی 1862ء کے بعد تجارت کا توازن مسلسل ہندوستان کے موافق رہا۔ (5) اپریل 1862ء سے مارچ 1905ء تک کی تینتالیس برسوں میں درآمدات کے مقابلے میں 1288.23 کروڑ کے فاضل برآمدات ہوئے جس کا اوسط ہوا 31.29 کروڑ فی سال ہے۔ اس کے عوض ہندوستان نے 508.81 کروڑ کا سونا اور چاندی درآمد کی۔ بقیہ یعنی 7806.42 کروڑ کی رقم ملک کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے پر خرچ کی گئی جو انگلستان کے ساتھ سیاسی اور معاشی روابط کی بنا پر اُس پر عائد ہوئی تھیں اور اُس کو "بعد عوض" برآمدات سمجھنا چاہیے۔

ادائیگیائی نوروہی اور ریمیش چندر کی طرح کے ماہرین معاشیات اور ہندوستان کی رائے عامہ کے رہنماؤں نے اس ادائیگی کو "خران" سے تعبیر کیا جو انگلستان کو ہندوستان ادا کرتا تھا اور ملک کی بڑھتی

(1) ایضاً (2) سول، نولہ بالا۔

(3) ایضاً، صفحہ 65۔

(4) سلیکٹ ٹیکسٹ کی رپورٹ (1839ء) مالیات اور حسابات، تجارت، جلد دوم، حصہ دوم، صفحہ 577 منسٹر مینٹل آپ کی شہادت

(5) 1855-56ء سے 62-1861ء تک ہندوستان کی درآمدی فاضل کی رقم تھی 5.322 کروڑ۔ اس خسارے کا بڑا حصہ یعنی 20.95 کروڑ 57-1856ء اور 60-1859ء کے درمیانی چار برسوں میں ہوا تھا جس کو 1857ء کی بغاوت کا راست نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔

ہوئی غربت و افلاس کی ذمہ داری ”ہندوستان سے ہر سال ہونے والے دولت کے نکاس“ پر ڈالی (1) اس نکاس کا ایک حصہ ”گھریلو اجات“ کی نمائندگی کرتا تھا جو ان ادائیگیوں پر مشتمل تھے جو ہندوستان کی طرف سے مندرجہ ذیل کے لیے انگلستان کو جاتی تھیں۔ لوگوں کے قرض کا سود ادا کرنے کیلئے صحافت اور اجات شدہ ریلوں کا سود اور سالانہ ادا کرنے کے لیے، اُن قرضوں کا سود ادا کرنے کے لیے جو مفاد عامہ کے دوسرے کاموں کی خاطر لیے گئے، اُن سول اور فوجی حکام کی چھٹیوں کے اخراجات اور پیشوں کے لیے جو ہندوستان میں ملازمتوں سے چھٹی پر آتے تھے یا ٹائر ہوئے تھے، انگلستان میں سکرٹری آف انیٹ کے دفتر کے اخراجات کیلئے اور اُس مال کے لیے جو حکومت ہندوستان کے مختلف شعبوں کو مہیا کیا جاتا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ در آمدات کی ایسی ”غیر مرئی“ آمدات پر ہونے والے اخراجات پر مشتمل ہوتا تھا جیسے بدلی بجک کاری، عید اور جہاز رانی کی کمپنیوں کی خدمات۔ بدلیوں کے کاروبار کے منافع جیسے چائے کے باغات، پت سن کے مصنوعات اور کان کی اور برطانوی افسروں اور تاجروں کی ہندوستان سے بھیجی جانے والی نجی رقمیں۔

1835ء اور 1871ء کی درمیانی مدت میں سالانہ فاضل در آمدات کی خالص مالیت تھی 461 ملین پاؤنڈ۔ (2) 1871-72ء میں یہ رقم بڑھ کے 21.03 کروڑ ہو گئی (3) لیکن اُس کے بعد کم ہو گئی اور 1890-91ء تک قریب قریب 16 سے 18 کروڑ رہی۔ اُس کے بعد دو گنا بڑھ گئی اور 1891-92ء میں 27.3 کروڑ، 1892-93ء میں 30.28 کروڑ اور 1894-95ء میں 34 کروڑ روپے تھی۔ 1903-4ء میں یہ رقم 29.9 ملین پاؤنڈ (27 کروڑ روپے) تھی۔ اسی طرح اس زمانے میں ”گھریلو اخراجات“ بھی بڑھ گئے تھے۔ 1884-85ء میں یہ اخراجات 11.4 ملین پاؤنڈ تھے۔ 1888-89ء میں 14.8 ملین پاؤنڈ، 1901-2ء میں 17.4 ملین پاؤنڈ اور 1904-5ء میں 19.4 ملین پاؤنڈ۔

استعماریت کے زمانے میں سالانہ ان رقموں کی ادائیگی ہندوستان اور برطانوی مصنفین کے درمیان ایک طویل اور نزاعی بحث کا موضوع بنی رہی ہے۔ برطان کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ ادائیگیاں اُس اصل کے سود اور منافع کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انگلستان نے جس کی اصل کاری اس ملک میں کی تھی۔ ہندوستان کے قومی رہنماؤں میں ایم۔ جی۔ راناؤے کی طرح کی بلند قامت شخصیت بھی پچھلی صدی کے آخر میں اس نقطہ نظر کی حامی تھی۔ صنعتی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ (4) ”پچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ جب تک ہر انگلستانی وہ بڑا اخراج ادا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہر سال 20

(1) (1) اوبائی نوروجی Poverty and Un-British Rule (لندن 1901ء)، صفحات 26-33

(2) غلامی اور برادری ترقی کی رپورٹ، 1872-73ء، صفحہ 107۔ سر راج وینکھیل کی ایک رپورٹ مورخ 14 ستمبر 1872ء کی رو سے انگلستان کو برآمد کئے جانے والے تجارتی مال کی قیمت تھی 121 ملین پاؤنڈ اور آمد ہونے والے مال کی قیمت تھی 58.3 ملین پاؤنڈ جس میں 42.9 ملین پاؤنڈ بھاری 15.4 ملین پاؤنڈ جس کو اگر 37 سے تقسیم کیا جائے تو مالانہ وسط آتا ہے 4.1 ملین پاؤنڈ

(3) (3) اوبائی نوروجی کے حساب سے یہ رقم 5.35 ملین پاؤنڈ سالانہ ہوتی ہے۔ اگر اس میں تجارت کا منافع اور انیم کی خالص آمدنی بھی جوڑی جائے جس کا ذکر تجارت کے حسابات میں نہیں کیا گیا ہے۔ مقابلہ کیجئے Poverty & Un-British Rule، محول بالا، صفحات 33-34

(4) (4) اس نقطہ کے بہترین نمائندے ہیں تھیوڈور مارٹن E. Co. Transition in India، باب 8، پریسبٹ Development of India، ضمیرہ۔

لروڑ روپے لے فاضل در آمدات ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں اُس وقت تک ہماری نجات ممکن نہیں ہے اور اپنی مدد کرنے کیلئے کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ موقف نہ منصفانہ ہے اور نہ جرأت آمیز۔“ انہوں نے صنعت کاروں سے بزور الفاظ میں کہا ”آپ خراج کے سوال پر فنشول بحث میں اپنی قوت عمل صرف نہ کیجئے جس کو سیاسی کانگریسیوں پر چھوڑ دیا جانا چاہئے۔“ اس کے برعکس بہت سے انگریزوں نے، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں، اس موضوع پر مختلف موقف اختیار کیا۔ (1) 1878-79ء کے مالیاتی بیان میں اس سلسلے میں کہا گیا۔ (2)

”ہندوستان کے معاشی حالات کی ایک خصوصی نوعیت ایسی ہے جس نے اس بات کو (ملک کی فاضل پیداوار کو صرف کرنے کا کوئی بڑا اور سازگار ذریعہ) زیادہ ضروری اور زیادہ اہم بنادیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ انگلستان کی ساتھ اُس کے روابط اور اُن روابط کے مالیاتی نتیجوں کی بنا پر وہ مجبور ہے کہ ہر سال اپنی پیداوار کا تقریباً 20 ملین پاؤنڈ کا حصہ یورپ بھیجے جسکے عوض اُسے اتنی مالیت کا تجارتی مال نہیں ملتا ہے۔ درآمدات کے مقابلے میں یہ فاضل درآمدات ایسے ہیں جنہیں ماہرین معاشیات کی زبان میں خراج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان وجوہات کے بنا پر ہندوستان کی تجارت کی نوعیت غیر معمولی ہو گئی ہے جو اُسے اس سے باز رکھتی ہے کہ وہ اس کے بدلے میں باہر سے آنے والا تجارتی مال اور خزانہ پائے اور اُس سے پورا تجارتی فائدہ حاصل کرے جو عام حالات میں اُس کے وسیع مادی وسائل کی بنا پر اُسے حاصل ہوتا چاہیے۔“ اسی طرح زمرے میکنڈلڈ نے لکھا تھا۔ (3) ”ایک بدیسی حکومت کے تحت ان بلا معاوضہ اخراجات کی دہری خصوصیت ہے اس لیے کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی پیداوار میں سے لیے جاتے ہیں بلکہ خود ہندوستان سے چھین لیے جاتے ہیں۔۔۔۔ اس کی وجہ سے پیداوار کے دھارے میں سے پانی کی بڑی مقدار نکال لی جاتی ہے جس کی معنی غربت و افلاس ہوتے ہیں۔“ اس نے مزید کہا۔ (4) اگر باہر بھیجا جانے والا خراج بھاری ہو تو وسیع پیمانے پر خوشحالی نہیں ہو سکتی ہے۔“

ایک مشہور امریکی مصنف نے لنڈ سنکس نے اس موضوع پر یہ کہا۔ (5) ”اخراجات کا وہ بوجھ جو ہندوستان پر ڈالا گیا بہت غیر معقول تھا۔ غدار کے اخراجات کبھی کے حقوق تاج کو منتقل کرنے کے اخراجات، چھین اور اہلی سینیائ کے خلاف جنگوں کے اخراجات اور لندن میں ہر اُس سرکاری مد پر ہونے والے اخراجات جن کا دور کا تعلق بھی ہندوستان سے نہیں تھا۔ یہاں تک کہ انڈیا آفس میں کام کاج کرنے والی عورت کی اجرت، اُن جہازوں پر ہونے والا خرچ جو گئے تو لیکن کسی کسی لڑائی میں حصہ نہیں لیا اور ہندوستان کو جانے سے پہلے چھ مہینے تک ہندوستان جانے والی فوج کو انگلستان میں تربیت دینے کے اخراجات۔ یہ کام اخراجات کا بوجھ اُن کسانوں پر ڈالا جاتا تھا جن کو نمائندگی حاصل نہیں تھی۔“ 1868ء میں ترکی کا سلطان لندن گیا اور سرکاری تاج کا انتظام انڈیا آفس میں کیا گیا اور اُس کے اخراجات ہندوستان کو برداشت کرنے پڑے۔ ہندوستان کے خزانے سے اسی قسم کے اصراف بنیادی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

(1) اس موضوع پر کئی برطانوی حاکموں کی راپوں کے متعلق دیکھئے دلا بھائی نوروجی، تحویل، 11، صفحات 54-38.

(2) مالیاتی بیان کی تجویز، نمبر 1911، مورخہ 18 مارچ 1878ء، پیڑ آف 52.

(3) اُس کے میٹلڈلڈ The Government of India، صفحہ 148.

(4) ایڈا، صفحہ 149.

(5) سنکس، ایل۔ ایچ تحویل، 11، صفحات 324-323، مزید دیکھئے دلی میٹن نے سامنے بٹانے نے بیان، 1885ء، صفحہ 149.

مہاتما گاندھی کے ایک قرضی ساتھ ہے۔ نئی کمار پاسی تفصیلات سے پہنچتے ہوئے یہی بات انگلستان کے ہندوستان پر قرض اور اس کے سود کی سارا نہ لوانگی کی تائید انسانی کے متعلق کہی ہے۔ (1) یہ غیر پیدہ اداری قرض زیادہ تر انگلستان نے خود ہندوستان کو فتح کرنے اور ایشیا اور افریقہ میں سامراجی مفادات کی جنگیں لڑنے کی خاطر لیا تھا اور ہندوستان کو وہ ادھر لڑتا پڑا۔ چونکہ یہ بڑے بڑے قرض ان لڑائیوں اور ان مفادات کو حاصل کرنے کی خاطر لیے گئے تھے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے یہ بوجھ ہندوستان پر ڈالنا کسی طرح بھی منصفانہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

چنانچہ ”گمرطہ اخراجات“ اور ”خراج“ کی یہ بحث زیادہ تر اخلاقی سطح پر کی گئی لیکن جو بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ان ادائیگیوں کا کیا اثر ہندوستان کی معیشت پر پڑا۔ ان ”بلا معاوضہ برآمدات“ کے سوال پر ماہرین معاشیات نے پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اس وقت پہلی مرتبہ تنبیہ کی ہے جب جرمنی سے تیل، جنگ و وصول کرنے کا سوال اٹھا۔ (2)

ہے۔ ایلم۔ کیمیز نے (جو بعد میں اراڈ کیمیز ہو گیا) اس موضوع پر مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی (3) اس بات کو سرسری طور سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ملک کی فاضل پیدہ اور اس کے نتائج کا تعلق ہے معیار زندگی کا گرتا (جو خراج اور لڑنے کی وجہ سے ہوا) یکطرفہ عمل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کسی ایسی سفید نسل کی نفسیات کا تجربہ نہیں ہے جو قریب قریب غلامی کی زندگی بسر کرتی ہو۔ لیکن عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی انسان کی تمام فاضل پیدہ اور اس سے چھین لی جائے تو اس کی کارکردگی اور محنت کم ہو جاتی ہے۔ صنعت کار اور اصل کار، تاجر اور دکاندار بچت نہیں کریں گے اور مزدور محنت نہیں کرے گا اگر ان کی محنت لے چل ان کے بچوں کو نہ ملیں یا ان کے بڑھاپے میں کام نہ آئیں یا ان کی عزت اور حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال نہ کئے جاسکیں بلکہ ان سے بدلیسی فائینین استفادہ کریں۔ جو بات سفید نسل کے لوگوں پر صادق آتی ہے۔ لیکن چونکہ ہندوستان ایک آزاد ملک نہیں تھا اس لیے وہاں سے ”دولت کے مسلسل نکاس“ اور اس کی معیشت پر اس کے تباہ کن اثرات کو کسی یورپین ماہرین معاشیات نے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن اوپر پچھ دن سے ماہرین معاشیات غیر ترقی یافتہ معیشتوں کو ترقی دینے کے تعلق سے اس سوال پر بحث کرنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر ہیری جی۔ جانسن نے بین الاقوامی تجارت پر معاشی نمو کے ہیروڈ۔ ڈومر طریقے کا اطلاق کرتے ہوئے معاشی ترقی پر ”بلا معاوضہ برآمدات“ کے اثرات کو جاننے کے لیے ایک ریاضی کا فارمولہ پیش کیا ہے۔ (4) اس فارمولے کے مطابق اگر مسلسل فاضل برآمد کی موجودگی کی بنا پر ملک کی بچت کی رائج الوقت شرح کم ہوتی ہے تو معاشی

(1) مہاتما گاندھی، Public Finance and our Poverty (نومبر 1921ء) صفحات 29-30

(2) ایلم۔ کیمیز، Econ. Consequences of Peaces صفحہ 192۔ حاشیہ بزرگ، تنبیہ برمن، نقلی کا مسئلہ، اکوٹام جرنل، جلد XXXIX (مارچ 1929)، صفحات 7-1 اور برمن، اکوٹام کا مسئلہ، ایک بحث، اکوٹام جرنل، XXXIX (جون

1929)، صفحات 173-172

(3) کیمیز، تحول، ص 193۔ حاشیہ۔

(4) ہیری جی۔ جانسن، International Trade & Eco. (لندن 1959ء) صفحہ 122

نمو کی شرح بھی اس حد تک کم ہو جاتی ہے۔ اُس کے الفاظ میں۔ (۱) اگر کسی زمانہ میں تباہی فاضل پر برآمد کم ہوتی جاتی ہو اور اگر برآمدات کی نمو کی شرح طبعی شرح نمو سے زیادہ ہو تو آخر الذکر اُس مدت میں کم ہوئی۔ ”گھریلو اخراجات“ کو منصفانہ سمجھا جائے یا غیر منصفانہ لیکن اس خیال سے اختلاف مشکل ہی سے کیا جا سکے گا کہ ان ادائیگیوں کا معیار ہندوستانی معیشت کے نمو پر بڑا فاضل برآمد بچانے اور اصل کاری کرنے کی طاقت کم کر دی اور اس طرح ملک کی معاشی ترقی کو روک دیا۔

جیسا کہ دوا بھائی نور دوجی اور آر۔ سی۔ دت نے کہا ہے اس معنی کہ خراج کی ادائیگی اور ملک کے بڑھتے ہوئے قسطوں میں ایک راست تعلق تھا۔ دوا بھائی نے اس پر زور دیا کہ تشکیل اصل کی نیچی شرح اور صنعتی ترقی کی سست رفتار نکاس کے راستہ جیتے تھے۔ دت اس سے بھی آگے بڑھ گئے انہوں نے نکاس کو غذائی اجناس کی برآمدات اور اس کے نتیجے میں ملک میں غذا کی قلت اور اُس کی اونچی قیمتوں سے جوڑ دیا۔ انہوں نے لکھا ”کسی حد تک تکلیف دہ ہونے کے باوجود اس پر نظر ڈالنا بڑا سبق آموز ہے۔ انگلستان کو جانے والے سالانہ معاشی نکاس کی قیمت ہندوستان کی آمدنی سے راست ادائیگی جاتی ہے۔ ہندوستان کی آمدنی کا بڑا حصہ مالگوار کی شکل میں زمین سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ مالگوار کی عام طور سے جنوبی ہندوستان میں کسانوں سے اور شمالی ہندوستان میں مالکان اراضی سے وصول کی جاتی ہے جو خود کسانوں سے لگان وصول کرتے ہیں۔ کسان اپنے کھیتوں کی پیداوار کا بڑا حصہ فروخت کر کے مالگوار یا لگان ادا کرتے ہیں اور اپنے لیے ناکافی ذخیرہ رکھتے ہیں۔ برآمد کرنے والے تاجروں کے گماشتے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں جو وہ مال خرید لیتے ہیں جسے فروخت کرنے پر کسان مجبور ہوتا ہے۔ ریلیں بلا تاخیر یہ مال بند گاہوں تک پہنچا دیتی ہیں جہاں سے وہ یورپ جاتا ہے۔ سردیوں میں آنے والے سیاحوں کی ہندوستان میں بڑی سرگرمیاں نظر آتی ہیں جب ہر بڑے شہر اور منڈی میں یہ خرید فروخت ہوتی ہے لیکن غلے کی تجارت کے خوشگوار منظر کے پیچھے یہ واقعہ چھپا ہوتا ہے کہ ایک زراعت پیشہ قوم کے گھر اور گاؤں مہلک حد تک غذا سے خالی ہو جاتے ہیں تاکہ ہر سال انگلستان کو وہ خراج ادا کیا جاسکے جو ہندوستان سے وصول کرنا چاہتا ہے۔“ (2)

چنانچہ ہندوستان کو باہر سے آنے والے اصل اور بدلی حکومت کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ”نکاس“ نے اس کی پخت اور اصل کاری کے استعداد کو کھادی اور اس طرح صنعتی ترقی روک دی۔ (3) اس کے علاوہ ملک کو اس پر مجبور کر کے کہ وہ خراج کے جزوی ادائیگی کے طور پر غذائی اجناس برآمد کرے (4) اس نے ملک میں غذا اور آبادی کے پرخطر توازن کو اور خراب کر دیا۔ اس نے ہندوستان میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں بار بار بڑنے والے قسطوں اور قلتوں میں اضافہ بھی اس کی وجہ سے ہوا۔

(1) یہ فارمولہ سر رائے بیروڈ کے معاشی نمو کے طریقے سے راست اخذ کیا گیا ہے اور اُس کا ترجمہ ہے۔ دیکھو Towards a

Dynamic Eco. (1948)۔

(2) دت۔ آر۔ سی۔ وکٹوریہ کے عہد میں معاشی تاریخ (دوسرا ایڈیشن 1906ء)، صفحات 49-348۔

(3) ”نکاس“ پر دوا بھائی نور دوجی نے پہلے کی بڑی نیلہ یہ تھی۔ دیکھئے ملی کمیشن کے سامنے اُن کی شہادت، تقریریں اور تحریریں۔

(4) ہندوستان میں پانچویں کی قیمت، برمن آف رائل اکیڈمی۔ اصل سہ ماہی (1892ء) نے اعتراف کیا کہ نقطہ اے دوران بھی ملک سے غذائی اجناس بے برآمدات کو ممنوع نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی وجہ سے گھریلو اخراجات کی ادائیگی میں نقص پیدا ہو جائے۔

شرائط تجارت

ہندوستان یہ ادائیگیاں کرنے کے باوجود ہر سال کچھ سو تا اور چاندی درآمد کر کے اس کی وجہ سے
تھی کہ اس کی پیداوار کی اچھی قیمتیں ملتی تھیں۔ 1861ء سے 1914ء تک ”شرائط تجارت“ ہندوستان کے
حق میں رہیں۔ مجموعی اعتبار سے دنیا میں 1876ء کے بعد شرائط تجارت زراعتی ملکوں کے خلاف اور صنعتی
ملکوں کے حق میں ہونے لگی تھیں۔ اقوام متحدہ تنظیم کی مطبع کے مطابق (1) یہ رجحان اس کے بعد سے برابر
بین الاقوامی معاشی سطح پر نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے شرائط تجارت اس کے حق
میں کم از کم پہلی عالمگیر جنگ کی ابتداء تک رہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتا ہے۔

نقشہ

ہندوستان کی خالص مبادلے کی شرائط تجارت۔ (2)

سال	مبادلے کی شرائط (تجارت برآمدی قیمت کا اشاریہ)	سال	مبادلے کے شرائط تجارت (برآمدی قیمت کا اشاریہ)
1861ء	92.6	1866ء	87.8
1862ء	92.6	1867ء	87.8
1863ء	82.4	1868ء	111.3
1864ء	78.5	1869ء	110.5
1865ء	80	1870ء	108
1871ء	111	1891ء	122.5
1872ء	100	1892ء	121
1873ء	103	1893ء	126
1874ء	105.5	1894ء	131
1875ء	99	1895ء	127.6
1876ء	125	1896ء	124.6
1877ء	135.7	1897ء	144.2
1878ء	125	1898ء	127.5
1879ء	125	1899ء	115
1880ء	115	1900ء	129.1
1881ء	111.8	1901ء	120.8
1882ء		1902ء	131.5

(1) کے۔ ایل۔ رت۔ Report on rise of prices (1914ء)، باب 5

(2) Relative price of Agricultural and Manufactural Commodities (1948ء)

مبادلے کے شرائط تجارت
(برآمدی قیمت کا اشاریہ)

سال

مبادلے کی شرائط
(تجارت برآمدی
قیمت کا اشاریہ)

سال

120.8	1905ء	112	1883ء
132.4	1906ء	123	1884ء
125	1907ء	121.3	1885ء
142.4	1908ء	116.2	1886ء
134.3	1909ء	113.2	1887ء
116.5	1910ء	106.5	1888ء
120	1911ء	114.3	1889ء
124	1912ء	114.3	1890ء
131	1913ء	117	1903ء
140	1914ء	111.8	1904ء

اس کی وجہ کئی تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اُن 128 شیاؤں سے جن پر برآمدات کی قیمتوں کے اشاریہ کا انحصار تھا غذائی اجناس تھیں۔ چونکہ اس زمانے میں غذائی اجناس کی قیمتیں ہندوستان میں بڑھ رہی تھیں اس لیے درآمدات کے مقابلے میں برآمدات کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو گیا اور اس کے نتیجے میں شرائط تجارت ہندوستان کے موافق ہو گئیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہندوستان مقروض ملک تھا اور اس کی بنا پر اُس کو ہر سال سود اور دوسری رقمیں ادا کرنی ہوتی تھیں جس کی وجہ سے بدیسی منڈیوں میں اُس کی پیداوار کی قیمتیں زیادہ تھیں۔ کوئلہ کارک کے مطابق ”جب صنعتی ممالک بین الاقوامی قرض دینے میں عملی طور سے مصروف ہوتے ہیں تو اُس زمانے میں شرائط تجارت اصل پیداوار کنندگان کے موافق ہوتی ہیں اور دیگر حالات میں اس کے برعکس صورت ہوتی ہے۔“ (1) 1875ء سے 1914ء تک انگلستان بڑی بڑی رقوں کی اصل کاری ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں کر رہا تھا اور اصل کی بڑی بڑی برآمدات (2) کے نتیجے میں اُس ملک کی شرائط تجارت میں کساد بازی پیدا ہو گئی جو اُن ذرائع ملکوں کے موافق تھی جن کے ساتھ تجارت کرتا تھا۔

برآمدات کی نوعیت اور مشتملات، دولت کی سالانہ نکاس اور حکومت کی آزاد تجارت کی پالیسی نے بدیسی تجارت کو ہندوستان کی معاشی ترقی کا ذریعہ نہ بننے دیا۔ جیسا کہ کنڈل برگر نے کہا

(1) کارک کوئلہ، Condition of Eco. Progress، صفحہ 466

(2) اگر انگلستان نے اصل برآمد کر کے اس زمانے میں اپنی تمام بدیسی اصل کاری کی ہوتی تو شرائط تجارت اور زیادہ اس کے موافق ہو جاتے لیکن حقیقت میں اُس کی بدیسی اصل کاری کا بڑا حصہ اُن رقوں پر مشتمل تھا جو ملک کے باہر کی تھیں اس کی وجہ سے بدیسی پیداوار کی اُس کی مانگ کم ہوئی اور شرائط تجارت کو بہت زیادہ موافق نہیں ہونے دیکھیں کہ اُن درآمد شدہ گیسوں کے، Hume &

Foreign Investment Economic Elements in Par Britanica (لندن اور مصلاح)

ہے۔ ”برآمدات کی بنا پر ترقی ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے اس ترقی کے لیے یہ شرط ہے کہ اصل کی تشکیل ہو، ٹھنکی تبدیلی ہو اور وسائل کا زبردستی نو تعمیر ہو۔“ جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا ان میں سے کوئی شرط پوری نہیں ہوئی۔ ”کاس“ نے تشکیل اصل کی شرح کو کم رکھا اور بدیسی تجارت میں زراعتی پیداواروں پر توجہ مرکوز کرنے کی وجہ زراعت اور صنعت میں محنت اور اصل کا تعمیر نہیں کیا جاسکا۔

جدید کارخانوں کی صنعتوں کے علاوہ زراعت اور صنعت میں تکنیکی قدیم ہی رہی۔ انیسویں صدی میں جو خصوصی حالات ہندوستان میں پائے جاتے تھے ان میں زیادہ کے مقابلے میں کم تجارت ملک کی معاشی ترقی کے لیے مفید ہوئی۔ (i)

ہندوستان کی بدیسی تجارت میں جو انقلابی اضافے ہوئے اس کا بڑا تقسیمی اثر ملک کی معیشت پر پڑا۔ تجارت کرنے والے طبقات تجارت کی وجہ سے دولت مند ہو گئے۔ چونکہ جہاز رانی، بنک کاری، بیمہ، اور برآمد درآمد کی تجارت قریب پوری بدیسیوں کے ہاتھوں میں تھی اس لیے برآمد درآمد کرنے والے اداروں کے مال تقسیم کرنے والے ایجنٹوں کی حیثیت سے ہندوستانی کام کرتے تھے۔ غلہ جمع کرنے والے اور کمیشن ایجنٹ، دلال اور زراعتی پیداوار کے تاجر، بنک کار اور دیگی ساہوکار، زمیندار، دکاندار اور درآمد کنندہ کے جانے والے مال کے تقسیم کاران سب کو بڑھتی ہوئی بدیسی تجارت سے فائدہ ہوا اور وہ دولت مند ہو گئے۔ چنانچہ تجارتی طبقات اور انہی کی طرح دیہاتی سرمایہ دار اور زمیندار زیادہ دولت مند اور طاقتور ہو گئے لیکن زراعت اور صنعت دونوں کے پیدا کرنے والے اس تجارت سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ تمام شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ کاشتکار اور دست کار زیادہ تباہ حال ہو گئے جس کی وجہ سے انہیں دشواریوں اور قحطوں کا بار بار سامنا کرنا پڑا۔

VII صنعتی ترقی

ہندوستان اور انگلستان کی باہمی رشتے کا سب سے زیادہ افسوسناک باب یہ تھا کہ انیسویں صدی میں صنعتوں کو عموماً نظر انداز کیا گیا۔ ہندوستان کی وہ پرانی صنعت برباد ہو چلی تھی جس کی وجہ سے آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کو روزگار ملتا تھا اور صدیوں تک دنیا بھر سے سونا اور چاندی یہاں آتا رہا تھا۔ دست کاریوں کی جگہ لینے کے لیے نئی صنعتیں شروع نہیں کی گئیں نہ جاپان کی طرح دست کاریوں کو نئے صنعتی نظام میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔

انگلستان کے حکمران حلقے کے ذاتی مفادات کے نتیجے میں مغرب کی نئی مشینی صنعت کو نشوونما پانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مختلف قسم کے پیشوں پر سختی سے پابندی لگائی گئی جو بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے کو حل کر سکتے تھے، سرمایہ دارانہ صنعت کی نشوونما کو روکا گیا جو زیادہ اور جلدی منافع کما سکتی تھی اور عہد وسطیٰ کی تنگ دستی کی معیشت کے دور کو غیر ضروری توسیع دی گئی۔ تجارت نے جو معیشت کی نمو کا سب

(1) اس صورت میں بدیسی تجارت کا اثر وسیع طبقے میں غیر معین ہو تا ہے، تجارت صرف اس صورت میں ترقی کا باعث ہو سکتی ہے جب باہر کے ملکوں میں مانگ صحیح ہو اور اپنے ملک میں سپلائی صحیح ہو۔ یہ تجارت اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے اگر بدیسی مانگ غلط ہو یا اپنے ملک میں سپلائی غلط ہو۔ وہ درمیانی صورتوں میں کیا ہو گا۔ یہ ہمیں معلوم ہے۔ کنڈل برگر، نولہ ۱۱، صفحہ ۳۱۱۔
ہندوستان کی حد تک مانگ ”بدیسی میں غلط تھی“ اور سپلائی اپنے ملک میں غلط تھی۔

سے بڑا ذریعہ ہے، تیزی کے ساتھ ترقی کی لیکن صنعت کاری کی عدم موجودگی کی بنا پر اس نے استعماری نظام کی بدترین خصوصیتوں کو اور پروان چڑھایا۔

1880ء کے قہقہہ کمیشن نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کی معاشی صورت حال کا لب لباب ایک جملہ میں پیش کیا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کے افلاس اور قلت کے زمانوں میں انہیں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن بنیادوں کی وجہ یہ ہے کہ بد قسمتی سے وہاں کے لوگوں کا واحد ذریعہ معاش زراعت ہے۔ موجودہ خرابیوں کا علاج اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا ہے جب تک مختلف پیشوں کو روانہ نہ دیا جائے جن کی بنا پر آبادی کا قافض حصہ زراعت کا پیشہ ترک کر کے مصنوعات یا اس قسم کے دوسرے کام کر کے اپنی گزر بسر کر سکے۔ (1) یورپ کے برعکس ہندوستان میں تجارت کی ترقی صنعت کاری کا سبب نہ بن سکی۔ بدیہی اصل ریلوں، باغوں، کانوں، بنکوں بیوں اور سرکاری قرضوں میں لگایا گیا۔ (2) لیکن چائے، بانٹ، کان کنی، لوہے سن کے کارخانوں کے علاوہ اس نے ہندوستان میں جدید مصنوعات کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ جاپان میں جرمنی میں صنعتوں نے تیزی کے ساتھ جو ترقی کی تھی اس کے برعکس ہندوستان میں صنعت کاری کی سست رفتاری کو چہرہ پر بحث کرتے ہوئے نکلس کے ڈیو بزنس کہا۔

”لیکن ہندوستان کی طرف سے ایک باج گزار ریاست تھا۔ حالانکہ دوسرے عوامل و مفادات بھی اُس میں شامل تھے پھر بھی اس کے تعلق سے انگلستان کی پالیسی، یہی تھی جیسی ایک صنعتی قوم کی زراعتی نوآبادی کے تعلق سے ہوتی ہے۔“

اُس کے بعد اُس نے صنعت کاری کو فروغ دینے میں حکومت ہندوستان کی ناکامی کے اباب کا ذکر کیا۔ قدرتی وسائل سے استفادہ کرنے کے لیے وہ قومی مفاد کے بجائے بدیہی کاروبار کو اور ہندوستانی خام مال کے استعمال کیلئے ہندوستانی پیدا کاروں کے مقابلے میں بدیہی مہم جو لوگوں کو ترجیح دیتا تھا، فوج، سول کاموں اور ریلوں کے لیے ہندوستان کمپنیوں نے بجائے برطانوی کمپنیوں سے مال خریداجاتا تھا اور اُنہی کے ایسے ضوابط بنائے گئے اور بنک کاری کے ایسے طریقے اختیار کئے گئے جو ہندوستانی مفادات کے لیے مضر تھے۔ (3)

1858ء سے پہلے لوہے کے کام، نسل کی کاشت، کاغذ سازی اور ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعتوں کی طرف انفرادی طریقے سے مہم جو افراد نے توجہ دی تھی لیکن عجیب بات یہ ہے کہ 1858ء کے ملکہ کے اس اعلان کے بعد کہ ”ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہندوستان میں پرامن صنعت کو فروغ دیا جائے“ بدیہی اصل کاروں اور حکومت دونوں نے ہندوستانی مصنوعات کو ترقی دینے میں افسوسناک حد تک ااپرواہی سے کام لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی میں اضافے اور ہندوستانی دست کاریوں کی تباہی کی بنا پر زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی گزر بسر کے لیے زراعت کی طرف رجوع کرنے لگے جس کی وجہ گلاؤں میں بے روزگاری بڑھ گئی۔ ایک طرف یورپ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان نے اپنی صنعتوں کو بڑھایا اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں بہت سے لوگوں کو زراعت سے ہٹا کر صنعتوں میں روزگار فراہم کیا لیکن

(1) قہقہہ کمیشن کی رپورٹ، حصہ 2، باب 6، صفحہ 175

(2) نکلس، جلد 1، صفحہ 25

(3) ڈیو بزنس۔ لے، Population of India & Pakistan، صفحہ 217

ہندوستان میں ”صنعتوں کو ختم کیا گیا“ (1) یہ بات مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتی ہے کہ 1911ء تک آبادی کی پیشہ وارانہ تقسیم میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ (2)

نقشہ

1871ء	1881ء	1891ء	1901ء	1911ء	کل ہند
100	100	100	100	100	کام کرنے والے (مرد)
74	74	74	75	76	(1) زراعت، جنگلات
74	74	74	75	76	مجمعی کا شکار اور عام کام
18	16	16	15	15	(2) مصنوعات سازی، کان کنی
8	8	10	10	9	تعمیر اور تجارت
8	8	10	10	9	(3) بار برداری اور دوسرے کام

دوسرے قسم کا کام کرنے والوں کی تعداد 1881ء میں 18 ویں صدی تھی جو 1901ء میں گھٹ کر 15 ویں صدی رہ گئی۔ اس زمانے میں ملک میں کئی ”صنعت کاری“ ہوئی اس کا ثبوت یہ اعداد و پیش کرتے ہیں۔ یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اس مدت میں مصنوعات سازی کے علاوہ کان کنی، تجارت اور تعمیر بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے اس زمانے میں تجارتی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں اور شہر کاری کی بنا پر تعمیری سرگرمیاں بھی بڑھ گئی ہوں گی۔ اس کی وجہ سے معیشت کے تجارتی اور تعمیری شعبوں میں روزگار کے مواقع بھی بڑھ گئے ہوں گے۔ چنانچہ ان دنوں دو شعبوں میں روزگار کے زیادہ مواقع پر نظر رکھی جائے تو مصنوعات سازی اور کان کنی میں روزگار لے مواقع کی کمی اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں کارخانوں کی صنعتیں شروع کی گئیں اور ان میں دو یعنی سوئی کپڑے اور پت سن کی صنعتوں نے تیزی کے ساتھ ترقی کی اس طرح کان کنی میں بھی ترقی ہوئی۔ 1905ء تک روزانہ اوسط 11,96,369 اشخاص سوئی کپڑے کے کارخانوں میں اور 1,33,162 پت سن کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ مقابلہ کم اہم صنعتوں میں سوئی کپڑے کے کارخانوں، کاغذ سازی کے کارخانوں، اسلحہ اور گولی بارود بنانے کے کارخانوں، شراب بنانے کے کارخانوں، کپاس صاف کرنے اور گانٹھیں باندھنے کے کارخانوں، نیل کے کارخانوں پت سن کی گانٹھیں بنانے کے کارخانوں، دھان صاف کرنے کے کارخانوں مشین آروں کے کارخانوں، شکر سازی کے کارخانوں، ریشم کے کیڑوں، لوہا اور پیتل ڈھالنے کے کارخانوں اور ٹائل کے کارخانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ 1905ء میں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی مجموعی تعداد تھی اتنی اگھ بانوے ہزار جو مجموعی آبادی یعنی تیس کروڑ کی ایک فی صدی سے بھی کم تھی۔ چنانچہ 1905ء تک روزگار کی حد تک ہندوستان کی صنعت کاری کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

ہندوستان کی صنعتی ترقی میں بدیسی اصل اور کاروبار پیش پیش تھا۔ باغ کاری یعنی نخل، چائے

(1) ڈنیل ٹھورن: De-Industrialization in India: 1881-1931ء معاشی تاریخ کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس میں

پڑھا گیا (اساکھم 1960ء)

(2) ایسنا، صفحات 224-225

کافی کی صنعت بدیسوں نے شروع کی اور حالانکہ کچھ ہندوستانی نے اصل بھی اُن میں لگایا تھا پھر بھی وہ بڑی حد تک بدیسوں کی ملکیت تھے اور وہی اُن کا انتظام کرتے تھے۔ یہی حال پٹ سن کی صنعت کا تھا۔ پٹ سن کا پہلا کارخانہ 1855ء میں ایک اسکاٹ جارج اگلیڈ نے شروع کیا تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک بہت کم ہندوستانی اصل اس صنعت میں داخل ہو سکا۔ کان کنی بھی محض بدیسوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ان صنعتوں پر بدیسوں کی اجارہ داری کی بنا پر اس کے بعد ان میں ہندوستانی اصل کے لیے گنجائش بہت کم تھی۔ ہندوستانی سرمایہ داری کے ہاتھوں میں واحد بڑی صنعت تھی سوئی کپڑے کی صنعت۔

1905ء میں 1494 مشترک سرمایہ کمپنیاں ہندوستان میں رجسٹرڈ تھیں جن کا اوشدہ اصل تھا 26.78 ملین پاؤنڈ یا 48 کروڑ روپیہ۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ وہ تمام کمپنیاں جو ہندوستان میں رجسٹر ہوئیں ہندوستان کی تھیں، جو بہت مشکوک ہے، تو پھر بھی کارخانوں اور کانوں میں لگنے والا کل ہندوستانی اصل ہوا محض 14.7 ملین پاؤنڈ اس کا مقابلہ 350 ملین پاؤنڈ برطانوی اصل سے کیا جانا چاہیے جو اُس زمانے میں ہندوستانی تجارت و صنعت میں لگا ہوا تھا۔ جس طرح مزدوروں کے لیے روزگار کے مواقع کم تھے اسی طرح جدید صنعت میں ہندوستانی اصل لگانے کے مواقع بھی محدود تھے۔

نیل، چائے اور کافی کی کاشت میں کوئلے، سونے اور میکیز کی کانوں اور پٹ سن کے کارخانوں میں انصرام، انتظام بڑی حد تک یورپیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ان صنعتوں میں ہندوستانی محض معمولی کلرکوں کی یا دوسری حیثیتوں سے کام کرتے تھے۔ سوئی کپڑے کی صنعت میں بھی، جس میں 99 فی صدی اصل ہندوستانی تھا، اس صنعت کی ترقی کے ابتدائی دنوں میں قریب قریب سبھی مل فیجر اور انفران شعبہ انکاشا سے آئے ہوئے لوگ تھے۔ (1) 1895ء میں بسبھی کے کارخانوں میں 42.4 فی صدی فیجر، تلیڈیکل انجیر اور دھنائی، کٹائی اور بنائی کے ماہر یورپی تھے۔ یہ امر قدرتی ہے کہ جب بدیسی تکنیک حاصل کی جاتی ہے تو صنعتی ترقی کے ابتدائی دنوں میں بدیسی تکنیکیں بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔ جاپان اور جرمنی کی طرح کے آزاد ملکوں کو بھی صنعت کاری کے ابتدائی مرحلوں میں اس پر عمل کرنا پڑا۔ لیکن اُن ملکوں میں وہاں کے باشندوں نے نئے فنون اور تکنیک جلدی سیکھ لیں اور تھوڑی ہی مدت بعد صنعتوں کا انتظام خود سنبھال لیا مگر ہندوستان میں اس میں بہت دیر لگی۔ (2)

ملک میں جن صنعتوں کو ترقی دی گئی وہ یا تو برآمد مائل تھیں یا ہندوستان میں بدیسی کاروبار کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انہیں ترقی دی گئی تھی۔ چنانچہ نیل، چائے کافی اور پٹ سن کی صنعتوں کی ترقی کی وجہ یہ تھی کہ انگلستان اور یورپ کی دوسری منڈیوں میں اُن کی مانگ تھی۔ کوئلے کی کانوں کو ترقی دینے کا راستہ تعلق ریلوں کے پھیلاؤ سے تھا۔ ریلوں کی وجہ، انجن سازی اور دوسری چھوٹی چھوٹی انجینرنگ کی صنعتیں بھی وجود میں آئیں۔ لیکن مشین سازی کی صنعت کو ترقی نہیں دی گئی اور جنگ عظیم کے بعد تک چھوٹی چھوٹی مشینوں کے لیے ملک کو بدیسی صنعتوں پر انحصار کرنا پڑا تھا۔ لوہے اور فواد کی

(1) کان۔ ڈی۔ ایچ۔ Development of Capitalist Enterprise in India. (نور پبلک 1924ء) صفحہ 21

(2) 1921ء میں بھی پورے ہندوستان میں یورپین مل فیجر کی تعداد مجموعی اعتبار سے 34.6 فی صدی تھی۔ جہاں تک اعلیٰ عہدوں کا تعلق تھا جن کی تنخواہیں 1000 روپیہ یا اس سے زیادہ تھیں ہندوستانی کاروباری اداروں میں 1947ء تک 97 فی صدی عہدے یورپیوں کے پاس تھے۔ دیکھئے "کھرس" "بسبھی" 6 جولائی 1963ء

صنعت کو بھی، جس کیلئے بڑے بڑے قدرتی وسائل ہندوستان میں موجود ہیں، اس وقت تک ترقی نہیں کرنے دی، جب تک پچھلی صدی کے ختم ہوتے ہوتے بلجیم میں فولاد کی صنعت بڑھ گئی اور ہندوستان میں بلجیم کے فولاد کی ملک میں اضافہ ہو گیا۔ اس کی بنا پر حکومت کی پالیسی میں یک لخت تبدیلی آگئی 1882ء میں جمشید پور میں اس امر کی پیش کش کی تھی کہ وہ بڑے پیمانے پر لوہے کی صنعت شروع کرنے کے پیش نظر وودرا کی سرکاری کوئلے کی کان لے لیں گے۔ اس تجویز کو رد کر دیا گیا تھا (1)۔ 1900ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ خارجہ ہملٹن پور وائسرائے لارڈ کرزن دونوں نے لوہا پور فولاد بنانے کی اسکیم کے تعلق سے مسٹر ۲۲ کی ہمت افزائی کی لیکن ۲۲ آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے 1911ء میں لوہا پیدا کرنا شروع کیا پور 1912ء میں فولاد بنایا۔ (2)

سوتی کپڑے کی صنعت۔ 1905ء سے پہلے ملک کی وہ واحد صنعت تھی جو ہندوستان میں برطانوی مال سے راست مقابلہ کرتی تھی۔ اس صنعت میں ہندوستان کو مانچیسٹر کے مقابلے میں کئی فائدے تھے پہلی بات یہ کہ ہندوستان سوتی کپڑے کی صنعت کے لیے خود ملک کے اندر بڑی منڈی موجود تھی جو بڑھتی ہی جا رہی تھی تیسری بات یہ کہ ہندوستان قدیم زمانے سے سوتی کپڑا بنانے والوں کا ملک تھا اور سوتی کپڑا بنانا اس کے لیے کوئی ایسا نیا کام نہیں تھا جس میں ہندوستانی سرمایہ داروں کو کوئی خطرہ نظر آئے۔ آخری بات یہ کہ ملک میں مزدور سستا تھا۔ ان فوائد کی بنا پر ہندوستان میں سوتی کپڑے کی صنعت شروع کرنے پر ہندوستانی سرمایہ دار آسانی سے تیار ہو گئے۔ لیکن جوں جوں صنعت نے ترقی کی ہندوستان صنعت کار کے مقابلے میں انگلستان کے صنعت کار کو جن دشواریوں کا سامنا تھا انہیں سامان کے کرائے میں بہت زیادہ تخفیف اور ایک شائیر کے مفاد میں ہندوستان پر مسلط کی جانے والی آزاد تجارت کی پالیسی نے دور کر دیا۔ اسے ایل۔ بلائے کے تخمینے کے مطابق 1853ء میں ہندوستانی منڈی میں انگریزی دھاگے اور ہندوستانی دھاگے کی قیمت فروخت میں صرف 4/3 پیس فی پاؤنڈ کا فرق تھا۔ (3) اس کے باوجود سوتی کپڑے کی صنعت منافع بخش تھی اور ہندوستان کے بنائی اور کٹائی کے کارخانے اس صنعت کی ترقی کے ابتدائی مرحلوں میں بھی بڑا منافع کما رہے تھے۔ (4)

1905ء سے پہلے ہندوستان کی ہر بڑی صنعت کے فروغ کی وضاحت معاشی امور کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔ (5) لیکن جس بات کی وضاحت نہیں کی جاسکتی ہے ملک کی معاشی ترقی کی سست رفتاری۔ (6) صنعتوں کی سست رفتاری بلکہ اس زمانے میں جب تیزی کے ساتھ صنعت کی ترقی کے مواقع بہت

(1) سکریٹری آف اسٹیٹ کا ہندوستان کو امر اسٹیل (س۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی) سول ورکس، نمبر 63، مورخہ 16 نومبر 1883ء

(2) لوہا پور فولاد بنانے کا منصوبہ پورا ہونے سے پہلے جے۔ این۔ ۲۲ کا انتقال ہو گیا لیکن ان کے بیٹوں اور وڈوں نے اس اسکیم کو پورا کیا اور اس طرح اس واحد بنیادی صنعت کی بنیاد ڈالی جو جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان میں موجود تھی۔ دیکھئے لوٹ فریئر، Iron

& Steel in India

(3) بلائے، ایل۔ England's Foreign Trade، لنڈن 1983ء، صفحہ 93۔ انگریزی دھاگیں قیمت تھی، 18 پیس فی پاؤنڈ

(4) ایک ماخذ کے مطابق (پارلیمنٹری، سیریز 1888ء، نمائندہ 5322، صفحہ 116) آخوں دہائی میں کچھ کارخانوں نے اپنا پورا اصل پہلے چار برسوں میں کمایا۔ اسی طرح کبھی کے پہلے کارخانے نے پہلے دو برسوں میں کوئی منافع نہیں دیا لیکن اس کے بعد ایک سال میں نصف اصل ہوا کر دیا۔

(5) کرزن، خارجہ، ہندوستان کی سست رفتاری معاشی نمو 1860ء، 1900ء، اکونامک، بنگلہ، 11، اگست 1962ء۔

(6) سین، اے۔ کے، سماجیاتی اعتبار سے سست رفتاری معاشی نمو 1890ء، 1900ء، اکونامک، بنگلہ، 11، اگست 1962ء۔

تھے ملک کی "غیر صنعت کاری" کے اسباب دریافت کرنے لیے ہمیں سماجیاتی اور سیاسی امور پر نظر ڈالنی ہوگی (1)۔

اس کی ذمہ داری وہ امور یعنی سماجی نظام اور سیاسی پالیسی پر ہے۔ ہندوستان میں یورپین تجارت کی نمونے ایک طاقت ور کاروباری طبقے کو جنم دیا جو یورپ کے تاجروں کی طرح الکسانی اور اجتماعی معاشی رجحان رکھتا تھا۔ لیکن انگلستان اور دوسرے یورپین ملکوں کے شہری تاجر نے انخراج وایجاد کے بعد تجارت کے بجائے صنعتی پیداوار پر توجہ دی مگر ہندوستان کے تجارتی طبقات نے اپنی کاروباری سرگرمیاں تجارت، روپے کے لین دین اور جائیداد و مکانات خریدنے تک محدود رکھیں۔ ملک کی صنعتی پس ماندگی کی بڑی وجہ اصل یہی کمی کے بجائے مواقع اور کاروباری قیادت کی کمی تھی۔ جیسا کہ بکائن نے کہا ہے "ہندوستانی سماج میں حالات ایسے سازگار نہیں تھے کہ وہ صنعتی قاعدوں کو جنم دیتے۔ اس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ انگلستان میں صنعت کی ترقی ان سے مختلف حالات میں ہوئی تھی جن میں صنعتی نظام ہندوستان پہنچا۔ مشرقی ممالک میں وہ بڑے بڑے گروہ کارخانے قائم کرنے کے لیے تیار تھے یعنی تاجر اور استاد قسم کے دست کار۔۔۔۔۔۔ ہندوستان کے دست کاروں نے اس قسم کا حصہ اس میں نہیں لیا۔ ہندوستان کے تاجر تجارت کرنا جانتے تھے اور ان کے پاس اصل تھا جس پر وہ ہمیشہ منافع کمانے کی خواہش مند رہتے تھے لیکن وہ مزدوروں کا انتظام کرنے کے کام سے ناواقف تھے۔" (2)

ہندوستان کی صنعت کی پس ماندگی اور سست رفتاری کی جزوی ذمہ داری مغربی معنیں اس کے سماجی نظام پر ڈالتے ہیں۔ ویرانسے نے مطابق ظاہری مذہبی رجحان، شدید روایت پرستی اور قدامت پرستی، ذات پات کے نظام، بدلیسی لوگوں سے علیحدگی اور سیاسی سلامتی کی عدم موجودگی نے معاشی تبدیلی کی رفتار کو سست بنادیا اور اب بھی سست بنا رہی ہے کنکس لے کا خیال ہے کہ "ذات پات" خاندانی روایات اور ہندو دھرم نے مل کر جدید زندگی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ڈال دی۔" (3)

یہ دلیل بہت معقول نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ جب ایک سماج ایک نظام سے دوسرے کی طرف عبور کرتا ہے تو روایت پرست عناصر کی طرف سے کسی نہ کسی حد تک مزاحمت ناگزیر ہوتی ہے۔ لیکن ہر دور کا سماجی اور سیاسی طاقتوں کی بنا پر سماج کو بہرہ ور غلبت یا مجبور امتداد ہوتا چڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشی حالات سماجی نظام کا تعین کرتے ہیں نہ کہ سماجی نظام معاشی حالات کا۔

مثال کے طور پر طاقت ور مذہبی عناصر کی مخالفت کے باوجود، قرون وسطیٰ کے راہبان اور دوسرے دنیاوی نقطہ نظر کے باوجود، سود خوری کے معاشی قوانین اور قیمتیں مقرر کرنے کے ضوابط کے باوجود اور مجدد و سطلی کے یورپ کے یکساں طریقوں کو دبانے میں کلیسا مدد کے باوجود یورپ کی قومی عہد و سطلی سے نکل کر عہد جدید میں داخل ہو گئیں۔ یہ وہ نئے غیر معقول کام تھے جیسے یادگاروں کی پرستش، سنتوں کے مزاروں کی یا تراشیں وغیرہ۔

اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی سماج کی اعتبار سے ازمنہ و سطلی کے یورپین سماج کی طرح تھا۔

(1) جیسا کہ شو میئر نے کہا ہے "معاشی نمونے ایک آزاد مظہر نہیں ہے جس کا اطمینان بخش، صداقت کھنص معاشی اصولوں سے کی جاسکے۔" میچے، میچیر، نظریاتی، سائل، معاشی تاریخ کا منسب، جرنل آف انونام، نئی سلیمنٹ، 1947، ص 3۔

(2) بکائن، ڈی، ایچ، تحول 146-145۔

(3) کنکس، لے، تحول 316۔

دونوں سماجوں کے سانچے یعنی مختلف فرقوں پر مشتمل تھے۔ اگر سماجیاتی اور معاشی عناصر کے زیر اثر ایک نے جوہری افراد کے سماجوں کی شکل اختیار لی، جسکو پچھ چدید مفکر قابل افسوس صورت حال سے تعبیر کرتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ اسی قسم کے حالات دوسرا سماج بھی بہ مشکل اختیار نہ کرے۔ معاشی بہتری کے لیے قدرتی انسانی محرکات کو بروئے کار موقع نے بااثر سماج کو تبدیل کرنے کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والی مذہبی اور روایتی طاقتوں پر فتح حاصل کر لی۔

جہاں تک سماجی اتحاد اور جمہوری مساوات کا تعلق ہے، ہندوستان کا ذات پات کا نظام یعنی ایک بڑی خرابی ہے لیکن اس کو معاشی پس ماندگی کے لیے ذمہ دار ٹھہرانا مبالغہ آرائی کے مترادف ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ یعنی ایک چوتھائی ہندو نہیں تھے مگر وہ بھی اتنے ہی پچھڑے ہوئے تھے جتنے ہندو پھر یہ کہ اس میں لچک نہ ہونے کے باوجود وہ نظام اتنا سخت گیر نہیں تھا جتنا سمجھا جاتا ہے۔ پیشے اور حیثیت میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ مثل کے طور پر براہمنوں کو لیجے مقدس کتابوں کے مطابق انہیں پوجا پات کے کاموں میں منہمک رہنا چاہیے لیکن ان میں سے بہت سوں نے زراعت، تجارت اور گھریلو ملازمت کے پیشے اختیار کر لیے ہیں۔ یہی بات شتربیوں، ویشیوں اور شودروں کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ایک گاؤں کا بنکر کپڑے کے میل میں با مہارت مزدور کیوں نہیں بن سکتا ہے یا گاؤں کا لوہا ایک لوہے کے کارخانے میں کام کیوں نہیں کر سکتا ہے۔ مذہب نے ویشیہ بنک کاروں اور تاجروں کو اس امر کی ممانعت نہیں کی ہے کہ وہ دولت جمع کریں یا اسے منافع بخش تجارت یا صنعت میں لگائیں

ہندوستان کی صنعتی پس ماندگی کی ذمہ داری اصل میں صنعتی ترقی کی طرف ریاست کے روئے پر ہے۔ حکومت کی تجارتی، مالیاتی اور زرعی پالیسیاں ہندوستان کے بجائے برطانوی سامراجی مفادات کے پیش نظر تشکیل کی جاتی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد تک، جب ہندوستان کو مالیاتی خود مختاری عطا کی گئی، ہندوستان کی تجارتی اور مالیاتی پالیسی کا انحصار انکا شمار کے کارخانوں کے مفاد پر ہوتا تھا۔ 1878ء میں انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بار بار پڑنے والے قحطوں کی بنا پر ہندوستان کے مالیات ایک بحرانی دور سے گزر رہے تھے پھر بھی سکرٹری آف انڈینٹ کے دباؤ سے درآمد ہونے والے سوتی کپڑے پر مجبوراً ڈیوٹی ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد جب آمدنی بڑھانے کے لیے ہندوستان آنے والے سوتی کپڑے پر درآمد ڈیوٹی لگائی گئی تو ہندوستانی ملوں کے بنائے ہوئے کپڑے پر بھی ستلائی آبکاری ٹیکس لگایا گیا تاکہ برطانوی کپڑے پر لگائی جانے والی ٹیکس ڈیوٹی سے ہندوستانی صنعت کار کو کوئی فائدہ نہ اٹھاسکیں۔ (1)

1868ء کے بعد جاپان میں تیزی کے ساتھ ہونے والے ترقی کا مقابلہ اکثر اسی زمانے میں ہندوستان میں صنعتی ترقی کی سست رفتار سے کیا جاتا ہے۔ جاپان میں صنعتی ترقی کی بڑی وجہ تھی ریاست کا فیض رساں رویہ اور ہندوستان کی پس ماندگی کی ذمہ داری تھی حکومت پر جس نے معاشی ترقی کو نظر انداز کیا اور اس کی طرف غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ ہندوستان کے صنعتی میدان میں حکومت کا عمل محدود تھا۔ نمائش کرنے، یورپ کے ملکوں میں ہونے والی مختلف نمائشوں میں ہندوستان کی بیدار کے نمونے بھیجنے

(1) جیہا کہ صنعتی کمیشن نے کہا ہے پہلی جنگ عظیم تک حکومت کی کاروائی صرف اتنے تک محدود تھی کہ ”نہایت ناقص عینیک اور صنعتی تعلیم، دی جانے اور تجارتی اور صنعتی معلومات حاصل کر کے لوگوں کو نوکری مہیا کی جائے“ رپورٹ صفحہ 68

اور تجارتی اور صنعتی معلومات فراہم کرنے تک انتہا تو یہ ہے کہ مقامی فنون اور صنعتوں کی بہت افزائی کے متعلق مدد اس کے محکمہ صنعت کی تجاویز کو بھی سکریٹری آف انڈسٹری نے اس بنا پر ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا کہ وہ عدم مداخلت کی روح کی منافی تھیں۔ جو صنعتی ترقی کے تعلق سے ریاست کی مسلم پالیسی تھی۔ (1) چنانچہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان کی صنعتی پس ماندگی کا جائزہ لینے وقت ملک کی سیاسی حیثیت اور حکومت کی صنعتی پالیسیوں کی اہمیت کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

VIII- ہندوستانیوں کا رد عمل

معاشی معلومات کے کے متعلق کی جانے والی ان نرذاری بحثوں کے دواہم نتیجے ہوئے۔ رائے عامہ دو مخالف کیسوں میں بٹ گئی۔ تمام کے تمام ہندوستانی ایک طرف ہو گئے۔ چنانچہ یہ خیال پھیلنے لگا کہ ہندوستانی مفادات برطانوی حکمرانوں کے مفادات کے منافی ہیں تمام صدیوں میں نشر و اشاعت کرنے والے ہندوستانی مل کر حکومت کی ان پالیسیوں پر تنقید کرنے لگے جنہیں وہ مضربالسیاں تصور کرتے تھے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ چونکہ حکومت عوامی اداروں کی عرضداشتوں و دلیلوں اور حجوزوں کو در خود اعتنا نہیں سمجھتی تھی اور ہندوستان کی رائے عامہ کی پرواہ نہیں کرتی تھی اس لیے ہندوستان کی سیاسی تحریک کو بڑے دھکے کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک نظام حکومت میں بڑی تبدیلی نہ کی جائے معاشی تکلیفوں کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کے نتیجے میں سیاسی حقوق اور نمائندہ حکومت کا مطالبہ ملک میں فروغ پانے لگا۔ انیسویں صدی میں برطانوی حکمران حلقوں کا خیال تھا ”ہندوستانی رائے عامہ“ ایک غلط تصور ہے وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی رائے عامہ یا ہندوستانی قومیت کوئی وجود نہیں رکھتی ہے۔ ہندوستان محض ایک جغرافیائی تصور ہے، نہ ہی فرقوں، نسلوں اور ذاتوں وغیرہ کا ایک مجموعہ، جس میں بنیادی سماجی وحدت یا سیاسی اتحاد مفقود ہے۔ 1906ء میں فلسفی سکریٹری آف انڈسٹری لارڈ مورلے نے لکھا تھا۔

”آپ سے (لارڈ منٹون سے) مجھے بالکل اتفاق ہے۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ بات نہ پسندیدہ ہو ممکن ہے نہ اس کا تصور کیا جاسکے کہ ہندوستان میں رہنے والی قوموں کو برطانوی سیاسی اداروں سے نوازا جاسکے۔ کم سے کم یہ آپ کی یا میری زندگی میں نہیں ہو سکے گا۔“ (2)

انیسویں صدی میں ہندوستانی رائے عامہ کا ارتقا تین خاص خاص مرحلوں سے گزرا۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جب تعلیم یافتہ متوسط طبقہ برطانوی حکومت کو حکومت الہیہ سے تعبیر کرتا تھا۔ برطانیہ نے امن امان قائم کیا تھا اور قانون کی حکمرانی شروع کی تھی جسے وہ ایسی نعمت سمجھتے تھے جس سے ہندوستان پچھلے

(1) سمر اسلام، آمدنی، نمبر 50، اتر طرف سکریٹری آف انڈسٹری مورے 29 جولائی 1909ء سکریٹری آف انڈسٹری کے روپے کی اصل وجہ تھی مدد اس کے پورچین تجارتی مفادات کی مخالفت جو مدد اس کے صنعتی اور عسکری معلومات کے دائرہ کمر مسز چرن کی کارروائیوں سے خائف تھے۔ ان کے نظر میں مسز چرن کے تحت صنعتی حلقے کا قیام ”نئی کاروبار کے لئے ایک براخوہ اور ان کاموں میں حکومت کی غیر ضروری مداخلت کے حروف تھا جو حکومت کے حلقہ کار سے باہر تھے۔“ دیکھئے صنعتی کمیشن لی رپورٹ، پیارگراف 107۔

(2) مورلے یادداشتیں، دوسرا حصہ، صفحات 73-172۔

سود برسوں سے محروم تھا اور چونکہ جان و مال کی حفاظت اور خوشحالی و ترقی کی لیے یہ چیزیں ضروری تھیں اس لیے برطانوی حکومت کا جو ارادہ بھی جاتی تھیں۔ تعلیم اور سماجی اور اخلاقی اصلاح کے نئے مواقع ہاتھ آئے اور قومی ترقی کے لیے نئے راستے کھل گئے تھے۔ اس قسم کے مواقع فراہم کرنے والوں کو وہ شہیت ایزدی کے آلہ کار سمجھتے تھے جنہیں ایک قدیم قدم کی نشاۃ ثانیہ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

دوسرے مرحلے میں امن و امان کے فوائد کا تاثر ختم ہو گیا اور انہیں روزمرہ کی چیز سمجھا جانے لگا۔ اس کے علاوہ مجسمہ یوں اور بجوں کی کاروائیوں اور ایک اجمعی نظام قانون نے پہلی توصیف و تعریف کے نقوش و حند لاد دیئے۔ برطانوی حکومت کی تہذیب، سائنسی علم اور عملی پہلوؤں سے جب تعارف ہوا، جنہوں نے ابتدا میں ہندوستانوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی، تو تاثر کی تازگی کم ہو گئی اور وہ سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کر سکے۔ وہیں بے اطمینانی جو اکثر مغاوت کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور البرٹ بل کو منسوخ کرنے کی طرح کے سیاسی مباحثات نے لوگوں کی آنکھوں سے پردے ہٹانے شروع کر دیے۔ لیکن 1885ء تک تنقید اور تحریک میں شدید وفاداری کا جذبہ شامل ہوتا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام نے سیاسی تحریک کو ایک کل ہند بنیاد عطا کر دی۔ ابتدا کی دور میں یہ یقین بدستور قائم رہا کہ حکومت اُن تمام خرابیوں کو دور کر دے گی جن کے شکار ہندوستان کے عوام تھے۔ جب اس میں مایوسی ہو گئی تو وہ ہندوستان کے ذیلی حکام کے بجائے انگلستان کے اصل حاکموں پر بھروسہ کرنے لگے۔ ہندوستانوں کے دونوں انگلستان گئے اور انگلستان کے اُن عوامی کارکنوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں تک انہوں نے رسائی حاصل کی اور اُن سے امداد لینی چاہی جنہیں ہندوستان کا بھروسہ سمجھا جاتا تھا۔ اخبارات پر اثر ڈالا گیا اور ہندوستانی نقطہ نظر کا پرچار کرنے کی خاطر انگلستان میں انجمنیں قائم کی گئیں۔ یہ مرحلہ 1905ء میں ختم ہوا۔

انڈین نیشنل کانگریس اور معاشی بے اطمینانی

دیہات کے لوگوں کے دکھوں اور افلاس پر شروع ہی سے انڈین نیشنل کانگریس نے توجہ دی۔ کانگریس نے اپنے دوسری سالانہ اجلاس میں ”بڑی بھدردی“ کے ساتھ ”ہندوستان کی آبادی کی ایک بڑی تعداد کے بڑھتے ہوئے افلاس کے خطرے پر“ غور کیا۔ اُس کے بعد کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں غربت و افلاس کے متعلق تجاویز منظور کرتا ایک دستور بن گیا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت پر حملہ کرنے کے لیے یہ ایک اہم معاملہ تھا۔ ملک پر سو سو سال حکومت کرنے کے بعد برطانیہ نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ معمول کے مطابق برسوں میں بھی 40 فی صدی سے زیادہ لوگوں کے پاس اتنا غلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ دو وقت روٹی کھا سکیں۔ اگر غربت اور بھوک مری ایسے کسی ثبوت کی ضرورت تھی تو 1857ء کی بغاوت کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے پڑنے والے خط اس کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے تھے۔ ہندوستان کے قومی رہنماؤں کے خیال میں ہندوستانی عوام کے افلاس کے کئی اسباب تھے جن میں اہم تھے حکومت کی مالکداری کی پالیسی، ہندوستان سے دولت کا ”نکاس“ اور ہندوستانی وسائل اور صنعتوں کی ترقی میں حکومت کی مدد نہ ملنا۔

اُن علاقوں میں جہاں بندوبست استراری نہیں تھا کسانوں کے افلاس کی اصل وجہ مالگوری کا نظام تھا جس پر کانگریس تنقید کرتی تھی۔ اس مطالبے نے کہ جہاں بندوبست استراری نہیں ہے وہاں بھی استراری بندوبست کیا جائے ایک قومی مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔

آر۔سی۔ دت نے 1901ء میں لارڈ کرزن کے نام ایک کھلی چٹھی میں کہا تھا کہ افلاس اور قحطوں کی ذمہ داری رعیت داری نظام اور کسانوں پر تشفیص کی جانے والی بھاری مالگوری پر ہے۔ حکومت پر حملہ کرنے کے لیے مالگوری کے نظام کا انتخاب کر کے کانگریس کے رہنماؤں نے بڑی دوراندیشی سے کام لیا اس لیے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں کے لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں قومی جدوجہد میں عوامی حمایت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ مالگوری کے اجنبی نظام اور زمین کے بھاری محاصل کو تنقید کا نشانہ بنانا ہے۔

لیکن عام لوگوں کے افلاس کے اسباب بہت پیچیدہ تھے حالانکہ اہمیت صرف دو کو دی جاتی تھی یعنی مالگوری کے نظام اور انگلستان کو دولت کے نکاس کو مگر اس میں سامراج کی پوری پوری معاشی پالیسی شامل تھی۔ لارڈ کرزن نے ان ناگفتہ حالات کی ذمہ داری ہندوستانی رہنماؤں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اُس کی شکایت تھی کہ ”بد قسمتی سے حکومت کو اپنے ناقدین سے“ اُس لگان کی حد مقرر کرنے میں مدد نہیں ملی جو کسان مالکان اراضی کو ادا کرتے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ مالکان اراضی پر تشفیص ہونے والی مالگوری کی صورت میں حکومت کو جو رقم ملتی ہے اُس کی استراری تجدید کر دی جائے۔ (1)

عوامی مالیات

لیکن مالگوری کا مسئلہ نہیں تھا۔ اصل میں یہ مسئلہ تو پوری مالیاتی پالیسی اور عوامی مالیات کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی رائے عامہ کے رہنماؤں کو عوامی مالیات کے تین پہلوؤں کی فکر تھی یعنی (1) عوامی اخراجات (2) محاصل اور خاص طور سے ساج کے کمزور حصوں پر اُس کی تشفیص اور (3) عوامی قرض کا بوجھ اور اُس کی ابتدا اور انتہا۔

عوامی اخراجات

عوامی اخراجات میں کمی پر بحث سب سے پہلے ٹریولین نے شروع کی تھی جس نے مدد اس کے گورنر کی حیثیت سے 1860ء میں اس موضوع پر تین رودادیں لکھیں۔ ان رودادوں نے دلسن اور ٹریولین میں بحث چھیڑ دی جس کی بنا پر وہ مختلف دبستان فکر وجود میں آئے۔

ہندوستانی رائے عامہ ٹریولین کے نقطہ نظر کی حامی تھی جبکہ حکومت کی مالیاتی پالیسی بدستور اس بنیاد پر قائم رہی جو دلسن نے ڈالی تھی جو دلسن رائے کی ایکزیکٹیو کو نسل کا پہلا رکن مالیات تھا۔ دلسن کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے حکومت نے اخراجات میں کمی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جو بغاوت کے بعد مسلسل بڑھتے رہے۔ یہ اخراجات 51-1850ء میں 26.93 کروڑ تھے جو 61-1860ء میں بڑھ کے 46.92 کروڑ، 91-1890ء میں 82 کروڑ اور 5-1904ء میں 101.47 کروڑ ہو گئے۔

عوامی اخراجات میں اضافہ ضروری نہیں کہ شکایت یا خطرے کا باعث بنے۔ لیکن سہراہی حکومت نے تحت ہندوستان کے عوامی اخراجات میں دو بڑی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ زیادہ تر خرچ فوج، سول، اختلالات اور ان قرضوں کے سود کی ادائیگی پر کیا جاتا تھا جو غیر پیداواری مقاصد کی خاطر لیے تھے دوسرے بات یہ تھی کہ عوامی اخراجات سے فائدہ اٹھانے والے بھی، فوجی لوگ، سول ملازمین، فوج کا اور دوسرا سرکاری سامان سپلائی کرنے والے اور سرکاری باغوں اور سکور نیوں پر سود وصول کرنے والے قریب قریب سبھی بدلتے تھے۔ چنانچہ عوامی اخراجات سے خراب قوم کے افراد کی آمدنی میں اضافہ ہوتا تھا کہ اس ملک کی جہاں سے حاصل کی شکل میں اخراجات کے لیے رقمیں حاصل کی جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ آمدنی کی رقموں کی اصل کاری ریلوں اور آپاشی کے کاموں میں کی جاتی تھی لیکن یہ بات ابتداء سے واضح تھی کہ ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر پیداواری استعداد بڑھانے کے بجائے سہراہی مقاصد کے پیش نظر کی جارہی تھی۔ دوسری طرف آپاشی کے کاموں پر اس وقت تک مقابلہ کم توجہ دی جاتی رہی جب تک ملک میں قریب قریب پوری طرح ریلیں نہیں تعمیر کر لی گئیں۔ چنانچہ ہندوستان کی رائے عامہ ہندوستانی حکومت کی غیر نمائندہ حیثیت کے بعد اگر کسی چیز کو اپنا پندہ قرار دیتی تھی تو وہ تھے عوامی اخراجات اور ہندوستان میں برطانوی حکومت پر حملہ کرنے کے لیے ان کو استعمال کیا جاتا تھا۔

ادابھائی نوروی نے 1897ء میں ایسٹ انڈیا فائننس کی سیٹیاٹ کمیٹی پر پیش کئے گئے اپنے میمورنڈم میں دریافت کیا ”کیا ہندوستان کی پیداوار آج کی تاریخ میں اس درجہ کافی ہے کہ وہ من حیث القوم اپنی روزمرہ کی ضروریات اور اپنی مخصوص غیر معمولی ضروریات میں محرومی اور سختی اٹھائے بغیر ایک دور درازے غیر ملک کو اپنی پیداوار کا ایک حصہ بھیج سکے کہ جو دراصل اس غیر ملکی حکومت کا ایک قدرتی اقتصادی نتیجہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ہندوستان اپنے بچوں کی روزمرہ کی معمولی ضروریات کے قابل بھی پیدا نہیں کر پاتا، اپنی تمام سماجی اور مخصوص۔ یا سب ضروریات کے لائق پیداوار کی تو بات ہی جانے دیجئے“ (1) انہوں نے خرچ کی رقم پر اعتراض نہیں کیا کیونکہ ان کو ڈیوک آف ڈیون شاہ اور سرولیم ہنٹر سے اتفاق تھا کہ ہندوستان کا انتظام ناکافی طور پر ہو رہا ہے اور ملک کے افلاس نے ملکی خرچ کی ایک اوسط درجہ کی رقم کو کمر توڑ بوجھ بنادیا ہے۔ (2) انہوں نے کہا ”یہ کوئی موجودہ برطانوی انتظامیہ کے ہندوستانی خرچ کی کڑی تنقید نہیں ہے کہ ہندوستان کے لوگ دولت نہیں پیدا کر سکتے۔ اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ وہ لاکھوں کی تعداد میں سرس اور کروڑوں کی تعداد میں۔ میں نوچتا ہوں کہ کھانا نصیب نہ ہو، ان کی پیداوار ناقابل اعتنا ہو اور اس پر بھی کوئی ان کو اس حقیر پیداوار کے ایک حصہ سے محروم کرے۔“

اوپنے خرچ کی خاص وجوہات میں یہ حقیقت بھی شامل تھی کہ ہندوستان کی فوجی اور سول سروسوں میں بیشتر اونچے اور متوسط عہدوں پر یورپی لوگ متعین تھے جن کی تنخواہیں مساوی لیاقتیں اور اہلیت رکھنے والے مقامی ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ دونوں کی تنخواہوں میں کوئی تناسب ہی نہیں تھا پھر بھی ترجیح یورپین کو تھی جیسا کہ سرولیم ہنٹر نے 1880ء میں مشاہدہ لیا تھا۔ ”ہندوستان اس (انتظامیہ) محنت کے لیے انگریزی شروں پر

(1) ادابھائی نوروی، مختار اور تحریریں، صفحہ 164

(2) ایل بی کیٹھن، ادابھائی نوروی کا میمورنڈم، اکتوبر 1895ء، جیسے مختار اور تحریریں صفحہ 85-84

وانگلی برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ سیاسی خدمت کی تحفہ پوری دنیا کے مقابلے میں بلند ترین ہے البتہ وہ اپنی مقامی شروحوں پر بھائی اور کر سکتا ہے کیونکہ یہ پوری دنیا میں یہاں شاید کم ترین ہے۔“ (1)

ہندوستان میں یورپیوں کو ملازم رکھنا ایک اور اعتبار سے بھی قابل اعتراض تھا۔ دور ان ملازمت ان کی تحفہ ہوں کا ایک حصہ اور راز ہونے کے بعد ان کی پوری سطح ہر سال انگلستان جاتی تھی۔ دلو ابھائی نوروی اور کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح ہر سال ہندوستان سے انگلستان کو دولت کا نکاس ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کے مالیات کے متعلق سلیکٹ کمیٹی کے سامنے دلو ابھائی نے کہا ”پچھلے زمانے میں بدیسوں کی فتوحات کا جہاں تک تعلق ہے حملہ آور یا تو لوٹ مد کر کے واپس چلے جاتے تھے یا ملک پر حکومت کرنے لگتے تھے۔ جب حملہ آور ملک کے حاکم بن جاتے تھے تو وہاں آباد بھی ہو جاتے تھے اور اُس زمانے کے بلاشلہ کے کردار کے مطابق اُس زمانے کی حکومت جیسی بھی ہوتی تھی لیکن ملک سے ملائی اور اخلاقی نکاس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن انگریزوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ پچھلے حکمران قصائی کی طرح جگہ جگہ کاٹتے تھے لیکن انگریز اپنے سائنسی نشتر سیدھے دل میں اتارتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ زخم نظر نہیں آتا ہے۔ وہ تہذیب، ترقی وغیرہ کے ایسے مرہم لگاتے ہیں کہ جلد ہی زخم بھر جاتا ہے۔ انگریز ہندوستان کے صدر دروازے پر پہرہ دار کھڑے ہیں اور دنیا سے کہتے ہیں کہ وہ تمام دشمنوں سے ہندوستان کی حفاظت کریں گے اور پچھلے دروازے سے وہ خزانہ لے جاتے ہیں جس کی حفاظت کے وہ دعویٰ دار ہیں۔ مختصر کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان سے مسلسل دولت نکالنے کے بہترین طریقے ایجاد کرے۔ دنیا میں اپنی بدنامی کرائے بغیر دولت نکالنے کا اس سے بہتر طریقہ وہ ایجاد نہیں کر سکتا جیسا کہ موجودہ ایسی کاموں کا طریقہ ہے۔“ (2)

اسی برداشت میں وہ پہلے کہہ چکے تھے ”انگریز حکمران اس بات پر بجا طور سے فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان میں تعلیم اور مغربی تہذیب کو روانہ کیا۔ لیکن دوسری طرف ان کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا گیا ہے اور ان کا فخر محض ایک سراب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے۔ یا تو انہوں نے تعلیم دی ہے یا نہیں دی ہے۔ اگر ان کا فخر کوئی حقیقت رکھتا تو عجیب بات یہ ہے پچاس سال یا اس سے زیادہ مدت کی کوششوں کے باوجود وہ ایسے لوگوں کی ایک معقول تعداد پیدا نہیں کر سکتے جو خود اپنے ملک کی خدمت کی اہلیت رکھتے ہوں۔ محکمہ تعلیم کو لیجئے ہم اپنی اے ایم اے اور ایم ڈی وغیرہ ہو جاتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں اس قابل نہیں سمجھا جاتا ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو تعلیم دے سکیں۔ دوسرے محکموں کی طرح اُس محکمے میں بھی ہم پر ان یورپیوں کو بھوپا جاتا ہے۔ جو کسی نہ کسی طرح اُس میں داخل ہو جاتے ہیں۔“ (3)

حکومت پر ایک اور بڑا اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ ہندوستان کی سرحدوں پر لڑی جانے والی سامراجی جنگوں پر تو بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی تھیں لیکن تعلیم، زراعت اور صنعت کی طرح کے مفید کاموں پر خرچ کرنے کے لیے بہت کم رقمیں مہیا کی جاتی تھیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوامی اخراجات اور قوں کو خرچ کرنے کے طریقوں نے لوگوں (ہندوستانوں) کو دولت، کام اور عقل سے محروم کر دیا، ملت آمیز حد تک دستر، حقیر، بدلیہ اور ان سے انسانی خوبیاں چھین لیں۔

(1) ہندوستان میں برطانیہ کا کام، صفحات 119-118

(2) تقریر اور تحریریں، محلہ 10، ضمیمہ 4، صفحات 286-287

(3) ایضاً، صفحات 198-197

محاصل

ان بے جا اخراجات کے لیے رقیس حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ حکومت محاصل کا ایک بھاری اور خالص نظام بنائے جس کی تشکیل اس طرح کی گئی تھی کہ اُس کا زیادہ بوجھ ہندوستان کی غریب آبادی پر پڑتا تھا۔ کچھ انتظامی حکام نے بھی اس کا اقبال کیا ہے۔ چنانچہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی حیثیت سے لارڈ سلسبری نے لکھا تھا "اُس کو خوشحالی کی پالیسی سے نہیں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ زیادہ تر محاصل دیہی علاقوں سے وصول کئے جائیں جہاں سرمائے کی قلت ہے اور شہروں کو چھوڑ دیا جائے جہاں اُس کی بہتات ہے اور وہ برباد ہوتا ہے۔

ہندوستان کا خون تو نچوڑنا ہی ہے۔ نثر دہاں لگنا چاہیے جہاں خون زیادہ عیاں سے کم کافی ہے نہ کہ اُن حصوں میں جو کمزور ہیں اور خون کم رکھتے ہیں۔" (1) اسی طرح سرائیکینڈ کو لون نے، جو داسرائے کی ایگریکلو کوئل کارکن مالیت تھا، لیجسلیٹو کونسل میں کہا "ہمارے انتظامیہ کے دامن پر ایک دھبہ یہ ہے، جو دھلنے کے بجائے حالیہ واقعات کی بنا پر اور زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ کہ اس ملک میں ریاست سب سے زیادہ حفاظت اُن طبقات کی کرتی ہے جو ریاستی اخراجات کے لیے سب سے کم رقم دیتے ہیں۔" (2) اس میں امیر اور متوسط طبقوں کا کوئی قصور نہیں تھا کہ ہندوستان میں محاصل کا نظام رجعت پسندانہ نوعیت کا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لکشاؤز کے دباؤ اور سیاسی ضرورتوں کی بنا پر حکومت نے 1878ء کے بعد ہر قسم کی نسیم ڈیوٹی ختم کر دی تھی اور آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل کر رہی تھی۔ چنانچہ بالائی حکام کے احکامات کی تعمیل میں حکومت کو دولت مند طبقوں پر بالواسطہ محاصل لگانے کا سلسلہ ختم کرنا پڑا تھا۔

چنانچہ امیروں کی عیبوں تک پہنچنے کے واسطہ ذریعے تھے بلا واسطہ محاصل۔ لیکن انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ایک کم مدتی تجربے کے بعد انکم ٹیکس ختم کر دیا گیا تھا اور 1886ء تک دوبارہ نہیں لگایا گیا۔ ریلوں سے آمدنی نہیں ہو رہی تھی اور آب پاشی کے ذرائع کو ترقی نہیں دی گئی تھی۔ ان حالات میں آمدنی کے بڑے بڑے ذرائع تھے مالکداری، نمک کا محصول، ماکسائز ڈیوٹی (شراب، بھنگ، افیم، وغیرہ پر) اور اسٹامپ۔ ان تمام محاصل کا بار دیہات کی آبادی اور خاص طور سے غریبوں پر پڑتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کا نظام محاصل غریب طبقوں کے لیے بڑا غیر منصفانہ تھا۔ اس نے بڑی بے چینی پیدا کر دی تھی اور ہندوستان کی سیاسی تحریک کا وہ اصل محرک بن گیا تھا۔ مالکداری کے نظام کا سدھار، کسانوں پر مسلسل بڑھتے ہوئے بوجھ کو کم کرنے کی خاطر اُن علاقوں میں ہندوستان استمراری کرتا جہاں رعیت داری نظام رائج تھا، نمک پر محصول کم کرنا اور انکم ٹیکس کے لیے مستعفی آمدنی کی رقم کو بڑھانا ایندین نیشنل کانگریس کی تجویز کے بار بار موضوع بنتے رہے چنانچہ 1888ء میں کانگریس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ انکم ٹیکس کے مقاصد کے لیے کم سے کم ناقابل ٹیکس رقم ایک ہزار روپیہ کر دی جائے۔ (3) اس اجلاس میں کانگریس نے نمک کے محصول کے حالیہ اضافے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جس کی وجہ سے غریب طبقوں پر بوجھ بڑھ

(1) اردو مورخ 126 اپریل 1875ء۔

(2) لیجسلیٹو کونسل میں انکم ٹیکس بل پر تقریر، 4 جنوری 1886ء۔

(3) تجویز نمبر 6 جوچہ قومی کانگریس میں منظور کی گئی۔ دیکھئے اپنی سینٹ، How India wrought for Freedom، صفحہ

گیا ہے اور امن و افرات کے زمانے میں سلطنت کے واحد مالیاتی ریزرو کا جزوی انضمام ہو رہا ہے۔ (۱) اسی طرح مالگوار کی کے تعلق سے کانگریس نے اپنے پانچویں میں سالانہ اجلاس (۱۸۸۹ء) میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ بندوبست استراری کیا جائے۔ (۲) ۱۹۰۲ء میں کانگریس نے کہا کہ ”بہت سی بیماریوں کے پھیلنے کی ذمہ داری نئی تحقیق کے مطابق اس بات پر ہے کہ ہندوستان کے عام لوگ نمک کم کھاتے ہیں“ اور یہ مطالبہ کیا کہ محصول ”کم سے کم اس حد تک کم کر دیا جائے جتنا اضافہ ۱۸۸۸ء میں کیا گیا تھا۔“ (۳) اسی سال اُس نے کپاس پر لگائی جانے والی اُس اکسائز ڈیوٹی کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جو ۱۸۹۵ء میں عائد کی گئی تھی اس لیے کہ ”بننے کی صنعت کی آزاد نمو کو روکنے کے علاوہ یہ صنعت کاروں کے حق میں نہایت غیر منصفانہ ہے اور اُن لوگوں کے لیے اس نے بڑی دشواریاں پیدا کر دی ہیں جو مقامی بنا ہوا موٹا جھوٹا کپڑا استعمال کرتے ہیں۔“ (۴) ایک جامع تجویز میں جسے جی۔ کے۔ گوکھلے نے پیش کیا تھا کانگریس نے اپنے بیسویں اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۰۴ء میں مطالبہ کیا کہ کرنسی بورزر مبادلہ کے سلسلے میں کئے جانے والے اقدامات کے نتیجے میں جو فاضل آمدنی ہو اس کو مندرجہ ذیل کے لیے استعمال کیا جائے۔ (الف) محاصل کا بوجھ کم کرنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ (۱) نمک کے محصول میں مزید کمی کر کے، (۲) ان صوبوں میں جہاں کسانوں کو کئی سال تک خراب حالات کا سامنا کرنا پڑا وہاں مالگوار کی کاسرکاری مطالبہ کم کر کے اور (۳) سوئی کپڑے پر اکسائز ڈیوٹی میں تخفیف کر کے ”اور (ب)“ جب تک اس قسم کی تخفیف نہ کی جائے کانگریس مطالبہ کرتی ہے کہ اس فاضل آمدنی کا ایک حصہ اُن کاموں پر خرچ کیا جائے جس سے عام لوگوں کو راست فائدہ پہنچے جیسے مائیں بنیادوں پر زرعتی اور صنعتی تعلیم اور طبی امداد کے لیے بہتر سہولتیں اور یہ کہ بقیہ رقم لوکل اور میونسپل بورڈوں کی مدد کرنے پر صرف کی جائے۔“ (۵)

جہاں تک مجموعی اعتبار سے محاصل کا تعلق تھا انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما ہندوستان میں حاصل کے بوجھ کو ناقابل برداشت تصور کرتے تھے۔ دادا بھائی نوروجی نے قومی آمدنی کا جو تخمینہ لگایا تھا اس کے مطابق ۱۸۷۱ء میں مجموعی قومی آمدنی ۳۴۰ ملین پونڈ تھی جس میں سے ۵۰ ملین پونڈ محاصل کی شکل میں حکومت نے وصول کئے تھے یعنی قومی آمدنی کا ۱۵ فیصدی۔ اس حساب سے فی کس ٹیکس کی رقم ۶ شلنگ پڑی جبکہ فی کس سالانہ آمدنی ۴۰ شلنگ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہ محصول اُس سے بہت کم تھا جو اُن ملکوں کے لوگ ادا کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر اراڈمیو کے مطابق ترکی میں فی کس سالانہ محصول ۷ شلنگ ۹ پینس تھا، روس میں ۱۲ شلنگ ۲ پینس، اسپین میں ۱۸ شلنگ ۵۰ پینس، آسٹریلیا میں ۱۹ شلنگ ۷ پینس اور اٹلی میں ۱۷ شلنگ (۶) لیکن یہ مقابلہ غلط بھی تھا، اگر گمراہ کن بھی جیسا کہ دادا بھائی نوروجی نے کہا (۷) یہ دیکھنے کے لیے کہ محصول کا بوجھ واقعی ”کمر توڑنے والا“ ہے یا نہیں ہمیں محصول ادا

(۱) تجویز نمبر ۱۵، بحولہ ۱۵، صفحہ ۷۴۔

(۲) تجویز نمبر ۷، بحولہ ۱۵، صفحہ ۹۳۔

(۳) تجویز نمبر ۱۳، بحولہ ۱۵، صفحہ ۳۸۹۔

(۴) تجویز نمبر ۱۶، بحولہ ۱۵، صفحہ ۳۳۷۔

(۵) تجویز نمبر ۸، بحولہ ۱۵، صفحات ۱۰-۴۰۹۔

(۶) ایچ۔ سلیمنیو کو نسل میں تقریر، مارچ ۱۸۷۱ء۔

(۷) ایضاً، صفحات ۵۹-۵۲۔

لرنے والے کی آمدنی پر غور کرنا چاہیے۔ چنانچہ جب کہ ایک ہندوستانی اپنی چھوٹی سی آمدنی 15۶۱ء کی صدی حکومت کو دے دیتا تھا۔ ایک انگریز اپنی اُس سے کہیں زیادہ آمدنی یعنی 30 پونڈ سالانہ کا محض 8 فی صدی ادا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ 30۰ پونڈ سالانہ کی آمدنی میں سے 2 پونڈ 10 شلنگ ادا کرتا بھی اتنا بڑا بوجھ مہم تھا جتنا اُن 40 شلنگ سالانہ میں سے 6 شلنگ سالانہ ادا کرتا جو زندگی کی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں تھے۔

ہندوستان میں اس واقع نے نا انصافی میں اضافہ کر دیا تھا کہ حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ملک کی پیداوار بڑھا کر اُس کو ”دولت مند اور خوشحال“ بنانے کے بجائے گھریلو اخراجات اور ہندوستان میں برطانوی اصل کاری کے منافعوں کی شکل میں انگلستان جا رہا تھا۔ اگر دولت کا نکاس نہ ہوتا تو وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان کی پیداواری طاقت میں اضافہ ہو جاتا اور محصول کا بوجھ مطابق رقم کی شکل میں چاہے اتنا ہی رہتا تب بھی اسے آمدنی کی تناسب سے کم ہو جاتا۔ لیکن آمدنی ت جوں کی توں رہی لیکن محاصل برابر بڑھتے گئے اس لیے ان کے بوجھ نے واقعی لوگوں کی کمر توڑ دی۔

بڑے بڑے سرکاری اخراجات اور اُن کے نتیجے میں محصول اور دولت کے نکاس کے بڑے بوجھ کا ہندوستان پر کیا اثر پڑا اس کا خلاصہ پنڈت مدن موہن مالویہ کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے پونے میں کانگریس کے گیارہویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے ”تعلیم یافتہ ہندوستانی، جو ملک کے مہذب دانشوروں کی نمائندگی کرتے ہیں، پچھلے 40 سال سے ملک میں کئے جانے والے انتظامات کی تحقیق و تفتیش، عمل تفتیش، کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، ہم نے قریب قریب ہر معاملے میں اُن انتظامات پر اعتراضات کئے ہیں۔ ہم حکومت انگلستان کو اس کا طرزِ ٹھہراتے ہیں کہ اُس نے ہندوستان کی سول سروس پر کئے جانے والے غیر ضروری اور بھاری اخراجات کا بوجھ ہم پر ڈالا ہے، ہم اُس کو طرزِ کراؤنٹے ہیں کہ اُس نے ہماری کاندھوں پر فوجی اخراجات کا بوجھ ادا دیا ہے، ہم اُس کو طرزِ سمجھتے ہیں کہ اُس نے ہندوستان کی سرحدوں کے باہر ہندوستان کا روپیہ برباد کیا ہے۔ اور ہم اُسے طرزِ تصور کرتے ہیں کہ گھریلو اخراجات کے سلسلے میں اُس نے ہندوستان کے ساتھ جو یہ ہار کیا وہ غیر منصفانہ ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہم اُس پر یہ الزام بھی عاید کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تعلق سے اُس نے اپنے فرائض کو نظر انداز کیا۔ اُن اُنکھوں انسانوں کی موت کی ذمہ داری اُس پر ہے جو ہر دہائی میں بھوک مری کے شکار ہو جاتے ہیں یہ بھوک مری ضرورت سے زیادہ بھاری محاصل اور ناقص انتظام کا نتیجہ ہوتی ہے۔“ (1)

عوامی قرضہ

ایک اور چیز جس سے ہندوستان کے قوم پرست ناخوش تھے وہ تھا عوامی قرضہ 1960-61ء میں ملک پر 94,56 کروڑ روپیہ قرض تھا جو 1901ء میں بڑھ کے 312 کروڑ روپیہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے محصول دہندگان پر اس کا بوجھ پڑ رہا تھا اور فوج اور سول سروس پر کئے جانے والے بڑے بڑے اخراجات اور قرضے کی وجہ سے عام لوگوں پر بھاری محاصل لگائے جا رہے تھے۔ لیکن مخالفت کی وجہ اس کے مالیاتی پہلو سے زیادہ اُس کا اخلاقی پہلو تھا۔ ہندوستان کا زیادہ تر قرض نتیجہ تھا شرق میں فتوحات کے لیے برطانیہ کی جنگوں کا (2) ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں جو جنگیں لڑیں اُن کے اخراجات، 1857ء کی

(1) بی بی سیٹ محلہ بالا، صفحہ 213۔

(2) دیکھئے ملاتپا، ہے۔ سی۔ پبلک فنانس & our poverty (۱۹۴۱ء)، صفحات 29-30۔

گیا ہے اور امن و افرات کے زمانے میں سلطنت کے واحد مالیاتی ریزرو کا جزوی انضمام ہو رہا ہے۔ (1) اسی طرح مالگوارمی کے تعلق سے کانگریس نے اپنے پانچویں میں سالانہ اجلاس (1889ء) میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہندوستان استمراری کیا جائے۔ (2) 1902ء میں کانگریس نے کہا کہ ”بہت سی بیماریوں کے پھیلنے کی ذمہ داری نئی تحقیق کے مطابق اس بات پر ہے کہ ہندوستان کے عام لوگ نمک کم کھاتے ہیں“ اور یہ مطالبہ کیا کہ محصول ”کم سے کم اس حد تک کم کر دیا جائے جتنا اضافہ 1888ء میں کیا گیا تھا۔“ (3) اسی سال اُس نے کپاس پر لگائی جانے والی اُس اکسائز ڈیوٹی کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جو 1895ء میں عائد کی گئی تھی اس لیے کہ ”بننے کی صنعت کی آزاد نمو کو روکنے کے علاوہ یہ صنعت کاروں کے حق میں نہایت غیر منصفانہ ہے اور اُن لوگوں کے لیے اس نے بڑی دشواریاں پیدا کر دی ہیں جو مقامی بنا ہوا مونا جمونا کپڑا استعمال کرتے ہیں۔“ (4) ایک جامع تجویز میں جسے جی۔ کے۔ گوکھلے نے پیش کیا تھا کانگریس نے اپنے بیسویں اجلاس منعقدہ ستمبر 1904ء میں مطالبہ کیا کہ کرنسی اور زر مبادلہ کے سلسلے میں کئے جانے والے اقدامات کے نتیجے میں جو فاضل آمدنی ہو اس کو مندرجہ ذیل کے لیے استعمال کیا جائے۔ (الف) محاصل کا بوجھ کم کرنے کے لیے خصہ جیت کے ساتھ (1) نمک کے محصول میں مزید کمی کر کے، (2) ان صوبوں میں جہاں کسانوں کو کئی سال تک خراب حالات کا سامنا کرنا پڑا وہاں مالگوارمی کا سرکاری مطالبہ کم کر کے اور (3) سوئی کپڑے پر اکسائز ڈیوٹی میں تخفیف کر کے ”اور (ب)“ جب تک اس قسم کی تخفیف نہ کی جائے کانگریس مطالبہ کرتی ہے کہ اس فاضل آمدنی کا ایک حصہ اُن کاموں پر خرچ کیا جائے جس سے عام لوگوں کو راست فائدہ پہنچے جیسے سائنسی بنیادوں پر زرعتی اور صنعتی تعلیم اور طبی امداد کے لیے بہتر سہولتیں اور یہ کہ بقدر رقم لوکل اور میونسپل بورڈوں کی مدد کرنے پر صرف کی جائے۔“ (5)

جہاں تک مجموعی اعتبار سے محاصل کا تعلق تھا انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما ہندوستان میں حاصل کے بوجھ کو ناقابل برداشت تصور کرتے تھے۔ دادا بھائی نوروجی نے قومی آمدنی کا جو تخمینہ لگایا تھا اس کے مطابق 1871ء میں مجموعی قومی آمدنی 340 ملین پونڈ تھی جس میں سے 50 ملین پونڈ محاصل کی شکل میں حکومت نے وصول کئے تھے یعنی قومی آمدنی کا 15 فیصد۔ اس حساب سے فی کس ٹیکس کی رقم 6 شلنگ 7 پیس جبکہ فی کس سالانہ آمدنی 40 شلنگ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہ محصول اُس سے بہت کم تھا جو اُن ملکوں کے لوگ ادا کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر لارڈ ڈیو کے مطابق ترکی میں فی کس سالانہ محصول 7 شلنگ 9 پیس تھا، روس میں 12 شلنگ 2 پیس، اسپین میں 18 شلنگ 50 پیس، آسٹریلیا میں 19 شلنگ 7 پیس اور اٹلی میں 17 شلنگ (6) لیکن یہ مقابلہ غلط بھی تھا اور گمراہ کن بھی جیسا کہ دادا بھائی نوروجی نے کہا (7) یہ دیکھنے کے لیے کہ محصول کا بوجھ واقعی ”کمر توڑنے والا“ ہے یا نہیں ہمیں محصول ادا

(1) تجویز نمبر 15، کھولہ 10، صفحہ 74۔

(2) تجویز نمبر 7، کھولہ 10، صفحہ 93۔

(3) تجویز نمبر 13، کھولہ 10، صفحہ 389۔

(4) تجویز نمبر 16، کھولہ 10، صفحہ 337۔

(5) تجویز نمبر 8، کھولہ 10، صفحات 10-409۔

(6) لیب سلسٹینیو کو نسل میں تقریر، 1871ء، ج 1، صفحہ 1871۔

(7) ایسٹنا، صفحات 52-53۔

لرنے والے کی آمدنی پر غور کرنا چاہیے۔ چنانچہ جب کہ ایک ہندوستانی اپنی چھوٹی سی آمدنی 154 فی صدی حکومت کو دیدیتا تھا۔ ایک انگریز اپنی اس سے کہیں زیادہ آمدنی یعنی 30 پونڈ سالانہ کا محض 8 فی صدی ادا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ 30 پونڈ سالانہ کی آمدنی میں سے 2 پونڈ 10 شلنگ ادا کرتا بھی اتنا بڑا بوجھ مہں تھا جتنا اُن 40 شلنگ سالانہ میں سے 6 شلنگ سالانہ ادا کرنا جو زندگی کی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں تھے۔

ہندوستان میں اس واقعے نے انسانی میں اضافہ کر دیا تھا کہ حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ملک کی پیدوار بڑھا کر اُس کو ”دولت مند اور خوشحال“ بنانے کے بجائے گھریلو اخراجات اور ہندوستان میں برطانوی اصل کاری کے منافعوں کی شکل میں انگلستان جارہا تھا۔ اگر دولت کا نکاس نہ ہوتا تو وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان کی پیدوار میں اضافہ ہو جاتا اور محصول کا بوجھ مطابق رقم کی شکل میں چاہے اتنا ہی رہتا تب بھی اسے آمدنی کی تناسب سے کم ہو جاتا۔ لیکن آمدنی ت جوں کی توں رعے لیکن محاصل برابر بڑھتے گئے اس لیے ان کے بوجھ نے واقعی لوگوں کی کمر توڑ دی۔

بڑے بڑے سرکاری اخراجات اور اُن کے نتیجے میں محصول اور دولت کے نکاس کے بڑے بوجھ کا ہندوستان پر کیا اثر پڑا اس کا خلاصہ پنڈت مدن موہن مالویہ کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے پونے میں کانگریس کے گیارہویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے ”تعلیم یافتہ ہندوستانی، جو ملک کے مہذب دانشوروں کی نمائندگی کرتے ہیں، پچھلے 40 سال سے ملک میں کئے جانے والے انتظامات کی تحقیق و تفتیش، ملل تفتیش، کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، ہم نے قریب قریب ہر معاملے میں اُن انتظامات پر اعتراضات کئے ہیں۔ ہم حکومت انگلستان کو اس کا طزم ٹھہراتے ہیں کہ اُس نے ہندوستان کی سول سروس پر کئے جانے والے غیر ضروری اور بھاری اخراجات کا بوجھ ہم پر ڈالا ہے، ہم اُس کو طزم گرانے ہیں کہ اُس نے ہماری کاندھوں پر فوجی اخراجات کا بوجھ ادا دیا ہے، ہم اُس کو طزم سمجھتے ہیں کہ اُس نے ہندوستان کی سرحدوں کے باہر ہندوستان کا روپیہ برباد کیا ہے۔ اور ہم اُسے طزم تصور کرتے ہیں کہ گھریلو اخراجات کے سلسلے میں اُس نے ہندوستان کے ساتھ جو بوجھ پار کیا وہ غیر منصفانہ ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہم اُس پر یہ الزام بھی ماید کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تعلق سے اُس نے اپنے فرائض کو نظر انداز کیا۔ اُن ااکھوں انسانوں کی موت کی ذمہ داری اُس پر ہے جو ہر دہائی میں بھوک مری کے شکار ہو جاتے ہیں یہ بھوک مری ضرورت سے زیادہ بھاری محاصل اور ناقص انتظام کا نتیجہ ہوتی ہے۔“ (1)

عوامی قرضہ

ایک اور چیز جس سے ہندوستان کے قوم پرست ناخوش تھے وہ تھا عوامی قرضہ 1960-61ء میں ملک پر 94.56 کروڑ روپیہ قرض تھا جو 2-1901ء میں بڑھ کے 312 کروڑ روپیہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے محصول و ہندوگان پر اس کا بوجھ پڑ رہا تھا اور فوج اور سول سروس پر کئے جانے والے بڑے بڑے اخراجات اور قرضے کی وجہ سے عام لوگوں پر بھاری محاصل لگائے جا رہے تھے۔ لیکن مخالفت کی وجہ اس کے مالیاتی پہلو سے زیادہ اُس کا اخلاقی پہلو تھا۔ ہندوستان کا زیادہ تر قرض نتیجہ تھامشرق میں فتوحات کے لیے برطانیہ کی جنگوں کا (2) ایٹ اندیا کمپنی نے ہندوستان میں جو جنگیں لڑیں اُن کے اخراجات، 1857ء کی

(1) بی بی سیٹ بحولہ بالا، صفحہ 213۔

(2) دیکھیے مکاتبات، ہے۔ سی۔ Public finance & our poverty (ایم آر آپا، 1941ء)، صفحات 30-29

بغاوت کے اخراجات، جب حکومت ہندوستان تاج کو محض ہوئی اُس وقت حصہ داروں کو ادا کیا جانے والا اصل کا حصہ، افغانستان اور برما کی جنگوں کے اخراجات (1) اور اس قسم کے دوسرے تمام اخراجات ہندوستان کے حساب میں ڈالے گئے اور اُن کے لیے قرض لیا گیا جو زیادہ تر انگلستان کے لوگوں سے ملا تھا۔

بہت سے انصاف پسند انگریز بھی ان اخراجات کو غیر منصفانہ سمجھتے تھے اور اُن کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ مثال کے طور پر مسٹر فاسٹ نے 1880ء میں ہاؤس آف کامنز میں تجویز پیش کی ”اُس سرکاری اعلان کے پیش نظر کہ افغانستان کی جنگ انگلستان اور ہندوستان کے مفاد میں لڑی گئی تھی اس ایوان کی یہ رائے ہے کہ افغانستان کے ساتھ دوبارہ جنگ کے پورے اخراجات ہندوستان پر ڈالنا انصاف سے بعید ہے۔“ اپنی سینا کی مہم کے تمام معمولی اخراجات ہندوستان نے برداشت کئے۔ حکومت انگلستان نے محض غیر معمولی اخراجات برداشت کئے اس کے لیے یہ دلیل دی گئی کہ ہندوستان کو اپنی فوجوں کے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے اور اسے اس سلسلے میں منافع حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن حکومت انگلستان نے اُس وقت حکومت ہندوستان کے ساتھ کیا کیا تھا جب ندر کے زمانے میں فوجیں وہاں بھیجی گئی تھیں؟ کیا انہوں نے کہا تھا ”ہم اس سے منافع حاصل کرنا نہیں چاہتے ہیں۔“ جی نہیں۔ وہاں بھیجے جانے والے ہر شخص کے اخراجات پوری مدت تک ہندوستان کو برداشت کرنے پڑے حالانکہ انہیں صرف عارضی طور سے استعمال کیا گیا تھا۔ بھیجے جانے سے پہلے رگروٹوں کی حیثیت سے اُن کی تربیت اور قواعد پر پڑے جو اخراجات ہوئے وہ بھی ہندوستان کو ادا کرنے پڑے۔“ (2)

اس قسم کے انفرادی احتجاج کے باوجود انگلستان کی بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کی پالیسی ہندوستان کے تعلق سے یکساں تھی۔ جیسا کہ گلیڈ سٹون نے وضاحت سے اعتراف کیا تھا۔ ”مجھے حزب مخالفت کے عزت مآب اراکین کی اس یقین دہانی سے اطمینان ہوا کہ وہ اس بات کے حق میں ہیں کہ ہمیں رقوم اس بات کے لیے ادا کی جانی چاہیں کہ ہم، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اپنی مرضی کے مطابق انہیں قومی اور سامراجی پالیسی کو برقرار رکھنے پر صرف کر سکیں۔ اس ملک کی کسی پارٹی نے ابھی تک یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ ہندوستانی سلطنت کے تعلق سے ہماری ذمہ داری محض اُس کا حصہ ہے۔ میرے خیال میں ہر وہ شخص ایک اخلاقی جرم اور سیاسی غلطی کا مرتکب ہو گا جو یہ دعویٰ کرے کہ اس معاملے میں اُس کی جماعت کو اُن لوگوں پر نوبت حاصل ہے جن کی وہ ہمیشہ مخالفت کرتی ہے۔ یہ ایک سامراجی پالیسی ہے جس میں ہم سب معروف ہیں۔“ (3)

ان حالات میں اس امر کی امید کرنا فضول تھی کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان مالیات سوالوں پر کوئی منصفانہ سمجھوتہ ہو سکے گا۔ ہندوستانی قیادت اس کو غیر منصفانہ قرار دیتی تھی، لہٰذا ہندوستان پر اُن تمام اخراجات اور قرضوں کا بوجھ ۱۹۱۹ء کے جواز روئے انصاف سامراجی حکومت کو ادا کرنے چاہیے اور حکمرانوں کو اس پالیسی کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ دوا اجمالی نوروی نے 1867ء میں

(1) پبلیٹ اور اُس کے بارے میں بحث و مباحثہ کے بعد انگلستان اس پر آمادہ ہو گیا کہ جنگ افغانستان نے اخراجات کے لیے 5 ملین پونڈ اکرے۔ دیکھیے دوا اجمالی نوروی، تقریریں، صفحہ 348۔

(2) تقریر ہاؤس آف لارڈز، 15 مئی 1895ء، دیکھیے مباحثہ (لارڈز)، جلد 12، صفحہ 374۔

(3) ہنر ڈ، جلد 297، صفحہ 809۔

برطانیہ کو بتادیا تھا ”دو کروڑ غیر مطمئن لوگوں کے ایک لاکھ بدلیسی سنگینوں کے ساتھ ٹکراؤ کا نتیجہ کیا ہوگا اس کو بتانے کے لیے کسی کاغذی ہونا ضروری نہیں ہے۔ پانی کا ایک قطرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہو لیکن سیلاب ہر چیز کو بہالے جاتا ہے۔ جیت ہمیشہ تیز دوڑنے والے کی نہیں ہوتی ہے۔ ایک غیر مطمئن قوم سود فو نہ کر سکتی ہے اور سود فو نہ کر کے اٹھ سکتی ہے۔ لیکن بدلیسی کی ہار مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ مقامی لوگوں کی ہر ناکامی اُن کا بوجھ اور بڑھادگی اور بدلیسی جو اتار چھیننے کے لیے انہیں اور زیادہ بے چین کر دے گی۔“ (1)

تقریباً تیس سال بعد وہیمیکیشن کے سامنے پیش کرنے والی یادداشت میں انہوں نے غصہ کے ساتھ کہا تھا ”حکمران طبقے کی اقلیت کی بالادستی کیلئے جیسے جیسہ ہندوستان کے لوگوں کو دنیا چاہیے اور اُن پیسوں کو خرچ کرنے کے طریقوں کے متعلق انہیں آواز نہیں اٹھانی چاہیے اور انہیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ برطانوی شہریت کی برابری کے وعدے پوری طرح توڑے جائیں گے۔ اور ایسا کیوں ہوگا؟ کیا بقول لارڈ سلسبری اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ہاتھوں میں حکومت ہے اور رائٹلین ہیں جیسا کہ مسٹر گلڈسٹن نے خود ہندوستان کے بارے میں کہا کہ قانون یا طاقت کی دلیل جو ہمارے پاس ہے اور جس کا اطلاق ہم کرتے ہیں اس کمیشن کا فرض ہے، کم از کم اخراجات کا منصوبہ بنا کر دینے کی حد تک اسے اس شکایت کا ازالہ کرنا چاہیے۔“ (2) انہوں نے مزید دریافت کیا ”کیا ہندوستان کے انگریز حکام واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی افریقہ کے وحشیوں کی طرح ہیں یا بچے ہیں اور دو ہزار سال کی تہذیب کے باوجود جو اُس وقت یہاں پائی جاتی تھی جب انگریز وحشی تھے اور جواب انگریزوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بقول لارڈ ڈفرن ”بڑی اہلیت اور ذہانت رکھنے والے مقامی اشراف پیدا کر رہے ہیں“ کیا وہ اتنا بھی نہیں دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کتنے ذلیل و خوار اور معاشی اعتبار سے برباد ہو گئے ہیں، یا بات یہ ہے کہ ہندوستانی اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن یہ حکام اُس وقت تک اس کی پروا نہیں کریں گے جب تک وہ برطانوی عوام کو گمراہ کرتے رہیں اور انہیں یقین دلاتے رہیں کہ برطانوی ہند میں حالات اتنے ہی جبکہ حقیقت میں وہ اچھے نہیں ہیں۔“ (3)

کرسی کا مسئلہ

محاصل کی بھاری شرح اور گھریلو اخراجات سے جڑا ہوا تھا کرسی کا مسئلہ۔ یہ بھی ہندوستانی ذہن کے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھا زار کے میدان میں ایسے بین الاقوامی حالات رونما ہوئے کہ 1873ء کے بعد چاندی سونے کی قیمت گرنے لگی۔ چونکہ اُس زمانے میں چاندی کی آزاد سکہ سازی کا دستور تھا اور روپیہ ہندوستان کا معیاری زر تھا اس لیے چاندی کی قیمت جب گرنے لگی تو اسٹرلنگ کے تناسب سے روپیہ کی قیمت بھی گرنے لگی۔ روپیہ اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ 1874ء میں ایک شلنگ اور 10/4 پینس تھی جو 1891ء میں گھٹ کر ایک شلنگ اور 5 پینس رہ گئی۔ اس نے حکومت کے لیے بہت سے مسئلے کھڑے کر دیے۔ ہندوستان میں بدلیسی سول ملازمین اور فوجوں نے، جنہیں انگلستان اپنی تنخواہیں بھیجنے میں نئی شرح مبادلہ کی بنا پر گھٹا ہوا رہا تھا، متلافی جہتوں کا مطالبہ کیا جو ان جوں جوں شرح مبادلہ کم ہوتی گئی دیسے دیسے روپے

(1) لندن کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اجلاس میں پڑھا جانے والا رپورٹ جو 2 مئی 1867ء کو کوآرڈینیشن Poverty & un

British Rule، صفحہ 303

(2) دیکھئے تقریریں اور تحریروں، محلہ بالا، صفحات 357-256

(3) ایضاً، صفحہ 357

کی شکل میں گھریلو اخراجات بڑھتے گئے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف حکومت ہندوستان کی مالی مشکلات میں اضافہ ہو گیا بلکہ مسلسل گرتی ہوئی شرح مبادلہ نے بدیسی زر کے تعلق سے بڑی بڑی کو بھی فروغ دیا۔ (1) اس مسئلے کو حل کر نیکے لیے یہ کوشش کی گئی کہ دوسرے ملک کے دو دھائی نظام اپنے یہاں رائج کریں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چار بین الاقوامی کانفرنس کی گئیں۔ لیکن چونکہ انگلستان نے سونے کے معیار کو بدستور جاری رکھنے پر اصرار کیا اس لیے ان کانفرنسوں میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو پایا۔ 1892ء میں بروسل کانفرنس کی ناکامی کے بعد حکومت ہندوستان نے لارڈ ہر شیل کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ روپے کی گرتی ہوئی شرح مبادلہ پر غور کرے اور اُس کے تذراک کی سفارش کرے۔ ہر شیل کمیشن نے سفارش کی کہ عام لوگوں کو چاندی کا روپیہ ڈھالنے کی ممانعت کر دی جائے، یہ کہ روپیہ کی قیمت بڑھا کر ایک شلنگ اور 4 پینس کرنے کے لیے روپیہ کی مصنوعی قلت پیدا کی جائے، یہ کہ حکومت اس شرح پر روپیہ بیچے لیکن خریدے نہیں اور یہ کہ ایک نئی کمپنی یا کمیشن مقرر کیا جائے جو یہ فیصلہ کرے کہ روپیہ اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ ایک شلنگ اور چار پینس ہو جانے کے بعد ہندوستان زر کا ایک مستقل معیار اختیار کرے۔ ان سفارشات کو قبول کر لیا گیا اور 1893ء میں نکسلیس بند کر دی گئیں۔ 1898ء تک یہ مقصد حاصل کر لیا گیا اور ہندوستانی روپے کی قیمت بڑھ کے ایک شلنگ اور چار پینس ہو گئی۔ حکومت نے ہر شیل کمیشن کی سفارش کے مطابق سر ہنری فاؤلر کی قیادت میں ایک اور کرنسی کمیشن مقرر کیا اس کمیشن نے سونا معیار اختیار کرنے کی سفارش کی۔ لیکن اُن وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں ہے ہندوستان نے سونا کرنسی معیار کے بجائے، جس کی سفارش فاؤلر کمیشن نے کی تھی، سونا مبادلہ معیار اختیار کیا۔

زر کے میدان میں ہونے والی تبدیلیوں کے تعلق سے کانگریس نے دہرا موقت اختیار کیا۔ (1) اس نے مبادلے کی فرسودگی کا متلانی بہتہ یورپین حکام کو دینے کی مخالفت کی اور (2) ہندوستانی روپے کو اسٹرلنگ سے جوڑنے کی بنا پر، جو ایک بدیسی کرنسی تھا، اس کی آزاد حیثیت کے کھو جانے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اس نے اپنے نويس اجلاس منعقدہ دسمبر 1893ء میں اس موضوع پر دو تجویزیں منظور کیں۔ (2) تجویز نمبر 14 میں کہا گیا تھا کانگریس کو اس کا افسوس ہے کہ حال ہی میں حکومت ہند نے جلدی میں ایک قانون بنایا ہے جس کی رو سے چاندی کی نجی سک سازی کرنے والی نکسلیس بند ہو گئی ہیں۔ اس نے لوگوں پر مستقل اور تکلف دہنو میت کے بالواسطہ حاصل کا بوجھ بڑھا دیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ کارخانوں کی صنعت پر اس کا بڑا مضرت اثر پڑا ہے۔ ”تجویز نمبر 15 کے ذریعہ کانگریس نے مبادلہ متلانی جیسے جو حکومت کے یورپین اور اپوزیشن ملازمین کو دیا گیا تھا اور جس کی وجہ سے ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ خرچ ہو رہا تھا اور بنکوں کو ایک لاکھ اکتیس ہزار پونڈ کا معاوضہ دینے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ خصوصاً ایسے وقت یہ اخراجات کئے گئے تھے جب ملک کی مالی حالت خراب تھی اور مزید محاصل لگانے کا خطرہ تھا۔

1899ء میں ایک تجویز منظور کی گئی جس کے ذریعے چاندی معیار کے بجائے سونا معیار کو رواج دینے کی مخالفت کی گئی تھی۔ (3) اور 1901ء میں نکسلیس بند کرنے کی ایک دفعہ پھر مذمت کی گئی۔

(1) کن مایات سر ڈیوڈ ہارور نے کہا کہ ہندوستان کی بخت ”زر کا جوا“ بن گیا ہے۔ دیکھئے ہر شیل کمیشن رپورٹ (1892ء)

(2) بی بی سیٹ، بحوالہ 180 صفحہ

(3) تجویز نمبر 14، ایضاً صفحہ 304

لین کرنسی کی اصلاحات نے حکومت کی مالی حالت سدھار دی اس لیے کہ ہندوستان سے سالانہ انگلستان بھیجی جانے والی سود اور اخراجات کی رقم میں کمی ہو گئی۔ لین کا ٹکریس 1898ء کی اصلاحات کی مخالفت کرتی رہی۔ اُس کا کہنا تھا کہ روپے کی قیمت میں 30 فی صدی کا مصنوعی اضافہ کر کے اس حد تک بالواسطہ طریقہ سے تمام محاصل میں اضافہ کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے حکومت کو تو سال بہ سال بڑی بڑی فاضل رقیس مل جاتی ہیں لیکن ملک کے کسانوں اور دوسرے پیداوار کرنے والوں کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔ (1) اس مسئلے پر بحث جاری رہی اور جنگ عظیم کے بعد وہ ماہرین معاشیات اور مبصرین کے درمیان نزاع کا باعث بنا رہا۔

X اختتامیہ

1858ء اور 1905ء کے درمیانی پچاس سال میں جب برطانوی تاج براہ راست ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا، مواصلات اور آمد و رفت کے ذرائع کی توسیع ہوئی، ہندوستان کی بدلتی تجارت میں بڑا اضافہ ہوا اور ہندوستانی معیشت نے جو جدید شکل اختیار کی ہندوستان بین الاقوامی تجارت میں پوری طرح شامل ہو گیا اور ایک اہم تجارتی اکائی سمجھا جانے لگا جدید صنعت اور کان کنی کی بنیاد بھی ہندوستان میں پڑ گئی۔ پٹ سن اور سوتی کپڑے کی صنعتوں نے اور کوئلہ، مسکیز اور ابرق نکالنے کی صنعتوں نے خاصی ترقی کی۔ جس وقت کانگریس نے سودیشی کی تحریک شروع کی اُس وقت ٹائٹل کے جدید نواد کے کارخانے کی تجویز بھی زیر غور تھی۔ ان معاشی تبدیلیوں کے نتیجے میں تاجر طبقوں، زمینداروں اور ساہوکاروں کی حالت میں بڑا سدھار ہو چکا تھا۔ قیمتیں بڑھی تو متانوں میں بھی اضافہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی اصل نے یورپ کی طرح کی تجارتی تنظیموں کو ترقی دینا شروع کر دی۔ مشترک سرمایہ کمپنیوں کی تعداد اور اصل میں بڑا اضافہ ہو گیا۔

ایک طرف تو یہ ترقی ہو رہی تھی دوسری طرف اسی دور میں ملک کو تاجیوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں انھوں بھک مری کا شکار ہو گئے۔ اس زمانے میں حکومت کے مالی حالت زیادہ تر خراب رہی جس کی وجہ سے اسے اور زیادہ بھاری محاصل لگانے پڑے اور زیادہ قرض لینا پڑا۔ بھاری بھاری محاصل کی بنا پر پڑنے والے معاشی بوجھ، ہندوستان کی دست کاریوں کی تباہی اور سول اور فوجی ملازمتوں میں یورپیوں کی زیادہ تعداد ہونے کی وجہ سے روزگار کی کمی نے لوگوں میں بڑی بے چینی پیدا دی تھی۔

برطانوی حکومت کی مخالفت کے اسباب اور بھی تھے لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ معاشی بے چینی اور دکھ ہندوستان میں برطانیہ کی نوآبادیاتی معیشت برطانوی مفادات کو تو بڑھاتی تھی لیکن اُس نے ہندوستان کی صنعتوں کی نمو کو روک دیا تھا۔ اس کے ساتھ مغربی تعلیم کے رواج، جدید سیاسی تصورات کے اثرات جدید سائنس اور تکنالوجی اور متوسط طبقہ کے نشو و نما نے زمین تیار کر دی اور سیاسی انقلاب کا راستہ کھول دیا۔ آزادی اور مساوات کے تصورات اور انگریز شدت پسندوں سے سیکھا ہوا "نمائندگی کے بغیر محاصل نہیں لگائے جاسکتے" کا سبق ایک نوآبادیاتی معیشت کے قیام میں معاون

نہیں ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کی قوم پرستی کو، جو ہندوستانی سماج پر برطانوی اثرات کا نتیجہ تھی، عام غربت و افلاس نے وہ عوامل و محرکات مہیا کر دئے جنہوں نے اسے حرکی عمل بنا دیا۔

اس افلاس، محاصل کے اس بڑے بوجھ، اس اخراجات بچاؤ اور دولت کے نکاس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان ایک آزاد اور با اقتدار ملک نہیں تھا۔ ڈی۔ این۔ واپا نے سترہویں کانگریس کا خطبہ صدرات پڑھتے ہوئے کہا تھا ”واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کو اپنے انتظامی معاملات میں انتخاب کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ اگر وہ آزاد ہو تا تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کا انتظامی ڈھانچہ ملک کے باشندوں پر مشتمل ہو تا جو اس ملک میں رہتے اور یہیں اپنا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔“ (1)

ہندوستان کی افلاس کا تجزیہ بلاشبہ ظاہر کرتا ہے کہ بنیادی طور سے اس کا افلاس ایک بدیسی حکومت کا نتیجہ تھا یعنی اس انتظامی طریقے کا جس کو برطانیہ نے ہندوستان میں رواج دیا۔ اس سے یہ ظاہر تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی معاشی حالت میں اس وقت تک کوئی سدھار نہیں ہو سکتا تھا جب تک حکومت کی نوعیت میں کوئی بڑی تبدیلی نہ ہو۔ چنانچہ حکومت تبدیل کرنے کے لیے تحریک چلانا ایک قدرتی امر تھا یعنی ایک نمائندہ اور جمہوری نظام کو رواج دینے اور برطانوی حکمرانوں کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں سیاسی طاقت منتقل کرنے کے لیے معاشی مسائل اہم اور ضروری تو تھے لیکن ان کے حل کا انحصار تھا ہندوستان کو خود مختاری حاصل ہونے پر۔

آٹھواں باب

مسلم سیاسی فکر کے رجحانات

(1857-1905ء)

1857ء کی بغاوت کے تعلق سے مسلم رد عمل

ہندوستان کے بااالی طبقوں کی امیدوں پر 1857ء کی بغاوت نے کاری ضرب لگائی۔ اس نے کھوئے ہوئے علاقے اور طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ چونکہ بغاوت کے بعد انگریزوں کی نفرت کا اصل نشانہ مسلمان بن گئے تھے اس لیے قدرتی طور سے بغاوت کے نتائج انہیں زیادہ برداشت کرنے پڑے۔ جن علاقوں میں بغاوت کا زیادہ زور تھا وہاں کے سرکردہ خاندان برباد ہو گئے اور بہت سوں کی زمینیں اور دوسری املاک چھین گئیں اور وہ غربت و افلاس کے شکار ہو گئے۔ نوجوانوں کا مستقبل تاریک ہو گیا اس لیے کہ سرکاری سرپرستی کے دروازے اُن پر بند ہو گئے تھے۔ پورا پورا مسلم فرقہ اندھیروں میں بھٹکنے لگا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی قسمت میں تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ سر الفریڈ لائل کے مطابق 1857ء کی بغاوت کے بعد، انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ حقیقی دشمنوں اور انتہائی خطرناک رقیبوں کا سلوک کیا جس کی وجہ سے بغاوت کی ناکامی ہندوؤں کے مقابلے میں اُن کے لیے (مسلمانوں کے لیے) زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ ہندوؤں پر روایتی برتری کا آخری شائبہ بھی مسلمانوں نے گم کر دیا، وقتی طور سے وہ بدیسی حکمرانوں کا اعتماد کھو بیٹھے اور اس وقت سے سول اور فوجی ملازمتوں میں اونچے ماتحت عہدوں پر اُن کی تعداد کم ہوتا شروع ہو گئی۔ (۱)

علماء

ان حالات میں اُن کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ یا تو وہ اپنے دکھوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے، اُن اخلاقی کمزوریوں کو دور کرتے جن کی وجہ سے اُن کی قوت ارادی مفلوج ہو گئی تھی، قرآن پاک کی تعلیمات کی بنیاد پر ایک صاف ستھرا، خدا پر ایمان رکھنے والا اور راست باز سماج قائم کرنے اور دوسرے مذاہب کو ماننے والے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا سیاسی نظام بناتے جس میں ہر کسی مذہب پر چلنے کی ممانعت نہ ہوتی، ترقی اور خوشحالی کے مادی مواقع ہوتے اور ہر مذہب، ہر نسل اور ہر رنگ کے انسان کے لیے ایک باعزت اور بادقار زندگی گزارنے کا موقع ہوتا۔

یامیہ کے لیے آزادی کے خواب کو بھول جاتے، بدیسی حکمرانوں کی حکومت کو تسلیم کر لیتے اور سرکاری سرپرستی کے لیے اُن کی خوشنودی حاصل کرتے۔ یعنی ملازمتوں میں اور میونسپل کونسلوں، قانون ساز اداروں اور دوسرے اداروں کی ممبری کی طرح کی بااثر عیثیوں میں حصہ بنانے کی کوشش کرتے۔

پہلاراستہ زیادہ تر علمائے اختیار کیا یعنی اُن بزرگوں نے جو روایتی درس و تدریس کے کاموں میں مصروف رہتے تھے اور ایک نصب العین رکھتے تھے۔ دوسرا رستہ اُن مسلم قائدین نے اختیار کیا جنہوں نے اُن اسکولوں اور کالجوں میں جدید تعلیمی پالیسی جو مغربی فنون اور سائنس کی نشر و اشاعت کے لیے قائم کئے گئے تھے۔

جو علماء مذہبی اصلاح اور سیاسی آزادی کے حامی تھے وہ اپنا رشتہ شاہد دلی اللہ سے جوڑتے تھے جنہوں نے نام نہاد وہابی تحریک کے قائدوں اور اُن عالموں کو متاثر کیا تھا جنہوں نے 1857ء کی بغاوت میں حصہ لیا۔ علاوہ عام مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کرتے تھے جن کے متعلق الاکل کا خیال تھا "میرے خیال میں یہ بات زیادہ قرین حقیقت ہے کہ اُن کی تائید اور غیر تعلیم یافتہ اکثریت ہمارے خلاف ہے" (1) اُن میں سے زیادہ تر معمولی محنت کش طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا اصل مقصد تھا کہ لوگوں میں پائے جانے والے مذہبی طریقوں کی اصلاح کی جائے، انہیں توہمات اور غیر اسلامی عناصر سے پاک کیا جائے اور انہیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ قرآن اور حدیث کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ اس کے علاوہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک ہندوستان میں بدیسی حکومت رہے گی اس وقت تک یہ اصلاحات نہیں کی جاسکیں گی۔ اُن کا خیال تھا کہ مذہبی اور سیاسی مسائل صرف اس وقت حل کئے جاسکتے ہیں جب انگریزوں کی حکومت ختم ہو جائے جو اسلام کے لیے ایک سیاسی اور ثقافتی خطرہ ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے تیار تھے کہ ملک کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ مل کر قومی آزادی کی جدوجہد میں پوری طرح شامل ہو جائیں۔ انہیں یقین تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد اُن کو پوری پوری مذہبی اور تہذیبی آزادی حاصل ہو جائے گی۔

چنانچہ وہ بڑی ثابت قدمی کے ساتھ حکومت کی مخالفت کرتے رہے۔ اُس بدیسی حکومت کے خلاف جس نے ریاست میں اُن کا اثر چھین لیا تھا، اُن کے دلوں میں جو جذبہ نفرت تھا اُس نے بدیسی علم اور تہذیب سے ہی انہیں متنفر کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم بہت سے مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر دے گی اور بہت سے الحاد کا شکار ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس وہ گروہ جو مسلمانوں میں اثر حاصل کرنے کے لیے ان کا مقابلہ کر رہا تھا اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو سیاسی اوامروں، فوجی طاقت اور مغرب کی تہذیب و تمدن سے بہت متاثر تھے۔ وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو ناقابلِ تسخیر کہتے تھے اور انہوں نے تاریخ میں پڑھا تھا کہ آزاد مسلم حکمران برطانیہ کے خلاف جدوجہد میں کس بری طرح ناکام ہوئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ مسلم بااِتی طیتے کی بربادی اُن غلطیوں کا نتیجہ تھی جو انہوں نے 1857ء میں کی تھیں۔

انہوں نے دیکھا کہ بالعموم ہندوؤں نے اور بالخصوص بنگالیوں نے ترقی کے موجودہ مواقع سے کس طرح پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے بڑی ترقی کی تھی۔ زمینداری اور تجارت سے بڑی دولت کمائی تھی اور سب ملازمتوں پر قابض ہو گئے تھے۔ مغربی تعلیم سے غیر مشروط لگاؤ کی بنا پر انہوں نے حاکموں کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اس کے برعکس مسلمان اُس سے اپنا دامن بجائے رہے اپنی شکایتوں کو زندہ رکھا اور اس کے نتیجے میں بچھڑ گئے۔ اس تاثر ابر کی کے متعلق ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا تھا۔ "تعلیم عامہ کا ہمارا نظام، جس نے ہندوؤں کو صدیوں کی نیند سے چونکا دیا اور اُن کے سست عام لوگوں میں قوم کی اعلیٰ خصوصیات پیدا کر دیں، مسلمانوں کی روایات کے خلاف، اُن کی ضرورتوں کے لیے ناکافی اور اُن کے مذہب کے لیے نفرت انگیز ہے۔" (2)

(1) الاکل۔ اے۔ بی۔ نولہ بالا 246

(2) ہنٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو، انڈین مسلمان، (لندن، 1876ء)، صفحہ 177۔

مسلمانوں نے ابتداء سے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی۔ انہوں نے اس وقت باضابطہ طور سے اس کی مخالفت کی تھی جس وقت لارڈ ولیم بینٹک نے 7 مارچ 1835ء کے حکم پر دستخط کئے تھے۔ آٹھ ہزار مسلمانوں کے دستخطوں سے ایک عرضداشت اُس کو پیش کی گئی تھی جس میں اس امر کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا کہ سرکاری مالی امداد محض انگریزی تعلیم پر خرچ کی جائے۔ انگریزی تعلیم پر اُن کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس سے نوجوان ہندوستانی طالب علموں کے مذہبی عقائد کمزور ہو جاتے ہیں اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے راستہ کھل جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کی مخالفت کے رجحان کے خلاف بھی کچھ آوازیں اٹھیں۔ شاہ عبدالعزیز (1746ء-1824ء) نے مغربی تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی تھی۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے کلکتہ کے انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہو کر مسلمانوں کے رجعت پرست عناصر کی مخالفت مول لی۔ کلکتہ مدرسہ میں بھی انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ دہلی میں جو کالج 1828ء میں کھلا تھا اس میں مغربی علوم کی تعلیم دی جانے لگی اور سائنس کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے نصف اول میں کلکتہ سے دہلی تک کچھ مسلم نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی۔ لیکن من حیثیت الفرقہ مسلمان انگریزی تعلیم سے دور رہے۔

سیاسی میدان میں بھی اُس شک اور دوری کو کم کرنے کی کوشش کی گئی جو حکمران طبقوں کے خلاف پائی جاتی تھی۔ کلکتہ کی محترم لٹریری سوسائٹی نے، جو 1823ء میں قائم کی گئی تھی اور جس کے سرکیریٹری خان بہادر نواب عبداللطیف خان تھے، شاہ ولی اللہ کے گروہ یعنی دہابیوں کے جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔ ملکہ انگلستان کے خلاف جہاد کی ضرورت کے لیے مکہ کے مفتیوں سے بھی فتوے حاصل کئے گئے۔

I۔ سر سید احمد خاں۔ حالات زندگی

لینن انگریزی تعلیم اور برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کے حق میں سب سے زیادہ موثر اقدامات سر سید احمد خاں نے کئے جو ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم رول ادا کرنے والے تھے۔

سر سید احمد خاں 1817ء میں پیدا ہوئے اُن کا دعویٰ تھا کہ باپ اور ماں دونوں کی طرف سے اُن کا تعلق طبقہ اشرافیہ اور مذہبی مسلم خاندانوں سے تھا۔ اُن کے دو عیالی بزرگ اور تنگ زیب کے زمانے سے مغل سلطنت کی ملازمت میں تھے، مغل دربار سے قریبی تعلق رکھتے تھے اور مغل تہذیب کے علمبردار تھے، اُن کے بھتیجی بزرگ خواجہ فرید احمد ایرانی تاجروں کے ایک دولت مند خاندان کے رکن تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی اور ریاضی اور فلکیات میں خصوصی مہارت حاصل کی تھی وہ پہلے تو کلکتہ مدرسہ کے سپرنٹنڈنٹ کے فرائض ادا کرتے رہے اُس کے بعد ایران اور برما کے درباروں میں برطانوی سفیر مقرر ہوئے۔ دو دفعہ وہ شہنشاہ کبیر شاہ دوم (1806ء-1837ء) کے وزیر اعظم بھی رہے۔

چنانچہ سر سید احمد خاں کی ابتدائی زندگی ایسے ماحول میں گزری جہاں وہ زمانہ وسطی اور زمانہ جدید دونوں کی تہذیبوں سے فیض یاب ہو سکے۔ لیکن وہ باضابطہ طریقے سے اور مسلسل تعلیم نہیں حاصل کر سکے۔ اس کی وجہ سے اسلامی امور کے متعلق اُن کی معلومات نا کھل تھیں۔ بعد میں انہوں نے اپنی کوششوں سے مغربی فکر تک

ر سائی حاصل کی اور مغرب نے قدرتی سائنسوں میں جو ترقی کی تھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ جس وقت اُن کی عمر 22 سال تھی ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور انہیں روزگار کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ مغل دربار میں اس قسم کی ملازمت کی گنجائش نہیں تھی جس میں انہیں مرضی کے مطابق تنخواہ مل سکتی۔ چنانچہ انہوں نے عدالتی کام سیکنا شروع کیا اور 1839ء میں آگرہ کے کسٹمز کے دفتر میں کلرک مقرر ہو گئے۔ 1857ء میں وہ ترقی کر کے صدر امین بن گئے۔ جس وقت 1857ء کی بغاوت شروع ہوئی وہ اس وقت بجنور میں تھے۔ بارہ سال بعد وہ انگلستان گئے جہاں تقریباً ڈیڑھ سال اُن کا قیام رہا۔ 1876ء میں وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور علی گڑھ میں سکونت اختیار کی۔ 1898ء میں 81 سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا۔

سید احمد خاں نے طویل عمر پائی اور پوری زندگی بڑی جانفشانی میں گزری۔ انہوں نے مسلمانوں کی بہت خدمت کی۔ زندگی کے ابتدائی برس انہوں نے ایک ایسے سانچ میں گزارے تھے جو ذلت اور خواری کے آخری مرحلوں سے گزر رہا تھا۔ اُس کا سیاسی اختیار و اثر ختم ہو چکا تھا، اس کا طبقہ اثر افی بے ایمان اور زوال پذیر تھا اور اس کے عام لوگ تیزی سے غریب اور افلاس کے شکار ہوتے جا رہے تھے۔ کمرپن، جہالت اور توہم پرستی بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مذہب محض ظاہری رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور اُس سے یقین و ایمان کی روشنی چھن گئی تھی۔ اخلاق خراب ہو چکے تھے اور زندگی سے غلوں و اصول پرستی ختم ہو چکی تھی۔ مکرور پاکدور دور تھا۔ عیاشی اور جسمانی لذت کا رواج عام تھا۔ تمام اعلیٰ اقدار اپنی توقیر کو چھپی تھیں۔

جب سید احمد خاں جوان ہوئے تو مسلمانوں پر ایک ایسی آفت آئی جو بظاہر اُن کی مکمل تباہی کا حکم رکھتی تھی۔ 1857ء اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے ہر طرف تباہی و بربادی پھیلادی۔ دولت مند بالائی طبقے کے بہت سے رکن ختم ہو گئے اور پورے فرقے کو حکمران نفرت اور شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ایک باعزت اور حساس مسلمان کے لیے یہ واقعات روح فرساتھے پہلے ملک سے ہجرت کرنے کا خیال انہیں آیا لیکن جلد ہی یہ بات اُن کی سمجھ میں آگئی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا چھوڑ کر خود کسی دوسرے ملک میں آرام کی زندگی بسر کرنا بزدلی ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا وہ یہیں رہ کر جدوجہد کریں گے۔ تقریباً پچاس برسوں پر محیط طوفان اور تباہی کے زمانے میں وہ بے مثال صبر، ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اپنی موت سے پہلے انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ ملت کے افق پر منڈلاتے ہوئے گہرے بادل چھٹ گئے ہیں اور اس کے حالات میں ایک ایسا انقلاب آ گیا ہے جو ایک روشن مستقبل کا ضامن ہے۔

II سید احمد خاں کے سماجی اور مذہبی اصلاحات کا تصور

سید احمد خاں کے سامنے ایک دشوار کام تھا۔ یہ کام تھا مسلمانوں کا سماجی، معاشی اور سیاسی سدھار۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سید احمد خاں کا تعلق بالائی طبقے سے تھا۔ اس طبقہ کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کا راستہ اثر خود اُن پر بھی پڑا تھا۔ وہ اُسے اپنا ذاتی نقصان سمجھتے تھے لیکن نچلے طبقوں کی آہستہ آہستہ اور تقریباً غیر محسوس طور پر گزرتی ہوئی حالت نے انہیں متاثر نہیں کیا۔ اُن کے رویے سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ اس تباہی سے واقف ہیں جس کے شکار رفتہ رفتہ عام مسلمان ہو رہے تھے۔ چنانچہ اُن کی

تمام تر کو ششیں اُس طبقے کے حالات سدھارنے پر مرکوز تھیں جو جھپٹے زمانے میں بااثر اور طاقتور تھا اور جس کے شاندار کاموں سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں جس کو مسلمانوں کے باوقار ورثے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے چنانچہ مسئلہ کا جو حل انہوں نے دریافت کیا وہ ملکا کے حل سے مختلف تھا۔

سید احمد خاں اور اُن کے ساتھی یہ دیکھ چکے تھے کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کی کوشش بے سود ہے۔ اُن کے نزدیک ”آزادی“ عملی سیاست نہیں تھی۔ دوسرا راستہ صرف یہ تھا کہ برطانوی حکومت کے تحت مسلمانوں کی حالت سدھاری جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان جو نفرت اور شک کی کھائی حائل تھی اس کو پالا جائے، یہ کہ انگریزوں کو یقین دلایا جائے کہ مسلمان اُن کی حکومت کے دشمن نہیں ہیں بشرطیکہ وہ اُن کے مذہبی عقائد و رسوم میں مداخلت نہ کریں اور یہ کہ اُن کے مذہب نے اُس کا حکم نہیں دیا ہے کہ اُن عیسائیوں کی طرف خاصمانہ رویہ اختیار کیا جائے جو اُن پر حکومت کرتے ہیں۔

اس کے لیے مذہب کی تشریح نو ضروری تھی۔ اس کی ضرورت تین اور وجوہ سے تھی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ عیسائی مشنری اسلام پر سخت تنقید کرتے تھے اور اسے طعن و طنز کا نشانہ بناتے تھے۔ کتابوں، رسالوں، تبلیغ عام اور مناظروں کے ذریعے وہ جو پرچار کرتے تھے اسے اسکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں سے تقویت ملتی تھی اور وہ بہت کارثر ثابت ہو رہا تھا۔ اس خطرہ میں اضافہ اس سے ہو گیا کہ وہ حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور بہت سے حکام اُن کے ہمرد اور حامی تھے حالات انتہائی پریشان کن تھے اور اس لیے مذہب کا دفاع ضروری تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ اخلاقی اور سماجی گراؤ اور مذہب کی طرف سے مسلمانوں کی لاپرواہی رقیبوں کو حملے کرنے کے مواقع فراہم کرتی تھی لیکن اُس کی وجہ سے اسلام کے حامیوں کے لیے اُس کی دفاع و شہادت ہو گئی تھی۔ اسلام کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ جدید خطوط پر اس کی تشریح نو لے کر اُس کا وقار بحال کیا جائے۔ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ تھا کہ توہمات اور غیر معقول تصورات سے اسلام کا دامن پاک کیا جائے۔

تیسری بات یہ تھی مغربی تصورات کی اشاعت اور مغربی تعلیم کی توسیع اسلام کے بنیادی عقائد کے لیے خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ جدید سائنس کے چیلنج کا بہر حال مقابلہ کرنا تھا۔

اس جدوجہد کے لیے جس فلسفیانہ اور مذہبی علم و فضل کی ضرورت تھی وہ سید احمد خاں کے پاس نہیں تھا لیکن وہ بڑی ہمت اور انتہائی جوش رکھتے تھے۔ انہوں نے تین کاموں کا بیڑا اٹھایا یعنی مذہب کی تشریح نو، سماجی اصلاح اور تعلیم۔ لیکن انہوں نے اس پر بھی نظر رکھی کہ یہ چیز مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی بحالی کے لیے بھی شرط اول ہیں۔

انہیں یقین تھا کہ عیسائی مشنریوں اور مصنفوں کے ساتھ مناظروں میں اطمینان بخش نتائج صرف اس وقت حاصل کئے جاسکتے ہیں جب اُن کے خلاف مغربی طریقہ استدلال استعمال کیا جائے۔ اگر وہ عقل اور سائنس کی بنیاد پر اسلام پر حملہ کریں تو انہیں بھی جواب میں اُسی قسم کی دلیل استعمال کرنی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کی تعلیمات عقل و فطرت کے مطابق ہیں۔ انہوں نے جو طریقہ استدلال استعمال کیا وہ علماء کے طریقوں سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے جن اصولوں پر بنیاد

قائم کی دہتے۔

(1) قرآن کی تعلیمات من جانب اللہ اور ابدی ہیں۔ اس لیے اُن میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی

ہے اور لفظ اور معنایوں اعتبار سے اُن کی پابندی لازمی ہے۔

(2) حدیث رسول کے اقوال پر مشتمل ہے جنہیں ایسے زاویوں نے سمجھا کیا ہے جن کے کردار و استناد

کی جانچ کی جانی چاہیے۔ اس لیے اُن پر تنقید کی جاسکتی ہے اور جانچ پڑتال کے بعد ہی انہیں تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

(3) حدیث کی پابندی محض مذہبی امور میں لازمی ہے۔ دنیاوی امور میں اُن کی پابندی نہ کرنے

کی اجازت ہے۔

(4) انسان کی مرضی آزادی ہے۔

ان اصولوں کی بنا پر وہ اسلامی عقائد کے باجرات اور انقلابی شارح بن گئے۔ انہوں نے اس قسم کے تصورات پر اُن اصولوں کا اطلاق کیا جیسے خدا کی وحدانیت، روح، آزادی مرضی، تقدیر، پیش گوئی، الہام، معجزات، معراج، فرشتے، شیطان، عالم غیب، عالم مثال، حیات بعد از ممات، خلود، قرآن وغیرہ۔ ان تمام سوالوں کے تعلق سے اُن کا رویہ بہت معقول تھا۔ مثال کے طور پر وجود باری تعالیٰ کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ اس کا ثبوت کائنات کے مظاہر میں موجود ہے۔ حالانکہ انسان کی محدود عقل رب العالمین کی حقیقت اور نوعیت کا احاطہ نہیں کر سکتی ہے۔ اُن کے مطابق ہم صرف جانتے ہیں کہ روح ہے لیکن اُس کی حقیقی نوعیت کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اُن کی رائے میں نبوت انسانی تکمیل کا نام ہے اور یہ کہ نبی ایک انسان ہوتا ہے جسے خدا نبوت کی صفات سے نوازتا ہے۔ ہر انسان خدا کا پیغام حاصل کرنے کا اہل ہوتا ہے لیکن اُن کی اہلیت میں فرق ہوتا ہے۔ الہام کی سچائی کو معلوم کرنے کا پیمانہ فطرت ہے۔

سید احمد خاں نے ایسے معجزوں کے امکان سے انکار کیا جو قانون قدرت کے منافی ہوں۔ اُن کا خیال تھا کہ ”فرشتے“ اور ”شیطان“ انسانوں اور جانوروں کی طرح کوئی آزاد وجود نہیں رکھتے ہیں بلکہ انسان کے اندر پائی جانے والی اچھی اور بری طاقت، رویہ یا رجحان ہیں۔ انہوں نے اس سے بھی انکار کیا کہ مکان و زمان کا اطلاق خدا، فرشتوں، خوابوں وغیرہ پر کیا جائے۔ اُن کے مطابق جنت اور دوزخ ایسے تصور ہیں جو انسان کی عقل سے باہر ہیں۔ قرآن کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ وہ کلام اللہ ہے اور اس لیے معنی اور لفظ دونوں اعتبار سے ابدی ہے۔ انہوں نے اسلام کی معقولیت سے ایک دلچسپ نتیجہ اخذ کیا اور وہ یہ تھا کہ جو شخص خدا میں یقین رکھتا ہے اُس کو کافر یا ملحد نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک دہریے کو بھی کافر یا ملحد ہی سے سمجھا جاسکتا ہے اس لیے کہ وہ اسلام کے ارکان سے لاکھ انکار کرے لیکن عملاً وہ اُن کا اسی طرح پابند ہے جس طرح کوئی حقیقی مسلمان اس لیے کہ خدا کے احکام قانون فطرت ہیں جن کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی ہے۔

سماجی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کے تعلق سے بھی سید احمد خاں اتنے ہی آزاد خیال تھے۔ اُن میں سب سے دلچسپ سوال تھے غلامی، کثرت ازواج، جہاد، سود اور جنگی قیدیوں کے سوال۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن مسائل کے تعلق سے اسلامی تصورات معقول اور قوانین فطرت کے مطابق ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ برتاؤ کرنے کے تعلق سے ایسی شرائط مقرر کی ہیں کہ اُن کی وجہ سے غلامی کی نوعیت ہی بدل گئی ہے، کثرت ازواج کی اجازت محض خصوصی حالات میں ہے، غیر مسلموں کے خلاف جہاد صرف

اُس صورت میں جائز ہے جب اسلام پر حملہ کیا جائے، ہر قسم کے سود کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اسلام سے پہلے جس طرح خون چوسا جاتا تھا اُس کی ممانعت ہے، جنگ میں گرفتار ہونے والے مردوں کو قتل کرنا اور عورتوں کو باندیاں بنانا مناسب نہیں ہے۔ جہاں تک خلفاء راشدین کا تعلق ہے اُن کا خیال تھا کہ آنحضرتؐ کے انتقال کے تیس سال بعد اُن کا سلسلہ امام حسین کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کے معنی تھے ترکی کا سلطان جائز وظیفہ نہیں تھا اور یہ کہ انگریز حکمرانوں کے ساتھ وقاداری لازمی تھی۔ (۱)

سید احمد خاں کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمانوں اور عیسائی حکمرانوں کے درمیان جو کھائی تھی اس کو پاٹ دیا جائے۔ دوسری طرف وہ مشترکہ باتوں پر زور دیتے تھے اور اسلام نے عیسائیت کی جو خدمت کی ہے اس کو یاد دلایا کرتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ سماجی تعلقات میں وہ عیسائیوں کے خلاف تعصب اپنے دل سے نکال دیں خاص طور سے کھانے پینے کی حد تک۔

مصلحت کی حیثیت سے وہ اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ مسلمانوں کے رجعت پرست عناصر اُن سے بہت خفا رہنے لگے تھے۔ اُن سے خاص طور سے قدیم خیال رکھنے والے ناراض تھے اور اُن کے خلاف کفر کا فتویٰ دیتے رہتے تھے۔ اخباروں، کتابوں اور تقریروں میں اُن کو گالیاں دی جاتی تھیں اور اُن کی زندگی خطرے میں تھی۔ لیکن انہوں نے کسی خطرے کی پرواہ نہیں کی۔ انہیں کوئی اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکا۔ بالآخر اُن کے زیادہ تر مترضین خاموش ہو گئے۔ حالانکہ قرآن کی جو جرأت آمیز تشریح انہوں نے کی تھی اس پر عمل خود اُن کے ادارے میں بھی نہیں کیا گیا پھر بھی اسلام کے تعلق سے اُن کے مقتول اور فطرت سے مطابقت رکھنے والے رویے کو مغربی تعلیم پائے ہوئے نیاز منین رکھنے والے مسلمان درپردہ قبول کریں۔ جہاں تک ہندوستانی سماج کا تعلق ہے اُن کے مذہبی خیالات کا اہم ترین نتیجہ یہ ہوا کہ اُن تک نظر عالموں کے خیالات کی نفی کی گئی جو ہندوؤں کو کافر سمجھتے تھے۔ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ اسلام کے قوانین فطرت کے قوانین کے مطابق ہیں اور یہ کہ ہر انسان پر اُن کی پابندی لازمی ہے۔ منطقی طور سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں اور دوسرے مذہب کو ماننے والوں میں جو بھی فرق ہے وہ محض لفظوں کا ہے حقیقی نہیں اس کے علاوہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خیر و شر کے انتخاب میں انسان آزاد ہے اور یہ کہ ایک مسلمان بھی ویسے ہی گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے جیسے کہ ایک غیر مسلم اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو کسی کی شفاعت کے بغیر خدا کے سامنے اپنے گناہوں کی جوابدہی کرنی ہو گی۔ اس طرح سید احمد خاں کے لبرل رویے مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے درمیان سماجی سمجھوتے اور تال میل کے دروازے کھول دئے۔

اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں سید احمد خاں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ انہوں نے 27 جنوری 1883ء کو پنڈت میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ”ہم دونوں ہندوستان کی ہو امیں سانس لیتے ہیں اور گنگا اور جمنا کا متبرک پانی پیتے ہیں۔ ہم دونوں ہندوستان کی مٹی سے پیدا ہوئے والی چیزیں کھاتے ہیں۔ ہم ساتھ جیتے ہیں ساتھ مرتے ہیں۔ ہندوستان میں رہ کر ہمارا خون بدل گیا ہے ہمارا رنگ بدل گیا ہے اور یکساں ہو گیا ہے، ہمارے خدا و خال میں مشابہت پیدا ہو گئی ہے۔ مسلمانوں نے بہت سی

(۱) سید احمد خاں۔ آخری مضامین (15-134)، بصری مطابق 98-1897ء، طابع الہیکہ فضل الدین بازار کشمیری، لاہور 1898ء۔ صفحات 150 و بعد کے صفحے۔

ہندوؤں کی رسمیں اختیار کر لی ہیں۔ ہندوؤں نے بہت سے مسلم طریقے اپنا لیے ہیں ہم اسے ایک دوسرے میں کھل مل گئے کہ ہم نے ایک نئی زبان اردو کو جنم دیا جو ہماری زبان ہے۔ نہ ہندوؤں کی زبان۔ چنانچہ اگر ہم اپنی زندگی کے، جو خدا کی امانت ہے اس حصہ کو اپنا سمجھیں تو اس میں شک نہیں کہ ایک ہی ملک میں رہنے کی بنا پر ہم ایک قوم تصور کئے جاسکتے ہیں اور ملک اور خود ہماری خوشحالی کا دارومدار اتحاد، باہمی ہمدردی اور محبت پر ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اختلافات، ضد، مخالفت اور خصمانہ جذبات ہمیں برباد کریں گے۔“ آگے چل کر انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک خوبصورت دلہن کی دو آنکھوں سے تھپیہ دی اور کہا کہ اگر ان میں سے کوئی بھی آنکھ خراب ہو گئی تو دلہن کا حسن ختم ہو جائے گا۔ (1)

پنجاب کے ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے شکایت کی کہ انہیں ہندو کیوں نہیں سمجھا جاتا ہے اور کہا ”آپ نے ہندو کی اصطلاحات اپنے لیے استعمال کی۔ یہ صحیح بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ میری رائے میں لفظ ہندو کے معنی کوئی خاص مذہب نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہر وہ شخص جو ہندوستان میں رہتا ہے اپنے کو ہندو کہنے کا حق رکھتا ہے۔ مجھے افسوس کہ میں حالانکہ ہندوستان میں رہتا ہوں پھر بھی آپ ہندو مجھے نہیں سمجھتے۔“

اپنے آخری مضامین میں سے ایک میں انہوں نے لکھا ”ہماری رائے میں جس طرح نہ ہی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایسی لین دین، باہمی محبت اور ہمدردی پر کوئی مضراثر نہیں پڑتا چاہیے اسی طرح سیاسی مسائل کو بھی ایسی لین دین، باہمی محبت، پیار، اور ہمدردی میں مائل نہیں ہونا چاہیے۔“ انہوں نے مزید لکھا ”اس میں شک نہیں کہ جس طرح ہم نہ ہی اختلافات کو نظر انداز کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستی، پیار، اتحاد اور باہمی ہمدردی کا رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں اس طرح سیاسی اختلافات سے بھی قطع نظر لڑکے ہم چاہتے ہیں کہ ان میں سماجی سطح پر باہمی دوستی، پیار، ہمدردی اور بھائی چارہ ہو۔“ (2)

سید احمد خاں کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی تعاون ہونا چاہیے۔ یہ بات حقیقت کے منافی ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس اتحاد میں مذہب کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا ہے اور ان کا ضمیر اس پر مطمئن تھا۔ کانگریس سے ان کے اختلافات کی وجہ تھی شخص سیاسی مصالحوں۔ اس قسم کے اختلافات خود ہندوؤں میں بھی پائے جاتے تھے یعنی زمینداروں اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے میں۔

سید احمد خاں ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے

سید احمد خاں نے مسلمانوں کے خیالات میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی طور سے مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش اس سے کم اہم نہیں تھی۔ وہ اپنے مذہبی خیالات کو ایک اداراتی اساس دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی ایک ایسی اسکیم بنائی جو ان کی مذہبی، تہذیبی اور مادی

(1) مجموعہ نیکو نامے سید (اردو)، خٹھی سراج الدین ڈیشن، لاہور پریس، 1892ء، صفحات 121-117۔

(2) مدعہ 1897ء، 13 اپریل 1898ء، نیچے آخری مضامین، مولہ ہا، صفحات 57-56۔

ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ مسلمانوں میں پائے جانے والے رجعت پسند عناصر کی طرح وہ خود بھی سرکاری طرف سے چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کی سیکولر تعلیم سے مطمئن نہیں تھے جس کی بنا پر طالب علم اسلام سے منحرف ہو رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تعلیم نے ان رواجوں کو پس پشت ڈال دیا جن میں کردار کی خوبی پر زور دیا جاتا تھا اور دوسری طرف اُس نے زندگی کے کوئی نئے اخلاقی اصول نہیں پیش کئے لیکن جہاں تک ذہنی نشوونما کا تعلق تھا سید احمد خاں نے مسلم مدرسوں کے قدیم نظام سے مطمئن تھے اور نہ جدید تعلیم سے جو حکومت کے قائم کئے ہوئے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی تھی۔ مدرسوں کے متعلق انہوں نے لکھا تھا، ان دنوں مسلمانوں نے پرانے قسم کے کئی تعلیمی ادارے جون پور، علی گڑھ، کان پور، سہارن پور، دیوبند، دہلی اور لاہور میں شروع کئے لیکن میں صدق دل سے کہتا ہوں وہ سب محض فضول اور بے مصرف ہیں۔“ (1)

مدرسوں کا نصاب تعلیم دینیات، زبان، منطق، طبعی سائنسوں، ریاضی، فہرہ اور طب پر مشتمل ہوتا تھا۔ سید احمد خاں کی رائے تھی ”اب یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ اسلامی سائنس محض بے مصرف ہے اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اُن کو پڑھنے سے اب کوئی فائدہ نہیں اس لیے وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر و خوار ہو گئی ہیں۔“ (2)

اسی کے ساتھ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں دی جانے والی اعلیٰ تعلیم بھی ناکافی تھی۔ اُن کی رائے میں یونیورسٹیاں تھوڑی بہت تعلیم دے کر بہت سے بی۔ اے اور ایم۔ اے پیدا کر رہی تھیں لیکن ایسے لوگ بہت کم نکلتے رہے تھے جنہیں واقعی عالم کہا جاسکے۔ انہوں نے تعلیم کے مقاصد اس طرح بیان کئے۔ (1) ایمان کو تقویت پہنچانے کے لیے مذہبی حقائق کا علم اور معنویت و روایت میں مفاہمت ضروری ہے۔ (2) اقامتی تعلیم کا یہی قائم کر کے اور صحت مند عملی کاموں کو فروغ دے کر کردار کی تہذیب اُرتا اور (3) جدید سائنسوں کی اعلیٰ ترین مدارج تک تعلیم دینا اور طالب علموں میں مقبول پسند کی رجحان پیدا کرنا۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے سید احمد خاں نے مندرجہ ذیل اقدامات کئے۔ اسکول کھولے، سائنسی وسائلیاں قائم کیں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تنظیم کی انہوں نے مسلمانوں کے لیے تعلیم کی جو اسکیم بنائی تھی اس میں تین قسم کے ادارے شامل تھے یعنی اعلیٰ تعلیم جس کی نمائندگی محمدن انگلو اور نیٹل کالج کرتا تھا جس میں 18 سال سے زیادہ کے طالب علم تھے۔ اس کے تین شعبے تھے سینی انگریزی، اردو اور فارسی اور عربی۔ ڈل سیشن جس میں گیارہ سے اٹھارہ سال تک کے بچوں کے لیے کتب۔ ان تینوں قسم کے اسکولوں میں مذہبی تعلیم لازمی تھی۔

اس اسکیم کے تحت محمدن انگلو اور نیٹل اسکول 1874ء میں قائم کیا گیا جسے ترقی دے کر 1878ء میں کالج بنادیا گیا۔ اس نے ہندوؤں اور برطانوی حکمرانوں دونوں پر ظاہر کر دیا کہ ہندوستانی مسلمان نئی تعلیم اور اُس کے فوائد کی طرف سے بے خبر نہیں ہیں۔ سید احمد خاں کی خواہش تھی کہ اس کالج کو ترقی دے کر آکسفورڈ یونیورسٹیوں کی طرح کی یونیورسٹی بنادیں۔ جس طرح یہ یونیورسٹیاں انگلستان کی حکومت کے لیے حکام اور انتظامی کارکن پیدا کرتی تھیں اسی طرح وہ چاہتے تھے محمدن انگلو اور نیٹل کالج ہندوستان کے لیے

(1) تہذیب الاخلاق (۱۱)، فصل اللہین انیشین، جلد 22، صفحہ 457

(2) ایضاً جلد اول، صفحات 419-424

حکام پیدا کرے۔ اُن کی دوسری خواہش یہ تھی کہ کالج ہندوستانی زبانوں کے ذریعے ہندوستان کے لوگوں میں مغرب کے اعلیٰ ترین علوم کی نشر و اشاعت کرے۔ کالج کے اردو شعبے سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ایسے عالم پیدا کرے جو اسلام کی مذہبی اور تہذیبی میراث کو آئندہ نسلوں تک پہنچا سکیں۔

لیکن سید احمد خاں کی توقعات کالج پوری نہ کر سکا۔ انگریزی شعبہ اپنا ردِ پوری طرح ادا نہ کر سکا یعنی اردو کے ذریعے وہ مغربی علوم کو مسلمانوں میں نہ پھیلا سکا۔ اس کے باوجود کالج اس کام پر کڑی نظر کیا جو ”اعلیٰ گزٹھ تحریک“ کہلاتی ہے اور مسلمانوں کی زندگی اور فکر پر اس کا گہرا اثر پڑا۔

محمدن، انگلو اور نیشنل کالج کا قیام سید احمد خاں کی زندگی میں ایک اہم موڑ کا حکم رکھتا ہے۔ وہ اس کی ترقی اور داشت و پرداخت میں اتنے شہمک ہو گئے کہ تمام دوسری دلچسپیاں ماند پڑ گئیں۔ اُن کی نظر میں اعلیٰ انگریزی تعلیم ہندوستان کی تمام سماجی اور سیاسی بیماریوں کا علاج تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ پنجاب اور آلہ آباد کی یونیورسٹیوں میں شرقی علوم کی درس گاہیں بنائی جا رہی ہیں تو انہوں نے اس پر سخت اعتراضات کئے۔ ابتدائی اسکول قائم کرنے کے لیے مسلمان جو چندے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اُس کی سخت مذمت کی۔ سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے سیاسی تحریک کی انہوں نے مخالفت کی۔ اُن کا خیال تھا کہ انہیں حاصل کرنے کا بہتر ذریعہ اعلیٰ تعلیم ہے۔ چونکہ کالج کی کامیابی کا انحصار ایک طرف تو مسلمانوں کی خوشنودی اور تعاون حاصل کرنے پر تھا اور دوسری طرف حکومت کی حمایت اور لہذا اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ان دونوں چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے انہیں ان باتوں سے بچنا چاہیے جو مسلمانوں یا حکومت کے لیے ناگواری کا باعث ہوں۔

کام بہت دشوار تھا۔ اُس زمانے میں مسلمان مذہبی اور سیاسی بنیادوں پر بنے ہوئے تھے۔ رجعت پرست علماء جن میں دیوبند کے، کول کے، رکن اور کلکتہ کے نواب عبداللطیف خاں، بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں، حیدر آباد کے نواب رسول یار خاں اور صوبجات شمال مغربی وادھ (اتر پردیش کے نواب) اہل اعلیٰ خاں کی طرح کے عالم شامل تھے اُن کے جدید تصورات اور معقول تشریحات کے خلاف تھے اور انہیں اُن کا فر نہیں تو ہر باضرور سمجھتے تھے۔ اُن کے حامی جن میں سید امیر علی جو اپنے کو معتزلی کہتے تھے، نہایت پادشہ سید مہدی علی (محسن الملک)، جنہوں نے بعد میں سبھی اسکیموں میں اُن کا ہاتھ بنایا اور مولوی چراغ علی، جنہوں نے اپنی سلیم الطبع تحریروں سے اُن کی مدد کی اپنے لبرل خیالات کی وجہ سے عام مسلمانوں میں اتنے پسند نہیں کئے جاتے تھے جتنے علماء اور اُن کے حلیف۔

مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی خاطر سید احمد خاں نے 1878ء میں اپنے رسالے تہذیب الاخلاق کی اشاعت روک دی اور اس طرح اُن کی ناراضگی کی ایک بڑی وجہ دور کر دی۔ انہوں نے جوش کے بجائے عقل سے کام لیا۔

سید احمد خاں اور سیاست

مذہب کے طور پر اسلام کی اصلاح ایک خطرناک کام تھا لیکن مسلمانوں کے اثر کی بحالی اور ہندوستان کے نئے حالات میں اُن کی نوآباد کاری ضروری تھی اور اس کے لیے کوشش کرنا اور مستحق تھا۔ ماضی میں طاقت و دولت حاصل کرنے کا راہ تھی۔ موجودہ حالات میں تعلیم صلاحیت اور اہلیت پیدا کرنے کا

ذریعہ تھی اور اہلیت سے عہدہ اور طاقت حاصل کی جا سکتی تھی۔

چنانچہ سید احمد خاں کے لیے معاشیات اور سیاسیات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور ایک دوسرے کے تابع تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ من حیثیت القرۃ مسلمان معاشی طور سے بہت کر گئے ہیں۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ حکومت سے تعاون کریں اور اس کی مدد سے اپنی معاشی حالت سنبھالیں۔ جو بات معاشی میدان میں صحیح تھی وہ سیاسی میدان میں بھی صحیح تھی۔ معاشی ترقی اور سیاسی حیثیت دونوں کا انحصار حکومت کی مہربانی پر تھا۔ یہ وجہ تھی کہ سید احمد خاں برطانوی حکمرانوں سے تعاون کرنا چاہتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے سے پہلے سید احمد خاں اس بات کی بڑی وکالت کرتے تھے کہ تمام ہندوستانی اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے حکومت کی کونسلوں میں ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں کے انتظامات میں حصہ لیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے لیے خصوصی مراعات کی مخالفت کی اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے دست و بازو پر بھروسہ کریں۔ اپنے رسالے ”اسباب بغاوت ہند“ (1863ء) میں انہوں نے لکھا تھا ”بغاوت کی اصل وجہ تھی ہندوستانی لیجسلیٹو کونسل میں شامل نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ اس بغاوت کی محض ایک بڑی وجہ تھی۔ بقیہ وجود پالی تھیں جیسے درخت میں نکل ہوئی شاخیں۔ میری اس رائے کی بنیاد کوئی قیاس ہے نہ کوئی نظریہ۔ صدیوں سے بہت سے قابل اور ہوش مند لوگ اس خیال کی تصدیق کرتے رہے ہیں جو سب میں ظاہر کرنے والا ہوں۔

”میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ تر لوگ اس خیال کے ہیں کہ خوشحالی کے لیے یہ ضروری ہے بلکہ اس کے استحکام کے لیے لازمی ہے کہ اس کی کونسلوں میں عام لوگوں کو شامل کیا جائے۔ صرف عام لوگ ہی حکومت کو یہ بتا سکتے ہیں کہ اسکے کاموں کا خیر مقدم کیا جانیگا یا نہیں۔ صرف عام لوگ ہی غلطیوں کا ابتداء میں ازالہ کر سکتے ہیں اور اس سے پہلے کہ ہم خطرات میں گھر جائیں اور تباہ ہو جائیں وہ ہمیں ان خطرات سے آگاہ کر سکتے ہیں۔“

انہوں نے مزید کہا ”اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مقامی لوگوں کو لیجسلیٹو کونسلوں سے علیحدہ رکھا جائے اور یہ ہے تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے ان تمام دکھوں کی اصل وجہ جن کا سامنا ہندوستان کو کرنا پڑا..... میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی جاہل اور غیر تعلیم یافتہ قوموں کو لیجسلیٹو کونسل کے مباحث میں حصہ لینے کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے یا یہ کہ انگریزی پارلیمنٹ کی طرح کی اسمبلی بنانے کے لیے ان کا انتخاب کیسے کیا جائے۔ یہاں میں صرف اتنا ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ طریقہ عمل نہ صرف قرین مصلحت بلکہ انتہائی ضروری بھی ہے اور یہ کہ شورش کی وجہ اس طریقہ کا کوئی نظر انداز کرنا ہے۔“ (1)

1866ء میں جب انہوں نے برٹش انڈیا ایسوسی ایشن قائم کی تو انہوں نے ہندوستانیوں پر زور دیا کہ وہ لیجسلیٹو کونسل میں اپنے مفادات کی مناسب نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے ہندوستانیوں سے کہا کہ یہ بے وقوفی اور بزدلی ہوگی اگر وہ حکومت یا ضلع کے حکام کے ذریعے مناسب نمائندگی کا مطالبہ نہ کریں۔ حالات کو بہتر بنانے کے لیے وہ ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنے کے حق میں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ ”ہم اگر گاؤں کی ختم کرنے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ آپ گائے کی قربانی نہ کیجئے۔“ (2)

(1) اہم مسلمان، جی، اے، تائیس، اینڈ کو، راس صفحات 98

(2) آخری مضامین، مجلہ بلا، صفحہ 70

گور داس پور میں 27 جنوری 1884ء کو تقریر کرتے ہوئے انہوں نے دونوں فرقوں کے اتحاد کے متعلق اپنے یقین کی تصدیق کی۔ انہوں نے لوگوں سے یوں خطاب کیا ”ہمیں (ہندوؤں اور مسلمانوں کو) اس امر کی کوشش کرنا چاہیے کہ ہم ایک جان دو قالب بن جائیں۔ اگر ہم میں اتحاد ہوگا تو ہم ایک دوسرے کی حمایت کر سکیں گے۔ اگر اتحاد نہیں ہوگا تو ہم ایک دوسرے کی مخالفت کریں گے جس کا نتیجہ ہوگا کہ دونوں کی بربادی اور زوال۔“

انہوں نے مزید کہا ”ہندو اور مسلمان بھائیوں“ کیا آپ ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک میں رہتے ہیں؟ کیا آپ ایک ہی ملک میں نہیں رہتے ہیں؟ کیا آپ اس زمین میں دفن نہیں ہوتے ہیں اور یہیں جلائے نہیں جاتے ہیں؟ کیا آپ ایک ہی سرزمین پر نہیں چلتے ہیں اور ایک ہی ملک میں نہیں رہتے ہیں؟ یہ بات یاد رکھئے کہ ہندو اور مسلمان کی اصطلاحات کا مقصد محض مذہبی امتیاز نہ کرنا ہے ورنہ تمام لوگ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان بلکہ عیسائی تک جو اس ملک میں رہتے ہیں وہ سب اس اعتبار سے ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ تمام مختلف فرقے ایک ہی قوم سے تعبیر کئے جاسکتے ہیں۔ ان سب کو ملک کی بھلائی کے لیے متحد ہو جانا چاہیے جو ہم سب کا ملک ہے۔ (2)

لیکن 1885ء کے بعد سید احمد خاں کا لبرلزم واضح طور سے کم ہونے لگا۔ بد قسمتی سے انہوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ سیاسی معاملات میں مذہب سے زیادہ احتیاط برتنی ضروری ہے۔ مذہبی معاملات میں انہیں مسلمانوں کے احساسات کا خیال کرنا تھا اور مذہب عناصر کو اپنے ساتھ لانا تھا۔ سیاسی معاملات میں ضروری تھا کہ حکمرانوں کے غیر ہمہ رد و اندر دینے کو ہمہ ردی اور حمایت میں تبدیل کیا جائے۔ بڑی و شواری یہ تھی کہ سیاسی مقاصد کے اعتبار سے مسلمان بنے ہوئے تھے۔ علماء جن کے ساتھ مسلمانوں کی اکثریت تھی، برطانوی تہذیب اور حکومت سے متفرق تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی دنیا میں جو حالات رونما ہو رہے تھے انہوں نے انہیں بہت پریشان کر رکھا تھا۔ 1878ء میں عثمانی سلطنت کو روسیوں نے زکری اور خلافت کو بہت سے علاقے اور اپنے وقار سے محروم ہونا پڑا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے، جو ترکی کے سلطان کو اپنا خلیفہ تصور کرتے تھے، یہ نہایت توجہ

(2) اہم مسلمان، محول مال، صفحات 31-32

انگریزوں کے تابع ہوتی جا رہی تھی۔ غدیو کے تحت دہلیج سے محمدی اور 1881ء میں عربی پاشا کی شکست ایسے واقعات تھے جن کے دور رس اثرات پوری اسلامی دنیا پر پڑے۔

اس کے علاوہ برطانیہ عظمیٰ اور روس کی آپسی رقابت کے نتیجے میں جب افغانستان ہوئی، جنرل رابرٹس نے کابل پر قبضہ کر لیا اور افغانستان کو برطانیہ کے حلقہ اثر میں شامل کر لیا گیا۔ ایران میں خلیج فارس کے ساتھ ساتھ واقع جنوبی علاقے پر قریب قریب انگریز قابض ہو گئے تھے اور شمال میں روسیوں نے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

ان حالات کی بنا پر مشرق اور مغرب کی سامراجی طاقتوں اور خاص طور سے انگلستان کے خلاف غصے کے جذبات مسلم ممالک میں بھڑک اٹھے۔ اُن کو جمال الدین افغانی کی شخصیت میں ایک مبصر اور رہنما مل گیا جنہوں نے اپنے علم و فضل، زور خطابت، انتھک جوش اور بے لوث لگاؤ سے مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی مدت کے خطرے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا۔ وہ عین اسلامی تحریک کے پیش رو بن گئے۔

ہندوستان کے تمام مسلم حلقوں میں اُن کی تحریروں اور تقریریں بڑے شوق سے چڑھی جاتی تھیں اور جب وہ 80-1879ء میں تیسری بار یہاں آئے تو ایک ہیرو کی طرح اُن کا خیر مقدم کیا گیا اور مسلم نوجوان مسیح کی طرح اُن کی پرستش کرنے لگے۔ ہندوستان میں اُن کے ایک سال کے قیام کے دور ان سید احمد خاں کی مخالفت اور بڑھ گئی اس لیے کہ افغانی نے اُن کے مذہبی اور سیاسی تصورات پر سخت حملے کئے۔ انہوں نے سید احمد خاں کی تفسیر قرآن کو ایسی جاہلانہ اور عامیانہ تفسیر سے تعبیر کیا "جس کا مقصد ہے مسلمانوں کے عقائد کو برباد کرنا، دوسروں کا مقصد پورا کرنا اور اُن کو (مسلمانوں کو) اُن کا مذہب اختیار کرنے کی ترغیب دلانے کی سازش کرنا"۔ (1)

جمال الدین افغانی سیاسی آزادی اور مساوات کے دعوہ دہندہ مغربی سامراج کے کٹر دشمن تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایشیائی قوموں کو آزاد کرانیں اور اُن کی گزشتہ شان و شوکت بحال کریں۔ اُن کی تقریروں سے اُس ہمدردی نے ایک واضح شکل اختیار کر لی جو مسلم ممالک کی بد حالی کی بنا پر ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھی اُن میں اتحاد کا شعور پیدا ہوا۔ لہذا اُن کی نگاہ اور اُسی کے ساتھ عالم اسلام کے وسیع تر اتحاد کا جذبہ بھی شکل اختیار کرنے لگا۔ لیکن جمال الدین کے مقاصد سید احمد خاں کے سیاسی تصورات کے برعکس تھے جن کا بے خیال تھا کہ ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری بالکل ناممکن الحاصل ہے اور جو انگریزوں اور مسلمانوں کے اتحاد کی بات کرنے لگے تھے جس پر علی گڑھ تحریک کی بنیاد قائم تھی۔ اب وہ اس کو مسلمانوں کے تحفظ اور اتحاد کا واحد ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔

چنانچہ سید احمد خاں کو بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن 1885ء تک حالات پلٹا کھار اُن کے حق میں ہو گئے تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ انگریزوں کے ساتھ تعلقات بدھانے کا موقع مسلمانوں کو مل گیا تھا۔ یورپ میں روس کے ہاتھوں ترکی کے کھڑے ہونے کا سلسلہ انگریزوں نے روک دیا تھا اور افغانستان کے متعلق اُن کی پالیسی سدھرنے لگی تھی۔ وسطی ایشیا کی طرف روس کی پیش قدمی کے خطرے نے برطانیہ عظمیٰ کو مجبور کر دیا تھا کہ مسلم ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات میں زیادہ اختیارات سے کام لے۔ امیر عبدالرحمن خاں کا خیر مقدم کرنے کے لیے راولپنڈی کا دربار اس پالیسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خود ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف برطانیہ کا رویہ بدل گیا تھا۔ قدیم مخالفت مسلمانوں کے ساتھ دوستی بدھانے کی پالیسی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس کے لیے کسی مخصوص تاریخ کا تعین کرنا مشکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پالیسی کی ابتدا ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب ہندوستانی مسلمان کی 1871ء میں

طباعت کے ساتھ ہوئی۔ اس نے حکومت کی توجہ مسلمانوں کی شکایتوں کی طرف مبذول کرائی یعنی ”غیر ہندو رائے، کم نظری کا مظاہرہ، خیانت، مجرمانہ اور ملک بھر میں پھیلی ہوئی عام خرابیاں“ (۱) وہ مسلمانوں کا پہلا ”قابل اور کسی قدر جذبات کو براہِ راست کرنے والا کیل تھا۔“ تبدیلی کے دوسرے انگریز وکیل تھے کلکتہ مدرسہ کا سابق پرنسپل نولیس، علی گڑھ کے محسن ونگو اور نیٹل کالج کے بیک اور مارٹن لیس اور ڈبلیو۔ ایس۔ بلٹ نے انہیں آواز اٹھانے پر اکسایا۔ اُس نے کہا ”میں نے اُن سے کہا کہ مسلمان اگر اپنی طاقت سے واقف ہوتے تو حکومت انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی اور نہ اُن کے ساتھ برا سلوک کر سکتی۔ انگلستان میں ہم مسلمانوں کی بغاوت کے تصور سے ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے اور ہمیں ہندوؤں کے مقابلے میں ایک مسلمان کی بات پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ لیکن اگر وہاں ہم پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور انگریزوں کی زیادتیوں کے لیے اپنی قسمت پر شاکر رہے تو انگلستان کے لوگ اُن کو اُن کی حالت پر چھوڑنے میں بڑی خوشی محسوس کریں گے۔“ (2)

انڈولف چرچل جو اس زمانے میں سکریٹری آف انٹیم برائے ہندوستان تھا 1885ء میں ہندوستان آیا اور یہ سمجھا گیا کہ مسلمانوں کی طرف حکومت کے جھکاؤ کے رجحان کی تصدیق کی۔ بہر حال 1888ء تک یہ رجحان واضح ہو چکا تھا۔ سر آکلینڈ کولون نے بیوم کو کانگریس کی سیاست کے خطرناک امکانات سے باخبر کر دیا تھا۔ (3)

ڈفرن خانف ہو گیا۔ مسلمانوں نے اُسے جو امدادی ڈر لیس دیا تھا اُسکے جواب میں اُس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اُن کی تعریف کی ”آپ ان لوگوں کی اولاد ہیں جو پہلے ہندوستان میں ایک مناسب حیثیت کے مالک تھے۔ آپ خاص طور سے اُن ذمہ داروں کو سمجھتے ہیں جو سکریٹریوں پر ہوتی ہیں۔“ (4) اس پالیسی کو فروغ دینے کے لیے لارڈ ناتھ بروکن نے علی گڑھ میں غلیظوں کے لیے مبلغ 10000 روپے عطا کئے۔ جان اسٹریچ نے اپنے ہومٹوں سے سفارش کی کہ وہ فاضی کے ساتھ کالج کی مدد کریں۔ 1882ء کے ایجوکیشن کمیشن کے صدر ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر نے کمیشن کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں کر کے اسکی اہمیت کا اعتراف کیا اور تعلیم میں مسلمانوں کے خصوصی دعووں کو تسلیم کیا۔ انگریز لائل نے علی گڑھ کالج کے بانیوں کی تعریف کی اور اُن کے کام کو حکومت کی بڑی خدمت سے تعبیر کیا۔ آکلینڈ کولون نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حکومت کے لیے جذبہ وفاداری پیدا کرنے میں کالج نے خصوصی رول ادا کیا ہے۔

1883ء میں البرٹ ہل کے حق میں جو تحریک چلائی گئی اُس نے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کو ہندوؤں کی طرف سے بدگمان کر دیا اور مسلمانوں کی طرف اُن کے رویے کو بدلنے میں مدد دی۔ ایک اور بات یہ ہوئی کہ اُس زمانے میں بدقسمتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اس کشیدگی کی وجوہ کئی تھیں۔ یعنی سماجی، سیاسی، اور معاشی۔ اُن میں کچھ نے محض بالائی طبقات کو متاثر کیا، کچھ نے عام لوگوں کو متاثر کیا اور کچھ نے دونوں کو تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافات کا فکروں سرکاری ملازمتوں کی بنا پر ہوا۔ انیسویں صدی کے پہلے چیمبر برسوں میں ہندوؤں نے ملازمتیں حاصل کرنے کی دودھ میں زیادہ مستعدی دکھائی اور برطانوی تعلیم و فن میں زیادہ عملی حصہ لیا۔ اُن میں انگریزی تعلیم زیادہ پھیل گئی۔ جب کہ مسلمان اُس سے دور رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازمتیں اور آزاد

(1) قتیاس، لائل۔ اے۔ سی، محول بالا، صفحہ 233

(2) بلٹ، ڈبلیو۔ ایس، ہندوستان میں دور حکومت میں، محول، صفحہ 233۔ (3) بوڈرن، ڈبلیو۔

(4) ڈفرن، Speeches, Delivered in India (1884-1888)، صفحہ 204۔

پیشوں میں کامیابی بڑی حد تک ہندوؤں کا پیشہ بن گئی۔ اس کے علاوہ اخبارات زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھے اور سیاسی تحریکات پر قریب قریب اُن کا اجارہ تھا۔ جیسا کہ حکومت ہند نے 1893ء میں کہا تھا ”مسلمانوں پر سرکاری اور نجی روزگار کے دو دائرے قریب قریب بند تھے جس کی وجہ سے قدرتی طور سے ہندوؤں کے خلاف اُن میں کجی پیدا ہو گئی جسکو یہ خیال زندہ رکھتا ہے کہ ماضی میں وہ صاحبِ اقتدار رہ چکے تھے۔“ (1)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس منعقدہ دسمبر 1885ء نے سید احمد خاں کو پریشان کر دیا۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال پرورش پانے لگا کہ اگر کانگریس اپنے مطالبات کی منظوری پر حکومت کو آمادہ کر سکے، جن میں سب سے اہم مطالبہ تھا کونسلوں میں ہندوستان کو نمائندگی دینا، تو مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ کانگریس کی مخالفت کرنے اور مسلمانوں کو اُس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دینے کی مقولہ وجہ تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک ایسے نظام میں جس میں راست انتخابات کے جائیں مسلمانوں کے لیے جو اقلیت میں تھے، کونسلوں میں جگہ پانے کے امکانات کم تھے۔ انیسویں صدی میں یہ خوف بے بنیاد نہیں تھا۔ یورپ میں نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتیں ہر جگہ اکثریتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کی وجہ وہ تحریکات وجود میں آئیں جن کا مقصد تھا اقلیتوں کو اُن کے بڑے گروپوں سے جوڑنا جو آس پاس کے ریاستوں میں پائے جاتے تھے اور اُن کا اکثریتوں سے علیحدہ کرنا تھا جن کے درمیان دورہ رہتی تھیں۔ مثال کے طور پر اطالوی زبان بولنے والی اسٹرینڈی رول اور ترستے میں رہنے والی اقلیتیں اٹلی میں شامل ہونا چاہتی تھیں اور جرمنی بولنے والی سلو ممالک کی اقلیتیں جرمنی میں اس طرح نسلی اقلیتیں بھی تحریکات چلا رہی تھیں۔ اسٹریٹن اور ترکی سلطنتوں میں رہنے والے سلاو اسر کی شدید خواہش رکھتے تھے کہ وہ روس کی عظیم سلطنتوں سے متحد ہو جائیں۔

لیکن موزوں ترین مثال تھی عثمانی سلطنت کی اس لیے کہ وہاں ایک مسلم سلطنت میں غیر مسلم خصوصاً آرمینی اور یونانی اقلیتیں آباد تھیں جن کو کچھ حقیقی اور کچھ فرضی شکایتیں تھیں اُن شکایتوں کو بہانہ بنا کر یورپ کی عیسائی طاقتیں اُن کے محافظ کے طور پر مداخلت کرتی تھیں۔

ہندوستان میں کچھ قدیم اثر افیہ خاندانوں کے مسلمان اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ ایک ایسے ملک میں جس پر اُن کے ہم مذہب چھ سو سال تک حکومت کر چکے ہوں ہندوؤں کے ساتھ برابری کی حیثیت میں زندگی گزاریں۔ حکومت سے وہ خصوصی برتاؤ کا مطالبہ کرتے تھے اُس کی جڑی عکرائی کی روایات کے دائروں کے طور پر اُن کی سیاسی اہمیت تھی۔

عام لوگ زیادہ تر معاشی حالات سے متاثر ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ہندو اور مسلمان زمینداروں کے مفادات اُن کے کاشتکاروں سے ٹکراتے تھے۔ ہندو ساہوکار اور مسلمان قرض لینے والا ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ اس معاشی منافقے کو فٹن اور دست کاریوں کے زوال نے زیادہ شدت دیدی جو اکثر مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھے۔

(1) لارڈ لٹنس ڈاؤن کاہر اسل سکرٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان اول آف کمبیری کے نام، موری 27 دسمبر 1893ء۔
پیر اگراف 7، (ٹھکر داتھ۔ پبلک، نمبر 84، 1893ء)

IV فرقہ وارانہ سیاست

احیا پرستی کی تحریکات جو انیسویں صدی میں پھیلی انہوں نے باہمی شکوک و خطرات میں اضافہ کر دیا۔ دہلی کے شاہ ولی اللہ کے دیستان اور دیوبند میں اُن کے شاگردوں کے قائم کردہ اسکول نے اور سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک نے مسلمانوں میں مذہبی جوش اور قدیم پاکیزگی کے خیالات کو بحال کر دیا۔ احیا پرستی کی تحریک نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کے طریقہٴ عمل سے وہ عناصر نکال دئے جائیں جو ہندوستانوں کے ساتھ روابط کی بنا پر اُس میں داخل ہو گئے تھے۔ ہندوؤں میں کلکتہ کے راجا کانت ایب کی ہندو سہا بر سر عمل تھی جو ہندو دھرم کو لبرل مصلحین اور عیسائی مشنریوں کے صلہ سے بچانے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کی کاروائیاں تیز تر ہو گئیں۔ یکم چندر چٹرجی کی طرح کے ادیبوں نے اس کو پھیلانے اور تقویت پہنچانے کے لیے اپنے زوردار قلم استعمال کئے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے 1875ء میں یسہی میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی لیکن جلد اس کا اثر شمالی ہندوستان میں پھیل گیا۔ انہوں نے ہندوؤں کو دیدوں کی طرف آنے کی دعوت دی اور جو لوگ اپنا مذہب بدل چکے تھے انہیں دوبارہ ہندو مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کی۔

انگریزی تعلیم کی وجہ سے مذہب کی طرف سے جولا پرواہی برتی جانے لگی تھی اس کے رد عمل کے طور پر ہندو دھرم کے عقائد اور روایوں کے لیے احترام کا جذبہ پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کی جارہی تھیں۔ یہ تحریک محض بالائی طبقوں تک محدود نہیں تھی۔ اس کا اثر بہت سی ایسی ذاتوں پر بھی پڑا جنہیں دوسروں سے کم تر سمجھا جاتا تھا۔ جوں جوں وہ ہندو فرقے میں ایک حیثیت حاصل کرتے گئے اتنے ہی ہندو دھرم کے کاموں میں وہ سخت تر ہوتے گئے۔ ہندو دھرم کے احیائے ان کے دلوں میں ماضی اور ہندو روایات کے لیے جذبہ احترام پیدا کر دیا۔

چنانچہ دونوں فرقوں میں متوازی تحریکات چل رہی تھیں جن کے مقاصد مشترک تھے اور طریق عمل یکساں تھا۔ بد قسمتی سے لبرلزم اور ردواری کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ آپس میں تعاون نہ کر سکے۔ اس کے بجائے وہ ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ان تحریکات کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ وہ منافرت و احتجاج پر زور دینے لگے اور انہوں نے جارحانہ شکل اختیار کر لی۔ دونوں اپنی بے گناہی پر مصر تھے، دونوں اپنے کو دوسروں سے بالاتر سمجھتے تھے اور دونوں اپنے کو دوسرے سے بہتر تصور کرتے تھے۔ دونوں فرقے ملوی خوشحالی کے تعلق سے اپنے مطلب کی بات کرتے تھے جس کو حکومت کے امتیازی رویے نے اور شدی، مطلب پرستی کے احساس نے پریشان کن صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مذہب کے احیائے فرقہ وارانہ جذبات کو بڑھا دیا خاص طور سے ایسی صورت میں جب کہ بے روزگاری کے شدید مسئلے کے حل کرنے کی کوئی امید ملک کے معاشی حالات سے نہیں تھی۔

ان حالات میں دور بینی اور اعتدال سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ دونوں فرقوں کے مستقل مفادات یکساں تھے اور فوری ضرورتیں اور حاجتیں اُن دونوں کی سیاسی غلامی کے نتیجے تھے۔ لیکن دونوں نے اپنا اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے ایسی پالیسیاں اختیار کیں جنہوں نے اختلافات اور بڑھادے۔ ایک دوسرے کے خلاف اُن کی الزام تراشیوں نے اُن کا مقدر ایک تیسرے فریق کے ہاتھوں میں دے دیا جس نے اُن کے آپسی جھگڑوں سے دہرا فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت زیادہ انتظام ہو گئی اور انگریزوں کو

ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے ایک جواز مل گیا جس کی انہیں بڑی ضرورت تھی۔

ہندوؤں میں پیدا ہونے والی نئی بیداری نے پرانے عقائد و رسوم پر ایک دفعہ پھر زور دیا اور ہندوستانی تہذیب کو بدھ کی عناصر سے پاک کرنے کے لیے ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ اُن کارروائیوں میں جنہوں نے ہندو مسلم اختلافات کو بھائے مندرجہ ذیل تھیں (1) گنور کشا (2) ہندی اردو کا جھگڑا (3) تیہاروں اور جبرک دلوں پر مذہبی حقوق پر زور دینا خصوصاً اس صورت میں جب ہندو اور مسلم کیلنڈروں کی نوعیتوں کی بنا پر وہ ایک دین پر تھے۔

آپسی تعلقات میں زیادہ کٹی پیدا کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں کچھ مقامات پر ایک فرقے کو غلبہ حاصل تھا اور دوسرے مقامات پر دوسرا فرقہ طاقت رکھتا تھا جسکی وجہ سے کچھ توازن پیدا ہو گیا تھا۔ انگریزوں کی فتح کے بعد دونوں فرقے انگریزوں کے حکوم ہو گئے اور حالانکہ انگریزوں کے مقابلہ میں وہ دونوں کمتر حیثیتیں رکھتے تھے لیکن آپس میں دونوں اپنے ماضی پر فخر کرتے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ انگریزوں سے پہلے اگر حکمران روہاڑی سے کام لیتا تھا تو وہ دونوں پر امن حالات میں رہتے تھے لیکن اگر حکمران حصب اور ظالم ہو تا تھا تو شاکی فریق کو اس کا موقع نہیں ہو تا تھا کہ وہ شکایت ظاہر کر سکے۔

گنور کشا کا مسئلہ پہلی دفعہ پنجاب میں اٹھا جہاں سکھوں کی حکومت میں گاؤں کشی سخت ممنوع تھی۔ اور اس جرم کی سزا موت تھی۔ الحاق کے بعد گاؤں کشی کی ممانعت ختم کر دی گئی۔ ہندو اور سکھ اس سے ناراض تھے لیکن مسلمان خوش تھے کہ اُن کا ایک حق تسلیم کر لیا گیا۔ جب آریہ سان کا قیام عمل میں آیا تو گنور کشا سو سائیاں تقریباً ہر صوبے میں کئی جگہ قائم ہو گئیں سب سے زیادہ ملک میں دورہ کرنے لگے، کانچی پورس کھولے گئے اور گاؤں کشی کے خلاف ایک تحریک شروع کی گئی۔ بہت سے ہندو راجوں اور زمینداروں نے اس تحریک کی مدد کی۔ سکھوں میں بھی (لدھیانہ) کے نام دھاری اس میں پیش پیش تھے۔ مسلمانوں میں بھی کچھ اس تحریک سے ہم روی رکھتے تھے۔ اتر پردیش میں انہوں نے گاؤں کشی کی ممانعت کی تحریک کی حمایت کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گنور کشا کا مسئلہ محض ایک مذہبی مسئلہ نہیں تھا بلکہ زراعت کرنے والوں کے لیے اس کا معاشی جواز بھی تھا۔

لکھنؤ کے فرنگی محل کے مولانا عبدالحی نے، جو ہندوستان کے علماء میں بڑی حیثیت رکھتے تھے، تین دوسرے عالموں کے ساتھ مل کر مندرجہ ذیل فتویٰ دیا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ گائے کی قربانی ترک کرنا کوئی گناہ نہیں ہے اور اس سے قربانی میں کوئی خلل نہیں پڑتا ہے ”ہم مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم دوسروں کو تکلیف دینے سے بچیں۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ بد اعمالی اور انسانوں کے ساتھ تشدد نامناسب ہے (مسلمانوں کو) اس کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ لوگ اس جرم کے مرتکب نہ ہوں۔ گاؤں کشی اسلام کے احکام میں شامل نہیں ہے چنانچہ اس مذہب میں عمل سے چنانچہ بہت مستحسن ہے۔“

اس فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں تھے (1) ابو الحسنات محمد عبدالحی، (2) محمد عبد الوہاب (3) ابو الیاء محمد عبد الحمید اور (4) قاضی سید محمد حسن۔ (1)

بدقسمتی سے ایک طرف ضرورت سے زیادہ جوش تھا اور دوسری طرف احساس ناگواری جس کے نتیجے میں بد نما مظاہرے اور ٹھکر ہوئے۔ 1881ء میں ملتان میں ایک فساد ہوا اور اُس کے بعد کئی برسوں تک

ملک کے مختلف حصوں میں دنگے فساد ہوتے رہے۔ 1893ء میں اتر پردیش، مدھیہ پردیش، بہار اور بھٹی میں فسادات ہوئے۔ حکومت اور مسلمانوں دونوں نے جان و مال کی بربادی کا ذمہ دار ہندوؤں کو ٹھہرایا۔ فسادات کی ذمہ داری سے قطع نظر دیکھنا یہ چاہیے کہ انہیں روکا جاسکتا تھا یا نہیں۔ یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن دفتر کے ایک نوٹ مورخہ 21 جولائی 1871ء میں کہا گیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ گورنر اور دوسرے اعلیٰ حکام کی اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے تعلق سے پولیس اور مجسٹریٹ بری الذمہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقصد یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی بات کی ذمہ داری کسی پر نہیں ہے۔ روہیل کھنڈ میں اس قسم کے فسادات کا مجھے بہت تجربہ ہے ایسے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات سہل ہے کہ حکام کے پاس ایسے کوئی ذرائع نہیں تھے جن سے وہ خطرے کے متعلق باخبر ہو جاتے۔“ (1)

لیکن فرقہ وارانہ اتحاد کے متعلق سید احمد خاں کی خواہش پر کاری ضرب ہندی اردو کے جھگڑے نے لگائی۔ سرکاری حلقوں میں بہت سے مسلمانوں کی طرف سے بدگمان تھے اور مسلم تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان کی جدید زبانوں مثلاً بنگالی، مراٹھی اور اردو کی ترقی کو ترقی دینے کی کوششیں کی گئیں۔ چونکہ ان زبانوں میں شعری ادب بہت تھا اس لیے یہ کام آسان تھا۔ لیکن کالج کے ذمہ دار حضرات کو یہ محسوس ہوا کہ اردو، جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے لفظیات اور شعریات کی حد تک فارسی سے بہت متاثر ہے اور چونکہ وہ زیادہ تر قصبوں اور شہروں میں بولی جاتی ہے اس لیے اسے عام لوگوں کی زبان میں کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے شتر کے ایک ایسے اسلوب کو ترقی دینے کی کوشش کی جس میں فارسی کے عناصر شامل نہ ہوں۔ اس طرح، ہندی شتر معرض وجود میں آئی۔ اس ہندی میں کوئی شعری ادب نہیں تھا اور اس کی شتر اردو کا اسلوب تھی جس میں فارسی کے الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ نے لے لی تھی۔ پہلے تو وہ کچھ اکھڑی اکھڑی زبان تھی لیکن جلد ہی شتر اور نظم دونوں میں اظہار کا ذریعہ بن گئی اور اُس نے ادبی زبان کی شکل اختیار کر لی۔

1897ء کے بعد ہندی کو ایک نیا محرک مل گیا۔ بہت سے برطانوی حکام اُس کی ترقی میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے اُس کی صرف نعتیہ اور ہندی کے ادیبوں کی ہمت افزائی کی۔ ایس۔ سی۔ بیل نے حکومت کو مشورہ دیا کہ ”ہندی کو رفتہ رفتہ عدالتوں اور دفتروں میں استعمال کیا جانا چاہیے۔“

اس لیے کہ ”ناگری کے مقابلے میں فارسی حروف زیادہ آسانی کے ساتھ تبدیل کئے جاسکتے ہیں۔ اور اس لیے اس کی وجہ سے دستاویزات میں تحریف کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔“ (2)

بہار میں لٹریچر گورنر سر جارج کمپ بیل (1871ء-1874ء) نے صوبے کی عدالتوں اور اسکولوں سے فارسی رسم الخط کو خدج کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا کہنا تھا کہ بہاری ”مفلس، بے زباں اور کچلے ہوئے ہیں اور جب تک اُن کی زبان (یعنی ناگری یا کیتی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندی) عدالتوں میں رائج نہیں کی جائے گی وہ غلط، پولیس، زمینداروں اور نیل کے باغوں کے مظالم کا شکار بنے رہیں گے۔“ (3)

اس کو مسلمانوں نے ایک خطرناک کارروائی سمجھا اس لیے کہ عدالتوں کے غلط، پولیس اور

(1) اس پر دیکھتے ہیں۔ ”بے۔ ایس (سر جان اسٹریٹجی) مورخہ 21 جولائی 1871ء (ہوم ڈپارٹمنٹ پبلک A، نمبر 47-145)

مورخہ 5 مارچ 1871ء

(3) بنگالی، 10 مارچ 1877ء

(2) موسوم ڈپارٹمنٹ، تلیس رواد، نومبر 1875ء، نمبر 11-13

زمینداروں اور نعل کے باندھاروں کے کارکنوں میں زیادہ تر مسلمان تھے جو صرف اردو جانتے تھے۔ اُن کی روزی کا سوال تھا۔ 1867ء میں حکومت کو ایک عرضداشت پیش کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ عدالتوں میں فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو کی جگہ دیوناگری میں لکھی جانے والی ہندی راہ کی جائے۔ سید احمد خاں، جو اُس وقت ایک عدالتی حاکم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اس سے بہت پریشان ہو گئے۔ اُن کے نزدیک یہ مطالبہ نہ صرف ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے منافی تھا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی بلکہ اُن عناصر کے وجود سے انکار کے مترادف بھی تھا جو ہزاروں سال سے زیادہ کی مدت سے ہندوستان میں رہ رہے تھے اور اسے اپنا گھر سمجھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پانے والے مسلمانوں پر معسر معاشی اثرات کے علاوہ اس نے خطرہ پیدا کر دیا تھا کہ سانچہ اور تہذیب دو ناقابلِ مصالحت حصوں میں بٹ جائے۔

1872ء میں صوبجات متوسط (مذہب پر دلش) کے 9 اضلاع میں اردو کے بجائے ہندی عدالتوں کی زبان بنادی گئی جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہو گیا۔

چنانچہ 1885ء سے پہلے ہی فرقہ وارانہ صورت حال خراب ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں کچھ ایسے شدت پسند عناصر بھی تھے جو ہندوؤں سے مکمل علیحدگی اور برطانوی حکمرانوں سے قریبی تعلقات کی سفارش کرتے تھے۔ اُن میں اہم ترین شخصیت تھی سید امیر علی کی جنہوں نے 1877ء میں نیشنل محزن ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ اس ایسوسی ایشن کا مقصد تھا مسلم نوجوانوں کو سیاسی تربیت دینا جس سے انہیں اس وقت بھی دلچسپی تھی جب وہ انگلستان میں طالب علم تھے۔ اس وقت انہوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلم نوجوانوں کو اگر ہندوؤں کے متوازی خطوط پر سیاسی تربیت نہ دی گئی تو وہ نئی قوم پرستی کے سیلاب میں ڈوب جائیں گے اُس وقت سید احمد خاں نے سید امیر علی کی رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

لیکن 1885ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو سید احمد خاں کے تمام شکوک و خطرات سائے آگئے۔ یہ ممکن ہے کہ اس خیال کو تقویت علی گڑھ کے محزن انگلو اور نیشنل کالج کے انگریز استادوں اور خاص طور سے تھیوڈ ہرڈیک نے دی ہو جو 1886ء کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا۔ یک نے سید احمد خاں کے خطرات کو ہوا دی اور کالج کے نوجوانوں میں ہندوؤں کے خلاف جذبہ نفرت اور برطانوی حکومت کے لیے جذبہ وفاداری پیدا کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دی۔ علی گڑھ کالج کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا ”ہمارے درسی گاہ کی آغوش میں پرورش اور کرکٹ اور فٹ بال کے میدانوں میں تربیت پانے والے طالب علم حکومت ہمارے ہر دلچیز بادشاہ کی ایسی روداد کرنے کو تیار رہیں گے جس سے ثابت ہو جائے کہ ہندوستانی مسلمان سلطنت کی حفاظت کے لیے گولیوں اور عینوں کا مقابلہ کرنے کو آمادہ ہیں۔“ اُس نے سید احمد خاں سے درخواست کی کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اداوت اُس کے سپرد کر دی جائے اور قومی تحریک اور اُس کے بنگالی حامیوں کی مخالفت کے لیے اُس کے کالم استعمال کئے۔ آتشیں سید احمد خاں اُس کے مدبر تھے، چنانچہ اُن مضامین کے لیے انہیں ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا اور وہ بنگالی اخبارات کے مسلمانوں کا نشانہ بن گئے تھے۔

1886ء میں سید احمد خاں نے محزن (بعد میں مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جو حقیقت میں ایک سیاسی جماعت تھی اس کا مقصد تھا تمام شہروں اور قصبوں میں شائیں قائم کر کے مسلمانوں کی تعلیم کرنا مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لینا اور اُن کی ذرا عتی، تجارتی اور صنعتی ضرورتوں کے متعلق تحقیقات

کرنا۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں میں اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے اور مسلم سماج میں ایک نیا شعور بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

1887ء میں انہوں نے کانگریس کے خلاف سخت جدوجہد شروع کر دی۔ انہوں نے تمام ہندوستانوں اور خاص طور سے مسلمانوں کو اس کی خطرناک کاروائیوں سے آگاہ کیا۔ لیکن ان کی مخالفت محض سیاسی سطح پر تھی۔ ہندوؤں کے ساتھ ان کے سماجی تعلقات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کے رویے کو سمجھنے کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے لیکن سید احمد خاں ایک رکن اشرافیہ تھے اور وسطی طبقے کی روایات سے جڑے ہوئے تھے اور یہ کہ سیاسی معاملات میں ان کا ذہن وسطی عہد کا ذہن تھا۔ مثال کے طور پر عہد وسطی کے تمام لوگوں کی طرح وہ سمجھتے تھے کہ بنیادی چیز طاقت ہے نہ کہ دولت اور یہ کہ جنگ جو اور جتکم لوگ تاجروں اور دالوں سے اہم تر ہیں۔ چنانچہ بالائی طبقے کے مسلمانوں کی حالت سدھارنے اور ان کی نو آباد کاری پر پورا زور صرف کرتے تھے لیکن عام لوگوں کی خوشحالی کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے خیال میں اصل مسئلہ تھاکرانوں کی خوشنودی اور ہمدردی حاصل کرنا جن کے ہاتھ میں سب کچھ تھا اور جن کی مخالفت کی بنا پر وہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا تھا جو 1857ء میں سامنے آیا۔ اس حادثے کی یاد وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے۔ چنانچہ ان کے خیال میں حکمرانوں کی طرف وقار وازی کی پالیسی مسلمانوں کے لیے بہترین پالیسی تھی۔ انہیں کبھی اس کا خیال نہیں آیا کہ ہندوستان کا اصل مسئلہ تھا یہاں کی بڑی اور بڑھتی ہوئی آبادی کی غربت و افلاس کا مسئلہ۔ یہ سمجھنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس سماجی معاشی بیماری کا علاج ایک بدلی حکومت کے پاس نہیں تھا وہ چاہے کتنی ہی مائل، طاقتور اور نیک نیت کیوں نہ ہو۔

لیکن ان تکلیف دہ حالات کا شکار وہ تنہا نہیں تھے۔ زیادہ تر زمیندار بھی اس خیال کے تھے۔ سید احمد خاں کی دلیل تھی کہ آزادی ایک خواب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس لیے برطانوی حکام بہت طاقتور ہیں اور انہیں ملک سے ہٹانا ناممکن نہیں ہے۔ چنانچہ حکومت کی غلطیاں ظاہر کر کے اور اس کے خلاف بے اطمینانی پھیلا کے اسے ناراض کرنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ میک نے جو سید احمد خاں کا رازدار اور مشیر تھا، بدرالدین طیب جی کے نام اپنے خط مورخہ 7 مئی 1888ء میں اس کی وضاحت کر دی تھی۔

”بیشک کانگریس کے متعلق ہمارا سب سے بڑا اعتراض دوسری خاص خاص تجاویز کے مقابلے میں زیادہ اساسی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کا طریقہ کار یعنی عام جلسے کرنا، لوگوں کی تکلیفوں کو بیان کرنا اور اس قسم کے پمفلٹ جاری کرنا جیسا کہ کانگریس کی رپورٹ کے آخر میں دیا ہوا ہے وغیرہ جلد یا بدیر ان صوبجات اور پنجاب کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیگا۔ اگر اس کے ساتھ سرحدی جنگ بھی شروع ہو گئی تو حالات تباہ کن صورت اختیار کریں گے۔“ اس نے مزید لکھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ بالائی ہندوستان کے تمام مسلمان بہت غریب ہیں۔ اگر انہیں یقین دلا دیا گیا، جیسا کہ وہ کر رہے ہیں، کہ اس کی وجہ برطانوی حکومت ہے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ وہ اپنی سابقہ شان و شوکت کی کمی کو بہت محسوس کرتے ہیں۔ دہلی اور آگرہ کی شاہی عمارتیں ان کی بد حالی کی زندہ نشانیاں ہیں۔ دہلی کے بوڑھے لوگ اب بھی خاندان تیور کے آخری شہنشاہ کو یاد کرتے ہیں۔ اس میں ان کا مذہبی کڑپن اور اضافہ کر دیتا ہے جو ابھی تک باقی ہے۔ اب بھی کبھی کبھی جہلا کاغذ سننے میں آتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ لوگ واقعی بھڑک اٹھتے ہیں، اور جنگ کو پسند کرتے ہیں جیسا کہ ہم دہلی اور آگرہ میں دیکھ چکے

ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس قسم کی بے چینی پھیل گئی تو پورے شمالی ہندوستان میں ایک دن آگ لگ جائے گی۔ ذاتی طور سے مجھے یہ دو دعوے کیا پرنا پسند ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں قتل ہونا نہیں چاہتا ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ کام جس کے لیے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے جاہ ہو جائے گا اور مسلمان ایسے کریں گے کہ پھر دوبارہ اٹھ نہ سکیں گے چنانچہ ہمیں کسی قسم کی شورش پسند نہیں ہے۔ (1)

ایک اور خط میں اُس نے ہندوستان کے مستقبل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو سید احمد خاں کے خیالات بھی تھے "ہندوستان میں ایک بات اہمیت رکھتی ہے اور وہ ہے حکومت کا استحکام۔ اس لیے کہ صرف اُس صورت میں ہر شخص رفتہ رفتہ تعلیم اور خوشحالی میں ترقی کی توقع کر سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ ملک کی حکومت میں حصہ لیں وہ حصہ نمائندگی کی بنیاد پر نہ لیا جائے جو میری رائے میں ہندوستان کے لیے موزوں نہیں ہے بلکہ دفتر شاہی میں بڑے بڑے عہدے حاصل کر کے لیا جائے۔" (2)

سید احمد خاں کو جو حمایت ملی اُس نے اُن کے خیالات میں بڑی استقامت پیدا کر دی۔ کانگریس کے تعلق سے سر آکلینڈ اکلون اور لارڈ فرین بھی اُسی نتیجے پر پہنچے تھے جس پر سید احمد خاں پہنچے تھے۔ راجہ رام پال سنگھ کو چھوڑ کر لودھ کے زیادہ تر تحفظ اُن کے ساتھ تھے۔ شمالی ہندوستان یعنی اتر پردیش، پنجاب اور سندھ کے اُس طبقے کے ہندو اور مسلم رہنماؤں میں بہت کم کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ حکومت نے شروع میں کچھ دلچسپی دکھائی تھی لیکن جلد ہی وہ غفلت برتنے لگی اور ہندوستان میں رہنے والے انگریز مجموعی اعتبار سے اس کے خلاف تھے۔

سید احمد خاں نے کانگریس کے مخالفین کو یونائیٹڈ انڈیا پیٹر ایک ایسوسی ایشن میں یکجا کرنے کی کوشش کی جس کا قیام 1888ء میں عمل میں آیا تھا۔ لیکن یہ ایسوسی ایشن زیادہ دن تک باقی نہ رہ سکی۔ 1893ء میں کئی مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں بمبئی کا فساد بھی شامل تھا اور اُسی سال ملک نے پونا میں گن بی کا تھوپا ملنا شروع کیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بیک نے محزن و فینس ایسوسی ایشن قائم کی جس کے سکریٹری خود وہ اور سید احمد خاں مقرر کئے گئے۔ اپنے اختتامی خطبے میں اُس نے پیٹر ایک ایسوسی ایشن کی خامیوں کا ذکر کیا اور ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو محض مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ اُس نے کہا کہ کانگریس سے لڑنے کے لیے ایک سیاسی ادارہ ہونا چاہیے جس کا مقصد اس کی رائے میں ہندو جماعتوں اور ہندو اہلیا پسندوں کے ہاتھوں میں طاقت منتقل کرنا ہے جو اسلام کے وجود کے لیے ایک خطرہ ہیں۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اخبارات سیاسی مضامین سے بھرے ہوتے ہیں جس کی بنا پر ہمارے تعلیم یافتہ مسلم نوجوان مجوزہ کاروائیوں کی یا تو حمایت کریں گے یا مخالفت۔ میری رائے میں یہ غلط ہو گا کہ اُن کی رہنمائی نہ کی جائے اور انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔" (3)

1895ء میں لندن کی مسلم ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے بیک نے کہا کہ ہندو۔ مسلم اتحاد کا کوئی امکان نہیں ہے اور ایسے حکومت کے کسی جمہوری نظام کا بھی کوئی امکان نہیں ہے اس لیے کہ اس قسم کے نظام میں مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندو اکثریت کے غلام ہو جائیں گے۔ اُس نے انہیں مشورہ دیا کہ 1857ء کی غلطی دوبارہ نہ کریں اور باغیانہ انڈین ریشل کانگریس میں شامل نہ ہوں جس کی رہنمائی اولو ابھائی

(1) دیکھئے نئی دہلی میں پرنسپل آف انڈین لاء اور ایڈمینیسٹریٹو لاء کے خطوط۔ اسکے علاوہ طیب جی حسین۔ بی بدر الدین طیب جی، سوانح

عمری، تمکیر انڈیا، بمبئی، 1853ء صفحہ 208

(2) ایضاً، صفحہ 209 (3) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 30 جنوری 1894ء۔

دیکھا کرتے تھے جسے بدسییوں نے ناپاک نہیں کیا تھا وہ دونوں اس ماضی کو دوبارہ لاتا چاہتے تھے اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ تاریخ کے دھارے کو پلٹنا ممکن نہیں ہے۔ دونوں اسکو تسلیم کرتے تھے کہ سیزر (یعنی بادشاہ وقت) خدا کے معاملے ہے اور اُن دونوں کی طرف سے انسان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن میں امتیاز نہیں کیا جاتا چاہے۔ سماج کی ساخت ایک ہمیشہ رہنے والی غیر سرمایہ دارانہ زرعی معیشت پر قائم تھی۔ بہت سے لوگوں کے لیے زندگی دشوار، افلاس میں گھری ہوئی اور تکلیف دہ تھی اور بالائی طبقے کے افراد کے لیے روزگار حاصل کرنا مشکل تھا۔ دونوں فرقوں کے درمیان ایک دوسرے پر معاشی انحصار اور سماجی داری کی علامتیں راجح نہیں ہو پائی تھیں اور عام طور سے پیشہ ورانہ علیحدگی پائی جاتی تھی۔

سیاست کے میدان میں ہندوستانوں کا علم اور تجربہ برطانوی غلامی عمل تک محدود تھا۔ برطانیہ ایک جمہوری اور ہم نوعی ملک تھا جہاں کوئی مستقل مذہبی، نسلی اور لسانی اقلیت نہیں تھی۔ اسکاٹلینڈ، آئرلینڈ اور ویس کے مسائل زیادہ اثر نہیں رکھتے تھے۔ برطانوی اکثریتیں اور اقلیتیں محض سیاسی تھیں اور ان میں رد و بدل ہوتی رہتی تھی۔ لیکن ہندوستان میں صورت حال مختلف تھی۔ بد قسمتی سے ہندو اکثریت نے اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھا کہ قومی اتحاد اور جمہوری حکومت صرف اس صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب اقلیتوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ان کا مذہب اور تہذیب محفوظ ہیں اور ان میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ اقلیتوں نے محسوس کیا کہ مستقبل میں مذہبی اکثریت ایک مستقل سیاسی اکثریت بن جائے گی اور جدید حکومتوں کے تجربے کے باوجود وہ یقین نہیں کر سکیں گے کہ ایک ایسے سماج میں ان کا مذہب اور تہذیب آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں گی جہاں اکثریت کا تعلق کسی دوسرے مذہب سے ہو پچھلے زمانے کے اثرات مابعد ابھی زائل نہیں ہوئے تھے۔

اکثریت کے تصور کی بنیاد تھی لوگوں کی تعداد۔ وہ واحد اہم تعداد جس سے واقف تھے مردم شاری کے اندراجات کی تعداد تھی جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد علیحدہ علیحدہ دی جاتی تھی۔ یہ تعداد ایسا لگتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے معین ہو گئی ہے۔

اس بات کا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا کہ سیاسی جماعتوں یا اُن گروہوں کے اعتبار سے تعداد کو دیکھیں جو مختلف سیاسی اور معاشی پروگراموں کی بنیاد پر بنتے تھے اور موسموں کی طرح بدلتے رہتے تھے۔ اس بات کو سمجھنے کی اہلیت اُن میں کم تھی کہ جدید حکومت کی اصل بنیاد مذہب کے بجائے مادی مفادات ہوتے ہیں۔

مذہبی اور سیاسی تعدادوں کے متعلق جو الجھن پیدا ہو گئی تھی باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکے کی ذمہ داری اُس پر تھی اور ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو مورد الزام ٹھہراتا تھا۔

سید احمد خاں نے بالائی طبقے کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک نئی امید اور اعتماد پیدا کر دیا اور اُن کی سیاسی رہنمائی کے لیے ایک مرکز قائم کر دیا جہاں سے انہیں ہدایت مل سکے۔ حالانکہ انہوں نے جو تحریک شروع کی اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں نے علی گڑھ کی رہنمائی قبول کر لی اور اُن کے رقیب پس پا ہو گئے پھر بھی انہوں نے مسلمانوں کے سامنے جو منزل رکھی تھی وہ تنگ دلی اور کوتاہ بینی پر مبنی تھی جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ سمجھوتے اور ہم آہنگی کا ضروری کام اور زیادہ مشکل ہو گیا۔

سید احمد خاں نے اپنی زندگی کی ابتداء ایک سماجی اور مذہبی مصلح کی حیثیت سے کی تھی۔

نور دینی اور بنگالی سیاست داں کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ اپنے عہدوں، اپنی آزادی اور اپنی حیثیت سے محروم ہو جائیں گے۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سید احمد خاں نے بیک کے خیالات کو قبول کر لیا اور آخری دم تک کانگریس کی ہر تجویز کی مخالفت کرتے رہے۔ عمر کے آخری چندہ سال میں بیک کے زیر اثر اُن کی سرگرمیوں نے اتنی غیر متوقع شکل اختیار کر لی کہ اُن کے قریبی دوست بھی تعجب کرنے لگے۔ اُن میں سے یکم نے اُن سے تعلق کرنا چھوڑ دیا۔ سید احمد خاں اور اُن کے دوستوں نے کانگ کی ٹرٹی شپ سے استغفی دیا جس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ کانگ کے معاملات میں بیک کا بدوہتا ہوا اثر فٹلی نعمانی کانگ سے رٹا رہو گئے اس لیے کہ سید احمد خاں کے سیاسی خیالات کے وہ سخت مخالف تھے۔ دوسرے ٹرٹی اسٹن پریشان ہو گئے تھے کہ وہ اخبارات میں مضامین لکھ کر ملت سے اپیل کرنا چاہتے تھے کہ وہ مداخلت کریں اور کانگ کو بچائیں لیکن سید احمد خاں کی موت نے انہیں خاموش کر دیا۔ اُن کی زندگی کے آخری دن بہت بُرے گزرے۔ اُن کے گھر میں ایک حادثہ یہ ہوا کہ اُن کے بیٹے کا ذہنی توازن خراب ہو گیا، رقوم کے غبن کی بنا پر کانگ میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور عام حالات بھی بگڑ گئے مثلاً سرائیکی میٹ ڈوئل نے حکم دیا کہ عدالتوں میں ہندی استعمال کی جاسکتی ہے۔ ان سب باتوں کا اُن پر بہت مضر اثر پڑا اور اُن کی صحت خراب ہو گئی۔

سید احمد خاں - کردار کا جائزہ

1898ء میں یہ پروقار بزرگ انتقال فرما گئے۔ کسی بھی پیمانے سے تاپے وہ ایک بڑے انسان تھے۔ اُن کے ایک عزیز دوست نے انہیں جو خراج عقیدت پیش کیا تھا اُس کا ذکر سی۔ ایف۔ انڈوز نے کیا ہے۔ وہ اُن کی عظمت کی پوری طرح وضاحت کرتا ہے۔ اُس نے کہا تھا ”سر سید احمد میں ایک شان، شیر کی سی طاقت، اعلیٰ تصورات اور ایک اعلیٰ ذہن کا شدید جوش مجھے نظر آیا۔ میرے ملاقاتیوں میں کسی مسلمان نے اپنے کردار کے وقار اور مضبوطی اور اپنی غالب ذہنی صلاحیت سے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا سر سید احمد نے کیا۔ جہاں بھی جاتے تھے وہ قدرتی طور سے پیش پیش ہو جاتے تھے۔ اُن کی شخصیت اس کا مطالبہ کرتی تھی اور لوگ قدرتی طور سے اس پر عمل کرتے تھے اُن کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ وہ لوگوں کو متاثر کر لیتے تھے۔ وہ ایک پیداؤں کی رہنما تھے۔“ (1) انہوں نے اپنی بہترین رہنمائی کی بنا پر مسلمانوں کو مایوسی کی دلدل سے نکالا۔ انہوں نے انہیں ناکارہ اور ظلمت پرست و ظلم سے غیر معقول لگاؤ سے چھٹکارا دلایا اور جدید تعلیم کی طرف اُن کے ذہنوں کو موڑا جس کی بنا پر وہ اپنے ملک کے معاملات میں اپنا جائز حصہ لے سکے۔ انہوں نے حکمرانوں کے شکوک اور مخالفت کو اعتماد اور دوستی میں بدل دیا۔

اس کو بد قسمتی کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مسلمان فریقے کو ملک پر فوقیت دی۔ اُن کے رویے کی صراحت شاید اس بات سے ہو سکے کہ اُن کے زمانے میں ایک جموٹے سے دانش ور طبقے کو چھوڑ کر پورا ملک بحیثیت مجموعی عہد وسطیٰ کے انداز فکر کا شکار تھا۔ عام لوگوں پر چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان سب سے زیادہ اثر نہ جب کا تھا۔ دونوں میں اس قسم کے لوگ موجود تھے جو ایک ایسے شاندار ماضی کا خواب

انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے تزلزل کی وجہ مسلمان شرفاء کا اخلاقی اور روحانی زوال ہے چنانچہ انہوں نے اسلام کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ چونکہ مسلمان توہم پرستی اور رسم پرستی کا شکار ہو گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی اصلاح کی بنیاد عقل پر قائم کی انہیں خواب سے جگانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ غیر معقول عقائد اور روایوں کی مذمت کی جائے اور اندھی رسم پرستی ترک کر دی جائے۔ پرانے اور ناکارہ تصورات کی گرفت سے ذہن کو آزاد کرنا ضروری تھا۔

اُن کا یہ خیال ٹھیک ہی تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں کو آزاد کرانے کا ذریعہ تھی جدید تعلیم اُس کی معقولیت پسندی اور سائنسی طریقہ۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر انہوں نے محض اننگلو اور سینٹرل کالج اور سائیکس سوسائٹی قائم کی۔ لیکن جدید قسم کی تعلیم کی ضرورت صرف مسلمانوں کی ذہنیت بدلنے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کا ایک فوری اور عملی مقصد بھی تھا اور وہ تھامس کاری ملازمتوں کے لیے مسلم نوجوانوں کو تربیت دینا۔

بدقسمتی سے پہلے مقصد کی شدت کے ساتھ مخالفت مسلمانوں کے رجعت پرست عناصر کی طرف سے ہوئی اور سید احمد خاں کو مجبور اپنے اعلیٰ مقصد یعنی اسلام کی عقلی تفسیر کی نشر و اشاعت ترک کر دینی پڑی اور اپنے عملی مقصد حاصل کرنے پر پورا زور صرف کرنا پڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی طرف سے حکومت کی بدگمانی دور ہو جائے تاکہ بالائی طبقوں کے مسلمانوں کی معاشی حالت سدھ سکے۔

علی گڑھ نئی شکل اختیار کرنے والے اسلام کا مرکز بن سکا۔ اس نے کوئی غزالی، ولی اللہ جمال الدین یا رشید رضا پیدا نہیں کئے۔ کالج میں دی جانے والی مذہبی تعلیمات میں روایتی اسلام چھایا رہا۔ لیکن روایت اور مغربی سائنس، فلسفے اور لویات ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ چنانچہ طالب علموں کا شعور دو حصوں میں بٹ گیا۔ مذہبی عقاید اور عقل میں مفاہمت نہیں ہو سکی۔

مسلمانوں کے دنیاوی امور کے متعلق تشویش نے علی گڑھ کو مجبور کر دیا کہ وہ حکومت کا سہارا لے اور کالج کے انگلستان کے تعلیمی اداروں کی شکل دے۔ لیکن انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اپنے ماضی کو نظر انداز کر دیا۔ نہ صرف وہ اپنی تہذیبوں کے لیے اجنبی بن گئے بلکہ انہوں نے ایک دوسرے کی تہذیبوں کو بھی بھلا دیا جس کا اثر جہاں تک ہوا۔ حالانکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مغربی تہذیب کے ظاہری رنگ و روغن نے انہیں ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے اور بظاہر وہ یکساں نظر آنے لگے ہیں۔ لیکن زندگی کے سنجیدہ تر مسائل میں وہ ایک دوسرے سے دور دور ہو گئے تھے مغربی تعلیم کا عجیب و غریب اثر ہوا تھا۔ اس نے اُن میں شعور کی یکسانیت اور جذباتی اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ علیحدگی پسندی کے جذبے نے اُن کے درمیان ایسی خلیج پیدا کر دی جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی اور جس کو مغربی فکر کا مشترکہ علم بھی پاٹ نہ سکا۔

ہندوستان کے تعلیمی نظام نے دونوں فرقوں کے درمیان مفاہمت کو دشوار بنا دیا۔ ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی پر زور دیا جاتا تھا اور ثانوی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں علم کے مغربی شعبوں کو مضامین کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا جس کی وجہ سے دونوں کلاسیکی زبانوں یعنی سنسکرت اور عربی کی تعلیم حاصل کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اُن کے درمیان دور واداری نہیں پیدا ہو سکی جو ایک دوسرے کے بنیادی نظریات کو سمجھنے کے بعد پیدا ہو سکتی تھی۔ وہ ہندو اور مسلمان جنہوں نے مغربی نظام کے تحت تعلیم

حاصل کی تھی وہ اپنے یا اپنے پڑوسیوں کے فلسفے، سائنسی اور ادبیات کے مقابلے مغربی فلسفے، سائنس یا ادبیات سے زیادہ اذیت رکھتے تھے۔

V۔ سید احمد خاں کے بعد علی گڑھ تحریک

سید احمد خاں کے انتقال کے بعد اقتدار محسن الملک کے ہاتھ میں آ گیا۔ لیکن ہندی اور اردو کے سوال پر شیل مغربی صوبجات کا نصیحت گور زانٹی میکنڈ ملڈ، اُن سے ناراض ہو گیا جس کے نتیجے میں علی گڑھ کی سیاسی سرگرمیاں معرض التوا میں پڑ گئیں۔ یہ صورت حال تقسیم بنگال تک جلدی رہی جس نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

انجی مدت کار میں بیک کے جانشین تھیوڈور مدیرین نے علی گڑھ تحریک کی رہنمائی کی۔ اُس نے مسلمانوں کو ہر قسم کی سیاسی تحریکات سے علیحدہ رکھنے پر اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ اس نے مسلمانوں سے کہا ”وقت آ گیا ہے کہ بالائی طبقوں کو جن کے ساتھ خاص طور سے اچھا برتاؤ کیا گیا ہے، یہ دکھانا چاہیے کہ وہ احسان فراموش نہیں ہیں۔“ اس نے دھمکی بھی دی ”اگر مسلمانوں کے رہنماؤں کے روپے نے (غیر وفاداری کی) تہمت کو صحیح ثابت کر دیا تو اس میں کسی کو تعجب نہیں ہو گا اگر حکومت اُن کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ ختم کر دے اور انگریزوں کی طرف اُن کے حالیہ دوستانہ روپے، ہندوؤں کے ساتھ اُن کی مخالفت اور اپنے مفادات کو پورا کرنے کے رجحان پر یقین نہ کرے“ (1)۔

اُس کے رہنماؤں کے مطابق علی گڑھ تحریک کے دو مقصد تھے ایک مذہبی اور دوسرا سیاسی۔ مذہبی معاملات میں سید احمد خاں ایک لبرل قوم پرست تھے۔ سیاست میں وہ وسیع انظر کی مظاہرہ نہ کر سکے۔ وہ آزاد ہند میں مسلمانوں کی منزل کا تصور نہ کر سکے اور اس لیے مستقبل کے تعلق سے وہ صرف حکام کی مہربانیوں اور حکمرانوں کے ساتھ وفاداری کی حد تک سوچ سکے۔ اُن کے پیروؤں میں کچھ جید عالم اور کچھ تعلیم یافتہ سیاست داں شامل تھے۔ اول الذکر میں اہم تھے چراغ علی، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور الطاف حسین حالی اور آخر الذکر میں محسن الملک اور وقار الملک جو دونوں حیدر آباد سے رٹائر ہونے والے حاکم تھے۔

سید امیر علی

سید احمد خاں کے حلقے کے باہر لیکن مسلمانوں کے حالات سے اتنی ہی دلچسپی رکھنے والے تھے کلکتہ کے سید امیر علی۔ وہ اپنے کو معتزلہ سمجھتے تھے اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں کو بنانا میں اُن کا جو حصہ ہے وہ سید احمد خاں کے تمام پیروؤں کی مجموعی کوششوں سے زیادہ ہے۔ لیکن سیاست میں وہ علی گڑھ تحریک کے کسی دوسرے رہنما سے زیادہ فرقہ پرست اور علیحدگی پسند تھے۔ وہ سیاسی اتحاد اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ شہریت کے تصور کے شدید مخالف تھے۔ انہوں نے

لکھا تھا "صرف وہ لوگ مشترکہ شہریت کی بات کرتے ہیں جو حالات سے ناواقف ہیں اور صورت حال کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔ کم تعدد ہندوؤں کو زیادہ تعدد ہندوؤں کے یکپ میں داخل کرنے کی کوشش کا نتیجہ فتنہ و فساد کی شکل میں سامنے آئے گا۔۔۔۔۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انہیں مشترکہ انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کر کے وہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے" (1) انہوں نے محض مسلمانوں کے مفاد میں ایک فرقہ وارانہ تحریک شروع کرنے کی اپنی اسکیم کے لیے سید احمد خاں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اُس کے بعد مسلمانوں میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی خاطر انہوں نے 1877ء میں سنٹرل محمدن ایسوسی ایشن قائم کی۔ 1902ء میں انہوں نے اسپرٹ آف اسلام شائع کی جس میں اسلام کو ایک ترقی پسند، معقول اور جمہوری مذہب ثابت کیا گیا ہے انہوں نے اسے کہیں مکمل انگریز مینشپن آف دی لائف اینڈ ڈیجنگس آف محمد، اسے ہینڈ بک آف محمدن لاء، اسے شارٹ ہسٹری آف سیر اسنس، دی اٹھیکس آف اسلام پر سلا آف محمد زو فیروہ کے علاوہ کئی مضامین بھی لکھے جن میں مسلمان نوجوانوں کی توجہ اُن کی شاندار میراث کی طرف مبذول کرائی گئی ہے اور مغرب میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وہ اسلام کے باوقوف اور معجزاتی عناصر کے اظہار سے بچتے تھے اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مقدس قوانین بیسویں صدی کے تصورات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ چاروں اماموں نے قدیم قانون کے متعلق جو فیصلے دئے تھے انہوں نے اُن فیصلوں کو ناقابلِ ترمیم ماننے سے انکار کر دیا۔ اُن کا خیال تھا شہریت کی قراردادوں میں جدید ضروریات کی روشنی میں ترمیم کی جاسکتی ہے اور ذاتی فیصلے کے حق کی وہ تصدیق کرتے تھے۔

رہنما ہونے کے بعد امیر علی نے انگلستان میں بود و باش اختیار کی تاکہ اخبارات اور ذاتی بیانات کے ذریعے وہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت برطانوی کنزرویٹو لوگوں میں کر سکیں۔ 1910ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک شاخ لندن میں کھولی۔

VI علما اور دیوبند تحریک

سید احمد خاں کے خیالات سے اختلاف مسلمانوں کے دو فرقوں نے کیا یعنی علماء نے، جو قدیم علوم کے نام لیا کرتے، اور قوم پرست مسلمانوں نے مسلمانوں کی سیاست میں سید احمد خاں کو دلچسپی 1857ء کی بغاوت کے بعد پیدا ہوئی مگر علماء اُس میں دلچسپی بہت پہلے سے لے رہے تھے۔ مغل سلطنت کا زوال اور اس کی جگہ برطانوی سلطنت کا قیام اُن کے لیے ایک کاری ضرب کا حکم رکھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی عمارت دو ستونوں پر قائم ہے یعنی ایمان اور طاقت۔ آخر الذکر ستون گر چکا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ ریاست کی حمایت کے بغیر کیا ایمان کی عمارت سلامت رہ سکے گی۔

علما کا جواب یہ تھا کہ وہ ایک دفعہ پھر مسلمانوں کی سیاسی طاقت بحال کر سکیں گے۔ چنانچہ دہلی کے شاہ ولی اللہ نے دو کاموں کا بیڑا اٹھایا۔ پہلا تو تھانہ ندگی کے اخلاقی چشموں کو پاک کرنا، قانون اور عایت سے چھپا چھڑاتا اور مسلمانوں کو قرآن کی اصل تعلیمات اور رسول کی روشن مثال کی طرف لانا۔ دوسرے مرحلے

میں انہوں نے اس عملی مسئلے کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی جو برطانوی فتح نے پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اُن کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے دہلی کو فتح کرنے کے بعد 1803ء میں فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالمرتب ہے۔ اس فتوے کے بعد ہر مسلمان کا فرض ہو گیا کہ یا تو وہ عیسائی فاتحین کے خلاف جہاد کرے یا ہندوستان سے کسی اسلامی ملک کو ہجرت کر جائے۔

بریلی کے سید احمد نے تحریک کی قیادت سنبھالی اور عبدالعزیز کے رشتہ داروں اور طالب علموں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ بہادر مجاہدین، جنہیں انگریزوں نے دہائیوں کے غلام نام سے منسوب کیا تھا، شمال مغربی سرحد کی دشوار گزار پہاڑیوں میں لڑتے ہوئے 1814ء تک حکومت سے ٹکر لیتے رہے۔

1857ء میں اُن میں سے کچھ نے انگریزوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا لیکن بغاوت کی ناکامی کے بعد انہیں ایک دفعہ پھر اُس سوال کا سامنا کرنا پڑا جس سے پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی نے دیا تھا۔ لیکن 1857ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد انیسویں صدی کے وسط میں جہاد کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

علامہ کا ایک گروہ، جس نے بغاوت میں عملی حصہ لیا تھا اور انگریزوں کے خلاف ایک تحریک شروع کر دی تھی جس کا سرگزار ہندوستان کے مظفر مگر ضلع میں واقع شالی میں تھا۔ حکومت کے جبر و ظلم سے کسی طرح محفوظ رہا اور سہارن پور کے ضلع میں دیوبند کے مقام پر انہوں نے ایک اسکول قائم کیا جس کا مقصد تھا مسلمانوں کے لیے مذہبی رہنمائی اور علم حاصل کرنا۔ اُن میں اہم تھے محمد قاسم نانوتوی (1837ء-1880ء) اور رشید احمد گنگوہی (1828ء-1905ء) یہ دونوں علماء اللہ کے پیرو تھے جو 1857ء میں مکہ کو ہجرت کر گئے تھے۔

دیوبند کا اسکول 1867ء میں قائم ہوا جس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے

- 1- بغیر کسی لالچ، سرپرستی، یا باؤ یا مہربانی کے کلام اللہ کی اشاعت کرنا۔
- 2- مسلمانوں کے ساتھ روابط برقرار رکھنا تاکہ صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے اُن کی تنظیم کی جائے۔

3- حکومت یا طبقہ اشرافیہ کے ساتھ کسی قسم کے تعاون کو اسکول کے معاملات کیلئے مضر تصور کرنا۔

4- شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر سختی اور ثابت قدمی کے ساتھ عمل کرنا۔

5- امیرانہ شان اور مطلق العنانیت سے دامن بجائے رکھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور

آپسی صلاح مشورے سے کام کرنا تاکہ انتظام کے جمہوری طریقوں کی مثال پیش کی جاسکے۔

اس اسکول میں تعلیم کے لیے درس نصاب کا انتخاب کیا گیا جس میں قدیم سائنسوں پر زور دیا گیا ہے۔ نصاب تعلیم، مالیات اور انتظامی امور کی حد تک اسکول بالکل آزاد تھا اور وہاں کے فارغ التحصیل طلباء کے لیے حکومت کے محکموں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ غریبوں کا اسکول تھا اور اسکے اساتذہ اور طلباء بہت جرسی کے ساتھ سخت محنت کی زندگی گزارتے تھے۔ وہ اپنے ایمان کو روشن رکھنا چاہتے تھے اور دنیاوی کامیابی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انگریزی تعلیم، مغربی تہذیب اور مشرق کے ملکوں پر مغرب کا غلبہ اُن کے لیے نفرت انگیز تھا اور وہ مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی حیات نو کے لیے ایشیا کے ملکوں کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔

حالانکہ اسکول کی فوری ضرورت تو تھی تعلیم اور کردار کے مسائل لیکن ”سماج اور ریاست“ کے سوال بھی ان کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتے تھے جتنے فرد کے ”ایمان و عمل“ کے سوال۔ ہندوستان اور

دنیاے اسلام میں رونما ہونے والے واقعات قدرتی طور سے اُن کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے 60-1859ء کے نبل کے فسادات، 1876ء کے دکن فسادات، قحط اور کسانوں اور دیہات کے دست کاروں کی بگڑتی ہوئی حالت نے انہیں راست متاثر کیا۔ بنگال میں شروع ہونے والی اُس سیاسی تحریک نے جو پورے ہندوستان میں پھیل گئی تھی اور خاص طور سے 1883ء میں البرٹ ہل کی وجہ سے شروع ہونے والی تحریک نے بڑے پیمانے پر انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔

اسی کے ساتھ دوسرے ملکوں میں جو حالات رونما ہو رہے تھے اُن کی وجہ سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ مصر، ترکی، مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور ایران میں مغربی سامراج کی توسیع کے اثرات ہندوستان پر پڑے۔ سید جمال الدین افغانی کی آمد نے مسلم مذہبی تنظیمی اداروں کے نوجوان طالب علموں میں جوش پیدا کر دیا تھا۔ ایشیاء کو مغربی تہذیب کے غلبے اور سیاسی اقتدار سے آزاد کرانے کے لیے انہوں نے جو آواز اٹھائی تھی اس کی گونج بہت سے دلوں میں سنی جاسکتی تھی۔

دیوبند اسکول حلال الدین افغانی کے خیالات سے متفق تھا۔ چنانچہ 1885ء میں جب سیاسی مقاصد کے لیے ہندوستانوں کو متحد کرنے کی خاطر انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی تو اسی اسکول نے اس کی حمایت کی۔ رشید احمد گنگوہی نے، جو محمد قاسم کے بعد اس ادارے کے سربراہ مقرر ہوئے تھے، اسکول کے رویے کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ شلہ عبدالعزیز کے فتویٰ کے مطابق ہندوستان دارالحرب ہے اور اس لیے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ انگریزوں کو ملک سے نکال دے۔

ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنے کے سوال پر رشید احمد گنگوہی نے کہا کہ دنیاوی امور میں قومی مقصد حاصل کرنے کی غرض سے شریعت نے اجازت دی ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ معاہدہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ کانگریس کی سرگرمیوں میں تعاون کریں حالانکہ وہ خود کانگریس میں شامل نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے کی کانگریس کے برعکس وہ مکمل آزادی میں یقین رکھتے تھے۔ دیوبند اسکول کے عالم سربراہ نے صاف لفظوں میں کہا کہ تمام مذہبی گروہوں کے اتحاد کی بنیاد پر قائم قومیت کا تصور کسی اسلامی اصول کے منافی نہیں ہے۔

اس فیصلے نے دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان خلیج پیدا کر دی۔ 1881ء میں عربی پاشا کی بغاوت کے تعلق سے سید احمد خاں نے انگریزوں کی موافقت کا رویہ اختیار کیا، جمال الدین افغانی نے سید احمد خاں کے مذہبی اور سیاسی تصورات کی مذمت کی اور آخر میں یہ ہوا کہ 1897ء کی ترکی۔ یونان جنگ میں سید احمد خاں نے ترکوں کے خلاف مغربی طاقتوں کی حمایت کی۔ ان سب باتوں سے ہندوستان میں مسلم فکر کے دو بڑے مرکزوں کے درمیان خلیج بڑھ گئی۔ محسن الملک کی کوششوں کے باوجود اُن دونوں کو قریب لانا ممکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ شدید فرقہ وارانہ منافرت کے زمانے میں بھی دیوبندی علماء قوی اتحاد اور ہندوستان کی آزادی کی برابر حمایت کرتے رہے۔

شیلی نعمانی

دیوبند کے اسکول کے حامیوں میں شیلی نعمانی (1857ء-1914ء) شامل تھے جو فارسی اور عربی

کے جید عالم تھے اردو میں جنہوں نے بہت ساشعری اور نثری ادب تخلیق کیا۔ سید احمد خاں کی دعوت پر 1883ء میں مخزن انگلو اور نیشنل کالج کے اساتذہ میں شامل ہو گئے اور حالانکہ 1898ء تک جس سال سید احمد خاں کا انتقال ہوا وہاں کام کرتے رہے لیکن پہلے سید احمد خاں سے اُن کے اختلافات ہو گئے تھے۔ وہ سید احمد خاں کے مذہبی نظریات اور اُن کی سیاست سے متفق نہیں تھے۔ وہ امام ابو حنیفہ کے کٹر پیرو تھے اور چاروں دہستان فقہ کی طرف سید کے غیر مقلد رویے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ابتداً تو کی باتوریہ کی پیروی کی حیثیت سے، اس کے بعد وہ غزالی اور رازی کے زیر اثر آ گئے اور آخر میں ابن تیمیہ کی پیروی اختیار کی۔ اس لیے انہوں نے سید احمد خاں کی معقولیت پسندی کو رد کر دیا۔

تعلیم کے سوال پر شبلی کا موقف دیوبند کے اسکول اور سید احمد خاں کے اسکول کے بین نہیں تھا وہ اس بات کے حق میں تھے کہ قدیم اسلامی نظام تعلیم میں سے زبانی اور رسمی دوری و قدریس کا سلسلہ ختم کر کے وہ انگریزی زبان اور یورپین سائنس شامل کر کے اسکی اصلاح کی جائے۔ انہوں نے لکھنؤ میں 1894ء اور 1896ء میں ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جہاں انہوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو عملی شکل دینے کی کوشش کی۔ پہلے روایت پرست علمائے ان کی بڑی مخالفت کی لیکن بالآخر وہ انہیں اس امر کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ پرانے نصاب کو تبدیل کرنا اور انگریزی کو رواج دینا مفید ہے۔

سیاسی امور نے تعلق سے اُن کا خیال تھا کہ اسلام ایک لبرل مذہب ہے جو ترقی اور تہذیب کو فروغ دیتا ہے۔ وہ انسان کی عظمت کا قائل ہے۔ انسانی مساوات پر زور دیتا ہے، عورتوں کے حقوق کا محافظ ہے اور حکومت کے جمہوری طریقوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ رد و اداری کی تعلیم دیتا ہے اور مذہب کے تحفظ کے علاوہ کسی اور صورت میں جنگ کو جائز نہیں قرار دیتا ہے۔ اس میں بالآخر تبلیغ مذہب کی ممانعت کی گئی ہے۔ اسلام زندگی کو دنیاوی اور دنیوی شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا ہے۔ اور تیاگ اور رہبانیت کے خلاف ہے۔

شبلی جمہوریت پسند تھے۔ سامراج کے مخالف تھے اور بین الاصلیت کے قائل تھے۔ یہ قدرتی امر تھا کہ وہ سید احمد خاں سے متفق نہیں تھے۔ ہندوستان کے مسائل پر اُن کے خیالات مختلف تھے جس کی بنا پر باہمی اختلافات اور جھگڑے گئے۔ انگریزوں کے لیے سید احمد خاں کی وفاداری اور کانگریس کی مخالفت کو تائید کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کالج کے انگریز اساتذہ کے وہ بہت زیر اثر ہیں۔ شبلی کے شاگرد اور سوانح نگار سید سلیمان ندوی نے کہا ہے۔

”انگریز پروفیسروں نے سر سید کو یقین دلادیا تھا کہ کانگریس کی مخالفت اور انگریزوں سے دوستی کالج اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔ اُن کے جلاو نے سر سید کو اتنا مسحور کر دیا تھا کہ وہ اپنی رائے سے دست بردار ہو گئے اور ہر چیز کو مسٹر بیک اور دوسرے انگریز استادوں کی آنکھوں سے دیکھنے لگے اور ہر بات اُن کے کانوں سے سننے لگے۔“ (1)

اُس کے اعلیٰ منصب العین اور ہندوستانوں کی بھلائی اور ترقی کے لیے اُس کی کوششوں کی بنا پر شبلی کانگریس کے مداح تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا شبلی کا خیال تھا کہ ایک اقلیت کے طور پر اُن کی وہ حیثیتیں ہیں۔ اُن کے پاس ایک ممتاز نمایاں مذہب اور تہذیب ہے، ہندوستان کی تاریخ میں اُن کا حصہ شاندار ہے اور مذہب کے اعتبار سے وہ عالمی سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مسلمان ہندوستان کے

شہری ہیں اور اپنے وطن کے وفادار ہیں دوسرے تمام فرقوں کے ساتھ وہ بھی اُن تکلیفوں کے شکار ہیں جو برطانوی حکومت کی پیدا کردہ ہیں اور ہندوستان کے مستقبل کے متعلق وہ بھی وہی توقعات رکھتے ہیں جو دوسرے لوگ رکھتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ عہد و سہلی کی مسلم حکمرانی کو بحال کرنا ممکن نہیں ہے لیکن انہیں یقین تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمان ایک ایسی ریاست قائم کر سکتے ہیں جس میں دونوں عزت و آرام کی زندگی گزار سکیں اور نہ اُن کے ضمیر اُن پر لعنت بھیجیں اور نہ مقدس قوانین کی خلاف ورزی ہو۔

XII۔ قوم پرست مسلمان

ایک اور مسلم کب خیال، جو کانگریس کے تصورات کی حمایت کرتا تھا، تعلیم یافتہ مسلمانوں پر مشتمل تھا جن میں زیادہ تر بمبئی اور مدراس پریذینسیوں کے رہنے والے تھے۔ اس اصطلاح کے جدید معنوں میں اُن کا نقطہ نظر قوم پرستانہ تھا۔ جمہوری خطوط پر ہندوستان کی سیاسی ترقی کے وہ حامی تھے اور ہندو۔ مسلم اتحاد سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ اُن کے نزدیک اسلام پر اُن کے ایمان اور ہندوستان کے لیے اُن کی محبت میں کوئی تضاد نہیں تھا۔

بدر الدین طیب جی

کانگریس کے ابتدائی دنوں میں بدر الدین طیب جی (1844ء-1906ء) کا شمار بڑے قوی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ اُن کا تعلق ایک عرب خاندان سے تھا جو ہندوستان آیا اور بمبئی میں آباد ہو گیا۔ ابتدائی زندگی میں انہوں نے ایک مسلم مدراس میں تعلیم پائی اور اُس کے بعد بمبئی کے الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ میں۔ وہ اُس وقت سیاست میں گہری دلچسپی لینے لگے جب 1878ء میں لارڈ لٹن نے ورناکلر پریس ایکٹ کا نفاذ کیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا (لارڈ سیکسبری) کو مشورہ دیا کہ اقرار نامہ کو پابند ملازمتوں سے ہندوستانوں کو علیحدہ رکھا جائے۔ اُن کاروائیوں کے خلاف اُن میں شدید رد عمل ہوا۔ 1883ء کے البرٹ مل کی نزاع نے انہیں ہندوستان کے مفاد میں لڑنے پر آمادہ کر دیا۔ وہ اُس زمانے میں ایک بریٹش کی حیثیت سے اپنے پیشے میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے تھے۔ وہ بمبئی کی لیجسلیٹیو کونسل کے زائمر کن پہلے ہی مقرر ہو چکے جہاں وہ اپنے زور خطابت اور وکالت کی بنا پر لوگوں میں بڑے مقبول ہو گئے تھے۔ بمبئی پریذینسی ایسوسی ایشن کا قیام 31 جنوری 1885ء کو عمل میں آیا اور انہوں نے اپنے سیاسی خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا۔

”میر اخیل ہے کہ قومیں ہوں یا افراد اُن کی سیاسی زندگی جب نشوونما پاتی ہے تو نئی توقعات بھی پیدا ہوتی ہیں اور اُن توقعات کے لیے ایک تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کو اظہار مل سکے۔ اور وہ تنظیم قومی توقعات پر نظر رکھتی ہے، منصفانہ کرتی ہے، ترقی دیتی ہے، اور رہنمائی کرتی ہے۔“ انہوں نے مزید کہا ”سیاسی حقوق کے تعلق سے ہم میں ایک احساس پیدا ہو گیا ہے اور نسل، رنگ اور مذہب کے اختلافات، جو ابھی تک ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھتے تھے، تعلیم کے روشنی بخش اثر کے تحت بالآخر ختم ہو گئے ہیں۔“ (1)

کاشی تاحہ ترمک تلک اور نیر و ز شامہ کے ساتھ طیب بی بھی بمبئی میں تمام عوامی تحریکات کے رہنما تسلیم کر لیے گئے۔ جیسا کہ سر ایچ۔ پی موڈی نے کہا ہے ”یہ تینوں ذہین حضرات نظم و نسق کے ہر شعبے میں اصلاحات کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے۔ مختلف پلیٹ فارموں سے اور طرح طرح کی تنظیموں سے وہ عام زندگی کے شعبے میں لوگوں کی بھلائی کے لیے مصروف عمل تھے۔“ (1)

جب دسمبر 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تو طیب جی نے نہ صرف کانگریس کی حمایت کی بلکہ لندن ٹائمس کے اس الزام کی تردید بھی کی کہ بمبئی کے مسلمان کانگریس کے اجلاس سے علیحدہ رہے۔ بمبئی پریسڈنسی ایسوسی ایشن میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا ”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری ہمدردی اور میرے عام ہم مذہبوں کی ہمدردیاں اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ اس تحریک کے متعلق لکھتے ہوئے انگلش ٹائمس نے غلط بیانی سے کام لیا اور کہا کہ مسلمانوں نے کانگریس میں حصہ لینے سے انکار کیا۔“ (2) حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی وجہ سے طیب جی اس اجلاس میں شرکت نہیں کر سکے تھے لیکن رحمت اللہ سیالی اور عبداللہ دھرمس وہاں موجود تھے جو بمبئی کے اتنے ہی بااثر مسلم رہنما تھے۔ طیب جی نے اپنے خیالات کی تصدیق نواس طرح کی ”مسلمانوں کے پاس انجمن اسلام ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ضروریات حکومت تک پہنچا سکتے ہیں اور مسلمانوں کی عام ترقی کے اقدامات کرنے کے لیے اُس پر زور ڈال سکتے ہیں لیکن میں اس امر کی تردید کرتا ہوں کہ ملک کی سیاسی ترقی کی تحریک میں دوسرے مذاہب اور پیشے رکھنے والے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ نہیں ہیں۔“ (3)

بمبئی کے گورنر لارڈ رے نے مسلمانوں کو کانگریس کی حمایت کرنے سے باز رکھنے کی خفیہ کوششیں کیں۔ لارڈ ڈفرن نے جو سید احمد خاں سے اطمینان بخش گفتگو کر چکا تھا، بدرالدین طیب جی کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی۔ وائسرائے نے طیب جی سے ملاقات کی، انہیں اپنی اور اپنے خاندان کے دوسرے اراکین کی ایک تصویر پیش کی اور مسلمانوں کی بڑی تعریف کی اور ان کے لیے دوستی کے جذبے کا اظہار کیا جن سے اُسے اس زمانے سے محبت تھی جب وہ ترکی میں برطانوی سفیر تھا۔ لیکن وائسرائے کی کوششوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بدرالدین طیب جی نے اعتراف کیا ”مجھے لینے والے نے جب تحفہ پیش کیا تو میں ڈر گیا۔“ (4) سید امیر علی نے بھی اُن کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش کی۔ کلکتہ کی محزن ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے طیب جی کو دعوت دی کہ وہ مجوزہ محزن پولیٹیکل کانفرنس میں شامل ہو جائیں۔ طیب جی نے یہ کہہ کر دعوت رد کر دی غالباً آپ جانتے ہیں کہ ہمیشہ سے میرا خیال یہ رہا ہے کہ فی الجملہ سیاسی مسائل کے تعلق سے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب اور خیالات رکھنے والے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے اور اُن سوالوں کے تعلق سے ہمارے اور ہندوؤں اور پارسیوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ اس کی وجہ سے مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہوا کہ کلکتہ کے مسلمان نیشنل کانگریس کے اُن اجلاس میں شریک نہیں ہوئے جو بمبئی اور کلکتہ میں منعقد ہوئے تھے۔ چنانچہ اگر مجوزہ محزن کانفرنس کا قیام نیشنل کانگریس کی رقیبت کے خیال سے عمل میں آیا جا رہا ہے تو مجھے اُس کی پوری مخالفت کرنی ہوگی اس لیے کہ میری رائے میں صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم کانگریس

میں شامل ہوں اور اپنے خصوصی حالات کے پیش نظر اس کے مباحث میں حصہ لیں۔ (1)
 اس کے بعد کے ایک اور خط میں بھی بدرالدین طیب جی نے ان الفاظ میں اپنے سیاسی خیالات
 ظاہر کئے "میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مجموعی اعتبار سے ہندوستان پر اثر انداز ہونے والے عام سیاسی سوالات
 کی حد تک سب تعلیم یافتہ اور عام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ بلا امتیاز ذات، رنگ
 اور مذہب مل کر کام کریں۔" (2)

انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس 1887ء میں مدراس میں منعقد ہوا اور طیب جی اس کے صدر منتخب کئے
 گئے۔ انہوں نے حکومت کی اندرونی سیاست اور سید امیر علی کی مخالفت کی پر وہ نہیں کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں
 انہوں نے اس پر زور دیا کہ ہندوستان کے تمام فرقے متحد ہو جائیں تاکہ وہ مل کر ان عام اصلاحات کے لیے کوشش
 کر سکیں جن سے ہم سب کی بھلائی ہوگی، اور جن کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بالافتقار رائے اور
 سنجیدگی کے ساتھ کام کر کے ان کو حاصل کرنے پر زور دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اس اثر میں تردید کی کہ کانگریس
 محض لوگوں کے اندرونی کام ہے۔ انہوں نے ان لوگوں کو چیلنج کیا جنہوں نے اثر میں لکھا تھا کہ "میرے ساتھ اس پہل
 میں آئے اور اپنے دل کو درد نظر ڈالیں اور مجھے بتائیے اس سے بہتر اثر افیہ کی نمائندگی کہاں دیکھی ہے۔ اثر افیہ سے میرا
 مطلب برائے ولادت اور دولت نہیں بلکہ برائے شعور، تعلیم اور حیثیت۔" (3)

1887ء کے بعد کئی سال تک طیب جی کی آواز کانگریس کے مباحث میں فیصلہ کن عنصر کا حکم رکھتی تھی۔
 ایک طرف تو انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اپنے مذہبی معاملات میں انہیں پوری آزادی
 حاصل ہے اور کانگریس اس میں مداخلت نہیں کرے گی۔ لیکن جہاں تک قومی سرگرمیوں کا تعلق ہے ہندوستانی مسلمانوں
 کو اپنے ہندوستانی تصور کو اپنا چاہیے۔ اور انہیں قومی ترقی یعنی بہتر حکومت، ہندوستانوں کے ساتھ بہتر برتاؤ، محاصل میں
 کمی اور تمام فرقوں کے لیے بہتر تعلیمی انتظام کے لیے دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے
 نمائندہ اداروں کے تعلق سے مسلمانوں کے شکوکہ فہم کرنے کی بھی کوشش کی جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ عید محرم
 اور دوسرے مسلم مذہبی مواقع پر کی جانے والی قربانی کے تعلق سے قوانین وضوابط نافذ کر کے مسلم مفادات کو خطرے میں
 ڈال دیں گے۔ انہوں نے شمال کے مسلم رہنماؤں کو لکھا کہ تمام تعلیم یافتہ اور عام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے شہریوں کا یہ
 فرض ہے کہ وہ بلا امتیاز ذات، رنگ یا مذہب مل کر کام کریں۔ انہوں نے روشن خیال مسلمانوں سے کہا کہ وہ عام لوگوں کی
 حالت سدھارنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور سے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں اس میں درغیر نہ رکھیں۔ جب تک وہ مذہب
 و ممالک کے مسلمان رہے لیکن اسی کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک مخلص ہوندا اور نڈر رہنا بھی رہے۔

1905ء میں تقسیم بنگال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی تعلقات میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔
 اس وقت تک مسلم سیاسی فکر دو ریاستوں میں غلبہ ہوئی تھی۔ ایک طرف شمالی ہندوستان کے بالائی طبقے کے مسلمان
 زیادہ تر علی گڑھ تحریک اور سید احمد خاں کے تصورات کے حامی تھے۔ دوسری طرف دیونند کا اسکول اور عالم دین
 لوگوں کی قیادت کر رہے تھے جو مغربی تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ قوم پرست مسلمان مغربی کی طرف سید احمد خاں
 کے لبرل رویے کے حامی تھے لیکن سیاسی اصلاحات، نمائندہ حکومت کے تصور اور جمہوری تحریک کے طریقوں کے
 مسائل کے تعلق سے ان سے اختلافات رکھتے تھے۔ لیکن تقسیم بنگال سے پہلے یہ بتانا مشکل تھا کہ ان میں سے کون
 سلاہستان خیال بالآخر مسلمانوں کی رہنمائی کے مقابلے میں کامیاب ہوگا۔

(1) مکتوب مورخہ 3 دسمبر 1887ء ایضاً صفحہ 179-180 (2) مکتوب مورخہ 13 جنوری 1888ء ایضاً صفحہ 191

(3) خطبہ نمائندہ مدراس اجلاس 1887ء۔

نواں باب

مذہبی اور سماجی اصلاح کی تحریکات

I۔ مغرب کا چیلنج

اُن واقعات نے جن کی ابتداء ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر ہو۔ ہندوستان کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ ہندوستان کے نظام حکومت کی تباہی، ان کی معیشت کی قلب مایہیت اور اُس کے سماجی نظام اور تہذیب پر ہونے والے حملوں کی بنا پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ نہ صرف یہاں کے قدیم لوگ ہمیشہ کے لیے سیاسی غلامی کے شکار ہو جائیں گے بلکہ یہ کہ ہندوستان مغرب کی ایک معاشی نوآبادی اور ثقافتی صوبے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس سیاسی محکومی اور ذہنی غلامی کے خلاف ایک احتجاج شروع ہوا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طاقت پکڑتا گیا۔

مشرق کے بنیادی تصورات اور اداروں کے سامنے جو مغرب کا چیلنج آیا اس کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ جس وقت یہ محسوس کیا جانے لگا کہ سیاسی میدان میں انگلستان کے غلبے سے نجات حاصل کرنے کی کوششیں بے سود ہیں تو قدرتی طور سے لوگوں کی توجہ مغربی تسلط کے تہذیبی اور سماجی پہلوؤں پر مبذول ہونے لگی۔

انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں مغرب کے اثرات کی بنا پر خود تنقید اور مذہب کی اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ صدی کے نصف آخر میں یہ عمل زیادہ تیز ہو گیا۔ مغرب کے عیسائی مذہب کی چنوتی نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو بیدار کر دیا تھا اور وہ خود اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دونوں نے محسوس کیا کہ مرور زمانہ سے اُن کے ابتدائی مقصد کی چمک دمک ماند پڑ گئی تھی، اُن کے ذہن کی دیرینہ پاکی باقی نہیں رہی تھی اور مذہب اندھیری رُسوں، خراب رواجوں، غیر معقول طریقوں اور بے درد توہمات کا مجموعہ بن گیا تھا۔ ہندو دھرم اور اسلام دونوں ان خرابیوں سے اپنا چھچھرا پھڑاتا چاہتے تھے تاکہ روحانی زندگی کا صاف و شفاف چشمہ پھر بہہ نکلے اور فرد اور سماج کو آزادی اور مسرت کی منزل کی طرف بہا لے جائے۔

روحانی بیداری اور پاک و صاف زندگی کی خواہش نے قدرتی طور سے انسان کے ذہن کو قدیم دین کی طرف موڑ دیا جو نیا نیا شروع ہوا تھا اور برائیوں سے پاک تھا۔ ان حالات میں اصلاح کی معنی تھے ابتدائی دین کی طرف بازگشت اور بہت سے مصلحین کی کوششوں نے احیاء پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن چونکہ ماضی کا احیاء ناممکن عمل ہے اور ماضی نام ہے ایک ایسے ذہن کی تشکیل کا جو اُس کا تصور کرے اس لیے مصلحین نے اپنے اپنے میلان طبع کے مطابق ابتدائی مذہب کی مختلف تصویریں پیش کیں اور اُسے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے مختلف طریقے بتائے۔

اصلاح یا احیاء کے لیے ضروری تھا کہ ان عناصر کو روکا جائے جو اصل دین سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں کچھ مصلحین نے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ آزادی کے ساتھ کاسٹ چھانٹ کی۔ آج

کے حالات میں پرانے عقائد کی تشریحات کے سلسلے میں بھی اُن میں اختلافات پائے جاتے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی کئی دبستان فکر پیدا ہو گئے۔ اُن کے ظاہری اختلافات کے باوجود اُن میں یکساں رجحان پایا جاتا تھا۔ یعنی مذہب کی تشکیل نو، اخلاقی اصلاح اور ایک مذہب کو ماننے والوں کو متحد کرنے کی زبردست خواہش کا شعور۔ وہ اس بات پر متفق تھے کہ اُن کی سیاسی ناکامی اور اُس کے نتیجے میں اُن کی بد حالی کا سبب تھا اخلاقی زوال اور سماجی کوتاہی جو نتیجہ قحط حقیقی مذہب کو نظر انداز کرنے کا۔

لیکن ان مذہبی تحریکات کا سب سے دلچسپ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے قومی نقطہ نظر کو فروغ دیا۔ یہ بات ناگزیر تھی کہ مذہبی فرقوں کے درمیان مناظروں نے ذہنوں میں اختصار پیدا کر دیا جو لوگ رواجوں سے سختی کے ساتھ چپے ہوئے تھے اُن کے رویے میں تبدیلی ہوئی اور وہ غیر مشروط طور پر انہیں قبول کرنے کے بجائے اُن کا جوڑ پیش کرنے لگے۔ مذہبی مباحث نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ اُن کی بنا پر انفرادیت نے فروغ پایا جو جدید فکر کی بنیاد ہے۔ انفرادیت میں جب سیاسی اور معاشی عناصر شامل ہو گئے تو وہ قوم پرستی کی نشوونما کے لیے طاقتور عوامل کا کام کرنے لگے۔ اس نقطہ نظر سے مذہبی تحریکات پر بحث جدوجہد آزادی کی تاریخ کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔

ہندو اور مسلم مصلحین میں بہت سے گروہ تھے جن کا سلسلہ اُن لوگوں سے لے کر جو قدامت پرست تھے اور کم سے کم تبدیلی کی وکالت کرتے تھے اُن تک پھیلا ہوا تھا جو قریب قریب سبھی رواجوں کو رد کرنے پر مائل تھے۔ یہ سب بلا واسطہ یا بلا واسطہ مغربی فکر سے متاثر ہوئے تھے۔ اُن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی پرورش قدیم اثرات کے تحت ہوئی تھی مگر اقتضائے زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے تھے۔ ہندوؤں کے ترقی یافتہ اور لیبرل گروپ میں مندرجہ ذیل شامل تھے۔ رام موہن رائے، رویندر ناتھ ٹیگور، کلچپ چندر سین، ایم۔ جی۔ راناڈے، ایٹھو چند دیا ساگر اور راج نرائن بوس اور مسلمانوں میں سید احمد خاں، امیر علی اور محمد اقبال۔ وہ گروپ جو سختی کے ساتھ قدیم روایت سے جڑا ہوا تھا وہ ہندوؤں میں مندرجہ ذیل پر مشتمل تھا۔ وایند سر سوتی، رام کرشنا پریم ہنس، دیویکانند اور بنکم چندر چٹرجی اور مسلمانوں میں اسی قسم کے فرقوں کے بانیوں پر جیسے اہل حدیث، اہل قرآن اور قادریانی۔

اس باب میں ہم ہندو مذہبی تحریکات کی وہ کہانی جاری رکھیں گے جو پچھلے باب میں شروع کی گئی تھی۔ اُس باب میں بتایا گیا تھا کہ یہ تحریک تین دھاروں میں بٹ گئی تھی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ تینوں دھاریں بھتی رہیں لیکن اُن کے بھاؤ کا زور کم زیادہ ہو تا رہا۔ کئی سال تک برہمنوں کی مقبولیت بڑھتی رہی۔ اُس کے بعد داخلی اختلافات مناقشات نے اُسے کمزور کر دیا اور اُسکی مقبولیت کم ہو گئی۔ بالآخر اُس کے ماننے والے ایک چھوٹا سا گروہ بن کر رہ گئے۔

لیکن رام موہن رائے کا لیبرل بنگال کی سرحدیں پار کر کے دوسرے علاقوں میں پہنچا اور اصلاح کی تحریکات کے لیے وہاں اُس نے میدان ہموار کر دیا۔

شدت پسندی نے ایک منظم نظام کی شکل اختیار نہیں کی لیکن مغرب سے متاثر لوگوں میں اُس پر یقین کرنے والے بہت سے تھے۔ اسکا اثر اب کی نہیںوں کے علاوہ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں محسوس کیا گیا۔

دوسری طرف وقت گزارنے کے ساتھ اور خاص طور سے 1870ء کے بعد رجعت پرستی نے متوسط طبقہ کے ذہن پر غلبہ حاصل کر لیا اور ملک میں بہت سی احیا پرستانہ مذہبی تحریکات نمودار ہو گئیں۔

حالانکہ یہ تحریکیں اس معنی میں کہ رجعت پرست تھیں کہ وہ قدیم ہندو مذہب کا پرچار کرتی تھیں لیکن قدیم مذہب کی نوعیت کے حقائق اُن میں اختلافات تھے۔ پھر قدیم عقائد، رسوم اور مذہبی فتنوں کو کس حد تک رد یا قبول کیا جانا چاہیے۔ اس کے بارے میں بھی اختلافات تھے۔ لیکن قریب قریب سبھی فضول ادھام پستی اور غیر معقول طریقوں کے خلاف تھے جو قرون وسطیٰ میں معرض وجود میں آ گئے تھے۔

II۔ برہموسماج

ہندوستان کی سرزمین کے مغربی تہذیب سے سیراب ہونے کے نتیجے میں جو نیا پودا اگا تھا اس کا پہلا پھل راس موہن رائے تھے۔ مذہبی معاملات میں ان کا طریق کار بڑی حد تک دانش مند تھا۔ جس سراج (برہمنو سراج) کو انہوں نے قائم کیا اس کی بنیاد معقول رویے پر قائم تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے وحدانیت کے جس اصول کو دریافت کیا اور فروغ دیا وہ ان کے انفرادی ذہن کی پیداوار تھا۔ جو اتنی ہی بہت رکھتا تھا کہ ہندوؤں کے عصری عقائد کی سماعت کر سکے۔ انچنانچہ ان کی برہمنو سراج طبقہ دانش وران کے ذہنوں کو متاثر کر سکی۔ ان کا خدا کے وجود کا اقرار و دی سے انکار، معقولیت پر مبنی اخلاقیات، سماجی، سیاسی اور معاشی معاملات میں مبدل رویہ، فکر و عمل کے میدان میں قرون وسطی کے طریقوں سے قطعی انکار اور سیکولر اور مذہبی معاملات میں امتیاز کرنے کا انداز۔ یہ دو باتیں تھیں جنہیں آسانی سے ہم سمجھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جہاں تک عمل کا تعلق تھا، ہر عبادت اجتماعی مطالعے، غور و فکر اور مراقبے پر مشتمل تھا جس میں وہ نگرہ تک لودیت استعمال نہیں کئے جاتے تھے جو عبادت کرنے والوں کی توجہ مرکوز کرانے کے لیے گر جاساں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی عبادت نگاہوں کے خشک ماحول میں پیروئے مذہب کا نمونہ آسان نہیں تھا۔

رام موہن رائے کے انتقال کے بعد دس سال تک جمود و کساد بازاری کا زمانہ رہا، اسکے بعد 1843ء میں رویندر ناتھ ٹیگور (رام موہن رائے کے شریک کار و دار کا ساتھ ٹیگور کے بیٹے) سماج میں شریک ہو گئے۔ انہوں نے سماج کی تنظیم نو کی۔ انہوں نے برہموبلیغین کو تربیت دینے کے لیے ایک اسکول قائم کیا جس کا نام تھا جوہدو مینی پانٹھ شالا، فلسفیانہ اور مذہبی مباحث کے لیے جوہود مینی پتریکا شروع کی۔ انہوں نے رکنیت کے ضابطے بنائے اور مذہبی کارکنوں کی تقرری کو منضبط کیا۔ برہمو اترار نامہ تیار کیا گیا جسکے ذریعہ اراکین خدا کے عبادت کرنے، اس سے محبت کرنے اور اس کے پسندیدہ کام کرنے کا مہمہ کرتے تھے اور خدا سے دعا مانگتے اور اس کی حمد و ثناء کرنے کے طریقوں کو رواج دیا گیا۔ ہندو متروں (برہم و حرم) کی بنیاد پر ایک مذہبی صحیفہ اور ایک دعاؤں کی کتاب تیار کی گئی۔ اس طرح سماج نے حیات نو پائی اور بہت ترقی کی۔ اُسکے مبلغین نے ہندوستان کے مختلف حصوں کا سفر کیا اور پنجاب سے شرفی بنگال تک اسکی شاخیں قائم ہو گئیں۔

چنانچہ 1843ء سے 1857ء تک اس مذہبی تحریک نے بڑی ترقی کی جسے رام موہن رائے نے شروع کیا تھا۔ 1857ء میں کیشپ چندر سین ساج میں شامل ہو گئے اور اپنی سرشت کے مطابق بڑے انہماک کے ساتھ کام کرنے لگے اس وقت تک کہ وہ ساج اپنے ابتدائی موقف سے بہت دور جا چکی تھی۔ رام موہن

رائے کی عقلیت پسندی اور انفرالویت کو ترک نہیں کیا کیا مگر ذہن کے دوسرے شعبوں اور انسانی تجربوں کو جنہیں انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا، فروغ دیا کیا اور ان کے مذہب کو انسانی صفات سے متصف کر دیا کیا۔ دعا اور خدا سے ہم کلام ہونے کے تصورات، زندگی کو وقف کر دینے کا تصور، خدا کے ساتھ محبت کرنے اور اس کی مرضی کے مطابق انسان کی خدمت کرنے کا تصور اور اس سے روشنی، روحانی تاثیر اور رحمت و برکت حاصل کرنے کا تصور مذہب کے جڑیں گئے اور اُسے وہ جذباتی رنگ عطا کر دیا جس کی اس میں پہلے کی کمی۔

لیکن تحقیق، اصلاح اور تبدیلی کا جذبہ جو بیدار ہو چکا تھا وہ دہندہ تاجھ کے اقرار نامے اور نظریوں سے مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے شروع تو اس سے کیا تھا کہ وہ غلطی سے پاک ہیں۔ لیکن جلد ہی انہیں اس نظریے کی عدم صحت کا علم ہو گیا اور انہوں نے ایک دفعہ پھر رام موہن رائے کی معقولیت پسندی کو قبول کر لیا۔ مذہبی علم حاصل کرنے کے ذریعے تھے فطرت اور وجدان، دہندہ تاجھ نے نہ صرف ویدوں کے صحیفہ آسمانی ہونے سے بلکہ کرم اور آداگون کے ہندو نظریات سے بھی انکار کر دیا۔ آئندہ برہمن سماج کی بنیاد ہونی تھی۔ ”انسانی دل جسے وہ روحانی علم روشنی دے گا جو اپنی حقیقت کو سمجھنے سے وجود میں آتا ہے۔“ (۱) لیکن ان کے دل میں قومی عزت کا اتنا شدید جذبہ تھا کہ زندگی بھر وہ ان کا ساتھ برطانوی حکومت سے فائدہ اٹھانے یا اس ملک کی بددستی حکومت کے نمائندوں سے کسی قسم کا تعاون کرنے سے بھی مسلسل انکار کرتے رہے راج نارائن بوس کے الفاظ میں ”دہندہ بابو عام طور سے یورپیوں سے ملنے سے بچتے ہیں اس لیے کہ ہندوستان کے معاملات میں وہ ان سے اتفاق رائے نہیں رکھتے، انگلستان اور ہندوستان میں ان کے خیالات کی حمایت کر کے ان سے متعارف ہونا آسان ہے۔ لیکن دہندہ بابو انگریزوں سے متعارف ہونے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ کرشنا مگر کالج کے پرنسپل شروپ نے ایک دفعہ لکھا تھا ”وہ خود در بزرگ یورپیوں کی تعریف کو بھی اپنے لیے کسر شان سمجھتے ہیں۔“ (۲)

دوسری طرف کیپٹ چندر سین کا پر جوش ذہن نے تصورات کی تلاش اور نئے تجربے کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ جلد ہی ان کیلئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ ہندو دھرم تک خود کو محدود رکھ سکیں۔ ۱۸۶۰ء میں انہوں نے سنگت سہا قائم کی جس میں ”ڈرگاپو جا“ کی طرح کی ہندو رسموں اور ذات پات کی طرح کے اداروں کی ضرورت پر بحثیں ہوتی تھیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں ترک کر دیا جانا چاہیے۔ ۱۸۶۱ء میں انگریزی تعلیم دینے کیلئے کلکتہ کالج قائم کیا گیا اور مشن کی سرکرمیوں کی نشر و اشاعت کیلئے انڈین میر دھاری ہوا۔

۱۸۶۴ء میں کیپٹ چندر نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ جدید ہندوستان میں ایک نظریاتی مذہبی انجمن قائم کرنے کی یہ پہلی اہم کوشش تھی۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں مدد اس میں وید سماج اور مہاراشٹر میں پرتھو سماج قائم کی گئی۔ اس دور ان کیپٹ چندر کی شدت پسندی نے سماج میں تبدیلی کی رفتار کو اتنا تیز کر دیا تھا کہ جلد ہی ان کے اور دہندہ تاجھ کے درمیان ہندو رواجوں اور ہندو مذہبی رویوں کے تعلق سے تصادم ہو گیا اس کی بنا پر ۱۸۶۰ء میں کیپٹ چندر برہمن سماج سے علیحدہ ہو گئے۔ اور ایک نئی انجمن قائم کر لی اس انجمن کے مقاصد تھے۔ ہندوستان کے سبھی برہمنوں کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں ایک ادارے میں مجتمع کرنا اور سبھی مذہب کی تعلیمات سے استفادہ کر کے برہمنو مذہب کے اصولوں کی تشکیل اس طرح

(۱) Studies in the Bengal Renaissance، تدوین رائے سی۔ کپتا، کلکتہ، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۶۷

(۲) پال، بی۔ سی۔ کے نیوٹرک بنگلہ میں درج، کلکتہ، ۱۹۱۴ء، صفحہ ۱۲۹

کرنا کہ وہ سب کے لیے قابل قبول ہوں۔ یہ اہم بات ہے کہ اُس نے اپنے لیے ”بھارت در شہ برہمو ساج“ کا نام منتخب کیا۔ دیندر ناتھ کی انجمن ”آدی برہمو ساج“ یا ”اصل برہمو ساج“ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

ساج کے پہلے بنوارے کے کچھ برسوں بعد دوسرا بنوارہ ہوا۔ ابتدا سے نئے ساج کو کیپٹ چندر نے مسور کر رکھا تھا۔ جن کا جوش اور ذہنی صلاحیتیں بنگال کے نوجوانوں کے لیے بڑی کشش رکھتی تھیں۔ لیکن اُن کی روح بے چینی سے عبارت تھی۔ 1870ء میں وہ انگلستان گئے اور ساج اصلاح اور سماجی بھلائی کے کاموں کے لیے اور زیادہ جوش لیکر واپس آئے 1872ء میں انہوں نے حکومت کو اس پر آمادہ کر لیا کہ برہمو میرج ایکٹ کو قانونی شکل دی جائے جس کی رو سے برہمو طریقے سے کی جانے والی شادیاں جائز قرار دے دی گئیں۔ اس کی بنا پر ہندوؤں سے اُن کا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا۔

اس دوران کیپٹ چندر کے ذہن میں نئے تصورات جنم لیتے رہے۔ ایک طرف تو عیسائیت اُن کے لیے بڑی کشش رکھتی تھی دوسری طرف ویشنو مذہب کے ماننے والوں کی بھگتی سے وہ بہت متاثر تھے۔ اوتار کے تصور نے، جو ان دونوں مذہب میں پایا جاتا ہے۔ اُنہیں اس پر آمادہ کر دیا کہ وہ مذہب کے سرچشمہ میں فطرت اور وجدان کے علاوہ الہام کا اضافہ بھی کر دیں۔ وہ اب متا جاتوں یعنی خدا کی حمد و ثناء اور کیرتن میں زیادہ وقت صرف کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ بات اُن کے ذہن میں جلد چڑھتی گئی کہ وہ خدا کے پٹا مبر ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے۔ کیپٹ چندر جو ابھی تک با اختیار سربراہ کی حیثیت سے ساج پر حکمرانی کرتے تھے۔ اب اپنے اعمال کو من جانب اللہ قرار دینے لگے۔ اس کی وجہ سے اُن کے پیروؤں کا ایک گروہ اُن کی مخالفت کرنے لگا۔ 1878ء میں اُن کی بیٹی کی شادی کوچ بھار کے کم عمر مہاراجہ کے ساتھ ہوئی۔ اُس وقت دو لہا اور دلہن دونوں کی عمر کم تھی۔ یہ شادی 1872ء کے برہمو میرج ایکٹ کے دفعات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہندو رسوم کے مطابق کی گئی۔ اس نے اُن کے مخالفین کو بہت ناراض کر دیا۔ اور وہ سب کے سب ساج سے علیحدہ ہو گئے۔

علیحدگی اختیار کرنے والوں نے ایک نئی تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کا نام تھا: ”سادھارن برہمو ساج“ اُس کے رکن صرف وہی لوگ بن سکتے تھے جو ہر قسم کی بت پرستی سے بچیں، ذات پات کے نظام کو رد کریں عورتوں کی آزادی کی حمایت کریں، تمام گھریلو رسموں میں برہمو طریقوں پر عمل کریں اور ساج نے جو نیا مسلک بنایا تھا اُس پر عمل پیرا ہوں۔ برہمو ساج کے وہ نوجوان ہیر و دیاسی تحریکات میں بڑھ کے حصہ لیتے ہیں جنہوں نے ”سادھارن برہمو ساج“ قائم کیا تھا۔

سب تاہم شاستری کی قیادت میں انہوں نے ”اعلان کیا کہ وہ آزادی میں یقین رکھتے ہیں۔ بدیسی حکومت کے تحت ملازمت نہ کرنے کا عہد کرتے ہیں لیکن اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ ملک کے خصوصی حالات کے پیش نظر وہ پرامن طریقوں سے کام کریں گے“ انہوں نے عوامی جمہوریت کے جھنڈے کے نیچے (1) دنیا کے سب لوگوں کی آزادی کے لیے بھی کام کیا۔ اُن میں اہم ترین شخصیت تھی سر بندر ناتھ بنرجی کی جو بعد میں بنگال کے بے تاج بادشاہ بن گئے تھے۔

کیپٹ چندر کے لیے یہ بنوارہ بڑی آزمائش کا حکم رکھتا تھا لیکن اس کے بعد انہوں نے ایک دفعہ پھر عہد کیا کہ ساج میں زیادہ روحانیت اور اصلاح کا زیادہ جوش پیدا کر کے اُس کو نئی توانائی عطا کریں گے۔ انہوں

نے اپنے نئے مشن کی اشاعت کی جسے انہوں نے نوودھان یا سنہ دستور کا نام دیا تھا اس کی خاص خاص باتیں تھیں۔ (1) مذہب کے باطنی پہلو پر زور دیا جائے اور (2) عیسائی اور ہندو نصب العین اور طریق استخراج کی کوشش کی جائے۔ انہوں نے بارہ چیلوں پر مشتمل ایک گروپ بنایا جنہیں وہ خدا کی طرف سے مقرر کئے جانے والے "خواری" کہتے تھے۔ اور مردوں اور عورتوں کا ایک طبقہ بنایا جن سے بڑے سخت عہد لیے جلتے تھے۔

ایک طرف تو وہ کہتے تھے کہ "سچ ایک مثالی انسان تھا اور اس کے معنی ایک مثالی خدا پرست تھا کہ اُس نے قرب الہی کا وہ اعلیٰ منصب حاصل کر لیا تھا جب روح فانی اللہ ہو جاتی ہے" وہ اُسے ایسی تصور کرتے تھے۔ دوسری طرف وہ رام کرشنا پر مفس کے اثر میں تھے، جن سے انہوں نے سیکھا تھا کہ خدا کو ماں سمجھا جائے جو انسان اور پوری کائنات کی لطیف و جمیل فیض رساں ہے۔

کیوبچندر کی خواہش تھی کہ اُن کا "نیانڈہی دستور" ایسا ہو کہ وہ "تمام مقدس کتابوں، نبیوں اور مذہبی نظاموں میں ہم آہنگی" کی مثال ہو۔ یہ بھی کوشش کی گئی تھی کہ باطنی مظاہر اور کرداروں کو شعوری حقائق میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ انسان معروضی بلویت کو نہ صرف ذات بلکہ کردار کے طور پر بھی اپنے دل میں محسوس کر سکے۔ اُن کی زندگی کے آخری ایام اپنی مذہبی انجمن کے عقائد، رسوم اور تنظیم کو سدھارنے میں گزرے مذہب کے میدان میں اُن کی یہ کوشش بڑی مہیت کی حامل ہے کہ عیسائی مغرب اور ہندو ہندوستان کے تصورات میں دو ایک شعوری استخراج پیدا کرنا چاہتے تھے۔

1884ء میں اُن کے انتقال کے بعد تینوں سہجوں میں سے کسی ایک میں بھی اُن کی قد آور شخصیت کا کوئی رہنما باقی نہیں رہا۔ لیکن تمام مذہب کے اچھے عناصر پر مشتمل کیوبچندر کا مذہب اُن کے تعلیم یافتہ ہم وطنوں کو متاثر کرنے میں ناکام رہا۔ اور برہم ساج کی توسیع کا عمل رک گیا۔ 1911ء میں ہندوستان میں 183 برہم ساج تھے۔ جن کے اراکین کی مجموعی تعداد تھی 5504۔

حالانکہ اُن کی تعداد کم تھی مگر برہم ساج پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ پہلی دفعہ ایک جدید مذہبی تحریک نے، جس کو متوسط طبقے کے دانش ور دن نے شروع کیا تھا۔ پورے ہندوستان میں بکھرے ہوئے پیردوں کو متحد کرنے کی کوشش کی جہاں تک تعداد کا تعلق ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں ساج نے بڑی کامیابی حاصل نہیں کی لیکن سماجی اصلاح کی تحریکات پر اُس کا بڑا اثر پڑا اور حب وطن کے جذبات کو بیدار کرنے میں ساج نے اہم رول ادا کیا۔

قوم پرستی کی نشوونما میں برہم ساج کی کاوشوں کا جائزہ پین چندر نے ان الفاظ میں لیا ہے۔ "کیوبچندر کی قیادت میں برہم ساج نے ذاتی آزادی اور سماجی مساوات کے لیے مقدس اصولوں کا اعلان کیا۔ جسکا شدید رد عمل نئے بنگال کی تشکیل، قومی شعور اور نئی سیاسی زندگی اور توقعات پر ہوا۔ اپنے سیاسی مالکوں کی برتری کے مفلوج کن احساس کی جگہ بین طور سے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک نیا اعتماد پیدا ہونے لگا۔" (1)

سماجی اصلاح کی تحریک کے اہم رہنماؤں میں راجن رائے (1826، 1899ء) شامل تھے جو ایک وسیع انظر عالم تھے اور فارسی زبان و ادب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے سائنس ان دیلیجنٹ لکھی جو برہم ساجیوں کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث تھی۔ برہم پبلک انجین لکھا "مختصر ایہ ان کی دیانت ہے۔" (2) وہ

کیپ چندر لور ان کے ان چیلوں کے سخت مخالف تھے جو کیپ چندر کو خدا کا واثق ثابت کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے برہمنوں کی ساج اور ہندو دھرم کی یکسانیت پر زور دیا۔ وہ صرف یہ کہتے تھے کہ برہمنوں کی شکل میں ہندو دھرم اپنی ترقی کے سلسلہ میں ایک نیا چیل ہے۔

انہوں نے قومی احساس کو فروغ دینے کے لیے ایک انجمن قائم کی جس کے مقاصد تھے ہندوستانی ورزوں کے ذریعہ نوجوانوں کی محنتوں کو بہتر بنانا، اسکولوں کے ذریعہ ہندو موسیقی، طب، سنسکرت زبان اور قدیم علوم کو ترقی دینا اور بدھ مت، سکھ مت اور جوں، طریقوں اور زبان کی جگہ انکی ہندوستانی شکلوں کو رواج دینا، زندگی کو ہندوستانی بنانے کی تحریک کو مقبول بنانے کے لیے انہوں نے 1867ء میں ”ہندو میلے“ کی بنیاد ڈالی اور نیشنل سوسائٹی قائم کی۔

الٹور چندر دیا ساگر (1820ء-1891ء) مذہبی مصلح ہے زیادہ تعلیمی ماہر تھے۔ وہ سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور 1850ء میں کلکتہ کے سنسکرت کالج میں پروفیسر اور ایک سال بعد پرنسپل کے عہدے پر فائز ہو گئے انہوں نے انجمن انڈیپنڈنٹ اسکولز کے فرائض بھی سر انجام دئے۔ 1858ء میں انہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا لیکن تعلیمی معاملات میں غیر رسمی طور سے وہ حکومت کو مشورے دیتے رہے۔

جدید تصورات کو فروغ دینے کے لیے سنسکرت کالج میں انگریزی تعلیم کو رواج دیکر انہوں نے سکولر نقطہ نظر پیدا کر رکھی رام موہن رائے کی کوششوں کو تقویت پہنچائی۔ انہوں نے تعلیمی کونسل کو لکھا تھا۔ ”کچھ وجوہ کی بنا پر..... ہم سنسکرت کالج میں ویدانت اور سکھیت کی تعلیم دینے پر مجبور ہیں۔ اب اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا ہے کہ ویدانت اور سکھیت فلسفے کے غلط نظام ہیں۔ یہ نظام غلط ہونے کے باوجود ہندوؤں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ سنسکرت نصاب میں ہم انہیں پڑھاتے رہیں لیکن انگریزی نصاب میں صحیح فلسفے کی تعلیم دیکر ہمیں ان کا اثر کم کرنا چاہیے۔“ (1)

بنکال کے ساج کو جدید شکل دینے کے لیے انہوں نے کئی سماجی اصلاحوں کی وکالت کی۔ جن برائیوں پر انہوں نے حملے کئے وہ تھیں کثرت ازدواج، بچوں کی شادیاں اور بیواؤں کی شادیوں کی ممانعت، یہ ان کی کوششوں اور کچھ دوسرے بااثر لوگوں کی حمایت کا نتیجہ تھا کہ انجمن قانون ساز نے 1856ء کا ایکٹ منظور کیا جس کی رو سے ہندو بیواؤں کی شادیاں جائز قرار دی گئیں۔ انہوں نے اصلاحات کی وکالت کے جوش میں مذہبی احکام کو رد نہیں کیا بلکہ ان پر زور دیا جو جدید حالات کے لیے موزوں ترین تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے پربھار سکھ کا انتخاب کیا۔ (2)

بیوہ، وڈو اور بالیہ، وڈو دوش کی طرح کی کتابچوں کے ذریعہ ان کی پُر زور حمایت کے باوجود بد قسمتی سے وڈو دوسری سماجی اصلاحات نہ کی جاسکیں جن میں انہیں دل چسپی تھی یعنی کثرت ازدواج اور بچوں کی شادیاں۔

مورتوں کی آزادی کے کام میں ان کی پیش قدمی کی بنا پر ان کا تعاون ڈاکٹر وائٹ جھون سے ہوا اور مورتوں کے لیے جھون کالج اور دوسرے اسکولوں کا قیام عمل میں آیا۔

(1) ہندو پادھیائے، بی۔ این۔ الٹور چندر دیا ساگر، کلکتہ، 1943ء، صفحات 136-131

(2) الٹور چندر دیا ساگر، وڈو دوش، کلکتہ، 1872ء، دیا ساگر گرنتھ ہالی، تدوین، سنیت کمار چندر پادھیائے، بی۔ این۔ ہندو پادھیائے اور

ایس۔ کے۔ داس، کلکتہ، 1838ء، صفحات 29-23

III۔ پرار تھنا سبھا

جدید ہندوستان کی پہلی تبلیغی تحریک تھی برہمنو سماج اور ملک میں نئے مذہب کی تبلیغ کرنے والا سبھا مسلح تھا کیپ چندر۔ جب 1864ء میں وہ بمبئی گئے تو ان کا پیغام قبول کرنے کے لیے میدان پہلے ہی تیار کیا جا چکا تھا۔ اس قسم کا ایک تعلیم یافتہ متوسط طبقہ اس پریسڈنسی میں بھی جنم لے چکا تھا جیسا بنگال میں پایا جاتا تھا وہ مغربی تصورات کو قبول اور انگریزی تعلیم کو حاصل کر رہا تھا اور اس نے مذہبی اور سماجی اصلاح کی ضرورت محسوس کر لی تھی اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ”پرہنس سبھا“ کی طرح کی انجمنیں عیسائیت کا مقابلہ کرنے کے لیے قائم کی جا چکی تھیں۔

1867ء میں کیپ چندر کے دورے کے نتیجے میں ”پرار تھنا سبھا“ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے خاص خاص عقائد خدا پرستی پر مبنی تھے اور اس کا مقصد سماجی اصلاح۔ جب ایم جی راناؤے اور آر۔ جی بھنڈارکر کی طرح کی اہم شخصیتیں اس میں شامل ہو گئیں تو اس کی حیثیت اور طاقت بڑھ گئی اور سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس انجمن کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے ایک اخبار سودھ پتر نکالا شروع کیا گیا اور محنت کش طبقے کو تعلیم دینے کے لیے ایک شینہ مدرسہ قائم کیا گیا۔ 1882ء میں سماج نے تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ایک باصلاحیت مرہٹہ خاتون پنڈتارام بائی نے ”آریا مہیلا سماج“ قائم کرنے میں بڑی مدد کی۔ جلد ہی کچھ روشن خیال اور تعلیم یافتہ اشخاص اس انجمن میں شامل ہو گئے اور سماجی اصلاح اور سماجی بہبود کے کاموں کو تقویت پہنچائی۔

اس سماج کے اصلی معیار تھے مہاویر گوند راناؤے (1882ء-1901ء) جو انیسویں صدی کے ہندوستان کے سب سے زیادہ قد آور دانش ور تھے۔ وہ ایک اچھے طالب علم، سچے استاد اور باصلاحیت اور ایماندار جذبہ فیل افسر تھے جو ہندوستان کے اعلیٰ ترین عدالتی مہدے تک پہنچنے کی دلچسپیاں وسیع تھیں اور قومی زندگی کے ہر اہم پہلو پر ان کی نظر رہتی تھیں۔ لیکن سب سے زیادہ انہیں مذہبی اور سماجی اصلاح سے دلچسپی تھی چالیس سال تک وہ ان خرابیوں اور اوہام پرستوں کے خلاف بڑی ثابت قدمی کے ساتھ جنگ کرتے رہے جن پر ہندوستانی سماج کی ناگفتہ بہ حالت کی ذمہ داری تھی۔

مذہب اور سماج کے مسائل کے تعلق سے راناؤے کا نقطہ نظر معقول تھا لیکن وہ آنکھیں بند کر کے مغرب کی تقلید کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اور مغربی فکر کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرنے کے خلاف تھے۔ انہیں اس پر تازہ تھا کہ وہ ہندو ہیں اور خود کو بھگوت گیتا کے پیروں میں تصور کرتے تھے انہوں نے اپنے ذہن کو ایسے تمام عقائد سے پاک کر لیا تھا جو عقل سے ثابت نہیں کئے جاسکتے تھے وہ ہندوؤں کی علیحدگی پسندی کی مذمت کرتے تھے۔ اور انہیں تلقین کرتے تھے کہ وہ پوری انسانیت کو اپنے گلے سے لگائیں وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوؤں کو تیاگ اور دنیا کی طرف حقارت آمیز رویے کو ترک کر دینا چاہیے، سماج میں اپنے فرائض پورے کرنے چاہیے، املاک کی پیدا کردہ آسودہ خاطر سے گریز کرنا چاہیے اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ راناؤے نے اپنے ہندو دھرم کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن یہ ہندو دھرم مشہور و زائد سے پاک تھا۔ اور خدا پرستی کے جدید فلسفے کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی تھی۔ راناؤے نے ہندو

وید ایک فلسفے کی فکری تشریح کو رد کر دیا جس کی بنیاد اصنام پرستی پر قائم تھی اور دشنورام پنچ اور دور و سطلی کے مرہٹہ سنتوں کی خدا پرستی پر جتنی تشریح کو قبول کیا۔ انہوں نے کہا ”دوسرے تمام نظاموں کے مقابلے میں اُن کے یہاں خدا پرستی کا بہتر اور زیادہ حقیقی تصور پایا جاتا ہے۔ (1) اُن کی نظر میں ”بھگتی تحریک“ بت پرستی کے بجائے حقیقی خدا پرستی کی تحریک تھی۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے۔ مذہب کی سچائی کا انحصار منطقی مقدمات کے بجائے عرفانی سچائی پر ہوتا ہے۔ جس طرح سائنس کا انحصار منطقی نتائج کے بجائے فطری قوانین کے تسلسل اور یکسانیت پر ہے۔ خدا پرستی کی موافقت میں جس قسم کی دلیلیں انہوں نے پیش کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سوال پر مغربی فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا تھا لیکن اس میں شک ہے کہ انہوں نے اُن کی علم کائنات، علم نباتات اور علم الوجود کے متعلق دلیلوں، شہوتوں اور تردید کی باریکیوں کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا تھا خدا پرستی کے متعلق اُن کے تصورات اُن اُنتالیس دفعات میں پیش کئے گئے ہیں جو انہوں نے ”مذہب کے متعلق ایک خدا پرست کا اعتراف“ کے عنوان سے ترتیب دیے تھے۔ خاص خاص اصولوں کی شکل میں اُن کی تلخیص ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

(1) قابل پرستش محض خدا ہے۔ وہ مالک، بامقت اور اخلاقی حاکم ہے۔ خدا واحد ہے۔ اُس کا ثانی کوئی نہیں ہے۔ وہ کئی ذاتوں پر مشتمل نہیں ہے سہلیت نہیں ہے یاد ذاتوں کا مجموعہ نہیں ہے وہ خالی اور روحانی دنیا میں رہنے والا خود میں جذب برہما نہیں ہے (2) اُس کے علاوہ اور کوئی دیوتا نہیں ہے اور بت پرستی حماقت ہے اُسکا کوئی اوتار نہیں ہے۔ لیکن وہ فطرت انسانی اور تاریخ میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔

(2) کائنات خدا کی تخلیق ہے اور حقیقی ہے وہ محض قرین نظر ہے۔ مادیہ کا جود، حرکت اور زندگی خدا کی دین ہے۔ (3) لیکن دنیا کی ابتداء انسان اور خدا، انسان اور کائنات کے رشتے کے مسائل پر اسرار اور ناقابل حل ہیں۔

(3) انسان کا حراج روحانی ہے۔ اُسکی روح مادی نہیں ہے روح ابدی ہے وہ خدا کے مشابہ ہے نہ اس کا ظہور و صیغ بہت سی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک میں استدلال کرنے خوش کرنے اور صبح اور غلط میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہے۔ وہ آزاد ہیں اور اپنے مال کی ذمہ دار۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی نظم و ضبط اور دکھوں کی زندگی ہے جسے آئندہ زندگی کی تیاری کی زندگی سمجھنا چاہیے لیکن آئندہ کیا ہو گا یہ کسی کو نہیں معلوم ہے صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ایک محد دو زندگی کے گمانوں کی ابدی سزا نہیں ہو سکتی ہے۔ کوئی ابتداء گناہ نہیں ہے اور کسی شخص کی قسمت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ دوزخ میں جائے گا یا جنت میں۔

خدا کے ساتھ انسان کا رشتہ انسان کے آمیزہ تصور اور اُس کو حاصل کرنے میں بتدریج ترقی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں دعائیں، قرب خداوندی، ایچھے اور پاکیزہ لوگوں کی صحبت استغفار اور پاکیزگی ضروری ہے۔ عبادت گاہوں میں مل کر عبادت کرنا اور زندگی کے اہم سنگ میلوں کا جشن منانا معاون ہوتا ہے لیکن یتاگ و ترک، گردوں کی حمد و ثناء اور نجات و بندوں اور مجزوں میں یقین بالکل ضروری

(1) مذہب اور عائنی اصلاح۔ مہاروی گووند راتڈے کے مضامین اور تقریر کا مجموعہ جسے ایم جی کولاسکر نے ترتیب دیا، بمبئی 1902ء صفحہ 12

نہیں۔ تمام دوسری باتوں کے مقابلے میں ضمیر کی فرماں برداری سب سے زیادہ اہم ہے اس فرماں برداری کی تحریر صرف اخلاقی امور اور دوسرے لوگوں کے مسلولی حقوق کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔ اخلاقی قانون کے تحت سب مرد اور سب عورتیں برابر ہیں۔ اور انسان کا سب سے بڑا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام تر خلوص دل اور ایمان کے ساتھ انسان سے اور خدا سے محبت کرے۔ اخلاقی عمل جس منزل کی طرف انسان کو لے جاتا ہے وہ ہے جسم کی تہذیب اور خواہشات نفسانی سے نجات حاصل کرنا۔

ان مذہبی عقائد نے سماجی اصلاح کے راتا ڈے کے تصورات کو جنم دیا چونکہ انسان ایزدی خصوصیات کا حامل ہے اور سب انسان برابر ہیں اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ کہ انسانی سماج جو خدا کی بخشی ہوئی سماجی شکست کا نتیجہ ہے۔ اُس میں ایزدی قدر حیات ہونی چاہیے چنانچہ انسان اور سماج کی طر فی اخلاقی ترقی ہے جس کے معنی ہیں کہ اُن تمام رواجوں، اداروں اور کام کے طریقوں کو دور کیا جانا چاہیے جو اس عمل میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور انسان کے ایزدی مزاج کی نفی کرتے ہیں۔

اگر راتا ڈے قدیم ویدک مذہب پر فخر کرتے تھے یعنی انہوں نے جس طرح اُسے سمجھا اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں پیش کیا تھا تو اسی کے ساتھ اُن کا یہ خیال بھی تھا کہ موجود زمانے میں ہندو سماج جن لوہم پرستان، رسوں اور غیر معقول اور غیر انسانی رواجوں کا شکار ہو گیا تھا وہ ”قدیم معیاروں سے دوری کا حکم رکھتی ہیں جن کے لیے آپ قدیم قانون سازوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے وہ انسان کے کارنامے میں، انسانی کمزوریوں کے شاختانے میں یعنی قدیم صحت مند ضوابط کی جگہ غلط طریقوں نے لے لی ہے۔“ (1)

لیکن وہ چاہتے تھے کہ تاریخی دلیل کو اُن کے مخالف غلط طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اصلاح کے تصور کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ اور عقل سے اُس کا جواز پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ ”اصلاح اصل میں نجات دلانے کا عمل ہے ایک برتر مذہب، قانون، نظام سیاست کے اداروں اور رواجوں پر خود غرضانہ عوامل کی غیر انسانی طاقت کے دباؤ کے سامنے ہم جس طرح جھک گئے ہیں اُس کی پیدا کردہ بندشوں سے نجات۔“ (2) اپنے خطبے ’احیا اور اصلاح میں انہوں نے کہا“ اگر حقیقی اصلاح کی خواہش ہے تو نہ صرف ظاہری شکل بلکہ اندرونی شکل یعنی اُس خیال و تصور کو بھی تبدیل کرنا ہو گا جو ظاہری شکل کا تعین کرتے ہیں۔“ (3) بنیادی تصورات جن میں تبدیلی کی ضرورت تھی وہ تھے۔ ”علیحدگی پسندی، ضمیر کی آواز کے بجائے بیرونی طاقت کی فرماں برداری، وراثت کی بنیاد پر انسان اور انسان میں تفریق کرنا، غلط طریقوں اور غلط اعمال کے سامنے سر جھکا دینا اور سیکولر ہستیوں کی طرف سے ایسی غفلت برتنا کہ اسے تن یہ تقریر سے کیا جاسکے۔ اس کے بعد انہوں نے ان نقوشوں میں کہا کہ اپنے ضمیر کی طرف مرد کی ذمہ داری کیا ہے۔

”ماضی اور حال کے بڑے اور صاحب فہم لوگ ہمارے احرام کے حقدار ہیں لیکن انہیں ہمارے اور خدا کے بیچ حائل نہیں ہونا چاہیے یعنی اُن ایزدی اصولوں کے جو ہم میں سے ہر چھوٹے بڑے انسان کے اندر پائے جاتے ہیں عزت نفس بلکہ یوں کہے خدا کی عزت کے احساس کو پروان چڑھایا جانا چاہیے۔ لیکن اس نازک پودے کی نشوونما تہذیبوں میں ہو پاتی ہے۔ ہم اس کام کو کرنے کی صلاحیت رکھتے

ہیں۔ اور خود اپنی ذات کے تعلق سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کام کو سرانجام دیں۔“ (1)

ماضی کی طرف دیکھنے کی تحقیق انہوں نے ایک زمانے میں کی تھی۔ لیکن اُس کی کمزوری اُن پر عیاں ہو گئی۔ اور انہوں نے احیاء پرستوں کے خلاف، جو قدیم ادواروں اور رواجوں کی وکالت کرتے تھے۔ شدید طعن و طنز کا حربہ استعمال کیا۔ ہم کس چیز کا احیاء کریں؟ کیا ہمیں اُن قدیم لوگوں کی عادتوں کا احیاء کرنا چاہیے جب ہماری ذاتوں میں سے سب سے زیادہ مقدس ذاتوں کے لوگ اُن کے مرتکب ہوتے تھے۔ جنہیں ہم اب بدتر اعمال سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جانوروں کا گوشت کھانا اور شراب پینا کیا ہمیں بارہ قسم کے میٹوں اور آٹھ قسم کی شادیوں کا احیاء کرنا چاہیے جن میں بالجبر پکڑ لیا بھی شامل تھا اور ملے جلے اور ناجائز جنسی تعلقات کو حلیم کیا جاتا تھا کیا ہمیں جانوروں کی اُس مذہبی قربانی کا احیاء کرنا چاہیے جو سال کے ایک سرے سے دوسرے تک جاری رہتی تھی اور جس میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کو بھی قربان کر دیا جاتا تھا۔ کیا ہمیں بائیس ہاتھ کی شقی پوجا کا احیاء کرنا چاہیے جس میں ناشائستہ حرکتیں کی جاتی تھیں اور عمل عیاش کا مظاہرہ کیا جاتا تھا؟ کیا ہمیں سستی، بچوں کو مار دینے کے رواج، زندہ لوگوں کو دریا میں بھینک دینے، چٹانوں پر کرانے، کانٹوں میں لٹانے یا جھگن ناتھ کے رتھ کے نیچے داب دینے کا احیاء کرنا چاہیے۔ (2)

اس سلسلے میں اہم ترین سوال یہ تھا کہ ماضی کے کس دور کا احیاء کیا جائے سماج ایک جسم نامی ہے جس میں لگاتار تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ دستور بدلتے رہتے ہیں اور ادواروں، قانونوں، رواجوں مذہبی تصوروں اور عقیدوں میں ترمیم و تحریف ہوتی رہتی ہے۔ جو مرنے کے بعد دفن کر دئے جاتے ہیں یا جلادئے جاتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں اور اسی لیے اُن کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا (3)۔ ماضی کو صرف ایک نئے جسم نامی کی شکل دی جاسکتی ہے اور اُس کو سماجی اصلاح کہتے ہیں۔

جن اصلاحات کی انہوں نے متواتر مسلسل وکالت کی اُن میں مندرجہ ذیل اہم ترین تھیں انسانوں میں برابری اور مساوات قائم کرنا جس میں ذات پات کی تقسیم اور مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیاہ کرنا شامل تھا، بچوں کی شادی کی مخالفت، بیواؤں کی شادیوں کے تعلق سے قانون بنانا، عورتوں کو پردے میں رکھنے کی مخالفت اور تعلیم نسوان کی ترقی۔ اس کے علاوہ ایسے تمام غیر معقول اور ظالمانہ رواجوں اور طریقوں کو منسوخ کرنا جو انسان کی تذلیل کا باعث ہیں۔ مختصر اُکھا جاسکتا ہے کہ سماجی اصلاح کا مقصد تھا فرد کی طہارت اور خاندان، گاؤں قبیلے اور قوم کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا عمل۔

رانا ڈے نے مذہب اور سماج کے تعلق سے جس فلسفے کی بنیاد ڈالی وہ مغربی نظریے سے مملو تھا۔ اس کے علاوہ کہ انہوں نے خدا پرستی، انسانی مساوات، سماجی آزادی، تیاگ و شہاس کی مخالفت اور عمل پندیری کے تصورات مغرب سے حاصل کئے تھے۔ ایک اور قابل قدر چیز مغرب سے انہوں نے مستعدی تھی اور وہ تھی فرد اور سماج کے مسائل کے تعلق سے دانش ورانہ طریق عمل۔ ان کا ردیہ معروضی اور ناقدانہ تھا اور اُن کا طریق کار بڑی بڑی حد تک تاریخی اور حسب ضرورت انتہائی تھا، اصلاحات کی کوشش کی بنیاد ترقی کے تصور میں اُن کے یقین پر قائم تھی۔ لیکن اُن کے نزدیک ترقی کے معنی محض مادی ترقی بلکہ

(1)۔ ایضاً

(2) ایضاً صفحات 71-170

(3) ایضاً صفحہ 171

علم کی ترقی ہی نہیں تھی۔ وہ ترقی کے معنی اخلاقی اور روحانی ترقی سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال یہ بھی نہیں تھا کہ ترقی انسانی صلاح کی طرف ایک راہ مستقیم نہیں ہے مثال کے طور پر ہندوستان کے ماضی میں ایسے کئی دور گزرے جو آج کے مقابلے میں مادی اور اخلاقی اعتبار سے زیادہ شاندار تھے۔ جو زمانہ بعد میں آتا ہے۔ وہ لازمی طور سے گزشتہ زمانے سے بہتر نہیں ہوتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی ملک کی تاریخ کا کوئی زوال پذیر دور ایک مستقل زوال اور ناقابل اصلاح تنزل کا پیش خیمہ ہو۔ اُن کا خیال تھا کہ ترقی نام ہے سماجی زندگی کی پیش رفت کا جس میں فرد ایک آزاد آلہ کار کا رول ادا کرتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ برہمن اصولوں کا اطلاق کر کے رٹاؤے اس نتیجے پر پہنچے کے مدح خشیب و فرار اور امن و استحکام کے بعد انتشار و بد نظمی کی داستان ہے۔ جس کا سبب ہے اخلاقی گروٹ اور جلد جلد پیر و بی و مداخلت۔ ہر حال میں خدا اپنے کرم اور فضل کے لیے انسانی ضمیر کو استعمال کرتا ہے۔ اور ہر نیر اواقعہ خدا کی مرضی سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے تعلق سے اُن کا کہنا ہے۔

”اس بات کو آسانی سے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ خدا کی یہ مرضی تھی کہ اس ملک میں رہنے والی اس بڑی آبادی کو ایک غیر ملکی حکومت کے اثر اور قید میں صدیوں تک رکھا جائے جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ اس اثر و قید کا مقصد تھا لوگوں کے کردار میں وہ چٹنگی پیدا کر کے اُن کی بڑی خدمت سرانجام دینا جس کا ہندوستان کی نسلوں میں بہت فہدان تھا۔“ (1)

”اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی حکومت کی بنا پر زوال اور بددیانتی کا شکار ہونے کے بجائے جب اسکی عتبات اُن مسلمان اور ہندو سیاست دانوں کے ہاتھوں میں تھی جو رد و اداریوں اور مساوات کی پالیسی پر عمل کر کے ملک کو خوش حال بناتے تھے، مقامی نسلوں نے طاقت حاصل کی۔ اشوک کے بعد قدیم ہندو خاندانوں میں وہ طاقت باقی نہیں رہی تھی جو اتحاد کی دین ہوتی ہے اور ان پر آسانی سے مسلمان حملہ آوروں نے غلبہ حاصل کر لیا۔“ (2)

اس کا ذکر کرنے کے بعد کہ ”دوسرے سینکڑوں طریقوں سے مسلم حکومت نے ہندوؤں کے طور طریق اور مذاق میں غفارت پیدا کرنے میں مدد دی۔“ (3) انہوں نے کہا کہ ”اس میل ملاپ کے زیادہ دور رس نتائج یہ ہیں کہ اُس نے لوگوں کے مذہب اور تصورات کو بہتر لہجہ عطا کر دیا۔“ (4)

آخر میں انہوں نے کہا ”مگر ماضی کے درس کی کچھ قدر وقاحت ہے تو ایک بات واضح ہونی چاہیے یعنی اس وسیع ملک میں کسی ترقی کا امکان اُس وقت تک نہیں ہے جب تک ہندو اور مسلمان مل کر کام نہ کریں اور ان لوگوں کی تقلید کرنے کا ہم ارادہ نہ کر لیں جو اکبر کے زمانے میں اس کے صلاح کار اور مشیر تھے اور ان غلطیوں سے بچنے کی امکانی کوشش نہ کریں جو اس کے پر پوتے اور تنگ ذہب نے کی تھیں۔“ (5)

رٹاؤے کی نظر میں ہندوستان کے مستقبل کی تصویر کشی ایک ایسی بڑی قوم کی تصویر جو اپنے ماضی پر فخر کرنے کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق ایک روشن مستقبل کی طرف گامزن ہو، جس میں مساوات اور آزادی کے تصور زات بر متحد ہو کر ثابت قدمی کے ساتھ عمل کیا جائے، جو سماجی خرابیوں سے پاک ہو اور ضمیر و اخلاق کی آواز جس میں حرکت پیدا کرتی رہے۔

(1) مرحوم آرتھل سنر: سنس۔ اینک۔ دی۔ لٹ۔ کی متفرق تحریریں، تاثر سنر، ام ہل، دہلی، 1910ء، صفحات 221-219

(2) اینا، صفحہ 223 (3) اینا (4) اینا، صفحہ 224 (5) اینا، صفحہ 226

IV۔ وید سماج

بنگل میں جو اصلاح کی تحریک شروع ہوئی تھی اُسے کیسپ چندر سین نے مہاراشٹر اور تامل ناڈو تک پہنچا دیا۔ 1864ء میں وہ اس گئے اور اپنی پراثر تقریروں کے ذریعہ انہوں نے لوگوں کو وید سماج قائم کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس سماج کی سرپرستی میں ہر ہفتے پراختہا سہائیں ہوتی تھیں۔ اور اس کے نظریات کا پرچار کرنے کے لیے ایک اخبار جاری کیا گیا۔ اس کے اولین رہنماؤں میں اہم ترین وی راج گوبال، چارلو اور پی۔ سبرابالاجی اور ایک رٹائرڈ جج اور تیلگو کے مصنف و شاعر مہالیر شامل تھے۔ لیکن اس تنظیم کے حقیقی بانی تھے نوجوان کے۔ سریدھر الوتانڈو جو ایک پرجوش، وسیع النظر اور ہونہار مگر غریب شخص تھے۔ انہوں نے کلکتہ کا سفر کیا، برہمنو تحریک کا مطالعہ کیا اور مدراں واپس آنے کے بعد 1871ء میں وید سماج کو جنوبی ہندوستان کے برہمنو سماج میں تبدیل کر دیا۔ پرانے طریقوں کی جگہ انہوں نے نئے روحانی مذہب کو رواج دیا اور برہمنو دھرم کی کتابوں کا ترجمہ تامل اور تیلگو میں کیا۔ اور مذہب کی تبلیغ کی خاطر تبلیغی دورے کئے۔ بد قسمتی سے وہ 1874ء میں ایک حادثے کے شکار ہو گئے۔

ان کی افسوسناک موت کے بعد سماج میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ کچھ اراکین سریدھر الوتانڈو کے مذہب پر قائم رہے جو کیسپ چندر کے پیلے تھے۔ لیکن اکثریت نے سادھرن برہمنو سماج کی طرح کی ایک انجمن قائم کر لی لیکن اس جھگڑے کی بنا پر تحریک کمزور اور اس کی مقبولیت کم ہو گئی۔ رام موہن رائے اور مہادیو گوند رانا ڈے انیسویں صدی کی دو قد آور شخصیتیں تھیں جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے وہ اپنے خوف اور کمزوریوں کو بھلا کر آگے بڑھے اور اپنے فرائض پورے کر لیے۔ وہ دونوں اپنے وقت سے آگے تھے اور حالانکہ انکے ہم وطنوں نے ان کے پیغام پر فوری توجہ نہیں دی پھر بھی ان کے نقش پا چراغ راہ بنکر اُس منزل کی نشان دہی کر رہے ہیں جس کی طرف ہندوستان کے لوگڑاتے قدم بڑھ رہے ہیں۔

کیسپ چندر سین کی خدا پرستی نے ایک کارنامہ اور جذباتی انتخابیت کا روپ اختیار کر لیا یعنی انہوں نے مختلف مذہب کے عقائد میں سے کچھ کو مین لیا۔ اُن کا مذہب ہندو دھرم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ برہمنو سماج کی تین شاخوں میں سے ”آدی سماج“ کا زوال ہو گیا اس لیے کہ وہ برہمنو دھرم قریب قریب یکساں تھے کیسپ چندر کے ”تودو دھان“ کو اس کے بانی کی ضرورت سے زیادہ انفر ولوٹ نے نقصان پہنچایا۔ صرف ”سادھرن سماج“ بحال اور متواتر ترقی کر جا رہا اس کے مبلغین، خدمت خلق کی تنظیموں اور اخباروں نے اس کو بہت فائدہ پہنچایا۔

رانا ڈے نے ایک ایسے مذہب کی تعلیم دی جس میں غالب عنصر عقلیت پسندی تھی حالانکہ دل کے تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن ان کی پکی دینداری اور اُن ہندو رسوں کی خدمت کی بنا پر، جو اپنی فرسودگی کے باوجود لوگوں کو بہت عزیز تھیں، قدامت پرست مذہب پر رہنماؤں کو موقع مل گیا کہ مغرب کے غلبے کے خلاف بے اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر احیاء پرستی کی تحریکوں کو مقبول بنائیں جو آزادی کے زمانے میں بزرگوں کے کارناموں کو لوگوں میں فخر و مباحات کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ بنگال اور مہاراشٹر دونوں جگہ لبرل اور ریڈیکل تحریکوں کو نقصان پہنچا۔

V۔ بنگال میں احیاء پرستی کی تحریک

1870ء کے لگ بھگ بنگال میں اور 1880ء کے قریب مہاراشٹر میں احیاء پرستی نے برہمنوں اور برہمن تہا ساج کی مقبولیت اور کم کرنا شروع کر دیا اور عقلیت پسندی کی جگہ ہندو دھرم کی وہ آواز سنائی دینے لگی جس کی بازگشت تقریباً 40 سال سے ملک میں گونج رہی تھی۔ کئی واقعات نے مل کر اس رجحان کو جنم دیا تھا۔ بنگال میں متوسط طبقے کے ہندوؤں کے ایک کٹر گروہ نے بہت پڑھے لکھے صوبہ بازار کے رادھا کانت دیب کی قیادت میں 1830ء میں رام موہن رائے کی لہر لے کر ہندو سماج کے مقابلے میں دھرم سہا قائم کر لی تھی لیکن نوجوان بنگال ریڈیکل اور خدا سیدہ دار کا تھہ ٹیگور اور ان کے بیٹے دیندرا تھہ کی طرح کے مصلحین کی کوششوں کی وجہ سے ان کی تحریک زیادہ ترقی نہ کر سکی۔ یہ دونوں تقریباً نصف صدی تک ملک پر چھائے رہے۔ اصلاح کی تحریک کی حمایت انکے کمارت (1820ء-1886ء)، ایشور چندر دویا ساگر (1830ء-1891ء)، رام تولا جری (1813ء-1898ء)، راج نرائن بوس (1826ء-1899ء) اور دوسرے حضرات نے کی جس کی وجہ سے برہمن سماج کی شہرت میں بہت اضافہ ہو گیا۔

لیکن 1857ء کی بغاوت کے بعد برسوں میں ملک کے سیاسی ماحول میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ نئے حالات نے سماجی رجحانات کو تبدیل کرنا شروع کیا۔ مذہبی فکر میں ریڈیکل تصورات کا اثر اور سماجی اصلاح کی ضرورت کا احساس کم ہونے لگا اور رجعت پسندانہ رجحانات ابھرنے لگے۔ انیسویں صدی کی آخر میں دہلی میں یہ تبدیلی زیادہ واضح ہو گئی۔

1858ء کے بعد جن دو تحریکوں نے بنگالیوں کے ذہنوں کو زیادہ سے زیادہ متاثر کیا وہ تھیں قوم پرستی اور روحانیت کی تحریکیں۔ یہ دونوں عام انسانی لگن کی پیداوار تھیں یعنی انفرادی خود اظہاری اور قوم کے ماضی پر فخر عناصر طبقے کی نخوت اور زور زبردستی کے خلاف نفرت، بیہات کی آبادی کی جو حق ہوئی غربت اور دکھوں سے ہمدردی کے احساس اور آزادی اور مساوات کی خواہش نے انہیں جنم دیا تھا۔ ان خواہشات نے سیاسی آزادی کی خواہش میں اضافہ کر دیا۔ جس کے بغیر جو بے پیمانے پر سماجی اصلاح بھی نہیں کی جاسکتی۔

ماضی پر فخر کے جذبات کو سب سے پہلے مذہبی تحریکات نے ابھارا۔ تاریخی مطالعوں اور کھدائی کرنے والوں اور ہندوستان کی تاریخ کے ماہروں کی دریافتوں نے اُسے تقویت پہنچائی۔ قدیم ادبیات، فلسفہ، مائنس، قانون، فنون اور یادگاریں جو تاریخ کے اندھیروں میں گم ہو گئی تھیں، ایک دفعہ پھر منظر حیات پر آئیں اور انکی وجہ سے دنیا میں ہندوستان کی شہرت میں بہت اضافہ ہو گیا اور یہاں کے لوگوں میں خودداری کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب کے خلاف ایک نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور مغرب کے غلبے کو رد کرنے کی خواہش نے جنم لیا۔ اس تحریک کے بہت سے حامی پیدا ہو گئے جس کو نو ہندو دھرم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ دو واضح دبستانوں میں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک ہر طرح کی اصلاح کے خلاف تھی اور دوسری شروعات میں تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کرتی تھی لیکن بنیادی اصولوں میں نہیں۔ پہلی تحریک میں پیش پیش تھے سداہر چوداسی اور دوسری میں پنڈر چنچرجی۔

سادھر قدیم ہر ایک رسوم و رواج کے حامی تھے وہ ہندوؤں کی مقبول عام رسوں اور سماجی رواجوں کی حمایت کرتے تھے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی بنیاد سائنس کے قوانین پر قائم ہے۔ اُن کے متعلق بیگور نے اپنی یادداشتوں میں لکھا تھا چنڈت سادھر کے دبستان فکر میں...۔ اعتقاد حد تک کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ توہمات کی نام و نہاد سائنسی جواز پر توجہ کی جائے۔ (1)

نوبند و بند و دھرم کے رہنماؤں میں جو لوگ سادھر چرائی کے تصورات سے قریب تر تھے وہ تھے کرشن پر۔ ناسین، جیسے چندر سین اور نیم چندر بندرہ دیا دھیمہ۔ کرشن پر ناسین ذہنی سطح پر کام نہیں کرتے تھے۔ اور مذہب کے متعلق اُن کی بحث بھونڈی ہوتی تھی۔ جیسے چندر سین، جو بنیادی طور پر شاعر تھے، اُس زمانے کے سماجی اداروں کے متعلق مخصوص رائے رکھتے تھے وہ مدائیت میں یقین رکھتے تھے۔ لیکن بت پرستی میں بھی انہیں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی اُن کا کہنا تھا کہ ذات پات کا نظام، کم عمری کی شادی اور اپنی ذات میں شادی کرنے کے قدیم سماجی رواجوں میں بھی کچھ اچھائیاں ہوں گی۔ مغرب کے سیکولر تعلیمی نظام کے کٹر مخالف تھے جو رفتہ رفتہ بنگال میں رواج پارہا تھا اور وہ شد و مد کے ساتھ اس امر کی وکالت کرتے تھے کہ تعلیم کا مقصد مذہب کو بحال رکھنا اور ترقی دینا ہوتا چاہیے۔

جیسے چندر کی طرح نیم چندر بندرہ دیا دھیمہ بھی پرانے خیال کے ہندو تھے۔ 1857ء میں انہوں نے سری کرشن کی زندگی کے حالات کے متعلق ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ جو بعد میں کتاب کی شکل میں شائع ہوا۔ انہوں نے اپنی کتاب برہمنو تھی ازم ان انڈیا (ہندوستان میں برہمنو خدا پرستی) میں اس امر کی وضاحت کی تھی کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں کو برہمنو سماج میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔

بنگم چندر چٹرجی (1838ء-1894ء)

بنگال میں تحریک کے سب سے زیادہ بااثر پیش رو تھے بنگم چندر چٹرجی وہ اُس بیداری کی نمائندگی کرتے تھے۔ جو انیسویں صدی کے قدیم ملکوں میں نظر آرہی تھی۔ اُن سے پہلے قدامت پسند ہندو دھرم کی مخالفت کی ذمہ داری راہا کانت و ب (1784ء-1867ء) کی قیادت میں دھرم سمجھا پر تھی لیکن اس قسم کے حالات ہندوستان کے دوسرے حصوں یعنی جنوب میں مادھوں، سری ویشنوؤں، شوسدھاتوں، وکاتوں سحر توں میں اور وسطی ہندوستان کے ویشنوؤں کے علاوہ بنگال کے چیتھ کے ماننے والوں میں پائے جاتے تھے۔ وہ کانفر نہیں کرتے تھے، مذہبی مطالعوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اپنے عقائد کی حمایت تحریروں میں شائع کرتے تھے تعلیمی ادارے قائم کرتے تھے اور مذہبی سرگرمیوں کا انتظام کرتے تھے۔

بنگم چندر میں قوم پرستی کے احساس کے ساتھ دین داری بھی پائی جاتی تھی۔ انگریزی تعلیم اور کانٹ، فسطے، جتھم، مل اور اسپینسر کے فلسفے کے نظاموں کے مطالعے نے اُن تنقیدی صلاحیت کو ابھار دیا تھا آگست کو متے کے ثبوت نے اُن کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ مغربی سائنسوں کے مطالعے کی شد و مد کے ساتھ وکالت کرنے لگے لیکن چاہے وہ جتھم کا افادیت اجتماعی ہو یا اسپینسر کا انقلابی فلسفہ لذتیت یا کو متے کا منکر خدا ثبوت انہیں کوئی بھی مطمئن نہ کر سکا۔ ہندو فلسفے اور مذہب کے مطالعے سے انہیں ذہنی اطمینان

نصیب ہوا لیکن مغربی فلسفے کے منہاجیات نے مذہب کی طرف ان کے رویے کو ایک خصوصی شکل دیدی تھی اور انہوں نے زندگی اور سماج کو درپیش مسائل کے تعلق سے ایک سائنسی، تنقیدی اور معقول طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ان کا مقصد تھا ایک آزاد نقطہ نظر کی تشکیل، مغربی فکر کے غلبے کی تسخیر اور لوگوں سے ایسی زبان میں گفتگو کرنا جسے وہ سمجھ سکیں۔

فلسفے سے ان کی دلچسپی نے انہیں ہندو دھرم کا محافظ بنا دیا۔ عیسائی مشنریوں کے حملوں نے انہیں مناظرات پر آمادہ کر دیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جدیدیت کے چیلنج کا جواب نہ سادہ رکھ کر طرح کے توہم پرست دے سکتے ہیں اور نہ برہمنی طرح کے ریڈیکل۔ اس بحث نے ان سے لیٹر آن ہندو ازم (ہندو دھرم کے متعلق خطوط) لکھوائے جن میں یوگیش چندر گھوش کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ہندو سماج کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا ان کا حل حاصل ہندو دھرم کا احیاء سادہ رکھ کر نام نہاد سائنسی جواز آنتا ہی بے عمل تھا جتنی کیشپ کی انتہائیت، جوں جوں بنکم چندر معمر ہوتے گئے، ان کے اعلیٰ مشن کا احساس بڑھتا گیا۔ ان کو روز افزوں یقین ہو گیا کہ ہندوستان کے مسئلے کا حل ہے۔ ہندو دھرم کا احیاء یعنی گیتا کے اُس عارفانہ اور وجدانی مذہب کا احیاء جس کی تشریح جدید ہندوستان سے لی گئی تھی انہوں نے اپنے تصورات دو جلدوں میں قلم بند کئے یعنی دھرم سدھانت (مذہب کے اصول) اور کرشن چرترا (کرشن کی زندگی اور کردار)۔

وہ مغرب کو سماج کی اخلاقی اور سیاسی حیات نو کا ذریعہ سمجھتے تھے انہوں نے کہا تھا ”مذہب کو اجتماعی افادیت کے تصور سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔“ (1) جہاں تک ہندوستان میں سماجی اصلاح کے مسائل کا تعلق تھا۔ ان کا طریقہ کار دوسرے ترقی پسند مصلحین سے مختلف تھا۔ وہ جزوی اصلاحات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا کہ مذہبی اور اخلاقی حیات نو سماج کو ڈھالنے کا موثر طریقہ ہے۔ ان سماجی ریسوں اور رواجوں پر حملے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا جو صحیفوں سے زیادہ سماج کی شیرازہ بندی کرتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فرد کی شخصیت پوری طرح نشوونما پائے۔ یہ ہم آہنگ ترقی انویاں دھرم (تقلم و ضبط کا مذہب) ہے جس کی بنیاد ہے بتدریج ترقی ہوئی چار قسم کی انسانی جماعتیں یعنی اپنے آپ سے محبت (آتم پرستی)، خاندان کی لیے محبت (سواجن پرستی)، ملک کی محبت (سودیش پرستی) اور بنی نوع انسان سے محبت (جگت پرستی)۔

محبت کا سب سے اعلیٰ درجہ یعنی بنی نوع انسان سے محبت ہی خدا سے محبت ہے۔ ملک سے محبت کرنا ہمارا سب سے بڑا انسانی فرض ہے جو اپنے آپ یا اپنے خاندان سے محبت کرنے سے زیادہ اعلیٰ دارفع ہے۔ بنکم کا قول تھا ”جب وطن مذہب ہے اور مذہب ہندوستان سے محبت کا نام ہے اس مذہب کی مقدس کتاب بھگود گیتا تھی جو بے لوث خدمت اور نتائج سے بے نیاز ہو کر عمل کرنے کا درس دیتی ہے۔“

انہوں نے کرشن چرترا میں نہ صرف کرشن کی مذہبی تعلیمات سے بحث کی ہے بلکہ ہندو سماج کی ترقی کے لیے ان کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ انہوں نے لکھا ”انہوں نے (کرشن نے) کبھی سماجی مصلح بننے کی کوشش نہیں کی ان کا مقصد تھا سماج کی اخلاقی اور سیاسی حیات نو، مذہب کو پھیلانا اور مذہب کی بنیادوں پر حکومت قائم کرنا۔ اگر یہ ہو سکے تو سماج میں از خود اصلاح ہو جائے گی اُس کے بغیر سماجی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ ہم سماجی مسائل کی طرف آڑہ اندر دیکھنا ضروریہ اختیار کر کے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ مذہبی ترقی ہی سیاسی

ترقی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ہر شخص کو مذہب کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہو سکے تو سماج کی اصلاح کے لیے کسی کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ (1) بنکم کے مطابق کرشن ایک مثالی انسان تھے، انسانی شخصیت کی تکمیل اور ”سب سے زیادہ سو بھو بوجھ رکھنے والے اور عظیم ترین ہندو“۔ خدا یہ انسان کے خدا کی طرح ذات محض، صفات سے عاری اور قائم بالذات نہیں ہے۔ جیسا کہ کرشن نے کہا ہے خدا ایک شخصیت ہے صفات رکھتا ہے۔ انسانوں سے مثبت کرتا ہے اور کریم ہے۔ کرشن سب سے بڑے علم اور اس مذہب کے بہترین نمونہ ہیں۔

دھرم جو میں کرشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے وہ جنہوں نے اپنے زور بازو سے شریہندوں کو شکست دی، اپنی سمجھداری سے ہندوستان کو متحد کیا اپنے علم کی طاقت سے ایک عجیب و غریب بے لوث مذہب کا اعلان کیا میں انہیں سلام کرتا ہوں وہ جنہوں نے اس ملک میں جس کی قوت تھی۔ ویڈ اُس وقت جب ویڈوں میں طاقت تھی کہا ”دھرم ویڈوں میں نہیں ہیں دھرم وہ ہے جو انسان کی فلاح و بہود کا باعث ہو“ وہ خدا ہو یا انسان میں اسے سلام کرتا ہوں۔ وہ جن کی ذات واحد میں بودھ، یسوع، محمد اور رام چندر شامل ہیں، وہی ہر طاقت پر خوبی، ہر مذہبی حقیقت اور ہر قسم کی محبت کا سر پٹہ ہیں چاہے وہ خدا ہوں یا نہ ہوں میں انہیں سلام کرتا ہوں۔ (2)

جس ہندو دھرم کی بنکم نے تعلیم دی وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا یہ زندگی سے لذت یاب ہونے اور تیاگ کا آمیزہ تھا اور بغیر کسی مسئلے کی تہمت کے عمل کرنے کا اصول۔ اُس نے وہ اخلاقی بنیاد فراہم کر دی جس پر ہندو سماج اور ریاست کی تعمیر کی جاتی تھی۔ لیکن ہندو دھرم پر اُن کی توجہ اس طرح مرکوز ہو کر رہ گئی تھی کہ ہندوستانی سماج کی گونا گوں نوعیت اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور محض ہندو فرقے کی اخلاقی اور سیاسی حیات نو پر توجہ دے سکے۔

بنکم چندر کی طرح بھو دیو چندر بھوپادھیہ بھی نو ہندو دھرم کے حامی تھے اس تحریک کے حامیوں میں بھو دیو کا موقف بنکم اور سادھر کے بہت قریب تھا۔ بنکم کی طرح انہوں نے بھی مغربی فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ بھو دیو نے کائنات کے بہت سے حوالے دیے ہیں اپنی کتاب سماجک پر بندھ میں انہوں نے ثبوتیت کے اصول کا ذکر اور حمایت کی ہے کہ ”دوسروں کے لیے زندہ رہو اس کے علاوہ بنکم کی طرح مغربی فلسفے کے مطالعے کی بنا پر اُن کے دل میں ہندو دھرم کے لیے زیادہ احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ بھو دیو کا خیال تھا کہ خود اُن کا مذہب زندگی کی ہر شعبے اور ہر فرد پر حاوی ہے۔ ان کا بھی یہ خیال تھا کہ ہندو دھرم کی عمومی نوعیت اُس کی اصل طاقت ہے۔ ایک جگہ انہوں نے کہا ہے۔

”ہندوستانوں کا سنا سن ہندو دھرم لازوال، ابدی اور ہر قسم کے حالات میں مکمل کیوں ہے؟

اس لیے کہ یہ مذہب سب کے لیے ہے اور ورو مند کی اور رحم دلی کا مظہر ہے جس کا روزانہ ہر قسم کے سادھنوں اور ہر طرح کی تلاش و جستجو کرنے والوں کے لیے کھلا ہوا ہے“ چونکہ ہندو دھرم کی عمومی نوعیت پر بھو دیو زور دیتے تھے اس لیے دوسرے مذہب کی طرف اُن کا رویہ رواداری پر مبنی تھا انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے۔ ”چونکہ ہندو دھرم کا مقصد دوسروں کو اپنے اندر شامل کرنا ہے اس

لیے وہ کسی مذہب سے نفرت نہیں کرتا ہے ایجوکیشن گزٹ کے کسی مضمون میں برہمنو، مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا چاہیے۔ (1) جہاں تک مذہب کے وسیع تر مقصد اور صراحت کا تعلق تھا مجھ کو یوں کہیں کہ پورا پورا اتفاق تھا ان کے نزدیک اس کا اصل مقصد تھا انسانیت کی بقا اور انسان کی فلاح۔ ”سماج پر بندہ“ میں انہوں نے لکھا ہے۔

”انسان کو مذہب ہی ہونا چاہیے جو کہ مذہب بحال و برقرار رکھتا ہے۔ مذہب برقرار رکھتا ہے۔ محافظت کرتا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ اُس سے وقتی لذت حاصل نہ کی جاسکے۔“ (2)

اس قسم کی اتفاق رائے سے ممکن ہو سکا اس لیے کہ بنکم کی طرح مجھ کو بھی تعلیم کو توسیع دیکر، غربت و افلاس کو دور کر کے اور دولت میں اضافہ کر کے سماج کو مادی اور اخلاقی حیات نو دینا چاہتے تھے۔ سماج پر بندہ میں انہوں نے ان باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ (3)

رام کرشن پرم ہنس (1836ء-1886ء)

بنکم کے برعکس کی کشیشور کے خدار سیدہ رام کرشن پرم ہنس کی حیات کا ایک عجوبہ کا علم رکھتی تھی، رام کرشن 1836ء میں پیدا ہوئے اور پچاس سال کی عمر میں 1886ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اس ”مفسر، ناخواندہ، دہلے پتلے، نفاست سے مبر ۳، بیمار، نیم بت پرست اور بے یار مددگار ہندو بھکت“ نے بنگال کو ہلا دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ کشیشور کے مندر میں، جہاں وہ رہتے اور پوجا کرتے تھے، جوق در جوق آنے والوں کے لیے وہ چراغ ہدایت کا کام کرتے تھے بلکہ انہیں صبر و سکون لے ساتھ تکلیفوں اور دکھوں کو برداشت کرنے اور روحانی اطمینان و مسرت حاصل کرنے میں بھی مدد دیتے تھے۔ اسی کے ساتھ اُن کے اندر مغرب سے متاثر متوسط طبقے کے لیے بھی کشش تھی۔ جوان کی اعلیٰ داری، انسان دوستی اور روحانی دیانت داری سے بڑے متاثر تھے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ نریندر ناتھ دت (بعد میں جو دیویگانند کے نام سے مشہور ہوئے) ایشیہ چندر اور دوسرے لوگ یا تو ان کے ساتھ رہنے کو آئے تاکہ اُن کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں یا اُن کا اثر قبول کیا کہ خود اُن کا نقطہ نظر بدل گیا۔

رام کرشن خدائی محبت سے سرشار عارف تھے۔ جنہیں ہر قسم کی عبادت میں ایک خالق مطلق کی محبت کا عکس نظر آتا تھا اور جن کی نظر میں ہر مذہبی تلاش و جستجو ”ایک ہی خدائی تلاش تھی جس کی طرف ہر شخص کے قدم بڑھتے ہیں حالانکہ راستے مختلف ہیں۔“ اپنی نسل کی روحانی میراث سے پوری طرح واقف اور دیدانت اور پینشہوں سے ہدایت حاصل کرنے والے رام کرشن ہر مذہب کو ایک ہی منزل کی طرف جانے کے مختلف راستے تصور کرتے تھے اور اپنے عارفانہ تجربات میں وہ ہر فرقے کے لوگوں کو شامل کرنا چاہتے تھے۔ اسلام کی تعلیم انہوں نے ایک مسلم صوفی سے حاصل کی۔ اور انجیل پڑھوا کر سنا کرتے تھے سکھ گروؤں کا وہ بڑا احترام کرتے تھے اور مصر رہتے کہ عالم میں انہیں مقدس ماں کالی اور کرشن کے علاوہ

(1) مجھ کو یوں لکھو یاد ہے، مجھ کو یوں جت، کلکتہ، حصہ سوم، صفحہ 310

(2) مجھ کو یوں لکھو یاد ہے، سماج پر بندہ، صفحہ 291

(3) ایضاً صفحات 231، 307۔

یہ سچ اور بدھ کے بھی دشمن ہوئے جیسا کہ ویویکانند نے اُن کے متعلق لکھا ہے ”بظاہر وہ ایک بھکت تھے لیکن باطنی طور سے وہ روح مقدس تھے۔“ (1) اُن کے وجد آخر میں تجربات نے انہیں خدا سے قریب کر دیا۔ اور انسان میں ایسی خصوصیت پیدا کر دی۔ نہ سب سے اُن کی محبت نے انہیں ہر اُس چیز کو ترک کرنا سکھایا جو عرفان ذات اور بنی نوع انسان کے لیے محبت اور شفقت کی راہ میں حائل تھی۔ خدمت خلق نے انہیں زندہ پیار کرنے اور دکھ بھیلنے والی انسانیت سے واقف کر دیا۔ ان کی ذہنی ”اے ماں مجھے حقیر انسانوں کی خدمت کا موقع دے (2) اور وہ اپنے لیے بالوں سے گھر میں بھاڑ دیتے تھے۔ اُن کی تعلیم تھی ”مہربانی نہیں خدمت۔ انسان کی خدمت کو خدا سمجھنا چاہیے۔“ جس وقت وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ اُس وقت بھی لوگوں کا نبوہ انہیں دیکھنے اور اُن کی باتیں سننے کے لیے آتا تھا۔ اور کوئی بھی انہیں گفتگو کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا لوگوں کے ہمدردانہ گلے کے جواب میں وہ کہتے تھے۔ ”مجھے فکر نہیں ایک انسان کی مدد کرنے کی خاطر میں ایسے میں ہزار جسم چھوڑ سکتا ہوں۔ ایک انسان کی مدد کرنا بھی بڑا شاندار کام ہے۔“ (3)

ویویکانند

رام کرشن کی انسان دوستی کے ایک یرجوش وکیل تھے اُن کے عزیز شاگرد ویویکانند۔ ویویکانند 1863ء میں پیدا ہوئے اور کلکتہ میں تعلیم پائی۔ اُن کے خدا و خال جاذب نظر، کسرتی بدن اور چہرہ خوبصورت تھا۔ وہ بڑے ذہین تھے۔ اُن کی ذہانت پر مغربی فلسفے نے اور جلا کر دی تھی۔ انہوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ ذکاوت، کائنات، اسپتور، بیگل، شوپنہار، کامت، ڈارون اور مل کی تعلیمات کا مطالعہ کیا تھا۔ جس نے اُس کی تنقیدی اور تجرباتی صلاحیت کو ابھار دیا تھا۔ پہلے وہ ”برہمنو سان“ کی تعلیمات سے متاثر ہوئے لیکن اُن کے سائنسی مطالعے نے خدا پرستی میں اُن کا اعتقاد ختم کر دیا۔ اُس کے بعد وہ رام کرشن کے زیر اثر آ گئے۔ اُس وقت اُن کی عمر پوری بیس سال کی بھی نہیں تھی۔ اب تو اُن کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ وہ سنت رام کرشن کے پتلے پر رہ گئے۔

اپنے استاد کے انتقال کے وقت ویویکانند کی عمر صرف پچیس سال کی تھی انہوں نے عہد کیا کہ رام کرشن کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے وہ اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔ انہوں نے دنیا ترک کر دی، سیر و سیاحت کی زندگی گزارنے لگے۔ اور ہمالیہ کے جنگلوں میں سکونت اختیار کر لی۔ چھ سال تک جس نظم و ضبط کے ساتھ انہوں نے زندگی گزاری تھی اُس نے اُن میں بڑا توازن، ذہنی سکون اور یقین کا دل پیدا کر دیا تھا جو عمر بھر اُن کی مشق کی امتیازی خصوصیت بنی رہی۔ ایک جہاں گشت فقیر کی طرح جب انہوں نے ہندوستان کا دورہ کیا تو انہیں عام لوگوں کے دکھوں اور تکلیفوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جسے انہیں یہ کہنے پر مجبور کیا۔ ”میں صرف ایک خدا میں یقین رکھتا ہوں۔ جو تمام روحوں کا مجموعہ ہے اور سب سے بڑھکے یہ کہ

(1) رولڈ روہالی، The Life of Vivekananda and The Universal Gospel (ہے۔ فرانسیسی لے ڈاکٹر مالکم

اسم سے ترجمہ کیا گیا، ایڈیٹور، الہ آباد، 1953ء) صفحہ 84

(2) ایڈا، 92

(3) The Complete Works of Swami Vivekananda، (ملیاتی میو ریل ایڈیشن) (ملیاتی، الہ آباد، 1945ء)۔

میرا خدا اثر پسند ہے میرا خدا بیمار ہے میرا خدا ہر نسل سے تعلق رکھنے والا، مفلس و نادار ہے۔ (1) یہ بڑی عجیب و غریب بات تھی حقیقت پسند و یوگانند میں رام کرشن کی ان تعلیمات نے جن کی بنیاد ویدانت کا قدیم ہندوستانی مذہب تھا اس سے ایمان و یقین پیدا کر دیا۔ جس سے ان کے ذہن اور روح دونوں نے تسکین پائی۔ اُن تعلیمات نے ہندوستانی روایت کی عظمت پر فخر کا جذبہ ایک روز پھر پیدا کر دیا جس کی جڑوں کو مغربی فکر نے روند ڈالا تھا۔ لیکن اُس کے سفر نے اُن پر روشن کر دیا کہ ان کے زمانے کا ہندوستان اخلاق اور مادی اعتبار سے کس حد تک گر چکا ہے۔

اُن کے دل میں طوفان برپا تھا اور روح سر د فشاں تھی انہوں نے تجویہ کیا کہ دنیا کی نظروں میں ہندوستان کی عظمت ثابت کریں گے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ہندوستان کے دکھوں کا حق ادا کریں گے۔ 1893ء میں وہ امریکہ گئے اور شکاگو میں منعقد ہونے والی مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ میں حصہ لیا۔ اُن کی تقریر ہندوستان کی وسیع و پست نظری کی عکاس تھی جس نے سامعین کے دلوں کو موہ لیا۔ انہوں نے کہا ”جس طرح مختلف دریاؤں کا پانی سمندر میں مل جاتا ہے اسی طرح مختلف مذاہب کی منزل خدا ہے“ نیویارک ہیرالڈ نے لکھا تھا۔ ”مذاہب کی پارلیمنٹ میں بلاشبہ یوگانند کی شخصیت سب سے قد آور ہے۔ اُن کی تقریر سننے کے بعد ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان پڑھے لکھے لوگوں کی قوم کے لیے مشنری بھیجتا کتنی بڑی حماقت ہے۔“ (2) ایک اور اخبار نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے۔ ”وہ فن خطابت میں خدا داد مہارت رکھتے ہیں اور پہلے اور گلابی کپڑوں میں اُن کا دین چہرہ اُن کے پر خلوص الفاظ اور ان کے خوبصورت پیرایہ اظہار سے کم دلچسپ نہیں۔“ (3)

انہوں نے امریکہ میں قیام کیا اور تقریریں کرنے، ویدانت سوسائٹیوں کے قائم کرنے اور شمارہ دینے میں وقت گزارا۔ اُن کی تقریروں کا لب لباب یہ تھا کہ ”دنیا کے کسی مذہب نے انسان کی عظمت کا ایسا درس نہیں دیا ہے جیسا ہندو دھرم نے۔“ (4)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے وہ انگلستان گئے۔ حالانکہ ایک قوم پرست ہندوستان کی حیثیت سے وہ دیسیوں کی حکومت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ لیکن انسانوں سے پیار کرنے والوں کی حیثیت سے انہیں انگلستان کے لوگوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ انہوں نے کہا تھا ”تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ سے زیادہ انگلستان کے لوگوں کو پیار لرتا ہو۔“ (5) انہیں ”انگلستان میں بڑی آزادی اور بڑی قانون نوازی ملی“ اور انہوں نے انگلستان کے لوگوں کو ”بہادروں کی قوم اور حقیقی مشنری“ (6) انگلستان سے وہ براعظم کے سفر پر روانہ ہوئے اور فرانس، سوئزرلینڈ اور جرمنی کا دورہ کیا۔

چار سال تک باہر رہنے کے بعد یوگانند ہندوستان واپس آئے اور 10 جنوری 1897ء کو کولہو میں اترے۔ کینا کماری سے کلکتہ تک اُن کا سفر ایک یادگار سفر تھا اس لیے کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے مغرب کی برتری کو تسلیم نہیں کیا اور اپنے مذہب کے متعلق معذرت کرنے اور ناقدین کے

(1) لٹل راجا، The life of Vivekananda and The Universal Gospel (نئے فرانسیسی ڈاکٹر مالک)

اسمہ نے ترجمہ کیا مایاتی، الموزا، تہا، (1953ء) صفحہ 26

(2) اقتباس از سید ایزد فار کوکاب، Modern Religious Movements in India (لندن، مک ملن، 1919ء) صفحہ

مسلموں کے خلاف اُس کا دفاع کرنے کے بجائے بڑی جرأت کے ساتھ اُس کی روحانی فضیلت اور بے مثال عظمت کا اظہار کیا۔ وہ ایسے ہیرو تھے۔ جنہوں نے معتز شین کا مقابلہ خود اُن کے وطن میں کیا اور انہیں تحسین و توصیف بلکہ خراج عقیدت ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اُن کے اس شاندار کارنامے کی بنا پر ہندوستان کا سر اُونچا ہوا اور وہ اپنی نظروں میں حقیر ہونے کے بجائے معتبر و مستند قرار پایا۔

یوگاندہ نے اپنی زندگی کے آخری کچھ برس مشن کی تنظیم کے کام میں صرف کئے تاکہ وہ اُن کے ملک کے پرچار اور ملک کے مفاد کی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے انہوں نے دو مرکز قائم کئے ایک مرکز ہلکتے کے قریب بلور میں اور دوسرا المودا کے نزدیک ملیاوتی میں جہاں ان نوجوانوں کو شناس کی تربیت دی جاتی تھی جو رام کرشن مشن میں شامل ہوتے تھے۔ تاکہ وہ مذہبی اور سماجی فلاح کے کام کر سکیں۔ چنانچہ اس طرح ایک قدم اور قابل احترام ادارے کو قومی خدمت کے کاموں کے لیے استعمال کیا گیا۔ پرانے زمانے کے سادھوؤں کی طرح اس مشن کے راہب بڑی گلن اور بڑے ریاض و زہد کی زندگی گزارتے ہیں لیکن سادھوؤں کے برعکس وہ عمل سماجی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور لوگوں کے دکھ دور کرتے ہیں، قحط کے زمانے میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں، بیمار اور طاعون، ہیپے اور کوڑھ کے مریضوں کا علاج۔ مالچہ کرتے ہیں اور یتیموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اسلئے، فلاحی کاموں کے مرکز کے علاوہ خانقاہیں بھی قائم کی گئیں۔

حالانکہ یوگاندہ ویاسی تحریک کے حق میں نہیں تھے لیکن اُن کی دلی خواہش تھی کہ ایک جبری اور فعال قوم کی تعمیر کی جائے۔ وہ مذہب کو قومی زندگی کا اہم ترین جز سمجھتے تھے۔⁽¹⁾ وہ چاہتے تھے کہ ”زندگی کے ہر شعبے میں اُس سادگی پسند و پنداری کو بیدار کیا جائے جو دلوری کو جنم دیتی ہے۔“ چنانچہ انہوں نے اس طرح ”قادر مطلق“ کے لیے گہرے پیار کے ساتھ دکھ جھیلنے والے انسانوں کے لیے اپیل کو جوڑ دیا۔

پھر بھی سماجی تنظیم اور سماجی امور کے تعلق سے ریاکارانہ مذہبیت کے جذبے کی وہ مخالفت کرتے تھے۔ اور اس کی بنا پر ذات پات، فرقہ واریت، چھوت بچات اور نارابری کے خلاف تھے۔ اُن کی نظر میں ہر انسان اس ایک نند کا بیٹا ہے اور سب میں یکساں ایزدی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اُن کا کہنا تھا ”غریبوں، بے نوٹوں، بے سہاروں اور پکے ہوئے انسانوں آؤ۔ ہم سب رام کرشن کے نام لیوا ہیں۔“⁽²⁾ مطلق، نارادھ لوگوں سے ہمدردی کرنے کی غرض سے وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا۔

”ہمیں پوجا پات کا یہ سب سامان پھینک دینا چاہیے سنگھ بھانا، گھنٹے بھانا اور بتوں کی آرتی اتارنا ترک کر دینا چاہیے۔ ہمیں تعلیم پر فخر نہیں کرنا چاہیے اور اپنی عمل (نجات) کے لیے شاستروں اور سادھوؤں کا مطالعہ ترک کر دینا چاہیے اور گاؤں گاؤں گھوم کر اپنی زندگی کی خدمت خلق کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اور غریبوں اور دکھوں میں جہاں لوگوں کو ان لفظوں میں پنوٹی دی ”جب تک لاکھوں انسان بھوک اور

انہوں نے تعلیم یافتہ لوگوں کو ان لفظوں میں پنوٹی دی ”جب تک لاکھوں انسان بھوک اور جہالت کا شکار ہیں۔ میں ہر انسان کو خدا تصور کرتا ہوں جس نے اُن کے وسائل سے تعلیم حاصل کی اور اُن کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔“⁽⁴⁾ انہوں نے مزید لکھا تھا۔ ”ہندوستان کی توقعات محض مام لوگوں سے وابستہ ہیں بالائی طبقے جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے مرچکے ہیں۔“

انہوں نے کہا کہ ”اگر برہمن کو ترکے میں اچھوتوں کے مقابلے میں تعلیم حاصل کرنے کی زیادہ اہلیت ملی ہے تو برہمنوں کی تعلیم پر زیادہ روپیہ نہیں خرچ کرنا چاہیے بلکہ اچھوتوں کو تعلیم دی جانی

چاہیے کمزور کو تحائف کی ضرورت ہے۔ اس لیے انہیں دیجئے۔ (1)

ہندوستانیوں کی کمزوری، بزدلی اور سستی پر انہیں بڑا غصہ آتا تھا۔ وہ اپنی تقریروں میں عام طور پر کہا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ طاقت درجنوں انہوں نے کہا تھا ”ہر اُس جز کو زیر کچھو جو تمہیں جسمانی، ذہنی اور روحانی طور سے کمزور بنائے۔ اس میں کوئی زندگی نہیں، اسکو سچائی نہیں کہا جا سکتا۔ سچائی طاقت ہے۔ سچائی پاکیزگی ہے سچائی ہر قسم کا علم ہے“ (2) ”اُن کا یقین“ ایسے مذہب میں تھا، جو ہمارے اندر خود اعتمادی قومی فخر اور مفلس و ہمار لوگوں کی تعلیم دینے اور اُن کے دکھوں کو دور کرنے کی طاقت پیدا کر سکے۔“ (3) وہ چاہتے تھے۔ کہ مذہب کے نام پر کیاں و حیان کی کاہلی اور جہود کو ترک کر دینا چاہیے اور اس پر زور دیتے تھے۔ ”تمہارے رام کرشن کی کون پر وہ کر تا ہے۔؟ تمہاری بھکتی اور مکتی سے کسے دلچسپی ہے؟ تمہاری مقدس کتابوں میں کیا لکھا ہے اس سے کس کو کیا لینا؟ میں ہزار جہنموں میں جانے کے لیے خوشی سے تیار ہو جاؤنگا۔ اگر اپنے ہونٹوں کو جو کاہلی اور بے عملی کے شکار ہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بناسکوں اور اُن میں کریم یوگ (عمل کے ذریعے عبادت) کا جذبہ پیدا کر سکوں۔“ (4) ”اُن کی خواہش تھی کہ ”زندگی کے ہر شعبے میں وہ سادگی پسند عروج ہو جو دلاوری کو جنم دیتا ہے۔“ (5)

آزادی دیکھنا تھا کہ کتنی عزیز تھی۔ اُس کی جھلک اُن کے قول و فعل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے کہا ”زندگی، نشوونما اور فلاح و بہبود کی واحد شرط ہے فکر و عمل کی آزادی۔ جہاں یہ نہیں ہوتی ہے وہاں فرد، نسل اور قوم تینوں کا زوال ہو جاتا ہے۔“ (6)

وطنی پرستی کے جذبات سے بھری ہوئی ایک پُر تاثیر تقریر میں انہوں نے اپنے ملک سے ان لفظوں میں خطاب کیا تھا۔

”اُو بھارت! کیا تو دوسروں کے اداروں پر، اس نقل پر دوسروں سے سائنس حاصل کرنے کے اس جذبے پر اس ناکارہ فلاحی پر، اس قابلِ نفرت اور قابلِ خدمت سنگ دلی پر، آزادی حاصل کرنے کے لیے انحصار کرتا رہے گا؟ کیا تو اُس شرمناک نیرود کی مدد سے وہ آزادی حاصل کرے گا۔ جو بہادروں کا حصہ ہے؟ یہ نہ بھول کہ تیرا سماج ایک عظیم مذہب کا عکس ہے۔ یہ نہ بھول کہ اچھوت، غریب، جاہل، پانی بھرنے والے اور جھاڑو دینے والے تیرا خون ہیں۔ تیرے بھائی ہیں۔ اے دلاور ہمت سے کام لے اور اس پر فخر کر کہ تو ہندوستانی ہے اور فخر کے ساتھ اس کا اعلان کر کہ میں ہندوستانی ہوں۔ ہر ہندوستانی میرا بھائی ہے۔ ہندوستان کی سر زمین میری بہشت بریں ہے ہندوستان کی بھلائی خود میری بھلائی ہے۔“ (7)

اپنے سیاسی عقاید کا اعلان انہوں نے ان الفاظ میں کیا۔ ”یقین کرو احکام نازل ہو چکے ہیں، فرمان الہی جاری ہو چکا ہے۔ ہندوستان کو سر بلند ہونا ہے۔ عام لوگوں اور مفلس و فاداردن کو مسرت سے ہنسنا ہوتا ہے تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ تم خدا کے آلہ کار کی حیثیت سے منتخب کئے گئے ہو۔“

(1) ایضاً صفحہ 113 (2) ایضاً صفحہ 112 (3) ایضاً صفحہ 110 (4) ایضاً صفحہ 126
(5) ایضاً صفحہ 129 (6) کنگوئی کن موہن، سوامی دیو کھانڈا ایک مطالعہ (کلکتہ صفحہ 40) (7) سوامی دیو کھانڈا سوانح حیات، جلد چہام، صفحہ 185

مہاراشٹر میں احیا پرستی کی تحریک

مہاراشٹر میں سماجی مصلحین کی عقلیت پسندی کے خلاف رد عمل کے طور پر احیا پرستی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اُس وقت تک مرہٹہ سماج پرانے رسم و رواج میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ بنگال کے دانش ور جدید طرز زندگی کو اپنا رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بمبئی دکن کا مرہٹہ علاقہ 1818ء میں انگریزوں کے زیر نگیں آیا تھا یعنی فتح بنگال کے ساٹھ سال بعد۔ بنگال کے برعکس مرہٹوں کو تجارت اور کاروبار میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور رعیت داری زرعی نظام کی وجہ سے مالکان آراضی کا طبقہ وجود میں نہیں آسکا تھا۔ لیکن چونکہ اُلحے ہوئے مالگوار کے نظام کو چلانے اور دوسرے کاموں کے لیے مقامی لوگوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے مرہٹہ اصلاح میں برہمن ذات کے لوگوں کو ماتحت عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ انگریزوں سے اُن کے روابط بڑھے اور انہیں مغربی طور طریقوں کا تجربہ ہو گیا۔ انہیں انگریزی زبان سے واقفیت مفید معلوم ہوئی اور اُن میں سے کچھ لوگوں نے مغربی نظام کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ ان لوگوں میں بال شاستری جام بھیکر، لوک بہت وادی، دیش مکھ اور جوتیا بھولے جیسے اشخاص تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے ہندو سماجی نظام پر اعتراضات کئے۔

ان مصلحین کی آواز بہت کم لوگوں تک پہنچ سکی اس لیے کہ تعلیم کے فروغ کی رفتار سست تھی اور متوسط طبقہ کمزور تھا۔ 1857ء میں بمبئی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا لیکن بیس سال کے بعد بھی میٹرک پاس لوگوں کی تعداد 100، کیرجیوں کی 179 اور وکالت پاس کرنے والوں کی 53 تھی۔ 1880ء میں صرف آٹھ کالج تھے۔ جن میں سے 6 بمبئی کے شہر میں تھے۔ ہائی اسکولوں کی تعداد 48 اور مڈل اسکولوں کی تعداد 177 تھی۔ ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے وہ غریب بچے ہوتے تھے جو چھوٹی موٹی ملازمت کرتا چاہتے تھے۔ وہ اپنے قدیم سماجی تعصبات اور فرسودہ تصورات سے بچھا نہیں چھڑا پاتے تھے۔ چنانچہ رانا ڈے، بھنڈارکر، اگر کر اور چندر کر کی طرح کے سماجی مصلحین کو صدیوں پرانے انداز فکر کے خلاف لوگوں میں جذبہ پیدا کرنا پڑا۔ 1870ء کے بعد نئے حالات رونما ہوئے جنہوں نے مصلحین کے کام کو ناقابل بنادیا۔ بار بار پڑنے والے قتلوں کی بنا پر یہ خیال پختہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ کہ ملک میں غربت و افلاس بڑھ رہا ہے۔ جس نے بدیسی حکومت اور اُس کی تہذیب کے خلاف تعصب اور عدم اعتماد کا جذبہ پیدا کر دیا اور ہندوستان کے ماضی کی دریافت نے ملک کے مستقبل کے متعلق ایک نئے اعتماد و فخر کو جنم دیا اور مغربی تہذیب کی اقدار کو اُن کی نظروں میں حقیر بنادیا۔ بدیسی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبے نے مذہبی اور سماجی اصلاح کے جذبے کو کمزور بنادیا۔ اور اُن کے ذہنوں میں سیاست ایک غالب عنصر بنی گئی۔

دشنو ساستری چپ لنکر (متوفی 1883ء) نے اپنے رسالے *عہدہ مالا* (1) کے ایک مضمون میں لکھا تھا ”برطانیہ کی فتح نے ہماری آزادی کو ختم کر دیا۔ آزادی کھودینے کے معنی ہیں کہ ہم نے ہر وہ چیز کھودی جو ہمارے لیے بیش قیمت تھی، ہماری قدیم سلطنتیں، ہماری دولت، ہمارا علم سب کچھ خاک میں مل

(1) ملک کی صورت حال ”ان کے عنوان سے عہدہ مالا کی اشاعت نمبر 77-83 میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔ اُس کے تحت لکھے ہوئے برطانوی حکومت پر سخت تنقید کی بنا پر 1910ء میں اُس کو ضبط کر لیا۔ 1937ء میں جب طاقت کا ٹکڑا لے کر آئی تو اسے شائع کیا گیا اور 1945ء میں ایک طلباء کانفرنس شائع ہوا۔

”کیا“ انہوں نے زراعت، صنعت، تجارت اور فنون کی پس ماندگی پر اظہارِ افسوس کیا اور کہا۔
 ”لیکن بدیسی حکومت کی سب سے بڑی لعنت ہماری اخلاقی گراوٹ ہے۔ جو نتیجہ ہے آزادی کھو
 دینے کا۔ ہمارے ہم وطن غلامی کی اُس منزل تک پہنچ چکے ہیں جب غلام خود کو غلام تسلیم کرتا ہے اور عزت
 نفس سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے کردار میں پوری طرح گراوٹ آچکی ہے۔“
 اُن کا خیال تھا کہ سماجی مصلحین کچھ بھی نہیں لیکن ہندوستان کے زوال کا کوئی تعلق کم عمری
 کی شادی یا ذات پات کی طرح کے سماجی رواجوں سے تھا اور نہ مذہب سے۔ تمام برائیوں کی جڑ تھی۔ محض
 بیرونی حکومت۔ اس سخت حملے کے خلاف راناؤے کی عقلیت پرستی کا میاب نہیں ہو سکتی تھی اس لیے جب
 بال گنگا دھر تلک کی طرح کے قابل، جری اور پر عزم قدامت پرستی کے متحین مخالفوں کی صفوں میں
 شامل ہو گئے تو سماجی اصلاح کی زیادہ گنجائش باقی نہیں رہی۔

تلک ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو پیشواؤں کی ملازمت میں رہ چکے تھے اور اُن کے
 ذہن کی ساخت ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی۔ جو مرہٹوں کے پچھلے شاندار کارناموں کی یادوں سے بھرا
 ہوا تھا۔ خاندان کے کزن پن، شہسکرت کی تعلیم اور قدیم تاریخ میں گہری دلچسپی کی بنا پر اُن میں ماضی کے
 احترام کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ہندو تصورات اور اواروں سے پیار اور ہندو مذہب اور فلسفے کے احترام نے انہیں
 مغربی تہذیب کا تہذیب کا تہذیب اور ہندوستان کی برتری کا حامی بنا دیا۔ چنانچہ جب راناؤے نے سماجی اصلاح کی تحریک کو
 منظم کرنا شروع کیا۔ تو تلک نے کھل کے اُسکی مخالفت کی۔ اصلاح کی مخالفت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اصلاح
 کے خلاف تھے۔ انہوں نے لکھا ”سماجی اصلاح اور ترقی کون نہیں چاہتا ہے؟ حالانکہ دونوں فریقوں میں منزل
 کے تعلق سے اتفاق ہے۔ لیکن اصلاحات کیا ہوں۔ اور کیسے ہوں اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔“

ہندوستان میں اُس وقت جو حالات پائے جاتے تھے۔ اُن میں سماجی اصلاح اُن کی نظر میں محض
 ایک تخریبی کارروائی تھی۔ جو سماجی رشتوں کو کمزور تو کر سکتی تھی ان کی جگہ کچھ اور نہیں دے سکتی تھی۔ اُن کا
 خیال تھا کہ سماجی مسائل پر بدیسی حکومت سے قوانین بنوانے کے بجائے رائے عامہ کو ہموار کیا جانا چاہیے۔
 اُن کی نظر میں بدیسی حکومت ہندوستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے وقت
 کی ضرورت نہ ہی اور سماجی تعمیر نو کے بجائے بدیسی حکومت کی مزاحمت کی تنظیم کرنا ہے۔ وہ اس بات کی
 تردید کرتے تھے۔ کہ حکومت خود اختیاری حاصل کرنے سے پہلے ذات پات کو ختم کرنا یا عورتوں اور مردوں
 کو مساوی حقوق دینا ضروری ہے۔ وہ اس کی بھی تردید کرتے تھے کہ سیاسی طاقت حاصل کرنے سے پہلے
 سماجی اصلاح ضروری ہے۔ حالانکہ وہ سماجی تبدیلی کے خلاف نہیں تھے۔ لیکن اُن کو سیاسی ترقی سے جوڑنے
 کے خلاف تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ سماجی اصلاح کی تحریک لوگوں میں پھوٹ ڈال دے گی۔ جو
 آزادی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

تلک نے سیاسی مقاصد کے لیے عوامی کارروائی کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا اس لیے وہ ہندو عوام کو
 ایک سیاسی جھنڈے کے نیچے جمع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ماضی کے شاندار کارناموں کی یاد تازہ
 کرنے کے لیے غنیش کے تہوار کی بنیاد ڈالی اور شیواجی کی سالگرہ منانے کا سلسلہ ایک دفعہ پھر شروع کیا۔
 انہوں نے تعلیم یافتہ ہندوؤں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ ہندو دھرم محض گمیان
 ، سیمان اور عارفانہ اور آخرت کے تصورات کا مذہب نہیں بلکہ وہ اپنے سامنے والوں کو باعمل زندگی گزارنے

کی تلقین کرتا ہے چونکہ زیادہ تر ہندو روحانی افادہ حاصل کرنے کے لیے بھگوت گیتا پڑھتے ہیں اس لیے اپنے خیالات کے ثبوت میں انہوں نے اس کی وسیع شرح لکھی۔

اس مذہبی اپیل نے مہاراشٹر کے لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں احیا پرستی کی تحریکات کو تقویت پہنچائی۔ لیکن بد قسمتی سے ایک فرقے کو اس نے جو کچھ حاصل ہوا اس نے دوسرے فرقے میں خوف اور خطرے کا احساس پیدا کر دیا۔

VII۔ آریہ سماج

وہ مذہبی رجحان جس نے بنگال اور مہاراشٹر کے ہندوؤں میں شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں، مغربی ہندوستان کے پارسیوں میں اور دوسرے لوگوں میں مذہبی اور سماجی اصلاح کی تحریکات کو جنم دیا۔ حقیقت میں پورے ہندوستان پر حاوی تھا ملک کے ہر حصے اور لوگوں کے ہر فرقے میں ذہنی ہلچل پائی جاتی تھی جو کہ بنگال اور مہاراشٹر میں ہو چکا تھا۔ اس کی تجدید گجرات میں ہوئی 1844ء میں کانٹیا دار میں واقع مورولی کی چھوٹی سی ریاست میں ایک بچہ پیدا ہوا جو بڑا ہو کر عجیب و غریب قسم کا مصلح بنا جو دوسروں سے مختلف تھا۔ ایک سام وی دی برہمن کا بیٹا کل شکر جو بعد میں دیانند کے نام سے مشہور ہوا بہت سخت اور باغیانہ مزاج کا بچہ تھا۔ ابھی وہ پورے چودہ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ بت پرستی کی تنبیخ کے سلسلے میں باپ سے جھگڑ پڑے۔ شادی کے بندھنوں سے بچنے اور اپنی روح کی پیاس بجھانے کے لیے انہوں نے گھر چھوڑ دیا۔ پندرہ سال تک وہ جہاں گشت عالم کی طرح تلاش علم میں گھومتے پھرے جس نے اُن کے کبھی شکوک و شبہات دور کر دیے۔ تلاش و جستجو کی لگن انہیں ہمالیہ، دندھیا اور اراول کے پہاڑوں میں، وادیوں میں اور گنگا، جمن اور نربدا کے کناروں پر لے گئی۔ انہوں نے سنسکرت زبان، اُس کی صرف و نحو فلسفے اور مذہبی ادب پر عبور حاصل کیا۔ اُس کے بعد انہوں نے مقبرہ امین ناچینا درج نند کی شاگردی میں دو سال گزارے جو قدیم علوم کے ماہر، بہت اچھے اُستاد اور عقلیت پسند مفکر تھے وہ بت پرستی، اودھم پرستی اور بہت سے دیوتاؤں کی پرستش کے تصورات سے نفرت کرتے تھے انہوں نے دیانند کو ویدوں کی فلسفیانہ تشریح کا درس دیا۔ اور اُس کے بعد اُن پر ہندو دھرم کو بدرائیوں سے پاک کرنے کی ذمہ داری ڈالی۔

1863ء میں اُن کی ہولیانہ زندگی کا آغاز ہوا جو 1883ء میں اُن کے انتقال کے ساتھ ختم ہوئی۔

اس تیس سال کی مدت میں انہوں نے بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ دیانند کوئی معمولی انسان نہیں تھے۔ وہ بڑی ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے کم ہی لوگ اُن سے زیادہ سنسکرت کے علوم سے واقف تھے۔ اُن کی نگاہ لوگوں کو متاثر کرتی تھی اور وہ بڑے تیز فہم مناظر تھے۔ جو اپنے مخالفین کو دلیلوں سے اجواب کر دیتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ مضبوط، غیر متزلزل اور قریب قریب ضدی کردار کے مالک تھے۔ وہ ایک پیدا کنٹی لیزر تھے۔ جن میں مفکرانہ حد تک عزم اور خود اعتمادی پائی جاتی تھی۔

وہ ایک واضح اور کٹھن رس و ہنر رکھتے تھے جس میں التباس، الہام اسرار اور نموز کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کالوں کی طرح وہ بھی اپنے اعتقادات کی پوری پوری وضاحت کرتے تھے۔ اور کسی

سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ مارٹن لوتھر کی طرح کی انفرادیت ان میں پائی جاتی تھی اور تمام مذہبی مسائل کو حاصل کرنے کے لیے وہ انفرادی عقل پر بھروسہ کرتے تھے۔ ہندوؤں کی بہت سی مقدس کتابوں میں سے کچھ کو صحیفہ آسمانی کی طور پر منتخب کرنے کی بنیاد ان کے فحشی عقائد تھے۔ اس کے علاوہ خدا کی وحدانیت، دیوی دیوتاؤں کی کثرت کے رد، آواگون اور کرم کے عقائد اور انسان، فطرت اور خدا کے باہمی رشتوں کے متعلق عقائد و نظریات کا انتخاب بھی ان کے تجربے اور رد عمل کا نتیجہ تھا جس میں نہ روایت نے ان کی رہنمائی کی نہ ہی تاریخ نے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ ہندو دھرم اور وید، جن پر اسکی بنیاد قائم ہے۔ ابدی ناقابل ترمیم، ہر قسم کی غلطی سے پاک اور منجانب اللہ ہیں۔ صرف وید کا مذہب صحیح اور سب کے لیے ہے۔ ان کا خیال تھا کہ آریہ برگزیدہ قوم ہے، وید برگزیدہ مقدس کتاب ہے اور ہندوستان برگزیدہ سر زمین ہے۔ تمام دوسرے مذاہب ناکمل ہیں اور ”آریہ سماج“ کا فرض ہے کہ ان کے ماننے والوں کو ہندو دھرم قبول کرنے پر آمادہ کرے۔

انہوں نے ”آریہ سماج“ کے لیے سماجی عمل اور اخلاقی اقدار کا ضابطہ بنایا۔ اس ضابطے میں پیدائش کی بنیاد پر ذات پات مردوں میں نابرابری اور مرد اور عورت کی نابرابری کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کا نعرہ تھا کہ جہاں تک روحانی اور اخلاقی زندگی کا تعلق ہے ”ویدوں کی طرف مراجعت کر دو“۔ لیکن وہ مغربی تعلیم، سائنس کا علم حاصل کرنے اور سماج کے بدی حالات کو سدھارنے کے حامی تھے۔

1875ء میں انہوں نے بمبئی میں ”آریہ سماج“ قائم کیا جس نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ شمالی ہندوستان کے زیادہ تر حصوں اور خصوصیت کے ساتھ پنجاب، اتر پردیش اور راجستھان میں اسکی شاخیں قائم ہو گئیں۔ اس میں متوسط اور نچلے طبقوں کے ہندوؤں کے لیے بڑی کشش تھی۔ حالانکہ اسے سماج میں اصلاح کے تصور کو پھیلنے میں مدد دی۔ لیکن ذات پات کے خلاف وہ زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ اسکا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ہندوستان کے ماضی کے متعلق فخر کے جذبات کو اس نے جنم دیا اور آریہ مذہب کی تبلیغ میں ایک جادہ جادہ شدت پیدا کر دی۔ اس کو فروغ دینے کے لیے آریہ سماج نے اوقاف بنائے اور تعلیمی ادارے قائم کئے یعنی اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج، ثانوی تعلیم کے لیے اسکول، عورتوں کی تعلیم کے لیے ادارے اور ایسے ادارے جن میں ہندوستان کے قدیم طریقوں کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔ ”آریہ سماج“ کی کچھ کاروائیاں نژادی نوعیت کی تھیں۔ ویانند پہلے ہندو معلم تھے جنہوں نے دفاع کے بجائے حملہ کیا یعنی عیسائیوں اور مسلمانوں کے اعتراضات کے خلاف ہندو دھرم کا دفاع کرنے کے بجائے خود ان پر حملے کئے اور انہیں اپنا دفاع کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی کتاب ستھیا تھ پرکاش میں دوسرے مذاہب پر اعتراضات کئے گئے ہیں اسکا لازمی نتیجہ تھا کہ فرد وارانہ کشیدگی جھگڑائی اور باہمی منافرت میں اضافہ ہو گیا۔

”آریہ سماج“ کے پروگرام میں شامل ایک اور چیز جس نے جھگڑے بڑھائے وہ تھی گور کھنڈ۔ 1882ء میں گور کھنڈ سماج قائم کی گئی اسکے پرچار کیلئے پرچارک مقرر کئے گئے اور گایوں کو ذبح ہونے سے بچانے کے لیے فذ جمع کیا گیا۔ گور کھنڈ بہت اچھا کام ہے معاشی اعتبار سے گائے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اسکے تحفظ سے ہندوؤں کو بڑا جذباتی لگاؤ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ ضرورت سے زیادہ پر جوش آریہ سماجیوں نے جادہ جادہ طریقہ کار اختیار کیا اور اگرچہ بہت سے غیر ہندو جن میں کئی مسلمان بھی شامل تھے ان کی تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے پھر بھی کچھ حساس مسلم علماء اور غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والے ان کے

کچھ ہیر و ناراض ہو گئے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑے بڑے جلوے ہوئے جن کی وجہ سے دونوں فرقوں کے درمیان منافرت بڑھ گئی۔

اس کے علاوہ دیانند کی شروع کی ہوئی تحریک نے ہندوستان کے لوگوں میں خود کفالت کا احساس پیدا کرنے اور خود اعتمادی کے جذبے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ ایک انگریز مشنری نے دیانند کے تصورات کو جو خراج عقیدت پیش کیا وہ اس لیے بیش قیمت ہے کہ ایک ایسے غیر متوقع باغض سے آیا ہے جو ”آریہ سماج“ کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر گرس ولڈ نے کہا کہ :

”ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پنڈت دیانند سرسوتی بڑے فراخ دل انسان تھے وہ خوبصورت خواب دیکھنے کے عادی تھے۔ انکی نظر میں ایک ایسے ہندوستان کی تصویر تھی جو توہمات سے پاک ہو سائنس کے فوائد سے بہرہ یاب ہو، خدائے واحد کی عبادت کرے، حکومت خود اختیاری کا اہل ہو، دنیا کی قوموں میں اپنی جگہ بنائے اور قدیم شان و شوکت دوبارہ حاصل کرے۔“ (1)

VIII۔ تھیوسوفیکل تحریک

اس زمانے میں ایک اور مذہبی تحریک شروع ہوئی جو آریہ سماج کے مقابلے میں زیادہ قدامت پرست اور زیادہ عارفانہ تھی۔ یہ تحریک تعلیم یافتہ لوگوں میں مقبول ہو گئی۔ یہ تھیوسوفیکل سوسائٹی جسے مادام بلاونسکی اور کرمل آل کوٹ نے بنیاد رکھی اس سال قائم کیا جس سال سوامی دیانند نے بمبئی میں ”آریہ سماج“ قائم کیا۔ یعنی 1875ء میں جنوری 1879ء میں اس سوسائٹی کے بانی ہندوستان آئے اور دسمبر 1882ء میں انہوں نے مدراس میں واقع ادیار کے مقام پر اس سوسائٹی کا صدر دفتر کھولا۔ جلد ہی اس کی شاخیں پورے ہندوستان میں پھیل گئیں۔ 1888ء میں انگلستان میں سمرانی میسنٹ اس سوسائٹی میں شامل ہو گئیں۔ سوسائٹی میں ان کی شمولیت سے اسے بڑا فائدہ پہنچا۔ وہ برٹاڈ شاہ، ڈبلو۔ ٹی۔ اسٹینڈ، اے۔ پی۔ سنٹ، بریڈلا اور ٹریڈ یونینسٹ کی طرح کے جدید فکر رکھنے والوں میں پہلے سے جانی پہچانی تھی اگلے پانچ سال انہوں نے مطالعہ اور درس دینے میں صرف کیے۔ 1893ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ گئیں اور شکاگو میں منعقد ہونے والی مذاہب کی پارلیمنٹ میں شرکت کی۔ اس کے بعد انہوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود ان کے ہم وطنوں کے مقابلے میں ہندوستان اور ہندوستانی ان کے قریب تر تھے۔ انہوں نے اعلان کیا ”میرا دل تمہارے ساتھ ہے اور پچھلے جنم میں میں تم میں سے تھی۔“ نومبر 1893ء میں نوئی کورن میں جہاز سے اتریں اور اس کے بعد انہوں نے ہندوستان میں پچھلے ڈال دی۔ جہاں وہ گئیں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ اتنی پرکشش شخصیت اور غیر معمولی خطابت کی بنا پر انہوں نے بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سوسائٹی میں شامل کر لیا جو انہیں اپنا گرو اور رہنما سمجھنے لگے۔ کچھ لوگ انہیں اوتار سمجھتے تھے۔ انہوں نے سوسائٹی کے کاموں کو بڑی تقویت پہنچائی۔ انہوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا جس میں قدیم ہندو دھرم کے دفاع میں تقریریں کیں، تعلیمی مراکز قائم کیے،

بہت سی کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ تھیوسوفی کا پرچار کیا اور سوسائٹی کے عقاید کی تشکیل کی۔

تھیوسوفیکل سوسائٹی کے عقائد مذہب، فلسفے اور سحر پرستی کا ایک عجیب و غریب آمیزہ تھے۔ اسکی مذہبی تعلیمات چار بنیادی باتوں پر مشتمل تھیں (1) خدا کی وحدانیت (2) حلیت ایزدی (3) حلقوں کی درجہ بندی جو فہم روحانی یا دیوتاؤں، فرشتوں، انسانوں اور تحت الانسانی حلقوں پر مشتمل ہے (4) عالمگیر بھائی چارہ جس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسانی ترقی کے مختلف مدارج و منازل کو نظر میں رکھا جائے۔

فلسفے کی رو سے سوسائٹی غیبت پرستی کے کتب کی حمایت کرتی ہے۔ شعور کی انضلیت کی مدعی ہے اور اُسکا عقیدہ ہے کہ انسانی فکر کی وہی نوعیت ہے جو ایزدی فکر کی۔ فکر انسانی سفلہ سرشت اور اُس کے ماحول پر قابو پا سکتی ہے۔ روح دائمی اور لافانی ہے اور ایک جسم سے دوسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے جس کے دوران وہ تجربے حاصل کر کے ترقی کے منازل طے کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ دنیا میں سیکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا ہے اُسکے بعد وہ حیات و ممات سے ماوراء اور ”حیات جاوید کے قابل“ ہو جاتی ہے۔

تھیوسوفی کی سائنس ”علم سینہ کی سائنس“ ہے جو مسلمہ ماہرین کے دریافت کردہ حقائق پر مشتمل ہے ان حقائق میں کائنات، انسان، قوانین عمل و رد عمل، ارتقا اور انسانی تکمیل کی ترکیب و ترتیب شامل ہے۔

معمولی سائنس کے برعکس رس ”سینہ کی سائنس“ کی بنیاد مغرورہ، تجربہ اور استخراج کی بنیاد پر قائم نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ہے اُن روشن ضمیر حضرات کے وجدان پر قائم ہیں جو روحانی اسرار سے واقفیت حاصل کرنے کے طریقے جانتے ہیں۔ اس روحانی اسرار کی واقفیت پر مقبوسوں کا درد مہار ہے۔ متوسط طبقے کے بہت سے تعلیم یافتہ ہندو اس سوسائٹی میں دلچسپی لینے لگے۔ بہت سے لوگوں کو اس منظر نے متاثر کیا کہ ایک سفید فام خاتون ہندو دھرم کے متعلق بڑی روحانی کے ساتھ اظہار خیال کرتی تھیں اور اُن باتوں کا جواز پیش کرتی تھیں جنہیں عیسائی مشنری اور یورپی مفسرین ادھام پرستی اور گمراہی سے تعبیر کرتے تھے۔ اس نے اُن کے شعور کو تسکین بخشی اور خود اپنے متفلسفین کے تیروں کا مذاک کیا۔ سوسائٹی کے ”باطنی علم“ نے جو گیوں کی پراسرار کہانیوں کی حقیقت کا ثبوت فراہم کیا اور سر ولیم کرک کی طرح کے سائنس دانوں کی حمایت نے اُس کے دعووں کی ساکھ بڑھادی۔

بہت سے دانش وروں کو اُس عقیدہ نجات کل سے ذہنی تسکین ملی جس کا پرچار سوسائٹی کرتی تھی۔ اس لیے کہ اُس کا عقیدہ تھا کہ سب مذہب حقیقت پر جی ہیں اور تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ ایک ایسے ماحول میں جو سفید فام لوگوں کی نسلی برتری کے تکبر اور ہندو دھرم کی ناقابل برداشت تحقیر سے مملو تھا اپنی پینٹ کی طرح کی ایک مشہور یورپی خاتون اور اُن کے ہمنویوں کی تعریف و توصیف کا اچھا نتیجہ لگتا ضروری تھا اُن کے اس بیان نے کہ ”وہ ہندوستان جس سے میں عقیدے اور دل کا رشتہ رکھتی ہوں..... وہ تہذیب جس میں روحانی علم کو سب سے ارفع و اعلیٰ درجہ دیا جاتا تھا۔ اور جس میں لوگ روحانی حقیقت کی تلاش و جستجو میں لگے رہتے تھے اور اُس کا احترام کرتے تھے..... وہ ہندوستان جس کی تعمیر کے لیے میں اپنی جان دے سکتی ہوں قدیم فلسفے اور قدیم مذہب سے پوری طرح واقفیت رکھنے والا ہندوستان ہے۔ ایسا ہندوستان جس کی طرف تمام دوسرے ملکوں کو روحانی زندگی کے لیے دیکھنا چاہیے۔“ (1) تعلیم یافتہ

(1) سزائی پینٹ کا اعلان جو انہوں نے امرت پور میں کیا میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کیا تھا، ویسٹ جیوزے،

لوگوں کے دل جیت لیے لیکن سوسائٹی کے جس کام کو ہندوؤں کی مکمل حمایت حاصل ہوئی وہ تھا ہندوستان کے نوجوانوں کی تعلیم کا کام۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ 1898ء میں بنارس میں سنٹرل ہندو کالج کا قیام جہاں ہندو دھرم کی تعلیم عام تعلیم کا جزو تھی۔ اس کالج میں کوشش کی گئی کہ انگلش پبلک اسکول کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ قدیم ہندوستان کے اساتذہ اور طلباء کے رشتے کی روایات کو زندہ رکھا جائے۔

سوسائٹی نے لڑکوں، عورتوں اور پچھلے ہوئے طبقوں کے لیے اسکول کھولے اور بوئے اسکاؤٹ کی تنظیم میں بھی حصہ لیا سوسائٹی نے بچوں کی شلوپوں کی مخالفت کی، ذات پات کو ختم کرنے کی حمایت کی اور اچھوتوں کے سدھ اور بیواؤں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی۔ رنگ اور نسل کے تعصبات کی مذمت کی۔ 1903ء ہی میں ایچی سینٹ نے اپنے سیاسی عقاید کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا تھا۔

”ہندوستان پر حکومت ہندوستانی احساسات، ہندوستانی روایات، ہندوستانی خیالات اور ہندوستانی تصورات کی بنیاد پر کی جانی چاہیے۔“ (1)

ہندوستانوں میں خوداری اور اپنے ماضی پر فخر کے جذبات پیدا کرنے میں تھیوسوفیکل سوسائٹی نے اہم ردل ادا کیا۔

IX۔ سماج کی اثر پذیر ی

راما کرشنا، ویوکانندا اور دیانندا کی تعلیمات نے ہندو دھرم کی بہترین روایات میں انسان پرستی کے اُس جذبہ کی آمیزش کر دی جو انیسویں صدی کے ہندوستان کا تہذیبی تحریک تھا ایک نیا جذبہ صورت پذیر ہو رہا تھا جس کے زیر اثر پرانے سانچے کھردر چکے تھے، اور اُن کی شکست و درشت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فرد کے اندر اپنی اہمیت اور سماج کے تقاضوں سے ایک نئی ذمہ داری کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اُس کے معاشرے کا دائرہ اب پھیلنے لگا جو پہلے محض خاندان، ذات اور قبیلے تک محدود تھا۔ تمام قدیم قید و بند ٹوٹنے لگے اور فرد کا رشتہ سماج سے قائم ہونے لگا۔ ان مصلحین کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں ایک ایسی علاقائی برادری کا تصور جنم لینے لگا تھا جس میں ملک کے تمام رہنے والے بلا لحاظ نسل و مذہب شریک ہوں۔ لیکن مذہب اور سیاست میں تمیز کرنے کی صلاحیت جو ہر سیکولر سماج کی بنیاد ہوتی ہے ابھی کچھ ہی لوگوں میں پیدا ہو پائی تھی۔

سماجی تبدیلی بیک وقت تصورات کی تبدیلی اور عملی زندگی کی تبدیلی کا نام ہے۔ ہندوستان پر فی الجملہ پڑنے والے برطانوی اثرات کی ایک خصوصی نوعیت یہ تھی کہ اس نے جدید ذہنی ماحول پیدا کر کے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں کو تبدیل کر دیا تھا۔ جس کا اثر عملی زندگی کے کچھ پہلوؤں پر پڑا۔ لیکن تمام لوگوں اور خصوصیت کے ساتھ گاؤں میں رہنے والوں ااکھوں کروڑوں انسانوں کی معاشی زندگی کو جوں کا توں رہے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی عادتوں اور رواجوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ راجہ رام موہن رائے کے وقت سے شروع ہونے والی اصلاحی تحریکوں کا اثر محض تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے قبول

کیا لیکن تمام لوگوں پر اُن کا کوئی اثر نہ پڑا اور وہ روایتی زندگی گزارتے رہے انتظامی تبدیلیوں نے گاؤں کی حالت کو تبدیل دی لیکن کسی نئے معاشی نظام کو جنم نہیں دے سکے۔ کاشت اور صنعتوں کی تکنیک اور طریقہ پیداوار پر عہد وسطی کی چھاپ رہی اور اسی عہد وسطی کی روایات پر قرار ہیں اور سرمایہ داری اور صنعت کاری فرد غنہ پاسکی۔ ان حالات میں سماجی تنظیم میں جمود لازمی تھا۔

شہری آبادی کا سلسلہ جو معاشی ارتقاء کی علامت ہے بہت ست تھا اور زیادہ تر لوگ گاؤں میں رہتے تھے۔ 1881ء سے 1911ء کے تیس سال میں شہری آبادی میں دس فی صدی سے زیادہ کا اضافہ نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہات میں پرانی روایات میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر شہری آبادی بھی جس میں متوسط طبقہ بھی شامل تھا۔ پرانے طریقوں سے جڑی رہی۔

ایک ادارے کی حیثیت سے ذات پات پیٹے اور معاشی سرگرمی جڑی ہوئی تھی۔ جب تک معاشی سرگرمی قدیم راستوں پر چلتی رہی ذات پات کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ دھندہ ہے کہ ذات پات اور رواجوں کا اثر اتنا گہرا تھا کہ اصلاح شدہ ملکوں کے ماننے والے بھی اُن سے بچھانہ چھڑا سکے۔ مثال کے طور پر برہمنو سماج نے بت پرستی کو ترک کر دیا تھا۔ لیکن یگور خاندان کے لوگ، جن کا شمار برہمنو سماج کے پیشواؤں میں تھا، ہر سال بڑے جوش و خروش کے ساتھ ڈرگاہ پوجا کا تہوار منایا کرتے تھے۔ آریہ سماج نے پیدائش کی بنیاد پر انسانوں کی درجہ بندی کی مذمت کی لیکن ایسے آریہ سماجیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جو اپنی ذات کے باہر شادی کرنے کی ہمت کر سکے۔ یہ صورت حال اخلاقی اعتبار سے غیر صحت مند تھی اسے اخلاقی معیاروں میں رخنہ پڑتا تھا۔ یعنی ایک معیار اپنے اور اپنے خاندان کے لیے اور دوسرے لوگوں کے لیے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی اصلاحی تحریکات نے دونوں فرقوں کو کل ہند کردہوں کی شکل دیدی اور اس طرح اُن علاقائی اور تہذیبی فرقوں کو متحد کر دیا جو عہد وسطی میں ایک دوسرے سے جداگانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ فرقوں کی اس داخلی یک جہتی نے انیسویں صدی میں بڑی ترقی کی۔ لیکن اُس کے ساتھ سب فرقوں کی سیاسی یک جہتی بھی قوی اتحاد کا عمل بھی جاری رہا۔ حالانکہ ملک کی سیاسی پس ماندگی، لوگوں کی قدامت پرستی اور اُن کی تعلیم کی طرف سے حکومت کی بے اعتنائی کی بنا پر قوم پرستی کا جذبہ اُس رفتار سے ترقی نہ کر سکا پھر بھی بہت سے تعلیم یافتہ فرقوں کا سوچنے، محسوس کرنے اور عمل پیرا ہونے کا طریقہ یکساں تھا۔

وہ جانتے تھے کہ ایک ایسے ملک کے سیاسی نظام کی تعمیر محض سیکولرزم کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے جس میں بہت سی نسلیں، زبانیں، تہذیبیں اور مذہب پائے جاتے ہوں۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر کے نہایت جذباتی اور رد واپائی ماحول میں مذہب کی نشاۃ ثانیہ ہوئی جس نے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا اور سیکولر قومی تحریک کی شدت کو کم کر دیا۔

مذہبی اصلاحی تحریک کی شدت ہندو دھرم اور اسلام دونوں میں یکساں تھی۔ دونوں فرقوں میں احتجاج و اعتراض اور اُن کی کاشت یا یوں سمجھئے کہ لبرلزم اور قدامت پرستی کے تصورات پھیل رہے تھے۔ یہ متوازی تحریکات یکساں وجوہ کی بنا پر وجود میں آئی تھیں ان کا اولین مقصد تھا متعلقہ فرقے کی شاندار ماضی کی بازیافت تاریخ نے انہیں بتایا تھا کہ اُن کے بزرگوں نے بڑی بڑی سلطنتیں بنائی تھیں تہذیبی ترقی میں کارہائے نمایاں سرانجام دئے تھے۔ اور دنیا کے معاملات میں ایسا رد واپائی کیا تھا جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا دوسری بات یہ تھی کہ اُن کے ماضی کے مقابلے میں اُنکا حال ذلت آمیز اور شرمناک تھا وہ اپنی آزادی کھو چکے تھے۔ اُن کی سلطنتوں کی شان و شوکت کو بدیسویوں نے خاک میں ملایا تھا، اُن کی صنعتیں تباہ

ہو چکی تھیں۔ اُن کے لوگ جلوہ حال تھے، اُن کے بالائی طبقے اپنے مالکوں سے بھوٹی بھوٹی مراعات کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اُن کے اخلاق میں گراؤٹ آچکی تھی اور اُن کے حوصلے پست ہو چکے تھے اسکا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے قابلِ نفرت حال کو بھول کر ایک نئی اور وسیع تر زندگی میں داخل ہونا چاہتے تھے۔

ان حالات میں فرقہ پرستی کو پھیلنے پھولنے کا پورا پورا موقع ملا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حکمران اُسکو ہوا دے رہے تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو قوم پرستی کی بات کرنے لگے اور مسلمان اسلامی قوم پرستی کا راگ گانے لگے اور اس طرح دو قوموں کے نظریے کی بنیاد پڑی۔ اس طرح اس نظریے کے حامیوں کو یہ خیال نہیں آیا کہ ہندو یا مسلم قوم کی اصطلاح خود اپنی نئی کرتی ہے۔ قوم ایک علاقائی، سیکولر اور سیاسی تصور ہے۔ اور مذہب، نسل اور زبان اس کے لازمی جزو نہیں ہیں لیکن انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کے پیش نظر ایسے ملکوں کی مثالیں تھیں جن پر عہدِ وسطیٰ کا ذہن رکھنے والے مسلمان حکومت کرتے تھے۔ عرب ممالک جہاں ترکوں کے زیرِ نگیں تھے ایران پر مطلق العنان قاجار حکمران تھے۔ ملا یا دور انڈونیشیا انگریزوں اور ڈچوں کے زیرِ حکومت تھے۔ نئے خیالات اور تصورات نے انہیں متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی بین الاقوامی اسلام کا اثر غالب تھا۔ اس لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی اور مذہبی اختلافات کو سامراہی سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا دشوار نہیں تھا۔ عہدوں اور سرپرستی کا لالچ قوم پرستی کے نئے نئے جذبے پر فوقیت لے کیا جس سے مستقبلِ قریب میں کسی مادی منفعت کی امید نہیں تھی۔ پھر بھی فرقہ پرستی کی تمام تر کشش کے باوجود انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں قوم پرستی نشوونما پاتی رہی۔

دسواں باب

تعلیم اور ہندوستانی اخبارات

۱۔ تعلیم (1858ء-1905ء)

ہندوستانی سماج کی تبدیلی اور جذبہ قوم پرستی کے نشوونما کے باعث جو حالات و واقعات تھے اُن میں معاشی اور سیاسی حقائق کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اُن کے ساتھ تہذیبی اور نظریاتی حقائق ہو گئے اور ان دونوں نے مل کر قوم پرستی کی تحریک کو ایک نئی توانائی عطا کر دی۔ مذہبی اور سماجی اصلاحات انیسویں صدی کے ابتدا میں شروع ہو چکی تھی اور اُس صدی کے نصف آخر میں پورے جوش و خروش کے ساتھ جاری رہیں۔ اُن کی وجہ سے ذہنی رویے میں بڑی تبدیلی آئی۔ وسطی عہد کے تصورات کی کاپیٹ ہو گئی۔ اور فرد اور سماج کے ایک جُڑ کی حیثیت سے انسان، فطرت اور خدا کے تعلق سے مسائل میں بڑی ترمیم ہو گئی۔

ہندوستان کے ماضی کے مطالعہ نے، جس میں قدیم ہمارے عہد و وسطی دونوں دور شامل تھے، پورے سنسکرت کی تعلیم کے احیاء، ذلت و خواری کے احساس کو دور کرنے میں مدد دی جو آزادی کھدینے کی بنا پر پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن اتنا پورے قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دینے میں سب سے بڑی معاون انگریزی تعلیم ثابت ہوئی۔

ہندوستانی سماج میں وہ بڑی تبدیلیاں انگریزی حکومت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس نے متوسط طبقے کو جنم دیا۔ اور دوسری یہ کہ اُس نے اُس طبقے کے لوگوں میں پائی جانے والے عہد و وسطی کے تصورات کو تبدیل کر دیا۔ یہ ظاہر ہے کہ لوگوں کی بڑی اکثریت اور خصوصاً دیہاتی آبادی تہذیبی اور ذہنی اعتبار سے پس ماندہ اور روایات کے حصار میں بند رہی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ عہد و وسطی کا گاؤں کاتامی نظام اگرچہ شکست ہو چکا تھا۔ لیکن اُس کی جگہ جدید صنعتی معیشت ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ مذہبی اور سماجی اصلاحات میں بڑے احکامات مفسر تھے۔ پھر بھی مکمل سماجی تبدیلی اُس وقت تک ممکن نہیں تھی۔ جب تک فی الجملہ لوگوں کی عملی زندگی میں انقلاب نہ آجائے۔ عہد و وسطی سے جڑے ہوئے یہ لاکھوں کروڑوں انسان متوسط طبقے کی زندگی کے لیے ایک بھاری پتھر بنے ہوئے تھے۔ جو ذہنی اعتبار سے انیسویں صدی میں رہتا تھا۔ لیکن جذباتی اور تہذیبی اعتبار سے قدیم راسم و رواج کا پابند تھا۔

تعلیم کا مسئلہ متوسط طبقے کی توجہ کا مرکز پہلے بن چکا تھا۔ ہر کتب خیال کے ہندوستانی جدید تعلیم کی قدر و قیمت سے واقف ہو چلے تھے اور اسیلئے اسکول اور کالج قائم کرنے میں مدد دے چکے تھے۔ جہاں مغربی نصاب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور انگریزی پڑھائی جاتی تھی لیکن اُن کے پاس اساتذہ اور اعلیٰ اداروں کو چلانے کے لیے وسائل کی کمی تھی۔ اس لیے انہوں نے تعلیم پھیلانے میں عیسائی مشنریوں اور یورپی کارکنوں کی اعانت کا خیر مقدم کیا۔

حکومت کارویہ مذہب تھا۔ 1813ء تک اُس نے تعلیم پھیلانے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ اُس کے بعد بھی اخراجات کے لیے بہت چھوٹی رقم منظور کی۔ چونکہ حکومت مستقل مزاجی سے کام نہیں

لے رہی تھی۔ اس لیے وہ پھوٹی سی رقم بھی خرچ نہ ہو پائی۔ حکومت یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ وہ تعلیم پھیلانے میں حصہ لے یا نہ لے۔ دوسری بات اس کے متعلق وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی یہ تھی کہ وہ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے اصلاح شدہ مقامی نظام تعلیم کی حمایت کرے یا انگریزی کے ذریعے جدید تعلیم کو فروغ دے۔ جب ہیملٹن کے فیصلے نے اس بحث کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد بھی شکوک و شبہات باقی رہے۔ سب سے زیادہ غور طلب بات یہ تھی کہ تعلیم کا کیا اثر برطانوی حکومت پر پڑ گیا۔ اُن دنوں کروہوں کے درمیان انیسویں صدی میں بحث و مباحثہ جاری رہا۔ جن میں سے ایک کہتا تھا کہ تعلیم برطانوی راج کے شکست و ریخت کا باعث ہوگی۔ جبکہ دوسرے کا خیال تھا کہ اس کے سبب برطانوی راج کو تقویت ملے گی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1853ء تک تعلیم نے کوئی ترقی نہیں کی اور حکومت کی کوشش بہت ناکامیاب ہوئی 1855ء میں تیس کروڑ کی آبادی والے ہندوستان کے لیے تعلیمی اداروں کی مجموعی تعداد، جس میں حکومت کے زیر انتظام اداروں اور تسلیم شدہ سبھی شامل تھے۔ 1,474 تھی جن میں صرف 67,569 طالب علم پڑھتے تھے۔ اور جن کا مجموعی بجٹ کل آمدنی کے ایک فی صدی سے بھی کم تھا۔

تین بیسائی مشنریوں نے صورت حال کو کسی قدر بہتر بنایا تھا۔ جو 1628 اسکول چلا رہے تھے، جن میں 64,005 طالب علم پڑھتے تھے۔ جہاں تک ہندوستانوں کا تعلق تھا اُن کے متنازعہ ہونے کے برابر تھے۔ پرانے دیسی تعلیمی اداروں کے علاوہ کچھ اعلیٰ تعلیم کے ادارے اور چند اسکول چلا رہے تھے۔

1854ء کے وڈ کے مراسلے سے تعلیم نے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس وقت ہندوستان میں اُن شکوک و انکاسات نظر آتے ہیں جو پچاس سال سے زیادہ ملی مدت تک حکمرانوں کے ذہنوں میں پائے جاتے تھے۔ اگرچہ اس کا آغاز پر شکوہ انداز میں ہوا تھا۔ جس میں لہا گیا تھا کہ حکومت تسلیم کرتی ہے کہ تعلیم ”ہمارے مقدس ترین فرائض میں شامل ہے۔ تاہم جہاں تک نام سے بن پڑے اُس کے ذریعے ہندوستان کی مقامی آبادی کو اُن اخلاقی اور مادی فوائد سے روشناس کروایا جائے۔ جو سود جسٹہ معلومات کے عام لوگوں تک پہنچنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔“ (1) اس کے بعد اُس میں اس بات کو کہ حکومت تعلیم اور اُس کے مقاصد کی راست ذمہ داری قبول کرنے سے دامن بچائے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ”ہم اُس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب ایسا نظام تعلیم باقی نہیں رہے گا جسکو پوری طرح حکومت چلا رہی ہو۔“ (2) اس مراسلے کے لکھنے والوں نے ایک اور جگہ مفید اور عملی علم کی تعلیم کے لیے اپنی بڑی خواہش کا اظہار کیا ہے ”اُن لوگوں کی بڑی اکثریت کے لیے جو دوسروں کی مدد کے بغیر ہم چاہتے ہیں کہ حکومت اس مقصد اور مستقبل کے لیے خصوصی اقدامات کرے جن کو بروئے کار لانے کے لیے ہم خاصی بڑی رقم منظور کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ (3)

مقامی ابتدائی تعلیم کو امدادی نظام کے تحت اگر اس فیصلے کو عملی شکل دی گئی۔ لیکن ابتدائی تعلیم کے لیے زیادہ رقم منظور کرنے کے وعدہ کو ایسا کرنے میں اتنی جلدی سے کام لیا گیا کہ ترقی کی رفتار تکلیف دہ حد تک سست ہو گئی۔

اس تمام زمانے میں قول و عمل کا فرق بہت واضح تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عام لوگوں کی

(1) 1854ء کا مراسلہ، جیراگراف 2۔ اس نے حوالہ دیتے ہیں۔ جے۔ اے۔ 71 Selections from Educational

Records، کلکتہ 1922ء، جلد 2 (1840ء-1859ء)، صفحہ 364۔

(2) ایضاً، جیراگراف 62۔

(3) ایضاً، جیراگراف 411۔

تعلیم دینے کی خواہش اُن کے عام حالات کو سدھارنے کی سرکار کی خواہش کا جزو تھی۔ لیکن بد قسمتی سے اس خواہش کا کوئی محسوس اثر ظاہر نہیں ہوا اس کے برخلاف خصوصیت کے ساتھ متوسط درجے کی تعلیم پر بڑی توجہ دی گئی اور اس زمانے میں اُس نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔

جہاں تک تعلیم کے مقاصد کا تعلق تھا تو اُن نے ان لوگوں کے خیالات کو رد کر دیا۔ جو سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں مغربی تعلیم کا رواج انگریزی حکومت کے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔ ”بہر حال میرا یہ خیال نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کو تعلیم دینے کی بنا پر انگریزی حکومت کے لیے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسکے برعکس میرا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ تعلیم حاصل کرے اور روشن خیال ہو جائے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اور ہم ایک مشترک مذہب کو ماننے لگیں تو ہندوستان میں انگریزی حکومت کمزور ہونے کے بجائے اور زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔“ (1)

انیسویں صدی کی حد تک وڈ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اسی لیے ہندوستانی دانشور حکومت کی پالیسیوں پر سخت اعتراضات کرنے کے باوجود انگریزی حکومت کو ہندوستان کے لیے ضروری اور مفید سمجھتے رہے اس رویے میں تبدیلی تعلیم کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ بدیسی حکومت کی ناقابل حلانی خرابیوں کے تجربے نے اُن کے رویے میں تبدیلی پیدا کی اور ہندوستانوں میں عزت نفس اور قومی وقار کی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وڈ کا دوسرا مقصد تھسہر کاری ملازمتوں اور مختلف پیشوں کے لیے ضروری کارکنوں کی فراہمی۔ اُس نے لکھا تھا ”ہمارا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان میں اگر تعلیم پھیل گئی تو آپ کو حکومت کے ہر محکمے کے لیے ذہین اور قابل اعتماد لوگوں کی خدمات کرنے کا موقع ملے گا جس سے حکومت کے ہر شعبے میں کارکردگی کا معیار بڑھ جائے گا۔“ (2)

تعلیم کی ہمت افزائی کرنے کے لیے اُن لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی جن کی تربیت انگریزی اسکولوں میں ہوئی تھی۔ چنانچہ سرکاری ملازمین اور زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریزی تعلیم تھی۔ اور تعلیم کے افادی مقصد نے اُن کے لبرل اور ملٹی پیلو کو دبا دیا تھا۔

تعلیمی مقاصد حاصل کرنے کے لیے حکومت نے دو طریقے اختیار کئے تھے۔ پہلا طریقہ تھا ناکام تعلیم جس میں ڈائریکٹر اور انسپٹر ہوتے تھے۔ جن کا کام تھا تعلیم کو کنٹرول کرنا اور صحیح راستے پر چلانا۔ حالانکہ اگلے فرائض میں تعلیم کی توسیع کا کام شامل نہیں تھا پھر بھی وہ حکومت کے قائم کئے ہوئے اداروں کی دلچسپی بھال کرتے تھے دوسرا طریقہ ان محکموں کا شروع کردہ لادری طریقہ تھا جس کے ذریعہ تعلیمی اداروں پر پورا کنٹرول رکھا جاتا تھا۔ ان محکموں کی مدد سے حکومت اُن پالیسیوں پر عمل کرنا چاہتی تھی جنہیں مراحل میں درج کیا گیا تھا۔

1857ء کے بعد تعلیم

انیسویں صدی کے نصف آخر میں تعلیم کی توسیع کی تاریخ کاراست اثر ملک میں قومی تحریک کی نشوونما پر پڑا۔ اس کے پہلے مرحلے میں بڑی ترقی ہوئی جو 1854ء سے 1882ء تک کی مدت پر محیط تھا جٹانوی اور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں بڑی ترقی ہوئی۔ ابتدا میں تعلیم کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ صدیوں میں تعلیم بٹ گئی۔

(1)۔ ہنر ڈے پریسبیٹریان، ص 1168-69، جلد XXXVII، صفحات 69-1168۔

(2)۔ 1854ء کا راولہ، ص 72۔

توسیع میں ہندوستانوں نے زیادہ حصہ لیا اور مشنریوں کی تعلیمی سرگرمیوں کو اپنیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چونکہ تعلیم کی ترقی میں روپیہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے مالیاتی نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کا اثر اس ترقی کی رفتار اور نوعیت پر پڑنا لازمی تھا۔ 1854ء سے 1870ء تک حکومت ہند کا بجٹ قطعی مرکزی نوعیت کا تھا۔ اُسکے بعد میونسپل لائبریری کا سلسلہ شروع کیا۔ اور تعلیمی اخراجات صوبوں کو منتقل کر دیے۔ 1882ء میں مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں کے ساتھ پانچ سالہ گرانٹ کے معاہدے کرنے کا طریقہ شروع کیا۔ اُس کے بعد تعلیم کے لیے روپے کی کمی کو پورا کرنے کیلئے دو مفید طریقے شروع کئے گئے۔ ایک طریقہ تھا صوبوں کو اس امر کی اجازت دینا کہ وہ گاؤں پر لوکل فنڈ محمول لگائیں (بنگال نے اس پر عمل نہیں کیا) دوسرا طریقہ یہ تھا کہ تعلیمی امداد کے لیے ضروری کر دیا گیا کہ لوگ اسکولوں کی دیکھ بھال کے لیے ضرور رقم جمع کریں اور طالب علم فیس ادا کریں۔ لیکن لوگوں کی عام غربت و افلاس کی وجہ سے یہ طریقے بھی اقامہ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

دو قسمی سے روپے کی کمی کا سب سے زیادہ اثر ابتدائی تعلیم کے شعبے پر پڑا۔ ابتدا کے اسکول دو قسم کے تھے یعنی پرانے قسم کے مقامی مدرسے اور جدید قسم کے اسکول جن کے اخراجات کی کفیل حکومت یا کسید بگر ایجنسیاں ہوتی تھیں۔ آخر الذر سب سے اہم تھے مشنریوں کے اسکول۔ مشنریوں نے 1857ء کے مراسلے کا خیر مقدم کیا تھا اور اُس نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کی توسیع کا اجازت نامہ سمجھا تھا۔ لیکن 1857ء کی بغاوت نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حکومت محسوس کرنے لگی کہ شورش کی بڑی وجہ عیسائیوں کا پرچار تھا۔ جسے ہندو اور مسلمان دونوں ناپسند کرتے تھے۔ ایٹن بروئے بورڈ آف کنٹرول کبدر کی حیثیت سے حکومت ہند کو آگاہ کیا تھا کہ مشنری اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم، نہ صرف ہمارے تعلیمی نظام بلکہ انگریزی حکومت کے امن و امان کے لیے بھی ایک خطرہ ہے۔“ اس نے مزید کہا تھا ”مجھے یقین ہے اس وقت مقامی باشندوں کے اشتعال کو دور کرنے اور حکومت کے لیے ان کا اعتماد حاصل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ان اسکولوں کو دی جانے والی سرکاری امداد بند کر دی جائے جن کا تعلق مشنریوں سے ہے۔“ (1)

مشنریوں کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہوئے تھے انکی وجہ سے ابتدائی تعلیم کے کام میں رکاوٹ پڑی لیکن اس سلسلے میں خود حکومت نے جو کچھ کیا وہ بھی بہت ناکافی تھا۔ سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا ولوف ڈربی نے 1859ء میں 1854ء کے مراسلے کے نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے حکومت ہند کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تھی کہ عام لوگوں کو خود ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کی کوشش کو مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہ امدادی طریقہ اس قسم کی تعلیم کی ترویج میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ گاؤں کے مدرسوں کے لیے زمین پر محصول لگایا جائے۔ (2) لیکن 1859ء کے اسٹیبلش کے مراسلے (3) نے امداد کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کی پالیسی کو یکسر رد کر دیا۔ تعلیمی امداد عام لوگوں کی اسکولوں کے بجائے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو دی جانی تھی۔ چنانچہ عام لوگوں کی تعلیم کو نظر انداز کیا

(1) ڈائریکٹر تعلیمات کی رپورٹ میں ادا کر لیا گیا ہے، سبکدوش، 58-1857ء، صفحہ 11۔

(2) حکومت ہند کی تاریخ 69-1868ء، ڈائریکٹر خارجہ استعماریہ، جلد 14 (سر میور، 1870ء)، صفحہ 368۔

(3) یاد لیسٹری، پیپر، 1859ء، ٹیشن، جلد 24، حصہ اول (1867ء)، صفحہ 11۔

گیا اور ان مقامی اسکولوں کی ہمت افزائی نہیں کی گئی جو تعلیمی نظام کے لیے اساس مہیا کرتے اور عام لوگوں کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرتے بعض صوبوں میں بالکل ختم کر دیا گیا۔ دوسرے صوبوں میں کوشش کی گئی کہ انہیں سرکاری نظام تعلیم میں شامل کر لیا جائے۔

پھر اس میں کوئی تعجب نہیں کہ حکومت ہند کے محکمہ داخلے کے انڈر سیکریٹری ہول دیل نے 1866ء میں شکایت کی کہ ”اعداد و شمار کے نقشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ 1854ء سے سالانہ تعلیمی اخراجات میں جو بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا ہے اس کا تناسب حصہ نچلے درجوں پر خرچ نہیں کیا جاتا ہے۔ مراسلے میں ان کے لیے جس زیادہ رقم کا تعین کیا گیا تھا اور جو اصل مقصد تھا اس کا ذکر ہی کیا ہے۔“ (1)

واقعہ یہ ہے کہ بار بار اعلان کے باوجود ثانوی تعلیم حکومت کی توجہ سے محروم رہی اسکے باوجود کہ عام تعلیم کے فوائد ظاہر تھے اور سب کو معلوم تھا کہ زراعت کے طریقوں کو سدھارنے، دیہات میں لہذا باہمی کو فروغ دینے کسان کی قانونی حیثیت کو تقویت پہنچانے یا اس کے معیار زندگی کو اونچا کرنے کے لیے دیہات میں عام خواندگی کو فروغ دینا ضروری ہے پھر بھی مقامی مدرسے قریب قریب نیست و نابود کر دیے گئے۔ قدیم نظام زراعت اور اس کی عہد و سہلی کی تعلیم و تکنیک جاری رہی۔ 1868ء میں ایڈورڈ ارنس نے کہا تھا ”ہمدی حکومت کی دشواریوں اور اس کے استحکام کے لیے امکانی خطروں میں سب سے اہم ہے عام لوگوں کی جہالت۔“ (2)

جدید ابتدائی مدرسوں کی کفالت محسول، مونپلیٹیوں اور عام لوگوں کے چند اور طالب علموں کی فیس سے حاصل ہونے والی رقمیں یا حکومت سے ملنے والی پھولی موٹی لہذا کرتی تھی۔ 1881-82ء میں ابتدائی تعلیم پر خرچ ہونے والی مجموعی 70 لاکھ کی رقم میں حکومت کا حصہ شخص 16.77 لاکھ تھا 83-88ء کے ہنٹر کمیشن نے ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور اسکی توسیع کے لیے حکومت کی مالی امداد کی کوشش کیا اور اعلان کیا کہ ”ثانوی تعلیم کے ساتھ ریاست کا رشتہ اس سے مختلف ہے جو ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہے یعنی مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر بھی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جاتا چاہئے جبکہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ثانوی تعلیم کا انتظام صرف اس صورت میں کیا جائے جب ضرورت کے مطابق مقامی تعاون حاصل ہو۔“ (3)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ برطانوی ہند کے نوصوبوں میں جن کی آبادی تقریباً تیس کروڑ تھی، صرف 21 لاکھ طالب علم ابتدائی اسکولوں میں تھے یعنی تقریباً ایک فی صدی اور حکومت کو مجبوراً اس امر کا اعتراف کرنا پڑا تھا کہ ”ابتدائی تعلیم اور خصوصاً مقامی زبانوں میں عام لوگوں کی تعلیم ابھی تک اطمینان بخش بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکی ہے، حکومت نے اس پر حسب ضرورت توجہ نہیں دی ہے۔“ (4)

ابتدائی تعلیم کے پچھڑے پن کی جڑی وجہ تو یہ تھی کہ حکومت خود اپنے فیصلوں پر پوری طرح عمل کرنے سے قاصر رہی، جڑی وجہ تھی عام لوگوں کی انتہائی غربت اور افلاس جو تعلیم کی توسیع پر ہونے والے اخراجات میں حصہ نہیں لے سکتے تھے اور جڑی وجہ یہ تھی کہ گاہکوں کے لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی محرک نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کو آبائی پیشے یعنی ہتھی بازی سے علیحدہ کر کے تعلیم

(1) حکومت ہند کی تاریخ 1866-67ء، تدوین ڈاکٹر جارج ایتھ، جلد 12، حصہ 1، صفحہ 362۔

(2) محکمہ داخل (تعلیم)، روداد، نومبر 1903ء، نمبر 47-42۔

(3) ہندوستانی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ، کلکتہ، 1883ء، پی آر آف 283، صفحہ 254۔

(4) نمونہ ہند (داخلہ تعلیم)، پبلشری آف اشیٹ نارائیک کے نام پر، 1۔ نمبر 1، فروری 1882ء۔

حاصل کرنے کی غرض سے اسکول بھیجیں۔

اس کے برعکس تعلیم کی توسیع کے پہلے مرحلے میں ثانوی تعلیم کی ترقی زیادہ اطمینان بخش تھی زیادہ تر ثانوی اسکولوں میں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی اس لیے کہ انگریزی تعلیم پانے کے بعد روزگار کے بہتر اور زیادہ تر راستے کھل جاتے تھے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے۔ 1873ء میں شمالی مغربی صوبہ جات کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے اپنے صوبے میں انگریزی پڑھنے کی لوگوں کی خواہش کی ان الفاظ میں شہادت دی تھی۔

”پہلے کبھی اس قسم کی خواہش دیکھنے میں نہیں آئی جیسی کہ اب مقامی لوگ انگریزی کے تعلق سے ظاہر کرتے ہیں“ (1) بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر رچرڈ نے ”بنگال کے ہندوستانیوں میں تعلیم کے ذریعے اپنی حالت بہتر بنانے کے صحت مندرجہ جہان کا“ ذکر کیا تھا اس نے مزید کہا ”ہر بنگالی نوجوان جو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے ذرا لگ رہا ہے۔ اس کو اپنی زندگی کا اصل مقصد تصور کرتا ہے۔ اور غریب طبقوں میں انگریزی پڑھنے کی خواہش پائی جاتی ہے۔“ (2)

حکومت ثانوی تعلیم کی توسیع میں دلچسپی لیتی تھی اس لیے کہ خود اس کی ضرورتیں بڑھ رہی تھیں اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کی تعداد بڑھانی تھی۔ بنگال کے ڈائریکٹر تعلیمات نے 1865ء میں کہا تھا ”ان طبقوں اور فرقوں کی لبرل تعلیم جو سماج میں اپنی حیثیت کی بنا پر غریب طبقوں کی تعلیم کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس وقت بھی سب سے اہم مقصد ہے جس پر حکومت کو توجہ دینی چاہیے۔“ (3)

تعلیم کی ترقی کے لیے حکومت نے وہ نظریہ اپنایا جسے ”Downward Filtration“ اور اسے نیچے کی طرف تغیر کہا جاتا تھا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ ”اسی طبقے میں تعلیم حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرنے کے لیے شرط یہ ہے اس سے اونچے طبقے میں تعلیم پائی جائے تاکہ وہ اس سے ایک حقیقت کی طرح روشناس ہو جائیں اور اس سے فوائد کو محسوس کریں۔“ (4)

انگریزی تعلیم کا فروغ

چنانچہ کئی وجوہ اور خصوصاً مغربی تعلیم حاصل کرنے کی متوسلہ درجے کی خواہش اور زیادہ تعداد میں انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کی سرکاری کاموں کے لیے ضرورت کی بنا پر اس زمانے میں ثانوی اور کالج کی تعلیم نے بڑا فروغ پایا۔ 1855ء میں ملک میں 169 ثانوی اسکول تھے جن میں 18,335 طالب علم پڑھتے تھے لیکن 1882ء میں محض گورنمنٹ اسکولوں کی تعداد بڑھ کر 1,363 ہو گئی جن میں 44,605 طالب علم تھے۔

(1) 1871-72ء میں ہندوستان کی اطلاقی اور مادی ترقی اور حالات کو ظاہر کرنے والا بیان، صفحہ 118۔

(2) 1872-73ء میں ہندوستان کی اطلاقی اور مادی ترقی اور حالات کو ظاہر کرنے والا بیان، صفحہ 72۔

(3) برطانوی ہند کا تعلیمی نظام، دیکھئے، محکمہ داخلہ (تعلیم) راولپنڈی، فروری 1882ء، نمبر 31-71۔

(4) ایڈورڈ ٹمپس۔ جانسن کے نام بنگال کے ڈائریکٹر تعلیمات اے۔ گرافٹ کا خط، مورخہ 26 جون 1881ء، محکمہ داخلہ (تعلیم) راولپنڈی، فروری 1882ء، نمبر 31-71۔

تعلیم کے فروغ میں خود ہندوستانیوں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ 1854ء میں ایسے اسکولوں کی تعداد بہت کم تھی جنہیں ہندوستانی چلاتے تھے لیکن 82-1881ء میں ان کی تعداد بڑھ کے 1,341 ہو گئی یعنی گورنمنٹ اسکولوں کی تعداد کے قریب قریب برابر اور مشترکی اسکولوں کی تعداد سے تقریباً دو گنا۔ ان کی تعداد تھی 757۔

تعلیمی سرگرمیوں میں ہندوستانیوں کا حصہ حکومت کی اس پالیسی کا نتیجہ تھا جس کی ابتدا 1854ء کے مراسلے سے ہوئی جس کی رو سے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ترقی میں حکومت نے راستہ ہدایت کر دیا۔ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ہندو قربانی کرنے کو تیار تھے جو مغربی تعلیم کے فوائد سے واقف تھے صرف مسلمان ابھی تک پس ماندہ اور مفلوک تھے۔ حالانکہ سید احمد خاں نے ان کی مخالفت کو ختم کرنے اور مغربی تعلیم کے حق میں ان کے خیالات تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی تھی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں کالج کی تعلیم میں بھی کم ترقی نہیں ہوئی۔ 1857ء میں تین احتجاجیہ والی اور الحاقی کرنے والی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ ان کا کام بھی کچھ ویسا ہی تھا جیسے محکمہ تعلیم کا جو 1854ء کے مراسلے کی سفارشات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا یعنی تعلیم کو صحیح خطوط پر چلانا اور اس کی نگرانی کرنا۔ حکومت ثانوی اسکولوں اور کالجوں کو چلانے کی راستہ دہرائی سے بچنا چاہتی تھی لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ ان میں سے کچھ کی ذمہ داری قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ 1857ء میں حکومت عام تعلیم لے 13 کالج، میڈیکل (طبی) تعلیم لے 3 کالج اور سول انجینئرنگ کالج چلا رہی تھی 6 کالج مشنریوں کے تھے اور ایک کالج مینی کلکتہ کا ہندو دیوالیہ تھا جس کو 1854ء تک ایسی مشترک کمیٹی چلا رہی تھی جس کے ممبروں میں ہندوستانی اور انگریز دونوں تھے۔ تین یونیورسٹیوں کے پہلے میٹرکولیشن امتحان میں کامیاب ہونے والے طالب علموں کی مجموعی تعداد 219 تھی۔

1882ء تک برطانوی ہندوستان میں انگریزی اور شرقی علوم کے کالجوں کی تعداد 72 ہو گئی اور ان کے علاوہ کئی ریاستوں میں بھی تھے۔ ان میں سے 59 آرٹس کالج تھے جن میں 3,399 طالب علم پڑھتے تھے۔ 82-1881ء میں میٹرکولیشن کے امتحان میں شریک ہونے والے طالب علموں کی تعداد 7,479 ہو گئی جن میں سے 2,778 کامیاب ہوئے۔ کالجوں میں علی گڑھ کا محض انٹکو اور نیپل کالج کا ذکر خاص طور سے کیا جانا چاہئے۔ یہ کالج مسلمانوں میں ایک نئے شعور کی علامت اور احیاء پرستی کی ایک ایسی تحریک کی پیداوار تھی جس نے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بڑا جوش پیدا کر دیا تھا۔ علی گڑھ کے محض انٹکو اور نیپل کالج کے علاوہ چار اور کالج تھے جنہیں نجی کوششوں سے چلایا جا رہا تھا۔ یعنی لکھنؤ کا ایک کالج جسے اودھ کے مالکان آرائشی چلا رہے تھے جیسا کہ کالج جس کے لیے رقم ایک خداترس ہندو کے ترے سے ملی تھی وزیراعظم کالج جیسے وزیراعظم کے مہاراجہ نے قائم کیا تھا۔ اور تینی ویل کالج جو 1861ء میں قائم ہوا تھا۔

1857ء سے 1871ء تک اور 1872ء سے 1882ء تک ایف۔ اے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے پاس کرنے والوں طالب علموں کی تعداد ظاہر کرتی ہے کہ اس زمانے میں انگریزی تعلیم کو کتنا فروغ ہوا۔ پہلے دور میں انگریزی کے آرٹس کالجوں کی تعداد 46 تھی اور دوسرے دور میں 77۔ پہلے دور میں ایف۔ اے میں 2,666، بی۔ اے میں 859 اور ایم۔ اے میں 151 طالب علم کامیاب ہوئے۔ دوسرے دور میں ایف۔ اے میں 5,969، بی۔ اے میں 2,443 اور ایم۔ اے میں 385 کامیاب ہوئے۔

ایک اور وجہ جسے رین کو تفتیش کرنے پر آمادہ کیا یہ تھا کہ ”ہندوستانیوں کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ عام لوگوں پر اپنا اثر ڈالے گا۔“ (2)

(2) یہ مکتوب نے 26 جون 2016ء کو [188] میں گولوشین، ولف نے پیش کیا۔ مکتوب میں اس کی تاریخ، بعد 4، 2016

صدر تھامس ڈیلو ہنر اور 20 ممبر تھے۔ جن میں سے آٹھ ہندوستانی تھے۔ کمیشن کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اس بات کا جائزہ لے کہ 1854ء کے مراسلے میں جن اصولوں کا ذکر کیا گیا تھا ان پر کہاں تک عمل کیا گیا ہے۔ اور اس میں جس پالیسی کا ذکر کیا گیا ہے اُس پر مزید عمل کرنے کے لیے ضروری اقدامات کی سفارش کرے۔ تعلیم کے مختلف پہلوؤں کے متعلق تفصیلی تحقیق و تفتیش کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ 1883ء میں پیش کی۔

کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ 1854ء کے مراسلے میں جو تعلیمی نظام پیش کیا گیا تھا وہ بنیادی طور پر صحیح ہے اور کسی بڑی تبدیلی کا محتاج نہیں۔ چنانچہ اُس کی سفارشات کا مقصد تھا اُس مراسلے میں بیان کئے جانے والے اصولوں کو تقویت پہنچانا اور ان کی حمایت کرنا۔ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ تعلیم کو اگر ضرورت کے مطابق بنانا ہے۔ تو اس کو سرکاری انتظام کے مضمرات سے وسیع تر بنی قومی بنانا ہو گا اور بڑی حد تک اُس کا انتظام لوگوں کو خود کرنا ہو گا (1) چنانچہ کمیشن نے سفارش کی کہ حکومت کا دست کش ہونا مناسب ہو گا۔ اور کہا کہ ”حکومت کو نہ صرف اپنے اداروں کے اخراجات میں کمی کرنی چاہئے۔ بلکہ جوں ہی کام کو جاری رکھنے کے لیے کوئی عوامی یا نجی ایجنسی مل جائے اُسے تعلیمی سرگرمیوں سے دست کش ہونا چاہئے۔“ (2)

اس پالیسی کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ کالج اور ثانوی تعلیم کے اداروں پر ہوتا تھا۔ لیکن جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق تھا اس نے کہا کہ ابھی تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے زیادہ حکومت کو اب اس کے لیے کوشش کرنی چاہئے۔ (3) اور یہ کہ ابتدائی تعلیم پختہ پڑی ہوئی آدمی داسی سطحوں میں پھیلائی چاہئے کمیشن نے یہ سفارش بھی کی کہ انگلستان کی طرح ابتدائی تعلیم کا کام ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں کے سپرد کیا جانا چاہئے لیکن اس نے اس بات کی سفارش نہیں کی کہ انگلستان کی طرح ابتدائی تعلیم اس ملک میں بھی لازمی قرار دی جائے۔ جہاں تک دیسی سطحوں کا تعلق تھا اُس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ ان کی ہمت افزائی کی جائے اور سدھارا جائے تاکہ وہ جدید ضرورتیں پوری کر سکیں۔

جہاں تک ابتدائی تعلیم کے لیے سرمائے کا سوال تھا۔ اُس میں سفارش کی گئی تھی کہ لوکل فنڈ اُس کے کفیل ہوں اور صوبائی حکومتیں محض لوکل بجٹ کی کمی کو امدادی رقم سے پورا کریں۔ اچھے ارادے بے نود ثابت ہوئے۔

اس رپورٹ کے بعد بیس سال میں ایک دفعہ پھر پچھلی دہائیوں کے مقابلے میں کالج کی اور ثانوی تعلیم میں تیزی سے توسیع ہوئی جہاں تک کالجوں کا تعلق تھا ان کی تعداد (جن میں آرٹس اور پیشہ ورانہ تعلیم کے اول اور دوم درجے کے ادارے شامل تھے) 72 سے بڑھ کے 191 ہو گئی جن میں سے 145 آرٹس کالج اور 46 پیشہ ورانہ کالج تھے۔ یعنی اس کے معنی یہ ہوئے کہ 1882ء کے بعد ان کی تعداد گنتی ہو گئی برطانوی ہند کے چھ صوبوں میں 82-1881ء میں طالب علموں کی مجموعی تعداد 54,32 (4) تھی اور

(1) انٹرنل ایجوکیشن کی رپورٹ، نکلت، 1883ء، صفحہ 452

(2) تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے، ایضاً صفحات 452-56

(3) ایضاً صفحہ 112۔

(4) انٹرنل، سر، انٹرنیٹ، 1886ء میں ہندوستان میں تعلیم پر رپورٹ جس میں ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا خصوصی حوالہ دیا گیا (طاہر، 1888ء) صفحہ 31۔ یہ نمونہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ 1781ء تا 1892ء، جلی، 1895ء، 1895ء، 120

2-1901ء میں یہ تعداد 23,009 (1) ہو گئی تھی۔ یعنی پوسگی سے زیادہ 82-1881ء میں 18 مشری کالجوں کے مقابلے میں 5 ہندوستانی کالج تھے۔ 2-1901ء میں 168 آرٹس کالج تھے جن میں سے 136 برطانوی ہند میں تھے اور 32 ہندوستانی ریاستوں میں تھے۔ ان میں سے 42 کا نظام ہندوستانوں کے ہاتھوں میں تھا اور 37 کاشتریوں کے۔ ظاہر ہے کہ 1903ء تک اعلیٰ تعلیم کی توسیع کے میدان میں ہندوستانی مشریوں سے آگے نکل گئے تھے۔ ثانوی تعلیم کے میدان میں بھی ایسی ہی ترقی ہوئی۔ اسکولوں کی تعداد 3,916 سے بڑھ کر 5,124 ہو گئی اور طالب علموں کی تعداد 2,11477 سے بڑھ کر 5,90,129 ہو گئی ان میں سے زیادہ تر اسکولوں کے اخراجات ہندوستانی ایجنسیاں نجی طور سے پورا کرتی تھیں اور اُس میں اُسٹرو بھی ہندوستانی تھے۔ لیکن صدی کے اختتام تک ابتدائی اسکولوں کی حالت قابل افسوس تھی۔ 2-1901ء میں واقعی اسکول جانے والے بچوں کی تعداد تیس لاکھ تھی جبکہ اسکول جانے کی عمر کے بچوں کی مجموعی تعداد ایک کروڑ اور اتنی لاکھ تھی۔ حکومت 82-1881ء میں ابتدائی تعلیم پر جو خرچ کرتی تھی۔ 2-1901ء میں بھی قریب قریب اتنا ہی خرچ کرتی تھی اول الذکر سال میں 77 میں 16 لاکھ خرچ کئے گئے اور آخر الذکر میں 16.92 لاکھ۔ اس کے برعکس تعلیم کی توسیع پر جو بھی خرچ ہو اُس کا بوجھ مقامی اداروں کے مزید محاصل پر پڑا۔ 82-1881ء میں لوکل بورڈوں نے 24.9 لاکھ دیئے تھے جو 2-1901ء میں بڑھ کر 46.1 لاکھ ہو گئے اس کے باوجود 2-1901ء میں مردوں میں خواندگی دس فی صدی تھی اور عورتوں میں 7 فی صدی ہر چار گاؤں میں سے تین میں اسکول نہیں بنے تھے۔

انگریزوں کی ڈیڑھ سو سال کی حکومت کے بعد بھی معاش اور تعلیمی اعتبار سے ہندوستان نے عام لوگ بچھڑے ہوئے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ حکومت نے ازلی ابتدائی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ اس منہجی تعلیم کو قلاق مقامی اداروں یعنی ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے سپرد کر دیا اور تعلیمی اداروں میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے مقامی اسکولوں کو بھی نظر انداز کیا۔ جہاں اتنا ہی افلاس ایسی وہ خرابیاں تھیں جو پورے زمانے میں لوگوں کو پریشان کرتی رہیں۔ ان حالات میں یہ لازمی تھا کہ وہ تو ہم پرستی میں مبتلا رہیں، رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے رہیں۔ بڑے بڑے کام کرنے کے حوصلے سے محروم ہوں۔ ذراعت کی جدید تکنیک کے خلاف ہوں، دھکوں اور بیماریوں کے شکار ہوں اور ترقی کی طرف سے غفلت برتیں۔

مقابلہ متوسط طبقے کو زیادہ تعلیم میسر ہوئی۔ حالانکہ اُن کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن اس زمانے میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں یہ لحاظ مقدار زیادہ ترقی ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ قومی زندگی کے تمام شعبوں میں متوسط طبقے کی سرگرمیاں بڑھتی رہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن میں تعلیم تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے تمام فرقوں میں تعلیم نے یکساں ترقی نہیں پائی۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا تعلیم بڑی حد تک متوسط طبقے تک محدود تھی اُس کے بالائی حصوں نے بھی دوسروں کے مقابلے میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع سے فائدہ کم اٹھایا۔ اُن کے مفاد میں حکومت نے خصوصی انتظامات کئے جن کی بنا پر ایک طرف تو وہ تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے اصل دھارے سے کٹ گئے

اور دوسری طرف اپنے بدیہی مالکوں کی طرف اُن کی وفاداریاں بڑھ گئیں۔

اس پالیسی کے مطابق ایسے ادارے قائم کئے گئے جہاں صرف راجوں، مہاراجوں، امیروں اور زمینداروں کے بچوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھے۔

(1) اجیر کا میو کالج

(2) راجکوت کارا بیکمار کالج

(3) اندور کا ڈال کالج

واقعہ یہ ہے کہ، محض متوسط طبقے اور خاص طور سے متوسط طبقے کے غریب لوگوں کے بچے انگریزی اسکولوں کی طرف جاتے تھے اس کی وجہ ظاہر تھی۔ متوسط طبقے کا بااُمی حصہ مالکان اور اُمی پر مشتمل تھا جو کسی آزاد پیشے یا سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کے بہت خواہش مند نہیں تھے۔ اور ایسے کالج کی تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے اس کے برعکس وہ لوگ جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے اپنے حالات کو سدھارنے کے زیادہ خواہش مند تھے اور اسکول اور کالج اُن سے بھر جاتے تھے۔ کسی نوجوان کو رات میں سڑکوں کے لمپوں کی روشنی میں پڑھتے ہوئے دیکھنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے برعکس، جو ایسے تعلیمی ادارے تھے جہاں طبقہ امرا کے نوجوانوں کو تہذیبی اور اخلاقی اُمور کی تربیت دی جاتی تھی، ہندوستان کے تعلیمی اداروں کو عہدوں کی تلاش کرنے والے حاجت مند نوجوانوں کی تربیت گاہ سمجھا جاتا تھا۔ انہیں اعلیٰ تعلیم یا علم و تحقیق کو فروغ دینے کے ادارے بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ہندوستان میں پڑھ لکھے لوگوں کی مجموعی تعداد کا 60 فی صد آبادی کے 20 فی صدی سے بھی کم حصے سے تعلق رکھتا تھا ان میں سے زیادہ تر 20 ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے جن میں زیادہ نمایاں تھے برہمنی، ویش اور کاستھ۔ یہ تینوں ذاتیں ملکر ہندوستان کی مجموعی ہندو آبادی کی دس فی صدی سے بھی کم تھیں۔ لیکن 36 فی صدی تعلیم یافتہ لوگ اُن سے متعلق تھے اگر سرائی اور عورتوں دونوں کو شامل کر لیا جائے تو صرف 11 ذاتوں سے، جو آبادی کی 14 فی صدی تھیں، 50 فی صدی تعلیم یافتہ لوگوں کا تعلق تھا۔ (1) ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں تعلیم ایک چھوٹے سے طبقے تک محدود تھی۔ لیکن اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ انگریزوں سے پہلے کے زمانے کے برعکس اُس وقت کوئی ایسا فرقہ نہیں تھا جو اپنے لوگوں میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد پر فخر نہ کرتا ہو تعلیم نے ذات پر مبالغہ بول دیا تھا لیکن ابھی تک وہ بہت معمولی اور سطحی دروازہ ڈال سکی تھی ذاتوں کی سختیوں میں محض ایک ذرا سی کمی ہوئی تھی۔

حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی تعلیم کی ہمت افزائی

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا اُن کی ترقی مایوس کن تھی۔ تعلیم میں اُن کے پچھڑے پن کی ذمہ داری بڑی حد تک حکومت کی تاہم منگی اور حکمرانوں اور اُن کے مذہب اور تہذیب کے تعلق سے خود اُن کی نفرت پر تھی۔ اس کا خصوصی اطلاق غازی اور اعلیٰ تعلیم پر ہوتا تھا 72-1871ء میں ہندوستان کے بڑے چھ

(1) ڈیوس، گزٹیکس، ہندوستان اور پاکستان کی آبادی، صفحہ 106۔ ڈیوس نے اپنے نتیجوں کی بنیاد ہندوستان کی مردم شماری کی

صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی 22.8 فی صدی تھی جبکہ اسکولوں میں پڑھنے والے کل طالب علموں میں مسلمان صرف 14.5 فی صد تھے۔ شمال مغربی صوبہ جات اور اودھ میں اُن کی تعداد تناسب سے زیادہ تھی اور بقیہ چار صوبوں میں تناسب سب سے کم اس واقعے اور مسلمانوں کی طرف حکومت کے بدلے ہوئے رویے کی بنا پر، جس کی علامت ہنر کی کتاب ہندوستانی مسلمان تھی جو 1872ء میں شائع ہوئی، حکومت نے 7 اگست 1871ء کو ایک تجویز منظور کی جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی تعلیم کی زیادہ ہمت افزائی کرے گی۔ ایک سال کے اندر یعنی 13 جون 1872ء کو ایک اور تجویز منظور کی گئی جس میں 1871ء کے بعد صوبے کی ترقی کا جائزہ لیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو اعلیٰ ذہنی تربیت اور زندگی کے لیے مفید صحت مند علم میں اُن کا پورا حصہ دیا جائے۔ یہ تعلیم اس طرح دی جائے کہ مشرقی روایت سے، جو اُن کی نسلی اور ملک کی مملکت ہے، ٹکراؤ کے بجائے دونوں شیر و شکر ہو جائیں۔“ (1)

دس سال کی مدت ختم ہونے کے بعد (1872-1882ء) کالجوں (انگریزی) میں مسلمانوں کی تعداد طالب علموں کی مجموعی تعداد کی 3.65 فی صدی اور انگریزی ہائی اور مڈل اسکولوں میں 9.2 فی صدی تھی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں کی آبادی مجموعی آبادی کی 22.8 فی صدی تھی ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ صورت حال اطمینان بخش نہ تھی۔ ہنر کمیشن نے تسلیم کیا کہ ”کسی طبقے کے لیے خصوصی انتظام بذات خود ایک برائی ہے (2) اور مسلمانوں سے کہا کہ اپنی مدد خود کریں اور اس کے لیے قربانی دیں۔ پھر بھی اُس نے سفارش کی کہ ”مسلمانوں کی تعلیم کے تعلق سے خصوصی انتظامات کو لوکل، مونسپل یا صوبائی فنڈ (3) کا جائز استعمال تسلیم کیا جائے“ اس کے علاوہ اس نے اس بات پر زور دیا کہ مقامی مسلم اسکولوں کی ہمت افزائی کی جائے، مسلمانوں کے اسکولوں کے لیے خصوصی معیار قائم کیا جائے، ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں مسلمانوں کے لیے حالیہ تعلیم ہندوستانی ہو اور اُس کو سکھانے کے خصوصی انتظامات کئے جائیں، انگریزی اسکول کھولنے کے لیے ”مسلم اوقاف کو استعمال میں لایا جائے اور اُن اسکولوں میں مسلم اساتذہ مقرر کئے جائیں، مسلم انجکشنز کا تقرر کیا جائے وغیرہ وغیرہ تاکہ مسلمانوں میں تعلیم فروغ پائے۔“ (4)؛ نیز کی حکومت مسلمانوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے پر ضامند ہو گئی اور اُس نے کمیشن کی زیادہ تر سفارشات کو منظور کر لیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1891-92ء تک آرٹس کالجوں (انگریزی) میں مسلم طالب علموں کی تعداد بڑھ کے 5.9 فی صدی، پیشہ ورانہ کالجوں میں 7.5 فی صدی اور ثانوی اسکولوں میں 14 فی صدی ہو گئی (5) جبکہ اُن کی آبادی 21.8 فی صدی تھی۔ مختصر یہ کہ جہاں تک مسلمانوں میں عام حرف شناسی کا تعلق تھا 1886-87ء میں وہ مجموعی آبادی میں اُن کے فی صدی تناسب کے مطابق تھی یعنی 22.6 فی صدی۔ (6) صرف اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑا فرق تھا۔ 1903ء تک فی الجملہ صورت حال اچھ خراب ہو گئی۔ اُن کی مجموعی آبادی 22.6 فی صدی تھی

(1) - سید محمد، محولہ بالا، صفحات 54-53۔

(2) - ہندوستان کی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ، محولہ بالا، صفحہ 506۔

(3) - ایضاً، صفحات 505-506۔

(4) - ایضاً، (5) - سید محمد، ایضاً، صفحہ 177۔

(6) - تعلیم کی ترقی کی پانچ سالہ رپورٹ (1897ء، 1902ء)، پیج 1133۔

اور مسلمان طالب علموں کی تعداد تھی 18.21 فی صدی۔ یہ کوئی بہت بڑا فرق نہیں تھا۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کا پیچڑاپن زیادہ نمایاں تھا۔ مسلمان طالب علموں کی تعداد سرکاری ابتدائی اسکولوں میں تھی 19.7 فی صدی، ثانوی اسکولوں میں 14.4 فی صدی، آرٹس کالجوں میں 3.7 فی صدی اور پیشہ ورانہ کالجوں میں 6.4 فی صدی۔ صرف خصوصی تعلیم کے میدان میں اذروئے تناسب اُن کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ تھی کل کی 7 سو فی صدی۔

یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمانوں کی جو خصوصی بہت افزائی کی گئی تھی اُس کا کوئی اثر اُن میں تعلیم پھیلنے پر پڑا۔ تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اُس کی بنا پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھل جاتے تھے۔ لیکن حکومت کے اچھے رویے کی بنا پر صرف ماتحت ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ جن میں بھرتی کرنے کا اختیار افسروں کو حاصل تھا۔ اُن کے لیے یونیورسٹی کی تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں تھی چنانچہ مسلمان نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتے تھے۔

اس کے برعکس جب کالجوں میں تعلیم پائے ہوئے لوگوں اور گریجویٹوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ پیدا ہونے لگے تو عہدوں کے لیے زیادہ سخت مقابلہ ہونے لگا۔ قابلیت اور ایاقا کا لحاظ کم ہونے لگا اور یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ مسلمانوں کو اہمیت کی بنیاد پر سرکاری عہدوں میں اُن کا حصہ مقرر کیا جائے اس مطالبے کی بنا پر جو مراعات دی گئیں اُنکا دہرا اثر ہوا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کھلا مقابلہ کرنا یا تو ایسے نئے معیار کے لیے کوشش کرنا ترک کر دیا۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کی بنا پر ہندوؤں میں گئی پیدا ہوئی۔

II۔ انگریزی تعلیم اور قومی تحریک

انیسویں صدی میں مغربی تعلیم کا اثر باز رہا جاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی، جن کو تبدیل کرنے میں اس کے دور رس اثرات نے کیا رول ادا کیا یورپ میں عہد جدید کی تشکیل میں یونانی علوم نے جو رول ادا کیا تھا وہی رول مغربی فکر نے ہندوستان میں ادا کیا۔ یورپی اور خصوصیت کے انگریزی سلاطین، فلسفے اور سائنس کی تعلیم کی بنا پر مذہبی اور سماجی اصلاحات، روحانیت، روشن خیالی یا عقل پرستی، تاریخی نقطہ نظر اور سماجی عمل نے ایک اصول کے طور پر حسب الوطنی کے جذبات کو ختم ملا۔ لیکن اس تبدیلی کا ہندوستان پر اگر وہی اثر پڑا جیسا یورپ پر پڑا تھا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ زندگی کے مادی حالات اور خاص طور سے عام لوگوں کی زندگی کے مادی حالات پر قریب قریب ایک جمودی کیفیت طاری تھی۔ اور اس قسم کی آزادی یا سیاسی سرگرمی مفقود تھی جو ان سماجوں میں دیکھنے میں آتی ہیں، جہاں حاکم و محکوم میں ایک زندہ رشتہ پایا جاتا ہے۔

جبکہ یہ بات تاریخی اعتبار سے درست ہے کہ مغربی تعلیم نے جدید سماج کی تشکیل اور ہندوستان کے مختلف لوگوں کے اتحاد میں اہم رول ادا کیا اس کو بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اس تعلیم کی ترویج میں کچھ بڑی خرابیاں بھی تھیں جن کے اُنکا سامنا فراوی بعد اجتماعی کردار میں نظر آتے ہیں۔

اولیٰ اور نظری علم پر زور دیا گیا جس کی وجہ سے کتاب پڑھنے اور غیر حقیقت پسندی کے خلاف

جھکاؤ اور بڑھ گیا تھا جسے کلاسیکی شرقی علم نے فروغ دیا تھا۔ ہندوستانی زبانوں کی طرف عدم توجہ، جنہیں حقارت سے اناکرا کا نام دیا گیا تھا، اور اس کے نتیجے میں جدید فکر کے ذرائع کی حیثیت سے ان کی پس ماندگی کی بنا پر وہ لوگ جو انگریزی نہیں جانتے تھے اور جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اُس عہد وسطیٰ کی دنیا سے نکلنے کے مواقع سے محروم ہو گئے جہاں وہ رہتے تھے اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان فاصلہ اور بڑھ گیا۔

ٹائوی اور اعلیٰ جماعتوں میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی کو رائج کرنے کا ایک اور بڑا نتیجہ ہوا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے بہت سے ہندو فارسی پڑھتے تھے پورے کچھ عربی بھی سیکھتے تھے اسی طرح بہت سے مسلمان ہندوستانی زبانیں پڑھتے تھے اور ان میں لکھتے بھی تھے چھمسکرت بھی پڑھتے تھے۔ لیکن جب ذریعہ تعلیم انگریزی ہو گئی تو ہندوؤں کے لیے انگریزی کے ساتھ عربی اور فارسی بڑھنا اور مسلمانوں کے لیے مسکرت سکھنا مشکل ہو گیا۔ ایک دوسرے کے کلاسیکی ادب سے عدم واقفیت بھی ایک وجہ تھی اس دور کی جو دونوں کے درمیان بڑھتی گئی۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ مغربی فکر اور انگریزی زبان کے مشترک علم نے اس کھائی کو کس قدر پائنے اور خرابی کو دور کرنے میں مدد دی۔

اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایک بدیہی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کا مجموعی نفسیاتی اثر کیا ہوا ہو گا لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ یہ لڑنے کی قوت پر بہت بوجھ پڑا اور فکر میں تازگی باقی نہ رہی۔

جب کرزن نے ہندوستان میں تعلیم اور پچھلے پچاس سال میں اُس کے عواقب کا جائزہ لیا تو وہ جس نتیجہ پر پہنچا اُس میں تعلیم کے فوائد مشغول تھے اُس نے کہا۔

”ایک اہم مکتب خیال ایسا بھی ہے جو اس بات کو نہیں پسپاتا کہ یہ تجربہ (ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا) ایک عظیمی تھا۔ اور اس کا نتیجہ تباہ کن۔ اُن کا خیال ہے کہ اس نے ایک ایسے ذہن اور لہرو اور کا جنم دیا ہے جو تنظیم سے عاری ہے، انضباط سے متغیر ہے، غیر مطمئن ہے اور کچھ صورتوں میں تو واقعی بغاوت کی طرف مائل ہے۔“ (1)

حالانکہ اُس نے اس رائے سے پورا اتفاق نہیں کیا لیکن اُس کا خیال تھا کہ ہندوستانی تعلیم بڑی حد تک ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے جس پر حکومت کو کنٹرول نہیں حاصل ہے اور یہ کہ ہندوستانی حکومت پر دن بہ دن زیادہ تنقید کرتے جا رہے ہیں۔ یا سرکار یقیناً تمہیں یوں سمجھے کہ زیادہ ”سرکش“ ہوتے جا رہے ہیں۔ اُس کا خیال تھا ان دونوں کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ چنانچہ اُس نے اس رویے کو بدلنے کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کی چنانچہ تعلیم کے کتر معیار کو بھانہ بنا کر جو بظاہر جائز سبب معلوم ہوتا تھا، اُس میں اُس نے ابتدائی ثانوی اور یونیورسٹی کی تعلیم کی خرابیوں پر روشنی ڈالی۔ ان خرابیوں کے متعلق اُس نے کہا۔

”ہم نے نصایات تعلیم اور امتحانوں کا ایک ایسا نظام بنوایا ہے۔ جو تعلیم کا بوجھ بڑھانے کے ساتھ انسانی عمل شمر میں نوعی خرابی کا باعث ہے۔ بھیڑوں کی طرح طالب علموں کو ایک لیکچر روم سے دوسرے لیکچر روم کی طرف اور ایک امتحان سے دوسرے امتحان کی طرف ہانکا جاتا ہے، لغات کی کتابوں کا انتخاب صحیح نہیں ہوتا ہے۔ ڈائریاں حاصل کرنے میں اُن کی تجارتی قدر و قیمت پر نظر رکھی جاتی ہے۔ سینوں میں

اراکین کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے۔ جن کا انتخاب تعلیمی قابلیت کے علاوہ ہر اصول کی بنا پر کیا جاتا ہے، سٹڈیٹوں کے پاس کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ فعال مگر اکثر اوقات بے سستی کی شکار کوششوں کا ایک عظیم نظام جس پر ایک بھوت کی طرح کسی خاص غرض سے بڑھنے کی معرفت رساں روح سایہ فگن ہے۔“ (1)

اسے پورے نظام کی تلخیص ان الفاظ میں پیش کی ”لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقی زندگی یعنی دینی، اخلاقی اور روحانی زندگی کے انعکاسات بہت کم اور دھندلے ہیں۔“ (2)

مہلتے کے باوجود یہ الزام غلط نہیں تھا، لیکن کرزن نے تعلیم کی ماہیت کو سدھارنے کے لیے جو طریقہ تجویز کیا اسے اسکی ماہیت اور خراب کردی خود اس کے الفاظ تھے ”ہمیں تعلیم کی مقداری نوعیت کے بجائے اسکی ماہیتی نوعیت پر نظر رکھنی چاہیے۔“ اس کی وجہ سے کرزن اور ہندوستان کی رائے عامہ میں کھلا ہوا ٹکڑو شروع ہو گیا جو پڑھے لکھے لوگوں کی بہت کم تعداد یعنی دس فی صدی سے غیر مطمئن تھی اور سمجھتی تھی کہ تعلیم کی توسیع ملک کے مفاد کے لیے ضروری ہے۔ لوگ داسرائے کے اراکوں کے متعلق مشکوک ہو گئے۔

ریلے ایجوکیشن کمیشن نے، جسے کرزن نے یونیورسٹی کی تعلیم کے نظام کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ سفارش کی کہ یونیورسٹی کے نظم کی تشکیل نو کی جائے، صرف امتحان لینے کے بجائے یونیورسٹی کے سپرد درس و تدریس کا کام بھی کیا جائے، ملحق کالجوں پر زیادہ کنٹرول رکھا جائے اور الحاق کے لیے زیادہ سخت شرائط رکھی جائیں۔

1904ء کے انٹرین یونیورسٹیز ایکٹ میں ان سفارشات کو شامل کیا گیا جس کی ان حکومت کو اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ یونیورسٹی کے ضوابط میں ترمیم یا منسوخ کر سکتی تھی۔

گوکھلے نے، جو ایک انتہائی ذمہ دار اور اعتدال پسند عوامی کارکن اور اہم ماہر تعلیم تھے ہندوستانوں کی بے چینی اور مایوسی کا ذکر ان تقریروں میں کیا پرل لیجسلیٹیو کونسل میں کہیں۔ انہوں نے اسبلی کو ”اس اقدام کے خلاف ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کے جذبہ مخالفت پر توجہ دلائی“ جس کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ (3) اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والی پچھلے آف آفس کی پچھنی کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے صاف صاف کہا کہ یونیورسٹی کے بااختیار اداروں کی تشکیل نو کی جو رعایت ایکٹ میں رکھی گئی ہے وہ ”اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مقامی لوگوں کی کوششوں پر برا اثر ڈالے گی“ اور مزید کہا ”اے کوئی فائدہ ہو گا یا نہیں ہو گا یہ بات مشکوک ہے لیکن جو نقصان اس سے ہو گا اسیں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔“ (4)

انہوں نے ان توقعات کی طرف اشارہ کیا جو کرزن کی تقریروں نے یونیورسٹی کے اصلاحات کے متعلق پیدا کردی تھیں اور شکایت آمیز لہجے میں کہا ”لیکن ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ نئی نئی امیدیں، جنہوں نے ہمارے دل خوش کر دئے تھے مگر اب ہمیں معلوم ہوا کہ اس اقدام کے بجائے جس کی ہم امید لگائے بیٹھے تھے ہمیں ہمیشہ ماہرین کی تنگ نظر اور مہنگی حکومت سے سابقہ پڑ گیا۔“ (5)

(1) ایضاً، صفحہ 70۔

(2) ایضاً، صفحہ 71۔

(3) گھوکیلے کی تقریریں دوسرا ایڈیشن، 1916ء، صفحہ 265۔

(4) ایضاً، صفحات 282-83۔

(5) ایضاً، صفحہ 304۔

کرزن اور تعلیم یافتہ ہندوستان کے درمیان ٹکراؤ تعلیم کے اس عمل کا نتیجہ تھا جو ہندو کالج کے قیام سے شروع ہو کر انیسویں صدی میں جاری رہا اس کی مابینا اور مقداری خرابیاں جو بھی ہوں جن کی وجہ سے تعلیم کی افادیت متاثر ہوگی لیکن اس کے نتائج نے اس کا جواز پیش کر دیا۔ تعلیم کا اصل مقصد ہے ذہن کی آزادی اور ایک آزاد ذہن کو ہمیشہ کے لیے بدلی مطلق العنانیت کا غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ کرزن نے، جو برطانوی سامراج کا سب سے بڑا وکیل تھا اس نوعیت کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جسے اس کے پیش روؤں نے جنم دیا تھا اس نے یہ قدم بڑے تذبذب اور مختلف عواقب کی امید کے ساتھ اٹھایا تھا کچھ انگریزوں نے اس کے نتائج کو پہلے ہی سمجھ لیا تھا لیکن انہوں نے سمجھداری معقولیت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ کچھ اور نے، جو اتنے ہی دور اندیش تھے، تعلیم کی توسیع کو تباہی کا پیش خیر تصور کیا لیکن تعلیم کو ان مقاصد کے تابع لانے کی تمام کوششوں کا جواز اس کی فطرت کے خلاف تھے، ناکام تھا۔ کرزن نے جن پالیسیوں کی داغ بیل ڈالی تھی ان کے نتیجے میں اس کے جانشینوں کے سامنے آئے۔

III۔ ہندوستانی اخبارات (1860ء-1900ء)

1857ء تک ہندوستانی اخبارات کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ بغاوت کے بعد کا زمانہ اخبارات کی نشوونما میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کے زمانے کو اخبارات کے بچپن کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ بہت سے اخبارات نکلے لیکن ان میں سے زیادہ تر کی زندگی محض چند روزہ تھی۔ ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ چھوٹا سا تھا اور ان میں اکثر چار صنفی کے ہفتہ وار تھے۔ اس دور ان انگریزی تعلیم پھیل رہی جو بڑھتے ہوئے متوسط طبقے کی علامت تھی۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور تین یونیورسٹیاں کام کر رہی تھیں۔ جن کی تعداد 1887ء میں بڑھکے پانچ ہو گئی تھی۔ مذہبی اور سماجی اصلاح کی تحریکوں نے سماج میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور مصلحین پرانے خیال کے لوگوں میں جو بحث و مباحثہ ہوتے تھے انہوں نے گہرا اثر لوگوں کے ذہنوں پر ڈالا تھا۔ جہاں تک سیاست کا تعلق تھا۔ بنگال بغاوت کی زیادتیوں اور ان کے نتائج سے محفوظ رہا تھا۔ لیکن سرکاری افسروں کے بدلے ہوئے ردے، دیہات میں بڑھتی ہوئی معاشی دشواریاں، جن کا اظہار بار بار پڑنے والے قسطوں سے ہوا تھا اور حکومت کے ہر کاروبار سے ہندوستانیوں کی علیحدگی ایسی وجوہ تھیں جنہوں نے ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی ہنجاری میں اور اضافہ کر دیا۔ ہندوستانی اُن واقعات میں زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے جو دوسرے ملکوں میں رونما ہو رہے تھے یعنی جرمن اور اٹلی کے اتحاد اور آزادی کی تحریک، آئرلینڈ میں ہوم رول کی تحریک، اور افریقہ میں مغرب کا بڑھتا ہوا غلبہ انگلستان کا مصر اور سوڈان پر قبضہ اور یورپی طاقتوں میں افریقہ کی تقسیم۔ ایشیائی ۲۲ عظم میں مغربی سامراج کی پیش قدمی چین کے ساتھ جنوبی، شرقی، اور وسطی ایشیائی ممالک کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔

چنانچہ اس قسم کے حالات پیدا ہو رہے تھے جن میں اطلاعات حاصل کرنے کی خواہش کا پیدا

ہونا لازمی تھا۔ اور اس خواہش کو صرف اخبار اور رسالے پورا کر سکتے تھے۔ چونکہ ایسا کوئی آئینی طریقہ موجود نہیں تھا جس کے ذریعے حکومت کی پالیسیوں اور اقدامات کے تعلق سے ہندوستانوں کی رائے عامہ کو ظاہر کیا جاسکے اور سیاسی تنظیمیں بھی نہیں تھیں جو عام لوگوں کے احساسات کا مظاہرہ کر سکیں اس لیے صرف اخبارات کے ذریعے ہی مانگیں اور شکایتیں متعلقہ افسران تک پہنچا سکتے تھے چنانچہ پرچار کا ایک آلہ کار مہیا کرنے میں اخباروں نے اہم رول ادا کیا۔

لیکن ابتدا ہی سے انہیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حکمران طبقے تنقید کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور لبرل ذہن رکھنے والے گورنر جنرلوں کو چھوڑ کر جیسے 1857ء سے پہلے مکاف اور 1857ء کے بعد رپن اُن میں سے زیادہ تر ہندوستانی اخباروں کو اگر تشویش کے باعث نہیں تو کم از کم تکلیف دہ ضرور سمجھتے تھے۔ سر جان کیملہی کی اس بات سے انہیں اتفاق تھا کہ آزاد اخبارات ایک مطلق العنان حکومت سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ چاہے وہ پوری مطلق العنانیت ہی کیوں نہ ہو۔⁽¹⁾ جفرسن کا یہ خیال اُن کے لیے کفر والحادی سے کم نہیں تھا کہ اگر اخباروں کے بغیر حکومت اور حکومت کے بغیر اخباروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو وہ آخر الذکر کی حمایت کریگا۔

انگریزی اخبارات

انگریزی اخباروں کی اشاعت نے مثال قائم کر دی۔ 1861ء میں ٹائمز آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔ اسٹینڈرڈ، ٹیلیگراف، کوریئر کو بھی ٹائمز میں ضم کر کے اس کو شروع کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے پہلے شمارے میں ایک ہندو گلاہور ہندوستان کے بڑے شہر کی حیثیت سے بمبئی کی اہمیت کا ذکر کر کے اپنے وجود کا جواز پیش کیا۔ ”تجارت ہو یا جنگ اُس کے دساکل سامراہی ہیں۔ اور وہ ایشیائی قدرتی منڈی اور راجدھانی ہے۔ بمبئی کا مستقبل کتنا شاندار ہوگا۔ اس کی پیشین گوئی کوئی مشکل ہی سے کر سکتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی پر امید کیوں نہ ہو۔ جب کہ شہر سامراہی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کے اخبارات ابھی تک صوبائی حیثیت کے تھے۔ ہم یہ اعلان کر کے کہ ہمارے اخبار کا نام ہے ٹائمز آف انڈیا وقت کی رفتار کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

1865ء میں الہ آباد میں پائیمیر شروع ہوا۔ اس کو حکومت کا ہموار اور انگلو انڈین فرتے کا آرگن سمجھا جاتا تھا۔ 1872ء میں سول اینڈ ملٹری ٹرٹ شملہ میں شروع ہوا اور 1876ء میں لاہور منتقل ہو گیا۔ یہ اخبار سول اور فوجی ملازمین کے مفادات کی وکالت کرتا تھا۔ اڈیارڈ پلنگ نے جس نے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں کچھ مدت تک سول اینڈ ملٹری ٹرٹ اور پائیمیر کے نائب مدیر کے فرائض ادا کئے۔ 1875ء میں رابرٹ ٹاٹ نے فرینڈ آف انڈیا خرید لیا اور کلکتہ کے چوبیس تاجروں کی مدد سے انڈینس مین قائم کیا۔ مہاراس میل اور مہاراس اسٹینڈرڈ اُس پریسٹنسی میں انگلو انڈین فرتے کی وکالت کرتے تھے۔ اسٹینڈرڈ جو 1877ء میں قائم کیا گیا تھا 1892ء میں ہندوستانوں کے ہاتھوں میں آ گیا اور ہندوستانی نقطہ نظر کی بڑی آزادی اور شدت کے ساتھ وکالت کرنے لگا۔

لیکن یہ سب انگلینڈ میں اخبارات تھے۔ اُس سے کہیں زیادہ اہم تھے وہ انگریزی اخبارات جو ہندوستان میں کی ملیت تھے اور جن کی ادارت بھی ہندوستانوں کے سپرد تھی شاید سب سے اہم تھا ہندو میٹریٹ جس کی ابتدا کی دو سال تک ادارت گریٹس چندر گھوش نے کی 1855ء میں ہریش چندر مکرجی نے اُس کی ادارت سنبھال لی۔ پلانٹری کے مظالم کو بے نقاب کرنے اور مظلوم کسانوں کو راحت پہنچانے میں وہ بڑی بڑی سے کام لیتے تھے۔ 1861ء میں اُن کے انتقال کے بعد لرسٹو داس پال اُسکے اڈیٹر ہو گئے۔ وہ انگریزی تعلیم کی مثالی پیداوار تھے۔ جو انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتے تھے اور برطانوی لبرلزم کے فلسفے کے حامی تھے۔ اُن کے زیر اثر ہندو پریٹریٹ بنگال کے مالکان اراضی کے بالائی متوسط طبقے کے مفادات کی نمائندگی کرنے لگا۔

پریٹریٹ کے مقابلے میں گریٹس چندر گھوش نے 1868ء میں بنگالی شروع کیا جو کسانوں کی ضرورتوں کی وکالت اور اُن کے خیالات کی ترجمانی کرتا تھا۔ سریندر ناتھ بھرجی نے، جو ان اخبار میں لکھتے رہتے تھے 1879ء میں اُسے لے لیا اور ہندوستان کا ایک سرکردہ اخبار بنادیا جو حکومت پر بلا خوف و خطر تنقید کرتا تھا اور ہندوستان کے مطالبات کی وکالت۔

1861ء میں انڈین مرد کے نام سے ایک اور ترقی پسند اخبار وجود میں آیا جس کی ادارت موہن گھوش کے سپرد تھی اور مالی امداد رابندر ناتھ ٹیگور نے کی تھی۔ اُن کے ساتھ کیشب چندر سین بھی کام کرتے تھے۔ انھوں نے پچھلے مدت تک اُس اخبار کی اڈیٹری کی۔ سریندر ناتھ سین کے زمانے میں یہ اخبار بہت ہرلعریز ہو گیا۔ گھوش برادران جینی سیرکار، بسنت کار اور بسنت کار نے 1868ء میں بنگال میں امرت بازار پر یکاثر شروع کیا۔ 1872ء میں اُسے کلکتہ منتقل کر دیا گیا اور 1878ء میں انگریزی میں شائع ہونے لگا تاکہ رونا کوک پر پریس ایکٹ کی افغانیات سے اُس کا پیچھا بچھٹ جائے۔ چھو چندر مکرجی نے 1882ء میں انیس انڈین میٹ شروع کیا۔ یہ سماجی معاملات میں قدامت پسند تھا۔

ابتداء میں مدراس اخبارات کامیاب نہ ہو سکے انیسویں ایٹن کا آرگن کریسنٹ، سرنی ماہور اور دیوان بہادر گھوٹا تھا اور پھر کچھ دوسرے خضرات کا شروع کیا ہوا انیسویں ایٹن اور مدراس کچھ ہی دن زندہ رہے۔ لیکن رائے عامہ کے آرگن کی ضرورت بہت محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ 1878ء میں ہندو شروع کیا گیا اس کی ادارت جی۔ سبرانیاز کے سپرد تھی اُن کی قابلیت نے اسے جلد ہرلعریز بنادیا۔ 1877ء میں مدراس اسٹنڈرڈ ایک انگلینڈ میں اخبار کی حیثیت سے شروع ہوا لیکن 1892ء میں وہ جی پلے کے ہاتھ میں آ گیا جنہوں نے اُسے ترقی پسند بنادیا۔ کے نٹ راجن نے انڈین سوشل رفاہر شروع کیا جو سماجی اصلاح کا بڑا حامی تھا۔

بمبئی میں کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں کی بنا پر یورپی اور ہندوستانی تاجر یعنی پارسی، بوہرے اور گجراتی ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ٹائمس آف انڈیا اُن کی مشترکہ سرگرمیوں کی نمائندگی اور اُن کے خیالات کا اظہار کرنے لگا اُس کا نقطہ نظر قدامت پرستانہ تھا اور وہ حکومت کی پالیسیوں کی شدت سے حمایت کرتا تھا۔ بمبئی میں ایک قوم پرست انگریزی اخبار نکالنے کی بھی کوشش کی گئی۔ 1882ء میں دادا بھائی نوروی نے، وائس آف انڈیا کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالنا شروع کیا جو بالآخر بہرہ امی۔ ایم مالاباری کے انڈین اسٹیلینڈ میں ضم ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ 1886ء میں فیروز شاہ مہتا نے ایڈوکیٹ آف انڈیا نکالنے کی

کوشش کی۔ لیکن اُس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے انگریزی تعلیم بسیں اور کچھ اور مصلوں کے شہروں تک محدود رہی جن کی ضرورتیں دوزبانوں میں شائع ہونے والے اخبار مثلاً اندو پرکاش، دینا پرکاش، سدھارک، نیو اوپینین وغیرہ پوری کر دیتے تھے۔ پچھلی صدی کے اختتام کے وقت 11 مرامی۔ انگریزی اور 13 گجراتی۔ انگریزی اخبار موجود تھے۔ مرمہا جسے ملک نے 1881ء میں انگریزی اخبار کی حیثیت سے شروع کیا تھا با اثر تھا لیکن اُسے وہ ہر دلعزیزی نصیب نہ ہوئی جو کیسری کو ہوئی۔

صوبجات متحدہ (آزپدیش) میں انگریزی زبان میں پہلا قوم پرست اخبار انڈین ہرلڈ 1879ء میں پنڈت اجودھیاناتھ نے شروع کیا تھا۔ تین سال تک وہ کامیابی کے ساتھ اہم انگلو انڈین آرگن پامیر کا مقابلہ کرتا رہا۔ 1890ء میں پنڈت نے ایک اور اخبار انڈین یونین اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پنجاب میں تربیون 1881ء میں شروع ہوا جس کو وجود میں لانے کا سہرا سردار دیال سنگھ بھٹیا کے سر ہے۔

ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی نشوونما

ہندوستانی زبانوں کے اخبارات 1857ء سے پہلے بھی بہت اثر رکھتے تھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ اُردو کے اخباروں نے بغاوت میں اہم رول ادا کیا تھا۔ 1857ء کے بعد سرکاری مصلوں کی مخالفت کے باوجود انہوں نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ حکومت خاص طور سے ان اخبارات کے اثر سے خائف تھی اُن کے خریدروں کا حلقہ بڑا نہیں تھا لیکن اُس کو اُن کے اثر کو ناپنے کا صحیح پیمانہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اُن کو پڑھنے والوں کی تعداد بہت تھی۔ پھر ایک بات یہ تھی کہ اُن اخباروں کا راست اثر پڑھنے والوں کا وہ طبقہ قبول کرتا تھا جنہوں نے اسکولوں میں انگریزی تعلیم نہیں پائی تھی اور اُن کی ہر بات کا یقین لے لیتے تھے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ بہت صاف گوئی سے کام لیتے تھے۔ اور ہم عصر انگریزی اخباروں کے مقابلے زیادہ تلخ لہجہ اختیار کرتے تھے۔

ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کی نشوونما کے دوسرے حصے سے پہلا مرحلہ تھا بغاوت سے لیکر عین کے وائسرائے مقرر کئے جانے تک یعنی 1857ء سے 1880ء تک اور دوسرے اٹھن سے کرزن تک یعنی 1880ء سے 1905ء تک پہلے مرحلے میں ہندوستانی زبانوں کے اخبارات جتنی دلچسپی سیاست میں لیتے تھے اتنی ہی سماجی اور مذہبی اصلاحات میں لیتے تھے۔ سیاست کی حد تک انگریزی حکومت کے تعلق سے اُن کا رویہ احترام و وفاداری کا تھا۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ سخت تنقید بھی کرتے تھے۔ پھر بھی فی الجملہ انگریزوں کے ساتھ رشتے کو مفید بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مبارک سمجھا جاتا تھا انگریزوں کے نیک ارادوں پر انہیں اعتماد تھا اُن جمہوری اور لبرل اصولوں کی وہ قدر کرتے تھے جو برطانوی تہذیب اور برطانوی پارلیمانی نظام کی بنیاد تھے۔

دوسرے مرحلے میں سیاست نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی اور سماجی اصلاح کی اہمیت کم ہو گئی تعلیم یافتہ ہندوستانوں اور خاص طور سے ہندوؤں کے تعلقات حاکموں اور دوسرے انگریزوں سے خراب ہونے لگے۔ حکومت کی پالیسیوں پر زیادہ گہری تنقید کی نگاہ ڈالی جانے لگی۔ اور ہندوستان کی سیاسی ترقی کے تعلق سے برطانیہ کے ارادوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ حالانکہ اُس وقت تک برطانیہ سے رشتے توڑنے اور آزاد ہوجانے کا خیال واضح شکل میں سامنے نہیں آیا تھا لیکن مصلوں کی ذلت نے لوگوں کو سوچنے اور چھپے چوری اُس کا اظہار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

1857ء میں کیٹنگ نے پریس ایکٹ کے ذریعے اخبارات کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اُس کے بعد لارنس نے ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی تنقید کا جواب دینے کے لیے ایک سرکاری خبر رساں ایجنسی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس اسکیم کو عملی شکل نہیں دی جاسکی اور وہ ترک کر دی گئی پھر بھی مطبعوں اور اخباروں پر پابندی عاید کرنے اور کتابوں کو رجسٹرڈ کرانے کی غرض سے 1867ء میں ایک ایکٹ منظور کیا گیا۔

نام نہاد وہابیوں کی سرگرمیاں بڑی تشویش کا باعث تھیں اس لیے اُن کا مقابلہ کرنے کی غرض سے 1870ء کی تعزیرات ہند میں 124 الف کیید نام زمانہ دفعہ کا اضافہ کیا گیا۔ اُس کا مقصد تھا اُمت مسلمین اور مقررین کو سزا دینا جن پر بغاوت کا الزام لگایا گیا ہو۔ تاہم بددک کے زمانے میں حکومت اور اخبارات کے تعلقات اور زیادہ خراب ہو گئے۔

اس وقت تک ہندوستانی اخبارات بڑی طاقت پکڑ چکے تھے۔ 1875ء میں بنگال میں 56 ہندوستانی زبانوں کے اخبار تھے اُن میں سے میں پوری طرح جم چکے تھے اور اُن کے خریداروں کی مشترک تعداد 30,000 (تھی ان اخباروں میں مندرجہ ذیل اہم تھے۔

دوار کا تاہد و دیابھوشن نے 1858ء میں سوم پرکاش شروع کیا۔ اُس کو عظیم، انشور اور سماجی مصلح ایسو چندر و دیاساگر کی سرپرستی حاصل تھی۔ و دیابھوشن کے بعد اُس کی ادارت سب تاہد شاستری نے منجالی جو برہمنو سماج کے لیڈر تھے۔ سماجی، اخلاقی اور سیاسی لبرلزم کے آگرن کی حیثیت سے اس پرچے کی بڑی قدر لی جاتی تھی۔ ششی کمار گھوش نے 1878ء میں امرت بازار پتریکا شروع کیا۔ جو 1878ء کے ورثا ظر پریس ایکٹ کے پاس ہونے تک بنگالی میں نکلتا رہا۔ اس کی جلد آئند بازار پتریکا نے لے لی۔ یہ ایک آزاد اخبار تھا جو بڑی دیانت داری اور ندری کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا۔ سندھ، مچاپرہا سستا اخبار تھا۔ جس کی قیمت بھی ایک پیسہ۔ اسے انڈین ریفرام ایسوسی ایشن نے 1876ء میں ٹیشپ چندر سین کی زیر ادارت نکالنا شروع کیا تھا۔ سدھارانی کو نیکم چندر چٹرجی کی نیک خواہشات کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔

ان ہفتہ وار اخباروں کے علاوہ کئی ماہواری اور دو ہفتہ بعد شائع ہونے والے اہم رسالے بھی روشن خیال پھیلا رہے تھے۔ اُن میں زیادہ تر ادبی، سائنسی اور مذہبی موضوعات کی اشاعت کرتے تھے۔ اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھے رہا سہہ سندھ (1863ء) جو کلکتہ بک سوسائٹی اور درناکھڑ لڑچکر سوسائٹی کا آرگن تھا۔ شک درپن (1863ء) جس کی جگہ 1868ء میں ایجوکیشن گزٹ نے لے لی، بنگلورن (1872ء) جس کی ادارت نیکم چندر چٹرجی کرتے تھے، بھارتی (1877ء) جیسے دکنی چندر تاہد ٹیگور نے نکالا تھا اور رابندر تاہد ٹیگور اور دوسرے اہم مصنفین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

اخبارات کے بڑھتے ہوئے اثر کو حکومت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ 1875ء کی بنگال کے انتظامیہ رپورٹ میں کہا گیا تھا۔

”برطانوی حکومت اور انتظامیہ کو مسلسل الزام دیا جاتا ہے۔ ناقابل عمل تجویز بھی اکثر پیش کی جاتی ہیں کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے اُسکے کینرے ڈالنا اور کسی بھی بات سے خوش نہ ہونا اُن کی عادت بن گئی ہے ہندوستان کے باشندوں سے انگریزوں کے بیوپار کے تعلق سے روز افزوں سدا کاظہار ہوتا ہے۔ اس قسم کا رجحان پھیلا جاتا ہے کہ علم اور عمل خیالات کے ہوش مند اثرات کا لحاظ کئے بغیر

خیلی تصورات کو مبالغہ آمیز توقعات سمجھ لیا جاتا ہے۔ اُس میں مزید کہا گیا تھا "ہندوستان کے باشندوں میں یہ عام خواہش جز پکڑتی جا رہی ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ اور سرکاری ملازمتیں اور حکومت کا نظام جو بہتر سے بہتر اشیاء فراہم کر سکتی ہیں اُن میں اپنے پورے حصے کے جائز دعووں پر زور دیں۔..... ہندوؤں کے کارہائے نمایاں کے تعلق سے اُن میں دن بدن بڑھتا ہوا آخر کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ جو ترقی کے لیے لازمی ہے۔ مختصر اُگھا جاسکتا ہے کہ ایک قسم کی شعوری نیچنی پورڈ ہنی پھیل موجود ہے۔" (1)

مغربی ہندوستان میں بھی اسی قسم کے حالات رونما ہو رہے تھے۔ 1871ء میں پریسڈنسی میں 29 مہینے، 26 گھنٹہ 30 آرڈو اور ایک فارسی کا اخبار تھا مرہنی کے اخباروں میں اندو پرکاش (1862ء) نیو اینڈین (1864ء) اور دین بندھو (1877ء) باثر تھے۔ اندو پرکاش جو دو زبانوں میں چھپتا تھا ترقی پسند لکھنے والوں مصلحین کا آرگن تھا۔ جس کے لکھنے والوں اور حامیوں میں رلتھ، بھندارکر، تنک، چندر اور کرور و شوشو شاستری پنڈت شامل تھے دین بندھو سید شوحد سہن کا آرگن تھا جیسے پھولے نے قائم کیا تھا جو ایک سماجی مصلح تھے۔ اس کے ایڈیٹر تھے کرشن رو بھالکر۔ یہ پرچہ پچھڑے ہوئے طبقوں کی وکالت کرتا تھا۔ جن کی جہالت، غربت اور پیداری پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ یہ پرچہ سیاسی اصلاح کا حامی نہیں تھا اُس کا خیال تھا کہ سیاسی اصلاح سے نچلے طبقوں کی قیمت پر بالائی طبقے فائدہ اٹھائیں گے۔ نیو اینڈین دو ہفتہ بعد شائع ہوتا تھا اُس کے ایڈیٹر و شوشو تھ تدرائن مند لک پرانے خیال کے تھے۔ اور اندو پرکاش کی اصلاح کی پالیسی کے خلاف تھے۔ بنگال کی طرح بمبئی میں بھی ایک مرہنی کا ستا ہفتہ وار اخبار دنیا جاکھ پوتا سے شائع ہوتا تھا۔ جس کی سالانہ قیمت تھی ایک روپیہ اور دو آنے۔

بمبئی کے دوسرے بااثر اخبار تھے۔ راست گفتار اور گزیرت مترا جس میں "بڑے زور دار ادارے" لکھے جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اُس کی تحریر میں بڑی سوجھ بوجھ ہوتی تھی۔ بمبئی کے اخباروں کے متعلق دکنیل نے لکھا تھا۔

"بمبئی کی پرچوشپاری آبادی نے، جس نے انگریزی طور طریقے سیکھ لیے ہیں اور اُن ریاستوں کے باشندوں کے فوجی کردار نے جن پر بمبئی کا گورنر راست حکومت کرتا ہے باجو اُس کی حفاظت میں ہیں۔ ہمیں درنا کر اخباروں سے متعارف کر دیا۔ جن کی نمایاں خصوصیت بنگال کے اخباروں سے بالکل مختلف ہے۔ پھر بھی اگر اُن کے ساتھ مناسب برتاؤ کیا جائے تو وہ مشرقی ہندوستان کے پتریکا اور پرکاش کے ایڈیٹروں کی مدد ہم لے کر زیادہ ذرا بھی خطرناک نہیں ثابت ہوں گے۔" (2)

بمبئی کے انتظامیہ کی 76-1875ء کی رپورٹ میں مرہنی اخباروں کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانیوں کے دستور کے حقوق کی وکالت کے متعلق شکایتی لہجے میں کہا گیا تھا۔ "دوسرے اقدامات کی آزادی کے ساتھ خدمت کی گئی مثلاً سیکریٹری آف اسٹیٹ اور ہندوستان کی عاملہ کے اختیارات میں توسیع، اخباروں کی آزادی پر مبنیہ پابندی اور مانچسٹر کی سوئی کپڑے پر درآمدی محصول کو منسوخ کرانے کی کوشش" (3) 78-1877ء کی رپورٹ میں کہا گیا کہ اگرچہ بمبئی کے اخبارات کا لہجہ معتدل ہے۔ اور سوجھ بوجھ کا پتا دیتا ہے۔ پوتا برابر حکومت کی مخالفت کر رہا ہے۔ اُس میں کہا گیا "اُن کی تحریروں کاغشا ہے کہ انگریز مظالم اور

(1) بنگال میں اقیاس کیا گیا 29۔ جنوری 1876ء۔

(2) کوٹھی، ڈیلیہ، ہندوستان اور شرعی لٹاک کے مقامی اخبارات کلکتہ رپورٹ، 787 (1877ء) صفحہ 373۔

(3) بمبئی میں انتظامیہ کی رپورٹ 76-1875ء صفحات 16-315۔

قریب سے خوش حالی کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ اور مظلوم لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بدعادت کریں اور انہیں ہندوؤں کے آبائی وطن سے نکال دیں۔“ (1)

مدرسہ پریسیڈنسی میں اگرچہ انگریزی زبان کے اخباروں کی رفتار سست تھی لیکن ہندوستانی اخباروں کی حالت تو بلیو سن تھی۔ عیسائی مشنری اخباروں پر چھائے ہوئے تھے لیکن ان کے اخبار محض مذہبی پرچار کرتے تھے۔ ان کے بعد مسلمانوں کے اخباروں کا نمبر تھا جن کی تعداد کل اخباروں کی ایک تہائی تھی۔ لارڈ ہاورٹھ نے، جو 1872ء سے 1875ء تک وہاں کا گورنر رہا، مسلمانوں کے اخباروں کی بہت افزائی کی۔ ان کے متعلق اس کا خیال تھا کہ ”وہاں ہیں جن میں ایک سطر بھی طبع زہر نہیں ہوتی ہے۔“

شمال ہندوستان میں جو موجودہ اتر پردیش، پنجاب، راجستھان، مدھیہ پردیش اور برار پر مشتمل تھا بنگال اور بمبئی کی طرح صحافت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ہندوستانی زبانوں کے اخباروں میں اردو پیش پیش تھی۔ ان اخبارات سے بظاہر وفاداری کے تمام لوازمات ظاہر ہوتے تھے۔ جس کی بڑی وجہ برطانوی راج کا خوف یا انگریز افسروں کی سرپرستی حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ ان میں کوہنور جو 1850ء میں شروع ہوا اور اخبار عام شامل تھا۔ جو 1870ء میں نکلا تھا۔

ڈکن کے بقول اس مرحلے میں ہندوستانی اخبارات کی حیثیت مندرجہ ذیل تھی۔ 1875ء میں 147 انگریزی کے اخباروں کے مقابلے میں 374 ہندوستانی زبانوں کے انگلو-ورنیکلر اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ جن میں سے 102 بنگال سے شائع ہوتے تھے، 86 بمبئی سے، 65 شمالی مغربی صوبات (اتر پردیش) سے، 58 مدراس سے اور 63 پنجاب، سندھ، صوبات متوسط (مدھیہ پردیش) اور راجستھان سے۔ (2)

ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کے خریداروں کا حلقہ مجموعی طور سے کہیں زیادہ بڑا تھا اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اگر ایک شمارہ کسی گاؤں یا گاؤں کے ایک بڑے حلقے میں پہنچتا ہے۔ تو اُس کے مندرجات سے جلد ہی آس پاس کا ہر شخص واقف ہو جاتا ہے۔“ (3)

IV - 1878ء کا ورنیکلر پریس ایکٹ

تمام دوسری مطلق العنان حکومتوں کی طرح ہندوستان کی حکومت بھی ہندوستانی اخبارات کے بڑھتے ہوئے اثر سے خائف اور مشکوک تھی اور برطانوی نوکر شاہی اور ہندوستان میں رہنے والے غیر سرکاری انگریز سخت تنقید پر فوراً تعقل کا اظہار کرتے تھے۔ اور اخبارات پر پابندی لگانے کے لیے سخت قانون بنانے کی سفارش کرتے تھے۔ حالانکہ اخبارات صحیح کراچی و فاداری کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ 1873ء میں سر چارلس کیمپبل نے، جو بنگال کا لٹریچر گورنر تھا، حکومت ہند سے سفارش کی کہ ایک ایسا قانون بنایا جائے جس کی رو سے موت تک مقدمہ چلائے بغیر ان لوگوں کو فوراً سخت سزا دی جاسکے جو حکومت کے خلاف شرارت آمیز اور باغیانہ الزام عائد کرتے ہیں۔ 1875ء میں برودا کے مہاراجہ ملہار راؤ کیواڈ کے خلاف

(1) بمبئی میں انتظامیہ کی رپورٹ 78-1877ء صفحات 26-42۔

(2) ڈکن، ڈیلی، کلکٹر رپورٹ، 787، (1877ء) صفحہ 362۔

(3) ملک کل، بی۔ بی، انگریزی تعلیم اور ہندوستانی قوم پرستی کی ابتدا، صفحہ 325۔

مقدمہ چلا اور اُسے تخت سے اتار دیا گیا۔ ہندوستانی اخباروں میں پہلی گئی اور اندو پر کاش نے ہندوستانی ریاستوں پر برطانوی حکومت کی حکم فرمائی پر شک ظاہر کیا اس سے حکمران حلقے میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اور ہندوستانی زبان کی اخباروں کی باغیانہ تحریروں کو کچلنے کا مطالبہ کیا گیا۔ سکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ سلیس بری نے پال مال کو لکھی اس رائے سے اتفاق کیا۔ ”ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کے بہت سے مضمون نہ صرف حکومت کی توہین کرتے ہیں۔ بلکہ چاہے وہ اُس کو جائز قرار نہ دیتے ہوں پھر بھی برطانوی حکام کے قتل کے جرم کو قابل درک کر ضرور سمجھتے ہیں“ (۱) اور ان نے مشورہ دیا کہ ”ان اخباروں کے خلاف تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائے“ حکومت کے قانونی مشیر کا خیال تھا کہ اس وقت جو قانون موجود تھے اُن کے تحت مقدمہ میں سزا پائی محکوک ہے۔

اُس کے بعد لارڈ لٹن نے اُس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اُس نتیجے پر پہنچا کہ ”ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کے مالکوں سے ضمانت کی رقم حاصل کرنے کا قانونی طریقہ شروع کیا جانا چاہیے“ ظاہر ہے کہ ہندوستانی اخباروں نے اس تجویز کی مذمت کی لندن کے ٹائمز نے بھی اس کو پسند نہیں کیا۔ (2)

بنگال کے لطیف گورنر نے مندرجہ ذیل بنیاد پر قانون بنانے پر زور دیا۔ ”حکومت کے کاموں اور سرکاری افسروں کے اداروں اور نیت پر تنقید کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ جو نہ صرف وفاداری کے مہتابی بلکہ کبھی کبھی تو باغیانہ ہوتی ہے اس پر حکومت ہند نے عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور 14 مارچ 1878ء کو (3) لارڈ لٹن نے کوئٹل سے ورناکلر پریس ایکٹ منظور کر لیا۔ اسکی رو سے مجسٹریٹوں کو اختیار حاصل تھا کہ وہ ہندوستانی اخباروں کے اڈیٹروں سے اس امر کی ضمانت لے سکیں کہ قابل اعتراض تحریریں شائع نہیں کریں گے یا انہیں حکم دیں کہ وہ طباعت سے پہلے پروف دکھائیں۔

ہندوستانی اخباروں نے اُن کے خلاف چیخ پکار کی اس اقدام کو غیر ضروری قرار دیا۔ اور ایک دفعہ پھر اپنی وفاداری کا اظہار کیا احتجاجی جلسے ہوئے جن میں ایکٹ کی مذمت کی گئی۔ ایک عرضداشت کے ذریعہ پارلیمنٹ سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ گلڈ سن کی قیادت میں لبرل پارٹی نے اس ایکٹ کی مذمت کی۔ بالآخر جب انگلستان میں کنزرویٹو حکومت کی جگہ لبرل پارٹی کی حکومت بنی اور ارڈر پین ہندوستان کا گورنر بنایا گیا۔ تو اس ایکٹ پر نظر ثانی کی گئی۔ لارڈ پین معاملے پر پوری طرح غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ایکٹ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اُس نے سکرٹری آف اسٹیٹ کو لکھا۔

مجھے اس سے برا طمینان ہوا ہے اور مجھے امید ہے کہ جلد ہی ہندوستان کے قوانین کی کتاب اس ناخوار ایکٹ سے پاک ہو جائے گی..... مجھے یہ امید نہیں تھی کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ جن مقامی اداروں سے مشورہ کیا گیا تھا۔ اُن میں سے بڑی تعداد تو تعزیرات ہند میں کسی قسم کی ترمیم کے حق میں نہ تھی واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے افسر ہندوستانی اخباروں کو ایک قسم کا شرم سمجھتے ہیں۔ جو غالباً ضروری ہے لیکن اُس کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ محدود رکھا جانا چاہئے۔ اُنھیں آزادانہ خیال کے فوائد کا کوئی احساس نہیں ہے۔“ (4) اس کے مشورے پر 19 جنوری 1882ء کو ایکٹ منسوخ کر دیا گیا۔ اور ہندوستانی اخباروں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

(1) پرنس نے اقباس دیا، محلہ بالا، صفحہ 279۔ (2) بنگال، 10، اپریل 1872ء، ٹائمز کا اقتباس۔ (3) ایضاً 1877ء۔

(4) رین کاٹھ سکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا فار کنٹین کے م، 29، اکتوبر 1881ء، یوشین ولف نے پبلیمار کوئٹل افسر پین کی سوانح میں اس کا اقتباس دیا ہے (پان برنی، 1921ء)، جلد ۱۰، صفحات 14-11۔

اخبارات اور قومی تحریک

لٹن نے جو غلط اقدامات کئے اُن کی زد سے مخالفت اور ناپسندیدگی کا ایک طوفان ٹوٹ پڑا، انگریزوں کے ارادوں کے تعلق سے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے اور سیاسی تحریک کی افادیت میں یقین بڑھ گیا۔ دوسرے مرحلے کے ابتدائی دنوں میں کچھ مدت تک حکومت کے مصالحت پسندانہ رویے کے لیے احسان مندی کے جذبے نے اخبارات کو ”سخت لہجہ اختیار کرنے سے باز رکھا“ لیکن جلد ہی نئی نئی اشتعال انگیزیاں کی گئیں اور نئے مسائل سامنے آنے لگے جن کی وجہ سے پرائیویٹ اور مخالفت کی تجدید ہو گئی۔ 1883ء کا لبرٹ بل، 1891ء کا رضانندی دینے کی عمر کا بل اور 1892ء کا کونسل ریفرم ایکٹ ایسے اقدامات تھے۔ جنہوں نے ایک دفعہ پھر سختی اور بے اطمینانی پیدا کر دی۔ 1893ء میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے جن کی وجہ سے حکومت اور عام لوگوں کے درمیان اور زیادہ دوری پیدا ہو گئی ایک فرقے کا خیال تھا فساد کی وجہ سختی حکام کی طرف سے کی جانے والی مسلمانوں کی حمایت اور دوسرا فرقہ سمجھتا تھا کہ اُس کا سبب تھا کہ اُن کے حقوق کے استعمال میں غیر ضروری مداخلت۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں شدید قحط پڑے جن میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں اور 1896ء میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی اُن حادثات نے صورت حال کو اور خراب کر دیا۔ کرنز کی نادری حکومت نے آگ پر تیل کا کام کیا۔

اخبارات کی تحریروں میں ایک نیا رجحان پایا جو سمجھے کہ پرانے رجحان کی ایک شدید شکل ظاہر ہونے لگی۔ مذہبی اور سماجی اصلاحات میں دلچسپی سر لڑی توجہ زبردی جو ابھی تک اُن کی تحریروں کا غالب منظر تھی۔ اب اخبارات زیادہ سے زیادہ سیاست پر توجہ دینے لگے اس تبدیلی کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی اصلاح کی تحریکات زیادہ سے زیادہ اہمیت اپنے اپنے فرقوں کی قدیم شان و شوکت اور طاقت کی احیا پر دینے لگیں اور اُس کے نتیجے میں سماجی اصلاح کی بحث پس پشت ڈال دی گئی۔ دوسری بات یہ تھی کہ عالمی حالات کا اثر محسوس کیا جا رہا تھا اس لیے کہ یورپ میں قومی حیات نو کی تحریکات نے طوفان برپا کر دیا تھا تیسری بات یہ تھی کہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں داخلہ تو بڑھتا جا رہا تھا نامساعدہ اوروں کی عدم موجودگی میں اخبارات ”پارلیمنٹ کا دائمی اجلاس“ بن گئے۔ اُن کے کالم حکومت کی سیاست اور اقدامات کے متعلق بحث کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ وہ حکومت کے انتظامی اور قانون سازان اقدامات کے متعلق ہندوستان کے لوگوں کے خیالات حکومت تک پہنچاتے تھے۔ اس قسم کے اقدامات کی تعریف بھی کرتے تھے جن کے پیچھے اچھے مقاصد کار فرما ہوتے تھے یا جن سے ہندوستانی مفادات کو فائدہ ہوتا تھا۔

اسی کے ساتھ اخبارات رائے عامہ کو ہموار کرنے صوبائی یا قومی کانفرنسیں منعقد کرنے، سیاسی تحریکات کی تنظیم کرنے، عوامی اداروں کو تعمیر کرنے اور عوامی مباحث میں حصہ لینے میں بھی بڑی مدد کرتے تھے خداجہ پالیسی یا داخلہ۔ انتظام کا کوئی مسئلہ اُن کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ ہندوستان کی عزت کا سوال ہو یا معاشی خوشحالی اور حکومت میں حصہ لینے کے مقصد کے حصول کا سوال ہو وہ اُس پر بحث ضرور کرتے تھے حکومت وقت کی ناراضگی کے خطرے سے بے نیاز وہ ہر سیاسی ٹانگ کو بار بار اور سختی کے ساتھ چیش کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی تاریخ کے دوسرے مرحلے میں اخبارات ایک اہم سیاسی ادارہ بن گئے تھے۔ اُن کا اثر اُن لوگوں پر بھی پڑنے لگا تھا جو دروازے کے گاؤں میں رہتے تھے۔ اُن کے لیے وہ سیاسی تعلیم

کاسب سے بڑا ذریعہ تھے۔

حکومت کے لیے وہ ایک ایسی انجینی تھے جو اُسے مطالبوں اور شکایتوں سے باخبر رکھتی تھی۔ اور اُس تک لوگوں کے خیالات اور توقعات پہنچاتی تھی اخبارات سرکاری پالیسیوں اور عمل کے تعلق سے عام لوگوں کے احساسات ظاہر کرتے تھے اور لوگوں کے اُن خطرات سے حکومت کو آگاہ کرتے تھے کہ انگلستان کے مفاد میں کہیں ملک کے مفادات کو قربان نہ کر دیا جائے۔ وہ صاف صاف ظاہر کرتے تھے کہ سیاسی غلامی کی حالت قومی خوداری کے منافی ہے۔

قدرتی طور سے ہندوستانی اخبارات تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی سرگرمی سے تعبیر کئے جاسکتے تھے اس طبقے کے رکن اُن کے مالک تھے اور اُن کا انتظام اور ادارت بھی اُن ہی کے ہاتھوں میں تھی اُن کے ذریعے سے متوسط طبقے نے پورے ملک میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی نمائندگی کا وہ جائز طور سے مطالبہ کرنے لگا۔ لیکن حکمران اس مطالبے کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اس کو دور خوراعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ بد قسمتی سے حالات اُن کے خلاف تھے اور اس مرحلے کے ختم ہونے سے پہلے ہی اُن کے انکار کی بنا پر اخبارات کے رویے اور طریق عمل میں ایک بڑی تبدیلی آگئی اور وہ انگریزی رائج سے آزاد ہونے کا مطالبہ بلند آواز کے ساتھ کرنے لگے یہ وہ مطالبہ تھا جو انیسویں صدی کے دوران زیر لب کیا جاتا رہا تھا۔

اخبارات انیسویں صدی کے اختتام پر

انیسویں صدی کے آخری ربع میں اخبارات کے جائزے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اُس وقت برطانیہ کے ساتھ اپنا رشتہ توڑنے کا خیال ہندوستان میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ اور ہندوستان پر انگریزی رائج کو واقعی مفید سمجھا جاتا تھا اس لیے کہ اُس کی وجہ سے ہندوستان کی سالمیت تقویت پاتی تھی اور اُس کے مادی اور تہذیبی مفادات فروغ پا رہے تھے۔ لیکن اسی لئے ساتھ بہت سے اخبار حکومت ہند کے انتظام سے مطمئن نہیں تھے وہ حکومت کی خارجہ پالیسی پر تنقید کرتے تھے جس کی وجہ سے مہنگی جنگیں لڑنی پڑتی تھیں، اخراجات میں تخفیف ہوتا تھا، محاصل بڑھتے تھے اور تعلیم، صحت عامہ اور آبپاشی وغیرہ کی طرح کے سماجی اور مادی بھلائی کے کام نہیں ہو پاتے تھے۔ ہندوستانیوں کو اعلیٰ ملازمتوں سے دور رکھنا اور برطانوی عملے کا تقرر کرنا جن پر زیادہ خرچ ہوتا تھا، ہندوستانیوں اور یورپیوں کے درمیان تکلیف دہ نسل اختیار کرنا پالیسی سازی اور قانون سازی کے کاموں میں انہیں شریک کرنے سے انکار کرنا۔ ایسی باتیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کی ذہنی صلاحیت اور اخلاقی دیانت داری پر انگریزوں کو بالکل اعتماد نہیں ہے اُسکی بنا پر ہندوستانیوں میں ناراضگی کے جذبات مسلسل پیدا ہوتے رہتے تھے۔

ایک مسئلہ جس کی بنا پر بدن بدن حکومت پر اعتماد کم ہوتا گیا۔ اور ہندوستان کے مختلف فرقوں میں علی بڑھتی رہی وہ تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی۔ اس مسئلے کے تعلق سے اخبارات کے رویے مختلف تھے جن اخباروں کے مالک اور مدیر ہندو تھے وہ یا تو مسلمانوں کو شدت پسندی اور ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ نہ کرنے کا الزام دیتے تھے یا برطانوی افسران پر الزام لگاتے تھے کہ بھوت ڈالو اور حکومت کردہ سرکاری پالیسی پر عمل کرتے ہوئے وہ مسلمانوں کی فرقہ دارانہ مانگوں کی حمایت کرتے ہیں۔ مسلمان

ادعائے کالزام ہندوؤں پر لگاتے تھے جس کی جزوی وجہ تھی اُن حقوق کی حفاظت جنہیں وہ جائز سمجھتے تھے، جزوی وجہ تھی اپنے فرقے کی اہمیت کا۔ اور جزوی وجہ تھی مالی نقصان کا خوف۔ بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ اُس کشیدگی نے زیادہ تکلیف دہ، رافنسوناک شکل اختیار کر لی۔ حالانکہ اُس کی ابتدا اور سم و درواج کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوئی لیکن وہ ایک خطرناک قسم کی سیاسی تزاؤ میں تبدیلی ہو گئی بد قسمتی سے دونوں فرقوں کے سمجھدار عناصر کی کوششوں پر خود اُن کے فرقوں کی تنگ نظری، حکومت کی مدد نہ کرنے اور کچھ حکام کی غلط اندازی نے پانی پھیر دیا۔

چنانچہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں ہندوستانی اخبارات زیادہ کار آمد ثابت ہوئے اور ہندوستان کے لوگوں میں اُن کا اثر بڑھتا گیا۔ ہر صوبے میں وہ انگریزی اخبار جن کے مالک ہندوستانی تھے۔ صوبے کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو خبریں اور افکار مہیا کرتے رہے اور اس طرح ہر صوبے کے انگریزی و اہل طبقتوں کو ایک واحد فرقے میں تبدیل کر دیا جو مشترک خیالات و جذبات رکھتے تھے۔ ہندوستانی زبانوں کے اخبار اُن خیالات و جذبات کی اشاعت لوگوں کے بڑے حصوں میں کرتے تھے۔ ان دونوں نے ملکر ملک میں قومی اتحاد کی طرح ڈالی۔

ہندوستان کے صوبوں میں بنگال رتی کے میدان میں سب سے آگے تھا۔ 1881ء میں اخبارات کی تعداد تھی 78 (28 بنگالی کے) لیکن 1905ء میں بڑھ کر 111 ہو گئی (65 بنگالی کے)۔ اُس زمانے کے انگریزی کے اخباروں میں سب سے زیادہ اہم اور بااثر تھا۔ بنگالی جس کی ادارت سریندر ناتھ بھرجی نے ہاتھ میں تھی اُس کے بعد امرت بازار پتریکا، ہندو پریات اور انڈین کامریڈ نمبر تھا 1903ء میں ایک اور انگریزی کا اخبار اُن کی صف میں شامل ہو گیا یعنی چندر پال کانو انڈیا۔

1857ء سے 1880ء تک کے زمانے کے اہم بنگال ہندو اخباروں کی فہرست میں سن جیونی (1883ء)، بنگ پالیس (1890ء)، بات بادی (1891ء) اور ہسوتی (1896ء) کا اضافہ ہو گیا۔ ایک روزنامہ بنگال اخبار دیک 1885ء میں شریں ہوا، بمبئی میں 79-1878ء کے خاتمے پر 177 اخبار تھے۔ صدی کے اختتام تک اُن کی تعداد بڑھ کر 178 ہو گئی تھی۔ اُن میں انگریزی کے، انگلو-مرہٹی، انگلو-گجراتی اور مرہٹی۔ گجراتی اخبارات شامل تھے خاص خاص اخبار تھے انگریزی کے انڈین اسپیٹیر، پونا ہیرلڈ اور مرہٹا، مرہٹی کا نیسری اور گجراتی کے قیصر ہند اور بمبئی ساچار۔ کیسری نے پہلے شمارے میں لکھا تھا "یہ اخبار چوکیدار کے فرائض ادا کریگا۔ جس کی بنا پر ہر انتظامی افسر رائے عامہ سے خائف رہے گا اور یہ کہ ہر غیر منصفانہ عمل کو بے نقاب کیا جائے گا" اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مرہٹی صحافت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

شمال مغربی صوبجات اودھ (آزپریڈیش) میں 1884ء میں شائع ہونے والے اخباروں کی تعداد تھی 90۔ اُن میں سے 76 اردو کے تھے۔ 12 ہندی کے اور 5 اردو۔ ہندی کے 1900ء میں اُن کی تعداد بڑھ کر 109 ہو گئی جن میں 70 اردو کے تھے۔ 32 ہندی اور 7 اردو۔ ہندی کی قابل غور بات یہ ہے کہ ہندی صحافت تیزی سے ترقی کر رہی تھی جبکہ اردو صحافت ایک جگہ رکی ہوئی تھی۔

مدرسے کے متعلق جو رپورٹیں ملیں ہیں اُن سے بڑھتی ہوئی صحافتی سرگرمیوں کا اندازہ نہیں ہو تا ہے لیکن اس بات کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ دوسرے صوبوں کی طرح وہاں بھی ترقی ہوئی ہوگی۔ 1882ء میں بی۔ سبرامینا آئر نے سودیش مترم شروع کیا جس نے جلد ہی ایک سرکردہ حامل

اخبار کی شکل اختیار کر لی جو ہر ترقی پسند اقدام کی حمایت کرتا تھا۔ منگلو کے اخباروں میں دیویک در دھتی سماجی اصلاح کی وکالت کرتا تھا اور آندھرا پرکاشیکا حالات حاضرہ میں دلچسپی لیتا تھا جن میں سیاست بھی شامل تھی۔ 1900ء میں جنوب کے اخباروں اور رسالوں کی تعداد تھی 161 جن میں سے 52 تھے تامل کے، 32 منگلو کے 12 کنڑ کے، 27 ملایالم کے اور 31 ہندوستانی کے جن میں کاو پرڈ کر کیا جا چکا ہے اُن کے علاوہ اہم اخبار مھیسما، لوک پکاری، وکٹ دوت، پراج مٹرم، کوپلا پتریکا اور منوراما۔

حکومت صحافتی سرگرمیوں کو شک و شبہ اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی رہی۔ پہلے پہلے حکومت نے اُس کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ 1885ء میں اخبارات کے متعلق جو رپورٹ تیار کی گئی تھی اُن میں اخباروں کے لیے اور انداز تحریر کو قابل اعتراض ٹھہرایا گیا تھا۔ پھر بھی اُس کو اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ اہمیت نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا خیال تھا کہ بنگال کی عصری ادبی سرگرمی کی نمایاں خصوصیت ہے اعتدال پسندی پر مبالغہ آرائی کو ترجیح دینا۔ اظہار کا جو بھی انداز اختیار کیا جائے حکومت کی نیت پر اُنہیں شک نہیں ہے نہ آزادی کی خواہش پائی جاتی ہے۔ رپورٹ لکھنے والوں کے مطابق اصل خرابی تھی حکومت کے ارادوں کے تعلق سے اطلاعات کی کمی اور اس کا علاج تھانہ صوری واقعات سے اُنہیں مطلع کرنا اور اُن کی وضاحت پیش کرنا۔ اس سلسلے میں ناتھ روڈ نے ایک اسکیم بنانے کی تجویز پیش کی تھی لیکن اُس کو عملی شکل نہیں دی جا سکی۔

لیکن جلد ہی رد اداری کا یہ رویہ بدل گیا۔ 1887ء میں حکومت بنگال کے چیف سکریٹری نے اخباروں کے معاندانہ لہجے کی شکایت کی۔ اُس نے کہا ”واقعہ یہ ہے۔ ہندوستانی اخباروں کے اصل خیالات کے تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے ارادوں اور عمل پر خدمت آمیز اور محاسناتہ تنقید کی آئینہ داری کرتے ہیں۔“ (1) پھر 1902ء میں شکایت اس طرح کی گئی ”عرف گیری اور نکتہ چینی سے بھری ہوئی تحریر تنقید جس کی بنیاد زیادہ تر صورتوں میں صحیحی اور مخالفت پر ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے اب بھی قابل تعریف مصنفین کا پسندیدہ طریقہ ہے۔“ (2)

بمبئی پریسڈنسی کے اخبارات کا میان بھی ویسا ہی تھا جیسا بنگال کے اخباروں کا اور حکومت کا رد عمل بھی اُسی قسم کا ہوا۔ 1880ء میں انتظامیہ کی رپورٹ میں ہندوستانی اخباروں کے بارے میں کہا گیا ”حکومت کی طرف ہندوستانی اخباروں کا عام رویہ حسب معمول پورے سال وقادارانہ رہا“ اُن کے بعد ایک نیا انداز اختیار کیا گیا کیسری، مرہٹا اور کل کی طرح اخبار وجود میں آئے اور اُنہوں نے ایک نئے عہد کی آمد کا اعلان کیا۔ کیسری اور مرہٹا کو ایسے وطن پرست اور نائی گرائی مصنفین کی سرپرستی حاصل ہو گئی جیسے چپ ٹنکر گر، ٹلک، اُپے، کھاوکر، کیلکر وغیرہ۔ وہ صحافت کو ایک پیشے کے بجائے قوم پرستی کے صرف حق کے پرچار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ٹلک، جو برطانوی حکومت کے شدید دشمن تھے، 1889ء سے 1920ء تک اُن دونوں اخباروں کے روح رواں تھے۔

کل، جس کے اوڈیر شیو رام مہادیو تھے، قوم پرستی کے خیالات کا پرچار کرنے والے تین اخباروں میں سے ایک تھا۔ وہ اتنے زیادہ ہر لغویز ہو گئے کہ اند پرکاش اور دینا پرکاش اُن کے آگے ماند

(1) براؤنر، ہے، حکومت بنگال کے چیف سکریٹری کی طرف سے حکومت ہند کے حلقہ داخلہ کے سکریٹری کو 25 نومبر 1887ء حلقہ داخلہ امور عامہ راج 1888ء، نمبر 451-408۔

(2) ایچ ایل انیشن، حکومت بنگال کے چیف سکریٹری کی طرف سے حکومت ہند، حلقہ داخلہ کے سکریٹری کو 29 اپریل 1903ء حلقہ داخلہ امور عامہ، حسب رد 10 نومبر 282 مئی 1903ء۔

پڑ گئے۔ انہوں نے سماج کارویہ بدل دیا۔ سماجی اصلاح کے کام کو دھکا پہنچا اور، قدامت پرستی اور سیاست کے برہمن ہونے طوقان سے مصلحین کو نبرد آزما کر لینی پڑی جس میں ان کی ہمدردی تھی۔

سیاسی مطالبات میں شدت پسند اور آزادیوں کی بنا پر کیسری اور کل دونوں کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ ہندوستانی اخباروں کے متعلق 1893ء کی رپورٹ بھیجے ہوئے حکومت بمبئی کے سکریٹری نے لکھا تھا ”مذہبی ادیان پرستی اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر سماجی اختیارات کی لہر ہندو سماج پر سے گزر چکی ہے۔ ہندو رائے عامہ کے بدترین آرزوئوں کی نمایاں خصوصیت ہے اس قسم کے سخت اعتراضات کرنا جن کا شمار برابر ثبوت نہیں کیا جاسکتا اور زبان کی بے لگبی۔ دوسرے مذہبی اداروں پر جو جملے کئے جاتے تھے اب ان کا رخ برطانوی حکومت کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ جو بڑی ناظر فداری کے ساتھ قانون کی حمایت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔“ (1)

1897ء میں بمبئی پریسڈنسی ایک بحران میں مبتلا تھی۔ بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے قحطوں اور وباؤں نے پریسڈنسی کی چولیس ہلا دی تھیں۔ شک و شبہ کے اس ماحول میں پوٹامیں وہ افسر قتل کر دیا گیا جو طاغوتوں کے تعلق سے اپنے فرائض ادا کر رہا تھا۔ انگلوانڈین اخبار آگ گولہ ہو گئے اور برطانوی حکومت کے لیے خطرے کا اعلان کر دیا حکومت گھبرا گئی۔ پونا کے شہر کا انتظام پولیس کے سپرد کر دیا گیا۔ اور اس لمحہ کے لیے خانہ تلاشیاں لی گئیں۔ حکومت کے خلاف بے اطمینانی پھیلانے اور تشدد کی ترغیب دینے کے جرم میں ملک پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں اٹھارہ مہینے کی سزا دی گئی۔

تقریباً ہند کی دفعہ 124 الف کی ترمیم کی گئی اور اسے زیادہ سخت بنا دیا گیا۔ حکومت بمبئی نے حکومت ہند کے نام اپنے خط میں لکھا تھا ”اس وقت جو صورت حال پائی جاتی اس کے بدترین نوعیت ہے ان اخباروں نے خریداریوں میں اضافہ جن کا لہجہ سب سے زیادہ تشدد آمیز ہے چنانچہ گورکھی کی، جو دوسرے سزا یافتہ ہو چکا ہے، 5,000 کاپیاں چھپتی ہیں۔ اس طرح کیسری کے خریداریوں کی تعداد 12,000 سے بڑھ گئی 13,000 اور کل کے 2,500 پر پے فروخت ہوتے ہیں۔ جو پریسڈنسی میں شائع ہونے والے اخباروں میں سب سے زیادہ کثیر پرور اور غرور ہے“ (2) اس نے مزید کہا کہ اخبارات میں تجزیہ کی کمی ہے۔ اور ان پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ 1903ء میں اخباروں کے متعلق جو رپورٹ بمبئی (3) میں تیار کی گئی تھی اس نے ہندوستانی اخباروں کی مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کی گئی تھی۔

”دلی مرہٹی کے اخباروں جو زیادہ تر چیت پادن برہمنوں کے ہاتھوں میں ہیں اور برطانوی راج کے خلاف مخالفت کا جذبہ رکھتے ہیں

(2) وہ اخبار جو کانگریس کے پرچار کی حمایت کرتے ہیں۔ اور زیادہ سیاسی حقوق کے تعلق سے ”سنے“

ہندوستان کے تو قعات کی وکالت کرتے ہیں۔

(3) (الف) وہ اخبارات جو اعتدال پسند ہیں، خاصے وفادار ہیں اور جن مسائل پر بحث کرتے ہیں

ان پر تنبیہ کی ہے اور دو دائرہ نظر ڈالتے ہیں۔

(ب) وہ اخبار جو پیش برطانوی پالیسی کی حمایت کرتے ہیں اور انتہائی وفادارانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں۔

(1) حکومتیات (بمبئی) 16 جولائی 1894 کا نمبر 4314۔

(2) بمبئی، جے ایل، حکومت بمبئی کے قائم مقام سکریٹری کا حکومت ہند کے حکمرانوں کے سکریٹری کو حکمران سیاست، 23 اگست

1901، نمبر 5963۔

(3) حکومتیات، جے ایل، حکومت بمبئی، جون 1904، نمبر 139، 138۔

(4) وہ مطبوعات جو مندرجہ بالا کسی بھی زمرے میں نہیں آتیں اور عام طور سے بے ضرر ہوتی ہیں۔“
 رپورٹ میں اس بات کو تسلیم کرنا پڑا تھا کہ جو اخبار برہمنوں کے ہاتھوں میں تھے مثلاً کیسری کل
 وغیرہ مقابلہ زیادہ بااثر تھے اور ان کے خریداروں کا حلقہ بھی زیادہ بڑا تھا۔

شمال مغربی صوبجات (آئر لینڈ) کے اخباروں کے سامنے بنگال اور بمبئی کے اخباروں کی
 مثال تھی۔ لیکن ان کا لہجہ مقابلہ زیادہ اعتدال پسند نہ تھا ”ہندوستانی زبانوں کے اخباروں میں اودھ اخبار راجہ
 رام پال سنگھ کا ہندی کا ہندوستان اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور انگریزی کے اخباروں میں ہندوستان
 ریویو، کانسٹھ سماچار اور ایڈوکیٹ بڑی سمجھداری کے ساتھ چلائے جا رہے تھے ہندوستان ریویو اور کانسٹھ
 سماچار کا شمار صوری اعتبار سے بہترین اخباروں میں ہوتا تھا۔ سنی زن کا لہجہ ویسا ہی رہا یعنی وہ عام طور سے
 حکومت کی غلطیاں نکالتا تھا“ (1)

”تاچو شی کے دربار کا تفصیلی حال بیان کیا گیا۔ لیکن کسی اخبار نے اس سلسلے میں جوش کا مظاہرہ
 نہیں کیا۔ اور سٹیزن نے اسے سامراج کے فضول مظاہرے سے تعبیر کیا۔

”ایڈوکیٹ نے کانگریس کے کام کی تعریف کی اور کہا کہ وہ ملک کے تمام لبرل تصورات کی حامی
 ہے۔ ہندوستان کو ایک مفتوح ملک تصور کرنے کی انگلو انڈین پالیسی کی خدمت صاف صاف لفظوں میں کی
 گئی، وائسرائے کی حیثیت سے کرنل کی موقف کاری کو وسیع کو اخباروں نے پسند نہیں کیا۔ اعلیٰ نوی عہدوں
 سے ہندوستان کے لوگوں کو علیحدہ رکھنے کو ”سامراج کی شدت پسندی“ سے تعبیر کیا گیا۔“ (2)

مگر اس کے اخباروں کا لہجہ اعتدال پر مبنی تھا۔ اس میں ہندو اور مد راسی اسٹنڈرڈ پیش پیش تھے جو
 اپنے خیالات اعتدال کے ساتھ کے ظاہر کرتے تھے۔ اسی طرح ہندوستانی زبانوں کے اخبار بھی عام طور
 سے شائستہ، لہجے میں تنقید کرتے تھے۔

(1) 1902ء میں صوبجات حصہ کے اخباروں کے متعلق ایڈیٹورس، محکمہ داخلہ امور عامہ (کانفرنس) روداد، حصہ ب ج ۱۰

1904ء

(2)۔ ایٹا۔

گیارہواں باب

سامراج اور اس کے ریکارڈ

سامراج اور اُس کا اعمال نامہ

ہندوستان میں متوسط طبقے کی نشوونما کے ساتھ سیاسی شعور بھی پیدا ہوا۔ انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اس نئے طبقے نے سیاسی امور میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے اخباروں نے اُس تحریک کو ہوائی شروع کر دی اخباروں اور اُس کے پڑھنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سیاست میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

تعلیم کی ترقی کے ساتھ یہ دلچسپی بھی بڑھی اور وسیع تر حلقوں میں پھیل گئی۔ 1858ء سے 1885ء تک یہ تحریک مقامی اور صوبوں تک محدود تھی لیکن یکساں مسائل لوگوں کی توجہ کے مرکز بنے ہوئے تھے جب مواصلات میں ترقی ہوئی تو صوبوں کے باہمی روابط بھی بڑھے، سیاسی تحریک نے صوبائی سرحدوں کو پار کیا اور قومی نوعیت اختیار کر لی۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ سیاست میں دلچسپی بڑھنے، رائے عامہ کا ایک شکل اختیار کرنے اور اُس کو ظاہر کرنے کے ذرائع کی تنظیم کے مقاصد کا انتشار اور خیالات، انتاف کو بڑھاد دیتا ہے۔ آزاد جمہوری ممالک کے سماجوں میں یہ اختلاف اُن سیاسی جماعتوں اور پارٹیوں میں ہوتا ہے جو مختلف مفادات کی نمائندگی کرتی ہیں اور امور عامہ کے تعلق سے مختلف خیالات رکھتی ہیں۔ محکم ممالک میں جہاں حاکم اور رعایا مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں سیاسی شعور اور سیاسی سرگرمیوں کی نشوونما محکموں کو انتظامیہ کو لبرل بنانے اور حکومت میں حصہ دینے کے مطالبوں پر آگہائی ہے۔ یہ مطالبہ بدلیسی حکومت کو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے باہمی تصادم جو بڑھکے طاقت حاصل کرنے کے لیے حاکم و محکوم کے درمیان جدوجہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہندوستان میں طاقت حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی جدوجہد دوسرے حلقوں سے گزری۔ پہلے مرطے میں مفتوح دور وسطی کے ہندوستان نے فاتح کا بھڑا اتار مہیکے کے لیے جنگ کی یہ مرطے 1858ء میں ختم ہو گیا۔ اُس کے بعد بہت بدلے ہوئے حالات میں دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ فاتحوں نے ایک منظم حکومت کا نظام قائم کر لیا تھا اور امن و امان کے مسئلے سے آگے بڑھکے لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی مثلاً تعلیم، سماجی اصلاح، مواصلات کی ترقی، ذراعت، صحت عامہ وغیرہ بدلیسی حکومت نے اپنے نکرہ چہرے پر ایک فیض رساں حکومت کی نقاب ڈال لی تھی۔ اور اصلاح اور ترقی کی ایک انجینی کی شکل اختیار کر لی تھی چنانچہ اُسے تعلیم یافتہ ہندوستانوں کی اطاعت حاصل ہو گئی جو انگریزوں کے قائم کردہ امن و امان کو اٹھارہویں صدی کی طوائف الملوکی سے آزادی تصور کرتے تھے۔ اطاعت نے بڑھکے قبول عام کی شکل اختیار کر لی جو بلا جبر واکراہ اور غیر مشروط نہ ہونے اور مفادات پر مبنی

ہونے کے باوجود حقیقی تھی۔

لیکن برطانوی حکومت اپنے سامراجی کردار سے چھٹکارا نہ پاسکی سامراجی ضرورتوں نے اُسے جنم دیا تھا اور اُس کی پالیسیوں کی رہنمائی کرتی تھیں۔ ابتدا میں اُن مفادات کے تعلق سے تنگ نظری سے کام لیا گیا اور فوری نوآبادی کی خاطر متوجہ ملک کا استحصال کیا گیا۔ خاص طور سے بنگال کی دیوبندی کی منتقلی کے بعد کی دہائیوں میں جلد ہی یہ محسوس کیا گیا کہ اس قسم کی تنگ نظری خود حکمرانوں کے لیے غیر مفید ہے سامراج کے دائمی مفادات اس کے متقاضی تھے کہ انتظامیہ کا ایک منظم اور کارگزار نظام قائم کیا جائے، امن کو برقرار رکھا جائے ملک کے مسائل کو اس طرح ترقی دی جائے کہ وہ انگلستان کی معاشی ضرورتوں کو پورا کر سکے اور ایسی تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں کہ کم سے کم لوگوں کا ایک حصہ بدیہی حکمرانوں کے طریقوں کو سمجھ سکے اور حکومت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا سکے راج کا اخلاقی جواز اور محکموں کی راضامندی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھا کہ روشن خیال حکومت کا قیام۔

ان طویل المدت تصورات کو عملی شکل دینے کے لیے ایک کارگزار حکومت کے قیام کی کوشش کی گئی۔ پالیسن نے، جو سامراج پر بلازور عایت تنقید کرتا تھا ان کی مندرجہ ذیل غیر مست تیار کی ہے۔ ”ہم نے ہندوستان میں وسیع تربیانے پر اور ہمیشہ کے لیے امن قائم کیا ہے جو سکندر اعظم کے وقت سے کچھ نصیب نہیں ہوا تھا ہم نے قانون پر متصفانہ طور سے عمل کر کے انصاف کا معیار بلند کر دیا ہم نے محاصل کو مضبوط کیا اور غالباً ان کا پورا ہجہ کم کر دیا اور اسی کے ساتھ دیہی حکمرانوں اور ان کے ٹیکس وصول کرنے والوں کی بددیانتیوں اور مظالم کا بھی سدباب کیا لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے ہم نے سرکاری اسکولوں کا ایک نظام بنوایا اور اس کے ساتھ نیم سرکاری مشنری ادارے بھی قائم کئے جو نہ صرف عیسائی مذہب کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ بہت سے صنعتی فنون کی بھی سزکوں اور ریلوں کے جال نے مواصلات اور آمدورفت کی سہولتیں پیدا کر دی ہیں اور آب پاشی کے سائنسی نظام نے زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھادی ہے۔ کوئلے، سونے اور دوسرے معدنیات کی کان کنی میں بڑی ترقی ہو چکی ہے۔ بہمنی اور دوسرے شہروں میں سوئی کپڑے کے مل قائم ہو گئے ہیں جن میں جدید مشینیں لگی ہوئی ہیں اور دوسری مشینیں صنعتوں کی تنظیم بڑے بڑے شہروں کے لوگوں کے لیے روزگار فراہم کرنے میں مدد کر رہی ہیں۔ چائے، کافی، نخل، پٹ سن، تریا کو اور دوسری مہار سے لائی ہوئی فصلوں سے ہندوستانی زراعت کو متعارف کر دیا گیا ہے۔ ہم ایسے بہت سے مذہبی اور سماجی توجہات کو رفتہ رفتہ ختم کر رہے ہیں جو انسانیت کے خلاف گناہ کا حکم رکھتے ہیں۔ اور ترقی کی ریلوں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور جہاں کہیں برطانوی اثر پڑ رہا ہے وہاں ذات پات کے نظام کی بھی ترمیم ہو رہی ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔“ (1)

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے فیض رساں اقدامات کی جو تعریف پالیسن نے کی ہے اس کو مبالغہ پر مبنی سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سول ملازمتوں سے تعلق رکھنے والے ”چین“ تعلیم یافتہ اور باختر لوگوں کے کاموں، سرکاری افسروں کی ”بے لوث اور سوچی سمجھی کوششوں“ اور ہندوستان کے معاملات کی رہنمائی میں گورنر جنرلوں اور وائسرائے ایوں کے تدبیر کے مظاہروں کا مجموعی نتیجہ کیا ہوا۔

(1) پالیسن، جے۔ اے۔، سامراج ایک مطالعہ تیسرا ایڈیشن۔ پراجائین ایڈیٹورز، لندن، 1938ء، صفحہ 287۔ یہ اہم کتاب 1902ء میں شائع ہوئی تھی۔

برطانوی سامراج سے جو بھی فائدے حاصل ہوئے جن میں سے کچھ نے ہندوستان کے اتحاد، قومی شعور اور بالآخر آزادی کے لیے ضروری حالات پیدا کر دئے پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نوعیت کی بنا پر سامراج جمہوریت اور حکومت خود اختیاری سے مناسبت نہیں رکھتی ہے اور خود کو ختم کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتی ہے۔ سامراج کی بنیاد طاقت پر قائم ہوتی ہے اور اُس کا آلہ کار ہوتا ہے فوجی طاقت۔ سامراج اور عسکریت ایک دوسرے کے حامی ہوتے ہیں وہ اپنی ماتحت نسلوں کی قیمت پر عروج پاتے ہیں خصوصاً جب نسلیں مختلف ہوتی ہیں۔

II۔ سامراج کی غارت گرانہ نوعیت

انیسویں صدی میں ایشیا اور افریقہ میں سامراج کی نوعیت ظالمانہ اور مضر تھی۔ جو قوم سامراجی سرگرمیوں میں شامل تھی اُس کے لیے بھی سامراج نصرت کا حکم نہیں رکھتا تھا اس نے انگریزوں کو دولت مند اور طاقتور ضرور بنادیا تھا لیکن اُس کی وجہ سے یورپ کی دوسری مقابلہ کرنے والی قوموں میں حسد اور رقابت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے اور بین الاقوامی جنگیں مچھڑ گئی تھیں۔ اس نے یورپ کی سامراجی ریاستوں کی داخلہ پالیسیوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ جوں جوں رقابت برہمی جنگ کے خطرے بھی بڑھتے جن کی وجہ سے روز افزوں پیمانے پر فوجی تیاریاں ضروری ہوئیں۔ جنگ کی تیاری کی بنا پر جو رقم سماجی بہبود، یعنی تعلیم، صحت عامہ اور لوگوں کی بھائی کے کاموں پر خرچ ہونا پڑتی تھی وہ فوجی سہولتوں پر صرف ہوئی اور ترقی رک گئی۔ عسکری ٹولوں نے سیاست پر قابو پانے اور جنگ کی نفیات پیدا کرنے کی کوشش کی جس نے ملک لے اندر اور ملک کے باہر لبرلزم اور جمہوریت کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی ایک طرف اگر برک نے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر انگلستان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی سامراجیت کے مضر اثرات سے آگاہ کیا۔ تو دوسری طرف بہت سے لوگوں نے انیسویں صدی میں صنعتی سامراج کے خطرے پر انگلستان کو توجہ دلائی۔ ان میں اس قسم کے لوگ شامل تھے جیسے رچرڈ کائنڈن جارج کائونل لوئی، جان براؤن، ایچٹھنی ٹرولوپ، جان اسٹورٹ مل ولفریڈ اسکاؤن بلٹ اور جان۔ اے۔ بابنس۔

سامراج کے خلاف دلیلوں کو ظاہر کرنے کے لیے بہت سی تحریروں میں سے دو کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے متعلق ایک خط میں جو 16، مئی 1858ء کو لکھا گیا تھا کائنڈن نے مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی تھی۔

”میں دو تارہوں کہ ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کی بنا پر ہمارا قومی کردار گرتے جائے اور آزادی سے ہمارا پیار ختم نہ ہو جائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہاں آپنے اپنے کردار کو گرائے بغیر ہم ہندوستان میں ایک مطلق العنان حاکم اور قضا کا رول ادا کر سکیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایشیائی فتوحات کی بنا پر قدیم یونانیوں اور رومنوں کے اخلاق خراب ہو گئے اور وہ بددیانتی کے شکار ہو گئے اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارا حشر بھی وہی ہو حالانکہ اُس کا انداز مختلف ہو سکتا ہے۔“ (1)

جے۔ اے۔ پالیسن نے لکھا تھا:

(1) جے۔ اے۔ پالیسن نے لکھا تھا: (اور ملے لائسن، میلٹن انڈیا کمپنی، لندن، 1908ء) جلد دوم، صفحہ 192۔

”سامراج اور فوجی، ڈپلومیٹک اور مالیاتی وسائل جو اُسے پروان چڑھاتے ہیں حالیہ حکومتوں کے لیے اتنے اہم ہو گئے ہیں کہ وہ پالیسی کی سمت مقرر کرتے ہیں، امور عامہ کے انصرام کو ایک خاص نقطہ نظر رنگ اور کردار عطا کرتے ہیں اور انجانے طور پر حساب فائدوں اور خطروں کی مسلسل تجاویز سے داخلہ پالیسی کے قریب تر اور زیادہ بنجیدہ عمل کو مرعوب کر دیتے ہیں۔ پارلیمانی طرز حکومت پر اس کا اثر جلد بڑتا ہے۔ اور بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی نمائندہ اداروں کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ انتخابات کے موقع پر رائے دہندگان سے یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ وہ مختلف قابل فہم پالیسیوں کے نمائندوں میں سے آزادی، سمجھداری اور معقول طریقے کسی کا انتخاب کریں..... ہاؤس آف کامنز کے مباحث میں حزب مخالف کی اختلاف رائے کی طاقت میں مسلسل کمی ہو رہی ہے..... خود حکومت کے اندر اُس قسم کی جو مرکزیت تو تیس کام کرتی رہی ہیں۔ (1) پالیسیں نے مزید کہا، ”سامراج اور جمہوری حکومت میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ اُن کی روح پالیسی اور طریقہ کار مختلف ہیں۔“ (2)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انگلستان کے لبرل حلقوں میں شدید سامراج مخالف جذبہ پایا جاتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں تصورات کی دو متوازی دھاراں موجود تھیں ایک طرف جمہوریت اور آزادی کے تصورات نے داخلی، سماجی اور سیاسی اصلاحات کو بڑھا دیا۔ اور پارلیمانی اصلاح، فوجداری قوانین سدھار، مزدوروں کے حالات کو بہتر بنانے، عورتوں کی آزادی مقامی حکومت کی تنظیم نو، تعلیم کی توسیع وغیرہ کی شکل اختیار کی اور خارجہ اور سامراجی سیاست کے میدان میں لبرل تصورات نے ایسے گروپوں کی تشکیل کی جیسے ”کلونیل ریفارمرس“ (استعماری مصلحین) ”سپر نٹسٹ“ (علیحدگی پسند) اور ”لعل انگلینڈس“ (چھوٹے انگلستانی)۔

لیکن دوسری طرف انیسویں صدی میں سامراجی غلبے کی سب سے زیادہ توسیع ہوئی۔ ایشیا اور افریقہ کے بڑے بڑے حصوں پر انگریزی حکومت قائم ہو گئی 1870ء اور 1900ء کی درمیانی مدت میں جن علاقوں پر قبضہ کیا گیا اُن کا رقبہ 4,754,000 مربع میل تھا۔ اور 1902ء کے تخمینے کے مطابق اُن کی آبادی آٹھ کروڑ اسی لاکھ تھی 34-1933ء میں سلطنت کا مجموعی رقبہ (برطانوی جزائر کو چھوڑ کے) 13,271 ملین مربع میل اور اُس کی آبادی 449 ملین افراد پر مشتمل تھی۔ اس وسیع سلطنت میں سفید فام لوگوں کی تعداد تھی 25,6 ملین اور غیر سفید فام کی 424 ملین حالانکہ جس رقبے پر سفید فاموں کا قبضہ تھا وہ اُس رقبے سے بڑا تھا جس پر غیر سفید فاموں کا قبضہ تھا۔ (3)

دو سلطنتیں

لیکن برطانوی سلطنت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی یعنی سفید فام نو آبادکاروں کی نو آبادیاں اور استحصال نو آبادیات (4) اور برطانیہ اعظمی کی سیاست میں وہ مختلف رول ادا کرتی تھیں۔ سفید حصہ اس قسم کی نو آبادیات پر مشتمل تھا جیسے کنڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ۔ یہ حصہ برطانوی اخبارات، عام

(1) پالیسن ہے۔ اے لور ہال، صفحات 147-48۔

(2) ایضاً صفحہ 15 (3) ایضاً، تتر، صفحہ 329۔

(4) ڈیشی۔ اے برطانوی سلطنت نو آبادیاتی جغرافیہ کا مطالعہ (جلد چہر بیب، لندن، 1925ء ترجمہ، ایف۔ ایف۔ رو، کتاب

اول، باب 3 اور 4۔

لوگ اور پارلیمنٹ کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا۔ بہت سے انگریزوں کا خیال تھا کہ اُن نوآبادیات کو رکھنا مناسب نہیں ہے۔ ایڈورڈ کین ویک فیلڈ کی طرح کے کچھ لوگوں نے حکومت کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے ایک تحریک چلائی کہ وہ ان نوآبادیات کے اس حق کو تسلیم کرے کہ انگلستان سے رشتہ توڑے بغیر وہ اپنی حکومت خود سنبھال لیں۔ کچھ دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ ایسی نوآبادیات کی قانونی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے جو اُس کے قابل ہیں۔ اُن میں کانڈن اور جارج کارنوال لوئس جیسے سپریمیٹ شامل تھے ایک زمانے میں ڈزرائل بھی نوآبادیاتی سلطنت کی افادیت کو مشکوک سمجھتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ اس کے اراکین بالآخر ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے پھر بھی ریفاہ رس نے تہیہ کیا تھا کہ وہ جارج سوم اور اس کے مشیر بوٹ اور تاتھ کی غلطیوں سے بچیں گے اور انہوں نے نوآبادیات کو حکومت خود اختیاری دیکر اُن سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک سفید قوم نوآبادیات کا تعلق تھا 1868ء کے بعد سامراج کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوا۔ نئی سلطنت کا تصور سب سے پہلے سرچارلس رکلے نے اپنی کتاب ”عظیم تر برطانیہ“ (1868ء) میں پیش کیا۔ ڈزرائل نے اپنے ردِ اجتماعی جوش کے ساتھ اس کی حمایت کی۔⁽¹⁾

سر جان سلی نے 1883ء میں اپنی بااثر کتاب ”انگلستان کی توسیع لکھی جس میں ”ٹھل انگلینڈ“ کا مذاق اڑایا اور اُسے ایک دہم سے تعبیر کیا۔ بے-اے-فراڈے نے اپنی کتاب اُشیان میں اُن نئے انگلستانوں کی طرف توجہ دلائی جو سمندروں کے پار نشوونما پا رہے تھے۔ اور پھل پھول رہے تھے۔ لیکن سب سے بڑا سامراجی تھا۔ جوزف جیمز لین (2) جو برطانوی سلطنت اور برطانوی نسل میں یواینین رکھتا تھا جو اُس کے مطابق ”جو دنیا کے پردے پر پائی جانے والی حکمران نسلوں میں سے ایک تھی“۔

اس نئے سامراج کا مقصد تھا خود مختار اکائیوں کی عظیم دولت مشترکہ میں سماجی دادرسی کی حیثیت سے نوآبادیات کو یکجا رکھنا جیسے ”آزوریا ستوں کی کہکشاں“ سے تعبیر کیا گیا۔

انیسویں صدی کے بعد اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ختم ہونے سے پہلے ریفاہ رس کا جواب حقیقت میں بدل گیا۔ 1867ء میں برٹش نار تھ امریکن ایکٹ نے کناڈا کو ڈومینیئن کی حیثیت دیدی۔ پانچ سال بعد کیپ کالونی کو ذمہ دار حکومت مل گئی۔ 1890ء میں مغربی آسٹریلیا میں اور 1893ء میں نئال میں ذمہ دار حکومت کے نظام کا قیام عمل میں آگیا۔ 1900ء میں آسٹریلیا کا من ویلٹھ ایکٹ کی رو سے آسٹریلیا ایک وفاقی یونین بن گیا۔ اور 1904ء میں ایک افسوسناک جنگ کے بعد جنوبی افریقہ، ٹرانس وال اور آر مییم فری اسٹیٹ برطانوی سلطنت کے اندر خود مختار ریاستوں کے حلقے میں داخل کر لی گئیں۔ اس کے مقابلے میں وہ اصول بالکل مختلف تھے جن کا اطلاق غیر سفید قوم سلطنت یعنی استعمالی نوآبادیات پر ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ انگلستان نے ہندوستان پر حکومت کی کبھی کبھی پارلیمنٹ اپنی ذمہ داری کا بھلے ہی اظہار کرے ورنہ کمپنی جو چاہتی تھی وہ کرتی تھی۔ پہلا موقعہ وہ تھا جب برک نے وارن ہسٹنگز پر الزام لگایا۔ لیکن سرکاری وکیل نے جتنا زبانی جمع خرچ کیا اس کے مقابلے میں مقدمے کا اثر بہت کم ہوا۔ ہر تیس سال بعد چارٹرڈ کی تجدید سے پہلے پارلیمنٹ جو تفتیش کرتی تھی وہ حقیقت میں انگلستان

(1) پیٹریک ڈزرائل کی سوخ نوالف-جی۔ مغربی چینی اور سی۔ ای۔ ٹیگ، جلد دوم، صفحات 545-534۔

(2) جوزف جیمز لین کے خیالات جاننے کے لیے دیکھئے اُس کی تصویریں جن کے اقتباسات جارج بینٹ نے سلطنت کے تصور میں

دئے ہیں۔ 1774ء-1947ء (لندن) اڈس انڈیا پارس پبک، 1962ء) صفحات 320-312۔

کے تاجروں اور صنعتی کاروں سے تہ گرد ہوں میں پائے جانے والی کمپنی کے حامیوں اور مخالفوں میں رسرکشی کے مترادف ہی جو ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور اپنے مفاد میں ہندوستان کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بورڈ آف کنٹرول نے، جس کا قیام ہیٹ کے انڈیا ایکٹ کی رو سے عمل میں آیا تھا۔ اور صدر جس کا سربراہ وہ تھا۔ اعلیٰ سیاسی امور کے علاوہ تقریباً نو سال حکومت کی۔ اُس کے بعد 1858ء میں جان اسٹورٹ مل کی مخالفت کے باوجود حکومت ہند کی ذمہ داری کمپنی سے تاج کو منتقل کر دی گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا کام ختم ہونے کے بعد صنعتی سامراج کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ برطانوی سرمایہ ہندوستان کو برآمد کیا جانے لگا اور بارش کاروں اور ریلوں میں لگایا جانے لگا۔ سرمائے کی اصل کاری کو بائسن نے "سامراج کی اصل جڑ" سے تعبیر کیا ہے چنانچہ شوم پیٹر کے اس نظریے کے برعکس کہ سامراج کی وجہ غیر معقول عناصر ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج کی بنیاد معاشی فوائد کی معقول تجارتی سوچ بچار اور حساب کتاب پر قائم تھی۔ نوٹس کا کہنا ہے کہ "انگریز دوسروں کو اپنے اندر جذب کرنے والی نسل نہیں ہے۔ توسیع کے اسباب عام طور سے معاشی ہوتے ہیں" (۱) سامراج کی بالادستی سرمایہ داروں کی برآمدی اور درآمدی تجارت اور حکومتوں میں اُن کی اصل کاروں کی حفاظت کرتی ہے۔

لیکن بنیادی معاشی اسباب میں کچھ اور اسباب کا اضافہ ہو گیا۔ یعنی طاقت، فخر، اور وقار۔ مثال کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی حکومت کے جواز میں ہندوستان نے، دشمنوں کو مہذب بنانے کا اپنا مشن پیش کرتی تھی۔

زیادہ تر انگریز اپنی حکومت کے نتائج سے بالکل مطمئن تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُس کے کارناموں پر فخر کرتے تھے اُن کے اطمینان کی وجہ یہ تھی ہندوستان کو حاصل ہونے والی اُن مسلمہ فوائد پر جن کا، نر پائسن نے کیا ہے، ایک طرف غور و فکر۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی تھا جس کو نظر انداز کیا گیا۔ مگر جسے کانڈن کی طرح نے عوامی کارکن باخبر تھے بائسن کی طرح کے مصنفوں نے اُسے بے نقاب کر دیا۔

سامراج کا یہ پہلو اُن تمام فوائد کی نفی کرتا تھا جن کا، کرائسکے حامیان، معترضین کرتے تھے۔ سامراج کا یہ پہلو کئی مکروہ خصوصیتوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ مثلاً، معاشی استحصال، عام لوگوں کی بد حالی اور محکموں کی اخلاقی معیاروں اور وقار میں گراؤٹ۔ سامراجی برطانیہ محکوم ہندوستان کو اپنا ذیلی سیارہ سمجھتا تھا۔ جس کا اصلی کام تھا۔ اپنے مالکوں کے لیے خون پسینہ ایک کرنا، اُن کی معیشت کی معاونت کرنا اور اُن کے راج کی شان و شوکت اور وقار میں اضافہ کرنا۔

سامراج نے اچھائی اور برائی، ترقی اور جمود کی آمیزش کی شکل اختیار کی 1858ء تک تعلیم یافتہ ہندوستانوں کا خیال تھا کہ اچھے اور ترقی پسند عناصر کی تعداد برے عناصر سے بہت زیادہ ہے۔ بددیانتی اور عدلیہ کی کام چوری، کسانوں پر مطالبوں کے تباہ کن بوجھ مضابطوں فائدوں پر عمل کرنے میں حکام کی سختی اور سب سے زیادہ انگریزوں کی غلطی کی پسندی اور گھمنڈ کے باوجود حکومت ملازمت کے مادی مواقع مہیا کرنے کا جو لبرل وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا۔ پھر بھی متوسط طبقے کے دانشوروں نے فی الجملہ برطانوی حکومت کو عام لوگوں کی بھائی کا خواہاں اور اس لیے وفاداری کے قابل سمجھا۔

III سامراجی حکومت کی نااہلی

ایک طرف سامراج عروج پکارا تھا دوسری طرف محکموں کی وسیع تعداد پر حکومت لڑنے کی اہلیت کم ہوتی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں 1857ء کی بغاوت نے برطانیہ کو بہت زیادہ خائف کر دیا تھا۔ اس کے رد عمل کے طور پر انھوں نے انگلستان اور ہندوستان دونوں کی حکومتوں میں سختی کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ توقع کے خلاف تھے۔ ماتحت جیسے یعنی حکومت ہند میں اختیارات کی مرکزیت پر زور دیا گیا۔ فوج میں برطانوی عناصر کو تقویت دی گئی۔ ہندوستان کی حکومت پر گورنر جنرل کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا۔ اور اُس کے دائرہ اختیار کو بڑھایا گیا۔ مرکزی عاملہ کے اختیارات کو تقویت پہنچانے اور اُس کے رقبوں کی دخل اندازی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اعلان کیا گیا کہ 1861ء کے ایکٹ کی رو سے جو لیجسلیٹیو کونسل قائم کی گئی ہیں۔ وہ حکومت کی قانون ساز کمیتیاں ہیں اور ذمہ دار اداروں کی نویت سے مبرا ہیں، جن کو درج فہرست اصلاح کا نام دیا گیا۔ اُن کے لیے سرسری انداز سے قانون بنانے کے اختیارات گورنر جنرل کو سونپے گئے۔ پبلکیشن کی مفادات پر عمل کر کے فوج کی برطانوی شعبے کی ضرورت سے زیادہ برتری کی ضمانت کی گئی۔ 1878ء کے اسلٹ ایکٹ کی رو سے ہندوستانوں کو اسلٹ رکھنے کی مخالفت کر دی گئی جس کو حکومت کی بقا کا خاص تصور بنایا گیا۔

جہاں تک انگلستان کی حکومت کا تعلق تھا انیٹ فار انڈیا کے نمائندوں اور نہ والے رول میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور انگلستان کے حکومت کے تعلق سے گورنر جنرل کو اختیارات میں تناسب کی کمی کر دی گئی۔ 1858ء کے ایکٹ کی رو سے بورڈ آف کنٹرول کے صدر اور کمپنی کے ڈائریکٹروں کے دو ہرے کنٹرول کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ اور کل اختیارات سکریٹری آف انیٹ کے سپرد کر دیے گئے۔ چنانچہ انگلستان کی حکومت کی داخلی دیکھ بھال ختم ہو گئی۔ اور سکریٹری آف انیٹ زیادہ کارآمد انداز سے کام لرنے لگا۔ اُس کے بعد انڈیا کو نسل کی تشکیل کی گئی۔ جو ایسے رہنماؤں کا کام پر مشتمل تھی۔ جو ہندوستان کے متعلق علم اور تجربہ رکھتے تھے۔ اُس نے ہندوستانی امور سے پنپنے کے لیے مقامی علم مہیا کر دیا۔ چونکہ مالیاتی اختیارات سکریٹری آف انیٹ کو حاصل ہو گئے تھے وہ اُن کی بنا پر حکومت ہند کے اخراجات پر نظر رکھنے لگا۔ اُن انتظامات کی آخری کڑی تھا 1877ء کا رائل ٹائسل ایکٹ جس میں صاف صاف کہا گیا تھا کہ گورنر۔ جنرل اور اُسکی کونسل سکریٹری آف انیٹ کے ماتحت ہے جس کو اختیار اعلیٰ حاصل ہے۔

انگلستان اور ہندوستان کے درمیان 1870ء میں راست کیبل ڈالا گیا، نہرو سڑک جہازوں کے لیے کھل گئی۔ جس کی وجہ دونوں ملکوں کے درمیان فاصلہ کم ہو گیا۔ اور بھاپ سے جہاز چلنے لگے۔ مندرجہ بالا امور کی وجہ سے انگلستان کی حکومت اور ہندوستان کی حکومت کے درمیان خط و کتابت اور خبر رسائی تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور یہ تبدیلیاں ممکن ہو سکیں۔ ہندوستان کی حکومت پر اُس کے اختیارات میں اضافے کے ساتھ سکریٹری آف انیٹ کے اختیارات پر کنٹرول کم ہو گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ کو ہندوستان کے امور میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اور سکریٹری آف انیٹ کے فیصلوں میں وہ شاذ ہی مداخلت کرتی تھی۔ انڈیا کو نسل کا کام صرف مشورہ دینا رہا۔

تھا۔ چنانچہ اس بات کو محض مذاق نہیں سمجھنا چاہئے کہ سکرٹری آف انٹیلیٹ کو مغل شہنشاہ سمجھا جانے لگا تھا۔ تاج کی منتقلی کے بعد اگرچہ ہندوستان پر برطانوی حکومت اظہار مضبوط و مستحکم معلوم ہوتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ غیر معینہ مدت تک قائم رہے گی لیکن اس کے طرز عمل کے جائزے نے یہ عیاں کر دیا کہ ظاہرہ صورت ایک فریب تھی اور یہ کہ عمارت کی بنیادیں کمزور تھیں۔ ایک سیاسی آلہ کار کی حیثیت سے اس میں بڑی تباہ کن خرابیاں تھیں۔

سب سے بڑی خرابی یہ تھی اگرچہ حکومت ہند کو بڑی بڑی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑتی تھیں۔ اس کے اختیارات محدود تھے اس لیے کہ حکومت ہند نے تمام اختیارات سکرٹری آف انٹیلیٹ کو سونپ دئے تھے۔ جس کا کوئی راست رابطہ ہندوستان کے لوگوں سے نہیں تھا اور جیسے اُن کی رایوں، خواہشوں اور جذبات کے متعلق کچھ نہیں معلوم تھا۔

سکرٹری آف انٹیلیٹ ایک مطلق العنان حکمران بن گیا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ عمل یا نظریے کی حد تک وہ ہندوستانیوں کے سامنے جو ہندہ نہیں تھا لیکن بڑی عجیب بات یہ تھی کہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے بھی وہ مدد داری سے قریب قریب بری تھا۔

حالانکہ اقتدار اعلیٰ پارلیمنٹ کو حاصل تھا پھر بھی انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی حکومتوں پر اس کی گرفت ڈھیلی ڈھالی اور غیر مسلسل تھی۔ ہندوستان میں جو قانون سازی ہوتی تھی اس پر وہ بہت کم توجہ دیتی تھی سکرٹری آف انٹیلیٹ اس کو کنٹرول کرتا تھا ہندوستان کی آمدنی اور خرچ میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ اور چونکہ سکرٹری آف انٹیلیٹ اور اس کے عملے کی تنخواہوں کا بوجھ انگلستان کے بجٹ پر نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے وہ اُن کی ضرورتوں کا جائزہ نہیں لیتی تھی کبھی کبھی وہ ہندوستانی امور کے متعلق تجاویز منظور کرتی تھی جن پر حکومت کوئی توجہ نہیں دیتی تھی۔ مثال کے طور پر 1889ء اور 1891ء میں انیم کی تجارت کے متعلق اور 1893ء میں بیک وقت ہندوستان اور انگلستان میں سول سروس کے امتحان لینے کے سوال پر تجاویز منظور کی گئیں ہانگکونگ اور چیفسورڈ نے اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ”لیکن ہم بلا جھجک یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے معاملات میں جو دلچسپی پارلیمنٹ نے دکھائی وہ قطعی اور عدم معلومات پر مبنی تھی۔“ (1)

پارلیمنٹ کی گرفت ڈھیلی ہونے کی وجہ سے سکرٹری آف انٹیلیٹ کو کل اختیارات حاصل ہو گئے جس نے ہندوستان کی حکومت کو اپنا ماتحت بنالیا جب میونسپل قانون سازی کے معاملات میں اپنی کونسل کے اختیارات کو بردہ کر لانے کی کوشش کی اس سے کہا گیا۔ ”امسول یہ ہے کہ ہندوستان کے معاملات کو کنٹرول کرنے اور ایک سمت دینے کا قطعی اختیار حکومت انگلستان کو حاصل ہے۔ اور اُن حکام کو حاصل نہیں ہے۔ جن کا پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ہندوستان میں تاج نے تقرر کیا ہے۔“ (2)

اُس نے مزید کہا ”ہندوستان میں جو حکومت قائم کی گئی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انگلستان کی شاہی حکومت کے تابع ہے۔ اور کوئی حکومت اس وقت تک تابع نہیں کہی جاسکتی جب تک

(1) ہندوستان کی دستوری اصلاحات کے متعلق رپورٹ (1918)، صفحہ 20۔

(2) سکرٹری آف انٹیلیٹ بنام حکومت ہند 24 نومبر 1870ء۔

حکومت بالا کو یہ اختیار نہ حاصل ہو کہ وہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا حکم دے سکے اور معمولی دستوری طریقوں سے حکام سے اپنے اُن احکام کی تعمیل کرا سکے کہ وہ اپنی سرکاری حیثیت اور اختیار کا استعمال اُس پالیسی کو تقویت پہنچانے کے لیے کریں گے جس کا فیصلہ تاج کے مشیروں نے کیا ہے۔

میں یہ تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں ہوں کہ موجودہ صورت میں شاہی حکومت نے جو ہدایتیں دی ہیں اُن کا اطلاق قانون سازی کے امور پر ہوتا ہے۔ جو انتظامی امور سے مختلف ہیں۔ (1)

نار تھ بردک سے، جو ہندوستان کے معاشی مفادات کو کچھ اہمیت دینا چاہتا تھا، کہا گیا "ملکہ معظمہ کی حکومت جس انداز سے کنٹرول کرتی ہے۔ اُس کا اطلاق مالیاتی پالیسی پر بھی ہونا چاہئے" (2) اُس کے جواز میں دستور کی دفعات پیش کی گئی جو عملاً ایک اختراع قانون کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی سکریٹری آف اسٹیٹ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہے اور یہ ذمہ داری "ہندوستان کی دور دراز کی حکومت" پر نہیں ڈال سکتا۔

1894ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ سر ہندی ملڈرنے: بے وثوق کے ساتھ کہا کہ برطانوی کابینہ متحدہ اور ناقابل تقسیم ذمہ داری کے اصول کا اعلان دونوں انتظامی اور قانون سازانہ امور میں ہندوستان کی انگریزیوں کو نسل پر بھی ہوتا ہے۔ اُس نے گورنر جنرل کو اطلاع دی "مگر دونوں میں سے کسی بھی صورت میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جو حکومت ہند کے اراکین کے لیے ضروری ہے کہ اپنی رائے قلمبند کرنے کے بعد اگر وہ مناسب سمجھتے ہیں..... تو یا تو وہ حکومت کا ساتھ دیں یا وائسرائے کو اپنا حصہ پیش کر دیں۔" (3)

اس طرح حکومت ہند سے قانون سازانہ، مالیاتی اور انتظامی امور میں فیصلہ کرنے کے اختیارات چھین لیے گئے اور ایک قریب قریب غیر ذمہ دار سکریٹری آف اسٹیٹ کو اختیارات اعلیٰ سونپ دئے گئے جو معمولاً ہندوستان کے معاملات کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ ہندوستان میں حکومت کے چاروں طرف جو لوگ تھے وہ زیادہ تر صورتوں میں قدامت پرست اور پابندیاں عائد کرنے کے حامی تھے۔ مثلاً سرکاری ملازمتیں اور یورپوں کا غیر سرکاری طبقہ یعنی تاجر، مالدار، صنعت کار وغیرہ جیسا کہ البرٹ مل کے متعلق پیدا ہونے والی نزاع سے ظاہر ہوتا ہے۔

اُن حالات میں حکومت ہند کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ بدلتے ہوئے ہندوستان کے نئے اور اُلجھے ہوئے مسائل کے تعلق سے کوئی طویل المدت پالیسی اختیار کر سکے۔ وہ روزانہ کے مسائل میں الجھی ہوئی تھی جہاں تک انگلستان کی حکومت کا تعلق تھا وہ اپنی دستوری مجبوریوں کی بنا پر اس قسم کی پالیسی کا خاکہ بنانے کے قابل نہیں تھی۔ دستوری اصلاحات (1918ء) کے متعلق رپورٹ تیار کرنے والوں کو مجبوراً کہنا پڑا تھا "ہندوستان میں بڑھتے ہوئے احساس کے مقابلے میں مسلسل ترقی کی پالیسی پر غور کرنے اور اُسے ایک شکل دینے میں ہماری ناکامی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی انتظامیہ کے کاموں پر نظر رکھنے کا کوئی باضابطہ طریقہ پارلیمنٹ نے نہیں بنایا۔ یہ وجہ اتنی اہم ہے جتنی دوسری وجہ۔" (4)

(1) ایضاً۔

(2) سکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے حکومت ہند کے مہم 30 نومبر 1894ء۔

(3) سر تھوڈی ناڈلیم کی طرف سے لارڈ ائیکن کے مہم 30 نومبر 1994ء۔ (4) رپورٹ صفحہ 30۔

IV منافرت

1857ء کی بغاوت تک عکرائوں اور محکموں کے درمیان ویسے تعلقات تھے جیسے گلہ بان اور گلے کے مالک اور ملازمین کے ہوتے ہیں عکرائوں خود کو برتر نسل کے اراکین تصور کرتے تھے اور محکوم اپنی کمتری کا احساس رکھتے تھے کائن کے الفاظ میں ”حالانکہ فخر، تعصب اور غمخیز تو پایا جاتا تھا پھر بھی یہ رشتہ محلی اور نفرت سے پاک تھا۔“ (1)

بغاوت کے بعد ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں اور یورپیوں میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ مظالم کی کہانیاں جن میں اشتعال اور خطرے کے احساس کی بنا پر بڑی مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا تھا، پورے ملک میں رہنے والے انگریزوں میں پھیلی گئی۔ وہ انگلستان بھی پہنچا جہاں انہوں نے غصے اور انتقام کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ اراڈیلکن نے اپنے جرنل میں لکھا تھا ”کم تر نسلوں کے درمیان رہنا بڑے خطرے کا کام ہے جب سے میں مشرق آیا ہوں میں نے کسی مرد یا عورت کی زبان سے ایک جملہ ایسا نہیں سنا جو اس مفرد حصے سے مطابقت رکھتا ہو کہ عیسائی مذہب کبھی اس دنیا میں آیا تھا؟ کرچا ہے چینوں کا ہو یا ہندوستانوں کا نفرت، حقارت، غصے اور انتقام کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔“ (2)

جی۔ ٹریوٹین نے 1866ء میں لکھا تھا ”پھر ہمارے کردار کی انتہائی گراؤٹ نے ان تاریک بدقماش قبیلوں کو جنم دیا جن کے دجود سے ہم بے خبر تھے انتہائی درد مند اور شدید غصہ یعنی ایک عظیم قوم کی مجروح خودداری کے احساس نے پوری قوم کو ہلا ڈالا۔ یہ وہ خاصانہ خیالات ہیں جن کے خلاف کئی مرتبہ مسٹر براؤٹ نے دلائل پیش کئے لیکن ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ خاموشی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ رحم، انسانی ہمدردی اور انسانی جان کا، قار اور تقدس یعنی تمام وہ اصول جو عام حالات میں دائمی حقیقت تسلیم کئے جاتے ہیں اس وقت تک کیلئے جلا دیئے جائیں جب تک ہماری حکومت بحال نہ ہو جائے اور انتقام نہ لے لیا جائے۔“ (3)

ٹریوٹین نے 1866ء میں جو کہا تھا اس کا ثبوت بغاوت کے دوران انٹلوٹنرین اخبارات کی تحریروں سے ملتا ہے۔ فریڈ آف انڈیا نے 8 ستمبر 1888ء کو لکھا ”اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری (برطانوی) حکومت لوگوں کے لیے ضرورت سے زیادہ اچھی ثابت ہوئی جو جنگی جانوروں سے شاید کچھ ہی بہتر ہیں اور یہ کہ ان پر حکومت کرنے کے لیے کمپنی کا پرانہ طریقہ ترک کر دینا چاہئے تھا۔ اور ڈنڈے کے زور پر عکرائی کی چابی چابی تھی۔“

اخبار نے کرل دیوان بیل کی کتاب غدر کے دوران لکھے گئے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے سوال کیا ”عیسائی اور بت پرست، مسکن اور ایشیائی، روشنی اور تاریکی کیجیے رہ سکتے ہیں“ (4) ہندوستان پر کیسے حکومت کرنی چاہیے اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اس نے لکھا ”وہ طریق عمل جس کی بنیاد غلط

(1) کاشن، بلیٹ، جے۔ ایس۔، ہندوستان یا ہندوستان (لندن)، دوسرا ایڈیشن 1904ء، ص 37۔

(2) سورے، جے، کاڈن کی سوانح، جلد 2، صفحہ 190 حاشیہ بلکن کے جرنل کا اقتباس، 21 اگست 1817ء۔

(3) ٹریوٹین، جی، او، مقابلے، 11، (میلٹن، ایند 1866ء)، صفحہ 242۔

(4) ہفتہ آف انڈیا، 15 ستمبر 1859ء۔

نظریات پر قائم ہوتی ہے خود بھی غلط ہوتا ہے۔ فوجی کنٹرول میں کئی قسم کی ذہیل اور فلولاء کے ہاتھوں پر حملے کے دستانے چڑھانے کی کوشش فی الوقت ختم کر دی جانی چاہئے۔ تین ہزار سال کی تربیت نے ایشیا کے لوگوں کو طاقت ور کالوہانا سکھادیا ہے اور ان کے حکمرانوں کو ثابت کرنا چاہیے کہ ان کی فوجی طاقت بے پناہ ہے۔ (۱) اس نے حکومت سے کہا کہ وہ ہندوستان پر برطانوی سلطنت کے ایک جڑی حیثیت سے حکومت کرے یعنی ایک مفتوح بدیہی ملک جو کٹر نسلوں کا وطن ہے۔

شدید نفرت کا یہ جذبہ سب انگریزوں میں پایا جاتا تھا چاہے وہ حکام ہوں یا غیر سرکاری لوگ، خون آشام غدار مسلحانہ پرگالیوں کی بوجھار اور ”کمزور ہندو“ پر طنز وطن سول ملازمین اور باغدار دونوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ (۲) لیکن رفتہ رفتہ حکام کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور انہوں نے بغاوت کے واقعات کا اثر اچھی رائے اور عمل پر نہیں پڑنے دیا۔ (۳) لیکن نئے حالات پرانے حالات سے مختلف تھے ”ملک کے رہنے والوں میں اب پہلی سی دیل چھپی نہیں لی جاتی ہے اور اگلی سی ناقابل یقین جانب داری نہیں دکھائی جاتی ہے۔“ (۴)

حالانکہ بغاوت نے جن جذبات کو ابھار دیا تھا وہ ٹھنڈے پڑ گئے لیکن حکمران طبقے کا رویہ سخت ہو گیا۔ خود اعتمادی باقی نہیں رہی تھی۔ کاڈن کارو عمل تھا کہ ”فتح اور مفتوح کبھی بھی..... اطمینان اور آرام کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔“ (۵) حکمرانوں کے ذہنوں میں مستقبل کے لیے خطرات اور ہندوستانوں کے خلاف مشکوک و شبہات نے جو پکڑ لی تھی۔ سلطنت کے مزید تحفظ کی فکر پالیسی کو مست عطا کرتی تھی۔ سردوار، لکھنؤ، مالکوم اور مکاف کی قسم کے پرانے لوگوں کی طرح اب کوئی اعلیٰ افسر یہ نہیں سوچتا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہندوستان ایک آزاد ریاست بن جائے گا۔ پالیسن نے کہا ”عام طور سے اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ کٹر نسلوں کو حکومت خود اختیاری کا فن سکھائے گا۔ قدیم لبرل تصور پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور صرف اس وقت تقریروں میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب ملک پر الحاق کے نئے اقدامات کرنے کے لیے زور دیا جاتا ہے۔“ (۶) حکمران جن پالیسیوں پر عمل کر رہے تھے ان پر مندرجہ ذیل مصنفین کے خیالات کا کوئی اثر نہیں پڑا یعنی پورنیکا، جس کا خیال تھا کہ بالآخر ہندوستان کو آزاد ہونا ہے، یا کارلائل کا جو ہندوستان کی سلطنت کو دائمی تصور نہیں کرتا تھا یا رگلے کا جو حکومت اختیاری کو منزل تو تسلیم کرتا تھا لیکن اسکے خیال میں وہ منزل بہت دور تھی۔ ان کا نعرہ تھا کار گزار حکومت نہ کہ حکومت خود اختیاری۔ اس تبدیلی کا عکس حکومت کے کام کے طریقے میں دکھائی دینے لگا ہندوستان کے لوگوں کے لیے ان کے خطرناک نتائج کے باوجود مالیاتی پالیسیاں سامراجی معاشی اور سیاسی مفادات کے تابع ہو گئیں۔ تحفظ کی ضرورتوں نے لوگوں اور فوج کی تنظیم نو میں پھوٹ ڈالنے والے رجحانات کی بہت افزائی کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی فوج سامراجی مقاصد کے لیے تو استعمال کی جائے لیکن 1857ء کی طرح پھر کبھی

(۱) ایضاً۔

(۲) نریوٹین، جی۔ و، بحوالہ، صفحہ 262۔

(۳) ایضاً، صفحہ 261۔

(۴) ایضاً، صفحہ 260۔

(۵) سورے، بی، کاڈن کی سوانح، جلد 2، صفحہ 193۔

(۶) پالیسن، بی، اے بحوالہ، صفحہ 122۔

برطانوی حکومت کے لیے خطرہ بن سکے برطانوی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ محکموں کو ہمیشہ احساس کسری میں مبتلا رکھا جائے اور اسی کے ساتھ برطانوی سلطنت کی طاقت سے انہیں خائف رکھا جائے اور حکمران نسل کی برتری کو تسلیم کرایا جائے۔ اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانوں کے تقرر نہ کرنے کی وجہ بتائی گئی کہ وہ اخلاقی طور سے اس کے اہل نہیں ہیں اور نمائندگی اصول کو فرقدارانہ اختلافات اور ہم آہنگی کے عدم وجود کی بنا پر ناقابل عمل قرار دیا گیا۔

اُن مفید اقدامات کی وجہ بھی ہندوستان کی بھلائی نہیں تھی جن سے قومی ہم آہنگی بڑھی اور قومی ترقی نے فروغ پلایا۔ حقیقت میں وہ بھی سامراجی مقاصد کے پیش نظر کئے جاتے تھے حکومت کے فیصلوں میں عام لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کو ناقابل اعتنا تصور کیا جاتا تھا۔ امن و امان کو بحال رکھنا، انصاف کرنا اور قانون کے مطابق حکومت کرنا بذاتِ خود اچھی باتیں تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ سامراجی مقاصد کو کامیابی سے پورا کرنے کے لیے وہ ضروری شرائط کا حکم بھی رکھتی تھیں۔ ریلوں اور آمد و رفت کے دوسرے ذرائع کو ترقی دینے کی جو بھی اور وجہ ہوں لیکن ان کی سب سے بڑی وجہ تھی فوجی اور تجارتی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ زراعت کو ترقی دینی گئی تاکہ خام مال کی برطانوی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ صنعتی ترقی پر توجہ دینے کی وجہ تھی برطانوی صنعتوں کو ہندوستانوں کے مقابلے سے محفوظ رکھنا اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینا تاکہ ماتحت ملازمتوں کے لیے عملہ مہیا کیا جاسکے لیکن جس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ تعلیم کی ترقی سے آزادی کا تصور فروغ پاتا ہے تو اس میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ کیا جاتا تھا اور انہیں ایسی ”چھوٹی سی اقلیت“ سے تعبیر کیا جاتا تھا جو کسی کی نمائندگی نہیں کرتی ہے اور برطانوی حکومت کے لیے ایک امکانی خطرے کے طور پر انہیں اعتماد کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کی تاریخ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی مایوسی اور بے چینی کی تاریخ ہے۔ 1858ء سے 1885ء تک کچھ افراد اور صوبائی ایجنسیوں کے علیحدہ علیحدہ احتجاج کا زمانہ تھا لیکن اس زمانے میں بھی ہندوستانی رہنماؤں نے صوبائی تحریکات کو ایک وسیع قومی تحریک کی شکل دینی شروع کر دی تھی۔ پچیس سال میں اقرار نے انکار کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی بہت سی وجوہ تھیں ایک طرف تو حیات نو کا جذبہ تھا یعنی ہندوستان کے ماضی پر فخر اور مستقبل پر اعتماد کرنا سیکھ لیا تھا اور دوسری طرف یہ احساس تھا کہ آزاد ہندوستان پوری انسانیت کیلئے ایک پیغام رکھتا ہے۔ اس فخر اور احساس نے ان طاقتوں کے خلاف جو نئی نئی خود اتحادی کے لیے ایک خطرے کا حکم رکھتی تھیں اپنی شناخت کے احساس کو زندہ رکھا، آئین خودداری، ملائی ترقی، سماجی اتحاد، سیاسی مقدر یعنی سامراج کے حمل چیلنج پر کئی طرف ہونے والے ضلوس کا مقابلہ ہندوستان کو کرنا پڑا۔

یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ 1857ء کی بغاوت نے انگریزوں کو ہندوستانوں سے دور کر دیا۔ اور محکموں سے حاکموں کی علیحدگی نے بے مثال صورت اختیار کر لی۔ ان حالات میں شدت پیدا ہونے کی کئی وجوہ تھیں پہلی بات تو یہ تھی کہ سامراج کے تصور نے فخر اور تعصب دونوں کو بڑھا دیا برطانوی حاکموں نے اپنی فوجی کامیابی کو خدا کی مہربانی اور اس امر کا ثبوت سمجھا کہ کمتر نسلوں کو مہذب بنانے کے کام کر کے وہ احکام الہی کی تکمیل کرتے رہے ہیں۔

اس تصور کا پرچار کرنے والے دہکروہوں میں بنے ہوئے تھے۔ ایک گروہ وہ تھا جو اسکو ایک

نہ ہی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس کی ابتدا کی مثال تھا چارلس گرانٹ۔ اسکے بعد ولیم وارڈ منٹر عام پر آیا جس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں اخلاقی تبدیلی کرنے کے لیے انگریز خدا کے آلہ کار تھے۔ رچرڈ کالڈ ویل کا، جس نے تامل مطالبات میں پیش قیمت اضافہ کیا، خیال تھا کہ برطانیہ کی کامیابی اس امر کا ثبوت تھی کہ خود برطانوی حکومت کا حامی ہے اور کورال کا مترجم یوپ سمجھتا تھا اقتدار اعلیٰ رکھنے والے لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی ہندوستان کی خوشحالی کی ضامن ہے۔ مارش مین، جس کے سپرد کلکتہ یونیورسٹی کے لیے ہندوستان کی تاریخ کی نسائی کتاب تیار کرنے کا کام کیا گیا تھا، برطانوی سلطنت کو پورے ایشیا میں یورپی غلبے کی توسیع کے لیے ایک خدا داد ذریعہ سمجھتا تھا۔ (1)

دوسرا کردہ نسلی برتری کے وہ نظریات پیش کرتا تھا جن کی رو سے ایشیا، افریقہ اور دوسرے برعظیموں کی غیر سفید فام نسلوں پر مغربی اور نورڈک نسلوں کا غلبہ جائز تھا۔ جیمز لین نے نورڈک۔ میوٹاٹک نسلوں کی تعریف کی اور غصے نے ”نوق البشر“ کے قصیدے لکھے۔ شاعروں اور ادیبوں نے انگلستان کے مشن اور ”غید فام انسان کے بار“ کا پرچار کیا۔ مینی سن نے کہا۔

”ہمارے وسیع شرقی (مقبوضات) میں

پھیلتا ہوا انگلستان اور اُس کا تخت

ایک جزیرہ، ایک ایسا جزیرہ

جو اپنی عظمت سے واقف نہیں ہے“ (2)

رڈیارد کیپلنگ نے اپنے ہموطنوں سے کہا۔

سفید فام انسان کا بار اٹھاؤ

اپنے بچوں میں سے بہترین کو وہاں بھیجو

انہیں جلا وطن کر دو۔

تاکہ وہ تمہارے حکومتوں کی ضرورت پوری کر لیں۔

اپنی بھاری ذمہ داری کے ساتھ

وہ تڑپتے ہوئے اور وحشی لوگوں

یعنی نئے نئے زیر دام آنے والے

ان روٹھے ہوئے لوگوں سہارا دیں جو

نیم خود سر ہیں اور نیم نا سمجھ“

و کنویریا کے عہد حکومت میں انگلستان کی خوشحالی اور شان و شوکت اپنے نقطہ عروج پر تھی۔

کرشل پبلس کی نمائش (1851ء) نے ملک کی بڑھتی ہوئی طاقت اور روز افزوں دولت کا سب سے پہلا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ پہلے کہا چکا ہے انیسویں صدی میں برطانوی سلطنت دنیا کے بڑے حصے کے چوتھائی رقبے پر پھیلی ہوئی تھی دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ اُس میں رہتا تھا۔ اُن میں سے 70 فی صدی ہندوستان میں اور

(1) خلیس، سی، ایش، ہندوستان، پاکستان اور سری لنکا کے محور (نصین) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1961ء، دیکھئے پروفیسر مزیر اور

داکنز کے اسے ہال ہیٹھ کے مضامین، صفحات 332-354۔

(2) پبلنگ، آر، Hehite mans's buiden 1899، (مجموعہ تصانیف)۔

۱۷ مئی ۱۷۵۷ء کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ دنیا کی تاریخ کے اس عجیب و غریب واقع پر غور کرتے وقت چار کروڑ پچاس لاکھ انگریزوں کا سینہ فخر سے پھول جاتا تھا۔

برطانیہ کا بحری بیڑا سندھوں پر حکمرانی کرتا تھا۔ برطانوی منتوں نے دنیا کی مینڈیوں کو برطانوی مال سے بھر دیا تھا۔ لندن دنیا کی معاشی راہدہ عالی بن گیا تھا۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں انگلستان سب سے آگے تھا۔ بدلتی حکومتوں کے لیے قانون برطانوی مدد برتا رہا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں ڈان جیسی فیکو کے مطالبات پورے کرنے کے لیے جس کی برطانوی شہریت مشکوک تھی، پارس سن نے یونان کی ناکہ بندی کا حکم صادر کیا۔ اُس کے بعد اتحادی تحریکوں کو تقویت دینے کی غرض سے اُس نے جرمنی اور اٹلی میں مداخلت کی۔

ڈزرائلی نے سوتل کھل کمپنی میں مصر کے حصے خرید لیے اور اس طرح سلطنت کے بحری راستوں کے تحفظ کے ساتھ مصر کے داخلی معاملات میں مداخلت کا حق بھی حاصل کر لیا ۱۸۷۷ء میں اُس نے ملکہ وکٹوریہ کو قیصر ہند کا لقب دیکر اُس کی جوبلی منائی۔ افغانستان کے پہاڑی ملک کو برطانیہ کے حلقہ اثر میں لانے کی غرض سے اُس نے اُسے جنگ پر مجبور کر دیا۔

ڈزرائلی کے جانشینوں نے افریقی سرداروں کا بالکل لحاظ نہیں کیا۔ اور اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق اُن کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جنوبی افریقہ میں بورس نے اپنی جمہوریہ قائم کر لی تھی۔ انگلستان اُن کے ہیرے اور سونے کو بڑی حریفانہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ اور سیسل روڈس نے اس امید سے قاہرہ تک پھیلی ہوئی برطانوی سلطنت کی اسکیم تیار کی۔ ۱۸۹۹ء میں بورس کے خلاف جنگ شروع کرنے کے بہانے ڈھونڈ لیے گئے اور شمال اور وسط مغربی ایشیائی ممالک کی پکالونی میں کر لیا گیا۔

سامراج کے سامنے ہر طرف بڑھ رہے تھے اور اُس کے عمل درآمد کے لیے ہندوستان بہترین میدان تھا چنانچہ یہاں سامراج نے مختلف تنظیمیں اختیار کیں یعنی محکوم نسل پر اپنی برتری کا اظہار اور خود پسندانہ عقیدہ کی۔ ہندوستانیوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ اور غریب اور نادار لوگوں کے ساتھ ظالمانہ بیوہار، ہندوستانیوں کو با اختیار اور ذمہ دار مہدوں سے دور رکھنا اور خود مختاری نہ ماننے والوں کے لیے اُن کی اہلیت سے انکار۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ابتدائی دنوں سے اُس کی بنیاد پر بیکی تھی جب کمپنی کے حکام مغل نوابوں کی نقل کرتے تھے اور اُن کی طرح شان و شوکت کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ روایت پوری کی پوری انیسویں صدی میں برقرار رہی اور سرخ وردی پہننے والے چیراسی، چالپوس ملازمین اور زندگی کے کردار فریض میں داخل ہو گئے۔

انگریزوں کی سامراجی عقیدہ کی پسندیدہ اور ہندوستانیوں کے خلاف جذبات کو انڈین سول سروس کے لوگوں کو دی جانے والی تعلیم تقویت پہنچاتی تھی۔ نیلی بری کالج کے طالب علموں کو جیس مل کی تاریخ ہند پڑھائی جاتی تھی اور وہ توں تک ہندوستان کے متعلق انگریزوں کی معلومات کا ذخیرہ تاریخ بنی رہی۔

بغاوت کے بعد لے زانے میں ہندوؤں کی مخالفت لے جذبہ کو مسلمانوں کے خلاف دشمنی لے اُٹھانے والیا تھا۔ ہر ہندی اہلیت کی تاریخ ہند نے، جس نے آنے والے موزوں کی نسل کو جہد و علمی کی تاریخوں کے لیے، مواد فراہم کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خراب کر دیا۔ برطانوی تعصبات کو تقویت پہنچانے میں بڑا اثر انگریزوں کو دیا۔

مل نے اپنی تاریخ میں ہندو تہذیب اور ہندو کردار کی مذمت کرنے کی غرض سے تمام ماخذ لکھ کھال ڈالے اور پورا زور قلم صرف کر دیا۔ اس ملک کی تاریخ میں اُسے ”بغاوتوں، قتل عام اور وحشیانہ فتوحات“ (1) کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا۔ اُس کی ریاست میں ”کمزور اور اُدباش و حشت کی وہ قابل نفرت صورت نظر آتی ہے۔ جو ہندوؤں کی طرح کے بھول لوگوں کی حکومت کا ایک نظری خاصہ ہے۔“ (2)

ہندو سماج کو ”ماحتی کے ذلت آمیز اور تباہ کن نظام“ (3) سے تعبیر کیا گیا ہے، ذات کیلئے کہا گیا ہے۔ ”ایسا ادارہ جو انسانی کردار کے سدھار کے راستے میں ایسی رکاوٹ ہے۔ جیسی کہ تلون مزاجی اور خود غرضی نے شاید پہلے کبھی نہ کھڑی کی ہو۔“ (4) ہندوؤں کی مذہبی تنظیم کی ”بنیاد ایسی عظیم اور تکلیف دہ توہم پرستی ہے۔ جیسی کہ شاید ہی انسانوں کے کسی گروہ کی ذلت کا باعث بنی ہو (5) اخلاقی کردار کی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک خرابیاں تھیں ”وہی خلوص کا فقدان، وہی دروغ گوئی اور غائبازی، دوسروں کے احساس کے تعلق سے وہی بے نیازی، وہی نمائش بینی اور ضمیر فروشی، دونوں کے مشترک خاصے ہیں“ (6)

ایلیٹ نے اپنے ”اصل مقدمے“ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا، مگر مختصر ایوں کیا تھا ”عام لوگوں کی بد نصیبی اور ناامیدی کے گہرے اندھیروں میں پھینک دئے گئے ہوں گے۔ اس جلد میں جو چھوٹے موٹے اقتباسات دئے ہوئے ہیں۔ اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مخالفت کرنے کی بنا پر ہندو قتل کئے جاتے تھے جلوسوں، عبادت اور طہارت کی عام مخالفت تھی اور اس کے علاوہ بھی غیر رواداری کے مظاہرے کئے جاتے تھے مثلاً بت توڑے جاتے تھے، مندر منہدم کر دئے جاتے تھے، بالآخر اسلام قبول کرنے اور شادی کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا، جاوٹنی اور ترقی، قتل اور قتل عام اور اُن ظالموں کی شراب نوشی اور عیاشی عام تھی جیسے جو ہندوؤں پر حکومت کرتے تھے۔ مندر چہ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس تصور میں رنگ آمیزی نہیں کی گئی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ تصویر اُن لوگوں کی تحریروں سے بنائی پڑتی ہے۔ جنہوں نے واقعات بیان لئے ہیں اور جو ایسا لکھتے ہیں کہ اچھا بیٹوں کو پھند کرتے تھے اور نہ برائیوں کو تاپھند۔ دوسرے ملکوں میں بھی اس قسم کے مظالم نظر آتے ہیں لیکن کم از کم کچھ لوگ اُن کا، لر گئے اور نفرت کے ساتھ کرتے ہیں۔“ (7)

اُس کے بعد اُس نے تاریخ لکھنے کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی۔ ”وہ (ایرانی مورخین) ہماری ہندوستانی رعایا کو ہماری حکومت کے انصاف اور ترقی کے فوائد سے باخبر کریں گے۔ اگر اُن سے کوئی سبق ”سیکھتا ہے تو ہمیں مسلم ہندوستان کے متعلق بلا سوچے سمجھے بیانات“ دینے سے گریز کرنا چاہیے جو اکثر ایسے لوگ دیتے رہتے ہیں۔ جو یقیناً جاہل نہیں کہے جاسکتے ہیں۔ وہ کردار جو اس وقت اپنے کارناموں کی شان

(1) لاور، بلیسن، برطانوی ہند کی تاریخ، جلد، صفحہ 125۔

(2) ایضاً، صفحہ 377۔

(3) ایضاً، صفحہ 131۔

(4) ایضاً، صفحہ 343۔

(5) ایضاً، صفحہ 133۔

(6) ایضاً، صفحہ 366۔

(7) ایلیٹ اور ڈر سن The History of India told by Its Own Historians ہندوستان کے تاریخ نویسوں کی تاریخ۔

8 اصل مقدمہ، صفحہ XXI

و شوکت اور لگا تار فتوحات کی بنا پر مشہور ہیں۔ اگر اُن کے چہروں سے چالچلی کی نقاب ہٹادی جائے اور خطابت کھاری سے اُنہیں محروم کر دیا جائے اور اصل رنگ میں پیش کیا جائے تو وہ انسانیت کے دامن پر ایک بد نما دھبہ نظر آئیں گے۔ ہمیں اُن بابو لوگوں کی بات نہیں سننی چاہیے جنہیں ہماری حکومت میں بڑی آزادی اور دوسری ایسی سیاسی مراعات جو کبھی کسی محکوم قوم کو نہیں عطا کی گئیں لیکن پھر بھی وہ طنز پرستی اور اپنی ذلت کے راگ گاتے ہیں۔ اگر وہ اُن جلدوں میں سے، جن کا ذکر بیان کیا جا رہا ہے۔ کسی ایک کو پڑھ لیں تو اُن نوجوان سیاست دانوں کو بڑی جلدی معلوم ہو جائے گا کہ تاریکی کے جن دنوں کی یاد میں وہ آپس بھرتے ہیں۔ اُن دنوں میں اگر وہ محکمہ خزانہ میں کسی ایک جملہ بھی زبان سے نکالتے تو ہماری حقارت آمیز خاموشی کے بجائے انہیں پھٹلے ہوئے سیسے یا سولی سے سابقہ پڑتا ہمیں اب لگان معاف لگان داری کے متعلق چیخ پکار پر کان نہیں دھرنا چاہیے جب ہر صفحے پر اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ اُس زمانے میں کوئی ایسی لگان داری نہیں تھی۔ جیسے فطری یا قانونی اعتبار سے واپس نہیں لیا جاسکتا ہو اور جو عملی طور سے بار بار واپس نہ لی جاتی ہو۔ مگر کوئی باحوصلہ حاکم اپنے مغل پیش رو دس کے ”انتہائی فیض رساں“ طریقوں کی پیروی کی خواہش رکھتا ہے تو اُس کے حوصلے پست کرنے کے لیے اتنا بتا دینا کافی ہے کہ محلوں، سراپوں، غلام گردشوں، مندروں اور مقبروں کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی نقل اُتاری جاسکے۔ وہ دیکھے گا کہ اگر ہم دہلی کے شہنشاہوں کی لمبی فہرست میں سے تین نام نکالیں تو لوگوں کی بہبود و خوشحالی کا خیال اُن میں سے کسی کو نہیں تھا اور کچھ پلوں اور سراپوں کے علاوہ جو محض شاہی فوجوں کی آمد و رفت کے لیے بنائے گئے تھے، اسے کوئی چیز ایسی نظر نہیں آئے گی جس کی تعمیر میں خود غرضی شامل نہ ہو۔ ہمارا یہ ارادہ نہیں ہے کہ اُن کی عمارتوں کے حسن اور شان و شوکت سے انکار کریں لیکن اُن کی تعمیر کی وجہ تھی خود نمائی اور کچھ مندرجہ بالا چیزوں کو پھوڑ کر اُن میں کوئی ایک بھی عام لوگوں کی بھلائی کی غرض سے نہیں بنائی گئی تھی۔“ (1)

ہندوستان مخالف جذبات کے خطرناک نتائج حکومت کے اراکین اور ہندوستان آنے والے لوگوں کی نظروں سے چھپے نہیں رہے۔ 1860ء میں سر چارلس وڈ نے کیٹنگ کے نام کئی خطوں میں اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا۔ کیٹنگ کے نام ایک خط مورخہ 2، ستمبر (2) 1880ء میں اُس نے امید ظاہر کی تھی کہ کیٹنگ اُس نسل مختصص کے احساس کو ختم کرنے میں کامیاب ہو سکے گا جو بدعتی جا رہا تھا۔ 9 اکتوبر، 1861ء (3) کو اس نے دو ججوں کے طریقہ کار پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا اور اُن مقدموں کے فیصلوں میں، اُس کی جانب داری کو شرانگیز قرار دیا تھا جو ہندوستانوں اور یورپیوں کے درمیان چلے تھے۔ ایک خط میں لیٹکن کو اُس نے لکھا تھا ”میں نے سنا ہے کہ ہمارے حکام اب ہندوستانوں کے ساتھ مہربانی اور تواضع کا رویہ برتاؤ نہیں کرتے تھے (جیسا بعد سے پہلے کرتے تھے)۔

یہ کہ ایک برتر نسل، ایک شریف انسان اور انگریزی شرافت کے نمونے کے طور پر ہم ہندوستانوں کی نظروں میں گرتے جا رہے ہیں۔“ (4)

(1) ایضاً، صفحہ XXXII اور بعد کے صفحات

(2) کوڈ کے کاغذات سر چارلس وڈ کا خط اول کیٹنگ کے نام 9 ستمبر 1860ء

(3) ایضاً 19 اکتوبر 1861ء

(4) کوڈ کے کاغذات سر چارلس وڈ کا خط اور ڈاکٹنگ نام، 26 جون 1862ء

جب بلکن نے ایک انگریز سپاہی روڈ کو، جس نے ایک ہندوستانی کو قتل کر دیا تھا، "کئی دفعہ مقدمہ چلانے کے بعد پھانسی دلوادی تو وہ نے اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ اُس نے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کا اثر قبول نہیں کیا۔ اُس نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ "پست ذہنیت انگریزوں میں یہ جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو کمتر نسل سمجھا جائے اور جی بھر کے ستایا جائے۔" (1)

بلکن نے سکرٹری آف اسٹیٹ کو جو خط لکھا اُنہیں روڈ کے مقدمے کے سلسلے میں اعتراف کیا کہ "ہندوستانیوں اور یورپوں کے ساتھ یکساں انصاف کرنا بہت دشوار ہے۔" (2)

سر جان لارنس نے کہا "حقیقت میں اُن دونوں طبقوں کے درمیان بڑی چوڑی خندق ہے اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اور چوڑی ہو رہی ہے یا نہیں۔ ان حالات کا سبب ہے۔ غرور اور اُس کے بعد ہونے والی تبدیلیاں۔ میں اُسے ایک بڑا خطرہ سمجھتا ہوں جو ہندوستان میں ہماری حکومت کو درپیش ہے۔" (3)

ایک اور خط میں نے لکھا تھا "اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مخالفت کی ایک بڑی وجہ ہے مذہب اس طرح نسل، رنگ اور سماجی طور طریق بھی اس کی وجہ ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے ہمدردوں کا نفروبی طریق کار بڑا اثر ڈالتا ہے۔ چاہے دھچکھا دیا برا۔" (4)

لارڈ لٹن نے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے متعلق لارڈ سلیس بری کو لکھتے ہوئے کہا تھا "لیکن جہاں تک تنگ نظری اور خنکی کا تعلق ہے وہ یقیناً امریکہ کے جنوبی باشندوں اور ہندوؤں کے بغیر فام مالکان اراضی کے بہت مشابہ ہیں۔" (5) تین ہفتے بعد قمر کے مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے سکرٹری آف اسٹیٹ کو لکھا "چونکہ قمر کے مقدمے کی بنا پر مجھے اُن مقدموں میں عدالتوں کے حالیہ فیصلوں کو غور سے دیکھنا پڑا جن کا تعلق ہندوستانیوں سے تھا اور مجھے بین الناصبی دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ ہوائی کورٹ کی منظوری کے بعد اپنے سانس کے قتل اتفاقی کے سلسلے میں قمر پر 30 روپیہ جرمانہ کیا گیا تھا لیکن کچھ دن پہلے ایک ہندوستانی کو چڑھانے کے لیے جس دوام عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔" (6) ایک مہینے بعد اُس نے مزید لکھا "نچلے طبقوں کے ہندوستانیوں کے ساتھ جو مظالم روا رکھے جاتے ہیں اور ہندوستانیوں کے بالائی طبقوں کی طرف حکام جس قسم کا رسمی رویہ اختیار کرتے ہیں اُس کے بعد تعجب تو یہ ہے کہ ہماری حکومت اور زیادہ غیر مقبول کیوں نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں ہمیں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن میں سب سے بڑا خطرہ سفید فام لوگوں کا پیدا کر دہ ہے۔" (7)

لارڈ کرزن نے لارڈ جارج بلکن کے نام ایک خط میں سول ملازمین کے معیاروں میں گراؤ پر اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے حکام کی لوگوں سے بڑھتی ہوئی دوری پر اُس کی توجہ دلائی اُس نے لکھا "انگلتان سے دلچسپی بڑھنے کے معنی ہیں کہ اس قدر اخلاقی قوت یہاں کم ہو جائے گی۔ خود ہندوستانی بھی

(1) ایضاً، اگست 1863ء

(2) بلکن کے کاغذات، بلکن کا خط سر پارلس وڈ کے نام، 22 جون 1862ء

(3) لارنس کے کاغذات، سر جان لارنس کا خط لارڈ کرزن یوزی کے نام، 19 ستمبر 1869ء

(4) ایضاً، 4 جنوری 1867ء

(5) لٹن کے کاغذات، لارڈ لٹن کا خط لارڈ سلیس کے نام، 5 اگست 1876ء

(6) ایضاً، 27 اگست 1876ء

(7) ایضاً، 28 ستمبر 1876ء

اس سے واقف ہوتے جا رہے ہیں وہ اپنے اخباروں میں مسلسل لکھتے رہے ہیں کہ صاحب اب پہلا سانس نہیں رہا اور یہ کہ دونوں نسلوں کے باہمی تعلقات بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہو رہے ہیں“ (1) کرن زن میں جو بھی اور خرابیاں ہوں لیکن ”انسانیت سے وہ سخت نفرت کرتا تھا“ اور چاہتا تھا ”کہ حق و صداقت کا بول بالا ہو اور مجرم کو سزا ملے“ (2) اُس کی وجہ سے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے اخبار اُس سے ناراض ہو گئے اور اُس پر سخت حملے کرنے لگے۔

ان بڑے بڑے افسروں نے جو کچھ کہا ہے اُنہیں اور شہادتوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ کو بڈن نے برائٹ کے نام ایک خط میں یہ واقعہ بیان کیا ہے ”اتفاق سے مجھے کچھ ایسی خواتین سے ملنے کا موقع ملا جو کچھ دن پہلے ہندوستان سے واپس آئی تھیں جہاں وہ باہر گاؤں میں رہنے کی عادی تھیں اس لیے کے اُن کے شوہر ہندوستان کی فوجوں میں افسر تھے۔ مجھے اُن کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ بھاری ہندوستانی رعایا کو عام طور سے مگر و جشی، کہا جاتا ہے“ (3) ایک اور خط میں اُس نے اعتراف کیا ”اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ کام ہندوستانی حکومت کی اصلاح، کسی طرح نہیں ہو سکتا حالانکہ موجودہ واقعات نے دونوں نسلوں کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی جس کو پانا نہیں جاسکتا ہے۔“ (4)

ٹریوٹلین کا کہنا تھا ”ہندوستانی عام طور سے تیسرے درجے میں سفر کرتے ہیں۔ اگر صاحبوں کا خوف، جس کو بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا، مان لیں تو زیادہ تر دولت مند ہندو غالباً فرسٹ کلاس میں سفر کرتا چاہیں گے۔“ (5)

ٹریوٹلین اور کچھ دوسرے افراد نے ہندوستانیوں کی توہین اور مار پیٹ کے واقعات لکھے ہیں ٹریوٹلین نے سوئی پور کے میلے میں خود دیکھا کہ ایک انگریز باندہ نے اچھے کپڑے پہنے ہوئے دولت مند اور باعزت ہندوستانیوں کو ایک شکاری کوزے سے زرد کو ب کیا۔ اُس نے ان حالات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

”ایک شخص جتنا زیادہ اس ملک میں رہتا ہے اتنا ہی اُس کا یقین بڑھتا جاتا ہے کہ اُس ملک میں فاتحوں اور محکموں کا باہمی اختلاف ایک دور از کار تصور ہے جسے آٹومیا سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔“ اُس نے مزید کہا ”واقعہ یہ ہے کہ ہمارے کردار جو نسلی تعصب اور فخر چلایا بسا ہوا ہے وہ افسوسناک ہے اور اس کو محض اعلیٰ تعلیم اور دشمن خیالی کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہے۔ سماجی اعتبار سے جتنا نچلا طبقہ ہو گا اتنے ہی زیادہ اس معر جہ کے علامتیں اس میں نظر آئیں گی۔“ (6)

گر ہم نے سر سید احمد خاں کی سوانح میں مسٹر جنسن محمود کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب چیف جنسن سر چارلس ٹرنر کے ساتھ وہدراں کلب گئے تو کلب کے ایک ممبر نے چیف جنسن کی موجودگی میں مسٹر محمود سے کہا کہ ”کسی ہندوستانی کو اس کلب میں آنے کی اجازت نہیں ہے“ اور دروازہ بند

(1) اورڈ کرن کا خط جارج میٹکسن کے نام 21 مئی 1902ء۔

(2) کائن ایجنس۔ ایس۔ بے بحول بالا، صفحہ 50

(3) مورس۔ بے، کالین کی سوانح جلد 3 صفحہ 189۔ مسٹر برائٹ نے ہم خط، 27 اگست 1857ء۔

(4) خط مورس 22 ستمبر 1857ء ایسٹ صفحہ 193

(5) ٹریوٹلین، بے۔ مقابلہ کرنے والے، صفحہ 24

(6) ایسٹ، صفحہ 134

کر دیا۔ جنس راتاؤں اور جنس چند اور کی طرح کے قابل تقسیم رہنماؤں کی ریل کے سفر کے دوران معمولی انگریزی سپاہی بے عزتی کرتے تھے۔

جی۔ ایف۔ آبت نے ہندوستان میں اپنے تجربات کا ذکر اس طرح کیا ہے ”میں نے کچھ نوجوانوں کو (ہندوستان کے نوجوان سرکاری افسروں کو) جو لندن مقامات سے آتے ہیں عمر رسیدہ ہندوستانی امرا کے ساتھ دیا رہا کر کے دیکھا ہے جیسا کوئی شریف انسان اپنے ملازم کیساتھ بھی نہیں کرے گا۔“ (1)۔ ایچ۔ ڈیلیو لوئس نے دیکھا کہ ریلوں، ہوٹلوں، کلبوں، بنگلوں اور سرکاری دفاتروں میں ہندوستانیوں کے ساتھ بہت غیر شریفانہ سلوک کیا جاتا تھا ”اکتا براکر انگلستان میں اسکوٹا قابل یقین حد تک شرمناک سمجھا جائے گا۔“ (2)

کہا جاتا ہے کہ یونین تمباکو جیکل سی سیزی کے صدر ڈاکٹر چارلس تھ برٹ حال نے جنوری 1908ء میں نیویارک کے بار ایسوسی ایشن کلب ہاؤس کے جلسے میں کہا تھا ”میں نے نہایت ذہن اور باکردار ہندوستانیوں کو جو میرے نجی دوست ہیں ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا ہے۔“ (3)

اس زمانے کے اخبارات انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی ذات اور زرد کو ب کے واقعات سے بھرے ہوتے تھے انگریزوں کے اخبارات عام طور سے مجرموں کی حمایت کرتے تھے اور جرمانوں کی رقمیں ادا کرنے کے لیے چندہ کرتے تھے۔ ”جو شخص اپنے لوگوں کا ساتھ دیتا ہے اُسے بھیڑتے ڈرتا پائیے۔“ (4) یہ مشورہ ایک اہم اینگلو انڈین ہفتہ وار نے لارڈ کرزن کو دیا تھا جس کو ایک ایسے انسان سے تعبیر کیا جاتا تھا جس کا دل ہمدردی کے جذبے سے خالی ہے اور جو اس برطانوی فطری مہارت سے محروم جس سے حقیقی مدد پر پہنچا جاتا ہے۔ فرینڈ آف انڈیا نے بھی، جو سب سے زیادہ متوازن انڈین اخبار سمجھا جاتا تھا اس وقت رجعت پسندانہ رویہ اختیار کر لیا جب البرٹ مل پر نرالی بحث شروع ہوئی۔ اس نے نسلی امتیاز کے اصول کی حمایت کی اور حکومت کو مشورہ دیا ”دولت مشترکہ کو نقصان پہنچانے بغیر جس حد تک ممکن ہو اُسے ان مختلف نسلوں کے حق، استحقاق اور درجہ کا احترام کرنا چاہئے جو ملطت میں آباد ہیں۔“ (5)

دوسری طرف ہندوستانیوں کے اخبار ہندوستانیوں پر انگریزوں کی زیادتیوں اور ذلت آمیز برتاؤ کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کے رد عمل کو ظاہر کرنے کے لیے برکال سے کچھ اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ حکمرانوں کے روپے کے متعلق اس کی رائے تھی ”حکمرانوں اور محکموں کے درمیان علیحدگی و سب سے تر ہو گئی ہے حکمران طبقے عام لوگوں کے متعلق ویسا احساس نہیں رکھتے تھے جیسا پہلے تھا اور محکموں کے دلوں میں اپنے مالکوں کے تعلق سے اگلا اعتماد نہیں ہے۔“ (6)

اگلے شمارے میں اس نے لکھا ”ہماری حکومت کا نوکر شاہی کردار اسے ان باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دینے دیتا ہے جنہیں وہ لوگوں کی فرضی شکایتیں سمجھتی ہے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ لوگوں کے

(1) سندر لینڈ، ہے۔ ٹی، غلام ہندوستان، صفحہ 73

(2) نوٹس، ایس۔ ڈیلیو new spirit in India؟؟ صفحات 8-1110۔

(3) سندر لینڈ، ہے۔ ٹی، بحول بالا، صفحہ 72

(4) کامت، ایچ، ایس، ہے نے ذکر کیا، بحول بالا، صفحہ 5

(5) فرینڈ آف انڈیا، جولائی 1883ء

(6) بنگال، ستمبر 1873ء

تعلق سے وہ جو کچھ بھی کرتی ہے وہ بہر حال درست اور مناسب ہوتا ہے۔ ملک پر حکومت کرتے وقت ہندوستانوں سے زیادہ انگریزوں کا مفاد پیش نظر رہتا ہے۔“ (1) ”عام حالت نے ہر جگہ ہندوستانوں اور انگریز افروں کو بے چینی کا شکار بنادیا ہے۔ مختصر اکہا جاسکتا ہے کہ یہ احساس عام ہے کہ حالات بے قابو ہو چکے ہیں اور اسی طرح یہ اندیشہ عام طور سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔“ (2)

ایک انگریز سپاہی کے ہاتھوں دو مسلمان مزدور اور ایک دھوئی کے عہد اقل پر اظہار رائے کرتے ہوئے اس نے لکھا اس کے لیے (انگریزوں کے لیے) صرف ایک سفید قام انسان ہی انسان ہوتا ہے۔ لیکن ایک کالا آدمی محض قابل نفرت جانور ہے جسے 1877ء کے واقعات نے اور زیادہ قابل نفرت بنادیا ہے۔“ اس کے بعد اس نے ان برطانوی جیوریوں کی، جو انگریز قاتلوں کو رہا کر دیتی تھیں، ان الفاظ میں طرہ مگردانا“ حالانکہ یورپین برطانوی رعایا نے بہت سے قتل کئے ہیں لیکن صرف دو یورپیوں کو پھانسی دی گئی ہے جن کے نام مور اور روڈ ہیں۔ یورپین قاتلوں کو جو سزا سے بریت حاصل ہے اس کی ذمہ داری یورپین جیوریوں پر ہے جو انصاف پر اپنی نسل و قار اور برتری کو ترجیح دیتی ہیں۔“ (3)

قلم کے مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے، جس میں مجسٹریٹ ”عد اس جرم کے ارتکاب کے لیے جس کو مجروح کرنے (قتل کو کم کر کے پیش کرنے) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔“ (3) روپیہ جرمانہ کیا تھا اور ہائی کورٹ نے اس سزا کو ناقابل اعتراض قرار دیا تھا، بنگالی نے سخت تنقید کی جس میں بڑے طنز سے کام لیا گیا تھا اور معتمد انداز سے کیا تھا کہ ”کوڑے مارنے والوں کے اسٹیچو بنائے جائیں اور مندروں کو قاتلوں کے ناموں سے منسوب کیا جائے۔“ (4)

ان اقتباسات سے جن میں بے انتہا اضافہ کیا جاسکتا ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ حاکموں اور محکموں کے درمیان خلیج کتنی چوڑی ہو چکی تھی۔ اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں صدی کا سامراج انسانی صفات اور نسل تعاون کے تصورات کا مخالف تھا۔ حکومت کے ایک ایسے نظام میں جنہیں ظلموں پر محکموں کی ذمہ داری نہیں تھی اور ان کے اختیارات کا سرچشمہ ملک کے باہر تھا محض فوجی طاقت ہی حکومت کی بنیاد بن سکتی تھی اس کی قانونی شکل اور سولین خدو خال کے باوجود ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت حقیقت میں فوجی نوعیت کی تھی۔ ایک فوجی حکومت میں رعایا کی اطاعت گذاری کو برقرار رکھنے کیلئے طاقت کا وجود اور اس کا مظاہرہ لازمی تھا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ حکمران نسل سے تعلق رکھنے والے سفید قام لوگوں کی برتری غیر سفید قام محکموں کے ذہن نشیں کرائی جائے۔ مردم آزاری، دھمکی، بدتمیزی اور ستائی کی سامراجی طریق عمل اور نظریے کی قدرتی خصوصیتیں تھیں۔ کچھ شریف انسانوں کو جمہور کی یورپین اس سامراجی اصول کے پابند تھے جیسا کہ کانٹ نے 1904ء میں کہا تھا بد قسمتی سے یہ ”اس امر کی خطرناک علامت ہے کہ ہندوستان کے حکام بھی غیر سرکاری لوگوں کی طرح ہندوستانوں کے خلاف تعصبات کے پوری طرح شکار ہو چکے ہیں۔“ اُس نے مزید کہا ”اب ہمارے پیش نظر ایسی صورت حال ہے جس میں ایک

(1) ایضاً، 19 جنوری 1875ء،

(2) ایضاً، 7 اگست 1875ء،

(3) ایضاً، 17 جون 1876ء،

(4) ایضاً، 19 اگست 1876ء،

طرف محض ہندوستانی ہیں اور دوسری طرف سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے انگریز ہیں۔ (1)
 برطانوی حکومت کسی دوسری نوعیت کے مقابلے میں جس چیز پر خود آگاہی کے جذبے کی
 بیداری اور ذلت و خواری اور محرومی کے احساس کی ذمہ داری ہے وہ ہے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے
 درمیان پایا جانے والا اس قسم کا رشتہ۔ لوگ محسوس کرنے لگے تھے سب سے بلند قامت ہندوستان بھی ایک
 معمولی انگریز سپاہی، تجارتی کلرک، باغدار کے نائب، ریل کے ٹکٹ کلکٹر اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کے
 ہاتھوں پر بر ملا توہین سے محفوظ نہیں ہے قدرتی طور سے وہ اسے ناپسند کرتے تھے اور چونکہ اس کا تدارک
 ممکن نہیں تھا اس لیے اُن میں بپجاری کا جذبہ پیدا ہوا تھا جو نتائج سے بے نیاز ہو کر تشدد پر آمادگی میں معاون
 ہوتا تھا۔ چونکہ بہت سے ہندوستانی انگلستان چاہتے تھے، برطانوی خوش خلقی سے واقف تھے اور اُن کے گھروں
 میں برطانوی مہمان نواز کا تجربہ رکھتے تھے اس لیے انگلستان میں رہنے والے انگریز اور ہندوستان میں پائے
 جانے والے انگریز کے فرق کو بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے اور مجبوراً انہیں اس نتیجے پر پہنچنا پڑا تھا کہ
 اُس کی اصل وجہ سامراجی حکومت ہے۔ اس خرابی سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی خواہش ناگزیر تھی۔

V۔ ہندوستانیوں کی شکایتیں

ہندوستان میں رہنے والے انگریز فریقے کے اراکین کے طور طریقے نے جس عام نفسیاتی تنفر
 کو جنم دیا اُسے دو قسم کی شکایتوں نے تقویت پہنچائی۔ ایک شکایت کا تعلق تھا حکومت کی معاشی پالیسی سے اور
 دوسری کالوگوں کی سیاسی توقعات کو پورا کرنے سے اُس کے انکار سے۔

حکومت کی سیاسی پالیسی اور اُس کے نتائج کا ایک پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ عام لوگوں کی
 غربت و افلاس، اُن کی بد حالی اور بار بار پڑنے والے قحطوں کے دوران اُن کے ملکوں نے وسیع پیمانے پر شدید
 بے چینی پیدا کر دی تھی۔

متوسط طبقہ جس کی جڑیں گاؤں میں پھیلی ہوتی تھی، قدرتی طور سے بہت پریشان تھا برطانوی
 حکام کے وطن و وطن کے باوجود جن کا کہنا تھا کہ ہندوستانی رہنما زرعی مسائل سے واقفیت نہیں رکھتے
 ہیں واقعہ یہ ہے کہ بدلیسی حکمرانوں کے مقابلے میں عام لوگوں کے زیادہ قریب اور اُن کے حقیقی ہی خواہ
 تھے۔ حکومت کی مخالفت کا انہوں نے مقابلہ کیا۔ اور عام لوگوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے مسلسل جنگ
 دو کرتے رہے۔

دوسری شکایت کا تعلق سیاسی امور سے تھا۔ حکومت کی ناانصافیوں اور لوگوں کی خواہشات کی
 طرف اُس کی کھل غفلت نے ہندوستانی رہنماؤں کے رویے کو متاثر کیا۔ انیسویں صدی کے اختتام ہی سے
 حکومت کی نافرمانی اور مزاحمت کی تنظیم کے منصوبے بننے لگے تھے۔ ہندوستانیوں کی درخواستوں کے سلسلے
 میں کزن کے نخت آمیز رویے، ہندوستانی کردار کی تحقیر اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقوں کا اثر کم
 کرنے کے اقدامات نے آزادی کی تحریک کو نئی توانائی بخش دی۔

ہندوستان پر حکومت کرنے کے تعلق سے برطانوی پالیسی کی بنیاد دو باتوں پر قائم تھی یعنی سامراجی مفادات کا اقتدار اعلیٰ اور حکومت خود اختیاری کے لیے ہندوستانوں کی "نااہلیت"۔ اُن کی بنا پر وہ دہری پالیسی پر عمل کرتے تھے پہلی بات تو یہ کہ ایسی قابل اعتماد فوجی طاقت ہو جو بیرونی اور اندرونی دونوں قسم کی چوٹیوں کا پوری طرح مقابلہ کر سکے اور دوم یہ کہ ایک کارگزار انتظامیہ کے نظام کا قیام۔ چونکہ فوجی طاقت کو ایسا ہونا چاہیے تھا کہ وہ مخالف کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ اس لیے 1857ء کی بغاوت کے بعد اُس کے تجربے کی بنیاد پر فوج کی عظیم نوکی گئی۔

لیکن چونکہ بڑی فوجی طاقت یا فرقہ وارانہ یا طبقاتی اختلافات ہمیشہ کے لیے سلطنت کی ضمانت نہیں کر سکتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ اُس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے آبادی کے کچھ حصے برفساد و غبت حکومت کی اطاعت کریں لیکن برفساد و غبت اطاعت کروانے کے لیے ایک اچھی حکومت ہونی چاہیے۔ جو لوگوں کو یقین دلا سکے کہ حکمران واقعی اُن کے بھی خواہ ہیں اور بلائی اور اخلاقی ترقی کرنے میں اُن کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ سامراجی مقاصد حاصل کرنے اور رعایا کو مطمئن رکھنے کے لیے ایک اچھی حکومت اور ترقی پسند اقدامات ناگزیر تھے۔

لیکن برطانوی حکومت اقتصادات کا شکار تھی سامراجی مقاصد اُس کو ایک مدت میں سمجھنے سے تھے اور رعایا کے اہم مطالبات دوسری ست آئیسویں صدی میں سامراج اور لبرلزم میں ملزما ہو رہا تھا لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا وہاں سامراج کا بول بالا رہا۔

برطانوی سامراج کو جو ہندوستان پر لاوا گیا تھا اور جس کو فوج اور سول ملازمت چلا رہی تھی، لوگوں کے سماجی اور مذہبی اختلافات کے استحصال نے زیادہ مضبوط اور محفوظ بنا دیا۔ جو ہندوستانی آزادی کے خواہش مند تھے انہوں نے قدرتی طور سے اُن ستونوں پر حملے کئے جو بدلتی حکومت کو مہاراجے رہے تھے اور قومی تحریک نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بڑھانے اور طلبندگی پسندی کے رویوں کو ختم کرنے کی کوشش کی تاکہ حکومت اختیاری کے لیے اتحادی سروری بنیاد فراہم کی جاسکے۔

برطانوی حکومت کی فوجی بنیاد

وٹس لونی نے سامراج کا نمونہ میں لکھا ہے۔ "عسکریت اور سامراج میں یکساں فکر و عمل کے واضح نمونے ملتے ہیں" (۱) ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی توسیع کی تاریخ اُس بیان کی حمایت میں وافر شہادت مہیا کرتی ہے کہ فی الجملہ ہندوستان کا ایک فوجی کارنامہ تھا اور ہندوستان کی برطانوی سلطنت انگریز حکمرانوں کی توانائی مہارت اور یقین حکم کی یادگار تھی۔ فوج نے وہ قوت مہیا کی جس کی بنا پر برطانوی اقتدار ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا اور اسی نے حکومت کی ساخت میں پھیل کی۔ کارنوالس جو ایک سپاہی تھا ملک کے گورنر جنرل کے ساتھ کمانڈر ان چیف کے عہدہ کو بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ کلاپو کے زمانے سے ڈہلوی کے زمانے تک قریب قریب ہمیشہ ہی سول اور فوجی حکام کے درمیان پنچہ نہ پنچہ رہا۔ اس کی گونج بیسویں صدی کی ابتدا میں آف سوت سنائی دی۔ جب کرنل اور پٹنر میں جھگڑا ہوا اور کرنل کو مزہ کی کھانی پڑی۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی دستور و اصولوں کے باوجود حکومت جانتی تھی کہ اُس کی ہتھکڑی دلوں اور فوج پر ہے۔ برطانوی حکومت کی نوعیت کا تقاضا تھا کہ اُس کے حکام ہمیشہ چونکار ہیں۔ لیکن نے کرین بروک کے نام ایک خط میں اصراف کیا تھا۔ ”یہ صحیح ہے کہ حکومت ہندوستانی ہم انگریزوں سے محبت نہیں کرتے۔“ (۱) اُس نے کہا کہ اسان ست اور کامل ہیں، ہندوستان کی رائے عامہ کے نمائندے دانش ور باغیان خیالات پھیلاتے ہیں، بہت سے راہے نواب ناقابل اعتماد ہیں اور سب کے سب پولیٹیکل حکام کے برتاؤ سے غیر مطمئن ہیں۔ ”اُس نے مزید لکھا“ واقعہ یہ ہے ہندوستانی راہے نواب سازش کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں۔“

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ حیدر آباد کا ساار جنگ ایران کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اور کشمیر کا مہاراجہ روسیوں کے ساتھ صرف ہندوستان کی فوج ایسا بند تھی جو اُس سیلاب کو روکے ہوئے تھی جس میں سلطنت غرق ہو سکتی تھی۔

1857ء کے بعد فوج کی جو تنظیم نوکی گئی تھی اُس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ برطانوی حکام کی پالیسیوں کی بنیاد ہندوستانیوں پر اعتماد نہ کرنے کے اصول پر قائم تھی اور ایسی انتہائی طاقتور فوج پر وہ تکیہ کرتے تھے جو برطانوی حکومت کے خلاف ہر خطرے پر قابو پاسکے۔

1857ء سے پہلے ہندوستانی فوج کے دو حصے تھے یعنی یورپین اور ہندوستانی۔ یورپین حصہ مشتمل تھا۔ ملکہ کی اُن رہنمائیوں پر جو ہندوستانی حکومت کو مستعار دی گئی تھی اور اُن یورپیوں پر جن کو ہندوستان میں بھرتی کیا گیا تھا 1856ء تک ہندوستان کی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی تھے یعنی ہری یورپین سپاہیوں کے مقابلے میں 7 سے 9 تک ہندوستانی سپاہی (2) بغاوت کو جس میں بنگال کی فوج نے اہم رول ادا کیا جو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں یعنی اودھ کے راجپوتوں اور برہمنوں پر مشتمل تھی، حکومت نے فوجی تنظیم کی ناقابل اعتماد محبت کے لیے براخطہ سمجھا۔ جنرل جیل کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ وہ ضروری ترمیمات کی سفارش کرے۔ اُس کی رپورٹ 1809ء میں شائع کر دی گئی اور 1862ء تک اُس کی زیادہ تر سفارشات پہ عمل لایا گیا اور ہندوستانی فوج کی تنظیم نو کر دی گئی۔

تنظیم نوکی بنیاد یہ اصول تھا کہ یورپین عناصر کو غلبہ حاصل ہو تاکہ وہ فوج کے ہندوستانی عناصر کے خطرے پر قابو پاسکیں پہلی بات تو یہ کی گئی کہ دونوں کے تناسب کو بدل دیا گیا۔ نیا تناسب جس کی سفارش کی گئی تھی وہ مندرجہ ذیل تھا۔ بنگال کی فوج میں دو ہندوستانیوں کے مقابلے میں ایک انگریز اور مدد اس اور بمبئی کی فوجوں میں پانچ ہندوستانیوں کے مقابلے میں دو انگریز۔ مجموعی طور سے 40,000 یورپین تھے اور 40,000 ہندوستانی 1885ء میں روسیوں کے خطرے کے بنا پر اُن کی تعداد بڑھا کے 73,500 یورپین اور 1,54,000 ہندوستان کر دئے گئے۔ 1893ء میں پانچ ہندوستانیوں کے مقابلے میں دو انگریزوں کا اصول

(1) لیکن کے کاغذات، لیکن کا خط کرین بروک کے نام ۸ فروری 1879ء

(2) فوج کے ہر شعبے میں سپاہیوں کی تعداد کے تخمینے مختلف جنرل گورڈین نوہار لفٹیننٹ کرن بالون کی مولفہ کتاب ”برطانوی سلطنت کی فوجی کتاب“ کے مطابق یورپیوں کی تعداد تھی 45,522 اور ہندوستانیوں کی 3,48,000۔ ستر اٹھ سو اسی نے یورپیوں کی تعداد 45,522 ہندوستانیوں کی تعداد 3,23,444 (کچھ اثرات جنہوں نے برطانوی انتظامی نظام کو جنم دیا، صفحہ 127)۔ ملٹری سکرٹری جنرل کے تخمینے کے مطابق 1857ء میں کل فوج تھی 2,77,746 جس میں یورپین نے 45,522 اور ہندوستانی 2,22,224 (ہندوستانی فوج کی تنظیم کے متعلق جیل کمیشن کی رپورٹ صفحہ 2، صفحہ 21)

نہ اپنایا گیا۔ پوری کی پوری انیسویں صدی میں یہ تناسب برقرار رکھا گیا۔ (1)

دوسری تبدیلی یہ کی گئی کہ یورپین فوج کے درمیان حصوں (باقاعدہ فوج اور مقامی فوج) کو ملا کر برطانوی فوج کا حصہ بنادیا گیا۔ تیسری تبدیلی کی گئی کہ ہندوستانی سپاہیوں کو اسلحہ خانوں اور توپ خانوں سے ہٹادیا گیا۔ صرف اُن چھانڈیوں کے لیے اس اصول میں استثناء کیا گیا تھا جو یورپوں کی صحت کے لیے خاص طور سے معزز تھیں۔ اس طرح یورپوں کی قوت حرب کو بہت زیادہ بڑھا دیا گیا اور ہندوستانیوں کی قوت تناسب میں کمی کر دی گئی۔ ان دونوں کی تربیت میں بھی کچھ فرق پیدا کر دیا گیا تھا جس سے ہندوستانی سپاہیوں کو نقصان پہنچا۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی حصے کی حیثیت اصل فوج سے کم کر کے یورپین فوج کی مددگار کر دی جائے۔

لیکن زیادہ اہم اور اثرات امیز تبدیلی رجمنٹوں کو بھرتی کرنے اور اُن کی تنظیم کے طریقوں میں کی گئی۔ 1857ء کے واقعات نے حکمرانوں کے شکوک کی تصدیق کر دی تھی۔ اور ہندوستان کے لوگوں پر اعتماد کرنے کے خطرے سے انہیں آگاہ کر دیا تھا حالانکہ اب بھی میجر۔ جنرل مین کاک کی طرح کے کچھ فوجی افسر سمجھتے تھے کہ اعتماد کرنے کی پالیسی سب سے اچھی ہے پھر بھی افسروں کی بڑی تعداد اُس کے خلاف تھی بیل کمیشن کے ساتھ ماننے پیش کئے جانے والے نوٹ میں میجر جنرل مکر نے اُن کے نقطہ نظر کی وضاحت کی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ”ہندوستان میں ہم طاقت کے ذریعے اپنا اقتدار قائم رکھ سکتے ہیں۔ مختلف نسلوں اور قومیتوں پر فتح حاصل کر سکتے ہیں“ اس نے یہ دلیل دی ”یہ بات تجربے اور عقل سلیم کے معانی ہے کہ کسی حال میں بھی ہندوستانی دل سے ہماری حکومت کو پسند کر سکیں“ اُس نے مزید کہا ”جب ہم ہندوستانیوں کو مذہب اور قوم پرست بنادیں گے تو ہمیں یہاں سے ہٹا ہو گا۔ اس وقت تک ہمیں یہاں ان غیر یقینی حالات میں رہنا ہو گا جن کے ایک افسوسناک نمونے کا تجربہ ہم ابھی کچھ دن پہلے کر چکے ہیں۔ اس کے مطابق ”حالات کا تقاضہ ہے کہ ہماری شرقی مملکت محروم نہ ہو۔ اُن حکمران جن قومیتوں اور نسلوں کو ہماری فوجوں میں باقی رکھنا مناسب سمجھتے ہیں انہیں واضح اور اوس میں تقسیم کیا جائے تاکہ وہ ہمارے لیے کم سے کم خطرے کا باعث بن سکیں۔“ (2) چنانچہ بیل کمیشن نے سفارش کی کہ ”عام طور سے فوج کو مختلف قومیتوں اور ذاتوں پر مشتمل ہونا چاہیے جنہیں ہر رجمنٹ میں گڈ کر دینا چاہیے۔“ مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستانی فوج کی ایک اہم نوعیت کو ختم کرنے کے لیے مختلف مقامات، ذاتوں اور قبیلوں سے بھرتی کی جانے والی کمپنیوں کو رجمنٹ میں ملا دیا جائے تاکہ اگر ان میں سے کوئی ایک بغاوت مظاہرہ کرے تو اسے زیادہ شوریٰ کے بغیر علیحدہ اور ہتھیاروں سے محروم کر دیا جائے۔

چنانچہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے اصول پر سیاست میں عمل کرنے سے بہت پہلے فوج میں اس پر عمل کیا جانے لگا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد میں توازن برقرار رکھا جائے۔ رجمنٹوں میں کمپنیاں اور ٹروپ شامل ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر آٹھ ٹروپ کی ایک گھڑسوار رجمنٹ میں تین سکھ، تین مسلم اور دو ہندو ٹروپ تھے کسی بڑے یا چھوٹے ہندوستانی کمیشنر افسر مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ جب ذفرن نے سفارش کی کہ مہاراج کوچ بھار کو کمیشن دیا جائے تو اس کی سفارش کو

(1) 1856ء میں ہندوستانی فوج میں 39,375 یورپین اور 2,14,985 ہندوستانی تھے۔ 1878ء میں اُن کی تعداد 6,002 افریقہ

اور 160,370 افریقہ سپاہی اور 1,23,254 ہندوستانی سپاہی تھے فوجی کمیشن کی رپورٹ (1879ء) بمبئی آرکائیو 16

(2) بیل کمیشن رپورٹ، 1889ء، نمبر 1، میجر جنرل ایچ۔ ٹی۔ مکر، مورے 18 ستمبر، پیر 9۔

یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ اس سے ایک خطرناک مثال قائم ہو جائے گی۔
 لارڈ آلفسٹن نے اپنی پالیسی کی وکالت کرتے ہوئے کہا تھا ”چھوٹ ڈالو اور حکومت کرو قدیم
 رومیوں کا قول تھا اور اب یہ ہمارا ہونا چاہیے“ (1) 1858ء سے 1866ء تک سکریٹری آف انٹیٹ کے
 عہدے پر فائز رہنے والے سر چارلس وڈ نے اسے قبول کر لیا اس نے لکھا ”سب لوگوں میں مشترکہ احساس نہ پیدا
 ہونے دیجئے“ (2) گور سپاہیوں کو آپسی ربط و ضبط اور میل ملاپ سے بچانے“ (3) اس پر پوری طرح عمل کیا گیا اور
 اس سوال کا جواب تلاش کر لیا گیا ”ہم ہندوستانی فوجی افسروں اور سپاہیوں پر کتنا اعتماد کر سکتے ہیں۔“ ہندوستانیوں کی
 حیثیت کو کمتر بتلایا گیا اور اعتماد و ذمہ داری کے تمام عہدے ان کے لیے ممنوع قرار دے دیئے گئے۔

سول خدمات میں امتیاز

سول ملازمت کی شرائط بھی بہتر نہیں تھیں۔ کارنوالس نے فیصلہ کر دیا تھا کہ ہندوستانی صرف
 ماتحت کی حیثیتوں سے کام کر سکیں گے۔ میننگ نے انہیں ایسی ماتحت جٹیں دیں جن میں تنخواہیں کسی حد
 تک زیادہ تھیں۔ 1833ء کے چارٹرڈ ایکٹ اور ملکہ وکٹوریہ کے 1858ء کے بیان کے باوجود پوری انیسویں
 صدی میں اس صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

انیسویں صدی میں اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد کم تھی۔ قومی رہنمایہ مطالبہ کرتے
 تھے کہ امتحان بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں لیے جائیں تاکہ ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد مقابلے کے
 امتحان میں بیٹھ سکے اور ملازمتیں حاصل کرنے کے زیادہ مواقع انہیں مل سکیں۔ لیکن حکمران قوم اس کے
 لیے تیار نہیں تھی۔

اعلیٰ ملازمتوں اور خصوصیت نے ساتھ انتظامی ملازمتوں کی تنظیم ان افسروں پر کی گئی تھی جو
 ہندوستان کے لیے مخصوص تھے۔ وہ اصول انگلستان کی اعلیٰ ملازمتوں کے اصولوں سے بہت صرف اس
 حکومت کا ایک ماتحت حصہ ہی نہیں تھے جس کا کام تھا احکام کی تعمیل کرنا بلکہ وہ حکومت میں شامل تھے۔ یعنی
 پالیسی بنانے والے ان میں سے گورنروں اور گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسلوں کے ممبر سکریٹری آف انٹیٹ
 کی انڈیا کونسل کے ممبر اور ہندوستان کی اور صوبوں کی لیجسلیٹیو کونسلوں کے ممبر بنے جاتے تھے۔ ان
 میں سے کچھ نے عدلیہ کے اعلیٰ عہدوں تک ترقی کی۔ گورنر جنرل اور صوبوں کے گورنروں کے علاوہ کوئی ایسا
 عہدہ نہیں تھا جس پر ان کا تقرر نہ ہو سکے۔ ریاست کے معاملات میں ان کی اہمیت کی بنا پر انہیں نوکر شاہی
 سے تعبیر کیا جانے لگا۔

سبھی گورنر جنرل اور سکریٹری آف انٹیٹ اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کے یکساں
 مخالف تھے سر چارلس وڈ ہندوستانی کردار کے متعلق بری رائے رکھتا تھا۔ اُسکے مطابق ہندوستانی ”اگرچہ علم
 و فہم میں کسی سے کم نہیں تھے۔ لیکن ان میں کردار اور اخلاقی جرات کی کمی تھی جن کی بنا پر کوئی شخص تنہا کسی

(1) بیل کمیشن رپورٹ، ضمیمہ 3، صفحہ 146

(2) وڈ کے کاغذات، وڈ کا خط انگن کے نام، 3 مارچ 1862ء

(3) ایسٹا، وڈ کا خط انگن کے نام، 10 مئی 1862ء

ذمہ دار عہدے پر کام کرنے کے قائل ہو تا ہے۔“ (1)

جب 1867ء میں ہار تھ کوٹ نے سول ملازمین کے قرارداد کا حوالہ لارنس کو دیا تو اُس نے جواب میں کہا ”تم نے تلوار سے ہندوستان کو فتح کیا ہے۔ حالانکہ پالیسی اور اچھی حکومت نے بھی ہماری مدد کی ہے۔ ہمیں اسی طرح اُس کو رکھنا چاہیے۔ اپنی حکومت کو جاری رکھنے کی ایک شرط کے طور پر انگریزوں کو اعلیٰ عہدوں پر رکھا جانا چاہیے۔ یعنی عزت اور طاقت کی حیثیتوں پر۔“ (2)

لارنس کا خیال تھا ”اس قسم کے لوگ (بنگالی) مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونے کی کتنی ہی اہلیت کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن اُن میں وہ صلاحیت نہیں ہے۔ جو اچھے حاکموں اور زمین کے لیے ضروری ہے۔“ (3)

انگریز امیدوار کے لیے مقابلے کے امتحان کا جواز پیش کرتے ہوئے ڈیوک آف آرگل نے کہا ”مقابلے کے طریقے میں اگرچہ کامیابی بذات خود اس کی دلیل نہیں ہوتی ہے۔ کہ اُس میں حکمران یا حاکم بننے کی صلاحیت بھی ہو پھر بھی خاندانی یا سیاسی سرپرستی کے مقابلے میں اس طریقے سے اہلیت تلاش کرنے کے بہتر مواقع ہاتھ آتے ہیں۔ اور چونکہ یورپیوں میں عام طور سے وہ صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کی بنا پر انہوں نے ہندوستان کی سلطنت جیتی اور آج بھی اُسے رکھتے ہیں اس لیے فی الجملہ مقابلے کے امتحان انگریزی نسل کے مختلف امیدواروں کے درمیان ایک اچھے قسم کی جانچ ہے۔“ (4)

لارڈ ڈار تھ بروک نے اس کے جواب میں لکھا ”عام مقابلہ ہندوستان کے لیے سازگار نہیں ہے (5) اور اس بات پر زور دیا کہ امتحانات ”پبلک ملازمتوں کے لیے ہندوستان کے لوگوں کو بھرتی کرنے کے بہترین ذرائع نہیں ہیں۔“ اور یہ کہ ”مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان کے امیدواروں کی کسی طرح ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے۔“ (6) لٹن نے کہا ”مجھے اس نظریے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ ہندوستان کے لوگ سرکاری ملازمتوں کے تعلق سے کوئی مطلق حق رکھتے ہیں۔“ (7) ڈوکیٹ جنرل کے عہدے پر ایک مشرقی کے تقرر کو سیلبری نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا حالانکہ اس سے پہلے ہندوستانی ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ لیکن جب بھی ہندوستانی کا تقرر عمل میں آیا تھا تو انگریزوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا۔ سیلبری کے مطابق اس کی وجہ تھی۔ ”ایسے یورپیوں کی تلاش کرنے میں دشواری جو ان کے (ہندوستانیوں کے) ماتحت کام کریں۔“ (8)

سکرٹری آف اسٹیٹ ڈیوک آف آرگل نے ایک خط میں ہندوستانیوں کو سول سروس میں بھرتی کرنے اور امتحان کی موزونیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا تھا ”جہاں تک

(1) کڈ کے کاغذات، دڈ کی طرف سے سرانجام میں 9 اکتوبر 1862ء

(2) لارنس کے کاغذات، لارنس کی طرف سے ہار تھ کوٹ کو 17 اگست 1867ء

(3) ایضاً، لارنس کی طرف سے ہار تھ کوٹ کو، 17 اگست 1867ء

(4) ڈیوک آف آرگل، سکرٹری آف اسٹیٹ نوٹورنمنٹ آف انڈیا، 8 اپریل 1861ء مزید پدلیٹ۔ لٹن کے کاغذات،

ہندوستان کی سول سروس میں ہندوستانیوں کا داخلہ (1879ء) ص 1376، نمبر 8، پیراگراف 6

(5) ہار تھ بروک کے کاغذات، ہار تھ کی طرف سے سیلبری کو، 14 جون 1874ء

(6) ایضاً، 30 ستمبر 1878ء

(7) لٹن کے کاغذات، لٹن کی طرف سے سیلبری کے نام 10 مئی 1877ء

(8) ہار تھ بروک کے کاغذات، سیلبری کی طرف سے ہار تھ بروک کو، 5 نومبر 1874ء اور 27 جنوری 1875ء

ہندوستان کے لوگوں کا تعلق ہے اس اصول پر عمل کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ان کے تعلق سے محض ذہنی صلاحیت حکمرانی کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قوت، ہمت اور انتظامی صلاحیت کے اعتبار سے ہندوستان کی کچھ نسلیں جو تعلیم میں دوسروں سے پیچھڑی ہیں ان نسلوں سے برتر ہیں جو ذہنی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ مقابلے کے امتحان میں غائبانہ ایک بنگالی کسی پٹنن یا سکھ کے مقابلے میں زیادہ بہتر ثابت ہوگا۔ پھر بھی یہ ایک خطرناک تجربہ ہوگا کہ کلکتہ کے کالجوں کے کسی کامیاب طالب علم کو شمالی ہندوستان کے جنگ جو قبیلوں پر حکم چلانے کا موقع دیا جائے۔ (1)

لیکن ہندوستان کا دعویٰ انصاف اور قانون کے اعتبار سے مضبوط تھا۔ لٹن نے کر دین بروک کو لکھے جانے والے ایک خط میں اس کی وضاحت کی تھی کہ قانون کے احکام کی تعمیل کیوں نہیں کی جاسکتی۔ اس نے کہا ”آپ نے لکھا ہے کہ 1833ء کے ایکٹ نے ہندوستانوں کو سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کی آزادی دی ہے جو نظری اعتبار سے غیر محدود ہے اس ایکٹ کا مقصد یا کم از کم اثر یہ ہوا کہ انتظامیہ کو اجازت دی گئی کہ وہ اس نظری آزادی پر عملی بندش عائد کرے جو اتنی ہی غیر محدود ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سچ ہے۔“ اس کے بعد اس نے اجمالی طور سے صورت حال مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کی۔

”(الف) مصلحت، فرار، دلی، پالیسی اور معیشت کی بنا پر یہ عام طور سے محسوس کیا جاتا ہے کہ ہندوستانوں کو ہندوستان کے سول انتظامات میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ جگہ دینا مناسب ہے۔

(ب) اس کے علاوہ پارلیمنٹ نے اس کا وعدہ کیا ہے جو غیر واضح ہونے کے باوجود بہت وسیع ہے۔

(ج) ابھی تک ان مقاصد کو حاصل کرنے یا ان وعدہ کو پورا کرنے میں کوئی پیش رفت نہیں

ہوئی ہے۔ نہ سنجیدگی کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے۔

(د) ان وعدوں کو پورا کرنے میں جو مسئلہ اعتبار سے ناکامی ہوئی ہے اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود وعدے غیر واضح ہیں۔“

دوسری دشواریوں کا ذکر کرنے کے بعد یعنی اس ملازمت کے یورپین اراکین کی مخالفت کا اس نے یہ دلیل دی کہ ان ”وعدوں اور توقعات“ سے حیلہ سازی کر کے بچنے کے بجائے جو ”کبھی پورے نہیں کیے جاسکتے ہیں نہیں کئے جائیں گے“ بہتر یہ ہے کہ جو وعدے کئے گئے تھے انہیں توڑ دیا جائے اور ”ایکٹ (1870ء) کے کوٹھو ثابت کرنے اور بے اثر بنانے کا عمدہ اور واضح طریقہ اختیار کیا جائے۔“ اس سلسلے میں انہوں نے مشورہ دیا ان وعدوں کی ”جو غیر واضح ہیں اور جلدی میں کئے گئے ہیں، زیادہ احتیاط کے ساتھ وضاحت کی جانی چاہیے۔ احتیاط کے ساتھ ان کی وسعت کم کیجئے لیکن ان کے حدود کے اندر انہیں حقیقت بنائیے۔“ (2)

حقائق کی اس تلاش کا نتیجہ، جو کئی سال تک جاری رہی تھی، یہ ہوا کہ ازروئے قانون سول سروس کا قیام عمل میں آگیا۔ لیکن اس میں آنے والوں نے اچھا کام نہیں کیا اور اس لیے اسے ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس وقت کے پنجاب کے گورنر جنرل کی صدارت میں ایک پبلک سروس کمیشن 1886ء میں قائم کیا گیا، اس کمیشن کی خاص خاص سفارشی تھیں۔ (1) معبودہ سول سروس میں داخلے کے نظام کو جو کاتوں بحال رکھا جائے، (2) معبودہ سول سروس کے لیے مختص کئے جانے والے عہدوں کی

(1) ریکٹس پارلیمنٹری کانفرنس، ص 2376، نمبر 8، محول بالا۔

(2) لٹن کے کانفرنس، لٹن کی طرف سے لڑین بروک کو، 21 جولائی 1878ء۔

تعداد کم کر دی جائے اور (3) ان میں سے کچھ کو اس نئی ملازمت میں منتقل کر دیا جائے جو پرانے سول سروس کھاتی تھی جو انتظامی، عوامی، پولیس، تعلیمی، امور عامہ اور دوسرے شعبوں پر مشتمل تھی۔
انتظامی شعبے کیلئے بھرتی مقابلے کے امتحان کے ذریعہ کی جانے لگی چنانچہ انڈین سول سروس کے دروازے کھولنے کے بجائے اور زیادہ سختی کے ساتھ بند کر دیئے گئے اور کم تر حیثیت کی ایک ملازمت، جس کی سماجی حیثیت کم تھی اور تنخواہیں بھی کم تھیں، ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کے لیے شروع کر دی گئی۔
”جو وعدہ کیا گیا تھا وہ ایک دفعہ پھر توڑ دیا گیا۔“

ہندوستان اور انگلستان میں بیک وقت سول سروس میں بھرتی کرنے کے امتحان لینے کے حق میں داد ادا کی گئی اور دہلی کی کوششوں کے نتیجے میں 1893ء میں ہاؤس آف کامنز میں ایک تجویز منظور کی گئی۔ سکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ کیمبرلے نے اُسے رائے معلوم کرنے کے لیے حکومت ہند کو بھیجا۔ حکومت ہند نے کہا کہ یورپین عہدہ داروں کی تعداد میں بڑی کمی برطانوی حکومت کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس میں کہا گیا تھا ”وہ سول سروس ہی ہے۔ جس کی انتظامی صلاحیت اور حکمرانی کرنے کی اہلیت کی بنا پر 22 کروڑ لوگوں پر، جو 9,43,000 مربع میل کے علاقے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اچھی طرح حکومت کرنے کا انحصار ہے۔ اس لیے یہ بات بہت زیادہ اہم ہے۔ کہ اُن محنت طلب فرائض کی ادائیگی کے لیے جو ان افراد کو پورے کرنے ہوتے ہیں، بہتر سے بہتر لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اُن پر (برطانوی حکومت) کا انحصار ہے۔ اُن کے اثر میں کوئی کمی یا کارکردگی میں خرابی دیکھی جائے تو ان کے سلوک کو جنم دے گی جس سے برطانوی اسلحہ نے ملک کو نجات دلائی ہے۔ چنانچہ یہ بات بدیہی ہے کہ ”سول سروس کے اراکین کی ایک خاص تعداد ہمیشہ یورپین ہوتی چاہیے“ اور اس کا خطرہ پایا جاتا ہے کہ بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں امتحان ہونے کی صورت میں اس ملازمت میں نااہل ہندوستانی بھر جائیں گے۔ اور برطانوی سلطنت کی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ (1)

کرزن نے 1904ء کی بجٹ کی تقریر میں اس پالیسی کی حمایت کی۔ اُس کے مطابق امپیریل سول سروس میں انگریزوں کو آتا چاہیے۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ جرمنی طور سے وراثت کی بنا پر جرمنی طور سے اپنی پرورش کی بنا پر اور جرمنی طور سے تعلیم کی بنا پر وہ حکومت کرنے کے اصولوں سے واقف ہیں اور ویسی خداتیں اور کردار کی پختگی رکھتے ہیں جو اُس کے لیے ضروری ہے۔“ اس مشاہیر کے کردہ کے باہر ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ ملازمتیں دی جائیں گی۔ ”لیکن اس اصولوں پر عمل کرنے کے لیے بھی ایک شرط یہ ہے کہ کچھ خصوصی شعبوں میں، جہاں سائنسی اور تکنیکی معلومات ضروری ہیں۔ یا جہاں ایک خاص ذمہ داری پوری کرنی ضروری ہے، وہاں یورپیوں کو بھی موجود ہونا چاہیے۔ اور کچھ صورتوں میں تو اُن کی تعداد نا قابل ہوتی چاہیے۔“ (2)

عدم قابلیت کے اظہار کا جو رویہ حکومت نے اختیار کیا تھا اُسے ہندوستان کی رائے عامہ کو بڑا مشتعل کر دیا۔ انگریزی حکومت کے سو سال گزر جانے اور مغربی تعلیم کے بعد بھی انتظامی فوجی اور سیاسی شعبوں میں کلیدی عہدوں پر انگریزوں کا تقرر کرنے کی پالیسی نے برطانوی وعدوں اور اعلانات کے تعلق سے ہندوستانیوں میں مایوسی کی لہر دوڑادی۔ حکمرانی کے تجربے نے حکمرانوں کو اندھا کر دیا تھا اور اُن کے لیے یہ ممکن نہ رہا تھا کہ وہ اپنی دلیلوں کے نقائص کو دیکھ سکیں۔

(1) ہندوستان، اندر اور باہر کی تاریخ، جلد دوم صفحہ 177

(2) لارڈ کیمبرلے کی طرف سے سکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ کیمبرلے (عامہ) 62 مورخہ جنوری 1893ء

البرٹ بل پر نزاری بحث

جس وقت اعلیٰ امپیریل ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی شرکت کے دعووں پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا اُس وقت ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے حکمران قوم کے نسلی تکبر کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ وہ تھا یورپین برطانوی رعایا کے تعلق سے ہندوستانی بچوں کے اختیار سماعت، سوال، ممبر، قانون، سرگورنٹی البرٹ نے ایک بل پیش کیا جس کا مقصد تھا ضابطہ فوجداری کی اُس عدم یکسانیت کو درست کرنا جس کی رو سے معبودہ خدمات کے ہندوستانی اراکین کے اختیارات سماعت محدود تھے لیکن بنگال کے بعد کی مدت میں ایک ہی خدمت کے اُن اراکین کے درمیان بھی، جن کا انتخاب ایک ہی طریقے سے ہوا تھا۔ برابری کا ذکر یورپینوں کو مشتعل کر دینے کیلئے کافی تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے انگریز لاڈلے رابرٹس کے جذبات کے حامی تھے ”میر انیال ہے کہ ہم اُسے (ہندوستانی کو) کوئی بھی عہدہ کیوں نہ دیدیں۔ پھر بھی اُس کی بنا پر برطانوی حکام اُس کو اپنے برابر نہیں سمجھیں گے۔“ (1)

چنانچہ ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان نے لبرل دائرے رہن کی اُس کوشش میں رکاوٹ ڈالیں گے کہ انہیں اُس حق سے محروم کر دیا جائے کہ ان کے مقدمات کی سماعت محض یورپین مجسٹریٹ اور جج کر سکتے ہیں۔ شدید پرچار شروع کیا گیا۔ جلے تلے تلے گئے اور سخت لفظوں میں بل کی مذمت کی گئی۔ یہ کہا گیا کہ برطانوی آزادیوں کو ختم کرنے کی بنا پر اُن میں خطرے کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے برطانوی سرمایہ یہاں سے چلا جائے گا۔

بنگالی بابو کوبرا بھلا کہا گیا۔ اُس کے لیے کہا گیا کہ وہ ”چربی دار، سانپ کی طرح چالاک انگو مہل اثرات لگانے والا وغیرہ ہے“ (2) برطانوی کمنشنر مسٹر ہنس نے حکومت بنگال کے سکریٹری کو ایک خط لکھا جس میں اُس نے لکھا ”میرے ہم وطنوں کے لیے یہ بات بھی کم تکلیف دہ نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو اُن کے برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔ ... لیکن یہ بات کسی طرح سے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے کہ انگریزوں کے مقدمات کو جو جدوجہد حیات میں پہلے ہی دوسروں کے مقابلے میں نقصان اٹھا رہے ہیں، ہندوستانی مجسٹریٹ سن سکیں اور وہ مزاحم کی طرح اُن کے سامنے پیش ہوں۔“ (3)

اُس تحریک کو چلانے کے لیے ایک ”وقافی تنظیم“ بنائی گئی اخبارات کے کالموں میں حکومت کی پالیسی کی سخت مذمت کی گئی۔ کلکتہ اور آس پاس کے شہروں میں جلے تلے گئے۔ دائرے، سکریٹری آف انٹرنل اور پارلیمنٹ کو یادداشتیں بھیجی گئیں اور انگلستان کے لوگوں کے سامنے اُن کا مقدمہ پیش کرنے کی خاطر ایک ایجنٹ انگلستان بھیجا گیا۔ سر جیمس اسٹینٹس اور مسٹیوں کا رکی طرح کے رٹائرڈ برٹش حکام نے اُن تحریک کی حمایت کی۔

دوسری طرف لبرل، جن کے ہاتھوں میں اس وقت حکومت کی باگ ڈور تھی، اور اُن کے اخبارات بل کی حمایت کر رہے تھے۔ برائٹ نے آگاہ کیا کہ بل اٹرواپس لے لیا گیا تو ”بے چینی بڑھ جائے گی

(1) ریلی سرٹی، ہندوستان میں لاڈلے رزن، چند صفحات 106-107

(2) برائٹس کی تقریر ہنس کی رپورٹ بنگال میں شائع ہوئی۔ 3 مارچ 1883ء

(3) بنگال عدالتی کاروائی، 1883ء، جس کا ذکر بنگال ماضی اور حال میں کیا گیا، جلد XXXI، حصہ اول جنوری۔ جن 1991ء

اور وقاداری کم ہو جائے گی۔“ (1)

درپن نے کہا کہ اس بل کے پس پشت جو پالیسی ہے وہ نئی نہیں ہے۔ اسکو پارلیمنٹ نے بتایا تھا کہ سکرٹری آف اسٹیٹ نے اُس کی وکالت کی اور 1879ء میں لنن نے جو قواعد بنائے تھے اُن کے تحت اسکا حلاق کیا۔ جہاں تک اسکا تعلق تھا۔ اُس نے اس پالیسی کی حمایت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ”میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ پاکبازی سے قوم بلند مرتبہ ہوتی ہے۔ اور تاریخ کے مطالعہ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک بڑی سلطنت کو فوجوں اور سپاہیوں کے ذریعے ہمیشہ زندہ نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس کو قائم رکھا جاسکتا ہے۔ اُس کے قوانین کی پاکبازی اور انصاف کے اصولوں کے لیے اُس کے احترام کے ذریعے۔“ (2)

لیکن لبرلوں کی کوشش بے سود ثابت ہوئی اور ہندوستانیوں نے عمل اور انصاف کی جو اپیل کی اُس پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ برطانوی قوم کے حقوق کو برقرار رکھے کیلئے حکومت کو بل میں ترمیم کرنی پڑی۔ یہ پورا حادثہ حکمران نسل کے لیے باعث شرم تھا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک خاص ملازمت کے ہندوستان اور یورپین اراکین کے درمیان برابری پیدا کرنے کی ایک جھوٹی سی کوشش نے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں میں اتنا زیادہ مخالفت کا جذبہ پیدا کر دیا اور یہ کہ حکومت کو اُن کے سامنے اس بری طرح جھکنا پڑا۔

VI۔ نمائندہ حکومت

ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقوں اور حکمران طاقت کے درمیان سب سے اہم بحث تھی ملک کی حکومت میں اُن کی شرکت اور نمائندہ اداروں کے قیام کا مطالبہ۔

1857ء سے بھی پہلے کی دور میں انگریزوں کا جو زیادہ ترجیحی نتیجہ لبرل فلسفے کے چر و تھے اور جو سمجھتے تھے کہ محکوم ملکوں سے برطانوی تجارت کو فائدہ ہو سکتا ہے، خیال تھا کہ برطانیہ کی عمرانی بی بنا پر ایک دن ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو نفع محض نہیں سمجھتے اور اُس سے پریشان نہیں ہے کہ ہندوستان ایک دن برطانوی حکومت کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ دیگا۔ لیکن 1857ء کے بعد اُس قسم کے خیالات رکھنے والے لوگوں کی تعداد کم ہو گئی۔ خصوصیت کے ساتھ حکمران حلقوں میں۔ اس کے باوجود کو بیڈن، برائنٹ اور ہاسن کی طرح کے لبرل رہنما سمر اجی فلسفے کی خدمت کرتے رہے۔ مثال کے طور پر کو بیڈن نے کہا کہ اُسے یقین نہیں ہے کہ انگلستان مستقلاً ہندوستان پر حکومت کر سکے۔ اُس کی رائے تھی کہ پارلیمنٹ کے کنٹرول میں تاج اکھوں کروڑوں ایشیائی لوگوں پر حکومت کرنے کی جو کوشش کر رہا ہے وہ ضرور ناکام ہوگی اور اس لیے اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ”ہندوستان پر اُن لوگوں کو حکومت کرنی چاہیے جو دنیا کے اُس حصے میں رہتے ہیں۔ لوگ اس بات کو پسند کریں گے کہ اُن کے لوگ اور عزیز واقارب اُن پر حکومت کریں چاہے وہ ہمارے خیال کے مطابق بڑی حکومت ہی کیوں نہ ہو اور اُس کو اس بات

(1) بلال، اُس نے کرے پر ہوئے والی ایک میٹنگ کی رپورٹ جو یکم ستمبر 1883ء کو ہوئی تھی۔

(2) ایجسلیٹیو کونسل کی رپورٹ، 1884ء، جنوری 1884ء۔

پر ترجیح دیں گے دنیا کے دوسرے سرے سے بار بار آنے والے وقتی حراحت کار اچھی حکومت کریں۔“ (1)
 ہاسن کی رائے میں بدلی حکومت کو صرف اُس صورت میں جائز قرار دیا جاسکتا تھا۔ ”اگر
 حکومت کے اختیاری اور حقیقت کی پر جوش نمونہ ہندو اہل اہل کی روشن خیالی پالیسی معاون ہو۔“ (2) ہندوستان
 کو اپنے ہاتھ میں رکھے کے برطانوی سلطنت کے دعووں کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے اُن باتوں کا اطلاق
 حالات پر نہیں کیا جاسکتا تھا۔

جہاں تک حکومت اختیار کی نمو کا تعلق تھا ہاسن نے محسوس کیا کہ ”بہت کم انگریز حکام، اُس
 قسم کا خیال رکھتے ہیں کہ ہم حکومت کے مغربی نمونہ ہندوستان کی عظیم آبادی کو سکھا سکتے ہیں۔ یا کامیابی کے
 ساتھ سکھا رہے ہیں۔ عام طور سے اس بات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ یا یہ خیال پایا جاتا ہے کہ موہیل یا دوسری
 قسم کی حکومتوں کے تعلق سے برطانوی حکومت کے تحت اور برطانوی خطوط پر جو تجربے کئے گئے ہیں وہ ناکام
 ہو چکے ہیں۔“ (3)

1857ء کے بعد ہندوستان کے ہر حصے میں جو بحث چل رہی تھی وہ لوگوں پر مطلق العنانی انداز
 سے حکومت کرنے کا فطری نتیجہ تھی۔ سیاسی۔ اجتماعی۔ اور دور اندیشی کا تقاضہ تھا کہ لوگوں کا اعتماد حاصل
 کیا جائے اور کونسلوں کو لوگوں کی خواہش کا نمائندہ بنایا جائے۔ یہ مطالبہ اُس زمانے کی تمام سیاسی کاروائیوں
 میں گونج رہا تھا اور وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔

یہ مطالبہ اتنا فطری تھا کہ کچھ حکام بھی اُس کی حمایت کرنے لگے تھے۔ سلیٹ کمیٹی کے سامنے 1873ء
 میں شہادت دیتے ہوئے سر چارلس ٹریوٹین نے کہا تھا کہ، وصولی اور نمائندگی میں مطابقت ہونی چاہیے۔ (4)
 اُس نے اُس اصول کی وکالت کی کہ حکومت کو اُس کا حق دینا چاہیے۔ کہ وہ اپنا رویہ خود حاصل
 لریں اور خود خرچ کریں اس لیے کہ ”پورے ہندوستان کے لیے یہ حکومت اختیاری سیکھنے کی ہوس گاہ بن
 جائے گا اور 20,00,00,000 لوگوں کو اپنے اوپر سلطنت کرنے کا درس دینے کے سلسلے میں سب سے بڑا
 قدم ہو گا جو اُس ملک کے ساتھ ہمارے تعلقات کا مقصد منزل ہے۔“ (5)

ٹریوٹین کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جو اُسی قسم کے خیالات رکھتے تھے لیکن اُن کے
 خیالات صدا بہ صحرائی ثابت ہوئے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت تھی اُن کے پیش نظر دوسرے مقاصد
 تھے اور یہ مطالبہ اُس وقت تک بے سود ثابت ہوا جب تک حالات نے حکمرانوں کو اُسے تسلیم کرنے پر مجبور
 نہ کر دیا۔ چنانچہ حکومت خود اختیاری کی ابتداء کے لیے ملک کو تقریباً چالیس سال تک انتظار کرنا پڑا۔ واقعہ یہ
 ہے کہ 1861ء کے بعد سامراجی اہلیا کے دور میں اُن لوگوں کے لیے جو سفید فام نہیں تھے حکومت اختیاری
 کا تصور حکمران طبقوں نے ترک کر دیا تھا۔ 1853ء کی ایپریل لیجسلیٹیو کونسل کی توسیع کی تحریک کے سلسلے
 میں کیننگ نے دو کو ایک خط لکھا تھا جس میں سکرٹری آف اسٹیٹ سے کہا تھا ”جہاں تک ہندوستان کے باشندوں
 کا تعلق ہے مجھے اُس سے خوشی ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ اُس قسم کا ہر ممبر ماحذر ہونا چاہیے (حکومت کی طرف سے)

(1) مور لے۔ جے۔ کوبین کی سوانح، جلد دوم، صفحہ 187، ایوانِ اسٹیٹ، 1903ء۔

(2) ہاسن، جے۔ اے، مخول 11، صفحہ 243۔

(3) ایسا صفحہ 119۔

(4) اے۔ ف۔ میشل پنڈت، کنورس، کے۔ اور میں ہندوستان کی سماجی تاریخ، (ہندوستان انشیں)، صفحہ 276۔

(5) سینگ کے کاغذات، لینک کی طرف، نو، 30، ستمبر 1959ء۔

کسی بھی قسم کا حلقہ انتخاب چاہے وہ ہندوستانوں پر مشتمل ہو یا یورپوں پر ناممکن السل ہے۔“ (1) اس نے مشورہ دیا کہ ہندوستان کے لیے قانون ساز ادارے کو ختم کر دیا جائے اور ہر پریسڈنسی میں لیجسلیٹیو کونسلیں قائم کی جائیں بعد میں وہ اس کے لیے تیار ہو گیا کہ سپریم لیجسلیٹیو کونسلیں بحال رکھی جائے اور یہ تجویز پیش کی کہ ”ایسے ہندوستانوں کو جو اگر بڑی طور طریقوں سے واقف نہیں ہیں۔ ان میں عملی حصہ دیا جائے۔“ (2)

وڈ کا خیال تھا کہ نمائندہ ادارے ہندوستان کے لیے ناقابل عمل ہیں اور منظمہ کے لیے باہر کے عناصر غیر مفید ثابت ہوں گے۔

لیکن آخر میں وڈ اس کے لیے تیار ہو گیا کہ سپریم لیجسلیٹیو کونسل میں ترمیم کی جائے اور مدراس اور بمبئی پریسڈنسیوں میں لیجسلیٹیو کونسلیں قائم کی جائیں۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار دیدیا گیا کہ وہ بنگال، شمال مغربی صوبہ، جات اور پنجاب میں صوبائی کونسلیں قائم کر دے۔

لیکن یہ لیجسلیٹیو کونسلیں قانون سازی کے لیے انتظامی کونسلوں کی محض توسیع شدہ مشاورتی کمیٹیاں تھیں۔ چونکہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ قانون سازی کے کام میں ہندوستانوں کو شامل کیا جائے اس لیے باج کڑار ریاستوں کے حکمرانوں یا ان کے وزیروں کو اور مالکان اراضی کے نمائندوں کو ابتدائی برسوں میں نامزد کیا گیا۔ سر سید احمد خاں، سر جتندر ناتھ ٹیگور اور کچھ دوسرے حضرات نامزد ہندوستانوں میں شامل تھے جنہوں نے بعد میں کونسلوں کی بحثوں میں حصہ لیا۔

کونسلوں کو اور کوئی اختیارات حاصل نہیں تھے نہ وہ حکومت کے انتظامی اقدامات پر بحث کر سکتی تھی۔ لیکن وہ تھوڑے بہت اختیارات بھی جو انہیں حاصل تھے حکومت ہند کی دستوری حیثیت کی بنا پر اور کم ہو گئے تھے اس لیے کہ انتظامی اور قانون سازی دونوں میدانوں میں ہندوستانی امور کے تعلق سے کنٹرول کرنے اور رہنمائی کرنے کا آخری اختیار انگلستان میں موجود سکریٹری آف اسٹیٹ کو حاصل تھا۔

تقریباً تیس سال تک کونسلوں کو زیادہ جمہوری بنانے کے تعلق سے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ ایکٹ کے منظور ہونے کے ایک سال بعد وڈ نے انگلن کو لکھا کہ ہندوستان کی رائے عامہ کی حقیقی نمائندگی ممکن نہیں ہے۔ ”ہندوستان میں جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں صرف ایک قسم کی حکومت ممکن ہو سکتی ہے یعنی ایسی مطلق العنانیت جس کو انگلستان سے کنٹرول کیا جائے۔“ (3)

جبکہ ارباب اقتدار ذمہ دار کونسلوں کے مطالبے کے تعلق سے کان بند کئے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں اس قسم کے حالات رونما ہو رہے تھے جن کی بنا پر حکومت کو بالآخر لوگوں کی خواہشات پر دھیان دینا پڑا۔ انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں دکھوں اور شورشوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کو اس صدی کے کچھ بدترین فطلوں کا سامنا کرنا پڑا ویسی حکمرانوں سے تعلقات بھی تشویش کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ان کے داخلی معاملات میں برطانوی مداخلت بڑھ رہی تھی۔ اور ان کے ساتھ غلطیوں کی طرح کا سلوک کرنے کے بجائے انہیں ماتحت سمجھا جانے لگا تھا۔ 1875ء میں ملہار راؤ ٹیکواڑ کو تخت سے اتار دیا گیا جس کا برا اثر ہندوستان کی رائے عامہ پر پڑا۔ اس کے علاوہ جرمنی کے فرانس پر فتح پانے

(1) ایضاً، 4 فروری 1861ء

(2) وڈ کے کانڈات، وڈ کی طرف سے ایگلن کے نام، 28 اگست 1862ء

(3) وڈ کے کانڈات، وڈ کی طرف سے ایگلن کے نام، 28 اگست 1862ء

کی وجہ سے یورپ میں طاقت کا توازن بدل گیا اور روس شرق کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا اثر بھی ہندوستان پر پڑا اس لیے کہ اس کی بنا پر حکومت ہند وسط ایشیا میں مہم جوئی کرنے لگی، افغانستان کے ساتھ اس کی جہاد کن جنگ ہوئی اور بلقان میں جنگ کا خطرہ بڑھ گیا۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں بے چینی اور خطرے کا احساس پیدا ہوا گیا اور انہیں بین الاقوامی اسلامی تحریک شروع کرنی پڑی۔

ہندوستان میں بڑی بے چینی تھی۔ یوم نے 1872ء میں نار تھ بروک کو حالات کی تنقید کی سے آگاہ کیا کہ ”اب ہمارے اور ہماری تباہی کے درمیان محض ٹھیکن حائل ہیں“ اور ”یہ کہ سلطنت کا مقدر معلق ہے۔“ اس نے گورنر جنرل کو مشورہ دیا ”میری یہ عاجزانہ درخواست ہے کہ آپ اس پر غور کریں کہ وقت گزر جا رہا ہے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنی رعایا کی رائے اور خواہشوں کا اپنے انتظامی کاموں میں زیادہ لحاظ رکھ سکیں۔“ (1)

لیکن یوم کی بات سنی ان سنی کر دی گئی۔ ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری کا اصول انگلستان کے حکمران طبقے کے لیے ناقابل قبول تھا۔ لہٰذا کہہ چکا تھا کہ ہندوستانی حکومت اختیار کی جائے تو نہیں رکھتے ہیں سر رچرڈ ٹیمپل نے 1880ء میں لکھا تھا ”تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی حکومت خود اختیاری کی توقعات رکھتے ہیں وہ بھی سیاسی طاقت بلکہ نمائندے اور اسے چاہتے ہیں۔ یہ رعایتیں فی الوقت عملی سیاست کے میدان میں نہیں آتی ہیں۔“ (2)

کاشن کے اس خیال کو رد کر دیا گیا کہ تعلیم یافتہ طبقے ملک کی آواز اور ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ کہ عام لوگوں نے اپنے قدرتی اور بہترین نمائندوں کے طور پر تعلیم یافتہ طبقوں کو قبول کر لیا ہے اور اس لیے اس تحریک نے ایک قومی تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کی اس یقین دہانی کا کوئی اثر نہیں ہوا کہ اس کے معنی یہ کہ تعلیم یافتہ طبقے وفادار ہیں کہ وہ برطانوی حکومت کے فوائد کو جانتے ہیں اور یہ کہ وہ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت ختم ہو جائے ”لیکن انہیں طاقت سے محروم کر کے ان میں سختی پیدا کر دی گئی ہے۔ ان کے حق میں جو بار بار کہا گیا تھا اس کو بالمقصد نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یورپین ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتے ہیں اور ان کی جائز توقعات کو بڑے غرور اور تکبر کے ساتھ ٹھکرایا جاتا ہے۔“ (3)

1881ء میں رہن نے ہارٹنگٹن کو، جو اس وقت سکریٹری آف انٹیلیجنس تھا یہ مشورہ دیا کہ لیجسلیٹیو کونسلوں میں چنے ہوئے عناصر کو شامل کرنا مناسب ہو گا اس لیے کہ اس سے ہندوستانیوں کی ”سیاسی تعلیم“ ہو گی اور حکومت عام لوگوں کے خیالات سے واقف ہو سکے گی اور ”اُسے اس کا موقع ملے گا وہ اپنے ارادوں کی وضاحت کر سکے اور غلط فہمیاں دور کر سکے (4) لیکن ہارٹنگٹن نے اس کی بات نہ مانی۔

اس دوران سیاسی تحریک ہندوستان میں طاقت حاصل کرتی رہی۔ سریندر ناتھ بھرجی نے 78-1877ء میں ملک کا دورہ کیا تاکہ سول سروس کے امتحان کے لیے عمر کم کرنے کے سوال پر پورے ہندوستان میں احتجاج کروایا جاسکے۔ صوبائی سیاسی انجمنوں نے عام جلسوں میں احتجاج کیا۔ ہندوستانی اخبارات نے حکومت کے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ انڈین نیشنل کانگریس

(1) نار تھ بروک کا گذشتہ، یوم۔ لے۔ جو۔ کی طرف سے ہر تھ بروک کو، یکم اگست 1872ء (۱۵ اپریل آف سائبرری)

(2) ٹیمپل، سر رچرڈ، 1880ء میں ہندوستان، صفحہ 124

(3) کاشن، ایچ۔ جے۔ ایس۔، مورلہا، صفحہ 31۔ کاشن نے ان خیالات کا اظہار 1885ء میں کیا تھا۔ جب تکاب کا بیلاؤ نیشنل شائع ہوا تھا

(4) رہن کے کاغذات، رہن کا خط ہارٹنگٹن کے نام، 31 دسمبر 1881ء

نے، جو سیاسی تحریک میں آگے آگے تھی، نمائندہ حکومت کے تعلق سے ہندوستانوں کے توقعات کی حمایت میں اپنی آواز اٹھائی۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں ایک تجویز منظور کی گئی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ”سپریم اور موجودہ مقامی لیجسلیٹو کونسلوں میں چنے ہوئے نمائندوں کی بڑی تعداد کو شامل کر کے ان کی اصلاح اور توسیع کی جائے۔“ اس قسم کی تجویزیں سال بہ سال منظور کی جاتی رہیں۔

لیکن نوکر شاہی حکومت کا رد عمل یوں کن تھا۔ ارڈن نے حالات کا ایسا جائزہ مندرجہ ذیل الفاظ میں لیا ”آؤ کال کی طرح کی انجینئرس معرض وجود میں پہلے ہی آچکی تھیں، کانس کو بے اثر بنادیا گیا ہے اور شدت پسند تحریک کے تمام فنون ہندوستان میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ایک کمیٹی پارلیمنٹ کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم، انصاف اور اعتدال پسندوں کا گھر بناتے ہو پھر آپ خود ہی سوچئے کہ ایک بابو پارلیمنٹ کیا ہو گی۔“ (1) کانگریس کے مقاصد اور طریق کار کے تعلق سے اس کی رائے کا اظہار اس کے پرائیویٹ سکرٹری نے اُن لفظوں میں کیا ”چالاک اور فعال بنگالی بابوؤں کا ایک پس منظر اور پائپ ایک یادو انگریزوں کی مدد سے یہ کوشش کر رہا ہے کہ ہندوستان کے تمام حصوں میں ایک سیاسی تحریک کی تنظیم اور اس کی رہنمائی کرے۔“ (2)

انگلستان میں قدامت پسند رائے عامہ کے سرکردہ آرگن انڈین ٹائمز کا خیال تھا کہ وہ لوگ جو ہندوستان سے واقف ہیں اس تبدیلی کی نامعقولیت کو تسلیم کریں گے۔

سر سید احمد خاں کے سیاسی مشیر اور ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے پرنسپل بیل نے اُن چار وجوہ کا ذکر کیا جو نمائندہ اداروں کی کامیابی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بنی ہوئی ہیں اس کا خیال تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے تصور کے مطابق جو نمائندہ حکومت بنے گی وہ نقلی نمائندہ حکومت ہوگی جس میں محض انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی نمائندگی ہوگی یعنی اس قسم کی اولی گاری ہوگی جس میں اس طبقے کو عملی اقتدار سونپا جائے گا جس کی آبادی میں بہت تھوڑی سی تعداد ہے۔ بیل کے مشورے سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں نمائندہ حکومت کے مطالبے کی مخالفت کرنے کی خاطر تحریک شروع ہوئی۔ دلیل یہ دی جاتی تھی کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں ہے اور یہ کہ نمائندہ حکومت میں ہندو اکثریت مسلم اقلیت پر ظلم توڑے گی اور اس لیے یہ بات مسلمانوں کے مفاد میں تھی کہ انتظامی طاقت یورپیوں کے ہاتھوں میں رہے۔ (3)

سیاست ترقی کی راہ میں حائل بڑی بڑی رکاوٹوں کے باوجود سرکاری کام اُن واقعات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے جو ملک میں رونما ہو رہے تھے۔ نمائندہ حکومت کی طرف پیش قدمی کی مخالفت کرتے وقت بھی انہیں تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ ہاتھ رکھنے بیٹھا رہنا ممکن نہیں ہے۔ ڈفرن نے بھی، جو نمائندہ حکومت کے مطالبے کا اہم اڑا تھا اور اسے ”بابو پارلیمنٹ“ سے تعبیر کرتا تھا اب لارڈ تھرل ہروک کو لکھا کہ وہ کونسلوں میں چنے ہوئے عناصر کو شامل کرنے کے تعلق سے ایک منصوبہ سکرٹری آف انشٹیوٹ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔“ (4)

(1) ڈفرن کے کاغذات، ڈفرن کی طرف سے مرین ہے۔ ایشیئن، 6 مارچ 1886ء۔

(2) ایضاً، اس کی طرف سے اے۔ کوڈلے، 26 اپریل 1886ء۔

(3) شمال کے مسلمانوں میں ایک خط و ملت لرایا گیا، اس کا حوالہ بنگال میں، 29 جنوری 1887ء۔

(4) ڈفرن کے کاغذات، ڈفرن کی طرف سے تھرل ہروک، 11 مارچ 1887ء۔

اُس کے دس دن بعد کراس سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے اعتراف کیا ”یہ شور و ہنگامہ محض بنگالی بابو ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ پورا تعلیم یافتہ ہندوستان، جس میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ چاہتا ہے کہ اُس کے داخلی معاملات کے انتظام میں اُس سے مشورہ کیا جائے۔“ (1) اُس نے مزید کہا ”اُس میں شک نہیں کہ ایک مطلق العنان طاقت کی حیثیت سے جس کے پاس 2,000,000 فوج موجود ہے۔ ہم کچھ دن تک اُن کے مطالبوں کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ایسا صرف کچھ مدت تک کیا جاسکے گا۔“ (2)

اس نے کیمبرج کے سریشی کالج کے ماسٹر کو بھی لکھا تھا کہ ”ہندوستان پر حکومت برٹانویز بروز دشاوترو تہو تا جا رہا ہے۔ اب یہ الگ تھلک علاقہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا براعظم ہے جس کے دروازے پر جارحیت پسند پڑوسی کھڑے ہیں دوسری طرف پچھلے تیس سال میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کئی اعتبار سے قابل اور ذہین طبقہ معرض وجود میں آ گیا ہے اور فطری طور سے اس بات کا خواہش مند ہے کہ اپنے معاملات سے اپنے میں اُسے بڑا حصہ دیا جائے اور اس طرح ان دونوں نقاط نظر سے ملک کا نظم و نسق اب دیکھا نہیں ہے جیسا اس پچھلے زمانے میں تھا جب یہاں غلامی پائی جاتی تھی۔“ (3) اس کے بعد انگریزوں نے اُسے ”میکسیمی کے ہم“ ایک نام دیا۔ ”ہندو“ نامیوں کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین طبقے کی نشوونما اس کے ساتھ اس کی انتہائی حالات پیدا کر رہی ہے جو ہوم رول کی تحریک کے مشابہ ہیں اور اس کے ساتھ اس کی انتہائی، رد و اور دوسرے شدت پسند لوازمات بھی وجود میں آ رہے ہیں۔“ (4)

کونسل کی اصلاح کے تعلق سے ڈفرن بہت شک و شبہات رکھتا تھا۔ کلکتہ میں سینٹ انڈرو وڈز کے موقع پر اسے 30 نومبر 1888ء کو جو تقریر کی تھی اس میں ہندوستان کے نمائندہ حکومت کے مطالبہ کے تعلق سے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جن باتوں پر اس نے خاص طور سے زور دیا وہ تھیں۔

(1) ”ہندوستان ایک ملک نہیں ہے بلکہ ایسی سلطنت ہے جس کی آبادی ”ایسی مختلف قومیتوں پر مشتمل ہے جو مختلف مذہب رکھتی ہیں، مختلف رسوم و ادا کرتی ہیں، مختلف زبانیں بولتی ہیں، جنہیں تعلیمات، مختلف سماجی جٹوں اور محاسبات مادی مفادات نے بھی ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا ہے۔“

(2) ”ہندوستان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دو بڑے سیاسی گروہوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں بنا ہوا ہے۔ اسکے علاوہ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی قومیں ہیں یعنی سکھ، عیسائی اور انگریز۔“

(3) ”ہندوستان برطانوی سرمائے کی بڑی بڑی سرمایہ کاریوں کا اور وسیع برطانوی مفادات کا مرکز ہے جن میں سرکاری اور نجی دونوں مفادات شامل ہیں۔“

(4) ”برطانیہ مغربی کے بین الاقوامی رشتوں کے تعلق سے ہندوستان اہم رول ادا کرتا ہے۔“

(5) ”ہندوستان کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت تاخوندہ ہے اور جن لوگوں نے تعلیم حاصل کی ہے وہ بھی بہت معمولی علم رکھتے ہیں۔“

”دو کروڑ کی آبادی میں سے صرف چند ہزار ایسے ہیں جو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے والے اُلجھے ہوئے اور باریک معاشی اور سیاسی سوالوں کے تعلق سے ذہانت آمیز رویہ اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

(1) کراس نے کانڈات، ڈفرن طرف سے کراس کو 30 مارچ 1887ء، (2) ایسا

(3) ڈفرن نے کانڈات، ڈفرن کی طرف سے کیمبرج کے سریشی کالج کے ماسٹر کے نام 8 اپریل 1887ء

(4) ایسا، ڈفرن کی طرف سے انگریزوں کے نام، (نمائندہ)، 26 اپریل 1887ء۔

اس مقدمے سے یہ پتا واضح ہو جاتی ہے کہ ”کوئی سمجھدار آدمی یہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ برطانوی حکومت ایک چھوٹی سی اقلیت کو اس کی اجازت دے کہ وہ اس عالی شان اور مختلف النوع سلطنت کے نظم و نسق کو کنٹرول کرے جس کی حفاظت اور خوش حالی کے لیے وہ (انگریز) خدا اور انسانی تہذیب کے سامنے ذمہ دار ہیں۔“ ظاہر ہے کہ ڈفرن کا جواب تھا ”ہندوستان کے موجودہ حالات میں ان لوگوں کی حقیقی اور موثر نمائندگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن کے مفادات مختلف ہیں اور جن کی قومیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔“ اور یہ کہ ”ان خصوصی حالات میں اس سے بڑی نعت کوئی نہیں ہو سکتی ہے کہ ملک میں ایک بدلیسی، خاطر اور غیر خفیہ حکومت موجود ہے جو انصاف پسند ہے اور جس کے پاس اتنی طاقت اور خواہش موجود ہے کہ وہ سلطنت کے مختلف عناصر کے حقوق اور حیثیتوں کو ایک بڑے امن اور ہم آہنگ اتحاد میں تبدیل کر دے۔“ (1) ظاہر ہے کہ اس کی آخری رائے یہ تھی کہ انگلستان کو کبھی بھی عوامی معاملات کو کنٹرول کرنے کے اقتدار اعلیٰ سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے یا ان مختلف فرقوں کی خوشحالی کی ذمہ داری، جن پر وہ حکومت کرتا ہے، کسی اقلیت یا طبقے کے سپرد نہیں کرنا چاہیے۔

ہندوستان کے لوگوں کی ایسی پیچیدہ اور انتہائی مختلف تعلق ڈفرن نے بہت کچھ کہہ دیا لیکن اسے یہ خیال نہیں آیا کہ اس مسئلے کو جو دو میں لانے میں برطانیہ کا کتنا ہاتھ ہے جس کا کل (نیلے آئیڈنٹ) کی رو سے) کسی بھی منظم حکومت کے بنیادی فرائض میں شامل ہے یا جب وہ برطانوی حکومت کے فوائد کے گن گار رہا تھا اس وقت اس نے یہ نہیں سوچا کہ خود اس کے اعتراف کے مطابق ہندوستانی عام طور سے اس حکومت سے کتنی نفرت کرتے تھے۔ اس نے اس قسم کے واقعات کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا جیسے ہندوستانیوں کی طرف انگریزوں کا کھاترات آمیز رویہ، عام لوگوں کی بڑھتی ہوئی غربت و افلاس، بار بار قتلوں کا پڑنا، ان عہدوں سے ہندوستانیوں کو محروم رکھنا جن میں ذمہ داری اور تحفظ زیادہ تھی اور خود اپنے معاملات میں فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے مواقع سے انہیں دور رکھنا۔

اگر ڈفرن نے کوئل میں جس قسم کی اصلاح لرنی چاہی وہ بہت محدود نوعیت کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ”ذمہ دار ہندوستانی شرفا ملک کے نظم و نسق میں مدد دیں۔“ وہ اس کے لیے آمادہ تھا کہ ”صوبائی کونسلوں میں اصلاح کر دے“ لیکن اسی کے ساتھ اس کا کہنا تھا کہ پالیسی پر مکمل کنٹرول انتظامی ادارے کو حاصل ہو گا۔ کوئل نے سوال پر ہندوستانیوں کے احساس کی شدت نے ڈفرن کو متاثر کیا تھا۔ اس نے سیکریٹری آف انڈینٹ کے سامنے تجویز رکھی کہ ہندوستانی ممبروں کے تعلق سے انتخاب کے اصول کو مان لیا جائے لیکن اسی کے ساتھ کہا ”اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا کہ ہندوستان کی مقدر دیا یا تحت حکومتیں اپنے ان ممبرانہی اختیارات کے ضروری حصے سے دست بردار ہوں جو ایسی خطرناک طاقت کی حیثیت سے ان کے وجود کے لیے ضروری ہے جو مختلف قومیتوں پر اقتدار رکھتی ہے۔ جن میں سے زیادہ تر تہذیب اور روشن خیال کے اعتبار سے بہت پس ماندہ ہیں۔“ (2) لیکن اس کے مطابق ”تجوری چشم رفت میں ایک اور قدم

(1) راولپنڈی ڈفرن آف ہندوستان میں جو تقریریں کی (1890ء) کلکتہ میں 30 نومبر 1888ء کو سینٹ ایڈرو کے موقع پر پڑی

کی کئی تقریر، صفحات 248-229

(2) کلکتہ (اصل) (عوامی)، خلیہ 10، 11، 12، 13، 14، 15، 16، 17، 18، 19، 20، 21، 22، 23، 24، 25، 26، 27، 28، 29، 30، 31، 32، 33، 34، 35، 36، 37، 38، 39، 40، 41، 42، 43، 44، 45، 46، 47، 48، 49، 50، 51، 52، 53، 54، 55، 56، 57، 58، 59، 60، 61، 62، 63، 64، 65، 66، 67، 68، 69، 70، 71، 72، 73، 74، 75، 76، 77، 78، 79، 80، 81، 82، 83، 84، 85، 86، 87، 88، 89، 90، 91، 92، 93، 94، 95، 96، 97، 98، 99، 100، 101، 102، 103، 104، 105، 106، 107، 108، 109، 110، 111، 112، 113، 114، 115، 116، 117، 118، 119، 120، 121، 122، 123، 124، 125، 126، 127، 128، 129، 130، 131، 132، 133، 134، 135، 136، 137، 138، 139، 140، 141، 142، 143، 144، 145، 146، 147، 148، 149، 150، 151، 152، 153، 154، 155، 156، 157، 158، 159، 160، 161، 162، 163، 164، 165، 166، 167، 168، 169، 170، 171، 172، 173، 174، 175، 176، 177، 178، 179، 180، 181، 182، 183، 184، 185، 186، 187، 188، 189، 190، 191، 192، 193، 194، 195، 196، 197، 198، 199، 200، 201، 202، 203، 204، 205، 206، 207، 208، 209، 210، 211، 212، 213، 214، 215، 216، 217، 218، 219، 220، 221، 222، 223، 224، 225، 226، 227، 228، 229، 230، 231، 232، 233، 234، 235، 236، 237، 238، 239، 240، 241، 242، 243، 244، 245، 246، 247، 248، 249، 250، 251، 252، 253، 254، 255، 256، 257، 258، 259، 260، 261، 262، 263، 264، 265، 266، 267، 268، 269، 270، 271، 272، 273، 274، 275، 276، 277، 278، 279، 280، 281، 282، 283، 284، 285، 286، 287، 288، 289، 290، 291، 292، 293، 294، 295، 296، 297، 298، 299، 300، 301، 302، 303، 304، 305، 306، 307، 308، 309، 310، 311، 312، 313، 314، 315، 316، 317، 318، 319، 320، 321، 322، 323، 324، 325، 326، 327، 328، 329، 330، 331، 332، 333، 334، 335، 336، 337، 338، 339، 340، 341، 342، 343، 344، 345، 346، 347، 348، 349، 350، 351، 352، 353، 354، 355، 356، 357، 358، 359، 360، 361، 362، 363، 364، 365، 366، 367، 368، 369، 370، 371، 372، 373، 374، 375، 376، 377، 378، 379، 380، 381، 382، 383، 384، 385، 386، 387، 388، 389، 390، 391، 392، 393، 394، 395، 396، 397، 398، 399، 400، 401، 402، 403، 404، 405، 406، 407، 408، 409، 410، 411، 412، 413، 414، 415، 416، 417، 418، 419، 420، 421، 422، 423، 424، 425، 426، 427، 428، 429، 430، 431، 432، 433، 434، 435، 436، 437، 438، 439، 440، 441، 442، 443، 444، 445، 446، 447، 448، 449، 450، 451، 452، 453، 454، 455، 456، 457، 458، 459، 460، 461، 462، 463، 464، 465، 466، 467، 468، 469، 470، 471، 472، 473، 474، 475، 476، 477، 478، 479، 480، 481، 482، 483، 484، 485، 486، 487، 488، 489، 490، 491، 492، 493، 494، 495، 496، 497، 498، 499، 500، 501، 502، 503، 504، 505، 506، 507، 508، 509، 510، 511، 512، 513، 514، 515، 516، 517، 518، 519، 520، 521، 522، 523، 524، 525، 526، 527، 528، 529، 530، 531، 532، 533، 534، 535، 536، 537، 538، 539، 540، 541، 542، 543، 544، 545، 546، 547، 548، 549، 550، 551، 552، 553، 554، 555، 556، 557، 558، 559، 560، 561، 562، 563، 564، 565، 566، 567، 568، 569، 570، 571، 572، 573، 574، 575، 576، 577، 578، 579، 580، 581، 582، 583، 584، 585، 586، 587، 588، 589، 590، 591، 592، 593، 594، 595، 596، 597، 598، 599، 600، 601، 602، 603، 604، 605، 606، 607، 608، 609، 610، 611، 612، 613، 614، 615، 616، 617، 618، 619، 620، 621، 622، 623، 624، 625، 626، 627، 628، 629، 630، 631، 632، 633، 634، 635، 636، 637، 638، 639، 640، 641، 642، 643، 644، 645، 646، 647، 648، 649، 650، 651، 652، 653، 654، 655، 656، 657، 658، 659، 660، 661، 662، 663، 664، 665، 666، 667، 668، 669، 670، 671، 672، 673، 674، 675، 676، 677، 678، 679، 680، 681، 682، 683، 684، 685، 686، 687، 688، 689، 690، 691، 692، 693، 694، 695، 696، 697، 698، 699، 700، 701، 702، 703، 704، 705، 706، 707، 708، 709، 710، 711، 712، 713، 714، 715، 716، 717، 718، 719، 720، 721، 722، 723، 724، 725، 726، 727، 728، 729، 730، 731، 732، 733، 734، 735، 736، 737، 738، 739، 740، 741، 742، 743، 744، 745، 746، 747، 748، 749، 750، 751، 752، 753، 754، 755، 756، 757، 758، 759، 760، 761، 762، 763، 764، 765، 766، 767، 768، 769، 770، 771، 772، 773، 774، 775، 776، 777، 778، 779، 780، 781، 782، 783، 784، 785، 786، 787، 788، 789، 790، 791، 792، 793، 794، 795، 796، 797، 798، 799، 800، 801، 802، 803، 804، 805، 806، 807، 808، 809، 810، 811، 812، 813، 814، 815، 816، 817، 818، 819، 820، 821، 822، 823، 824، 825، 826، 827، 828، 829، 830، 831، 832، 833، 834، 835، 836، 837، 838، 839، 840، 841، 842، 843، 844، 845، 846، 847، 848، 849، 850، 851، 852، 853، 854، 855، 856، 857، 858، 859، 860، 861، 862، 863، 864، 865، 866، 867، 868، 869، 870، 871، 872، 873، 874، 875، 876، 877، 878، 879، 880، 881، 882، 883، 884، 885، 886، 887، 888، 889، 890، 891، 892، 893، 894، 895، 896، 897، 898، 899، 900، 901، 902، 903، 904، 905، 906، 907، 908، 909، 910، 911، 912، 913، 914، 915، 916، 917، 918، 919، 920، 921، 922، 923، 924، 925، 926، 927، 928، 929، 930، 931، 932، 933، 934، 935، 936، 937، 938، 939، 940، 941، 942، 943، 944، 945، 946، 947، 948، 949، 950، 951، 952، 953، 954، 955، 956، 957، 958، 959، 960، 961، 962، 963، 964، 965، 966، 967، 968، 969، 970، 971، 972، 973، 974، 975، 976، 977، 978، 979، 980، 981، 982، 983، 984، 985، 986، 987، 988، 989، 990، 991، 992، 993، 994، 995، 996، 997، 998، 999، 1000

انڈینٹ نے 22 مئی 1888ء کو اس کے مطالبے میں شامل تھی، مورخہ 26 نومبر 1888ء

اٹھانے کا وقت آگیا تھا "اُسے (حکومت کو) نظم و نسق کے کام میں تعلیم یافتہ طبقے کے کئی "نامزد اور منتخب لوگوں کو شامل کرنا چاہیے تاکہ اس کا رابطہ ہندوستان کی رائے عامہ کے ایک بڑے حصے سے قائم ہو جائے اور اس طرح اُن ذرائع میں اضافہ ہو جائے جن کی وساطت سے وہ ان مختلف فرقوں کے احساس سے باخبر ہو سکتا تھا۔ جس کی خوشحالی اس کی ذمہ داری ہے۔" (1) ڈفرن کا مقصد تھا کہ نسلوں کو کچھ توسیع دینا اور حکومت کے کام میں ہندوستانیوں کو زیادہ شامل کرنا۔

یہ معمولی تجویز بھی سکرٹری آف اسٹیٹ کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ لیکن ڈفرن کے جانشین لینڈلن نے ان پر اصرار کیا۔ سکرٹری آف اسٹیٹ کو اس نے جواب دیا "حقیقت میں یہ ممکن نہیں ہے کہ نمائندگی ہندوستان کے لوگوں کے بجائے اسکی قوموں کو دی جائے۔ بلکہ ہندوستان کی قوموں کی نمائندگی نہیں کریں گے وہ تو صرف اپنی نمائندگی کریں گے۔" (2) اُس نے مزید کہا "میرا خیال ہے کہ ایسا کوئی اقدام ہندوستان میں ہماری حکومت کے لیے پیغام دے گا۔" (3)

لیکن جب 1892ء میں برطانوی حکومت کو مجبوراً ایک پانچواں ڈفرن دینا پڑا تو اس وقت انڈیا سکرٹری آف اسٹیٹ تھے اس بات کی وجہ سے کہ ایک پانچواں ڈفرن دینا بہت ہی خواہشات سے حکومت کو باخبر رہنا۔ اس پانچواں ڈفرن میں حقیقی شراکت یا اس کی طرف پیش قدمی نہیں تھا۔ اس کے مطابق ہندوستان کے بے زبان کروڑوں انسانوں کے لیے نمائندہ حکومت ناقابل عمل تھی۔ اس ایکٹ کا مقصد انتہائی محدود تھا۔ نئی کونسلوں کو محدود کے اندر رہتے ہوئے کام کرنا تھا۔ مزید ممبروں کی تھوڑی سی تعداد اور حکومت کی طرف سے ان کی نامزدگی اور بحث پر بحث کرنے اور تفصیلات معلوم کرنے کا محدود میدان ہندوستانیوں کی سیاسی تعلیم کے لیے کافی نہیں تھا۔ ہندوستان کی رائے عامہ نے اس ایکٹ پر سخت تنقید کی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے صدوروں میں سے فیروز شاہ مہتا، ذیلوی، برجی، سریندر ناتھ برجی اور آر۔ سی۔ دت نے اور ہندوستان کے اخباروں نے زور دیا کہ راست انتخاب کئے جائیں اور کونسل کے کام کی توسیع کی جائے۔

ارڈر کرن، جس نے حکومت ہند کی کارکردگی کے معیار کو بہت اونچا کر دیا اور اس میں بلا کی پستی پیدا کر دی، ایک فعال حکومت میں یقین رکھتا تھا اور حکومت کے تمام محکموں کے کاموں کو ترقی دینے اور ان کی محسوس پالیسیوں کی وضاحت کرنے میں اس نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ لیکن اس کا رجحان ہندو مزاج ایک اچھی اور اچھی طرح سے کی جانے والی حکومت سے آگے نہ بڑھ سکا، یعنی وہ یہ نہ سوچ سکا کہ سب کے ساتھ برابر کا انصاف کیا جائے، نظم و نسق کو خرابیوں سے پاک کیا جائے اور حکمرانوں کے تصورات اور انگلستان میں ہندوستان کے مفادات کے دعوؤں کے مطابق لوگوں کی بھلائی کے کام کئے جائیں۔ اس نے کہا "ہندوستان جو دو ۶ سال بعد بھی اپنے فائض کے سامنے ایک خوبصورت اجنبی کی طرح لہڑا ہوا ہے وہ غیر محفوظ ہے، تنہا ہے، جس کو بہت کم سمجھا گیا ہے اور جس کے متعلق بہت کم واقفیت

(1) مخلصہ (محمی) ذخیرہ روداد، ستمبر 1889ء، نمبر 1-3، ستوری اصلاحات کے متعلق ارڈر ڈفرن کی روداد جو سکرٹری

آف اسٹیٹ کے نام اس کے مراسلے میں شامل ہے، مورخ 6 نومبر 1888ء۔

(2) اس کے کاغذات، اس کی طرف سے لینڈلن کے نام، 30 جون 1889ء۔

(3) ایضاً، اس کی طرف سے لینڈلن کے نام، 23 جنوری 1890ء۔

حاصل کی گئی ہے۔“ (1) لیکن وہ یہ بات نہیں تسلیم کرتا تھا کہ اچھی حکومت حکومت خود اختیاری کا بدل نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے تعلیم یافتہ طبقوں کو ناراض کر دیا ہے۔ جنہیں اس کی اصلاحات میں حکومت خود اختیاری کا ہلکا سا عکس بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بات ہندوستان کے مفاد میں عقلمندی یا تدبیر نہیں کہ سیاسی راحت دی جائیں یا اصلاحات کی جائیں۔ اس نے کہا ”زیادہ قومی اتحاد کے تعلق سے ہندوستانوں کی توقعات اور ملک کے عوامی امور میں زیادہ حصہ لینے کی ان کی خواہش سے مجھے بڑی ہمدردی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی نجات کی تلاش سیاست کے میدان میں نہیں کی جانی چاہئے۔“ (2) چنانچہ 1892ء کے بٹکانی اور غیر اطمینان بخش ایکٹ میں سترہ سال تک کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔ حالانکہ بغاوت کو پچاس سال اور میکالے کی لبرل پیش گوئی کو پچتر سال گزر چکے تھے پھر بھی ہندوستان کی حکومت خود اختیاری ایک خواب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی جس پر دل چپ گھٹکو تو کی باسکتی تھی لیکن اسے عملی شکل نہیں دی جاسکتی تھی۔

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

برطانوی حکمران اپنی بے عملی کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ہندوستان ایک قوم نہیں ہے اور یہ کہ انتخاب یا نمائندہ حکومت کا اصول ہندوستانی تصور نہیں ہے اور مشرقی روایات اور مشرقی ذہن سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں نے اپنی ڈیڑھ سو سال حکومت میں یہ نہیں سوچا کہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی ذمہ داری ان پر بھی ہے خاص طور سے ایسی صورت میں جب ان کا کہنا تھا کہ سامراجی حکومت کا مشن تھا ان پس ماندہ قوموں کو، جن پر وہ حکومت کرتے تھے، تربیت دینا اور مہذب بنانا۔ ہر ریاست کا یہ پہلا کام ہونا چاہیے کہ انھیں زندگی کے راستے میں حائل داخلی رکاوٹوں کو دور کرنے اور سماجی ہم آہنگی اور یک جہتی کے راستے میں آنے والی دشواریوں کو ختم کرے۔ تاریخ نے سفحیات ان واقعات سے بھرے ہوئے ہیں کہ ریاستوں نے کس طرح قوموں کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ برٹش کی ریاست نے کس طرح سینکڑوں چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں کو ملا کر جرمن قوم بنائی، یڈمانٹ کی چھوٹی سی ریاست نے کس طرح اٹالوی قوم کو جنم دیا اور خود برطانیہ نے کس طرح کنناڈا، آندھرا، گجرات اور جنوبی افریقہ کی قوموں کو ایسے گروپوں کو ملا کر بنایا جو سیاسی اختلافات رکھتے تھے اور تہذیبی اعتبار سے مختلف قوموں اور قومیتوں پر مشتمل تھے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہندوستان دو بڑے اور کئی چھوٹے چھوٹے مذہبی فرقوں کا، پس تھا، یہ کہ اس کے لوگ بہت سی زبانیں بولتے تھے، یہ کہ اس کی آبادی 20 کروڑ سے لے کر 30 کروڑ تک تھی اور یہ کہ ان میں نسلی اور تہذیبی اختلافات پائے جاتے تھے پھر بھی کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ انتظام اور تعلیم کی مجھداری اور فیض رسائی پر مبنی پالیسیوں پر عمل کر کے ان میں ایسی سیاسی برادری ہوئے کہ شعور پیدا کیا جاسکتا جس میں مختلف نسلیں، مذہب اور تہذیب شامل تھیں جو پچھڑیا تہائے متحدہ امریکہ، کنناڈا اور روس میں

(1) اور ڈکر زن ہندوستان میں 1896ء-1905ء اس کی تقریروں کا انتخاب از ماسٹریل، جلد دوم، صفحہ 331

(2) ایضاً، جلد 1، صفحہ 156

حاصل کیا گیا اس کا ہندوستان میں حاصل کرنا ناممکن نہیں ہونا چاہیے تھا جہاں ایسی بہت سی وجوہ موجود تھیں جو سیاسی اتحاد کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک دوسرے ملکوں کا تعلق ہے وہاں کی حکومت ”لوگوں کے ساتھ ایک فطری رشتہ رکھتی تھی“ اور داخلی یک جہتی کے لیے کوشاں تھی۔ لیکن ہندوستان میں حکومت اور عام لوگوں کے رشتے کی بنیاد مختلف مفادات پر قائم تھی۔ حکمران نہ صرف نسل، مذہب، زبان، تہذیب اور روایات کے اعتبار سے مختلف تھے بلکہ وہ نفسیاتی اعتبار سے بھی الگ اور نمایاں تھے۔ فرض یا مفادات کے خیال کی بنا پر ایک انگریز کچھ مدت کے لیے ہندوستان آجاتا تھا لیکن اس کا مادی، جذباتی اور روحانی گھر کہیں اور تھا۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کی امیدوں اور خواہشوں میں یا ان کے دکھوں اور تکلیفوں میں شامل نہیں تھا نہ وہ ان کے ذہن کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ ان کے درمیان رہ کر بھی ان میں سے ایک نہیں بن پاتا تھا۔

ان حالات میں جبکہ سامراجی اپنے مفاد کے اقتدار اعلیٰ پر اصرار کر رہے تھے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ انگریز حکومت کا اولین فرض ادا کرنے میں ناکام رہے یعنی لوگوں کے درمیان ہم آہنگی اور باہمی اعتماد کا احساس پیدا نہ کر سکے۔ اس کے برعکس انہوں نے ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن کی بنا پر فرقے اور فرقے اور طبقے اور طبقے کے درمیان خلیج اور بڑھ گئی۔ سامراج کے اس پہلے اصول پر سختی کے ساتھ عمل کیا گیا کہ ان کو فتح کرنے کے لیے لوگوں کے باہمی اختلافات کا استحصال کیا جائے اور اس کے بعد ان پر دائمی غلبہ رکھنے کے لیے ان اختلافات کو استعمال کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اختلافات پائے جاتے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ابتداء میں حب الوطنی کے احساس کا ایسا رشتہ نہیں تھا جو کسی علاقے کے لوگوں کو متحد رکھ سکا اور یہ کہ اپنی تباہی کے لیے ہندوستانیوں نے خود کو آلہ کار بنانے کی اجازت دی پہلے ہندو اور مسلمان دینی حکمرانوں اور سرداروں نے اور ان کے زوال کے بعد دونوں فرقوں نے اپنے سامراجی مالکوں کی چالوں میں ان کی مدد کی۔ 1857ء کی بغاوت کے فوراً بعد سے لے کر منٹو کے عہد تک ہندو حکومت کے پسندیدہ عناصر بنے رہے۔ بغاوت میں انہوں نے جو حصہ لیا تھا اس کو معاف کر دیا گیا مگر مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے اصل دشمن سمجھا جاتا رہا۔ اس کے بعد حالات نے کروٹ لی۔ ہندوؤں کی بیداری نے حکومت کو پریشان اور ناراض کر دیا جس کا اظہار مذہبی اور سماجی اصلاحات کی تحریکوں میں، ادب کے نشاۃ الثانیہ میں، شاندار ماضی کی یادوں کے احیاء میں اور ہندو دانشوروں کی بڑھتی ہوئی قوم پرستی میں ہوا جس نے اخبارات اور منظم تحریک کے ذریعہ سیاسی شکایتوں کو دور کرنے کا مطالبہ کیا۔ سرچرڈ ٹیمپل نے اپنے غصے کا اظہار اس طرح کیا ”وہ (برہمن بچاری) جو اپنی نسل اور خاندان پر فخر کرتے ہیں، اپنی ایزدی ابتدا پر یقین رکھتے ہیں، اپنے تقدس پر اصرار کرتے ہیں اور اپنی ذہنی برتری کا شعور رکھتے ہیں ایک ایسی نئی سلطنت کے متعلق ناقابل بیان جذبات رکھتے ہوئے جس نے تعصبات، توہمات اور فرسودہ تصورات کو اس طرح کچل دیا جس طرح پرانے زمانے میں خود ان کی روایات کے مطابق یجن تھ کا تھ لوگوں کو کچل دیا کرتا تھا۔“ (1)

چنانچہ حکومت نے اپنی سرپرستی بدل دی۔ مسلمانوں کی خطرناک وہابی تحریک کچل جائیگی تھی۔ سر سید احمد خاں، امیر علی اور عبداللطیف خاں کی طرح کے مسلم رہنما برطانوی شکوک کو رفع کرنے اور

مسلمانوں میں وقاداری کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہندو اور خاص طور سے بنگالی بابو کو انگریز حاکم قتلِ نفرت سمجھنے لگے تھے اور ان کے خلاف جذبہ خصامت بڑھتا جا رہا تھا۔

لیکن ان کے پسندیدہ لوگ چاہے ہندو تھے یا مسلمان ان کا مقصد یکساں تھا یعنی فرقوں میں پھوٹ ڈالنا اور انہیں تیسرے فریق کے خلاف مل کر کام کرنے سے روکنا یعنی اس کے خلاف جوان پر حکومت کرتا تھا۔ اس زمانے کے ریکارڈ پر نظر ڈالنے سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ فرقہ وارانہ منافرت سے حکمران حلقوں کو کتنی خوشی ہوتی تھی اور کس طرح وہ اپنی کاروائیوں اور پالیسیوں سے فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے میں مدد دیتے تھے۔

وڈ نے اہلگن کے نام ایک خط میں کہا تھا ”ہم نے ایک کو دوسرے کے خلاف شہ دے کر اپنی حکومت کو باقی رکھا ہے اور آئندہ بھی ہمیں یہی کرنا چاہیے۔ اس لیے آپ مشترکہ احساس کو روکنے کیلئے جو بھی کر سکتے ہیں وہ کیجئے۔“ (1) مزید کہا ”ہم نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ فوجوں کے درمیان بھائی چارے اور میل ملاپ کا جذبہ نہ پیدا ہو پائے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے لیے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ نسلوں اور طبقوں کو ایک دوسرے سے دور رکھا جائے تاکہ اس قسم کے خطرے سے زیادہ سے زیادہ بچا جاسکے۔ شامی مغربی صوبے کا روزمرہ کام شامی مغربی فوجوں سے چلائے، پنجاب کا کام پنجاب کی فوجوں سے، پنجاب کی فوجوں کو اس کے لیے تیار کئے کہ وہ پوریوں کو مار بھگا لیں اور اگر ضرورت پڑے تو پوریوں کو سکسوں کے خلاف استعمال کیجئے (2) ایک اور خط میں وڈ نے بڑے حکیمانہ انداز میں لکھا ہے ”ہندوستان میں ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنی حیثیت کو مضبوط بنانے کے کسی بھی ذریعہ کو نظر انداز کر سکیں۔ یقین کیجئے کہ نسلوں کی فطری مخالفت ہماری تقویت کے لیے ایک اہم عنصر ہے۔ اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم کتنے دن وہاں رہ سکیں گے۔“ (3)

ہندوستان کے ساتھ ترک کے رشتے اور عثمانی خلیفہ کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردی پر بحث کرتے ہوئے لٹن نے سیلس بری کو خطرے سے ان الفاظ میں آگاہ کیا تھا ”اس بات سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت ایک مسلم طاقت ہے اور اس کا پورا اخصار ملک معظم کی حکومت کی پالیسی پر ہے کہ ہماری مسلم رعایا کے جذبات ہمارے لیے بڑی سلامتی کا باعث بنیں گے یا بڑے خطرے کا۔“ (4)

پورے ہندوستان کا دورہ کر کے سریندر ناتھ بھرتی نے جو تحریک شروع کی تھی اس نے، انڈین ایسوسی ایشن کی 78-1877ء کی تحریک نے اور 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام نے حکام کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ لارڈ ڈی اے نے انجمن اسلام کی ایک یادداشت ڈفرن کو بھیجے ہوئے لکھا تھا کہ ”اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ مقابلے میں مسلمان پیچھے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ ان کے لیے جو کچھ کر سکوں وہ کر دوں حالانکہ سرکاری عہدوں کے لیے درخواستیں دینے والوں کی تعداد میں

(1) کوڈ کے کاغذات، وڈ کا خط ہلکن کے نام، 3 مارچ 1862ء۔

(2) ایضاً، ایضاً، 10 مئی 1862ء۔

(3) کوڈ کے کاغذات، وڈ کا خط ہلکن کے نام، 19 مئی 1862ء۔

(4) لٹن کے کاغذات، لٹن کا خط سلیسبرے کے نام، 23 جون 1877ء۔

اضافہ خوش آئندہ نہیں ہے۔“ (1) بنگال کے لکھتہ گورنر سر ریورس ٹامس نے ”ملازمتیں حاصل کرنے میں مسلمانوں کی دست گیری کرنے“ (2) کی سرکاری پالیسی میں تبدیلی کا استقبال کیا تھا۔ سر ڈبلیو۔ ایچ۔ گرگوری نے مسلمانوں کی تعلیم پر حکومت ہند کی تجویز کو بہت پسند کیا تھا۔ اس نے ڈفرن کو لکھا تھا ”مجھے یقین ہے کہ یہ بہت مفید ثابت ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کا فائدہ محسوس ہو رہا ہے اور مسلمان برہمن اور بابوؤں کی تحریک سے بالکل علیحدہ ہیں۔ یہ بات بڑی کارآمد ثابت ہوگی کہ ہمارے تعلقات آبادی کے اس حصے سے اچھے ہو جائیں جو سب سے زیادہ بہادر ہے اور ایک زمانے میں ہمارے سب سے زیادہ خطرناک دشمن تھا۔ لیکن انہوں نے ایک زبان ہو کر اعلان کر دیا ہے کہ 1857ء میں انہیں سزا مل چکی ہے اور وہ ایک مرد کی طرح اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ ہندوؤں کے غلبے سے محفوظ رہنے کے لیے وہ اب ہماری طرف اور صرف ہماری طرف دیکھتے ہیں۔“ (3) ایک سال بعد گرگوری نے پھر گورنر جنرل کو لکھا ”انہیں (مسلمانوں کو) صاف صاف نظر آتا ہے کہ انہیں ہمارا ساتھ دینا چاہیے اس لیے کہ انہیں کسی بابو یا برہمن سے بھلائی کی توقع نہیں ہے۔“ (4) اس کے بعد اگلے سال اس نے ان الفاظ میں ڈفرن کو مبارکباد پیش کی ”یہ بات آپ کے لیے بڑے اطمینان کا باعث ہوگی کہ آپ نے سمجھداری سے کام لے کر مسلمانوں کو ہمارے راج کا پکا حامی بنادیا ہے۔ اب آپ بابو کی کینہ پروری پر مسکرا سکتے ہیں۔“ (5) شمال مغربی صوبہ جات کے لکھتہ گورنر کولون نے ڈفرن کو یقین دلایا تھا کہ اس کے صوبے کے مسلمان کانگریس کے بہت خلاف ہیں جسے وہ ہندو اقتدار کے دعوے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کی قومی تحریک احمقانہ ہے جس میں مسلمان حصہ نہیں لیں گے۔ (6)

سر جان اسٹرنجی نے اعتراف کیا کہ ”حقیقت یہ ہے کہ ان خاصمانہ مذہب کا ساتھ ساتھ وجود ہندوستان میں ہماری سیاسی حیثیت کی تقویت کی ایک بڑی وجہ ہے۔“ (7)

سکرٹری آف انٹیٹ فار انڈیا جارج فرانسس ہملٹن نے ہندوستان کے وائسرائے کرزن کو لکھا تھا ”میرا خیال ہے کہ اب نہ سبھی پچاس سال بعد ہندوستان میں ہماری حکومت کے لیے حقیقی خطرہ ہے۔ تحریک اور تنظیم کے مغربی تصورات کو رفتہ رفتہ قبول کرنے اور توسیع دینے کی کوشش اور اگر ہم تعلیم یافتہ ہندو پارٹی کو دوائیے حصوں میں تقسیم کر سکیں جو متضاد تصورات رکھتے ہوں تو ہم اس قسم کی تقسیم سے اپنی حیثیت کو ان مسلسل حلوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں جو تعلیم کے پھیلاؤ کی بنا پر ہماری حکومت کے نظام پر ضرور کئے جائیں گے۔“ (8)

اعلیٰ حکام کے خیالات اس قسم کے تھے جن کی اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک خود

(1) ڈفرن کے کاغذات، ای۔ اے۔ کاغذ ڈفرن کے ہم، 31 مئی 1885ء

(2) ایضاً، سر ریورس ٹامس کاغذ ڈفرن کے ہم، 14 جنوری 1886ء

(3) ایضاً، ڈبلیو۔ ایچ۔ گرگوری کاغذ ڈفرن کے ہم، 24 فروری 1886ء

(4) ایضاً، سر ڈبلیو۔ ایچ۔ گرگوری کاغذ ڈفرن کے ہم، 21 مارچ 1887ء

(5) ایضاً، 16 مئی 1888ء

(6) ایضاً، سر الکسیڈر کولون کاغذ ڈفرن کے ہم، 24 مئی 1888ء

(7) پٹی۔ مون نے ہندوستان میں جسکی میں اس کا اقتباس دیا ہے۔ صفحہ 99

(8) ہملٹن کاغذ کرزن کے ہم، 2 ستمبر 1897ء

ذفرن کا تعلق تھا اس نے کراس سے کہا تھا "اس ملک میں آتے ہی میں نے جن مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا وہ بھی میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے ہیں اور قریب قریب ہندوستان کے ہر شہر کے مسلمانوں نے مجھے سپاس نامے پیش کئے ہیں۔" (1) کراس اُسے پہلے ہی لکھ چکا تھا کہ "مذہبی جذبات میں یہ پھوٹ ہمارے لیے بہت مفید ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ کی تفتیش کی کمیٹی کا نتیجہ اچھا ہی ثابت ہوگا۔" (2)

جب 1892ء میں لیجسلیٹیو کونسلوں کی توسیع ہوئی تو ممبروں کو چننے کا سوال پیدا ہوا۔ امپریل لیجسلیٹیو کونسل میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ لینس ڈاؤن نے اس کی وضاحت کی کہ ایسے ادارے قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے جو یورپ کی پارلیمانی اسمبلیوں کی طرح کے ہوں۔ ہم تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ان کونسلوں کے لیے ان ممبروں کی خدمات حاصل کی جائیں جو واقعی نمائندہ ہوں لیکن جو ملے اور تعداد کے بجائے قسموں اور طبقوں کی نمائندگی کریں گے۔" (3) چنانچہ اس طرح مختلف مذہبی فرقوں اور گروہوں کے لیجیڈاگانہ رائے بھندگی کا اصول شروع کیا گیا اور ہندوستان کو ایسے مختلف مفادات، طبقات اور تہذیبوں کا آمیزہ سمجھا گیا جن میں کوئی فطری سیاسی اتحاد نہیں تھا نہ آئندہ ہونے کی امید تھی۔

حکومت کے ان دعوؤں کے متعلق ایک کنزرویٹو انگریز نے نیشنل ریویو میں لکھا، جو ایک کنزرویٹو اخبار تھا کہ "مسلمان اور ہندوؤں کے درمیان مبینہ رقابت توجہ ہٹانے اور اصلاحات سے بچنے کا ایک آسان طریقہ ہے میں یہ نہیں کہتا چاہتا ہوں کہ دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات نہیں ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہتا چاہتا ہوں کہ ان اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔" انڈین نیشنل کانگریس کے متعلق اس نے لکھا تھا "کانگریس کے ممبر قومیت کی مشترکہ بنیاد پر ہر ایک ملک کے شہری ہونے کی بنا پر، ایک حکومت کی رعایا ہونے کی وجہ سے، ایک قسم کے قوانین رکھنے والوں، ایک حکومت کو نیکس ادا کرنے والوں، ایک انتظامی نظام سے فائدہ یا نقصان اٹھانے والوں کی طرح، مشترک عوامل کی بنا پر، ایک سے حقوق حاصل کرنے کے لیے اور دوسرے سے ایک سا چھٹکارا پانے کے لیے آپس میں ملتے ہیں۔ لوگوں کو قومیت کے رشتے میں باندھنے کے لیے اگر یہ وجوہ کافی نہیں ہیں تو پھر یہ سوچنا بھی دشوار ہے کہ کیا کافی ہوگا۔" (4)

رجسٹروں کے ساتھ اتحاد

برطانوی اقتدار کو باقی رکھنے کے لیے ہندو، مسلم اختلافات گویا کہ ناکافی تھے ایسے برطانوی سامراج کی دہری ضمنت کے طور پر انگریزوں نے ایک اور دفاعی لائن بنائی۔ ہو سکتا تھا کہ مسلمان ان صورتوں میں انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیتے اور مذہبی اشتعال کے تحت 1857ء کی خطرناک راہ پر چلے جاتے۔ یہ محض خیال تھا خطرہ نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ بین الاقوامی مفادات کی بنا پر انگریزوں کا بھڑا عثمانی خلیفہ سے ہو جاتا جس کی بنا پر مسلمان اپنا توازن کھودیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں افغانستان،

(1) کراس نے کاغذات، ذفرن کا خط کراس کے نام، 26 مارچ 1888ء

(2) ایضاً، کراس کا خط ذفرن کے نام، 14 جنوری 1887ء

(3) لینس ڈاؤن، امپریل لیجسلیٹیو کونسل میں تقریریں، 16 مارچ 1893ء

(4) انڈین ریویو، 19 مارچ 1890ء، "ذفرن کا خط"، 1890ء، انڈین نیشنل کانگریس، (نیشنل، 1917ء)، ص 2۔

ایران اور مصر میں اسلام اور انگلستان کے درمیان تصادم ہو چکا تھا اور آرمینیا کے عیسائیوں کی گلیز سن جو حمایت کر رہا تھا وہ امکانی جھگڑے کی وجہ بن گئی تھی۔

یہ بات زیادہ کار آمد معلوم ہوئی کہ ہندوستان کے لوگوں کے ایک ایسے حصے کو دریافت کیا جائے اور اس سے تعلقات بہتر بنائے جائیں جس پر بغیر معمولی حالات کی صورت میں اعتماد کیا جاسکے۔ عام لوگ جو جاہل اور جاہ حال تھے ان سے کوئی امید نہیں تھی۔ ان کے سامنے مسلسل روزی، روٹی کا سوال رہتا تھا۔ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ سیاسی اعتبار سے فعال تھا۔ لیکن اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے اس میں بڑی بے چینی تھی اور وہ ایسے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے جنہیں حکومت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی تھی۔

اب صرف دیسی حکمرانوں، سرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کا طبقہ اثر افیہ باقی رہ گیا تھا۔ مراعات دیکر ان کی وفاداری اور حمایت حاصل کرنے میں کچھ خطرے تھے۔ لٹن کے مطابق دیسی حکمران سازشوں کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ (۱) پھر بھی وہ جانتے تھے کہ حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا خود ان کے مفاد میں ہے۔ 1857ء کی بغاوت کے دوران انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ ڈیلوزی کی پالیسی نے انہیں خائف کر دیا تھا اور وہ کے متعلقہ اوروں کے متعلق کینگ نے جو پہلا فیصلہ کیا تھا وہ بھی ان کے لیے بہت اطمینان بخش نہیں تھا۔ چنانچہ وہ تذبذب کے شکار تھے اور اپنے مستقبل کے متعلق پریشان۔

ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ دیسی حکمرانوں کے تعلق سے ایسی پالیسی تشکیل کی جائے جو ایک طرف تو ان کے سازش کرنے کے جذبے کو دبا دے اور دوسری طرف ان کے تعاون کی ضامن ہو۔ ان کے عزائم کو ختم اور تمام خطروں کو دور کرنے اور حکم فرماں مالک اعلیٰ کا دیسی حکمرانوں کو فادار رکھنے کی غرض سے وہ پالیسی تشکیل کی گئی جسے لی۔ واند نے ”ماقتی یونین“ سے تعبیر کیا ہے۔

ماقتی کی پالیسی کی بنیاد بالادستی، شای حق، حقوق معاہدے کے مضمرات اور فوجی مصلحت کے اصولوں پر قائم تھی۔ اسکا اطلاق ریاست کے خارجی اور داخلی دونوں امور پر کیا جاتا تھا۔ اسکا مقصد تھا ریاست کو برطانوی سلطنت کے ایک ازمی جزو میں تبدیل کرنا۔

1858ء کے بعد ظاہر ہو گیا تھا کہ جبکہ ہندوستان بدل رہا تھا اور نئی سیاسی، انتظامی اور معاشی طاقتیں ملک کی صورت تبدیل کر رہی تھیں اس وقت ریاستیں علیحدہ اور وسطی پس ماندگی میں مبتلا نہیں رہ سکتی تھیں۔ 1857ء میں چھ سو سے زیادہ ریاستیں موجود تھیں اور کمپنی کی حکومت کے ساتھ ان کے رشتے مختلف نوعیت کے تھے۔ حیدر آباد کی طرح کی کچھ ریاستیں اقتدار اعلیٰ کے حقوق کی دعویدار تھیں اور ایسی حکومت بھی جاتی تھیں جن کی حیثیت حکومت کے مساوی تھی۔ کچھ دوسروں کو اتنے زیادہ حقوق حاصل نہیں تھے لیکن وہ بھی بالادست حکومت کے ماتحت نہیں تھے۔ لیکن ان میں زیادہ تر ایسی تھیں جنہیں انگریزوں نے جنم دیا تھا اور انہیں ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ ہر قسم کی ریاستوں کے حقوق و فرائض محض معاہدوں اور سمجھوتوں ہی میں درج نہیں تھے بلکہ کنونشن اور رواج کی بنیاد پر بھی قائم تھے۔

جب حکومت ہندوستان کمپنی سے تاج کو منتقل ہو گئی اس وقت ان تمام معاہدوں، سمجھوتوں اور سندوں کی، جو کمپنی اور ریاستوں کے درمیان ہوئے تھے، تصدیق کر دی گئی تاکہ دیسی حکمرانوں کے ذہنوں

میں کوئی شک و شبہ یا خطرہ باقی نہ رہے۔ لیکن عملاً ان کو لفظاً لفظاً پورا کرنا ممکن نہ تھا اور حالات اور وقت کی لمبیدلی کے ساتھ ان کے منہوم کو بھی اس طرح توڑ مڑ کر پیش کیا گیا کہ ان کا اصل مقصد بڑی حد تک بدل گیا اس طرح کی جانے والی ترمیم کے جواز میں یہ دلیلیں پیش کی گئی کہ پارلیمنٹ کے اختیار کی تجدید نہیں کی جاسکتی ہے، یہ کہ تاج کو ایسے شاہی حقوق حاصل ہیں جنکی ریاستیں پابند ہیں اور یہ کہ بالادست حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کو خداجی صلوں اور داخلی سورشوں سے محفوظ رکھے اور اسکے لیے ان کے داخلی معاملہ میں مداخلت کرے۔

اس طرح برطانوی حکومت کا کنٹرول ریاستوں پر بڑھتا رہا اور ان کی جھپٹیں کم ہوتی رہیں اور بہت سی پابندیاں ان پر لگ گئیں۔

سب سے پہلے برطانوی تاج یعنی انگلستان کے بادشاہ وقت سے وفاداری اور اس کی اطاعت۔ چونکہ بادشاہ عزت کا سرچشمہ تھا اس لیے اسے حق حاصل تھا کہ وہ دینی حکمرانوں کو خطابوں، سلامی، تمغوں، عہدوں اور حقوق سے نوازے اور دینی حکمرانوں کا فرض تھا کہ وہ انہیں قبول کریں۔ پچھلے راجہ یا نواب کی گدی پر اس کا جانشین اس وقت بیٹھ سکتا تھا جب اسے بادشاہ یا اس کا نائب بھی دائرہ سرائے قبول کرے۔ وراثت کے متعلق تمام جھگڑوں کا فیصلہ برطانوی حکومت ان حقوق کے مطابق کرتی تھی، ان ریاستوں کا انتظام سنجال لیتی تھی جن کے حکمران باغی تھے اور بد نظمی یا بغاوت کی صورت میں حکمران کو گدی سے اتار دیتی تھی۔ اس کو برطانوی بالادستی کہا جانے لگا۔

جہاں تک خداجہ ریشٹوں کا تعلق تھا چاہے بدیسی حکومتوں کے ساتھ ہوں یا دوسری ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ، ہندوستان کے دینی حکمرانوں کو بین الاقوامی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ ان کے اختیارات پوری طرح حکومت ہندوستان کو منتقل کر دیے گئے تھے۔ وہ کسی بدیسی طاقت کے ساتھ معاہدہ کر سکتے تھے نہ کسی دوسری ہندوستانی ریاست کے ساتھ سرکاری رشتے قائم کر سکتے تھے۔ ہندوستانی ریاستوں کے باشندے جب کسی دوسرے ملک کو جاتے تھے یا وہاں رہتے تھے تو ان کی حفاظت برطانوی حکومت کی ذمہ داری تھی اور وہ برطانوی قوانین کے پابند تھے۔

جہاں تک سلطنت کے دفاع کا تعلق تھا یا بالادست حکومت کو غیر معمولی حالات میں ریاستوں کے پورے وسائل کو استعمال کرنے کا احمد و حق حاصل تھا۔ اسکے علاوہ کچھ ریاستوں کو فوج کی ایک مقررہ تعداد برطانوی حکام کی انتظامی اور جنگی کمانڈ میں مشعر کہ دفاع کے لیے رکھنی ہوتی تھی۔ فوجی معاملات میں ریاستوں کے اختیارات سختی کے ساتھ کم کر دیے گئے تھے اور اس کا فیصلہ برطانوی حکومت کرتی تھی کہ کسی ریاست کے پاس کتنی فوج ہوگی۔

چونکہ ریاستوں کی حفاظت کی ذمہ داری بادشاہ پر تھی اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ آمد و رفت اور خبر رسائی کے ذرائع یعنی ریلیں، ٹیلی گراف اور ڈاک کے نظام بھی برطانوی حکومت کے کنٹرول میں ہوں۔

آخری بات یہ کہ بالادست حکومت نے معاہدوں کی وضاحت کچھ اس طرح کی تھی کہ ریاستوں کی داخلی آزادی بھی بڑی حد تک کم ہو گئی تھی۔ مثال کے طور پر وہ کہتے تھے کہ انہیں حق حاصل ہے کہ ریاستوں کی شکست و ریخت نہ ہونے دیں، جائز خطرہاں کے خلاف بغاوت کو کچل دیں۔ بد نظمی سے بات کو بچائیں، غیر انسانی رواجوں یا بدیہی قوانین اور عام اخلاق کے خلاف جرائم کو روکیں اور نہ ہی

رواداری پر اصرار کریں پھر عدالتی معاملات میں حکومت ہندوستان کو برطانوی رعایا کی ذات پر اختیار حاصل تھا اور ریاستوں کے علاقوں میں واقع چھانڈوں میں ہر شخص اور ہر چیز پر اسے اختیار حاصل تھا حالانکہ وہ اس کا علاقہ نہیں تھا۔

چنانچہ جیسا کہ سلیسبری نے کہا تھا ہندوستان کے دیسی حکمران اپنے علاقوں کا انتظام بخیر کرنے کے لیے برطانوی حکومت کے نائب بنا دیے گئے۔ برطانوی سلطنت کے لیے خطرہ پیدا کرنے کی ان کی طاقت ہمیشہ کیلئے ختم کر دی گئی۔

لیکن اتنا کافی نہیں تھا۔ لیکن کا مقصد تھا ”ہندوستان کے طبقہ شرفا کو پوری طرح ہاتھ میں لینا اور اچھی طرح استعمال کرنا۔“ (1) اس نے تجویز کیا ”باج گزار ریاستوں اور دیسی حکمرانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات میں اس طرح ترمیم کی جانی چاہیے کہ ان سے ہماری سلطنت کے استحکام اور سلامتی کو فائدہ پہنچے۔“ (2) اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ دیسی حکمرانوں کی سیاسی طاقت میں اضافہ کیا جائے بلکہ وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ ان کی تسکین کی جائے اس لیے کہ ”آپ جتنا زیادہ مشرق کی طرف جاتے ہیں اتنی ہی زیادہ ایک چھوٹی سی جھنڈی کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔“

ان جھنڈیوں میں سب سے زیادہ اہم تھا ملکہ وکٹوریہ کا اعلان جس میں کہا گیا تھا ”میں نے موجودہ علاقوں میں توسیع کرنے کے ہم خواہش مند نہیں ہیں۔“ دوسری تھی ڈیہوڑی کے ریاست کے سوخت ہونے کے نظریے اور گوڈ لینے کی سند دینے کے طریقے کو ادا کرنا۔ ان دونوں کی وجہ سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ ریاستوں میں تاریخی خاندانوں کی حکمرانی ہمیشہ باقی رہے گی اس طرح ان کی تشویش دور ہو گئی اور دیسی حکمران اس کے لیے آمادہ ہو گئے کہ معاہدوں کی وہ تعمیری وضاحت کی جائے جس کی بنا پر ان کی حیثیتیں اور اختیارات بہت کم ہو گئے پھر بھی وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو بحال و برقرار رکھنے کے لیے بڑی وفاداری کے ساتھ آمادہ ہو گئے۔

اتنے زیادہ، اتنے مضبوط اور بظاہر ناقابلِ تسخیر سلامتی کے قلعے بنانے کے بعد ہندوستان کے برطانوی حکمران طاقت کے نشے میں اتنے چور اور اپنی نسلی ”برتری“ کے خیال میں اتنے گمن ہو گئے کہ وہ اس تبدیلی کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے جو ملکہ میں آ رہی تھی۔ ان کے اس خیال نے کہ وہ ہندوستان کے بے زبان کروڑوں لوگوں کے ولی کی حیثیت سے نیک ارادے رکھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت چھین لی اور وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ عام لوگوں کو کتنے دکھوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اپنی پاکبازی کے متعلق ان کے غرور نے انہیں اس بات پر اکسلیا کہ ہندوستانیوں کے دکھوں کو وہ خود ان کے رواجوں اور عادات کو نتیجہ بتائیں جسکی بنا پر لوگوں کی ترقی کی راہ میں ناقابلِ عبور رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ چونکہ عام لوگ سیاسی اعتبار سے بہت پس ماندہ تھے اور برطانوی راج کے لیے خطرہ پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اس لیے انگریزوں کو ان کی حقیقی بھلائی کے اقدامات کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ہندوستان کے دیسی حکمرانوں کو جب زبان اور مراعات کے ذریعہ بے ضرر بنا دیا گیا۔

دوسری طرف متوسط طبقہ اور خاص طور سے اُس کا گواہ۔ یعنی تعلیم یافتہ حصہ خرانوں میں

(1) لیٹن کے کاغذات، لیٹن کا دسواں سلیسبری کے نام، 11 مئی 1876ء۔

(2) ”ایسا“، 25 مئی 1876ء۔

لے جلے اساسات پیدا کرتا تھا۔ یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ان کے تعاون کے بغیر انتظامی ڈھانچہ نہیں چلایا جاسکتا ہے اس لیے ان سے اچھے تعلقات رکھنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اپنے غیر تعلیم یافتہ ہم وطنوں پر وہ اثر ڈال کر تشویش ناک مسائل پیدا کر سکتے تھے اس لیے انہیں مطمئن رکھنا ضروری تھا لیکن حکومت پر ان کی تنقید تا پیندہ تھی۔ اور ان کی سیاسی مانگوں کو بنیادی طور سے سامراجی مفادات کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ وہ جن اصلاحات کی وکالت کرتے تھے ان سے برطانوی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جو سیاسی، معاشی غلبہ حاصل کیا گیا تھا وہ ختم ہو جاتا اس رجحان کو ختم کرنا ضروری تھا موثر انداز میں ان سے ہنسنے کے لیے ایسی پالیسی پر عمل کرنا ضروری تھا جس کے دوزخ ہوں۔ یہ ضروری تھا کہ انہیں دلیلیں دے کر یقین دلایا جائے کہ ان کی کم تعداد اور نمائندہ حیثیت کی کمی کی بنا پر ان کے مطالبات ناقابل قبول ہیں اس کے علاوہ ہندوستان کی مطلق العنانیت کی سیاسی روایتیں اور جمہوری طریق عمل کے متعلق اسکی نا تجربہ کاری حکومت کے نمائندہ نظام سے مطابقت نہیں رکھتی ہیں۔

یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان متحد نہیں ہے نہ اس کا کوئی امکان ہے کہ نسل، مذہب اور تہذیبی اختلافات کی بنا پر کبھی قومی جذبہ وجود میں آسکے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اپنی دلیوں کو تقویت پہنچانے کی غرض سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اختلافات کو اور مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کو، جو سیاسی اتحاد کے راستے میں حائل تھے، انتظامی اقدامات کے ذریعہ ابھارا گیا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے خصوصیت کے ساتھ اس کا اثر قبول کیا اس لیے کہ ان کے قلیل المدتی اور فوری مقاصد میں اور ہندوؤں کے مقاصد میں ٹکراؤ تھا۔ ان باتوں پر بہت اختلاف نہیں تھا جن کا راست تعلق مذہب سے تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہب کے محافظ یعنی مسلم ملا قومی مطالبات کی حمایت کرنے کے لیے تیار تھے۔ اختلافات تو سیکور امور میں تھے مثلاً کونسلوں میں نمائندگی، ملازمتوں میں نمائندگی اور حکومت کی سرپرستی حاصل کرنے میں مقابلہ۔

اس قسم کی پالیسیوں پر عمل کر کے انگریزوں نے یوم الحساب کو ملتوی کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے حالات میں انہوں نے اسی قدیم قول کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ ”اچھی حکومت حکومت خود اختیاری کا بدلہ نہیں ہوتی ہے۔“ وہ متوسط طبقہ کے اثر کو بھی پوری طرح نہ سمجھ سکے جو ایک ”چھوٹی سی اقلیت“ ہونے کے باوجود عام لوگوں کے دل و دماغ کے مترواف تھا۔ انہوں نے تاریخ کے اس سبق سے فائدہ نہیں اٹھایا کہ کوئی سیاسی نظام تغیر سے بری نہیں ہوتا ہے اور یہ کہ فرقہ وارانہ اختلافات اس طوفان سے نہیں بچا سکتے ہیں جو عالمی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہندوستان کی سلطنت پر منڈلا رہا تھا۔ انکی ضد، کم نگاہی اور تکبر نے ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کر دی تھی اور ایسے وہ وقت کی تحریر کو پڑھنے اور مستقبل کے لیے تیار رہنے کی اہلیت کھو بیٹھے تھے۔

انگریزوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اہل نظر تھے اور جنہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ برطانوی راج ہمیشہ نہیں رہ سکتا ہے اور ایسے ایک نہ ایک دن ہندوستان کو آزادی دینا پڑے گی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو لبرل نقطہ نظر رکھتے تھے لیکن ہندوستان کے مسئلے کی الجھنوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا اس لیے وہ مستقبل کو صاف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن فی الجملہ حفر ان طبقہ اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ برطانوی مفادات کو پورا کرنے کے لیے سیاسی غلبہ ضروری نہیں ہے اسوقت بھی وہ سامراجی بنے رہے۔

انہوں نے کارلائل کی اس بات کو بھلا دیا یا غیر اہم سمجھا جو اس نے اٹھارہویں صدی کے فرانس کے متعلق کہی تھی لیکن جس کا اطلاق دوسرے ملکوں پر بھی ہوتا تھا یعنی ”بھوک اور برہنگی اور پاکیزگی کے ساتھ کئے گئے مظالم کا بوجھ 25 ملین دلوں پر تھا۔ فرانسیسی انقلاب کی اصل وجہ یہ تھی نہ کہ زرخشی احساس برتری اور فلسفے کے دکیوں، دولت مند دکانداروں اور دیہاتی اشرافیہ کے فلسفوں سے انکار تمام ملکوں میں ہونے والے انقلابوں میں ایسا ہی ہوگا۔“ (1)

انہوں نے اس دور کے عظیم انقلابی لیسن کو بھی اہمیت نہیں دی جس نے کہا تھا ”سیاست وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں عام لوگ ہوتے ہیں۔ وہاں سے نہیں جہاں ہزاروں ہوتے ہیں بلکہ وہاں سے سنجیدگی کے ساتھ سیاست شروع ہوتی ہے جہاں لاکھوں کروڑوں ہوتے ہیں۔“ (2)

بھوک، برہنگی اور مظالم کا احساس ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں عام لوگوں کے دلوں میں مایوسی پیدا کر رہے تھے اور اس کے ساتھ انہیں ان لوگوں کے پیچھے لے جا رہے تھے جو بہتر زندگی کے دعوے کرتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو بھی اخلاقی تقویت پہنچائی جو ان کے لیے اچھی خبر لائے تھے۔ انسانی نسل کی 1/5 آبادی کے بے چینی اور بے اطمینانی کے طوفان کو چھوٹی موٹی باتوں سے نہیں روکا جاسکتا تھا۔ پانی کو مختلف دھاروں میں بانٹ کر کچھ دن کے لیے سیلاب کو مالا جاسکتا تھا لیکن ہمیشہ کے لیے آگے بڑھنے سے روکا نہیں جاسکتا تھا۔

(1) کارلائل، انقلاب فرانس کی تاریخ، III، باب 1۔

(2) لیسن، مجموعہ تصانیف، جلد 7، صفحہ 290

بار ہواں باب

سیاسی تحریک

I۔ متوسط طبقہ کا رول

انیسویں صدی کا نصف آخر ایسا زمانہ تھا جب ملک کے بدلیسی حکمرانوں کے ہاتھوں سے سیاسی باگ ڈور چھوٹی جارہی تھی اور ملک کی کشتی موجوں کے رحم و کرم پر تھی۔ ایک طرف تو یہ عہد برطانوی سامراجی طاقت کی مرکزیت کا دور تھا، جس کا مستقر لندن میں تھا، اور جسے ہندوستان میں نوکر شاہی کا آہنی ڈھانچہ اور ایک منظم فوج تعزیت پہنچا رہی تھی جو بظاہر ناقابلِ تغیر اور ناقابلِ تغیر معلوم ہوتا تھا اور دوسری طرف یہ دور تھا ہندوستان کے عام لوگوں کا جو غریب تھے، ناخواندہ تھے، غیر مسلم تھے اور بٹے ہوئے تھے جنہیں ”ایک ست گام مجمع“ کہنا چاہیے۔ ان دونوں کے درمیان تھا متوسط طبقہ جس کی تعداد کم تھی اور جو پورے ملک میں بکھرا ہوا تھا لیکن وہ زیادہ تر شہروں میں پایا جاتا تھا اور اس نے جدید تصورات کو جذب کر لیا تھا اور سیاسی اور معاشی سوالوں کے تعلق سے تنقیدی رجحان رکھتا تھا۔ لیکن عملاً یہ طبقہ وسطی قسم کے بہت زیادہ دیہاتی آبادی میں گھرا ہوا تھا اور قریب داری اور ذات پات کے وسطی رشتوں میں بندھا ہوا تھا۔ رسم و رواج، روزمرہ کی عادات اور جذباتی رد عمل کی حد تک یہ عام لوگوں سے علیحدہ نہیں تھا اس لیے کہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ روایت کے ان رشتوں کو توڑ دے جن میں وہ جکڑا ہوا تھا۔

مکمل طور سے سیکولر، جمہوری اور قومی نقطہ نظر رکھنے والے ایک گروہ کی شکل میں متوسط طبقہ کا ارتقا کسی حد تک غیر یکساں تھا۔ اس کے باوجود آزادی کی وہ خواہش، جو ہر انسانی دل میں پائی جاتی ہے، تمام ہندوستانی فرقوں میں ایک تحریک پیدا کر رہی تھی اور ان میں پائے جانے والے مذہب، شکوک اور خطرات کے باوجود سب چاہتے تھے کہ عام لوگوں کی حکومت حقیقت میں عام لوگوں کی حکومت ہو اور ان میں سے ہر فرقے کو حکومت میں اس کا حصہ ملے۔

اس قسم کی صورت حال کسی طرح بھی عجیب و غریب نہیں کہی جاسکتی۔ سیاسی آزادی ہر قسم کے سماجوں میں پائی جاتی رہی ہے اور پائی جاسکتی ہے چاہے وہ فیوڈل سماج ہو، نیم غلام اور نیم آزاد سماج ہو، توہمات آلودہ سماج ہو، اصنام پرستانہ سماج ہو، نیم خواندہ سماج ہو وغیرہ وغیرہ۔ آزادی کو اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ عام لوگ اخلاقی طور سے مکمل ہو جائیں، تمام سماجی خرابیاں دور کر دیں اور سب لوگ خواندہ ہو جائیں۔ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود ہندوستان کے متوسط طبقے نے برطانوی حکومت کو چٹوٹی دی، حالات نے اس کی مدد کی۔ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ یک جہتی پیدا کرنے سے برطانوی حکمرانوں نے انکار کر دیا، ان کی حکومت ہندوستانی سماج کے لیے فطری نہیں تھی۔ وہ تو داخلی یا بدلیسی عنصر تھا جو ہندوستان کی سیاست میں داخل ہو گیا تھا۔ چونکہ انگریزوں نے جذب ہونے سے انکار کر دیا تھا اس لیے وہ ہندوستان میں صرف اس وقت تک حکومت کر سکتے تھے جب تک وہ غیر متحد تھا۔ لیکن جو انہی ہندوستان اپنے قومی اتحاد سے واقف ہو

گیا اس کے لیے فوراً ان بدہشی عناصر کو نکال پھینکنے کی کوشش کرنا ضروری ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ کہ جن علاقوں کو طاقت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے ان کو صرف اس صورت میں رکھا جاسکتا ہے جب اس کا اخلاقی جواز پیش کیا جاسکے اس لیے کہ سنگتوں سے اور سب کچھ کیا جاسکتا ہے لیکن ان پر بیٹھا نہیں جاسکتا۔ اخلاقی جواز کی بنیاد ہوتی ہے محکموں کا اسے تسلیم کرنا، اس کی اجازت دینا اور اس کے متعلق نیک خیالات رکھنا، لوگوں کی مرضی کے خلاف کچھ کیجئے تو اس کا نتیجہ ہو گا ملامت، اگر آپ طاقت اور تھک سے کام نہ لے کر ان کی مرضی کے مطابق کام کریں گے تو وہ خود بخود آپ کے ساتھ آئیں گے۔ بدہشی حکومت میں اس کی تباہی کے اسباب مضر ہوتے ہیں۔

II۔ ابتدائی سیاسی انجمنیں

ہندوستان کی انفرادیت کے متعلق سیاسی شعور رام موہن رائے کے زمانے ہی میں نمودار ہو چکا تھا۔ ان کا کام دونوں لبرل اور قدامت پسند ہندوستانوں نے جاری رکھا جن میں شدت پسند دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فعال تھے، انہوں نے 1828ء میں اکاڈمک ایسوسی ایشن قائم کی تھی جس میں مذہبی اور اخلاقی سوالوں کے ساتھ سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی بحث و مباحثہ کیا جاتا تھا۔ 1838ء میں انہوں نے سوسائٹی فار اکیوزیشن آف جنرل پانچ (عام معلومات حاصل کرنے کی انجمن) قائم کی جس میں جیوری کے ذریعہ مقدموں کی سماعت، اخباروں کی آزادی اور سرکاری محکموں میں جبراً کام کرنے والے کی طرح کے سوالوں پر بحث کی جاتی تھی۔ اس کے بعد 1842ء میں دو ارکان کا تھئیٹور سیاسی تحریک کی تنظیم کے لیے خارج ہائیس کو انگلستان سے ہندوستان لائے۔ انگلستان میں غلامی کے خلاف تحریک چلانے میں ہائیس نے بڑا حصہ لیا تھا۔ کلکتہ آنے کے بعد وہ جیلے کرنے لگا اور اس کی کوششوں کے نتیجے میں بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی کا قیام 1843ء میں عمل میں آیا۔ اس کے اغراض اور مقاصد میں یہ شامل تھا کہ ملک کے لوگوں کے حالات، قوانین، اداروں اور وسائل کے متعلق معلومات حاصل اور لوگوں کو فراہم کی جائیں اور پرامن اور قانونی نوعیت کے ایسے دوسرے ذرائع سے، جو ضروری معلوم ہوں، ہندوستان کے لوگوں کے تمام طبقوں کی بھلائی کے کام کئے جائیں، ان کے حقوق کی توسیع کی جائے اور ان کے مفادات کو فروغ دیا جائے۔

1828ء میں کلکتہ کے زمینداروں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک انجمن بنائی تھی جس کا نام تھا ”لینڈ لارڈ سوسائٹی“، اس کا ابتدائی مقصد تھا قانونی ذرائع سے مال گزاری معاف اراضیوں کو حاصل کرنے کی حکومت کی کوشش کو ناکام بنانا۔

اس طرح بالائی طبقے کے زمیندار اور درمیانی طبقے کے شدت پسند دونوں سیاسی تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ 1851ء میں انہوں نے مل کر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی اس کے پہلے صدر تھے راجا کانت دیپ اور پہلے سکریٹری تھے ریندر ناتھ ٹیگور، وہ چاہتے تھے مقامی انتظام اور حکومت کے نظام میں مددگار کیا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ”اس کے گذشتہ اور آئندہ انتظام کے تعلق سے ہندوستان کے لوگوں کے احساسات سے برطانوی حامی لوگوں کو واقف کرایا جائے۔“ 1853ء کے پارٹر کی تجویز سے پہلے

پارلیمانی تفتیش کے دوران برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے ان کے بلاخطے کے لیے ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں ان کی تجویز شامل تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ہندوستانوں کو اس کا حق دیا جائے کہ وہ لیجسلیٹیو کونسلوں کے لیے اپنے نمائندے منتخب کر سکیں۔

اسی قسم کے حالات ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی نمودار ہو رہے تھے۔ مثال کے طور پر بمبئی میں ”عوک ہت دادی“ دیش کھ نے ہندوستان کے لیے ایسی پارلیمنٹ کی مانگ کی جس میں ہر شہر اور ضلع کی نمائندگی ہو۔ اگست 1852ء میں جگناتھ شکرشٹ، دادا بھائی نوروجی، نوروجی فریدوں جی، بھاؤ دادی اور دوسرے لوگوں نے ”بمبئی ایسوسی ایشن“ قائم کی، اس کے مقاصد تھے ”لوگوں کی خواہشات معلوم کرنا، عام بھلائی کے لیے حکومت کو اقدامات کی سفارش کرنا اور موجودہ خرابیوں کو دور کرنے اور عام مفاد کے اقدامات کرنے کے لیے ہندوستان اور انگلستان کی حکومتوں کو یادداشتیں پیش کرنا۔“

1852ء میں ایسوسی ایشن نے پارلیمنٹ کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں بد نظمی کے متعلق خصوصی الزامات درج تھے اور عملی اصلاحات کی سفارشیں کی گئی تھیں، ان میں شامل تھیں لیجسلیٹیو کونسلوں کی تنظیم نو، اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانوں کے تقرر اور یونیورسٹیوں کے قیام کی سفارشیں۔

مدراس میں بھی 1853ء کے چارٹر کی تجدید سے کچھ پہلے اس قسم کی ایک انجمن معرض وجود میں آگئی جس کا نام تھا ”مدراس نیو ایسوسی ایشن“۔ اس نے پارلیمنٹ کو ایک یادداشت پیش کی جس کے ذریعے ”اس پریذیڈنسی کے لوگوں کی شکایتوں اور ضرورتوں سے“ اُسے مطلع کیا گیا، شکایتوں میں سب سے زیادہ اہمیت محاصل کو دی گئی تھی۔ یادداشت پیش کرنے والوں نے ”زمینداری اور رعیت داری دونوں نظاموں میں جدتیں پیدا کرنے کے خلاف اپنی بیزاری کا اظہار کیا تھا خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر کہ وہ دونوں ناانسانی اور مظالم کے آلہ کار ہیں۔ لیکن انہوں نے سب سے زیادہ رعیت داری کی خدمت کی تھی جس نے کاشتکاروں کے طبقے کو بدترین غربت اور بد حالی کا شکار بنا دیا تھا۔ اس یادداشت میں ”کچنی کی عدالتوں کی ناکارگی، دیگر اور اخراجات کی شکایت کی گئی تھی۔ ان کی خاص خاص مانگیں تھیں سڑکوں، پلوں اور ذرائع آب رسانی کی تعمیر اور لوگوں کی تعلیم کا بہتر انتظام۔ انہوں نے سرکاری اخراجات میں کمی اور مقامی حکومت کی ایسی شکل کی مانگ کی تھی جو رعایا کی بھلائی اور ملک کی خوش حالی کا باعث بن سکے۔“ (1)

چنانچہ اس سے پہلے کہ حکومت ہندوستان تاج کو منتقل ہو تعلیم یافتہ طبقے نے رائے عامہ کو ہموار کرنا اور حکومت کی غلطیوں اور خامیوں کے خلاف شکایتیں کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے سیاسی تحریک کے مغربی طریقہ پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا اور انہیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شکایتوں کو رفع کرانے کے لیے انہیں ہندوستان اور انگلستان میں حکومتوں کو توجہ دانی ہوگی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں برطانوی حکمرانوں اور ہندوستانی متوسط طبقے کے درمیان جو جھگڑا شروع ہوا اُس کو دوسرے حلوں میں بانٹا جانا چاہیے۔ پہلا مرحلہ 1885ء تک چلا جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس مرحلے میں ہندوستان کی سیاسی تحریک غیر منظم تھی، کبھی کبھی اس میں انبال آتا تھا اور جو شے سے محروم تھی۔ اشتعال انگیزی کے بعد جب جذبات متفعل ہو جاتے تھے تو تحریک میں جان بڑھاتی تھی

(1) حکومت ہندوستان نے عاقبتوں کے متعلق سلیکٹ کمیٹی کے سامنے دی گئی شہادت کی روداد کو ضمیمہ 1، جیمز رپورٹ، ضمیمہ 1،

اور جب شکایت کی فوری وجہ دور ہو جاتی تھی تو اس پر جمود طاری ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں متوسط طبقہ کمزور تھا اور اس کی سیاسی سرگرمیوں میں قدرتی طور سے منصوبے اور اتحاد کی کمی تھی۔ لیکن 1885ء کے بعد اس نے طاقت اور خود اعتمادی حاصل کر لی۔ دوسرے مرحلے میں سیاسی تحریک کا مرکز کانگریس بن گئی، تحریک میں تیزی پیدا ہو گئی اور اس کا اصل مقصد بن گیا مذہب دار حکومت خود اختیاری کا حصول۔

III- قوم پرستی تحریک کی ابتدا

اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر وہ زمانہ تھا جب برطانوی سامراج کی بڑی توسیع ہوئی جس کے دور رس نتائج تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس توسیع کی بنا پر ایشیا اور افریقہ میں جو جاہلانہ فوجی کاروائیاں کی گئیں ان سے ہندوستان پر بوجھ بڑھ گیا اور اس کی معاشی اور سماجی ترقی میں رکاوٹ پڑ گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر اس کا خصوصی اثر پڑا کیونکہ زیادہ تر توسیع مسلم ریاستوں کی قیمت پر کی گئی تھی۔ بدیس کے ہم مذہبوں کی بد حالی نے ان میں ہمدردی کے مذہبی جذبات پیدا کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے فرقہ دارانہ جذبات نے ایک واضح شکل اختیار کر لی۔ اور ان کا رشتہ غیر ملکیوں سے جو گیا۔

خود ملک کے اندر حکمران طبقے کے رویے میں تبدیلی اور ان کے بڑھتے ہوئے سامراجی تکیے نے ہندوستانی متوسط طبقے کو اپنی کم حیثیت اور ہلکے آئینہ موقف کا اور زیادہ احساس دلایا۔ چنانچہ اس کی ناراضگی بڑھتی گئی۔ دانشوروں کا طبقہ سماجی نابرابری کو پسند نہیں کرتا تھا اور اُسے نمائندہ حکومت اور سرکاری ملازمتوں کے جن میں سول اور فوجی دونوں ملازمتیں شامل تھیں، مسئلوں سے زیادہ دلچسپی تھی، تاجر لوگ حکومت کی آزاد تجارت کی پالیسیوں سے ناالا تھے جو ہندوستان کے بجائے انگلستان کے مفاد میں تھیں۔ ان کے کاروبار میں انتظامی دشواریاں حائل تھیں۔

جہاں تک عام لوگوں کا تعلق تھا ان کی معاشی حالت بہت خراب تھی اور معیار زندگی انتہائی ناقابل اطمینان بار بار پڑنے والے خطوں نے معاشی دکھوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ لوگوں کے عام دکھوں میں اور اضافہ اس وقت ہو گیا جب طاعون کی دہالک میں پھیل گئی جس کے بہت سے لوگ شکار ہو گئے اور جس نے 1892ء کے بعد ملک میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔

حالات کچھ بہت اچھے نہیں تھے جب مذہبی مصلحین منظر عام پر نمودار ہوئے۔ ان کا مقصد تھا مذہب کی روح کی بازیافت اور لوگوں کو بتانا کہ دوسرے لوگوں کی طرف ان کے فرائض کیا ہیں۔ مذہبی اصلاح کی تحریک نے ادبی نشاۃ ثانیہ کے ایک نئے مرحلے کو جنم دیا اور قوم پرستی کے جذبات اور غریب بد حال لوگوں کے لیے ہمدردی میں اضافہ کر دیا۔ شاعروں، ناول نگاروں، مضمون نگاروں، صحافیوں، مؤرخوں غرض کہ سبھی لکھنے والوں نے قومی شعور کو ابھارنے میں اپنا رول ادا کیا۔

مصنفوں اور خطیبوں نے عام لوگوں میں مغرب کی آزادی کی تحریکات کے متعلق معلومات پھیلائی یعنی آئرلینڈ کی ہوم رول کی تحریک اور اٹلی کی اتحاد اور آزادی کی تحریک کے متعلق 1858ء میں سوم پرکاش نے میزنی، نگاری بالڈی، کسور اور اسکاٹ لینڈ کے سیر ولیم والس کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ شروع

کیا۔ سریندر ناتھ بھرجی نے 1875ء میں اٹلی کی بیداری اور سکسوں کی تاریخ پر کئی تقریریں کیں جن میں سکھ رہنماؤں کی بیداری کی دانتائیں دہرائیں۔ دوسرے لوگوں نے محمودے، تالستانی اور کاتے کے تصورات بیان کیے۔ بینکم چندر چٹری نے (1834ء-1894ء) نے اثر آفریں کہانیاں لکھیں جنہوں نے قومی جذبے کو بڑھایا۔

اس طرح جو جذبہ بیدار ہو گیا تھا اس نے عملی کاموں کو بڑھا دیا۔ نیشنل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں پیش پیش تھے راج نرائن بوس اور بابا گوپال متر۔ انہوں نے ایک اسکول، ایک پھاپا خانہ، ایک اخبار اور ایک جن جمیویم کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے ”ہندو میلے“ کی ابتدا کی جو ہر سال کیا جانے لگا۔ اس میں ہندوؤں کی گزشتہ اور موجودہ برتری اور بنگالی زبان و ادب کے متعلق تقریریں کی جاتی تھیں۔ گیت گائے جاتے تھے جن میں بار بار دہرایا جاتا تھا ”ہندوستانوں کی پوری نسل کو متحد ہونا چاہیے۔“ مغرب سے واپسی کے بعد دیویکانند نے ہندوستان کے دورے کے دوران اپنی تقریروں میں آزادی کا پیام دیا اور ہندوستان کے نوجوانوں سے کہا کہ انھیں اہمیت سے کام لیں اور عام لوگوں کی خدمت کریں۔

مسلم علماء جو عام مسلمانوں کی رہنمائی کرتے تھے، برطانوی حکومت کے خلاف تھے، دیوبند کے اسکول نے، جس کے اثر اور شہرت کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا تھا، ایسی تمام تحریکوں کی حمایت کی جن کا مقصد تھا برطانوی غلبے کو کمزور کرنا اور ہندوستان کی آزادی کی خواہش کو تقویت پہنچانا۔

1851ء میں فرنش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی جا چکی تھی لیکن اس ایسوسی ایشن کو جمہوری بنانے کی نئی کوششیں کی گئی خاص طور سے کمد گھوش نے کی (امرت بازار پتریکا کے بانی) لیکن اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اُس کے بعد سریندر ناتھ بھرجی اور ان کے دوستوں آئندہ موہن بوس (پہلے ہندوستانی جنہوں نے کیمبرج میں ریاضی میں درجہ اول پایا اور پیر مٹر تھے)، سبھنا تھ شاستری (برہمور ہنما) اور کرشن موہن بھرجی نے 1876ء میں انڈین ایسوسی ایشن کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی شاخیں بنگال کے اضلاع میں قائم ہو گئیں اور بنگال کے باہر کی سوسائٹی سے انہوں نے رشتے قائم کر لیے۔

اس ایسوسی ایشن کی تجویز پر سریندر ناتھ بھرجی نے 78-1877ء میں ہندوستان کا دورہ کیا اور اس کے دوران 1878ء کے ورٹاکٹر پریس ایکٹ اور لائسنس ایکٹ کی خدمت کرنے اور کسانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی گئی۔ 1880ء کے عام انتخابات سے کچھ پہلے اہل موہن گھوش کو انگلستان بھیجا گیا تاکہ برطانوی رائے دہندگان کو وہ ہندوستان کے مسائل سے واقف کرا سکے، اس ایسوسی ایشن کے آرگن بنگالی نے زور دار الفاظ میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ”صوبوں کے بے حسی سے چھپا کٹا لیجے اور اس غلوں و جوش کا مظاہرہ کیجئے جو قوم کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں“ اس نے پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا ”بڑے بڑے صوبائی شہروں میں عام جلسے کئے جائیں گے جن میں ہندوستان کے مسائل پر مباحثہ ہو گا اور ہندوستان کی ضرورتوں اور شکایتوں سے انہیں واقف کر لیا جائیگا۔ پورے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایسے کتابچوں کو گشت کر لیا جائے جن میں ہندوستانی موضوعات پر بحث کی جائے گی۔۔۔۔۔ اور آخر میں ہندوستان کے لوگوں کے مسلم دوستوں کو ایک ایسی جامع اور مشترکہ تنظیم کے تحت مجتمع کیا جائے گا جو ملک کے عوامی بلوروں سے ہمہ روی رکھتی ہو اور ان کے ساتھ خط و کتابت کرتی ہو۔ چنانچہ اس ملک اور انگلستان میں پائے جانے والے ہندوستان کے دوستوں کو ایک مشترکہ اور ہٹا چاہیے اور خیال یہ ہے کہ اس قسم کی مشترکہ تنظیم ناقابلِ حراست ہو گی۔“ (۱)

VI۔ سامراج کی حیات نو

سیاسی تحریک کی مزید پیش رفت کا سبب دو قوتوں کا عمل تھا یعنی 1870ء کے بعد سامراج کی حیات نو اور برطانیہ کی سامراجی پالیسیاں اور تعلیم یافتہ ہندوستانوں میں حکومت خود اختیاری کی بڑھتی ہوئی خواہش۔ کبھی کبھی انگریز اس کو سیاسی مصلحت سمجھتے تھے کہ بہت احتیاط کے ساتھ اور بادل ناخواست چھوٹی چھوٹی سیاسی مراعات دے کر لوگوں کی تسکین کر دی جائے جو حکومت کی سب سے نیچی سطح سے شروع ہوتی تھیں یعنی شہروں اور ضلعوں کی حکومت خود اختیاری سے لیکن انہیں نمائندہ اداروں اور حکومت خود اختیاری کی طرف انقلابی قدم اٹھانے کی مزاحمت دیتا جاتا تھا اور اس کے متعلق بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔ چنانچہ 19 صدی کے آخری پچیس سال کی تاریخ حاکموں اور محکموں کے درمیان تصادموں اور ایک طرف حقوق پر اصرار اور دوسری طرف ان سے انکار کی ایک بے رنگ کہانی ہے۔

پہلے مرحلے یعنی 1857ء سے 1874ء تک انگلستان کی پالیسیوں کا تعین وہ لوگ کرتے تھے جن کی قیادت پامرسٹن کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سمندروں پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہو، آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی پارٹیوں کے جمہوریت کی حیثیت سے بلاعظم کے معاملات میں رول ادا کرے، برطانیہ کے رقبہ روس کی تحدید کرے اور عثمانی سلطنت کو انگریزوں کے رقبوں کے ہاتھوں میں آنے سے بچائے رکھے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا اس پالیسی کے معنی تھے سرحدوں پر ”بلا اقتدار عدم حرکت“ اور وہاں امن قائم رکھنے اور سامراجی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ملک کو ترقی دینا۔

1874ء میں طاقت نوریوں کے ہاتھوں میں آگئی اور 1905ء تک ان کے ہاتھوں میں رہی۔ صرف دو دفعہ حکومت تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے لبرلوں کے ہاتھوں میں آئی یعنی 1880ء سے 1886ء تک اور 1892ء سے 1895ء تک۔ نئے نوری سامراج کے پس پشت ڈسراٹلی کا داغ کام کر رہا تھا اور سامراجی توسیع کے لیے عوامل اس نے مہیا کئے تھے، گورنر جنرلوں نے، جو اس کی پیش رفت کی پالیسی کے ایجنٹ تھے، ہندوستان کو مہموں اور جنگوں میں جکڑا کر دیا، اس کی بہت قلیل مالیات پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا، ترقی پسند سرگرمیوں کو قریب قریب ختم کر دیا، معاشی ترقی کو نظر انداز کر دیا اور حکمرانوں اور محکموں کے درمیان تلخی بڑھا دی۔

بغوات کے بعد کے برسوں میں زیادہ تر انتظامی نظام کی تشکیل نو کا کام کیا گیا تھا یعنی ضرورت سے زیادہ مرکزی اور فضول خرچ حکومت کی مالی دشواریوں کا مقابلہ کرنے اور لوگوں کی معاشی تکلیفوں کو کس قدر دور کرنے کا کام۔

1861ء میں مختفہ، عدلیہ اور دفاعی فوجوں کے متعلق قوانین بنائے گئے۔ 1853ء میں جو لیجسلیٹو کونسل قائم کی گئی تھی اس نے اس سے زیادہ اختیارات حاصل کر لیے تھے جو اس کو دئے گئے تھے۔ چنانچہ نئی کونسلوں (1861ء) کے پرکاش دیئے گئے اور انہیں یہ محسوس کر دیا گیا کہ وہ محض مشاورتی ادارے ہیں۔ 1861ء کے انڈین ہائی کورٹ ایکٹ نے تان کو سارا اختیار دے دیا کہ وہ ہائی کورٹ قائم کر دے اور قدیم اور بے ڈھنگی سپریم کورٹ اور صدر، یوآئی اور فوجداری عدالتوں کو ختم کر دے۔ ہائی کورٹوں کو

ان عدالتوں کی نگرانی کے، جن کی اپیلیں سننے کا وہ مجاز تھا، اور ماتحت عدالتوں کے کام اور مقدموں کی سماعت کو منضبط کرنے کے لیے ضابطے بنانے کے اختیارات دیدئے گئے۔ 1861ء کے ایک اور ایکٹ کی بنا پر فوج کی ساخت میں بڑی تبدیلی ہو گئی یعنی ہندوستانی حصے کے مقابلے میں ہندوستانی فوج کے یورپین حصے کی تعداد اور طاقت میں اضافہ کر دیا گیا۔

معاشی مسئلے کے خاص خاص پہلو تھے عام لوگوں کی انتہائی غربت و افلاس اور ملک پر بڑھتا ہوا حاصل کا بوجھ لوگوں کے دکھوں کا اندازہ فرد کی آمدنی سے لگایا جاسکتا ہے۔ حکام نے جو حساب لگایا تھا اس کی رو سے ہندوستان میں فی کس اوسط آمدنی 30 روپیہ سالانہ تھی۔⁽¹⁾ لیکن اس وقت قیمتیں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔ اعداد و سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات پورے ملک میں پائے جاتے تھے۔ بنگال میں چاول، جو 1860 میں روپیہ 50 کا سیر ملتا تھا، 1870ء میں روپیہ 20.8 کا سیر، 1890ء روپیہ کا 18.3 اور 1905ء روپے کا 13.2 سیر تھا۔ پچاس سال میں قیمتیں تقریباً چار گنا ہو گئی تھیں جبکہ آمدنی میں فی کس 25 فی صدی کا بھی مشکل سے اضافہ ہوا تھا۔⁽²⁾

1857ء کی بغاوت میں جو اخراجات کئے گئے تھے ان کی وجہ سے ہندوستان کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ قتلوں اور حکومت کی فضول خرچی خصوصاً فوجی اخراجات کی زیادتی نے اور 1878-80ء کی افغان جنگ، 40-1839ء کی چین کی جنگ، 1836ء کی ایرانی مہم اور 1875ء کی پیراک کی مہم کی طرح کی برطانوی فوجی کارروائیوں کے اخراجات کے ہندوستان پر غیر منصفانہ بوجھ کی بنا پر حالات خراب تر ہو گئے۔ سال بہ سال حکومت کو خساروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ فصلیں خراب ہونے کی وجہ سے مالگرازی میں کمی ہو گئی جس کا اثر فی الجملہ سرکاری آمدنی پر پڑا۔ دیہاتوں میں لوگ دکھوں میں مبتلا ہو گئے تھے جنہیں راحت پہنچانے کیلئے حکومت کو روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا اس لیے کہ 1860ء کے بعد ملک کے کسی نہ کسی حصے میں قحط پڑتا ہی رہتا تھا، سرکاری قرض بڑھتا جا رہا تھا۔ 1870ء میں بڑھ کے وہ 102 ملین پاؤنڈ ہو چکا تھا۔

بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کیلئے حاصل میں اضافہ کیا گیا۔ انکم ٹیکس ایک فی صدی سے بڑھا کر ڈھائی فی صدی اور پھر 3 فی صدی کر دیا گیا، مد اس میں نمک پر محصول دگن کر دیا گیا، بھٹی میں تقریباً تکتا (3.81 فی صدی) اور دوسرے صوبوں میں اس میں 50 فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا۔

قرضوں میں سے یا پیداوار سرکاری کاموں پر خرچ کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی اور صوبوں کو اس کا اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنے کچھ اخراجات مقامی حاصل لگا کر پورے کریں۔ 1856-57ء اور 1870-71ء کی درمیانی مدت میں حاصل میں 50 فی صدی سے زیادہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔⁽³⁾

حکومت کی معاشی پریشانی کا ایک اور سبب تھا چاندی کی قیمت میں گراوٹ جس کی وجہ سے روپیہ کی شرح تبادلہ پر اثر پڑا اور ہندوستانی خزانے پر بوجھ بڑھ گیا۔ اس کے علاوہ بدیسی تجارت کے تعلق سے جن پالیسیوں پر عمل کیا جاتا تھا وہ ہندوستان کے مفادات کے لیے مضرت تھیں۔ ذرائع مواصلات اور آمد و رفت میں جو انقلاب آیا تھا اس نے ہندوستان کی بدیسی تجارت کو بڑھا دیا تھا۔ 1834-35ء اور 1838-39ء کی درمیانی پانچ سالہ مدت میں اس کی مالیت 1,894 لاکھ روپے تھی جو 1868-69ء میں ختم ہونے والی پانچ سالہ

(1) ڈیوس، کے، ہندوستان اور پاکستان کی آبادی (ہر نسلن، 1951ء)، صفحہ 206

(2) جی، جی، دی، تحریریں اور تقریریں، صفحہ 600

(3) اے، اے، رینش، انور، یہ ہے جہد میں ہندوستان کی معاشی تاریخ (نیا بند، ستالی ایڈیشن) صفحہ 270

مدت میں 10,697 لاکھ روپیہ ہو گئی اور 1877ء میں 11,400 لاکھ روپیہ ہو گئی تھی۔⁽¹⁾ یہ بات مشکوک ہے کہ تجارت میں اضافہ ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی میں تناسب اضافے کو ظاہر کرتا ہے یا نہیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی معیشت پوری طرح انگلستان کی معیشت کے تابع تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ملک جو ایک زمانے میں مصنوعات برآمد کرتا تھا اب دنیا کو خام مال مہیا کرنے لگا اور اسے جدید صنعت کو فروغ دینے سے روک دیا گیا، صرف ہندوستان میں سوتی کپڑے کے مل تھے جنہیں برطانوی صنعت کاروں کے حسد کے خلاف سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔

V۔ ہندوستانیوں میں بے چینی

(1) نیل کی شورشیں

تاج کی راست حکومت کی ابتدا اسی سے 1858ء میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان جھڑپ شروع ہو گئی۔ پہلے جھڑپ کی وجہ تھی نیل کے باغداروں کی زیادتیاں۔ اس جھڑپ کا سبب تھا ہندوستانی کسانوں کی طرف نیل کے باغداروں کا غلامانہ اور غیر انسانی رویہ۔ نیل ایک قیمتی رنگنے کی چیز تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت میں ایک اہم عنصر سمجھی جاتی تھی۔ 1780ء کے لگ بھگ کمپنی نے اس کی راست کاشت شروع کر دی تھی۔ اُس نے ویسٹ انڈیز سے باغداروں کو بلایا تھا اور کاشت کرنے میں ان کی بہت افزائی کرنے کیلئے انہیں بڑی بڑی رقبے پیشگی دی تھیں یہ باغدار سرکش قسم کے لوگ تھے۔ خود کاشت کرنے کے بجائے انہوں نے پیشگی رقبے دینے کے ایک نظام کے تحت مقامی کاشتکاروں سے کام کروانا شروع کیا۔ جو کسان پیشگی رقم لے لیتا تھا وہ قریب قریب زرعی غلام بن جاتا تھا باغدار غلاموں کا مالک تھا جو فصل حاصل کرنے کیلئے طاقت اور دھوکا دھڑی و دونوں سے کام لیتا تھا۔ اس صورت حال کے متعلق لارڈ میکالے کا خیال تھا کہ ”بڑی خرابی پائی جاتی ہے، یہ کہ اکثر اوقات بڑی ناانسانی کی جاتی ہے اور یہ کہ جزوی طور سے قوانین کے ذریعہ اور جزوی طور سے قانون کے خلاف عمل کر کے بہت سے کسانوں کو اس منزل تک پہنچا دیا گیا ہے جو زرعی غلامی سے زیادہ درمیں ہے۔“⁽²⁾

فریدپور کے مجسٹریٹ ڈبلیو۔ ای۔ وی لاٹور نے انڈیگو کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے نریل کی باغداری کے نظام کو ”قتل و غارت کے نظام“ سے تعبیر کیا تھا۔⁽³⁾ انڈیگو کمیشن اس نتیجے پر پہنچا ”جن شرائط پر اُس سے کام کر لیا جاتا ہے“ اُن شرائط پر نیل کی قیمتی کسان کے لیے منافع بخش نہیں ہے۔ اُس نے محسوس کیا ہے کہ اُسے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے سے روکا جاتا ہے اور اس کھیتی کو جاری رکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے اُسے مناسب یافت نہیں ہوتی ہے۔“⁽⁴⁾

میکالے نے بے ایمان باغداروں کو سزا دینے کا مطالبہ کیا لیکن چونکہ حکومت میں ان کے حلیف

(1) سندھ راجن، ہندوستان کی سماجی تاریخ، صفحہ 252۔ دتہ۔ آر۔ سی کولہ بلا صفحہ 249

(2) مٹر، اللٹ چندر، بنگال میں نیل کی شورشوں کی تاریخ، 1906ء، صفحہ 3۔ (3) ایضاً، صفحہ 4

(4) مٹر، اللٹ چندر، بنگال میں نیل کی شورشوں کی تاریخ، 1906ء، صفحہ 6

شامل تھے اس لیے انہیں کوئی پھونہ سکا، آخر وہ دن بھی آگیا جب تکلیفوں اور مظالم کو برداشت کرنے کی قوت نے جواب دیا اور 1859ء میں کسانوں نے مزاحمت شروع کر دی۔ انہوں نے نیل پیدا کرنے کے لیے پیشگی رقمیں لینے سے انکار کر دیا اور باغداروں کے مکانوں اور سرکاری دفاتروں پر ہتھ بول دیا، دیہات میں سواریوں پر بیٹھ کر گھومنے والے یورپیوں پر حملے کئے گئے، ان کی رسید روک دی گئی، نیل کی بڑھتی ہوئی فصلیں چاہ کر دی گئیں اور کارخانوں کو لوٹ کر ان میں آگ لگا دی گئی۔ بھالوں، تلواروں اور لاٹھیوں سے مسلح کسان بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ شمالی بنگال میں وہابی رفیق منڈل نے ان کا ساتھ دیا اور بسواس برادران نے مرکز بنی بنگال میں ان کی قیادت سنبھال لی۔

درمیانی طبقے کے دانشوروں نے اخباروں اور اپنی تقریروں میں ان کی حمایت کی۔ ہندو پٹریاٹ کے ہریش چندر مکرجی نے ان کے دکھ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے اور ان کی تکلیفوں کی دل دہلا دینے والی کہانیاں سنائیں۔ جیسور اور دایا سے آنے والے خطوط شائع کئے گئے جن میں باغداروں کے مظالم کا ذکر تھا، ان کے اور ان کے غلط طریقوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے گیت لکھے گئے۔ دین بندھو مترانے ایک ڈراما نیل درپن کے نام سے لکھا جو بڑا مشہور ہو گیا۔ ریورنڈ ٹالک کی نگرانی میں مانگل مدھ سودن دت نے اسکا ترجمہ انگریزی میں کیا جس کے خلاف باغداروں نے مقدمہ دائر کیا۔ اسے ایک مہینہ کی سزا دی گئی۔ اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ اس مقدمے نے لوگوں میں بڑا جوش پیدا کر دیا اور انہیں بہت مشتعل کر دیا۔ کیتک نے اس کا اعتراف کیا تھا۔ ”دہلی کے دنوں کے بعد سب سے زیادہ تشویش اسے اس سے ہوتی۔“ دریا میں سفر کے دوران اس نے دیکھا ”دن بھر کے سفر میں دریا کے دونوں کناروں پر ہزاروں لوگ قطار بنائے کھڑے تھے اور سب بڑے احترام اور ضبط و نظم کے ساتھ صاحب سے انصاف کی درخواست کر رہے تھے۔“ اس نے سوچا ”جو لوگ اتنی دانش مندی کے ساتھ یہ کر سکتے ہیں ان سے بیٹے میں احتیاط برتی جانی چاہیے۔“ (1)

شورش کو فرو کرنے کے لیے حکومت نے فوری اقدامات کئے۔ نیل پیدا کرنے والے اضلاع کا سپرینڈنٹ اور تجربہ کار افسروں کے سپرد کیا گیا اور وہاں کی صورت حال کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ کاشت میں منافع نہ ہونے اور پیشگی رقم کے غلامانہ نظام کے متعلق کسانوں کی شکایتیں صحیح ہیں۔ انہوں نے سفارش کی کہ باغداروں کا زور و ظلم ختم ہو جانا چاہیے۔ حکومت نے اس کی سفارش قبول کر لی اور دھمکیاں دینے کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ ”کسانوں نے اپنی آزادی کا نقش ہر ذہن میں بٹھا دیا۔“

نیل کی شورش ہندوستان کے ایک حصے میں پائی جانے والی ایک مخصوص شکایت کے خلاف رد عمل تھا۔ لیکن یہ شورشیں اس دیہی خرابیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو پورے ملک میں پائی جاتی تھیں اور جو خود بھی اس عام معاشی دکھوں کا حصہ تھیں جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔

(2) سول ملازمتوں کا مسئلہ

نیل کے فسادات نے جو حالات پیدا کر دیئے تھے ان کے معمول پر آنے کے بعد سول سروس کے امتحان میں شامل ہونے کے لیے عمر کم کرنے کی بنا پر تعلیم یافتہ ہندوستانی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

کارنوال کے زمانے سے بار بار وعدے کرنے کے باوجود اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے ہندوستانیوں پر بند رہے۔ چنانچہ 1853ء میں جب سرپرستی کے بجائے تقرر مقابلے کے امتحان کے بعد کیا جانے لگا تو ایک چھوٹا سا راستہ کھل گیا جس کے ذریعہ ہندوستانی داخل ہو سکتے تھے۔ یہ راستہ کتنا پیچیدہ تھا اس کے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے وسط کے ایک نوجوان ہندوستانی کی دشواریوں کو پیش نظر رکھا جائے اسے انگلستان کا طویل سفر کرنا پڑتا تھا تاکہ وہاں جا کر ان نوجوان انگریزوں سے مقابلہ کرے جنہوں نے برطانوی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندوستانی کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انگریزی اس کی مادری زبان نہیں تھی، ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم کے ادارے برطانوی تعلیمی اداروں کے مقابلے میں کمتر تھے اور برطانوی ماحول، طور طریقے اور آب و ہوا بہت مختلف اور صبر آزمائے۔ اس کے باوجود آئندہ کچھ برسوں میں ہندوستانیوں نے ہر قسم کے خطروں کا مقابلہ کیا، رکاوٹوں پر قابو پایا اور امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ 1853ء میں امتحان میں بیٹھنے کی عمر 23 سال رکھی گئی تھی لیکن 1859ء میں اسے کھانکر 22 سال، 1862ء میں 21 سال اور آخر میں 1876ء میں 19 سال کر دیا گیا۔ عمر کم کرنے کی وجہ سے نو عمر ہندوستانی امیدواروں کے راستوں میں زیادہ رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔

لیکن ہندوستانی رائے عامہ کو مطمئن کرنے اور ملک و کٹورہ کے اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے، جو 1858ء کے اعلان میں شامل تھا، 1870ء میں ایک ایکٹ منظور کیا گیا جس کی رو سے گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ کسی ہندوستانی امیدوار کو مقابلے کے امتحان سے مستثنیٰ کر کے سول سروس کے لیے نامزد کر سکتا تھا۔ لیکن 1879ء تک اس ایکٹ کے عمل درآمد کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا۔ جب اراڈلین نے یہ تجویز پیش کی کہ سول سروس کے دروازے ہندوستانیوں پر بالکل بند کر دئے جائیں۔ گورنر جنرل کا خیال تھا کہ یہ بات زیادہ صاف اور ایماندارانہ ہو گی کہ ہندوستانیوں پر سول سروس کے دروازے بند کر دیئے جائیں اور ان کے لیے ایک اور محدود ہندوستانی سروس شروع کی جائے اس کی تجویز سنجیدگی کے ساتھ کئے گئے تمام اعلانوں کے منافی تھی اس لیے اسے سرکاری طور سے رد کر دیا گیا لیکن اس کے اصل مقصد کو منظور کر لیا گیا اس لیے کہ ایک قانونی سول سروس شروع کی گئی جس میں ہر سال "اچھے خاندانوں اور اچھی حیثیتوں کے" کچھ ہندوستانیوں کا تقرر کیا جاتا تھا بشرطیکہ ان کی تعداد ان ملازمین کی تعداد کے چھٹے حصے سے زیادہ نہ ہو جنہیں اس سال سکریٹری آف انسٹیٹ مقرر کیا تھا۔

اس نئی ملازمت کو ہندوستانی متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس ملازمت سے دور رکھنے کا ایک طرح سمجھتے تھے اور اس لیے اس کی بڑی مخالفت کی گئی۔ نئی ملازمت کے متعلق بنگالی نے لکھا تھا "ہم نے اس اسکیم کو ایک بڑا فریب سمجھا تھا..... اور ہمیں جلد معلوم ہو گیا کہ تعلیم یافتہ ہندوستان ہمارا ہم خیال ہے، ہندوستان کے لوگ چاہتے تھے کہ مقابلہ کا امتحان اس ملک میں لیا جائے، لیکن نئے قاعدوں نے مقابلہ کے امتحان کو نظر انداز کر دیا اور اس کی جگہ نامزدگی کا طریقہ شروع کیا جس کی بنا پر ہم یقین سے بہہ سکتے ہیں کہ بددیانتی اور رشوت خوری کی انتہا نہیں رہے گی۔" (1)

سول سروس کے امتحان کیلئے عمر کھانکر 19 سال کرنے کی بڑی مذمت کی گئی۔ اس نے پورے ملک کے دانش ور کو اس کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ ایک بھنڈے کے نیچے آکر ستر کو بڑھانے کا مطالبہ

نہیں۔ سریندر ناتھ بزمی (1878ء-1925ء) نے، جنہوں نے سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن نہایت ہی معمولی وجوہ کی بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیے گئے تھے، اپنی عوامی زندگی شروع کر دی تھی اور انڈین ایسوسی ایشن کے روح رواں بن گئے تھے۔ انہوں نے اس رجحان کو پسند اقدام پر حکومت کو چنوتی دینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے انڈین ایسوسی ایشن کو ایک کل ہند تحریک کا مرکز بنادیا اور ”ایک متحد ہندوستان کے تصور کو عملی شکل دی جو مہینی کی قائم کردہ مثال سے اخذ کیا گیا تھا جس نے بنگال کے رہنماؤں کے ذہنوں میں جگہ پالی تھی“۔ (1)

اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا تاکہ رائے عامہ کو بھوار کیا جائے مشترکہ سیاسی مفاد کی بنیاد پر تمام صوبوں کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستانہ تعلقات قائم کرائے جائیں۔ اس سفر کے دوران وہ اتر پردیش گئے (بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، علی گڑھ، میرٹھ اور دہلی)، پنجاب گئے (امرتسر اور لاہور)، بمبئی پریسڈنسی گئے (سندھ، احمد آباد اور پونا) اور مدراں گئے۔ پہلی دفعہ ”اپنی مختلف نسلوں اور مذہبوں کے ساتھ ہندوستان کو ایک مشترکہ اور متحدہ کوشش کیلئے ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا گیا“۔ (2)

اس تحریک کے نتیجے میں حکومت نے 1886ء میں چارلس ایجنس کی صدارت میں ایک پبلک سروس کمیشن مقرر کیا۔ اس کی سفارشات کی بنا پر قانونی سول سروس ختم کر دی گئی اور سول سروس کے امتحان کے لیے عمر بڑھا کر 23 سال کر دی گئی۔ سرکاری ملازمتوں کو تین درجوں میں تقسیم کر دیا گیا یعنی امپریل، صوبائی اور ماتحت۔ امپریل سروس کیلئے انگلستان میں مقابلے کے امتحان کی بنیاد پر، جو وہاں ہوا تھا، بھرتی کی جاتی رہی، بقیہ دو قسم کی ملازمتیں کم حیثیت کی تھیں اور معمولی ہندوستانیوں کا ان پر تقرر صوبائی حکومتیں کرتی رہیں۔ امپریل سروس میں کچھ عہدے، جو درج فہرست عہدے کہلاتے تھے، صوبائی سروس کے حکام کو مل جاتے تھے جن کو ان پر ترقی دی جاتی تھی۔ اس طرح ہندوستان کے لوگوں کو بڑی مدت تک کلیدی عہدوں پر اپنا جائز مقام حاصل کرنے سے قریب قریب محروم رکھا گیا۔

(3) ورناکلر پریس ایکٹ

کونسل میں اصلاح اور ہندوستانیوں کو ملازمتوں میں لینے کے مسائل کو طویل المدتی تھے لیکن کچھ ایسے سوال سامنے آ گئے جن کو وجہ سے بڑے بڑے اختلافات پیدا ہو گئے خصوصیت کے ساتھ یہ اس وقت ہوا جب تارکھ بروک رٹائر ہو گیا اور اس کی جگہ لٹن نے عہدہ سنبھال لیا۔ ورناکلر اخباروں کو برطانوی حکمرانوں نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ ان کے دلوں میں ہمیشہ ان کے متعلق شکوک و شبہات رہے لیکن حکومت کی ناراضگی کے باوجود 1885ء کے بعد ان اخباروں نے خاصی ترقی کی تھی۔ حکومت کی نظروں میں ان کا لہجہ زیادہ تنقیدی بلکہ ”باغیانہ“ ہوتا جا رہا تھا۔ ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والے اخباروں کو وہ ہندوستانی پڑھتے تھے جو انگریزی سے واقف نہیں تھے اور چونکہ وہ لوگ انگریزی کے اخبار نہیں پڑھتے تھے جو حکومت

(1) بزمی، سریندر ناتھ، ”ایک زیر تعمیر قوم“ صفحہ 41

(2) بزمی، سریندر ناتھ، ”ایک زیر تعمیر قوم“ صفحہ 51

کی نقطہ نظر پیش کرتے تھے اس لیے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے خیالات کا آزادانہ اظہار، جس میں حکومت پر تنقید کی جاتی تھی، حکومت کے استحکام کے لیے ایک خطرہ ہے، چنانچہ لٹن نے جلد ہی خفیہ طور سے سکرٹری آف انٹیلیجنس سے اس امر کی اجازت حاصل کر لی کہ ”مقامی اخبارات کے بڑھتے ہوئے تشدد کو جواب راست بنات کی اشتعال دینے لگے ہیں۔“ ختم کرنے کے لیے ایک قانون بنایا جائے اور لندن سے اجازت آنے کی دو گھنٹے کے اندر 1878ء کا ایکٹ منظور کر لیا گیا۔ ہندوستانیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا جلدی کر کے اس کے ندمت کی اور برطانوی پارلیمنٹ سے اس کو واپس لینے کی اپیل کی، یہ تحریک اس وقت تک جاری رہی جب تک 1882ء میں رہن نے اس قانون کو منسوخ نہیں کر دیا۔

(4) لٹن کی دوسری کاروائیاں

انڈین سول سروس کے امتحان کے لیے عمر کم کرنے اور اخبارات کی آزادی پر پابندیاں لگانے کے علاوہ لارڈ لٹن نے اور بھی قابل نفرت کاروائیاں کیں۔ 1878ء کے اصلاح کے ایکٹ نے، جس میں امتیاز برتا کیا تھا اور محض ہندوستانیوں پر جس کا اطلاق کیا گیا تھا، بجا طور سے ہندوستانیوں کو ناراض کر دیا۔ اس طرح برطانوی مال اور خاص طور سے سوتی کپڑے پر حاصل درآمد ختم کرنے سے ہندوستانی ناراض ہو گئے تھے۔

ایسے وقت میں جب ملک ایک شدید نقطہ کے ہولناک تجربات سے گزر رہا تھا جس وقت شمالی مغربی سرحد پر جنک کے بادل منڈلا رہے تھے جس کے لیے بوے روپے کی ضرورت تھی ملک وکنور یہ کی حکومت کی جوبلی منانا اور اس کا ملک کا لقب اختیار کرنا ظاہر کرتا تھا کہ حکومت کو لوگوں کے جذبات کا کوئی خیال نہیں ہے۔

جہاں تک خارجہ امور کا تعلق تھا لٹن کے ہندوستان میں آنے کے بعد وہ پالیسیاں بدل گئیں جن پر پچھلے پچیس سال سے عمل ہو رہا تھا۔ بلکن، لارنس، میو اور تارتھ بروک ہم جوئی کاروائی اختیار کرنے سے بچتے رہتے تھے اور ”باقاعدہ بے عمل“ کی پالیسی پر عمل کرتے رہتے تھے، لیکن نے گورنر جنرل نے ”پیش رفت کی پالیسی“ پر عمل کیا جسے اس کے مالکوں نے شروع کیا تھا، افغانستان کے خلاف جنگ کے لیے اشتعال انگیزی کی اور سرحدی قبائل کے خلاف انتہائی جھگڑوں میں حکومت کو جتا کر دیا۔

مختصر کہا جاسکتا ہے کہ لارڈ لٹن کے چار سالہ دور حکومت کو (1876-80ء) ”ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سب سے ناکام اور رسوائی زمانہ مدتوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ جوبات عجیب و غریب اور بے نظیر تھی وہ تھی شک، پچکاپٹ اور خطرے کا احساس جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی روح پر مسلط ہو گیا ہے اور اس کے عمل کا سبب بنا ہوا ہے۔“ (1) 1880ء میں جب لارڈ نے آئینی دیا تو بنگالی نے لکھا تھا ”اس ملک میں عوامی زندگی کے فروغ کا سبب اس کے ظالمانہ اقدامات کے سر جاتا ہے اور اس خدمت کے لیے ہمیشہ جذبہ انسان مندی کے ساتھ ہماری لارڈ شپ کو یاد رکھے گا۔“ (2)

1880ء میں جب انگلستان میں طاقت لبرلوں کے ہاتھ میں آئی تو، اس کے اے کی حیثیت سے رہن کو ہندوستان بھیجا گیا، توقع کی جاتی تھی کہ وہ اس نقصان کا ازالہ کر سکے گا جو اس نے پیش رو کی آمرانہ

(1) بنگالی، 13 ستمبر 1879ء

(2) بنگالی، 12 ستمبر 1880ء

حکومت کی بنا پر ملک کو ہوا تھا۔ وہ نیک نیت انسان تھا۔ اُس نے قابلِ نفرت ورتاکر پرپس ایکٹ کو منسوخ کر کے رائے عامہ کو مطمئن کیا۔ افغان جنگ ختم کی گئی اور کسی حد تک حکومت خود اختیاری کو چلن، اصلاح کی تحصیلات اور میونسپل شہروں میں دیا گیا۔ یورپین مجرموں کے مقدموں کی سماعت کرنے کا اختیار ہندوستانی مجسٹریٹوں کو دیکر اسے قانون نوعداری میں اصلاح کرنی چاہی لیکن اس کی بڑی سخت مخالفت یورپیوں نے کی اور ان کی رائے کے احترام میں بدقسمتی سے یہ تجویز بدلتی پڑی۔

(5) مقامی حکومت خود اختیاری

لنن کے رجعت پر ستانہ اقدامات کے باوجود ہندوستانی دانش ور انگریزوں کے نیک ارادوں اور مساوی برتاؤ اور حکومت خود اختیاری کے ان کے وعدوں پر یقین کرتے رہے۔ رہن نے جب ورتاکر پرپس ایکٹ کو منسوخ کیا اور اس سے بھی زیادہ جب اس نے حکومت خود اختیاری کی اسکیم پر عمل کرنا شروع کیا تو یہ احساس اور پختہ ہو گیا۔

پریسڈنسی شہروں میں میونسپل حکومتیں ابتدا ہی سے چل رہی تھیں۔ 1842ء میں انہیں دوسرے شہروں میں بھی رائج کر دیا گیا۔ اس کے بعد 1850ء میں صوبائی حکومتوں کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ شہروں میں باواسطہ محاصل لگانے کی اجازت دیدیں۔ 1870ء کے منطقی اختیارات کے ضابطوں کے تحت تعلیم، صحت عامہ، طبی امداد اور رفاہ عام کے کاموں کا انتظام مقامی اداروں کی ذمہ داری بن گیا اور انہیں مقامی محصول اور چٹکی وصول کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

1857ء کی بغاوت نے جو ملی دشواریاں پیدا کر دی تھیں ان کی بنا پر حکومت اخراجات کم کرنے پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو گئی۔ مالیات کے ممبر جس میں ولنن نے تجویز پیش کی کہ سڑکوں اور رفاہ عام کے کاموں کی ذمہ داری مقامی اداروں کے سپرد کر دی جائے۔

1854ء میں لارنس نے ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے شہروں کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ شہر کی پولیس، ترقی، تعلیم اور دوسرے مقامی امور کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مقامی آمدنی بڑھائیں، اس قرارداد میں بڑی شان کے ساتھ کہا گیا تھا ”ہندوستان میں جو ہمیں حیثیت حاصل ہے اس کے فرائض اور پالیسی کا تقاضا ہے کہ ملک کا زیادہ سے زیادہ کام یہاں کے لوگوں کو کرنے دیا جائے۔“

چنانچہ 1870ء تک ہندوستان کے ہر اہم شہر میں میونسپلٹی قائم کی جا چکی تھی۔ حالانکہ ان اداروں کے اراکین کا انتخاب رائے دہندگان کر سکیں اس کے متعلق کئی ایکٹ بنائے گئے لیکن انتخاب کے اصول پر عمل نہیں کیا جاسکا۔ جہاں سرکاری اثر تھا 1880ء تک صرف کلکتہ اور بمبئی کے شہروں کی میونسپل کونسلوں میں کچھ عوامی عناصر تھے حالانکہ مقامی حکومت اور مقامی محاصل کا ذخیرہ موجود تھا پھر بھی دوسرے شہروں میں کنٹرول پوری طرح سرکاری حکام کے ہاتھوں میں تھا۔

اس مرحلے پر رہن نے مداخلت کی اور صوبائی حکومتوں سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے 1882ء میں مقامی حکومت خود اختیاری کے تعلق سے ایک قرارداد منظور کی۔ خود مختار ادارے جو محض شہروں تک محدود تھے انہیں وسعت دی گئی اور دیہاتی علاقوں میں ان کی توسیع کر دی گئی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ قائم کئے گئے جن کے حلقے اختیار میں اور تحصیلیں آگئیں اور انہیں کنٹرول کرنے کے اختیارات دے دیے گئے۔ اس

تہذیبی کو "سیاسی اور عوامی تعلیم کے ایک ذریعے" (1) کے طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور اس لیے شہری اور دیہاتی دونوں قسم کے بورڈوں میں سرکاری ممبروں کی تعداد کو کھٹا کر کل ایک تہائی کر دی گئی اور غیر سرکاری نشستوں کو بھرنے کے لیے انتخاب کے اصول پر عمل کیا گیا اس قرار دواؤں میں جو پالیسی پائی جاتی تھی اس پر عمل کرنے کے لیے 84-1882ء میں صوبوں نے لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ منظور کئے یہ ظاہر تھا کہ قرار داد کا مقصد تھا عوامی جذبے کو ترقی اور اختیارات استعمال کرنے کی تربیت دینا۔ حکومت کو چلانے والی نوکر شاہی ایکٹ کے لبرل رجحان سے خائف ہو گئی اور عمل میں اس کو بدل دیا۔ ابتدا ہی سے بورڈ "دائرہ عمل کی تنگی، محدود اختیارات اور نامحتمل نمائندہ نوعیت" کے شکوکے اور بالآخر نوکر شاہی کے غیر لبرل رویے کی بنا پر یہ تجربہ وہ مقاصد حاصل نہ کر سکا جو رپن کے پیش نظر تھے۔

(6) البرٹ مل

رپن کے عہد حکومت میں البرٹ مل کی نزاع سیاسی دباؤ ڈالنے کے تعلق سے ایک سبق کے مترادف تھی اس کو کوئی بڑی اہمیت تھی اور اس کا تعلق عدالتی کارروائی سے تھا۔ 1857ء میں صورت حال یہ تھی کہ پریذیڈنسی شہروں میں ہندوستانی مجسٹریٹ اس کے اہل سمجھے جاتے تھے کہ جسٹس آف پیپلز کے فرائض ادا کر سکیں اور اس لیے یورپوں کے مقدموں کی سماعت ختم کر دی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ یورپوں کے ایسے مقدموں کی سماعت جن میں تین مہینے کی سزا یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ یا اس سے زیادہ سزا اور جرمانہ ہو سکتا تھا محض یورپین مجسٹریٹ ہی جج کر سکتے تھے۔ 82-1881ء میں ضابطہ فوجداری پر آخری بحث ہوئی اور مہاراجہ جیوہر موہن نیگور نے اس کا نوٹس دیا کہ وہ یورپوں کے مقدمات کی سماعت کرنے کے ہندوستانی مجسٹریٹ کے اختیارات پر بحث شروع کریں گے۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ ضابطہ منظور ہونے کے بعد اس سوال پر بحث کی جائے گی۔

لیکن مل منظور ہونے سے پہلے بنگال کی سول سروس کے بی۔ ایل۔ گپتانے حکومت کی توجہ اس غیر معمولی صورت حال کی طرف دلوائی جس کی رو سے یورپین برطانوی رعایا پر معبودہ سروس کے ہندوستان اراکین کو محدود اختیار حاصل تھا۔ بنگال کے لفٹننٹ گورنر ہعلی ایڈن نے سفارش کی کہ سول سروس کے ہندوستانی اراکین کو ان پابندیوں سے مستثنیٰ کر دیا جائے جو نئے ضابطہ فوجداری نے لگائی ہیں، زیادہ تر صوبائی حکومتوں نے اس سفارش سے اتفاق کیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ سے اجازت مانگی گئی جو اس نے دیدی، اس کے بعد غیر قانون سرکوانٹی البرٹ نے ان امور کے تعلق سے ایک مل تیار کر کے پیش کیا۔ البرٹ مل ایک غیر اہم اقدام تھا جس کا مقصد تھا قانونی تباہی کو دور کرنا جس کی بنا پر ہندوستانی مجسٹریٹوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا تھا۔

لیکن یورپوں نے نسلی برابری کے خیال کو توہین آمیز سمجھا اور اس بات کو ناقابل برداشت ذات سے تعبیر کیا کہ ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کسی سفید فام مجرم کے مقدمے کی سماعت کرے۔ شدید تحریک شروع کی گئی۔ جس میں متحدہ اور بغاوت کی دھمکی دی گئی۔

تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے، جنہیں حالات کی شدت نے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا، گورنر جنرل

کو پریشانی سے بچانے کے لیے بڑی اعتدال پسندی سے کام لیا۔ ان کے احساس کا اظہار کرتے ہوئے بنگالی نے لکھا تھا ”ایک بڑے اصول کے متعلق فیصلہ کرنا ہے، اس کا فیصلہ کرنا ہو گا کہ آیا کہ انگریز انصاف اور مساوات کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستان میں حکومت کریں گے یا طاقت کے بل بوتے پر“۔⁽¹⁾

ایک دفعہ پھر اس نے اس موضوع پر لکھا ”یہ سمجھنا طاقت اور انصاف سے بعید ہے کہ یہ بڑی سلطنت..... زیادہ حد تک اس پالیسی کی بنیاد پر باقی رہ سکتی ہے جس کی اساس طاقت ہو اور جس کو طاقت اختیارات عطا کئے ہوں، برطانوی اختیار کی بنیاد کو بدلہ جانا چاہیے..... نسلی برتری اور فتح کے حق کی باتیں اس قوم کے منہ سے اچھی نہیں معلوم ہوتی ہیں جس نے بار بار پارلیمنٹ کے متقدمہ ایکٹوں کے ذریعے پر اعلان کیا ہے کہ وہ فاتح کے حقوق سے دست بردار ہوتی ہے اور انصاف کے اصولوں کے مطابق اس ملک پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔“⁽²⁾

اس تحریک کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس بل میں ترمیم کر دی گئی اور یورپین مجرموں کو اس کا حق دیا گیا کہ چھوٹے سے معاملے میں بھی وہ جوری کے ذریعہ مقدمے کی سماعت کا مطالبہ کر سکیں جس کے کم سے کم آدھے ممبر یورپین یا امریکن ہوں۔ چنانچہ برترنسل کے خصوصی دعوں کو تسلیم کر لیا گیا حالانکہ اس نے انصاف کا خون کر دیا۔ ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کی تحریک سے ہندوستانوں نے کچھ سبق سیکھ لیے۔ اس نے ظاہر کر دیا کہ دیوبکر سامراج بخود ہوتا ہے۔

بل میں تبدیلیاں کی گئیں تھیں ان سے ہندوستانوں کو بہت مایوسی ہوئی۔ انہوں نے ان تبدیلیوں کو بجا طور سے سفید فام لوگوں کے آگے حکومت کے جھکنے سے تعبیر کیا اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ نسلی بنیادوں پر بنائی جانے والی جوریوں کی غیر حقیقی اور نمائش ہو گئی۔ ”پچھلے پچاس سال یا اس سے بھی زیادہ مدت میں یورپین جیوریوں نے زیادہ تر یورپین ملزموں کے حق میں جو شرمناک اور غلط فیصلے کئے ہیں وہ تاریخ کے جو بن گئے ہیں اور اس کے تاریک ترین ابواب میں شمار کئے جانے چاہیے۔ سر ایڈورڈ ایمان اور سر یانرل سپکا کی طرح کے اعلیٰ کردار رکھنے والے جوں نے اس کی شہادت دی ہے کہ یورپوں کے زیادہ تر جرائم میں انصاف نہیں کیا گیا اور ہندوستان کے لوگوں نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ کسی یورپین کو سزا میں دی جائیگی۔ لارڈ میکالے نے بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور کہا تھا کہ وہ آزادی جس کے معنی ہوں بہت سے لوگوں کے حقوق پر کچھ لوگوں کی فوقیت وہ آزادی نہیں بلکہ بدترین قسم کا ظلم ہے۔“⁽³⁾

VI۔ ہندوستانوں کی طرف سے جنوبی کا جواب

اس بات نے ہندوستانوں کی آنکھیں کھول دیں کہ یورپوں کے ساتھ ہندوستانوں کی برابری کے سلسلے میں جس کا ملکہ وکٹوریہ کے اعلان میں وعدہ کیا گیا تھا، ایک چھوٹے سے قدم کی سفید فام لوگوں نے کتنی سخت مخالفت کی، ہندوستان کے لوگوں کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ اپنے وطن میں ان کی حیثیت کمتر تھی، یہ کہ حکام انہیں بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہ کہ آزادی شہریوں کے حقوق حاصل کرنے کے

(1) بنگالی، 3 مارچ 1883ء

(2) بنگالی، 2 جون اور 16 جولائی 1883ء

(3) بنگالی، 11 فروری 1882ء

لیے انہیں طویل اور پر خطر راستے طے کرنا ہو گا۔ بل کے بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں ملک کے عوامی اداروں نے متحد ہو کر بل کے حق میں ایک عر ضداشت پریم کونسل میں پیش کی تھی، جس میں اس مقصد کے پیش نظر ایک عام جلسہ کیا گیا، ہندوستانی اخباروں نے حکومت کی پوری حمایت کی، لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا، یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے یادداشتیں اور عر ضداشتیں ناکافی ہیں اور یہ محسوس کیا گیا کہ ”سلسلہ تحریک چلانے اور ملک کے سامنے وہ اغراض و مقاصد رکھنے کے لیے جن سے ملک کی دائمی بھلائی کا امکان پیدا ہو سکے۔“ (1) اور سیاسی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے تنظیم بنائی جائے یہ محسوس کیا گیا کہ وقت آگیا ہے کہ ملک کے انتظام میں بھی نہ صرف مقامی بلکہ مشترکہ قومی معاملات میں بھی حقیقی اور موثر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کی جائے۔ یہ کام صرف ایک ایسی ملک گیر تنظیم کر سکتی تھی جو رائے عامہ کو ہموار کر سکے اور عام لوگوں میں تحریک کو مقبول بنا سکے۔

اس کی حمایت جسٹس اور مد راس کے اخباروں نے کی۔ چونکہ یہ شکایت مقامی نوعیت کی نہیں تھی اس لیے یہ محسوس کیا گیا کہ ایک کل ہند تنظیم زیادہ بہتر انداز سے حالات سے نمٹ سکے گی۔ 1876ء میں دہلی دربار سے کچھ پہلے پونا کی سر دجک سجا کے جوشی نے ایک خط ان لوگوں کو لکھا جنہیں دربار میں مد عویا گیا تھا اور اس میں کہا کہ قومی اہمیت کے مسائل پر گفتگو کرنے کیلئے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ 1882ء میں قومی کانفرنس کرنے کا خیال پھر ظاہر کیا گیا۔ ”قومی یا پھر کم از کم ایک صوبائی کانگریس کا اجلاس کیوں نہ کیا جائے۔ یعنی ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مندوبین کا جلسہ جنہیں اپنے اپنے نقطہ نظر کی نمائندگی کرنے کے لیے مختلف عوامی ادارے بھیجیں؟ یہی ہماری عوامی تحریکوں کو حقیقی نمائندہ نوعیت عطا کر سکتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ایک عظیم قومی کانگریس کا سالانہ جلسہ ہندوستان کی نسلوں میں جذبہ اتحاد پیدا کر دے اور ملک میں بکھرے ہوئے مختلف سیاسی اداروں کے سیاسی معاملات کے تعلق سے متحدہ عمل کے لیے میدان تیار کر دے۔“ (2)

1883ء میں جب البرٹ بل کے خلاف تحریک اپنے شباب پر تھی اس وقت سریندر ناتھ برہی کے خلاف عدالتی کارروائی نے رائے عامہ کو اور مشتعل کر دیا۔ اخبار میں ایک مضمون لکھنے کی وجہ سے ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ حکومت کے گھمنڈ اور ضد کا مناسب جواب دیا جانا ضروری تھا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں تحریک چلانے اور ”ایک ایسی قومی عبادت گاہ تعمیر کرنے کے لیے روپیہ جمع کیا جائے جس میں سب پارٹیاں یعنی زمیندار، کسان اور دکان دار ملکر قومی مفادات کو فروغ دے سکیں (3) اس فنڈ کا ایک مقصد یہ تھا کہ ملک کے مختلف حصوں کے نمائندوں کی ایک سالانہ کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ وہ عوامی جذبہ پیدا کر سکے اور ہندوستان کی رائے عامہ کو استوار کر سکے۔“ (4)

قومی کانفرنس کا پہلا اجلاس 28 سے 30 دسمبر 1883ء تک کلکتہ میں ہوا۔ جن سوالوں پر اس کانفرنس میں بحث کی گئی وہ تھے نمائندہ کونسلیں، تعلیم جس میں عام اور تکنیکی دونوں قسم کی تعلیم شامل تھی، عدلیہ کی انتظامیہ سے تعلیم گئی، فوجداری مقدمات کی سماعت اور آخر میں سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں

(1) بگلی، 26، جون 1884ء

(2) بگلی، 27، مئی 1882ء

(3) ایسٹا، 18، جولائی 1883ء

(4) ایسٹا، 3، اگست 1883ء

لی زیادہ بھرتی، البرٹ بل کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کا تعلیم یافتہ ہندوستان نے یہ جواب دیا جیسے ”سنہرے ناکوس کی گونجی آواز سے“ تعبیر کیا جانا چاہیے (1) بقول بلٹ کے یہ ”قومی پارلیمنٹ کی طرف سپاہ قدم تھا“۔ (2)

سیاسی گروپوں کو متحد کرنے اور قومی فنڈ کیلئے روپیہ اکٹھا کرنے کی غرض سے 1884ء میں بنرجی نے ایک وفد پھر شمالی ہندوستان کا دورہ کیا، لاہور پین کی ہندوستان سے روانگی کے موقع پر پورے ملک میں مظاہرے کئے گئے جس نے حکام پر ظاہر کر دیا کہ ہندوستان میں قوم پرستی کی نئی طاقت کتنا زور پکڑ چکی تھی۔ آکلنڈ کوٹون نے بڑی حیرت کے ساتھ کہا ”کھلی واوی کی سوکھی ہڈیوں میں نئی جان پڑ گئی ہے۔“ (3) کلکتہ کارپوریشن کے چیرمین سر ہنری ہیرسن نے تسلیم کیا کہ ”تعلیم یافتہ ہندوستانی پہلے ہی ہندوستانی قوم کے ایجنٹ، رہنما، معلم اور اطلاعات فراہم کرنے والے بن چکے ہیں اور اس کو سمجھنے کیلئے زیادہ ذہانت کی ضرورت نہیں ہے کہ آئندہ کا ہندوستان ویسے ہی سوچے گا جیسے وہ لوگ بتائیں گے جن کے ہاتھوں میں ان کے اسکول، ان کے اخبارات، ان کی عدالتیں اور ان کے سرکاری دفاتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ہندوستان کی آواز اور اس کا ذہن بنیں گے اور عام لوگ اس کے ہاتھ ہوں گے جن سے اس کی تعلیم چلے گی، جیسا کہ اُسے کبھی کبھی نام دیا جاتا ہے نوجوان ہندوستان سے معاملہ کرتے وقت یہ سمجھنا بڑی غلطی ہوگی کہ ہم سیاسی اعتبار سے (جیسا کہ ظاہر اہم فوجی اعتبار سے کر رہے ہیں) آبادی کے ناقابل اعتناء حصے میں بٹ رہے ہیں اس وقت جو چند بات دو لاکھ لوگوں کے سینوں میں یک رہے ہیں وہ بیس لروڑ لوگوں کے سینوں تک پہنچ سکتے ہیں بلکہ پہنچ رہے ہیں۔ یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ساتھ ہمارے برتاؤ کا اثر محض اس طبقے تک محدود رہے گا۔“ (4)

انڈین نیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس کے بعد جو 1883ء میں ہوا تھا، دوسرا اجلاس دسمبر 1885ء میں ہوا جسے کلکتہ کی تین ایسوسی ایشنوں نے طلب کیا تھا جنہی فرنٹ انڈین ایسوسی ایشن جو زمینداروں کی نمائندگی کرتی تھی، متوسط طبقوں کی انڈین ایسوسی ایشن نے اور محض ان ایسوسی ایشن نے جس کے سکریٹری امیر علی تھے۔ بنگالی، شمالی ہندوستان اور بمبئی کے مندوین نے اس میں حصہ لیا اور تجملہ دیگر موضوعات لیجسلیٹیو کونسلوں کی فوری اصلاح پر زور دیا۔

(2) پونا سارو جنگ سبھا

برنگال کی طرح مغربی ہندوستان میں بھی -یاسی شعور بڑھ رہا تھا۔ 1870ء میں حکومت تک لوگوں کی خواہشات کو پہچاننے کے لیے سارو جنگ سبھا کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے ممبروں میں شامل تھے بڑے بڑے زمیندار، تاجر، بنک کار، پٹنار ڈسٹرکاری ملازمین، کیل، پروفیسر اور مہاراشٹر کے تچہ راب

(1) بی۔ بی۔ کچا، صفحہ 36

(2) بلٹ، الجوائس، رچن سے زور، حکومت ہندوستان، صفحہ 116

(3) بی۔ بی۔ کچا، صفحہ 88

(4) بی۔ بی۔ کچا، صفحہ 91

مہاراجے، مہادیو گوند رانا سے، جن کا تقرر 1871ء میں پوتا میں ہوا تھا، اس کے رہنما اور فلسفی بن گئے۔ ان کے خیالات نے سبھا کو متاثر کیا اور اس کی سرگرمیوں کو سمت عطا کی۔ ایسوسی ایشن کا اصل مقصد تھارا نے حالت کو ہموار کرنا لیکن اس نے ہندوستانی معیشت کے مسئلوں کے مطالعے پر زیادہ توجہ دی اور لوگوں کی معاشی دشواریوں پر حکومت کو توجہ دلائی۔ اسی کے ساتھ اس نے ملک کو ایک عرصہ اشتعالیجی جس میں درخواست کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بھی وہی سیاسی حقوق دیئے جائیں جو برطانوی شہریوں کو حاصل ہیں۔ لیجسلیٹیو کونسلوں کیلئے انتخابات کی ضرورت پر بھی نے زور دیا۔ 1878ء میں اس نے ایک رسالہ شائع کرنا شروع کیا جس نے زرعی اصلاحات، زرعی بینکوں کے قیام، تعلیم پھیلانے، محاصل اور سرکاری اخراجات کم کرنے اور عدالتی نظام کو سدھارنے کی وکالت کی۔

1885ء میں فیروز شاہ مہتا، کے۔ ٹی۔ سنگھ اور بدر الدین طیب جی نے باقاعدگی کے ساتھ سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے اور حکومت کو عام لوگوں کے خیالات سے باخبر رکھنے کے لیے بمبئی پریسڈنسی ایسوسی ایشن قائم کی۔

(3) مہاجن سبھا

مدراں میں ہندوؤں کی بیداری کا آرگن ہندو 1878ء میں شروع کیا گیا اور اسکے حامیوں نے 1884ء میں ایک سیاسی انجمن قائم کی جس کا نام تھا ”مہاجن سبھا“ انہوں نے دسمبر میں صوبائی کانفرنس کی، جس میں مدراس اور پریسڈنسی کے دوسرے بڑے شہروں کے مندوین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں لیجسلیٹیو کونسل کی اصلاح، عدلیہ کو مال کے کاموں سے علیحدہ کرنے، سول ملازمتوں اور فوجی اخراجات کے مسائل پر بحث کی گئی۔ یادداشتیں تیار کی گئیں اور حکومت کو پیش کی گئیں۔

VII۔ کانگریس کی ابتدا

اس قسم کی صوبائی سیاسی سرگرمیوں نے ایک سیاسی تنظیم بنانے کے لیے میدان تیار کر دیا تھا۔ ایک ایسی تنظیم جو پورے ہندوستان پر حاوی ہو اور ملک میں بکھری ہوئی سیاسی تنظیموں اور سیاسی شعور کو والے افراد کو ایک تنظیم میں متحد کر دے۔ ایک ایسی قومی اسمبلی کے قیام کے لیے حالات سازگار تھے جو قومی مطالبات اور ضرورتوں کا اظہار کر سکے۔

تاریخ کے کسی دور میں حکومت عام لوگوں سے اتنی دور اور محکموں کے ساتھ ہمدردی سے مبرا نہیں تھی۔ دوسری طرف تعلیم یافتہ متوسط طبقہ بڑا ہو گیا تھا اور ملحدوں کی طرف فرائض کا زیادہ شعور اُس میں پیدا ہو گیا تھا صوبوں کی سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ وہ اپنی طاقت اور جذبہ آزادی کا ثبوت دے چکا تھا۔ نام نہاد لیجسلیٹیو کونسلوں کی حقیقی نوعیت کے متعلق اسے اب دھوکا نہیں پایا جاسکتا تھا۔ جدید کانگریسیوں نے کہا تھا ”اس یاس نے تین یا چار راہبوں کو تہذیبی تمویزی مدت بعد کھلتے پایا بات ت تاکہ ان میں

بورڈ میں گورنر جنرل اور اس کے کچھ بورچین ساتھیوں سے ملاقات کر سکیں اور کم اہمیت کے سرورڈوں کو اسی طرح گورنروں سے بات کرنے کے لیے مدراس اور بمبئی بلایا جاتا ہے۔ اگر اسے بدلی حکومت کی علیحدگی پسندی سے باضابطہ روگردانی سمجھا جائے تو یہ اچھا ہے، لیکن اسکو بدلی حکومت اور مقامی لوگوں کے درمیان اختیارات کی شرکت کون تصور کرتا ہے۔“ (1)

اس کا کافی جواز پلایا جاتا تھا کہ حکومت کے کاموں میں لوگوں کے نمائندوں کو شریک کیا جائے۔ ہندوستانی اخبارات، جو رائے عامہ کی نمائندگی کرتے تھے، اس کا مطالبہ کر رہے تھے، سیاسی انجمنیں بار بار حکومت ہندوستان اور حکومت انگلستان کو توجہ دلا چکی تھیں اور ہندوستانی رہنما بہت سے پلیٹ فارموں سے اسکے متعلق ہندوستانیوں کی خواہشات کو ظاہر کر چکے تھے۔ ہندوستان کی توقعات سے ہمدردی رکھنے والے انگریز بھی اس کی ضرورت پر حکومت کو توجہ دلا چکے تھے۔

ان میں ہنری کاٹن اور آئین ایکوین ہیوم کی طرح کے لوگ شامل تھے۔ ہندوستان کے مطالبات کی حمایت دودا-ساب کی بنا پر کرتے تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کیلئے حکومت خود اختیاری کو پسند ہی کی نظر سے دیکھتے تھے اور دوسری یہ کہ اس بات کی فکر تھی کہ دونوں ملکوں کے باہمی رشتے نہیں ٹوٹنا چاہیے اور یہ کہ حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کے لیے تھوڑے پر مجبور نہ کیا جائے، کاٹن نے لکھا تھا ”وہ (تعلیم یافتہ ہندوستانی) ہماری حکومت کو ایک ناقابل تصنیع ضرورت کے طور پر برداشت کرتے ہیں جس نے ماضی میں انہیں بہت فوائد پہنچائے ہیں لیکن جس میں ترمیم کرنے کا وہ نہیں ارادہ کر چکے ہیں اگر وہ خود ہی ان تبدیلیوں کو قبول نہیں کر لیتی ہے جو خود اس کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔۔۔ ان کا مطالبہ ہے کہ نام نہاد مساوات کے بجائے حقیقی مساوات ہو، خود انکے ملک کی حکومت میں انکی آواز ہو اور سرکاری ملازمتوں کے انہیں مواقع ملیں۔“ (2)

آئین ایکوین ہیوم (1829ء-1912ء)، 1846ء سے سرکاری ملازمت میں تھا لیکن 1879ء میں اُسے آزاد خیالات رکھنے اور بلا خوف ان کو ظاہر کرنے کی بنا پر لنٹن نے حکومت ہندوستان کے سیکریٹری کے عہدے سے ”شرمناک اور ظالمانہ انداز“ سے ہٹا دیا تھا۔ 1882ء میں وہ ملازمت سے رٹائر ہو گئے۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے لوگوں کے مفادات ازلی طور سے یکساں ہیں اور یہ کہ ہندوستان میں حکومت اس طرح کی جانی چاہیے جس سے دونوں کو برابر فائدہ ہو۔ انہیں یہ بھی محسوس ہو گیا تھا کہ اس برطانوی ہندوستان کے معاشی مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے، یہ کہ قحطوں اور مایوسیوں نے کسانوں کو تباہ کر دیا ہے، یہ کہ اس زمانے کی حکومت لوگوں سے خطرناک حد تک دور ہو چکی ہے۔ اور یہ کہ حاکموں اور محکموں کے درمیان روابط قائم کرنے کا کوئی جانا پہچانا ذریعہ نہیں ہے یعنی ہندوستانیوں کی ضرورتوں اور رائے سے حکومت کو باخبر رکھنے کا کوئی دستور یا ذریعہ نہیں ہے۔ 1872ء میں اس نے بار تھ بروک کو اس خطرہ سے آگاہ کیا تھا کہ برطانوی علاقہ مظبوط ہو تا جا رہا ہے۔ اس نے لکھا تھا ”ہماری حکومت کتنی غیر مستحکم ہے اس کا علم غالباً آپ کو نہیں ہے۔۔۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ سلطنت کی صورت حال بہت خراب ہو چکی ہے اور سی وقت بھی پوری طرح نظر نہ آنے والا

(1) بنگالی، 16، اپریل 1881ء۔

(2) کانن، ایچ، نیپھو، لندن، 1904ء، ص 32، اس کا پہلا ایڈیشن 1886ء میں شائع ہوا تھا۔

بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا بڑھ کے ایسا طوفان بن سکتا ہے جو ملک کو طوائف الملوکی اور تباہی کا شکار بنا دے۔“ (1)
 انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہندوستان میں بڑے دکھ اور بڑی بے چینی تھی اور حکومت
 کے سرکاری کی حیثیت سے ہیوم کو جو اطلاعات ملی تھیں ان پر اسے یقین ہو گیا تھا کہ صورت حال خطرناک
 ہے۔ وہ کہتا ہے ”اس وقت (میر خیال ہے کہ لندن نے جانے سے تقریباً 15 مہینے پہلے) مجھے جس ثبوت نے یہ
 یقین دلایا تھا کہ ایک بڑی شورش کا فوری خطرہ ہے وہ یہ تھا۔ مجھے سات بڑی بڑی جلدیں دکھائی گئیں۔ جن
 میں بہت سے اندراجات تھے۔ ان سب سے ظاہر ہوتا تھا کہ سب سے نچلے طبقوں کے ان غریب لوگوں کو
 موجودہ حالات میں اپنی بے بسی کا یقین ہو گیا ہے اور انہیں یقین ہو گیا ہے کہ وہ طاقتوں پر فائدے کریں گے اور
 مر جائیں گے اور یہ کہ انہیں کچھ کرنا چاہیے۔ وہ کچھ کرنے والے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور
 اس کچھ کے معنی ہیں تشدد“ (2) دو ککن کے بلووں نے اس کے خطرات و خیالات کا ثبوت فراہم کر دیا۔

اس خطرے سے بچنے کے لیے قدرتی طور سے ہیوم نے محسوس کیا کہ اس کا کاٹ کر تا ضروری
 ہے یعنی قومی تحریک کی ایک ایسی تنظیم بنائی جائے جس کے تین مقاصد ہوں۔ ”پہلا مقصد یہ کہ اُن تمام
 مختلف عناصر کو جن پر ہندوستان کی آبادی مشتمل ہے ایک قومی دھارے پر لانا، دوسرا یہ کہ روحانی، اخلاقی،
 سماجی اور سیاسی خطوط پر اُس قوم کی ہر ترجیح و اس طرح بنائی گئی ہو اور تیسرا یہ ہے کہ ان شرائط میں
 جو غیر منصفانہ اور غیر مفید ہوں تبدیلی کر کے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان یونین کو مستحکم بنانا۔“ (3)

چنانچہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے ہندوستانی رہنما جس ملک گیر سیاسی ادارے کی تعمیر کرنا
 چاہتے تھے ہیوم کی رہنمائی پر جو شجاعت اُسے جلدی معرض وجود میں لے آئی۔ ہیوم نے یکم اگست 1883ء کو کلکتہ
 یونیورسٹی کے کونگریس کے نام ایک خط میں اس بات پر زور دیا کہ ایک مقررہ طریق عمل کی پیروی کرنے
 کے لیے وہ ایک یونین بنائیں اور ان الفاظ میں انہیں مشورہ دیا ”جہاں تک ضبط و نظم اور ساز و سامان کا تعلق
 ہے ہماری چھوٹی سی فوج کو آپ اپنی نظیر ہونا چاہیے اور سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ آپ میں سے کتنے ایسے
 نکلیں گے جو اعلیٰ تعلیمی استعداد کے علاوہ وہ بے لوثی، اخلاقی جرأت، ضبط نفس اور فیض رسانی کا جذبہ رکھتے
 ہیں جو اس میں شامل ہونے والوں کے لیے ضروری ہے۔“ (4) اُس نے مزید لکھا ”ہر قوم جس قسم کی
 حکومت کے قابل ہوتی ہے اس کو ایسی ہی حکومت ملتی ہے اگر آپ جو چہندہ اور تعلیم یافتہ ہیں اپنے لیے اور
 اپنے ملک کے لیے زیادہ آزادی حاصل کرنے کی غرض سے جدوجہد نہیں کر سکتے ہیں۔ تو کم از کم اس
 وقت ترقی کی تمام امیدیں ختم ہو جائیں گی۔“ (5)

ہیوم نے ہندوستانی رہنماؤں سے مشورہ کر کے 1884ء میں مندرجہ بالا تین مقاصد کے ساتھ
 انڈین نیشنل یونین کی اسکیم شروع کی۔ یونین کے مقاصد کی وضاحت اس طرح کی گئی ”تمام دستوری
 طریقوں سے یہاں یا انگلستان میں کسی بھی ایسے چھوٹے یا بڑے حکام کی مخالفت کرنا جن کا عمل یا عدم عملی
 ہندوستان کی حکومت کے ان اصولوں کے منافی ہے جو برطانوی پارلیمنٹ نے بنائے ہیں اور جن کی توثیق
 برطانوی بادشاہ نے کی ہے۔“ (6)

(1) اے۔ او۔ ہیوم کا خط تھ بروک کے نام، یکم اگست 1872ء، تھ بروک کے کاغذات، انڈیا آفس لائبریری لندن۔

(2) ڈاکٹر ایچ۔ ایل۔ پال، انیسویں ہیوم، صفحات 80-81 (3) ایضاً، صفحہ 47 (4) ایضاً، صفحہ 51

(5) ایضاً، صفحہ 52 (6) ایضاً، صفحہ 53

ان یونین کی تنظیم جلد ہی پورے ہندوستان میں پھیل گئی تاکہ ہندوستان کی رائے عامہ کو پیش کیا جاسکے۔ اس کے مطالبات یہ تھے۔ دنیا کو نسل کو ختم کیا جائے یا اسے بالکل بدل دیا جائے۔ پارلیمنٹ، ایک باضابطہ اور بڑی یادداشت ان موضوعات کے متعلق پیش کرنی تھی۔ حکومت کے عدالتی اور دوسرے شعبوں کے اعلیٰ عہدوں سے ہندوستانیوں کو قریب قریب علیحدہ رکھا جا رہا ہے، محاصل عامہ کرنے کے معاملے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہے اور موجودہ لیجسلیٹیو کونسلوں میں ایسی ترمیم کرنے کی ضرورت جس سے وہ کسی حد تک نمائندہ بن جائیں۔“ (۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہیوم نے سیاسی کانفرنس کے منصوبے پر گورنر جنرل ڈفرن سے آفٹوکی تھی اور اس کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ ڈفرن اس کا خواہش مند تھا کہ لوگوں کی حقیقی خواہشات سے واقف ہو اور اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے کانفرنس ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگی۔

ہندوستان کے دوسرے بھی خواہوں سے مشورہ کرنے کے لیے ہیوم اس کے بعد انگلستان گیا۔ جب اس نے ان کی مدد کا یقین ہو گیا تو ہندوستان واپس آیا تاکہ اس کانفرنس میں شرکت کر سکے جو 25 ستمبر کو پونا میں یونین نے طلب کی تھی۔ چونکہ اس کی حمایت ہندوستان کے مختلف حصوں کی طرف سے ہوتی تھی اس لیے اس کا نام ”انڈین نیشنل کانگریس“ پڑ گیا، آخری وقت میں یہ طے کیا گیا کہ وہ پونا کے بجائے بمبئی میں منعقد ہوگی۔

کانگریس کے انتظامات بمبئی پریسڈنسی ایسوسی ایشن نے کئے۔ اس کے اجلاس کو کل داس تچ پال سنکرت کالج میں ہوئے۔ مندوبین جن کی تعداد 72 تھی ہندوستان کے سبھی حصوں سے آئے اور ملک کے ایک بڑے وکیل ڈبلیو۔ بی۔ برنہی کو صدر چنا گیا۔ بناوٹ کو ابھی تیس سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ جب ہندوستانیوں کی ایک نئی نسل، جس کے دلوں میں نئے تصورات اور نئے ہندوستان کی تصویر نے انہیں بھر دی تھیں، ایک جگہ اکٹھا ہوئی اور اس تحریک کی داغ بیل ڈالی جو ساٹھ سال میں اپنی منزل تک پہنچ گئی۔ 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ہونے کے بعد پورے ملک میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ سب سے اہم واقعہ تھا۔ پہلی دفعہ سیاسی اتحاد کا پیغام کسی مرکزی مقامی یا بدلی حکومت کے بجائے داروین کے جرات مند اور ترقی پسند سپہ سالاروں نے دیا تھا جو ملک کے ہر گوشے سے آئے تھے۔ وہ بمبئی میں جمع ہوئے، آپس میں مشورہ کیا اور ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے حکومت و وقت کو چھوٹی دی، ہندوستان کے حاکموں سے صاف صاف کہا کہ وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ملک کے متعلق فیصلے محض بدلی کریں اور یہ کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا مستحق ارادہ کر چکا ہے، انڈین نیشنل کانگریس نے قیادت سنبھال لی اور ملک نے اس کی رہنمائی کو قبول کر لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریس لوگوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا اظہار تھی۔ یہ ہندوستان کی ذات کے خلاف کرب کی ایک جگہ بھی تھی اور غلامی کے خلاف اعلان جنگ بھی۔ اس کی ابتدا ہوئی برطانوی راج کی فیض رسانی پر یقین سے لیں ایک ہی نسل کی زندگی میں اس نے بڑھ کے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا معرض وجود میں آنا ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک بے مثال واقعہ تھا۔ اس نے ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان کیا یعنی ایسے۔ یانی اتحاد کے دور کا جو اوپر سے تھوپے جانے کے بجائے لوگوں کے مرض کا اظہار ہو۔ کانگریس اس نئے مان کا مرکز اور تھی جو پلاس کے بعد کے سو

برسوں میں ہونے والی وحاشی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے ایک ایسے عمل کو مکمل کر دیا جس کا شریک ہندوستانوں پر انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں سے بڑا۔

لیکن 1885ء میں یہ کہنا مشکل تھا کہ کانگریس کا مستقبل کیا ہو گا؟ سبھی اداروں کی طرح اس کو بھی وقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان مراحل سے گزرنا پڑا جب لوگوں نے اس کی طرف سے بے نیازی کا رویہ اختیار کیا اور حکومت نے عدم پسندیدگی کا لیکن اس سب کے باوجود یہ ایسا طاقتور حربہ بن گئی جس نے برطانوی سلطنت کی طاقت کا مقابلہ کیا۔

اس کی ابتداء زیادہ دھوم دھام سے نہیں ہوئی تھی۔ پہلے اجلاس کی تقریروں اور تجویزوں میں اعتدال پسندی سے کام لیا گیا تھا اور برطانوی حکمرانوں کے احترام کا خیال رکھا گیا تھا۔ صدارتی خطبہ میں بڑے شائستہ انداز سے حکومت کو یاد دلایا گیا کہ ”حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کر کے کانگریس محض اتنا چاہتی ہے کہ حکومت کی بنیاد کو دسمت دی جائے اور لوگوں کو اس میں ان کا مناسبت اور جائز حصہ دیا جائے۔“

لجسلیٹیو کونسلوں کی اصلاحات پر جو تجویز پیش کی گئی تھی وہ سب سے زیادہ اہم تھی۔ اُسے کے ٹی۔ ٹنگ نے پیش کیا اور اس کی تائید اس میں سیرافیا ایئر نے کی تھی اس میں مانگ کی گئی تھی کہ منتخب ممبر ہو، سوالات کرنے کا ممبروں کو حق دیا جائے، بجٹ کو کونسلوں میں پیش کئے جائیں، شمال مغربی صوبہ جات، اودھ اور پنجاب میں کونسلیں قائم کی جائیں اور ہاؤس آف کامنز میں ایک اسٹینڈنگ کمیٹی (مستقل کمیٹی) بنائی جائے جو کونسلوں کی اقلیتوں کے باقاعدہ احتجاجوں پر غور کرے۔

(1) کانگریس کے مقاصد

یہ صحیح ہے کہ کانگریس ویسے ہیگاموں اور جوش و خروش کے ساتھ معرض وجود میں نہیں آئی تھی جو عام طور سے سیاسی قراردادوں کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں۔ پہلے اجلاس میں صرف 72 مندوبین شریک ہوئے تھے لیکن بعد میں ان کی تعداد بڑھ گئی تھی کلکتہ میں منعقد ہونے والے دوسرے اجلاس میں اس کی تعداد تھی 344 اور دس سال کے تیسرے اجلاس میں 607۔ مندوبین زیادہ تر پیشہ ور طبقوں سے تعلق رکھتے تھے مثلاً وکیل، استاد، ناشرین، مدیر وغیرہ۔ بہت کم تاجروں نے حصہ لیا اور زمیندار زیادہ تر اُس سے علیحدہ رہے۔ مسلمان بٹے ہوئے تھے اور سرسید احمد خاں کی قیادت میں اُن کے ایک حصے نے 1886ء کے بعد کانگریس کی عملی مخالفت شروع کر دی تھی۔ پھر بھی مسلمان مندوبین کی تعداد جو بمبئی میں دو تھی کلکتہ میں بڑھ کے 33 اور دس سال میں 81 ہو گئی تھی۔ 1890ء میں چھٹے اجلاس کے موقع پر کل مندوبین کی 702 تعداد میں سے مسلمانوں کی تعداد 156 تھی۔

ابتدائی برسوں میں کانگریس کے اجلاس خوش سلیقگی، شجاعت اور متانت کے ماحول میں منعقد ہوئے تھے۔ تقریروں اور تجویزوں میں انقلابی جوش نہیں ہوتا تھا۔ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا جاتا تھا، خطبات صدارت میں برطانوی راج کے فوائد کا ذکر کیا جاتا تھا، تاج کے ساتھ ہندوستان کی تاداری کی یقین دہانی کی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ ہندوستان چاہتا ہے کہ برطانوی سلطنت میں شامل رہے۔

کانگریس کے مطالبات مقابلے اور چوٹی کے بجائے عرصہ اشتیاق اور درخواستوں کی شکل میں

پیش کئے جاتے تھے، لیکن ابتداء ہی سے ان کا زرخ بنیادی دستور کی تبدیلیوں کی طرف تھا۔ کانگریس کے پہلے ہی اجلاس میں سپریم اور مقامی لیجسلیٹیو کونسلوں کی توسیع، ان میں منتخب ممبروں کے خاصے تناسب کو جگہ دینے اور ان کے اختیارات بڑھانے کی درخواست کی گئی تھی۔ یہ ایسی تجویز تھی جس کا مقصد تھا حکومت کے غیر نمائندہ نظام کو ایک ایسے نظام سے تبدیل کیا جائے جس کی بنیاد لوگوں کے نمائندوں کے مشوروں پر قائم ہو، آئندہ اجلاسوں میں یہ تجویز دہرائی گئی۔

اگرچہ کانگریس متوسط درجہ کی تنظیم تھی پھر بھی وہ تمام طبقوں کی ضرورتوں میں دل چسپی لیتی تھی اگر متوسط طبقہ کے لیے یہ حکومت سے مطالبہ کرتی تھی کہ سول اور فوجی دونوں قسم کے ملازمتوں میں اور خصوصیت کے ساتھ ان کے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کو زیادہ بھرتی کیا جائے تو دیہات کے کاشتکاروں کے لیے یہ مطالبہ کرتی تھی کہ زمیندار جو مال کڑا کر لے کر آتے ہیں اور کسان زمینداروں کو جو لگان دیتے ہیں ان کا استمراری بندوبست کیا جائے۔ اس نے جنگل کے قوانین کے خلاف احتجاج کیا جنہوں نے غریب دیہاتوں کے لیے مشکلات پیدا کر دی تھیں اور نمک کے محصول کے خلاف بھی احتجاج کیا جس کی بنا پر ان کی چھوٹی چھوٹی آمدنیوں پر ایک ایسے محصول کا بار پڑتا تھا جو صرف کرنے کی ایک ناکریر شے پر لگایا جاتا تھا۔

اس کے بعد کانگریس کے تجویزوں میں مالی معاملات کا ذکر کیا جانے لگا جیسے فوجی اخراجات کا غیر منصفانہ بوجھ، بدلی زر مبادلہ کی بہرہ پھری جو ہندوستانی معیشت کے لیے مضر تھی، انتظام پر کیا جانے والا زیادہ خرچ، بھاری محاصل، تارف کی پالیسی اور کسانوں کی بیگاریاں، آخری الذکر کا مقصد تھا ہندوستانی تاجروں کے مفادات کا تحفظ۔

کانگریس نے اس پر زور دیا کہ عام لوگوں کی تعلیم نظر انداز کی جاتی ہے، قانون اور انصاف میں سدھار کے مشورے دئے اور خاص طور سے یہ سفارش کی کہ عدالتی اور انتظامی کام علیحدہ کر دئے جائیں اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے قانون میں اسقام کی طرف توجہ دلائی۔ حالانکہ اس کے ممبروں کی تعداد کم تھی اور اس کے پاس طاقت تھی نہ دولت پھر بھی کانگریس نے ہندوستان کے دل و دماغ کی نمائندگی کرتی تھی۔ اسکے بحث و مباحثوں میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی خوشحالی کے تصور کے انعکاسات دیکھے جاسکتے تھے اور اس کی تجویز کے پیچھے بلند تر اور آواز تر زندگی کی ہندوستان کی خواہش کا فرما تھی کانگریس نے ہندوستان کی علامت اور اس کی اخلاقی انفرادیت کی زندہ گواہ تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا کانگریس ہندوستان کی سیاسی امیدوں اور آرزوؤں کی تجسیم اور آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد کا آلہ کار بن گئی۔

(2) کانگریس کا اثر ہندوستانیوں پر

کانگریس کی فعال حیثیت کے ہندوستان کے مختلف طبقوں اور انگریزوں میں مختلف رد عمل ہوئے۔ پرانے فیوڈل طبقوں کے باقیات اور نئے مالکان اراضی، چاہے وہ ہندو تھے یا مسلمان، بہت خائف ہو گئے۔ کانگریس کی بنا پر اس سیاسی نظام کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا جس نے انہیں جنم دیا تھا اور زندہ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں ایک غیر یقینی مستقبل کے خطرے سے آگاہ کیا قدرتی طور سے ان مناسروں نے اپنے ان واقعات یعنی برطانوی حکومت کی طرف نظریں اٹھائیں اور پریشانی کے عالم میں اس کا امن اور مضبوطی کے ساتھ پڑا لیا۔

جہاں تک تجارتی طبقے کا تعلق تھا اس کی ضرورتیں فوری بھی تھیں اور مستقل بھی جوں جوں اُسے اپنی مستقل ضرورتوں کا اور اس بات کا زیادہ احساس ہوتا گیا برطانوی حکومت ان کو پورا کرنے کی راہ میں کس طرح حائل ہوئی ہے دیئے دیئے وہ کانگریس کے قریب آتا گیا جو یہ چاہتی تھی کہ عام لوگوں کو بے انتہا غربت و افلاس سے بچھکارا دلوانے کے لیے ملک کو معاشی ترقی دی جائے۔

اب رہی عام لوگوں کی بہت بڑی تعداد۔ انگریز حکام ڈھنگیں مارا کرتے تھے کہ زمین پر کام کرنے والے یعنی کسانوں اور شہمی داروں کے مفادات کے حقیقی محافظہ ہیں لیکن جیسا کہ دادا بھائی نوروجی نے بتایا کہ واقعات اس کے برعکس تھے بے زبان عام لوگوں کا استحصال مہاجن کرتے تھے، زمیندار کرتے تھے اور سرکاری ملازمین کرتے تھے۔ دیر میں سبھی پھر بھی حکومت نے مہاجنوں کے چنگل سے انہیں چھڑانے کی اور زمینداروں کے مظالم سے نجات دلانے کی کوشش کی لیکن تمام کا تمام زرعی اور قانونی نظام ایسا تھا کہ یہ کوششیں کم و بیش بے سود ثابت ہوئیں۔

عدم واقفیت کی بنا پر عام لوگ حالانکہ ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے پھر بھی کانگریس نے ان کے دکھوں کو دور کرنے کی کوشش بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ کی، اس طرح وہ ان کی بھی خواہ اور نمائندہ بن گئی۔ سمجھدار لوگوں نے کانگریس کی اہمیت کو سمجھ لیا اور اس کے اعتدال پسندانہ الفاظ اور معتدل دعوؤں کے پس پشت کام کرنے والے مقصد کو دیکھ لیا۔ پارلیمنٹ کے ایک ممبر سلیگ نے، جو 1885-86ء کے موسم سرما میں ہندوستان آیا تھا، اپنے ملک کے لوگوں کو آگاہ کیا کہ وہ حالات کو سمجھیں اور ہندوستان کے مطالبات کو شرافت کے ساتھ تسلیم کر لیں، اس نے کہا "کانگریس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش حماقت ہوگی یہ اس تحریر کی طرح ہے جو بل شازار کے محل کی دیواروں پر نمودار ہوئی تھی" (1) پارلیمنٹ کے ایک اور ممبر سیوکل اسمتھ نے ہندوستان کے سفر کے بعد سلیگ کے الفاظ دہرائے کہ "وقت آ گیا ہے جب ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کو توسیع دینی چاہیے اور ان میں بہترین کو ملک کی حکومت میں شامل کیا جانا چاہیے" (2)

کانگریس کے خلاف حکومت کا رد عمل

حکومت کا رد عمل کیا تھا؟ برطانوی حکومت کا محل بریکو کی دیواروں کی طرح نہیں تھا کہ کانگریس کے بغل کی آواز کے ساتھ سسار ہو جاتا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں واقعہ یہ ہے کہ برطانوی سلطنت اپنی طاقت اور وقار کے نقطہ عروج پر تھی "اعلیٰ انگلینڈر" (وہ لوگ جن کا خیال تھا کہ انگلستان کو نو آبادیوں کے تعلق سے اپنی ذمہ داریاں کم کرنی چاہیے) پس پاہور ہے تھے اور لبرلوں کے ایک اہم گروپ نے سامراجی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ سکرٹری آف انٹرنیشنل کے ہاتھوں میں پوری طاقت تھی اور اس کو پورے اختیارات حاصل تھے اور حکومت ہند ان فیصلوں پر عمل کرنے کے لیے محض آلہ کار تھی جو لندن میں کئے جاتے تھے۔

حکومت ہندوستان نے جسے سیاسی حالات کے متعلق سکرٹری آف انٹرنیشنل کو مشورہ دینا تھا، کانگریس کی کاروائیوں پر کچھ غجب کا اظہار کیا اور تحریک میں تھوڑی بہت دلچسپی لی۔ 1886ء میں ڈفرن نے کلکتہ میں مندوین کو ایک دعوت میں مدعو کیا۔ ہر اس میں منعقد ہونے والے اگلے اجلاس میں گورنر نے اسی طرح انہیں مدعو کیا۔

سرکاری حکام کو اجلاس میں شرکت کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن 1888ء تک حکومت کاروبار بالکل بدل چکا تھا۔ قرار دادوں میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا جاتا تھا اور تقریروں میں حکومت کی کاروائیوں اور خصوصیت کے ساتھ سامراجی پیش قدمی کی پالیسی اور جنگوں کی مذمت کی جاتی تھی جسے برطانوی حکمران ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جس چیز نے انہیں اور زیادہ ناراض کر دیا وہ تھی ان پمفلٹوں کی اشاعت جن میں ہندوستانیوں کی شکایتیں درج ہوتی تھیں اور جو ظاہر ہے کہ سیاسی تحریک کو جاری رکھنے کا ایک ذریعہ تھا۔ اس کی وجہ سے بے چینی اور تناؤ اور بڑھا اور آئرلینڈ کی ہوم رول کی تحریک کی سی شکل اس نے اختیار کر لی۔

کانگریس کے مطالبات کے تعلق سے ڈفرن نے شدید رد عمل ظاہر کیا اس نے کانگریس کے سرکیریٹری ہوم کو ملازمت کا نشانہ بنایا، سرہنری مین کو ایک خط میں اس نے لکھا ”ایک شریہ انسان ہے جس کا نام ہے ہوم اسے لارڈ پرن نے بہت اچھا لکھا، ایسا مظلوم ہو تا کہ ہندوستان کی ہوم رول کی تحریک میں جان دالنے والوں میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ چالاک ہے، کسی حد تک مخبوط الحواس ہے، خود پسند ہے اور بددیانت ہے۔ سچائی کے متعلق احتیاط سے کام نہیں لیتا ہے۔“ (1) میں نے اس سے اتفاق کیا کہ ہندوستان نمائندہ حکومت کے اہل نہیں ہیں اور اس کے لیے دلیلیں دیں۔ اس نے ڈفرن کو لکھا ”یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ پڑھے لکھے ہندوستانی جس کو اپنی منزل سمجھتے ہیں وہاں وہ کبھی نہیں پہنچ سکتے ہیں اٹھارہ کروڑ لوگ اپنے اوپر حکومت کیسے کر سکتے ہیں؟ جب اس جم غفیر پر ان کا اطلاق کیا جاتا ہے تو ذمہ دار نمائندہ حکومتوں کی اصطلاحیں اپنے معنی کھو دیتی ہیں۔۔۔ حالانکہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ہماری جمہوری زبان کا استعمال سیکھ لیا ہے لیکن حقیقت میں وہ تنگ نظر پر جمی ایک اولی گار کی قائم کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تعداد 5,000 سے زیادہ نہیں ہوگی، لیکن کوئی بھی ایسا نظام جس میں 18-5,000 کروڑ پر حکومت کریں طبقہ اشرافیہ کو جنم ضرور دے گا اور اس مخصوص صورت میں ایسے طبقہ اشرافیہ کو جنم دیگا جس کے پاس نہ طاقت ہوگی، جو نہ نمائندہ ہو گا اور نہ کسی سماجی اصلاح کی طرف مائل ہوگا۔“ (2) ڈفرن نے نار تھ بروک کو لکھا ”بڑی بڑی تبدیلیوں کے لیے عام لوگوں کی خواہش کو بڑھانے سے میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا دامن بچلایا ہے اور انہیں ایسی امیدیں اور توقعات نہیں دلائی ہیں جنہیں پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔“ (3)

بنگال کے خداتہ پسند طبقے کے متعلق ”جو دستور یو وارڈوں کو شروع کرنے کے لیے مسلسل چیخ پکار کرتے رہتے ہیں“ ملک کو بھیج جانے والے خط میں گورنر جنرل نے ان کے بارے میں لکھا تھا ”یہ جھوٹا سا جھٹکا ہے۔ جس کا اثر بہت معمولی ہے اور جس کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔“ (4) پھر بھی ہندوستانیوں کو خوش کرنے کے لیے اُس نے جشن جولائی کے نام ایک پیغام میں کہا ”جس زمانے کا ہم جائزہ لے رہے ہیں اُس میں تعلیم نے اپنا کام کیا ہے اور ہمارے چاروں طرف وہ ہندوستانی شرفیائے جاتے ہیں جن کے بڑے بڑے کارنامے ہیں اور جو بہت ذہانت رکھتے ہیں اور جن کے صدق دل اور وفاداری اور دیانت داری سے کئے جانے والے تعاون سے ہمیں بہت فائدہ کی امید ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسی حکومت کے لیے جیسی ہماری ہے اُن

(1) ڈفرن کا خط مین کے نام، 4 مئی 1886ء ڈفرن کے کاغذات

(2) مین کا خط ڈفرن کے نام، 2 جون 1886ء، ڈفرن کے کاغذات

(3) ڈفرن کا خط نار تھ بروک کے نام، 23 جون 1886ء

(4) ملک کے نام خطوط، ڈفرن کا خط ملک کے نام، نمبر 76، 26 مارچ 1888ء

نے مشورے امداد اور یک جہتی کامیابی کے ساتھ حکومت چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ پندہ یلی اور نیک نیقی کے علاوہ میں کسی اور نظر سے ان کی اس قدرتی خواہش کو نہیں دیکھتا ہوں کہ اپنے معاملات کے الزام میں وہ اور زیادہ انگریز حکمرانوں کے ساتھ مل کر کام کریں اور مجھے بڑی خوشی ہو گی کہ اگر ہندوستان میں میری مدت قیام میں حالات مجھے اس کی اجازت دیں کہ میں اس سیاسی حیثیت کو زیادہ وسیع اور زیادہ لفظی بنیاد دے سکوں جو ایک نسل پہلے لارڈ ہیلی نکسن نے ان ہندوستانی شرفا کو عطا کی تھی جنہیں ان کے اثر، ان کی ہلیتوں اور اس اعتماد کی بنا پر، جو ان کے ہوملن ان میں رکھتے تھے، ایجسلیٹو کونسلوں میں مفید اضافہ سمجھا گیا۔“ (1)

ایک مہینے بعد اُس نے سکریٹری آف انیٹ سے اعتراف کیا ”اس کے علاوہ آپ کو یہ جاننا چاہیے کہ یہ چیچ پکار محض بنگالی بابو نہیں کر رہے ہیں بلکہ پورا تعلیم یافتہ ہندوستان اس میں شامل ہیں اور مسلمان بھی اس سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو چاہتے ہیں کہ داخلی امور کے انتظام میں اُن سے زیادہ مشورہ کیا جائے۔“ (2) لیکن اُسے اس پر اصرار تھا کہ اقتدار اعلیٰ برطانیہ کا ہو۔ اُس نے کہا تھا ”مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے کہ جس چیز میں ہندوستانوں کی واقعی بھلائی ہے وہ ہے انگریزی انصاف اور انگریزوں کی انتظامی صلاحیت اور ہر حال میں انہیں پوری طرح باقی رکھا جانا چاہیے۔“ (3) اُس نے انڈین نیشنل کانگریس کو ”بچکانہ حرکت“، ”آئین اور پیر کی بحث و مباحثہ کی انجمن“ اور ایسی ”جذباتی“ انجمن سے تعبیر کیا ”جس میں زیادہ مدت پسند اور زیادہ بیوقوف اراکین کا حکم چلتا ہے“ اس نے اُسے ”بابو پارلیمنٹ“ کہا جس کی ”حمایت ایک چھوٹی سی اقلیت کرتی ہے۔“ (4)

لینس ڈاؤن نے جذباتیت سے بچتے ہوئے 1880ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے متعلق اپنی رائے مندرجہ ذیل میں ظاہر کی۔

”حکومت ہندوستان تسلیم کرتی ہے کہ کانگریس کی تحریک کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اُس کی نمائندگی کرتی ہے جس کو یورپ میں ایک ”پیش قدم لیبرل پارٹی“ کہا جائے گا جو اُس کنزرویٹو رائے عامہ سے مختلف ہے جو ملک میں پائی جاتی ہے۔ جب تک یہ دونوں پارٹیاں دستور طریقے سے کام کرتی ہیں وہ دونوں کی طرف تاثر دہی کارویہ اپناتا چاہتے ہیں۔“ (5)

لیکن کے زمانہ حکومت میں سکریٹری آف انیٹ جارج ہملٹن نے دائرے کو کھینچ جانے والے ایک خط میں اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ کانگریس رو بہ تنزل تھی اس لیے کہ اُس کا خیال تھا کہ وہ باغیانہ تنظیم ہے اور اس کے رہنما مفلوک کردار رکھتے ہیں۔

سب سے بڑے سامراجی دائرے کرزن نے سکریٹری آف انیٹ کی اس نامناسب خوشی میں اور اضافہ کیا اور یہ سوچ کر خوشی سے پھول گیا کہ کانگریس کی موت قریب ہے۔ اس نے کہا ”میرا اپنا خیال ہے کہ کانگریس لڑکھارہی ہے اور گرنے والی ہے اور ہندوستان میں جب تک میں ہوں میری خواہش ہے کہ اس کی پرامن موت میں مدد کروں۔“ (6)

(1) ڈفرن، جولائی کے جشن میں کی جانے والی تقریر 16 فروری 1887ء دیکھیے ”ہندوستان میں کی جانے والی تقریریں“ صفحہ 159

(2) کر اس کے کاغذات، ڈفرن کا خط کر اس کے نام، 20 مارچ 1887ء (3) ایضاً

(4) کر اس کے کاغذات، ڈفرن کا خط کر اس کے نام، 4 جنوری اور یکم فروری 1887ء

(5) اے۔ سی نرورائے ”ہندوستان کے قومی ارتقا“ میں اقتباس دیا، صفحہ 82

(6) کرزن کا خط سکریٹری آف انیٹ کے نام، 18 نومبر 1900ء

VIII۔ حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان نزاع

واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کے منظر عام پر آنے کے بعد وہ نزاع اور واضح ہو گئی جو ایک سماجی طاقت اور اس کی رعایا کے باہمی رشتوں کا لازمی جز ہوتی ہے۔ اس نزاع نے ایک اخلاقی سوال پیدا کر دیا۔ برطانوی حکومت کے پاس اس کا جواز کیا تھا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کرے۔

انگریزوں کا کہنا تھا کہ ہندوستان کوئی وجود نہیں رکھتا ہے۔ جسے ہندوستان کہا جاتا ہے وہ محض ایک جنرالیٹی اصطلاح ہے اور ایک ایسا علاقہ ہے جس میں کئی قبیلے، فرقے اور نسلیں، مذہبی سماجی اور تہذیبیں ملتی ہیں۔ انہیں ایک قدرتی سماجی یا اخلاقی اکائی نہیں کہا جاسکتا اور انگریزوں کو ان پر حکومت کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا ان سے پہلے حکمرانوں کا تھا۔ ان کے حق کی بنیاد بھی وہی تھی جو پچھلے فاتحین کے حقوق کی بنیاد تھی۔ یعنی تلوار۔ پچھلے فاتحین کی طرح انگریزوں نے بھی امن قائم کیا اور نظم و ضبط پیدا کیا۔ انہوں نے اس کے علاوہ بھی کچھ دیا یعنی ایک جدید حکومت جو قانون، عدالتی نظام اور اچھے انتظامیہ پر مشتمل ہے۔ قومی اتحاد کی عدم موجودگی میں حکومت کو تقریباً بیس بے ربط اور متصادم گروپوں کے سامنے ذمہ دار کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

مضبوطی کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھی ہوئی نوکر شاہی نے سماجی پہچان کو پوری طرح نہیں سمجھا اور ان کے چاروں طرف جو سماجی انقلاب ہو رہا تھا اس کو دیکھنے سے وہ قاصر رہے۔ ملک کے متعلق ان کا خیال تھا وہ ناقابلِ ترمیم مشرق ہے جہاں سفید فام لوگ حکومت کا بوجھ سنبھالتے ہیں اور آپس میں لڑنے والے راجاؤں مہاراجوں اور قبیلوں میں قانون کی عملداری قائم کرنے میں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ اعداد و شمار کا سہارا لیتے تھے کہ نئے انگریزی تعلیم پائے ہوئے طبقے کی اہمیت کتنی کم ہے۔ وہ پوچھتے تھے کہ کتنے ہندوستانی یونیورسٹی کا تجربہ رکھتے ہیں اور کس طرح یہ چھوٹا سا طبقہ لاکھوں کروڑوں بے زبان لوگوں کی خواہشوں کی نمائندگی کر سکتا ہے؟ شہر کے باسیوں یعنی وکیلوں، ایڈیٹروں اور کلرکوں اور چھوٹے چھوٹے ہزاروں گاؤں میں رہنے والے کسانوں اور دستکاروں کے درمیان ایک خلیج ہے۔ وہ عام لوگوں کی زندگیوں اور انکی ضرورتوں اور تکلیفوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں اور ان کی طرف سے بات کرنے کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ہندوستان کے سیاست دان وہ غرے دہراتے ہیں جو انہوں نے انگریزی کی کتابوں میں پڑھے ہیں اور جو ہندوستان کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ حالات کے متعلق اس قسم کے خیالات کی بنا پر نوکر شاہی بڑی حدت کے ساتھ کانگریس کی کاروائیوں کو بے معنی بکواس کہا کرتی تھی۔ وہ ہیوم کی اس وضاحت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ کانگریس وسیع تر جذبہ ایثار حقیقی عوامی جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے۔..... وہ زیادہ بڑے پیمانے، ہر نمائندہ اداروں کا مومن اور طریقوں سے ملک کو متعارف کرانا چاہتی ہے۔ ”نوکر شاہی کے منہ پر سر آکھیندہ کو لون نے پامیر کے کالموں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ بار بار آپ کے رسالے پڑھے اور ان میں مجھے ایسے ٹکڑے ملے جن میں برطانوی حکومت اور ہندوستان کے انگریز افسردہ لوگوں کے سامنے غیر انصاف پسند، ناواقفیت اندیش، جاہل اور اپنی کاروائیوں میں بے پرواہی کی حیثیت سے پیش کر کے ان کے غصے کا نشانہ بنایا گیا ہے۔.....

رو کیا آج کا ہندوستان جیسا کہ ہم اُسے جانتے ہیں یعنی وہ ہندوستان جو تعلیم حاصل کر رہا ہے وہ ہندوستان جسے اپنے کمزور عام لوگوں کے مفادات میں ایک باطندار انصاف کے سامنے جھکتا چلا، وہ ہندوستان جس میں سڑکوں اور ریلوں نے اتحاد پیدا کیا، وہ ہندوستان جو دنیا کی لول درجے کی تجارتی منڈیوں تک رسائی حاصل کر سکا، وہ ہندوستان جس میں مذہبی رولواری ہے، وہ ہندوستان جس میں برسوں تک مسلسل امن قائم رہا، وہ ہندوستان جس میں اخباروں کو آزادی حاصل ہے اور آخر میں وہ ہندوستان جسے پہلی دفعہ سکھایا گیا کہ حکومت کا مقصد ہے لوگوں کی بھلائی نہ کہ بادشاہ کا ذاتی مفاد، اس کا کوئی ذکر آپ کی تحریروں میں نہیں ملا..... ان رسالوں کے لیے کانگریس کے ناقدین پارٹی کے رہنماؤں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔“

ہندوستان کا جواب تھا کہ یہ ملک ایک تہذیبی اکائی ہے۔ جس میں ایک قدیم تہذیب غالب ہے اور کئی اقلیتوں کی تہذیبیں ہیں۔ یہ ایسی صورت حال ہے جو تاریخ میں عام طور سے دیکھنے میں آتی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس کا حجم اور پیمانہ بڑا ہے۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اُسے قوم کی حیثیت یعنی سیاسی اتحاد کا شعور بخش دیا تھا۔ کانگریس کے صدور نے بار بار اس پر زور دیا تھا غیر وز شہ مہتا نے 1890ء میں کہا تھا۔ ”کانگریس کے اراکین ان انسانوں کی طرح ملتے ہیں جن کی مشترکہ بنیاد قومیت ہے، جو حکومت کے ایک نظام کی بھلائی یا برائی سے متاثر ہوتے ہیں، جنہیں ایک سے حقوق حاصل کرنے اور ایک سے بوجھوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک سے عوامل حرکت میں لاتے ہیں..... یہ وجہ ہے کہ اس تنظیم کو انڈین نیشنل کانگریس کا نام دیا گیا ہے اور وہ اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کی خواہش مند ہے۔“ اس خیال کے مطابق انڈین نیشنل کانگریس اس شعور کی علامت اور منظم ادارہ تھی۔

IX۔ برطانوی پالیسیاں

(1) لیکن یہ دلیل انگریزوں کو مطمئن نہ کر سکی اور وہ ہندوستان کو ایک نام اور جغرافیائی اکائی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ محض اپنے سامنے ذمہ دار ہیں اور فیصلے کرنے اور پالیسیاں بنانے میں ہندوستانوں کی رائے لینے یا انہیں شریک کرنے کو وہ تیار نہیں تھے۔ فرانس کے کلونیل اسکول کے ایک اہم ممبر اور پرنسپل اور مشرقی مسائل کے طالب علم جیمز کاکہتا ہے کہ یورپ کی سامراجی طاقتوں کی اپنی ”نیوپالیسی“ تھی جس کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد تھا یورپ کے کارخانوں کے لیے سستے مزدور مہیا کرنا اور دوسرا تھا ”محکوم لوگوں کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ بدیہیوں کے اقتدار اور حکومت کو قبول کر لیں۔“ (2) باغداری کی صنعتیں یعنی نمل، پٹ سن اور چائے ایسے برطانوی کاروبار تھے جن میں سستے ہندوستانی مزدور کام کرتے تھے اور اس کے علاوہ ہندوستان میں برطانیہ نے جو حیثیت تعمیر کی تھی وہ انگلستان کی صنعتوں کے لیے ہندوستان کے سستے مزدوروں کے ذریعے خام مال پیدا کرنے کی ہمت افزائی کرتی تھی۔ دوسرے مقصد کو پورا کرنے کی کوشش ایک اچھی حکومت قائم کر کے اور محکوموں کے

احساسات کو سمجھ کر اور انہیں خوش کر کے کی جاتی تھی، چیلی کے مطابق اس مقصد کو حاصل کرنے میں انگریزوں کو بڑی کامیابی ہوئی۔ صرف ایک تعلیم یافتہ طبقہ ایسا تھا جس کی حمایت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اس کی تعداد بہت کم تھی۔ اور کسی بھی حالت میں وہ آبادی کے نو فی صدی سے زیادہ نہیں تھے۔

چیلی کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت نے بڑے طریقے سے ”نوپالیسی“ پر عمل کیا یعنی ایک ایسی حکومت قائم کر کے جو ان کے خیال کے مطابق اچھی ہو اور محکموں کے احساسات کا احترام کر کے ان کا خیال تھا کہ اس پالیسی کی بنا پر ان کی حکومت ہمیشہ قائم رہے گی اور لوگ ہمیشہ کے لیے ان کے اقتدار کو تسلیم کر لیں گے۔

اچھی حکومت کے معنی سمجھے جاتے تھے وہ حکومت جو امن و امان قائم رکھے، داخلی شورشوں کا سدباب کرے، جان و مال کی حفاظت کرے اور بیرونی حملوں سے ملک کو بچائے امن و امان کو قانون کے ضابطوں یعنی سول قانون اور تعزیرات ہند، سول اور فوجداری کے ضابطوں، قانون شہادت وغیرہ سے، سول سروسوں کی تنظیم سے، عدالتوں سے اور پولیس کے ذریعہ برقرار رکھا گیا۔

لیکن جس وقت حکومت کے یہ ضروری کام پورے ہو گئے تو انگریزوں کو حکومت کے فلاحی کاموں کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔ اس زمانے کے متعلق لکھتے ہوئے پرسیول اسپیر کہتا ہے ”حکومت ہندوستان کو تخلیقی کوشش یا ایک نئے عہد کے لیے تیاری کرنے کی دعوت کے بجائے اور زیادہ سفید فام لوگوں کا بوجھ سمجھا جانے لگا۔... دور رس امید کو پس پشت ڈالنے کے بعد صرف اتنا کام رہ گیا تھا کہ وہ امن بحال رہیں اور انصاف کریں، ترقی کے اقدامات کریں اور پیار کے ساتھ دیکھ بھال کریں۔“ (1) رپن کے رائٹز ہونے سے کرزن کے واپس بلائے جانے تک کے بیس سال میں حکمرانوں کا سب سے اہم مقصد تھا اس غیر ذمہ دار سامراجی حکومت کو برقرار رکھنا جس پر لوگوں کا اعتماد روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا اور جس کے خلاف قوم پرستانہ جذبہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔

(2) عام فلاح و بہبود کے مسائل۔

ایک ناگزیر عمل کے طور پر انگریز ہندوستانی معیشت کے بنیادی مسائل کو حل کرنے، سماجی اصلاح کرنے اور سیاسی ترقی کرنے کے بجائے اپنی حکومت کو برقرار رکھنے اور سامراجی مفادات کو فروغ دینے میں مصروف تھے۔ اور کانگریس کے اصرار اور جلدی کو تکلیف دہ امر سمجھ کر ٹال دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر لوگوں کی اس بہت بڑی تعداد کی حالت سدھارنے کے لیے جو کاشت کرنے میں مصروف تھے اس زمانے میں وہ جو کچھ کر سکتے وہ صرف اتنا تھا کہ شمالی ہندوستان کے زمینداری کے علاقے میں انہوں نے بنگال، پنجاب اور اودھ کے قوانین مال کے ذریعہ کسانوں کو کچھ راحت پہنچائی۔

اس کے بعد زمین کو علیحدہ کرنے کے قوانین بنا کر مہانتوں کے خلاف کسانوں کا کچھ تحفظ کیا گیا۔ لیکن اگر لیکچر کمیشن کی سفارشات منظور و نکر (1889ء-1890ء) کی رپورٹ اور کاشتکاری کے محکموں اور فارموں کے قیام کے باوجود ہندوستانی کاشت کو ترقی دینے کی انگریزوں کی کوششوں میں اتنا تذبذب اور بین تامل پایا جاتا تھا کہ اس میں زیادہ سدھار نہیں ہو سکا۔“

صنعت کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی ہندوستان کے پھوٹنے سے اور تذبذب سترہائے کو

صنعتوں میں لگانے کے لیے بہت افزائی نہیں کی جاتی تھی جیسا کہ ہے۔ بے ٹانگے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو صنعتیں صرف معرض وجود آگئی تھیں ان میں سے زیادہ تر انگریزوں کا کنٹرول تھا جیسے سوئی کپڑے کی صنعت، چائے کی صنعت، کوئلے کی صنعت، پٹ سن کی صنعت اور کانڈ کی صنعت۔ ریلوں اور جنگلات وغیرہ پر حکومت کا کنٹرول تھا، یہ صحیح ہے کہ ریلوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ 1900ء تک 25,000 میل ریل کی پڑی بچھائی جا چکی تھی لیکن اس قابل تعریف ترقی کے پس پشت دو عوامل کام کر رہے تھے یعنی برطانوی سرمائے کے لیے محفوظ اور منافع بخش اصل کاری کا موقع اور حکومت کی فوجوں کی ضروریات کو پورا کرنا۔ 1852ء کی مشہور روڈو میں ڈلہوزی نے ریلوں کے اصل فوجی رول کا ذکر کیا تھا (1) اور اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ انگلستان کو سمجھنی جانے والی کپاس کے برطانوی تجارت کو ملک کے اندرونی حصوں کی پیداواری کو دنیا میں برآمد کرنے اور برطانوی مال کے لیے نئی منڈیاں کھولنے میں اُن سے فائدہ ہوگا۔

ریلوں کے مقابلے میں آب رسانی کے ذرائع کو کم اہمیت دی گئی حالانکہ ایک کاشتکار کی کرنے والے ملک میں، جس کے بڑے بڑے علاقوں کو پانی کی ضرورت ہے اُس کی ضرورت اگر زیادہ نہیں تھی تو کم بھی نہیں تھی۔ صحت، صفائی، رہنے کے لیے گھروں اور زندگی کے عام حالت کو بہتر بنانے کی طرف اور بھی کم توجہ دی گئی۔ چنانچہ 1871ء سے 1911ء تک اگر ہندوستان کی آبادی میں کروڑوں سے بڑھ گئی ہوئی۔ شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ تعلیم کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ دوبارہ بتا دیا جانا چاہیے کہ 1885ء اور 1901ء کی درمیانی مدت میں خواندگی کے تناسب میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوا تھا۔

حکومت کو جمہوری بنانا یہ تھریکار ڈائجسٹی حکومت کا۔ حکومت خود اختیاری کو فروغ دینے کے لیے کیا کیا گیا؟ عظیم بغاوت کے بعد کی تین دہائیوں میں سامراجی حکومت میں جو لبرل وقفہ آیا وہ تھریکار کا چار سالہ دور حکومت جب حکومت خود اختیاری کو توسیع دینے کی کوشش کی گئی لیکن اُسے نوکر شاہی نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ہندوستان کے رجمناؤں کی یہ اپیلیں رد کر دی گئیں کہ ہندوستانوں کا سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر کیا جائے اور انتخابات کے ذریعے انہیں لیجسلیٹیو کونسلوں میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اگر ہندوستان کی حکومت مقامی حالات کے زیر اثر کچھ پیش قدمی کرنے کی ضرورت محسوس بھی کرتی تھی تو انگلستان کی حکومت اُن تجاویز کو رد کر دیتی تھی یا کوئی بڑی تبدیلی کے بغیر ”محکموں کو خوش کرنے کا کوئی طریقہ دریافت کر لیا جاتا تھا۔

لیجسلیٹیو کونسلوں میں ہندوستانوں کی شرکت کی کہانی بڑی افسوسناک ہے۔ جب 1831ء میں کونسلوں کی تشکیل نو کی گئی تو انہیں مشکل سی سے متفقہ کا نام دیا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ حقیقت میں حکومت کے ہاں میں ہاں ملانے والی کمپنیاں تھیں۔ مثال کے طور پر حکومت ہندوستان کی لیجسلیٹیو

(1) نقشہ پر ایک نظر ڈال کر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ہماری سلطنت کتنی بڑی ہے، کتنے مختلف طبقات اور مختلف اس میں شامل ہیں اور اُن مختلف مقامات کے درمیان کتنا فاصلہ ہے جہاں کبھی بھی ملے ہو سکتا ہے۔ اُن لوگوں میں اس قسم کی دشمنی کا مستقل ذخیرہ پایا جاتا ہے جن سے ان کی امید نہیں ہوتی یا ہے تھی۔ اس علاقے میں فوجوں کی معمولی نقل و حرکت میں وقت درہم پیہ اور جان کا بھتا ذخیرہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے پیش نظر سمجھا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ مصلحت کے لیے ایک نظام سے کتنے سیاسی فوائد اٹھائے جاسکتے ہیں جو آج کی، قذ کے مقابلے میں پانچویں صدی کے ساتھ ہر سال میں حکومت و اطلاعات پرچھا سکتا ہے۔ اور حکومت اس قابل بن سکتا ہے کہ وہ کسی بھی مقام تک فوجوں کا بڑا حصہ اتنے دنوں میں پہنچا، جتنے مہینوں میں آؤں پہنچتی ہے اور اتنی زیادہ جتنی آؤں پہنچتی ہیں۔ (ماری، 1900ء، ص 20) اپریل 1885ء، لندن، اٹل، (جوائی)، کار، ائی، 2NN، صف 815

کو نسل تو سبج اور لوگوں کو نسل تھی۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ممبروں کے علاوہ اُس میں چھ سے لے کر بارہ تک ایسے ممبر تھے جنہیں گورنر جنرل نامزد کرتا تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ اُن میں سے آدھے غیر سرکاری ہوں اُس کے کام محدود تھے۔ گورنر جنرل کی پیشگی اجازت کے بغیر وہ سرکاری آمدنی، قرضوں اور فوج کی طرح کے اہم امور پر غور نہیں کر سکتی تھی۔ گورنر جنرل کو درخواست ادا کرنے کا مطلق حق اور آرڈینیشن بنانے کا اختیار حاصل تھا۔ تاج کسی بھی ایکٹ کو منظور کر سکتا تھا اور ہندوستان کے لیے قانون بنانے کے پارلیمنٹ کے اختیار پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اُس کا دائرہ عمل کتنا محدود تھا اُس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ کونسل کے ساتھ انگلستان میں ایک آزاد لائیکیشن بھی کام کرتا تھا۔ جو اُن قانونوں کے مسودے تیار کرتا تھا۔ جنہیں لیجسلیٹیو کونسل منظور کرتی تھی وہ کتنی بے بس تھی اُس کا ثبوت 1876ء میں سوتی کپڑے کی درآمد پر دیونئی ختم کرنے کا واقعہ پیش کرتا ہے لارڈ میکڈنالڈ نے 1888ء میں کونسلوں کے متعلق یہ کہا تھا۔

”اُن لیجسلیٹیو کونسلوں کی نوعیت، جنہیں 1861ء کے ایکٹ کے تحت قائم کیا گیا تھا، صرف اتنی ہے کہ وہ قانون سازی کرنے کی کمیٹیاں ہیں۔ ایسی کمیٹیاں جن سے انتظامی حکومت اپنی قانون سازی میں مشورہ کرتی ہے مدد لیتی ہے۔“

جہاں تک اُس کے بنائے ہوئے قوانین کا تعلق تھا۔ اُس نے کہا ”لیجسلیٹیو کونسلوں میں جو قوانین بنائے جاتے ہیں انہیں حقیقت میں حکومت کے احکامات کہنا غلط نہیں ہوگا۔“ اُس نے مزید وضاحت کی ”کونسلوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ اُن قانونوں کے علاوہ جو اُس کے سامنے ہوں کسی اور موضوع پر بحث کریں۔ وہ شکایتوں کی تفتیش نہیں کر سکتی ہیں، اطلاعات حاصل نہیں کر سکتی ہیں۔ یا مجلسِ عالمہ کے کردار پر غور نہیں کر سکتی ہیں۔ انتظامیہ کے کام پر گرفت نہیں کی جاسکتی ہے یا اُن کی ان اسامیوں میں صفائی پیش کی جانی چاہیے جب تک کہ ان کا تعلق اُن اقدامات سے نہ ہو جس پر بحث کی جا رہی ہو۔“ (D)

ان کونسلوں میں بالائی طبقوں کے لوگوں کو داخل کیا جاتا تھا جیسے راجے، نواب، امرا، زمیندار، مالدار تاجر، وکیل اور رجعت پسند اخباروں کے وفادار اذیت۔ اُن کی رکنیت کے متعلق یہ کہنا مذاق معلوم ہوتا ہے کہ ”اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لینے کے ہندوستانیوں کے حق کو تسلیم کر لیا گیا۔“

کونسلوں کی اصلاح پر تیس سال تک ہندوستانی زور دیتے رہے۔ اتحاد اور کام کے اعتبار سے کونسلوں کی توسیع اور لوگوں کے منتخب نمائندوں اور اُن طبقوں کے لوگوں کو ان کے ممبر بنانے کے متعلق کانگریس سال بہ سال تجاویز پاس کرتی رہی جو اس حق پر سمجھ داری اور آزادی کے ساتھ عمل کر سکیں۔ اُس نے مشورہ دیا کہ صوبائی کونسلوں کے ممبروں کو میونسپلیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، چیئرمین آف کامرس اور یونیورسٹیوں کے ممبر منتخب کریں یا راء دہندگان کے ایسے ادارے کریں جو اُن لوگوں پر مشتمل ہوں جنکے پاس اتنی تعلیم یا مالک ہو جو ضروری سمجھی جائے اور گورنر جنرل کی لیجسلیٹیو کونسل کے ممبروں کو صوبائی کونسلوں کے ممبر منتخب کریں۔ کلکتہ کی انڈین ایسوسی ایشن کی طرح کی سیاسی جماعتوں نے میٹنگیں اور کانفرنسیں کر کے حکومت کی توجہ کو کونسلوں کی تشکیل نو کی ضرورت اور اہمیت پر دلائی۔

ہندوستان کے اخباروں نے راءِ عامہ کا اظہار کیا جو کونسلوں کو ہندوستانیوں کے ساتھ مذاق اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش سمجھتی تھی اور اس کو پوری طرح بدلنے کے لیے حکومت پر زور دیا

جیمبر آف کامرس اور دوسرے عوامی اداروں میں یہ مانگ کی۔

کونسل کے سوال پر ہندوستانیوں کے احساسات کی شدت سے ڈفرن متاثر ہوا تھا ہندوستانی ممبروں کے لیے انتخاب کے اصول کو تسلیم کرنے کے لیے اس نے سکرٹری آف اسٹیٹ کے سامنے تجاویز رکھیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا ”ہندوستان کی اعلیٰ پامائت حکومتوں کے لیے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کہ وہ اس اختیار کے کسی بھی ضروری حصے سے دست بردار ہو جائیں جو ان بہت سی قومیتوں پر، جن میں سے زیادہ تر تہذیب اور روشن خیالی کے اعتبار سے بہت زیادہ پس ماندہ ہیں، حکومت کرنے والی طاقت کے طور پر ہمارے وجود کے لیے ضروری ہیں۔“ (1) لیکن اسکے مطابق وقت آگیا تھا کہ اپنے (حکومت کے) ساتھ انتظامی معاملات میں ایسے لوگوں کی معقول تعداد کو شریک کر کے دستور کی ترقی میں ایک قدم بڑھایا جائے جو تعلیم یافتہ طبقے میں سے ”منتخب یا سحر د“ کئے جائیں اور ہندوستان کی رائے عامہ کے بڑے حصے سے رابطہ پیدا کر لیں اور اس طرح ان ذرائع کی تعداد بڑھائیں جن کے ذریعہ وہ ان مختلف فرقوں کی ضروریات و احساسات کو معلوم کر سکیں جن کی بھود کی ذمہ داری ان پر ہے۔ (2)

اس سے ظاہر ہے کہ کونسلوں کو توسیع، ان کے کاموں کی توسیع اور جزوی طور سے انتخاب کے اصول کو تسلیم کرنے کا مقصد اختیارات دینا یا نمائندہ حکومت قائم کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد تھا ہندوستان کی رائے عامہ کے متعلق اطلاع حاصل کرنے کا ایک ذریعہ حکومت کو مہیا کرنا۔

جس وقت سکرٹری آف اسٹیٹ اور گورنر جنرل میں دستور کی جن تجویزات پر بحث ہو رہی تھی۔ ہندوستان کی توقعات سے دلچسپی رکھنے والے مسٹر ریڈ لانے انڈین نیشنل کانگریس کی درخواست پر 1890ء میں ہاؤس آف کامنز میں ایک بل پیش کیا جس کا مسودہ کانگریس کی اسکیم کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ اس نے حالات کی رفتار تیز کر دی اور برطانوی حکومت نے ایک بل پاس کیا۔ جلد ہی اُسے 1892ء میں کرزن نے ہاؤس آف کامنز میں پیش کیا۔ کرزن اس وقت انڈر سکرٹری آف اسٹیٹ تھا۔ اس بل کے مقاصد مندرجہ ذیل بتائے گئے تھے (1) اسی اصول کو تسلیم کرنا کہ (الف) تمام کونسلوں میں مالیاتی تنقید کی جاسکے، (ب) سوالات کئے جائیں اور (ج) کونسلوں کے ممبروں کی تعداد بڑھائی جاسکے۔

حالانکہ کرزن نے کہا تو یہ تھا کہ کونسلوں کے کاموں میں اضافہ کیا جائے گا اور حکومت کے کاموں میں حصہ لینے کے مواقع فراہم کئے جائیں گے لیکن اس کے حقیقی معنی تھے بالائی طبقے کے ایک نتیجہ چھوٹے سے حصہ کی خواہشات اور احساسات سے حکومت کو باخبر رکھنے کے ذریعے میں اضافہ کرنا، کرزن نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی اُس سے یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ حکومت واقعی شریک لڑنے یا نمائندہ حکومت کی بڑھنے کا کوئی ادارہ نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہندوستان لے کروڑوں ناخواندہ ”بے زبان لوگوں کے لیے نمائندہ حکومت کا کوئی نظام نہیں بنایا جاسکتا ہے۔“ (3)

(1) مجلس داخلہ (عوامی)، کانفرنس کی روداد، دسمبر 1889ء، نمبر 301، دستور کی اصلاحات پر لارڈ فرن کی روداد، سکرٹری آف اسٹیٹ کو بھیجے جانے والے مراسلے کے ساتھ بھیجی گئی۔ 16 نومبر 1888ء،

(2) ایضاً

(3) ہاؤس آف کامنز میں لارڈ کرزن کی تقریر، 28 مارچ 1892ء۔ دیکھیے سٹری، اے۔ سی۔، ہندوستانی دستور کے متعلق

ایک دلچسپ بحث کے بعد جس میں پارلیمنٹ کے کئی ممبروں نے کانگریس کے نقطہ نظر کی وضاحت کی، لیکن وہ حکومت کو مطمئن نہ کر سکے، بل منظور کر لیا گیا اور 1892ء کا انڈین کنسلرایٹ قانون بن گیا۔ انتخاب کے اصول کے بارے میں ایکٹ میں کچھ نہیں کہا گیا اس لیے کہ حکومت اس کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھی اس کے بجائے گورنر جنرل آف کنسل کو اختیار دیا گیا کہ وہ سرکاری آف اسٹیٹ کے مشورے کے ساتھ مزید ممبروں کی نامزدگی کے شرائط کے تعلق سے ضابطے بنائے (جن کی تعداد 12 سے بڑھا کر 16 کر دی گئی تھی) ان ضابطوں کی رو سے 16 مزید ممبروں میں سے زیادہ سے زیادہ اس نامزد ممبر غیر سرکاری ہو سکتے تھے تاکہ سرکاری ممبروں کی اکثریت باقی رہے، ان میں سے چار ممبر چار صوبائی کونسلوں کے غیر سرکاری ممبروں کی سفارش پر نامزد کئے جاتے تھے، ایک کو گلگت چیئرمین آف کالرس کی سفارش پر نامزد کیا جاتا تھا، ایک یو جیمس فور اپنے اس کلرامے سے اتنے خوش تھے کہ وہ اُسے ”دستور میں انقلاب“ سے تعبیر کرتے تھے۔

سوالات کرنے اور بحث پر بحث کرنے کا حق دیکر کونسلوں کے کاموں میں اضافہ کیا گیا۔ حالانکہ انہیں بحث پر ووٹ دینے کے حق سے محروم رکھا گیا تھا۔ امپیریل لیجسلیٹیو کونسل میں 2 فروری 1893ء کو تقریر کرتے ہوئے لارڈ لینس ڈاؤن نے کہا تھا ”ان کونسلوں کے کرداروں میں ہم بڑی تبدیلی کر رہے ہیں۔“ (1) اس نے انتخاب کے اصول کو رد کرنے کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ”ہندوستان کے بہت سے حصوں میں انتخاب کا کوئی نظام وہاں کے لوگوں کے احساسات اور عادات کے منافی ہے اور اگر ہم اس قسم کے نظام کو چلیں دیں تو اس کے تحت شاید کوئی نمائندہ شخصیت سامنے آ سکے۔“ (2) حکومت کا مقصد تھا کہ ”ان کونسلوں کے لیے ایسے ممبروں کی خدمات حاصل کرے جو واقعی نمائندہ ہوں لیکن جو علاقوں اور تعدادوں کے بجائے قسموں اور طبقوں کی نمائندگی کریں۔“ (3)

چنانچہ 1891ء کے کنسلرایٹ نے فرقہ وارانہ نمائندگی کے بیج بو دیئے۔ جب دستور کی ترقی کے دوسرے قدم کا سوال حکومت کی توجہ کا مرکز بنا تو ان بیجوں سے پودے پھوٹنے لگے۔ خود ایکٹ ہندوستان کی توقعات سے بہت کم ثابت ہوا۔ انتخاب کے اصول کی نفی اور بحث پر بحث اور سوال کرنے کے محدود مواقع کی بنا پر ہندوستان کی رائے علامتہ کو مایوسی ہوئی اور وہ ایکٹ پر نظر ثانی کرنے کا مطالبہ کرنے لگی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

X۔ ملک کی اخلاقی اور مادی ترقی پر بحث

(الف) برطانوی صفائی

حکومت خود اختیاری یا اچھی حکومت کے متعلق اگر کوئی رائے قائم کرنی ہے تو وہ اس کے نتائج کی بنا پر قائم کرنی چاہیے یعنی لوگوں کی مادی اور اخلاقی ترقی کی بنا پر ماضی میں اس سوال پر ہندوستان کے قومی رہنماؤں اور برطانوی حکومت کی وکالت کرنے والوں کے درمیان بڑی بحث ہوئی ہے۔

(1) لارڈ کونسی آف لینس ڈاؤن کی تقریریں، جلد دوم، ص 515

(2) ایضاً، تقریر، 16 مارچ 1892ء، ص 535، (3) ایضاً صفحہ 536

برطانوی مصنفین میں سے ہاسن کی طرح کے کچھ سامراجیت کے مخالفوں اور ڈیجی کی طرح کے ہندوستان کے حامیوں نے اور ماضی قریب میں جان اسٹریچی اور پارسے دت کی طرح کے مارکسوایوں نے خود اپنے ہموطنوں کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ برطانوی حکومت کی وکالت کرنے والوں کا خیال ہے کہ برطانوی حکومت میں ہندوستان کے لوگوں کی فی الجملہ مادی خوشحالی بڑھی ہے۔ حالانکہ عام غربت و افلاس اب بھی پایا جاتا ہے دوسری طرف لوگ اتنے ہی وثوق کے ساتھ کہتے تھے کہ انگریزوں سے پہلے کے زمانے کے مقابلے میں غربت و افلاس میں اضافہ ہوا ہے۔

زیر بحث مدت میں ہندوستان میں جو معاشی حالات پائے جاتے تھے اُن کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ اُن دلیلوں کی تکرار کے بغیر اب ضرورت اس کی ہے کہ معاشی حالات کے متعلق خیالات کا تجزیہ کیا جائے اور اُس زمانے کی سیاسی تحریک پر اُن کے اثر کا جائزہ لیا جائے۔

برطانوی حکومت کے حامیوں کے صحیح خیالات کی ترجمانی وہ کتابیں کرتی ہیں جنہیں جارج جینی، جان اور رچرڈ اسٹریچی، رچرڈ فیل، بے۔ ڈی۔ ایس، لوف فریزر، برسویل گرینٹھس اور دوسرے رٹائرڈ حکام نے لکھا تھا۔ ان کے علاوہ گورنمنٹ کے شائع کردہ بیانات، یادداشتیں اور رپورٹیں ہیں جو مختلف سیاسی مسائل کے تعلق سے اُس کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتی ہیں۔ ان تحریروں سے ہندوستان کے برطانوی حاکموں کے ذہنوں کا اظہار ہوتا ہے۔

اسٹریچی برادران نے 1882ء میں لکھتے ہوئے بتایا تھا ”اُس تمام کام (امور علانہ) کی تکمیل اور اس پر کئے جانے والے خرچ نے، جو اتنا بڑھ گیا ہے کہ اُس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، ہندوستان کے لوگوں کی دولت اور سہولت میں اضافہ کر دیا ہے۔“ (1) انہوں نے مزید کہا ”یہ واقعہ کہ ہندوستان اتنی تیزی کے ساتھ جس سے زیادہ تیزی کے ساتھ کوئی ملک نہیں بڑھ سکتا تھا، علم، دولت اور ترقی کے دوسرے شعبوں میں آگے بڑھا ہے۔ میری رائے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔“ (2)

جینی نے اپنی کتاب ہندوستانی سیاسی نظام میں، جس کا پہلا ایڈیشن 1868ء میں شائع ہوا تھا، 1894ء میں لکھا تھا ”جہاں تک مادی پہلو کا تعلق ہے ہندوستان پہلے کی کسی بھی ریاست کے مقابلے میں اب غیر معمولی طور سے خوش حال ہے۔ کوئی بھی جانچ کا طریقہ اختیار کیجئے چاہے وہ داخلی اور خارجی تجارت ہو، اشیاء کی زیادہ پیداوار اور ان کا صرف ہو، قیمتی دھات کا ذخیرہ ہو یا سب سے بڑھ کے ریلوں کے ذریعہ زیادہ تر ہو ہندوستان، جو برطانوی معیار کے مطابق اب بھی ایک بہت غریب ملک ہے، مقابلتاً اتنا دولت مند کبھی نہیں تھا جتنا آج ہے۔“ (3)

بی۔ ڈی۔ ایس نے، جو اُس زمانے کے قریب قریب آخر میں، جس کا جائزہ اس جلد میں لیا گیا ہے، گورنر جنرل کی کونسل کا مزید ممبر تھا، ہندوستانی قانون کی دلیلوں کے ذریعے خود پرانے اڑانے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا۔ ”ان لوگوں نے، جو میری طرح تیس سال پہلے ہندوستان کو جانتے تھے، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ موجودہ صدی میں زیادہ اونچا معیار راحت وہاں پایا جاتا ہے۔ یعنی بھر کپڑے، بہتر مکانات، مٹی کے

(1) اسٹریچی، جے اور اسٹریچی، آر۔ ہندوستان کی مالیات اور امور علانہ، 1882ء، صفحہ 8

(2) ایڈیشن صفحہ 12

(3) جینی، جی۔ ہندوستانی سیاسی نظام، (1894ء)، صفحات 394-391

برتنوں کے بجائے جیل کے برتن وغیرہ جو زیادہ آہنیوں اور بہتر حالات کی غازی کرتے ہیں۔“ (1)
 سرکاری بیانات میں لارڈ لائٹس کی بات دہرائی جاسکتی ہے اس نے کہا ”بلا خوف تردید کیا جاسکتا
 ہے کہ عام لوگ زیادہ خوشحال ہیں اور اتنے خوش ہیں جتنے کسی ہندوستانی حکمران کے دکان میں کبھی
 نہیں رہے۔“ (2) ڈفرن نے 1887ء میں ”آبادی کے نچلے طبقوں کے حالات“ کی خفیہ تفتیش کروائی تھی۔
 اُس کی رپورٹ بہت بری تھی لیکن حکومت ہندوستان نے اس کے متعلق جو قرارداد شاخ کی تھی اس میں کہا
 گیا تھا ”عام برسوں میں ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“ (3)
 تیسری دس سالہ اخلاقی اور مادی ترقی کی رپورٹ (1891-92ء) میں کہا گیا تھا کہ ”مادی اعتبار
 سے ایک کسان کی عام حالت ایسی ہے جس میں اُس معیار کے اعتبار سے، جو رفتہ رفتہ برابر بڑھ رہا ہے، اُس
 کے پاس کافی وسائل ہیں۔“ (4)

حقیقی تنظیمیں یا حکومت کے ممبروں کے بیانون میں سکرٹری آف اسٹیٹ فی ری فاؤنڈر کا بیان
 پیش کیا جاسکتا ہے جس نے 15 اگست 1894ء کو ہاؤس آف کامنز میں کہا ”میں جس سوال پر غور کرنا چاہتا
 ہوں وہ یہ ہے کہ کیا اس حکومت نے، جو اس وقت اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ہندوستان میں پائی جاتی ہے،
 ہندوستان کے لوگوں کی عام خوشحالی میں اضافہ کیا یا نہیں اور یہ کہ برطانوی تاج کے ایک صوبے کی حیثیت
 سے ہندوستان پہلے سے بہتر ہے یا بدتر۔ یہ ہے اصل جانچ۔“ اس سوال کا جواب اس نے یہ دیا ”وہاں بہت
 افلاس پایا جاتا ہے لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ برطانوی حکومت میں وہ افلاس بڑھنے کے بجائے کم ہوا ہے۔“ (5)
 اس نے مزید کہا ”لیکن ہندوستان کے افلاس کو برطانوی حکومت کی دین کہنے کا جہاں تک تعلق ہے واقعات
 برعکس صورت پیش کرتے ہیں۔“ (6)

(ب) ہندوستانیوں کا جوابی حملہ

ہندوستان کے برطانوی حکمران اپنے کارناموں سے بظاہر مطمئن تھے اور جو لوگ حکومت کی
 خامیوں اور برطانوی حکومت کے معاشی نتائج کی طرف اشارہ کرتے تھے اور سامراج کے چہرے کے
 دوسرے پہلو کو بے نقاب کرتے تھے انہیں وہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

بدیہی حکومت کی خرابیوں کو پوری طرح سمجھنے میں ہندوستان کے دانشوروں کو وقت
 لگا۔ بڑی مدت تک اٹھارہویں صدی کی خانہ جنگیوں، بد نظمی اور طوائف السلوک کی یاد میں انہیں ستاتی رہیں
 اور انہیں جو بھی نقصان ہوئے اُن کے مقابلے میں امن و امان اور باضابطہ حکومت کے قیام کے فوائد انہیں

(1) ایس، بی، ڈی، حقیقی ہندوستان (1908ء)، صفحہ 327

(2) مٹرینگی۔ بے، ہندوستان، صفحہ 365

(3) حکومت ہندوستان کی روداد 19 اکتوبر 1888ء۔

(4) بیان جس میں 1891-92ء اور اُس سے پہلے کے نو برسوں میں ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی اور حالات کو ظاہر کیا گیا

(1894ء)، صفحہ 427

(5) نمبر 3، چوتھا سلسلہ، جلد XXXIII، 1894ء، صفحات 1135 اور 1139

(6) ایسا صفحہ 1139

زیادہ معلوم ہوتے لیکن حکومت کی منفی پولیسی کی طرح کے کام چاہے کتنا ہی مہارت اور قابلیت کے ساتھ سرانجام کیوں نہ دیتے جائیں وہ ہمیشہ کے لیے محکموں کو مطمئن نہیں کر سکتے ہیں۔ ان کی خودداری کا تقاضہ ہوتا ہے کہ انہیں بے جان چیزیں نہ سمجھا جائے جن کی خواہشات، توقعات اور تصورات کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں اور حکومت کے فیصلوں کے تعین میں کوئی رول ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن جب صرف اتنا ہی نہیں کیا جاتا ہو کہ ان کی خواہش کو پوری طرح نظر انداز کیا جائے بلکہ ان کے مادی مفادات قربان کئے جائیں اور ان کے عزائم کا خون کیا جائے تو اس حالت میں بے چینی اور بے اطمینانی کا پیدا ہونا اور اچھے انتظامات کے فوائد کے تعلق سے جذبہ احسان مندی کا ختم ہو جانا ضروری ہوتا ہے۔

1857ء کی بغاوت کے فوراً بعد یہ خیال جڑیں پکڑنے لگا کہ اس کے باوجود کہ وہ ماضی کے مطلق العنان حکومتوں سے بہتر ہے اور ہر حال میں اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے ادراک کی بد نظمی کے مقابلے میں زیادہ قابل مقبول ہے پھر بھی برطانوی حکومت لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں ناکام رہی ہے۔ چنانچہ برطانوی حکومت کے فوائد کو تسلیم کرنے، برطانیہ کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے کی خواہش کی تصدیق اور برطانوی تاج کے ساتھ و قاداری کے اعلان کے باوجود ہندوستان کے رہنماؤں کو ضروری معلوم ہوا کہ شکایتوں کی طرف حکومت کو توجہ دلائی جائے۔ انہیں امید تھی کہ لبرل، بہن رکھنے والے حکمرانوں کو جو ہی ان کا علم ہو گا وہ انہیں دور کر دیں گے۔ انہیں بالکل یقین تھا کہ برطانوی حکومت مفید ہے لیکن اُس میں چند سیاسی اور معاشی خامیاں ہیں۔ سیاست کی حد تک دو اہم خامیاں تھیں، حکومت کی کونسلوں میں عوامی آواز کی عدم موجودگی اور اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کا تقرر نہ کیا جانا معاشی میدان میں بنیادی شکایت تھی ہندوستان کا افلاس جو بہت کم قومی اور انفرادی آمدنیوں سے، قحطوں سے، کسانوں کے قرضے سے، زندگی کی کم مدت سے اور زیادہ شرح اموات وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ عام طور سے سمجھا جاتا تھا کہ افلاس کی ایک اہم وجہ تھی ہندوستان سے دولت کا نکاس۔

(ج) دادا بھائی نوروجی کی تنقید

حکومت کی معاشی پالیسیوں کے باجرات اور

نذر ناقد تھے دادا بھائی نوروجی۔ 1825ء میں وہ پارسی مذہبی رہنماؤں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور بمبئی کے لفسن انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم پائی تھی۔ 1845ء میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ دس سال تک ایک استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1855ء میں وہ تجارت کے پیشے میں داخل ہوئے اور لندن کی کالابنز کو کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کے لیے انگلستان گئے۔ 1874ء میں وہ برودا کے مہاراجہ کے دیوان ہو گئے لیکن برطانوی ریونیوٹ کے ساتھ اختلاف کی بنا پر انہیں اس عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ وہ انگلستان واپس چلے گئے اور بقیہ زندگی خدمت خلق میں گذاری۔

دادا بھائی نوروجی نے لندن میں 1867ء میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے جلسے میں ایک مضمون پڑھا تھا جس کا عنوان تھا ”ہندوستان کے تعلق سے انگلستان کے فرائض“ اس میں انہوں نے یہ سوال کیا تھا کہ ”ہندوستان میں برطانوی حکومت کیا ہندوستان اور انگلستان کے لیے مفید ہے۔“ اور اُس کے جواب میں

کہا تھا ”لیکن اب (برطانوی حکومت) جو ملک کا خون مسلسل چوسا جا رہا ہے اس لیے اُس کی طاقت کا کم ہونا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو مستقل سدھار کئے جا چکے ہیں یا مساوی وسائل میں آئندہ کئے جائیں گے وہ اُس کو اتنا صحت مند بنادیں جیسے وہ چلے تھا۔“ (1)

ان جملوں میں انہوں نے ہندوستان کے افلاس، دولت کے نکاس اور اُن کے باہمی قریبی رشتوں کے مسائل پیش کئے۔ اپنی پوری زندگی وہ اُن مسائل کی جزیات پر غور کرتے ہیں اور جوں جوں اُن کا مطالعہ گہرا ہوتا گیا اور بدلی حکمران کا سنگین جرم کھٹا گیا وہ دیکھنے والے ہندوستان کے فوائد کے لیے جذبہ احسان مندی ختم ہوتا گیا۔ 1873ء میں انہوں نے پارلیمنٹ کی اُس سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دی جسے ہندوستانی مالیات کی صورت حال کے متعلق تفتیش کرنے کے لیے تقرر کیا گیا تھا۔ اور 1876ء میں اُنہوں نے ”ہندوستان کے افلاس“ پر اپنے مشہور پرچے کا سودہ ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کی بمبئی شاخ کے سامنے رکھا جس میں اُنہوں نے ہندوستان کی بد قسمتی کی ذمہ داری نکاس پر ڈالی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

”ہندوستان کے مفادات کو نظر انداز کرنے اور انگلستان کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے اُنہیں تابع بنانے کی حکومت کی اس غیر فطری پالیسی کی بنا پر پوری حکومت غلط، غیر فطری اور خود کشی کے راستے پر چل رہی ہے۔“ (2)

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے معاشی پہلو کے متعلق اُن کی رائے بہت خراب تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

”افسانہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جان و مال محفوظ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔“
جان و مال کی حفاظت صرف ایک نئی کریا ایک طریقے سے ہے یعنی منفی لوگ ایک دوسرے کے تھک دیا ہندوستان مطلق العنان حکمرانوں کے تھک دے محفوظ ہے۔ اس حد تک واقعی جان و مال کی حفاظت ہے۔ اور اس کے لیے ہندوستان اپنے جذبہ احسان مندی سے کبھی انکار نہیں کرتا ہے۔ لیکن انگلستان کی اپنی کُرفت سے مال کی حفاظت بالکل نہیں ہے اور اُس کے نتیجے میں جان کی حفاظت بھی نہیں ہے۔ ہندوستان کا مال محفوظ نہیں ہے۔ جو چیز محفوظ اور بہت زیادہ محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ انگلستان بالکل محفوظ ہے اور پوری حفاظت کے ساتھ ہندوستان میں رہ کر اور ہندوستان سے باہر لے جا کر موجودہ شرح کی رو سے تقریباً 3,00,00,000 یا 4,00,00,000 پاؤنڈ سالانہ ہضم کر جاتا ہے۔

”چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جیسی کے انگریزی حکومت ہے (ویسی نہیں جیسی وہ ہو سکتی ہے یا اُسے ہونا چاہیے) اُس کی پالیسی ایک مسلسل فروں تراور روز افزوں بدلی حملہ ہے جو رفتہ رفتہ سبھی مگر ملک کو بالکل تباہ کر رہا ہے۔“

”لیکن ہندوستان میں برطانوی حکومت کی موجودہ صورت حال نے ایک اور قابل افسوس خرابی کو جنم دیا ہے جس سے پچھلے بدترین بدلی حملے پاک تھے وہ یہ کہ 3,00,00,000 یا 4,00,00,000 پاؤنڈ سالانہ کی حد تک ملک کی باہمی دولت کے ساتھ یہاں کا اعلیٰ ”فہم“ بھی باہر جا رہا ہے۔“
”اس لیے میں یہ عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہندوستان میں جان و مال کی حفاظت

(1) (ادو ایمائی نور وہی، مضامین، تھاریر وغیرہ جس کی تہذیبی۔ اہل پارکھ نے کی، صفحہ 31)

(2) (ادو ایمائی نور وہی، افلاس، اور ہندوستان کی غیر برطانوی حکومت (1901) صفحہ 125)

نہیں ہے اور اس کے علاوہ ”علم“ اور ”فہم“ کی حفاظت بھی نہیں ہے کروڑ ہندوستانوں کے لیے زندگی کے معنی ہیں۔ ”آدھے پیٹ روٹی کھانا“ یا قاتے لڑنا نقطہ اور بیماریاں۔“ (1)

دولت کے نکاس کے بارے میں اپنی دلیل کی حمایت میں انہوں نے سلیسہ کی کا قول پیش کیا۔ سلیسہ کی کے اعتراف کے مطابق ”ہندوستان کے معاملے میں نقصان (معیشت کو) بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں سے اتنی آمدنی کسی راست معاوضے کے بغیر برآمد کی جاتی ہے۔ چونکہ ہندوستان کی نقد لینا ضروری ہے اس لیے نشتر جسم کے اُن حصوں میں لگایا جانا چاہیے جہاں خون جمع ہے یا کم از کم کافی ہے۔ اور اُن حصوں میں نہیں (کسانوں میں) جو خون کی کمی کی بنا پر خود ہی کمزور ہیں۔“ (2)

جس زمانے میں یعنی کمیشن کا اجلاس ہو رہا تھا اور گویا لکھنؤ، دہلی اور ممبئی میں سریندر برنجی اور سبرافیا ایئر شہادت دینے کے لیے انگلستان گئے تھے دادا بھائی نوروجی نے اُس موقع کو پورے انگلستان میں ”پلیٹ فارم کی جدوجہد کرنے کے لیے استعمال کیا تاکہ انگلستان کے عام لوگوں کے سامنے ہندوستان کی شکایتیں رکھی جاسکیں۔ اس جدوجہد کے اختتام پر لندن انڈیا سوسائٹی کی سرپرستی میں 28 دسمبر 1897ء کو تجویز منظور کی گئی تھی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ دادا بھائی نے چالیس سال تک حکمرانوں کو غلط اور غیر برطانوی راستے سے ہٹانے کی جو ناکام کوشش کی تھی اُس نے انہیں کس حد تک مایوس کر دیا تھا۔

تجویز ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

”یہ کہ ہندوستان پچھلی دہائیوں سے جن شدید دکھوں کا سامنا کر رہا ہے اور جن میں ادھر حال میں افسوسناک نقطوں اور طاعون کا، جو روز افزوں غربت و افلاس کے نتائج میں اور اہمقانہ سرحدی جنگ کا اضافہ ہو گیا ہے جس میں پورے پورے گاؤں کو تباہ کرنے کی وحشیانہ حرکتیں کی گئیں۔ جو کسی بھی قوم اور قومیت کے ساتھ برطانوی تہذیب کے لیے باعث شرم ہونی چاہیے اس کے علاوہ بغاوت کے لیے اہمقانہ مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہندوستانوں کی بے وفائی کے متعلق جاہلانہ چیخ و پکار کی جارہی ہے ہندوستانوں کی اخباروں کی آزادی کم کی جا رہی ہے اور حکومت میں مطلق العنانیت سے کام لیا جا رہا ہے جس کا عام معیار کارکردگی گر رہا جا رہا ہے۔ ان کی اور دوسری چھوٹی چھوٹی خرابیوں کی وجہ سے ہے حکومت کا غلط اور غیر برطانوی نظام جس کی وجہ سے مسلسل ملک کا خون چوسا جا رہا ہے اور جس کو ایسے سیاسی مکر و فریب اور مسلسل بہانوں سے برقرار رکھا جا رہا ہے۔ جو برطانوی وقار اور نام کے منافی ہیں اور برطانیہ کے لوگوں اور بادشاہ کی خواہش کے خلاف ہیں یہ کہ اگر موجودہ غلط اور غیر برطانوی نظام حکومت کو سدھار کے صحیح اور حقیقی برطانوی نظام میں تبدیل نہیں کیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ ہو گا ہندوستان کی تباہی اور برطانوی حکومت کا زوال۔“

بار بار کی ناکامیوں اور ہندوستان میں بڑھتی ہوئی کشیدگی نے دادا بھائی کو 1898ء میں اس نتیجے پر پہنچا دیا ”حکومت فیض رسانی کے قریب کے نقاب اپنے چہرے سے ہٹا رہی ہے اور دوسری طرف لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک فطری امر تھا کہ وہ اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں حکومت کے پرامن ارتقا کا بدلہ تھا دھاکا۔ انہوں نے لندن انڈیا سوسائٹی میں ایک اجتماع میں یکم جون 1904ء کو کہا تھا۔

(1) دادا بھائی نوروجی، مضامین، تقریریں، خطبہ وغیرہ جن کی سی۔ ایل۔ یارکھ نے تدوین کی صفحات 484-485۔

(2) دہلی، ص 26، تاریخ 1875ء۔

”موجودہ (۱) بے عزتی، ذلت اور تباہی کے نظام کا جنی اُس نظام کا محض ایک علاج ہے جس کا اثر پر امن ارتقا کے ذریعے تدارک نہ کیا گیا تو وہ سلطنت کو توڑ کے رکھ دے گا۔ وہ علاج ہے برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے تحت حکومت خود اختیاری کا قیام جب یہ بنیادی غلطی دور ہو جائے گی تو موجودہ نظام کی تمام دوسری خرابیاں اور خامیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔“ (۲)

کانگریس کے ۱۹۰۶ء کے کلکتہ اجلاس میں، جب کرزن کی اُن پالیسیوں کی بنا پر جذبات بھڑکے ہوئے تھے جن کا نتیجہ بنگال کی تقسیم کی صورت میں سامنے آیا، انہوں نے سوراج کا مطالبہ کیا اور ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ مل کر کام کریں انہوں نے کہا۔

”متحد ہو جائیے، ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کیجئے اور خود اختیاری حاصل کر لیجئے تاکہ اُن لاکھوں کروڑوں انسانوں کو بچایا جاسکے جو غربت، قحط اور طاعون کا شکار ہو رہے ہیں اور جنہیں پیت بھرونی بھی نصیب نہیں ہوتی ہے اور ہندوستان ایک دفعہ پھر دنیا کی متقدم قوموں میں اپنی قدیم باعزت حیثیت حاصل کرے۔“ (۳)

دادا بھائی نوروجی کی عملی زندگی اُنیسویں صدی کے نصف آخر پر پھیلی ہوئی تھی ہندوستان میں سامراجی حکومت کے تعلق سے اُن کے خیالات و جذبات میں جو تبدیلی رونما ہوئی اُن میں اُس تبدیلی کے انعکاسات دیکھے جاسکتے تھے جو رائے عامہ میں پیدا ہو رہی تھی ابتدا میں برطانوی حکومت کے فوائد اور ہندوستان کو تباہی سے بچانے کے اُس کے خداداد مقصد پر زور دیا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا احساسات میں تبدیلی آتی گئی۔ اور صدی کے آخر تک حکومت کے موجودہ نظام کو ختم کرنے اور حکومت خود اختیاری قائم کرنے کا خیال لوگوں کے ذہنوں میں جاگزیں ہو چکا تھا۔

شانداز بزرگ دادا بھائی نوروجی کی شخصیت اُس دور کے سیاسی اور معاشی دونوں میدانوں پر چھائی ہوئی تھی عام طور سے لوگ اُن کی قیادت کو تسلیم کرتے تھے جہاں تک برطانوی حکومت کی خدمت کا تعلق تھا لوگ عام طور سے اُن سے اتفاق کرتے تھے یعنی عام لوگوں کی کمر توڑنے کی ذمہ داری۔

دولت کے نکاس کے غیر معاشی نتائج اور اُس کے حجم کے متعلق ہندوستان کے ماہرین معاشیات نے اعداد و شمار کے ساتھ بار بار ذکر کیا (دیکھئے باب ۷) لیکن اُس کے معاشی مضمرات کے علاوہ نکاس کے سوال پر سیاسی اور اخلاقی بحث بھی شروع ہو گئی تھی اور ہندوستانیوں کا جواب مندرجہ ذیل پر مشتمل تھا برطانوی سلطنت کے جواز اور مقاصد کا گہرا تجربہ یہ سرکاری قرضوں کی ضرورت، بدلتی سرمائے کی ہندوستان میں اصل کاری کی ہمت افزائی جس سے ہندوستان کی دولت میں اضافہ ہونے کے بجائے درآمدات کی زیادتی کے کبھی نہ ختم ہونے والے عمل کی بنا پر اُس کا استحصال ہو رہا تھا اور اُسے تباہ کیا جا رہا تھا، سامراجی مقاصد کے لیے لڑی جانے والی جنگوں اور مہموں کی بنا پر بڑھتا ہوا غیر منصفانہ قرض اور بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے سول ملازمین اور ضرورت سے زیادہ فوج پر کیا جانے والا صرف بیجا۔ ہندوستانیوں کے جواب میں انگریزوں کے اس دعوے کو بھی غلط ٹھہرایا جاتا تھا کہ انہوں نے ہندوستان کی فلاح و بہبود کے

(۱) آر۔ پی۔ مائی نے اس کا حوالہ ”دادا بھائی نوروجی، ہندوستان کے شانداز بزرگ“ میں دیا ہے صفحہ 414

(۲) ایسا، صفحہ 428

(۳) انڈین نیشنل کانگریس (۱۹۱۷ء) صفحہ ۵۵۷

لیے برطانوی مہارت، دیانت داری اور علم مہیا کیا وپلیس کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کو کھلے نے اس دعوے سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا۔

”لیکن واحد خرابی محض ضرورت سے زیادہ قیمتی بدیہی ایجنسی نہیں ہے ایک اخلاقی برائی بھی ہے جو اس سے بھی بڑی ہے موجودہ نظام میں ہندوستانیوں کی نسل کا قد کھانے کی کوشش کی جا رہی ہے ہمیں اپنی زندگی کے دن احساس کمتری کے ماحول میں گزارنے پڑتے ہیں۔ اور ہم میں جو سب سے زیادہ قد آور ہے اُسے بھی جھکنا پڑتا ہے۔ تاکہ موجودہ نظام کی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ اگر اجازت ہو تو میں کہوں کہ آگے بڑھنے کا وہ جذبہ ہم سے بھین لیا گیا ہے جو ایشین ہیرو کے ہر بچے میں ہوتا ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ ایک دن وہ گلیڈسٹن، نیلسن یا ولنگٹن بن سکے گا اور جس کی بنا پر وہ اپنی سی بھرپور کوشش کرتا ہے موجودہ نظام کے تحت ہمارے لوگوں کو اس کا موقع نہیں دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فطری قد و قامت تک پہنچ سکیں اخلاقی برتری کا وہ احساس ہم میں نہیں ہے جو خود پر حکومت کرنے والی ہر قوم میں ہوتا ہے۔ استعمال نہ کئے جانے کی وجہ سے ہماری انتظامی اور فوجی اہلیت ختم ہوتی جا رہی ہے اور وہ وقت آ رہا ہے جب ہم اپنے ہی ملک میں دوسروں کے خدمت گار بن کے رہیں گے۔“ (1)

غربت اور دولت کے نکاس کے متعلق بحث و مباحثہ، جسے دادا بھائی نوروجی نے شروع کیا تھا، زیادہ سے زیادہ لوگوں میں اخباروں اور تقریروں کے ذریعے، کتابچوں کے ذریعہ، رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ اور بہت سے جلسوں، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں جاری رہا یہاں تک کہ اس پر پورے ہندوستان کو یقین آ گیا یعنی وہ ایسا وسیع تصور بن گیا جس نے قومی شعور کو جنم دیا۔ سیاسی تحریک کا سب سے بڑا محرک تھا بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی غربت اور اس بات پر اتفاق رائے کے وہ بدیہی حکومت کا نتیجہ تھی۔

لیکن برطانوی حکمرانوں نے اس تحریک کو نظر انداز کیا اور حقارت کی نظر سے دیکھا۔ لارڈ کرزن نے 1892ء میں ہاؤس آف کامنز میں کہا ”ہندوستان میں کانگریس پارٹی کے منصوبوں اور پالیسی کا کوئی اثر اس غیر مشکل تجلث (عام لوگوں) پر نہیں پڑیگا“ جہاں تک ہندوستان کے لوگوں سے اس کے رشتے کا تعلق تھا ”کانگریس نیابت کے جن حلقوں کی نمائندگی کرتی ہے انہیں ہندوستان کی مجموعی آبادی کی بہت چھوٹی سی اقلیت کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ (2) بعد ازاں وہ شام کی دلیل نے حکمرانوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

کرزن سے اتفاق کرنے والے سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں نے ان نسل اور فرقہ وارانہ اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جو ہندوستان میں پائے جاتے تھے۔ اس کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ ان کے تجربے مغربی یورپ کے بہت چھوٹے چھوٹے سماجوں تک محدود تھے جہاں اختلافات کم تھے اور جزوی وجہ یہ تھی کہ وہ سامراجی موقف کی اخلاقی راست بازی کا خود کو یقین دلانا چاہتے تھے اور تکلیف دہ مطالبات کرنے سے محکوموں کو باز رکھنا چاہتے تھے واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں کسی ملک نے سامراجی عناصر کے مکمل اتحاد سے ابتدا نہیں کی ہے نہ اس قسم کا اتحاد کہیں پایا جاتا ہے۔ یونائٹڈ کنگڈم بھی مختلف نسل اور مذہبی عناصر کے ملنے سے وجود میں آئی تھی جیسے انگلو، سیکس، پیوٹس، ڈیش، نارمنس وغیرہ اور آج بھی اس میں مختلف گروہ پائے جاتے ہیں جیسے انگلش، اسکاٹ، ووش، پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک، انیسویں صدی کے وسط تک جرمنی اور

(1) گو کھلے، جے، تقریریں، ہنٹر۔ اے۔ رائسن، دوسرا ایڈیشن، مارچ 1916ء، صفحہ 1188

(2) بھری، اے۔ سی، ہندوستان کی استعماری، ستاہرات، جلد دوم (1948ء)، صفحہ 119

اٹلی محض جغرافیائی نام تھے۔ بیسویں صدی میں روس ایک قوم بننا جا رہا تھا۔ عہد وسطیٰ سے عہد جدید تک عالمی تبدیلی کا رجحان ہے فیوڈل سوسائٹی سے، جسکے سماجی رشتے قبائلی اور فرقہ واری واری مذہب پر جس کے خصوصی اعتقادات اور رسوم ہوتی تھیں، ایسے سماج کی طرف عبور کرنا جس کی بنیاد پڑوس سے مادی مفادات میں باہمی تعاون اور قومیت پر قائم ہوتی ہے۔

ریاست نے اس عمل کو بہت بڑھایا ہے، فرانس کو متحد اُس کے بادشاہوں نے کیا جنہوں نے شہروں اور کیوں کے ساتھ ملکر فیوڈل لارڈوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور فرانسیسی قوم کو استحکام عطا کیا۔ ہونہو و سرنس نے بہت سی دعویٰ دار ریاستوں کو ملا کر جدید جرمنی کی تعمیر کی۔ اٹلی کا اتحاد ہیڈ فونیر بادشاہوں کا زمانہ تھا۔ یہی عہد کے بعد ریاست کی کوششوں کے نتیجے میں جاپان ایک قوم بن گیا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اتاترک نے جس ریاست کی تنظیم کی تھی اس کی رہنمائی میں ترکی نے قوم پرستی اور جدیدیت کی راہ پر چلنا شروع کر دیا۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کا رول اس کے برعکس تھا سماجی یک جہتی کو فروغ دینے کے بجائے اس نے اپنا اثر اختلاف کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ سچ ہے کہ برطانوی حکومت کے بالواسطہ اثرات اور برطانوی انتظامیہ کے غیر متوقع نتائج ملک کی مادی ترقی اور اتحاد کی صورت میں سامنے آئے اور انہوں نے اُسے کسی حد تک جدید بھی بنا دیا لیکن حکومت کی بالمقصد پالیسی کی بنیاد ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کا اصول تھا۔

چنانچہ ان منفی حالات کے تحت بدیہی حکومت نے جو کچھ کیا اس نے اس نئے جذبے کے ساتھ مل کر جو ہندوستان میں پیدا ہوا جو کچھ ہندوستان کی قومیت کو وجود میں لانے کا آغاز کر عمل سرانجام دیا تاریخی تسلسل اور عجیب و غریب تہذیبی شخصیت جس چیز کی ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ ریاست متوسط طبقے کے دانشوروں کے قومی شعور کو تقویت پہنچائے اور وسطی ذہن رکھنے والے گروہوں کے برکھار و گ کا علاج کرے لیکن ان وسطی اور قدیم سماجی طاقتوں پر قابو پانا بہت دشوار تھا جن کی مدد وہ حکومت کر رہی تھی اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ سیاسی شعور رکھنے والے طبقوں کے مبہم عزم اور انڈین نیشنل کانگریس کی کوششوں کے باوجود قومی تحریک میں پھوٹ پڑ گئی۔

XI۔ مسلم ردِ عمل^x

قومی تحریک سے حکام ناراض ہو گئے جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے پچھ حلقوں میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ سر سید احمد خاں نے ان حلقوں کی قیادت کی اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ کانگریس سے علیحدہ رہیں اور اتر پردیش کے سچھ ہندو زمینداروں کے ساتھ مل کر انڈین پیٹر پانک ایسوسی ایشن کے نام سے ایک اور تنظیم بنائی۔ لیکن یہ تنظیم زیادہ مدت تک نہ چل سکی اور اُس کے بعد سر سید اور علی گڑھ پارٹی نے مسلمانوں

کو برطانوی حکومت کی حمایت میں مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں بھی انہیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ پرانے کتب خیال کے بہت سے رہنماؤں یعنی ملانے سر سید کی مخالفت کی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے کئی تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں نے کانگریس کی حمایت کی۔ بد قسمتی سے 1890ء کے بعد فرقہ وارانہ صورت حال خراب ہو گئی اور بہت سے شہروں میں فساد ہوئے۔ اس سے نور شاہی کو اس کا موقع مل گیا کہ وہ کانگریس پر طنز کریں اور اس کے اس دعوے پر اعتراض کریں کہ ہندوستان ایک ہم قوم ملک ہے جسے نمائندہ ادارے ملنا چاہیے، لندن اسٹینڈرڈ نے لکھا ”ہمارا خیال ہے کہ یہ بات خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے کہ ہندوستانوں کا ذمہ دار عہدوں پر تقرر کیا جائے اور لوگوں کا انتخاب ایسے کیا جائے کہ انہوں نے کچھ غلطی امتحان پاس کر لیے ہیں۔ ہم ہندوستان پر آج بھی تکیار سے حکومت کرتے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے۔ ہم اس ملک میں بلکہ یوں کہیے کہ بہت سے ایسے ملکوں کے گروپ میں امن قائم رکھتے ہیں جو ہمیشہ لڑ سکتے ہیں اور باہمی جنگ و جدل کر سکتے ہیں۔“ (1)

ہندوستانوں کا خیال تھا کہ یہ فساد پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے نتیجے ہیں جس پر وہ برطانوی حکام عمل کرتے ہیں جو کانگریس کے مطالبات سے ناراض ہیں اور قومی تحریک میں رخنہ ڈالنے کے لیے مسلمانوں کو آگستے رہتے ہیں، امرت بازار پٹرک نے لکھا ”لوگوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتی ہے۔۔۔ مسلمانوں کی بالواسطہ انداز سے ہمت افزائی کی گئی اور ان کی پیٹھ ٹھوکی گئی۔“ (2)

کانگریس نے فرقہ واریت کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی اور اپنے صدر فیروز شاہ مہتا کے ذریعہ اعلان کیا ”کانگریس کے ممبر ان انسانوں کی طرح سمجھا ہوتے ہیں جن کی بنیاد مشترکہ قومیت ہے اور جو ایک ملک کے شہری ہیں“ (3) بدر الدین طیب جی نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا (1887ء) ”کم از کم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ مسلمانوں کو دوسری نسلوں اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر سب کی بھلائی کے لیے کیوں نہیں کام کرنا چاہیے۔“

XII۔ شدت پسند پارٹی کی ابتدا

حکام کی ڈھنکائی اور مخالفت کے باوجود سیاسی تحریک طاقت پکڑتی رہی اور بہت وسیع ہو گئی انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس سال بہ سال ہوتے رہے جن میں حکومت کی بنیادی خرابیوں اور وقتی غلطیوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی جاتی رہی صوبوں میں سیاسی کانفرنسیں کی جاتی تھیں جن میں کانگریس کی تجاویز کو دہرایا جاتا تھا۔ ہندوستان کے سبھی حصوں میں سیاسی انجمنوں کے جملے ہوتے تھے جن میں تنقید کی جاتی تھی انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے اخبارات قومی رہنماؤں کے خیالات کا پرچار کرتے تھے۔ سیاسی تحریکیں چھاپے خانوں سے نقلی اور ملک میں پھیلتی رہتی تھیں اور لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے

(1) اسٹینش مین نے 9 ستمبر 1893ء کی اشاعت میں اقتباس پیش کیا۔

(2) امرت بازار پٹرک 10 ستمبر 1895ء۔

(3) خطبہ صدارت 1890ء، انڈین نیشنل کانگریس (ٹائٹلس 1917ء)، صفحہ 72

بہت سے سیاسی کارکن پھونسنے اور بڑے جلسوں میں لوگوں سے خطاب کیا کرتے تھے۔

اس قسم کی بے چینی ملک میں پائی جاتی تھی جب حکومت کے روپے سے مایوس ہو کر ہیوم نے قوم سے اپیل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس بجٹ میں کوڈن اور اسکے شریف رفقہ کی طرح انصاف، اپنی آزادی اور حقوق کے لیے لڑیں گے ہر وہ ہندوستانی جو اس مایہ وطن کی مقدس سر زمین پر سانس لیتا ہے، ہمارا ساتھی، ہمارا مددگار، ہمارا حامی، اور ضرورت پڑنے پر ہمارا سپاہی بن جائے“ (1) یہ اس امر کا تہیہ تھا کہ کانگریس کے طریقوں کے حدود سے باہر اگر سیاسی تحریک کو ملک کے طول و عرض میں پھیلا یا جائے۔ تمام طبقوں کے لوگوں سے چندہ کرنے کے لیے جلتے کئے گئے، شہروں اور ضلعوں میں جلسوں سے خطاب کرنے کے لیے مقررین بھیجے گئے اور تحریریں تقسیم کی گئیں۔ دو پمفلٹ لوگوں کی توجہ کے مرکز بن گئے اور حکومت کے حامیوں میں انہوں نے خوف و ہراس پیدا کر دیا وہ تھے کانگریس کا سوال و جواب نامہ اور کمیٹی پور کے مولوی فرید الدین اور رام بخش کی گفتگو جس میں زمینداری اور مطلق العنان حکومت کی خرابیوں کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ ان خرابیوں کو دور کرنے کا طریقہ ہے نمائندہ حکومت کا قیام۔

1881ء میں ہندوستان کے باہر اور خاص طور سے انگلستان میں پروپیگنڈا کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی ایک برطانوی کمیٹی قائم کی گئی جس کا صدر تھاولیم وڈربرن، سکرٹری تھاولیم وڈنگی اور ادا بھائی نوروجی اور چھ دوسرے انگریز اس کے ممبر تھے کانگریس کے خیالات کا پرچار کرنے کے لیے انڈیا نامہ کا ایک رسالہ شروع کیا گیا۔

ہیوم نے جو کام شروع کیا تھا اس سے تھک اور دیندو گھوش کی طرح کے قومی رہنماؤں نے فائدہ اٹھایا۔ وہ کانگریس کے پر وقار مگر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ طرز عمل سے غیر مطمئن تھے جس کی قیادت پیشہ ورانہ طبقوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کامیاب ممبروں کے ہاتھوں میں تھی۔ انہیں کانگریس کے اختلاف اور درخواست کرنے کے طریقے سے اختلاف تھا اور وہ زیادہ فعال سیاسی تحریک کے حامی تھے آرویندو گھوش نے 1893ء میں اندر پرکاش میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھا جن کا عنوان تھا ”ہر انروں کی جگہ سنے چراغ“ ان مضامین میں انہوں نے کانگریس کے ان طریقوں کے نقائص کو بے نقاب کیا جن پر وہ ابھی تک عمل کر رہی تھی، انہوں نے ایجسٹینڈو کو نسلوں کی توسیع اور بہ یک وقت امتحانوں کو ”شعبہ بازی“ سے تعبیر کیا اور ”برطانوی حکومت کی برکتوں اور اس ناقابل فہم مشیت کا مذاق اڑایا جس نے ہمیں انگلستان کی فیض رسانی آغوش مایہ تک پہنچا دیا۔“ اور اس خطرے سے آگاہ کیا ”آج بھی برطانوی جبر کیویکی ویاویریں صحیح سلامت ہیں اور غربت و افلاس کے سیاہ سائے بڑھتے اور دور تک پھیلنے جارہے ہیں۔“ (2)

ارویندو کانگریس سے بہت غیر مطمئن تھے اس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ ”متوسط درجہ کا ادارہ جو اپنے عوامی عمل میں مطلب پرست اور زمانہ ساز ہے اور بے لوث وطن پرستی کے کھوکھلے دعوے کرتا ہے سنجیدہ سوالوں سے بچنے کے بجائے کھلونوں سے کھیلتا ہے اس نے کبھی اس کوشش نہیں کی ایسا عوامی ادارہ بن سکے جسے ہندوستان کے لوگوں نے اختیارات سطا کئے ہوں۔ زیادہ تر لوگوں کو وہ متاثر نہیں کر سکا ہے۔ اس صورت حال میں کلیدی حیثیت پر سانسیت کو حاصل ہے۔ صحیح اور با معنی پالیسی سے ملک کی پوری آبادی کو بیدار اور منظم

(1) وڈربرن، ڈبلیو، اے۔ او۔ ہیوم، صفحہ 63، ایسا مظلوم ہو تا ہے کہ ہیوم نے 1888ء میں یہ اپیل کی تھی۔

(2) کرنی، جی۔ ایس۔ اور انارش، بی۔ او۔ کنھش کے۔ سیاسی خیالات، صفحات 67-68

کرنا اور اس طرح اس کے حجم اور اہمیت (عام لوگوں کے حجم اور اہمیت) میں بہت زیادہ اضافہ کرتا، “ (۱) اور ہندو کے چیلنج کا جواب بال گنگا دھر تلک نے دیا اور اُن دونوں نے مل کر ہندوستانی سیاست کی پرسکون سطح آب میں الجھل بچا دی۔

لیفٹس ڈاؤن کے ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے نئے حالات کے سائے بڑنے لگے تھے۔ ہندوستان میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی جس میں نئے خطروں اور امیدوں نے اضافہ کر دیا۔ شدید قحطوں، طاعون اور فرقہ وارانہ فسادات نے کبھی کو خائف کر دیا تھا۔ اُسی کے ساتھ مذہبی احیاء پرستی کے جذبات ملک میں ہر طرف پھیل رہے تھے اور ماضی کے متعلق فخر و مباحات کا جذبہ اور اپنی عزت کا احساس بڑھ رہا تھا۔ دیوکانند کے کامیاب دورے نے شاندار مستقبل کی امیدیں جگا دیں تھیں اور حالات تیزی کے ساتھ اسکی نفی کرتے جا رہے تھے کہ مغرب کو مشرق پر فوقیت حاصل ہے۔

ہندوستان کے باہر برطانوی سلطنت کو، تین چوتھائی صدی تک عالمی امور میں مسلط طور سے قیادت کرنے کے بعد، نئی رفتاروں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی نے صنعتی ترقی میں انگلستان کو مات دیدی تھی اور دنیا کی تجارت میں بڑا سخت مقابلہ کر رہے تھے۔ جرمنی کے نوجوان اور باوصلہ بادشاہ قیصر ولیم دوم نے پرانے مشیر بسمارک کو ہر طرف کر کے اختیارات خود سنبھال لیے تھے وہ سمندر پار توسیع کرنے کے دعوے کر رہا تھا جو برطانیہ کے لیے جیونئی کے مترادف تھے، روس بڑی بے رحمی کے ساتھ بحر الکاہل کے ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں نیا نیا پیدا ہونے والا جاپان سنتری کے فرائض ادا کرتا تھا۔ جاپان کی ترقی نے یورپ کو آگاہ کر دیا تھا کہ ایشیا میں نئی ہوا چلنی شروع ہو گئی ہے۔

لیکن 1893ء میں ہندوستان آیا اور نئے حالات کا سامنا کیا۔ منظر عام پر نئے ہندوستانی رہنما آچکے تھے جو پرانے رہنماؤں کی جگہ جلد لینے والے تھے۔ ان میں پیش پیش تھے بال گنگا دھر تلک نوجوانی میں انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی زندگی ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ ملکر ایک اسکول شروع کیا اور دو اخبار شائع کرنا شروع کئے جن میں سے ایک تھامرا اہنجا جو انگریزی میں نکلتا تھا اور دوسرا تھاکسری جو مرہٹی میں شائع ہوا تھا۔ ان کا مقصد تھا عام لوگوں کو تعلیم دینا اور رائے عامہ کو بہادر کرنا۔ حکومت کی کاروائیوں اور پالیسیوں کی بے باک اور نڈر تنقید کی وجہ سے یہ دونوں اخبار بہت جلد مقبول ہو گئے۔ (1890ء میں تلک اُس وقت منظر عام پر آئے جب انہوں نے اس بنا پر رضامندی کی عمر کی مل کی مخالفت کی کہ ایک بدیسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی اور سماجی معاملات میں مداخلت کرے۔ 1893ء میں انہوں نے کور لھشاک کی تحریک شروع کی اس لیے کہ ان کو شبہ تھا کہ حکومت مسلمانوں کی حمایت اور ہمت افزائی کر رہی ہے۔

اُسی سال انہوں نے قدیم مراٹھی تیوہار گن پتی کو دوبارہ منانا شروع کیا اور تقریروں، گانے والی ٹولیوں اور جلوسوں کی تنظیم کر کے اسے سیاسی رنگ دیا۔ اس تیوہار کے مقاصد ویسے ہی تھے جیسے ہندو میلے کے تھے جسے پہلے بنگال میں راج نرائن بوس اور ان کے دوست شروع کر چکے تھے تاکہ عام لوگوں کو سیاسی ذہن رکھنے والے تعلیم یافتہ طبقوں کے زیر اثر لایا جائے، ان میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اور انہیں ضبط و نظم اور ہمت و جرأت کی تعلیم دی جائے۔

1895ء میں انہوں نے بہادری دلاوری کا جذبہ پیدا کرنے اور بدھئی حکومت سے ملک کو آزاد کرانے کی خواہش کو جگانے کے لیے شیواجی کا تیوہار شروع کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں تیوہاروں نے عام لوگوں میں بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا اور سیاسی تصورات کے پرچار میں مدد دی۔ ملک کے مطابق ان تیوہاروں نے لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے کی حد تک وہی رول ادا کیا جو یونان میں الچین اور پائی تھین نے ادا کیا تھا۔ غالباً مہاراشٹر میں جہاں ہندو طور طریقوں کا غلبہ تھا ملک ایسے تیوہار کے ذریعے عام لوگوں کو آسانی سے بیدار کر سکے جس کا تعلق ان کے مذہبی جذبات سے تھا اور دوسرے اس تیوہار کے ذریعہ جس نے لوگوں کو مرہٹا عروج کے دن یاد دلادیے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے قوم پرست تھے جیسا کہ تقسیم کے دوران اور اس کے بعد کی تحریک سے ظاہر ہوتا ہے پھر بھی رانا ڈے کی طرح کے لبرل ہندوؤں اور مسلمانوں کی تنقید بے بنیاد نہیں تھی سیاست کے ساتھ مذہب کو ملانا ایک خطرناک فعل تھا جیسا کہ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا۔ بہر صورت ایک بسیار مذہبی سماج میں اس کو غلط انداز سے سمجھنا لازمی تھا۔

اپنے فوری مقصد یعنی لوگوں میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کرنے میں ملک کامیاب ہو گئے اور عام لوگوں کے ذہنوں پر ان کی گرفت کی تصدیق ہو گئی۔ 1896ء اور 1897ء میں مہاراشٹر میں خطہ پڑے اور 1897ء میں طاعون پھوٹ پڑا ان کی وجہ سے بڑا جانی نقصان ہوا۔ جون 1897ء میں ان کی زیادتیوں کی بنا پر بلینگ کشنر انڈیا اور لٹنٹ آئیر لٹ کو قتل کر دیا گیا اور حکومت نے ملک پر الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ لوگوں کو بھڑکادیا تھا۔ ان پر مقدمہ چلا اور انہیں 18 مہینے کی قید کی سزا دی گئی۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے نانو برادران کو گرفتار کر کے ایک فرسودہ ضابطے کے تحت نظر بند کر دیا گیا، جنہوں نے واقعی قتل کیا تھا۔ انہیں بعد میں پکڑا گیا اور پھانسی دی گئی۔

ملک کو قید و بند کی سزا کی بنا پر غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور پورے ہندوستان میں حکومت کی مذمت کی گئی۔ بنگالی نے لکھا ”اپنے ہونٹوں کی نظروں میں وہ گر نہیں گئے، ان کی نظروں میں وہ جیل سے باہر بغیر کسی داغ کے آئیں گے۔ ان کی تکلیفوں کی بنا پر ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو گا اور اپنے وطنوں کی مذمت کرنے کی انکی طاقت بڑھ جائے گی کسی بھی حکومت نے اس سے بڑی غلطی کبھی نہیں کی ہوگی۔ بے اطمینانی کو دور کرنے کی کوشش میں اس نے ملک کے طول و عرض میں بے چینی پیدا کر دی ہے۔“ (1)

کانگریس کے صدر سر سٹرن نائرنے کہا ”حکومت ہندوستانوں کو ذاتی آزادی اور جانبدار سے اپنی مرضی کے مطابق محروم کر سکتی ہے۔ لیکن ہر وہ چیز انتہائی افسوسناک ہے جو اظہار خیال کی آزادی پر رکاوٹ لگائے۔“ (2)

اس وقت لارڈ کرزن ہندوستان آیا۔ کرزن آکسفورڈ یونیورسٹی کا ڈین طالب علم اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا اعلیٰ درجہ کی قابلیت کے ساتھ وہ کام کرنے کی انگلیں رکھتا تھا۔ وسیع مطالعے اور ایشیاء میں بے پناہ پرکے جانوالے سفر دن نے اسے اس رول کے لیے تیار کر دیا تھا جو وہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ انڈر سکرٹری آف انشیت کی حیثیت سے وہ ہندوستان کے انتظامی مسائل سے واقف ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس

(1) بنگالی، 18 ستمبر 1897ء۔

(2) خطبہ، سدا رت، 1897ء۔

کی خدا اور ذہانت اور اُس واقعیت کی بنا پر جو اُس نے بڑے محنت سے حاصل کی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا دور حکومت بہت کامیاب رہے گا۔ لیکن جو واقعات رونما ہوئے انہوں نے اُن امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اُن کی وجہ دریافت کرنا دشوار نہیں ہے انیسویں صدی کے آخر میں جو بین الاقوامی حالات پیدا ہو رہے تھے اُن کی بنا پر کرزن کو یقین ہو گیا کہ برطانوی سلطنت کی اُفتی پر طوفان مٹا رہا ہے۔ اُس طوفان سے سلطنت کو بچانا اُس نے اپنا فرض سمجھا اُس کا رول چسکتی ہوئی زرہ بکتر پہنے اُس نامت کا سا تھا جو اُس لیے بھیجا گیا تھا کہ اُس رقیب کو شکست دے جو اُس سلطنت پر بری نظر ڈالنے کی ہمت کرے جسے وہ پیار کرتا تھا۔

اُس میں بڑی مانیت تھی۔ ہندوستان میں اُس کی پالیسیوں کے پس پشت محض ایک تصور کار فرما تھا یعنی سلطنت کی جڑوں کو مضبوط کرنا۔ اُس کے خیال میں جس چیز نے حکومت کو کمزور بنایا تھا وہ تھی کارکردگی اور سامراجی جذبے کا فقدان، معاملات کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت آہستہ آہستہ حکومت کھو رہی تھی، حکومت کے کل پرزے ڈھیلے ہو گئے تھے اور پوری خبرداری، انصاف اور برتر فہم کا وہ احساس کم ہوتا جا رہا تھا جو کم تر سطحوں پر حکومت کرنے کا واحد جواز ہے نظام کو لوگوں میں نیا خون دوڑانا ضروری تھا۔

کرزن اتنی بات نہ سمجھ سکا کہ وہ جس پد ریت کو بحال کرنا چاہتا تھا وہ ہندوستان کے جذبہ خوداری اور خود اپنے پر حکومت کرنے کی خواہش کے منافی تھا۔ کرزن کے رویے اور ہندوستان کے لوگوں کے دعوے کے درمیان جو وسیع علیحدگی تھی اُس کی بنا پر غلط فہمیوں اور جھگڑوں کا پیدائش ہو نا لازمی تھا۔ اُس نے اچھے یا برے جو بھی کام کئے اُن کی بنیاد چونکہ نسلی برتری کے مفروضے پر قائم تھی اس لیے ہندوستانی انہیں ناپسند کرتے تھے کلکتہ کارپوریشن اور یونیورسٹی کو اُس نے سرکاری لوگوں کے ہاتھوں میں دیدیا، تعلیم یافتہ طبقوں پر اُس نے غلط بیانی کا الزام لگایا، اُس نے اعلان کیا کہ ہندوستانی اعلیٰ عہدوں کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں اُس نے انڈین نیشنل کانگریس کا ذکر بڑی تحقارت کے ساتھ کیا اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس نے لوگوں کی مرضی کے خلاف بنگال کو تقسیم کیا یہ ایسے اقدامات تھے جن کی بنا پر وہ نہ صرف ذاتی طور سے غیر مقبول ہو گیا بلکہ اُس نے تعلیم یافتہ طبقے کے ایک بڑے حصے کو برطانوی طاقت سے دور کر دیا۔ لیکن بنگال کی تقسیم نے قومی آزادی کی تحریک میں ایک نئے مرحلے کا آغاز کیا جس کا جائزہ اگلی جلد میں لیا جائے گا۔

تیر ہواں باب

ادبی نشاۃ ثانیہ

ادب سماج کی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے اور اس کی اُمیدوں، آرزوؤں اور شکوک کی عکاسی کرتا ہے۔ اس لیے وہ اُن تبدیلیوں کا ریکارڈ ہوتا ہے جن سے سماج گزرتا ہے۔ چنانچہ اُنیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی اور ذہنی تبدیلی کی تاریخ اُن ادبی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے جو اُس زمانے میں مختلف زبانوں میں لکھی گئی تھیں۔ وہ اُس انقلاب کی شہادت پیش کرتی ہیں جو سماج میں ہو رہا تھا۔

ہندوستان کی زبانوں میں بنگالی پہلی زبان تھی جس میں مغرب کے اثرات کے نتائج دیکھنے میں آئے۔ رفتہ رفتہ دوسری تمام زبانیں اُس سے متاثر ہوئیں اور اُن میں بھی اُسی قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی دراج کے قیام سے تمام طبقات متاثر ہوئے تھے پھر بھی سماج کے مختلف حصوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی وہ یکساں نہیں تھیں۔ جہاں تک تمام لوگوں کا تعلق تھا، وسطی زری اور صنعتی نظاموں کے زوال کی بنا پر اُن میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ چونکہ عام لوگ سب کے سب ناخواندہ تھے اس لیے اُس زمانے کی ذہنی تبدیلیوں سے وہ متاثر نہیں ہوئے پیدادار کی پرانی تکنیک میں یا پیشوں میں بہت کم تبدیلی ہوتی تھی۔ معیشت جلد تھی اور عام لوگوں کے طور طریقوں اور لوک ادب میں روایت سے کوئی بگاڑ یا انحراف نہیں کیا گیا تھا۔

دوسری طرف متوسط طبقہ ایک نئے معاشی اور ذہنی ماحول میں نمودار ہوا تھا۔ اُس میں نوجوان زیادہ سے زیادہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اُن کے ذہنوں میں نئے تصورات رسائی پا رہے تھے ایسے نئے جذبے معرض وجود میں آنے لگے جنہیں عہد وسطیٰ میں کوئی نہیں جانتا تھا اور سوچنے سمجھنے کے طریقے بدلنے لگے۔ نئی طرز زندگی اور نئی تعلیم دونوں کے اثر کے تحت متوسط طبقے کے سماج نے جدید تصورات قبول کر لیے اُن کی رائے اور مزاج کی عکاسی ادب کرنے لگا۔

لیکن مغرب کے طور طریقوں نے متوسط طبقے اور عام لوگوں کے درمیان خلیج کو وسیع تر کر دیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پہلی جلد میں اس فرق پر توجہ دلائی گئی تھی جو فوج کے طبقہ، اشرافیہ اور علما کے طبقے اور عام لوگوں کے درمیان پایا جاتا تھا جو تاجروں، دستکاروں اور کاشتکاروں پر مشتمل تھے پھر بھی تہذیبی اور سماجی اعتبار سے ماضی میں اُن میں ایک گونہ اتھارپایا جاتا تھا۔ اُن کے اختلافات اس قسم کے تھے جیسے ایک ہی قسم کی چیز کی ذیلی قسموں میں پایا جاتا ہے لیکن جہاں تک نئے سماج کا تعلق تھا، اُس کے متوسط طبقے کے، جس کا نقطہ نظر مغربی تھا اور عام لوگوں کے درمیان، جو قدیم رواجوں کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے، فاصلہ اور زیادہ بڑھ گیا۔

I۔ بنگالی ادب

بنگالی زبان اور ادب کے ارتقا میں یہ خصوصیت زیادہ واضح ہے۔ مغربی اثرات پڑنے سے پہلے ہی سے لکھے اور کھاتے پیتے لوگوں کا بنگالی ادب اور عام لوگوں کا ادب یکساں خصوصیات کا حامل تھا اور اُن کے یکساں موضوعات تھے۔ اُن کی ہیئتوں اور مواد میں کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔

شائد اردو ادب وہاد پر پیدا کر رہے تھے جنہیں راجا نواب اور زمینداروں کی سرپرستی حاصل تھی اور عام لوگوں کا ادب گاؤں کے لوگ شاعر پیدا کر رہے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں تہذیب کے دو اہم درباری سرگزشتے۔ ایک نایا (کرشن گھر) تھا جہاں راجہ کرشن چندر رائے حکومت کرتا تھا۔ اور دوسرا ڈھاکہ کا وکرم پور جہاں راجہ رائے بھو کی حکومت تھی۔ شاعر بھرت چندر کو لولالہ کی سرپرستی حاصل تھی جس نے نرائن اور اُس کی بھینجی آئندہ سائی کو آخرالذکر کیا۔ بھرت چندر کی شہرت کی باعث ہوئی اُس کی کتاب ”آئندہ سنگل“ جس میں دیا اور سندرا کی مشہور کہانی بیان کی گئی ہے اور جسے نرائن کو شہرت ملی مشہور و معروف ”ہری لیلائے“ سے۔ رواجی شاعر اسلوب کے وہ آخری بڑے شاعر تھے۔

عام لوگوں کے لیے جو شاعر لکھتے تھے اُن میں گیت کھارپا، کالی دال غنایہ ڈراموں یا ”پاتراؤں“، مذہبی نظموں یا ”کیرتوں“ اور دوسرے اصناف کے لکھنے والے تھے جیسے نپا، نپتی، دھاپ وغیرہ۔ اٹھارہویں صدی میں کالی دالوں میں سب سے زیادہ مشہور تھے رام پرشاد، ہار دھاکر، ہرے کرشنا پر کھائی، رام باسو اور نیتاند دیراگی۔ کرشن کمل گونائیں باترا کا بڑا شاعر تھا۔

ان گیتوں میں گھریلو زندگی کے اچھے اور برے پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی تھی جیسے نوجوان بنگالی بیوی جو شوہر کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ ماں جس کا دل بچوں کی محبت سے بھرا ہوا تھا، خاندان زندگی کے آرام و رکھ، تیرہلوں پر خوشیاں منانے کا منظر، قربانیوں، قناعت اور تکلیفوں کی کہانیاں جن کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جاتا تھا، حیات بعد از ممات کی خواہش اور شہیت ایڑی پر بھروسہ۔

دونوں قسم کے شاعروں کے موضوعات یکساں تھے۔ وہ زیادہ تر مذہبی تھے یعنی دیدانت کا فلسفہ، مذہبی کہانیوں کی تعریف و توصیف، دیو مالا کے قصے اور قصصیں اور راجا کرشن کی زندگی کے رومانی حصے۔ ان کے علاوہ ان میں زندگی کی خوشیوں اور ہوس پرستانہ محبت کے شیب و فراز اور قسمت کے الٹ پھیر کا بیان بھی کیا جاتا تھا۔ دونوں دہستانوں کے مختلف شاعر ایک ہی قسم کے موضوعات کی عکاسی ایک رواجی طریقے سے کرتے تھے۔ ان کے لیے تمام مرد اور عورتیں قسمت کی ڈوری میں بندھے ہوئے تھے اور خدا کی مرضی کے تابع تھی، دیوتا دیوی کی چھوٹی سے چھوٹی توہین کا خلیزہ بھگتنا پڑتا تھا اور توبہ اور استغفار کی بنا پر ان کی خواہش پوری ہوتی تھی۔ زندگی ایک پاترا تھی، اس کے دکھ ایمان کے امتحان تھے اور اس کی کامیابیاں من جانب اللہ تھیں۔ انسان کو دکھ اور تکلیفیں مبر و سکون کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے اس لیے کہ زندگی آتی جاتی ہے اور آدمیوں کا تکلیف دہ پیکر کھسکھس کر مٹ جاتا ہے۔

انسانی محبت، جو جدا بیویوں اور بد قسمتیوں کی داستان ہوتی ہے، عام طور سے عاشق و معشوق کے ملن پر ختم ہوتی ہے۔ اُس عہد کے شاعر واداسو قلب کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں کہ اُس میں نفس پرستی

کارنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ مرد اور عورت کے رشتے میں اخلاق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں اور سازشوں، غلط کاریوں، وعدہ فراموشی اور ناجائز جنسی رشتوں کو برا نہیں سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ اُن میں کامیابی ہو۔ جہاں تک سماج کی طرف فرد کے فرائض کا تعلق تھا اُن کے حدود کا یقین خاندان اور ذات کرتی تھی اور اُس سے آگے انسانیت کے لیے ایک غیر واضح احساس کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ سماج کا تصور درجہ بندی کا اور فیوڈل کا تھا۔ لیکن سماج میں چونکہ مقابلے کا جذبہ نہیں تھا۔ اس لیے سماجی تناؤ کم تھے اور گھروں کی باہمی رقابت اور چشمک کا اثر زندگی پر کم ہی پڑتا تھا۔ اس بات کو بلاچون دچرا تسلیم کیا جاتا تھا کہ دنیاوی معاملات میں حکمران کو اقتدار حاصل ہے اور مذہبی معاملات میں پروہت کو۔ عورتوں کی حیثیت ایسے ماتحتوں کی طرح تھی جو مرد کے لیے جیتی تھیں اور مرد کے لیے مرتی تھیں۔ سری خٹا سوداگر کی کہانی میں لاہانا کا شوہر کھلمکان کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس سے شادی کر لیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اُس کی پہلی بیوی اُس کی نئی بیوی کی خدمت کرنے اور وہ اپنے مالک کا حکم بجالاتی ہے لیکن ملازمہ کے خراب اثر کے تحت وہ ناظر بقہ کار بدل دیتی ہے پھر بھی ملازمہ کے خراب مشوروں کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور لاہانا اپنے کئے پر بچتا ہے اور پرانے تعلقات پھر استوار ہو جاتے ہیں۔

نظموں کے ہیر و اور ہیر و جن فرد نہیں ہوتے ہیں بلکہ افراد کی قسمیں ہوتی ہیں۔ جن کے کرداروں کو یا تو بہت اچھا بنا کر پیش کیا جاتا ہے یا بہت بُرا۔ یا تو وہ عمل اچھائی کی تجسیم ہوتے ہیں۔ یا مکمل بُرائی کی۔ اسی قسم کا وہ بظاہر فطرت کے بیان میں بھی اختیار کیا جاتا ہے الاول کی بہار مسرت و شادمانی کا موسم بنے جب پھول کھلتے ہیں۔ کوئل ہوتا ہے، شہد کی مکھیاں پھولوں سے رس لیتی ہیں۔ مسالیا کو نیلوں سے لو جاتے ہیں اور آم کے درختوں میں نئی نئی چٹاں اور ٹہنیاں پھونسنے لگتی ہیں۔ بھرت چندر انہی باتوں کی زیادہ پر شکوہ زبان اور غنائی نظموں میں حکمران کرتا ہے جن کا بیان اول الذکر کی بہار میں کیا جا چکا ہے۔ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ دوسرے شاعر بھی ایسے ہی منظر نامے پیش کرتے ہیں۔

ایسے ادب کی نمایاں خصوصیت انفرادیت اور حقیقت پسندی نہیں ہو سکتی ہے جس میں محض داخلیت ہو اور محض مافوق الفطرت واقعات یا نصب العین کی عکاسی کرتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں تو اُس میں پیش پا افتادہ، غیر شائستہ اور مخرب اخلاق موضوعات پر لکھا جانے لگا۔

جہاں تک درباروں کے شاعروں اور عوامی شاعروں کا تعلق ہے اُن میں محض اسلوب نگارش کا فرق پایا جاتا تھا۔ بھرت چندر اور جے نرائن تعلیم یافتہ تھے اور ان کے اشعار میں تشکرت کے بھی بھاری بھر کم لفظیات کی بھر مار ہے۔ اُنر تشکرت کے الفاظ کو سوچ سمجھ کر استعمال کیا جائے اُن سے شعر کا وقار و اعتبار بڑھ جاتا ہے ورنہ وہ طرز نگارش کو غیر ضروری حد تک پر تکلف اور مختلف بنا دیتے ہیں۔

بھرت چندر کی موت کے بعد کوئی باصلاحیت شاعر منظر عام پر نہیں آیا چاہے درباری شاعر ہوں یا عوامی شاعر ان میں بھرت چندر، جے نرائن اور رام پرشاد کے ادبی قد و قامت کا کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ ہو۔ کا جذب بات پھینکے پڑ گئے اور نئی خوبیاں ختم ہونے لگیں۔ وسطی دور کی روایتی شاعری کی دھار سست ہو گئی اور اس کا پھیلاؤ کم ہو گیا بنگال پر مغرب سے آئے ہوئے بدیسوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس فتح نے شاعرانہ صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا۔

چنانچہ پانچاسی کی جنگ کے بعد کی نصف صدی بنگالی ادب کے زوال کا زمانہ تھا۔ بھرت چندر کے

بعد پیدا ہونے والے ”کالی کنار“ نے مصنف کالی کرشن داس اور ”بیاترا“ کے مصنف باسک چند رائے کی طرح کے شاعر پرانے موضوعات اور تکنیک کو دہراتے رہے لیکن ان میں اپنے استادوں کی سی گری نہیں تھی۔ محض وہ زبان کے استعمال میں زیادہ آزادی سے کام لیتے تھے اور ان کا فنی اسلوب زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ناجائز محبت کی کہانیاں بیان کر کے وہ زیادہ سیکولرلوب کے لیے میدان تیار کر رہے تھے۔

رام نہ مچی گیتا، سر اھر کھنک، رام باسکالی وال، دسر تھی رائے، لرشا کھل گوسوامی اور مدھوکان (دھون کا مصنف) کی طرح کے مقبول شاعروں نے گاؤں اور شہروں میں عام لوگوں کی جذباتی تسکین کا سامان کیا۔

II۔ بنگالی ادب کی ابتدا

لیکن انیسویں صدی کی ابتداء سے بنگالی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ شاعری جو ابھی تک غالب صنف تھی پیچھے ہٹنے لگی اور اپنی اہمیت اور مقبولیت کھوئے لگی اور نثر تیزی کے ساتھ مظہر عام پر نمودار ہونے لگی جو علم اور معقول فکر کے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ پچاس سال میں وہ اظہار کا ایک پرزور اور لطیف وسیلہ بن گیا۔ اس تبدیلی کے بعد سوچنے کا وسطی اندہ ختم ہو گیا اور ہندوستان میں جدید انداز فکر کی ابتدا ہوئی۔

حالانکہ مٹھافونی فتح سے پہلے ایک قسم کی نثر کا بنگال میں رواج تھا جیسے کار و باری خط و کتابت کی فارسی سے بھری ہوئی بنگالی، سور یہ پرانے، دیو سہارتنز اور سہاجیا کی طرح کی مذہبی کتابوں کی آراستہ نثر اور قانون اور منطق کی کتابوں کی نثر لیکن علمی اور سنجیدہ کتابیں لکھنے کے لیے نثر کا استعمال محض انیسویں صدی میں شروع ہوا۔

اس قسم کی نثر کی ضرورت اُس وقت بھی محسوس کی گئی تھی جب کمپنی کے ضوابط کا بنگالی میں ترجمہ کرنا پڑا تھا۔ 1785ء جو تاتھن ڈکن کی رہنمائی میں دیوانی عدالت کے انصاف کے اہرام کے ضوابط کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ 1791ء میں نیل بینجمن ایڈمونسٹن کی نگرانی میں ضابطہ فوجداری کا ترجمہ کیا گیا اور 1893ء میں ہنری مٹسن فوسٹر کی نگرانی میں ضابطہ کارنوالس کا بنگالی میں ترجمہ کیا گیا۔

لیکن فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جدید ہندوستانی زبانوں کو ترقی دینے کے لیے اہم اقدامات کئے گئے اس کالج کو قائم کرنے میں ویلیزلی کا مقصد تھا جو انگریز سول ملازمین کو قانون، اخلاقیات، فلسفہ، قانون، سائنس وغیرہ کی طرح کے علوم کے ساتھ ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دینا۔ دھچا ہتا تھا کہ یہ نوجوان ہندوستانی زبانوں میں مہارت حاصل کریں اور ہندوستانی ثقافت کے جلسوں میں اسکا مظاہرہ کریں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کالج کو ہندوستان کی مختلف زبانوں میں طالب علموں کے لیے مختلف علوم کی کتابیں تیار کرنی پڑیں، ڈاکٹر گلکرسٹ اور ولیم کیری پر ان کی تیاری کی ذمہ داری تھی۔ گلکرسٹ ہندوستانی، فارسی اور عربی کا نگران تھا اور کیری بنگالی اور دوسری زبانوں کا ان کی دیکھ ریکھ میں کام کرنے کے لیے ہندت اور فنی ملازم رکھے گئے تھے۔

جن بنگالی عالموں نے درسی کتابیں تیار کیں ان میں مرہٹوں جیسے دو نکار، رام رام ہاسو، چندری پنن مشی اور راجیو لوچن لکھوپادھیائے مشہور ہیں۔ ان ابتدائی مصنفین میں دو قسم کے لوگ تھے یعنی پندت اور مشی۔ اول الذکر نے ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں سنسکرت کے پر شکوہ الفاظ شامل تھے۔ آخر الذکر نے اپنی تحریروں کو فارسی الفاظ سے جو جمل بنادیا۔ لیکن چونکہ ان کے برطانوی مالکوں کا جھکاؤ سنسکرت کی طرف تھا اس لیے سنسکرت کے حامی جیت گئے اور مدت تک بنگالی ادب اُن کے زیر اثر رہا، آخر کار ایک درمیان کاراستہ نکلا گیا اور بول چال کی زبان اور علمی زبان میں ایک قسم کا سمجھوتا ہو گیا۔ ایک آراستہ و غیر آراستہ اور طعراتی اور بیجا عبارت آرائی سے بھرے ہوئے مصنوعی اسلوب کی جگہ ایک ایسی قدرتی اور آسان نثر نے لے لی جس کے ذریعہ ہر قسم کے احساسات و جذبات کا اظہار کیا جاسکتا تھا۔

III۔ انیسویں صدی کا بنگالی ادب

بنگالی نثر کے ارتقا میں جن اور لوگوں نے مدد دی وہ تھے عیسائی مشنری۔ سیرم پور کے مشنریوں کے بہت سے ہیرو تھے جن میں کیری، مارش میں اور وارڈ نے راستہ نکالا تھا۔ اُن کے خاص خاص کام تھے صرف نحو اور لغتوں کی تیاری اور انگریزی سے ترجمہ۔ فیلکس کیری نے انسائیکلو پیڈیا کی پہلی جلد تیار کی جس میں اعضا کے افعال اور انسانی جسم کی ساخت کو بیان کیا گیا تھا۔ کالی موہن، بربجی نے، جو ابتدا میں عیسائی ہونے والوں میں شامل تھا۔ اور پارڈی بن گیا تھا، تیرہ جلدوں میں ایک انسائیکلو پیڈیا کی تدوین کی (دیا کلپدروما) سوانح عمریاں، تاریخیں، سائنسی اور فلسفیانہ کتابیں چھاپی گئیں۔ پھر سیرم پور مشن کی درپن، رام موہن رائے کے سبند کو مندی، راجندر لال مترا کے دیوی دھارتھ سنگرہ، دہندرناتھ ٹیگور کے سموا بود جتی پتریکا اور ایٹور چندر گپتا کے سبند پر بھاکر کی طرح کے اخباروں نے زبان کی ترقی میں بڑی مدد دی۔

مغربی علم کا پرچار کرنے والے تعلیمی اور تہذیبی ایجنٹوں نے بھی ادبی کام میں حصہ لیا۔ اُن میں ایک تھی کلکتہ اسکول بک سوسائٹی جس کا قیام 1817ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس کا مقصد تھا اسکولوں کو سستی قیمتوں پر کتابیں مہیا کرنا اور مختلف علوم یعنی تاریخ، جغرافیہ، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بنگالی میں کتابوں کا ترجمہ کرنا اور انہیں شائع کرنا ایک اور انجمن تھی درناٹھ لٹریچر سوسائٹی (1851ء) جو انعامات دے کر بنگالی میں کتابوں کی اشاعت کی ہمت افزائی کرتی تھی اس کی مطبوعات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل تھیں ذوقی رابنسن کروسو، سنٹ پیر کی پال اینڈ روجینیا، لب کی ٹیلیس فرام شیکسپیر اور الیزبتھ کی اگرائس فرام سائیکھ یا۔

سامی، مذہبی اور سیاسی تحریکوں نے بھی ادب کی پیداوار کی ہمت افزائی کی۔ مذہبی کیت، فلسفیانہ کتابیں اور سوال و جواب کی شکل میں مضامین لکھے اور چھاپے گئے۔

جنس لائیک نے، جس نے انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھی جانے والی بنگالی کتابوں کی وضاحتی فہرست بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ تیار کی تھی، 11400 بنگالی کتابوں اور کتابچوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگالی زبان اور ادب نے کتنی ترقی کر لی تھی۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل موضوعات پر کتابیں شامل ہیں، ریاضیات، سائنس، طب، قانون، لسانیات، تاریخ، فلسفہ اور مذہبی کتابیں۔

یہ صحیح ہے کہ سب کتابیں اعلیٰ معیار کی نہیں تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی بہت معمولی تھیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایسی تھیں جن سے اُس زبان کی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ حالانکہ انگریزی نہ صرف سرکاری زبان بلکہ اسلوں اور کالجوں کی تعلیم کی زبان بھی بن گئی تھی۔ اس کے باوجود بنگالی نے تیزی کے ساتھ جو ترقی کی وہ اس کا ثبوت ہے کہ لوگوں کو اپنی مادری زبان سے بڑا لگاؤ تھا۔ اگر بنگالی کو سرکاری زبان کی حیثیت دیدی گئی ہوتی اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنادیا گیا ہوتا تو وہ کتنی ترقی کرتی اس کا اندازہ جاپانی زبان کی 1860ء کے بعد ہونے والی ترقی سے لگایا جاسکتا ہے۔

اُس زمانے کے لکھنے والوں میں رام موہن رائے سب سے پیش پیش تھے حالانکہ، بنگالی نثر کی ابتدا ابھی تھی لیکن وہ تجرباتی مرحلے سے گزر رہی تھی اور زیادہ تر درسی کتابوں میں استعمال کی جاتی تھی۔ انہوں نے اسے سنجیدہ اور اعلیٰ انکار کے اظہار کا ذریعہ بنادیا۔ انہوں نے اُنپشندوں کا ترجمہ کیا، عیسائی مشنریوں کے حملوں کے خلاف ہندو دھرم کے تحفظ کے لیے کتابیں لکھیں اور اپنے ہم وطنوں کے غلط رویوں کی مذمت بھی کی۔

بنگالی نثر کے بانی سمجھے جانے کی صرف اتنی وجہ ہی نہیں ہے کہ رام موہن رائے دوسرے لکھنے والوں سے پہلے پیدا ہوئے بلکہ اس کی دوسری ٹھوس وجوہ بھی ہیں۔ اُن سے پہلے کے لکھنے والوں نے تالیف، ترجمہ کئے تھے لیکن انکا کوئی اپنا نوکھا اسلوب نہیں تھا۔ رام موہن رائے نے جو نثر لکھی وہ سیدھی سادی اور واضح ہونے کے ساتھ دل میں جگہ بنانے والی آراستہ اور شیریں تھی جس میں جذباتیت سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔

حالانکہ اُن کی تحریروں کا مواد بہت اہم تھا یعنی اخلاق اور سماجی اہمیت کے مسائل پھر بھی انہوں نے اس کا اظہار ایسی زبان میں کیا جو راست تھی، آسانی سے سمجھی جاسکتی تھی اور خطابت کے فن سے مبرا تھی۔ ہندوستان کی مذہبی کتابوں میں پائے جانے والے قدیم حقائق کے تعلق سے انہوں نے جدید معنویت پسند اور تنقیدی رویہ اختیار کیا۔

حالانکہ اُن کی زیادہ تر کتابیں نثر میں لکھی گئی ہیں لیکن اُن میں شاعرانہ صلاحیت کی بھی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے بنگو گیتا کا ترجمہ نظم میں کیا اور مذہبی اجتماعات میں استعمال کرنے کے لیے گیت لکھے۔ بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید بنگالی ادب کے دھارے کے بہت سے ماخذوں میں سے جس نے سوسال سے کچھ زیادہ کی مدت میں ایل: خاروری کی شکل اختیار کر لی ہے، رام موہن رائے کی بے پناہ صلاحیت کا شکر پاک و حیات بخش ماخذوں میں ہوتا ہے۔

ہندوستان کے ذہن میں مذہبی الجھل اور اُس پر مغرب کے اثرات کے نتیجے میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں کئی تعمیری تحریکیں وجود میں آگئیں جن سانچوں میں ہندوستانی فکر و عمل بھی وہ مغربی فکر اور ہندوستانی روایت کی دین تھے۔ سترھویں صدی سے انیسویں صدی تک نشوونما پانے والے مغربی فلسفے سائنس اور ادب کے وسیع نظریے نے اُن ہندوستانی دانشوروں کے لیے جنہوں نے انگریزی اور اردو میں تعلیم پائی تھی اور جو، سرے طریقوں سے اُس کے زیر اثر آئے تھے، ذہنی غذا مہیا کی۔ انہوں نے ڈکارتر اور اسپینوزا کی مقبولیت، ہوم کے شک و شبہات، پیٹھم ل کی افادیت پرستی، کانٹ کا نوق التجربہ، کوسٹے کی شونتیت اور مصریو، چین فلاسفی کے نظریات کا مطالعہ کیا۔

یورپ کی روشن خیالی نے جس کی بنیاد تھیں جدید عہد کی سائنسی دریافتیں، اُن کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ اور نہ صرف فطرت کو سمجھنے میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کر دی بلکہ علم کے متعلق اُن کے خیالات کے علاوہ کائنات کے متعلق اُن کے رویے اور عالمی نقطہ نظر میں بھی بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ اُس روشن خیالی کے بعد وہ حوالی انقلاب آیا جسے روس نے شروع کیا تھا۔ اس کا اثر نہ صرف فلسفیانہ فکر پر پڑا بلکہ ادب کے تمام شعبے بھی اس سے متاثر ہوئے یعنی شاعری، ڈراما، کہانی، تاریخ اور سماجی سائنس۔

انیسویں صدی کے ہندوستان پر سب سے زیادہ اثر روحانی تحریک کا پڑا۔ یورپ میں اُس نے سوکھی پھکی معنویت کی کلاسیکی مہارت کے خلاف جذبات و احساسات کے اظہار کے طریقے کے ابتدائی۔ اسکو بغاوت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں بہت سے تضادات پائے جاتے تھے وہ آج کے خلاف احتجاج ہونے کے باوجود ایک خیالی سہارے ماضی کی مدح و ثنا بھی تھی۔ سماج کے مصنوعی طریقوں کے خلاف وہ فطرت سے کی جانے والی اپیل تھی۔ وہ محض دانش ور کی ست روی کے خلاف عجلت پر زور دیتی تھی وہ ذہن کو اعتقاد و نظریے کے بندھنوں سے آزاد کرنا چاہتی تھی اور فرد کو ضابطوں کی قید سے چھڑانا چاہتی تھی پھر بھی اُس نے ماضی کی توصیف و تعریف کی اور اُس کی سادگی اور دلہاری کے گرد ایک رعت و برتری کا ہالہ بنا دیا وہ مذہب کی رسوم اور ظاہر واری کی تنقید کرتی تھی لیکن باطنی تجربات کی قدر و قیمت پر زور دیتی تھی اُس نے ذہنی تنہا دور ہو جانا تھا اور اس لیے حقیقی صلاحیت میں اضافہ ہو جانا تھا۔ اُس سے انفرادیت اور موضوعیت میں اضافہ ہو جانا تھا۔ اور اُسی کے ساتھ اخلاقی نظام کی عالمگیریت، تاریخ کا تسلسل اور فطری قانون اور معنویت پسندی کی برتری باقی رہتی تھی۔

مغرب کی جدیدیت نے ہندوستان کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ اُسے بہت سے چالے صاف کر دیئے لیکن ہر پرانی چیز کو فتح نہ کر سکی۔ اُس نے ہر قدیم چیز کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کرنے کے رویے کو بڑی حد تک تبدیل کر دیا۔ اُس نے انسانی مسائل کے تعلق سے ایک فعال طریقہ عمل کو فروغ دیا، جن چیزوں کی بنیاد محض عادت یا رواج پر قائم تھی اُن کے متعلق ہندوستان کے اعتقاد کو متزلزل کر دیا اور قدیم اعتقادات میں ترمیم کرنے اور انہیں جدید زندگی کے حالات کے مطابق بنانے کے لیے ہندوستانی ذہن کو مائل کیا۔ اس نے قدیم ہندو کا دوبارہ جائزہ لینے اور مغرب اور مشرق میں سمجھو تا کرانے کے لیے پر زور عوامل مہیا کر دیئے۔

اس کا اثر سب سے پہلے ہندوستان کی مذہبی فکر میں نمودار ہوا۔ لیکن جلد ہی ہندوستانی ادبیات بھی اُس سے متاثر ہو گئے اور اُن میں عملی تبدیلی ہو گئی اور خدا، فطرت اور انسان کے متعلق نئے رویے کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے مغرب سے نئے موضوعات مستعار لیے اور مقامی ادب سے پرانے موضوعات کا انتخاب کر کے انہیں نئے سانچوں میں ڈھالا ادب میں نظم کی قدیم مہکتیں استعمال کی گئیں لیکن انگریزی شاعری کی نقل میں نئی ہیئتوں کا بھی تجربہ کیا گیا۔ نثر میں ایک نیا ادب وجود میں آ گیا۔ بنگال نے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور شیکسپیر سے سوئمن برن تک کی انگریزی شاعری پر اور ڈیشیل ڈف سے ہسپہارڈی تک کی انگریزی نثر پر وہاں کے لوگوں کی اچھی نظر تھی اس کی وجہ سے قدرتی طور پر ایسی کتابیں لکھی گئیں جن پر انگریزی تصورات اور ہیئتوں کا گہرا اثر تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ مواد اور موضوعات کی حد تک ہندوستانی مصنفین انگریزی ادب سے متاثر ہوئے بلکہ اسلوب، طرز نگارش اور ان پر بھی اُس کا اثر پڑا لیکن وہ محض مغرب کی نقل نہیں کرتے تھے اس لیے کہ ان کے موضوعات اور کردار، ان کی نثر اور شاعری کا ماحول، ان

کی تحریروں میں پائی جانے والی زیریں لہریں اور اقدار و تصورات کا انتخاب ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے وطن کی سر زمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ رمان، مہابھارت، بھگود گیتا اور پرانوں نے، بھاسکی سنسکرت، فارسی، عربی اور وسطی زبانوں کی نظموں نے، عشق و محبت اور دلاوروں کی داستانوں نے، تاریخ ہندوستان کے کارناموں کی کہانیوں وغیرہ نے ان کی تخلیقات کے لیے مواد اور رنگ و آہنگ مہیا کر دیا تھا چنانچہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب سے، جسے مختلف مذہبوں اور نسلوں سے تعلق رکھتے والے ادیبوں نے پیدا کیا تھا، ہندوستانی تہذیب کا پورا منظر جھلکتا تھا۔ اس کے پس پشت ایک مشترکہ جذبہ کار فرما تھا اور اُس سے بڑی حد تک ایک مشترکہ ذہنی رویے کا اظہار ہوتا تھا۔

معصنین کا حلقہ محض عالموں کے اُن چھوٹے سے طبقے تک محدود نہیں تھا جس نے تعلیم کے قدیم طریقوں سے تربیت پائی تھی بلکہ اُن میں اُن طبقات کے رکن بھی شامل تھے جنہیں نئے تصورات کو جذب کرنے اور جدیدیت کے ماحول میں اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اُن سے زیادہ تر متوسط طبقے کے وہ لوگ تھے جو سیکولر کاموں میں مصروف رہتے تھے اور سبکی ذاتوں اور فرقوں سے تعلق رکھتے تھے مثلاً ہندو، مسلمان، عیسائی اور دوسرے۔ انہوں نے پنڈت اور مولوی کی ذہنی اجارہ داری کو ختم کیا جن کی درباری سرپرستی ہندوستانی سیاست میں ہونے والی تبدیلی کی بنا پر ختم ہو چکی تھی۔

نئے ادب نے نہ صرف نئے احساس و فکر کی عکاسی کی بلکہ انہیں ملک میں پھیلانے اور لوگوں کے ذہن نشین کرانے میں بھی مدد دی۔ انسانی ذہن کو قدامت کی غلامی سے چھٹکارا دلانے کے ساتھ اُس نے اس ذہنی رویے کو جنم دیا جو جدید اقدار کو قبول کرنے کے لیے ضروری ہے۔ مذہب میں ادعائیت کو تنقید نے شکست دیدی۔ اطاعت پروری کو ذاتی تجربے، پاکبازی اور روحانی لگاؤ نے ہرا دیا۔ مذہبی اصولیت کو اخلاقی عمل نے پسپا کر دیا۔ دوسری دنیا کے تصور پر سماجی بہتری اور خدمت کے تصورات نے غلبہ حاصل کر لیا۔ دنیا کو قابل مذمت مایہ جال سمجھنے کا رویہ بدل گیا۔ فطرت کو ایک ایسی دوستانہ طاقت سمجھا جانے لگا جس کا تعاون انسانی بہبودی کے لیے ضروری ہے اور جو اس بڑی توانائی کا مظہر ہے جو مسرت کا ذریعہ ہے۔

اس ادب میں انسان دوستی کا جذبہ تھا جس نے انسان کے وقار کو ایک نئے انداز سے ابھارا تھا تمام لوگوں کی برابری اور عورت اور مرد کی برابری پر زور دیا جاتا تھا اور فرد کو خاندان، ذات اور قبیلے کی بندشوں سے آزاد کرانے کی بات کی جاتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ قومی اتحاد کا شعور معرض وجود میں آ گیا تھا۔ حب الوطنی اور ملک سے پیار کے جذبے نے انفرادی خواہش پر غلبہ پالیا تھا اور فرد کے سماجی کردار پر اثر انداز ہوئے لگاتار۔ بدلیسوں کی اطاعت کی ذلت اور آزادی کی خواہش نے جس ذہنی کشمکش کو جنم دیا تھا اس نے ادبی اظہار اور فنی تخلیق میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کی۔

شاعری، ڈرامے اور نثر میں وہ روحانی تبدیلی نظر آتی تھی جو عظیم بغاوت کے بعد پچاس سال میں سن بلوغ کو پہنچ گئی تھی اس سے پہلے کی مدت میں بنگالی شاعری نے بندشوں سے پوری طرح چھٹکارا نہیں پایا تھا لیکن سمبند پر بھار کے اڈیٹر ایڈور چنڈ گپتا (1802ء-1859ء) کی شاعری کی اشاعت کے بعد یہ تبدیلی واضح ہو گئی۔ اُن کے ایک ساتھی رنگ ال۔ سربجی نے (1826ء-1887ء) اپنی طویل نظم لکھی جس میں عشق و محبت دلاوری اور وطن سے محبت کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ اُن کی نظم پر مبنی آپ لکھیاں کی بنیاد رانپوت تاریخ کی ایک کہانی تھی جس سے رانپوت عورتوں کی بہادری کا ثبوت ملتا تھا۔ پدمنی کی طرح اُن کی نظموں

کرم دیوی اور شعور سندی میں انگریزی شاعروں کے طریقوں کی عہد پیروی کی گئی تھی اور وہ حب الوطنی کے جذبات کے لیے ایک اپیل رکھتی تھی۔

ہیم چندر بن دیو پادھیانے (1834ء-1904ء) بہاری لال کے عمر عصر تھے۔ انہوں نے رزمیہ نظم کے تجربے کئے۔ انہوں نے رزمیہ نظمیں ہیر بھوکاویہ اور بھرت سنگیت لکھیں جن میں ہندوستانوں کی خودداری کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور نوجوانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان کی قدیم عظمت و قار کو بحال کریں اور اُسے آزاد کرائیں۔ اسکاکن میں انہوں نے ”سنہری روشنی سے جگمگاتے ہوئے مشرق“ کے گیت گائے اور کہا ”مادر وطن جو ایک دفعہ پھر اپنے تخت پر بیٹھی ہوئی ہے اور اسکے چہرے پر قدیم مدت کے جدید مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔۔۔ ایک دفعہ پھر خوشی سے سرشار ہو کر ہندوستان کے بچے جی بجا رہے ہیں۔ اور مسرت سے سرشار ہو کر وہ ایک دفعہ پھر بگل کی آواز کے ساتھ ذہن پر جادو پیا ہو گئے ہیں۔“

ہیم چندر کی طرح یمن چندر سین (1878ء-1909ء) نے بھی ہندوستان کی حیات نو کے خواب دیکھے۔ اُن کی سہ الیہ رائے وانگا اور پربھاس میں انہوں نے کوشش کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ اُس میں قومی دولت کے وجود پر بحث کی گئی ہے اور اُس کا علاج بتایا ہے۔

”ایک مذہب ہونا چاہیے، ایک نسل، ایک سلطنت، ایک قانون۔ اور سب کا نظریہ ہونا چاہیے سب کی بھلائی۔“ (۱)

لیکن اُن کے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ادبی صلاحیت رکھنے والے تھے مانگل مدھو سودن دت (1828ء-1873ء)۔ اُن کی تعلیم ہندو کالج میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ نئے تصورات سے روشناس ہوئے جس کی وجہ سے اُن کے اور اُن کے والدین کے درمیان اختلافات ہو گئے اور انہوں نے اپنا گھر اور مذہب چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اُن کی زندگی بڑی پر آشوب تھی۔ گھر چھوڑا، شادی سازگار نہیں رہی۔ طلاق ہوئی۔ یورپ میں بے سود قیام رہا، واپس آئے تک دوستی میں بقیہ عمر گزری، بیمار ہوئے اور مر گئے۔ اُن کی متعلقہ کمپنیں پر اثر و اتصالات زندگی میں انہیں تعلیمی کاموں کے لیے صرف چار سال ملے (1858ء-1862ء) جس میں انہوں نے اپنے شاہکار کھکے یعنی ذرا سے سرشتھابدماؤں اور کرشناکاماری رزمیہ نظمیں تیلوتما، میکنا دباؤ، غیر مکمل غنائیہ نظم براجن گن اور مکتوبی نظم برنگن۔ اُن کتابوں نے ظاہر کر دیا کہ مدھو سودن دت کو شاعری کی ہر صنف میں عجیب و غریب مہارت حاصل تھی چاہے وہ رزمیہ ہو، غنائی ہو، ڈرامائی ہو، ہیئت ہو، سائنس ہو یا کوئی اور صنف ہو۔ انہوں نے شاعری میں نئے اوزان اور قافیوں کے نظام کو چلن دیا یعنی نظم مصرع، چھ رکٹی، بحر اور ہشت مصرعی بند کو اور قدیم ہنگامی اوزان اور بحر اور بندوں کی ساخت کے تجربے کئے۔ ہندوستان کے ماضی کے لیے اُن کے دل میں جو محبت تھی اُس کی بنا پر انہوں نے ہندوستان کے لوگوں کے ادب اور تاریخ سے موضوعات کا انتخاب کیا یعنی رامائن، مہابھارت، کالی داس کی نظموں، دشنو گیتوں، راجپوتوں کے دلادری وغیرہ سے۔ لیکن انہوں نے اُن موضوعات کو نئے سانچوں میں ڈھالا۔ قدیم ہیرو کے بیان میں یا مسلحہ اقدار کی اہمیت پر اعتراض کرنے میں یازندگی کے متعلق جدید نقطہ نظر کی اہمیت اور ضرورت پر زور دینے میں وہ روایت سے رد گردانی کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اُن کے ذرا سے ”سرشتھاب“ کے متعلق ایک پڑھ لکھے پنڈت نے کہا ”اس میں منسکرت صرف دھن کے تمام اصولوں کی خلاف ورزی کی

گئی ہے اپنی رزمیہ نظموں میں انہوں نے بنگالی شاعری کے قاعدوں کو نظر انداز کیا اور کامیابی کے ساتھ ان میں انقلاب برپا کر دیا۔ اپنی مزاحیہ تحریروں میں انہوں نے بنگال کے سماج پر طنز کیا۔ یعنی اُس کی ریاکاری اور بددیانتی پر۔ ”کرشناکاری“ میں انہوں نے جدت سے کام لیتے ہوئے الہیہ کی عکاسی کی جو ہندوستان کی ڈرامائی روایت کے خلاف تھا۔ اپنی سب سے اہم کتاب ”میگھاند بدھ“ کے متعلق انہوں نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا ”میں یونانی کہانیاں مستعار نہیں لوں گا بلکہ اُس طرح لکھنے کی کوشش کروں گا جیسے یونانی لکھتے تھے“ اُن کی کردار سازی میں حقیقت پسندی کی کوشش شامل ہوتی ہے اور وہ قدیم ہیر و کو انسان بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بالہیکسی کی رمانس کے کردار کے برعکس اُن کاراؤن ”برائیوں سے پاک ہونا چاہتا ہے“ جو ایک بہادر سپاہی ہے لیکن ایک بیمار کرنے والا باپ بھی ہے۔ میگھاند ایک نظم کا حقیقی ہیرو ہے جو بہادر ہے، باوقار ہے اور اولوالعزم ہے جسے ایک ریاکاری لکھن قتل کر دیتا ہے جو اپنی فتح کے لیے لایا کی چالوں پر بھروسہ کرتا ہے رام ایک کمزور انسان ہے جس میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن کمزوریاں بھی ہیں۔

مالکھل مدھ سودن دت کی شاعری پر مغرب کی رومان پسندی کا اثر تھا۔ ”اُن کی طرح وہ فطرت کو ایک دوست اور ایک فیض رساں سمجھتے ہیں۔ انسان کو فرشتے یا شیطان کے بجائے انسان سمجھتے ہیں جس میں انسانی جذبات اور خواہشات ہیں اور جو زندگی کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور اُسے اپنا مقصد سمجھتا ہے۔ انیسویں صدی میں مدھ سودن دت کے بعد جو شاعر پیدا ہوئے اُن میں سب سے اہم تھے رابندر ناتھ ٹیگور۔ لیکن انہیں بیسویں صدی کا شاعر سمجھنا چاہیے اُن کی صلاحیتیں پوری طرح بیسویں صدی ہی میں بروئے کار آئیں۔ ٹیگور کا اثر پورے ہندوستان پر پڑا اور اُن کی شہرت دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔

بنگالی نثر کی پوری ترقی مغربی اثر کا نتیجہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں وہ صحافت، تاریخ اور سوانح مضامین، مذہبی فکر، انگریزی اور منطک سے تراجم اور دوسرے سنجیدہ ادبی کاموں میں استعمال کی گئی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں اکشے کمار دت (1820ء-1886ء) ایسور چندر دویا ساگر (1820ء-1891ء) اور بنکم چندر چٹرجی (1828ء-1894ء) کی کاوشوں سے وہ فکر کا صحت مند ذریعہ بن گئی۔ دت نے رابندر ناتھ ٹیگور کے صحابو دھینی کے اڈیٹر کے طور پر اپنے مضامین میں اخلاقی بلندی، مذہبی سرگرمی اور اصلاح کے جذبے کو پیش کیا۔ پڑھے لکھے پنڈت اور شکرکات کالج کے پرنسپل دویا ساگر نے ہندوستانی عورت کی سماجی ترقی کے لیے بنگالی زبان کے غیر مشکوک وسائل کو استعمال کیا۔ اُن کی طرز نگارش کے متعلق ہمیش چندر دت کی رائے ہے۔

”اکشے کمار کے اسلوب میں ہمیں ایک پہاڑی چشمے کی شدت اور زور ملتا ہے جس کا حسن اُن کے کھردرے پن اور ناتراشیدگی میں ہے دویا ساگر کے یہاں زیادہ شائستگی ہے۔ جسے ہم جدید بنگالی نثر تصور کرتے ہیں۔ اُس کو اُن دونوں نے شکل عطا کی ہے۔“ (1)

لیکن اس صدی کے سب سے اچھے نثر لکھنے والے بنکم چندر چٹرجی کو سمجھا جاتا ہے۔ 1838ء میں پیدا ہوئے اور کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے دو گریجویٹوں میں اُن کا شمار تھا۔ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر اُن کا

تقرر ہوا اور سرکاری اعزازات سے نوازے گئے۔ 1894ء میں اُن کا انتقال ہو 1864ء میں اُن کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا جب انہوں نے اپنا پہلا تاریخی ناول ”سندھنی“ بنگالی میں شائع کیا۔ وہ عہد ساز کتاب تھی۔ اُس کے بعد تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد کئی کہانیاں آئیں جن میں ”آئندہ منہ“ (1883ء) سب سے زیادہ مشہور ہے اس کے لیے اُس میں ہندو مت پر مبنی نظم شامل ہے جو جدوجہد آزادی کے دوران ہندوستان کا قومی ترانہ بن گئی تھی اور آزاد ہندوستان میں جسے قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے۔ ہرم پور کے زمانہ قیام میں (1869ء-1874ء) انہوں نے کئی ادبیوں کو سکھا کر لیا تھا۔ یعنی بھو دیو مہرجی، دین بندھو مشرا، مگر داس ہنر اور دوسروں کو جنہوں نے سیاسی مسائل، سماجی اصلاح اور تہذیبی ادبی سرگرمیوں پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے ایک انجمن بنائی تھی۔ 1872ء میں اُن کی کوششوں سے رسالے بنگادرشن کی اشاعت شروع ہوئی جس نے بنگالی زبان اور ادب کی ترقی میں بہت مدد کی۔ بنکم کے الفاظ میں اُس کا مقصد تھا۔ ”انگریزی سے بچھا چھڑانا... اور عام لوگوں سے اُس زبان میں گفتگو کرنا جسے وہ سمجھتے ہیں۔“ (1)

آخری زندگی میں وہ بہت مذہبی ہو گئے تھے اور کرشن چتر اور دھرم مہو میں انہوں نے ہندو دھرم کے متعلق اپنے خیالات پیش کئے اور یہ بتایا کہ وہ ہندو دھرم کے لازمی اصول سمجھتے ہیں۔ نیا ہندو دھرم جس کی انہوں نے وکالت کی، ہندو سماج کی ماضی کی عظمت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تھی اس لیے اُن کا خیال تھا کہ قوم کی نجات انفرادی سماجی اصلاح سے نہیں ہو سکتی بلکہ اُس کے لیے قدیم روحانی نصب العین کو دوبارہ زندہ کرنا ضروری ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ناولوں میں شیکسپیر، دسکاٹ، وکی کونلس، بلورٹن اور دوسرے انگریزی کے ادیبوں سے انہوں نے بہت کچھ لیا تھا۔ اُن کے یہاں روحانی تصورات تھے یعنی ماضی کی عظمت، سماجی خرابیاں اور سیاسی حکومتی کے خلاف بغاوت، قومی وقار کی بازیافت اور ہم جوں۔ چونکہ انہوں نے ماضی کی عزت کے جذبات کو ابھارا ناول کے ہیرو کے گرد و شجاعت و قربانی کا ہالہ بنایا، اور اُس مذہب کی تبلیغ کی جس کا سرکزی کردار بھگود گیتا کے کرشن کی فعال شخصیت تھی۔ اس لیے بنکم جدید عہد کے سب سے زیادہ بااثر مصنف بن گئے۔ ڈاکٹر سو کد سین کے بقول ”وہ محض ناول نگار ہی نہیں تھے انہوں نے ایک راستہ تلاش کیا اور راستہ بنایا۔“ (2)

لیکن بنگال اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں احیا پرستی کی ان تحریکوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو فرقے کی علیحدگی پسندی اور بڑھ گئی اور وہ اتنے موضوعی ہو گئے کہ غیر ہندو لوگوں کے وجود سے بے خبر ہو گئے۔ اپنے کام سے کام رکھنے اور اپنی بہبودی کے خیال میں گمن رہنے کے رویے نے اس میں شک نہیں کہ ملک میں وسیع قومی جذبے کے نشوونما پر مضراثر ڈالا۔

IV۔ مراٹھی ادب

انیسویں صدی کے پہلے راج میں جب پیشوا کی سلطنت پر انگریزی کا قبضہ ہو گیا تو وہ سیاسی و معاشی اور سماجی عوامل جو پہلے بنگال پر اثر انداز ہو چکے تھے۔ بسین پریڈنسی میں بھی کام کرنے لگے۔ مراٹھی

(1) ڈی۔ تھیوڈور ہارڈ، سلیٹن، لے۔ آر۔ ریلڈت، اے۔ یادو ”ہندوستانی روایت کے ہندو“ صفحہ 709

(2) انیسویں صدی کے پہلے بنگالی ادب کی تاریخ صفحہ 237

زبان اور ادب بھی انہی خطوط پر تبدیل ہونے لگے جن پر ہنگلی زبان اور ادب تبدیل ہوتے تھے۔

برطانوی فتح سے پہلے کا مراثی ادب دوسرے تمام وسطی ہندوستانی ادبوں کی طرح زیادہ تر نظم میں لکھا جاتا تھا۔ اور اُس کا مقصد تھا مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کی ترسیل یا محبت اور دلاوری کے متعلق عوامی جذبات کی عکاسی۔ ابتدائی وسطی عہد میں مراثیوں، مہانویہادوں اور درکریوں نے اُسے غیر مقلد خیالات کے اظہار کرنے، مسلک کے اصولوں کا پرچار کرنے اور خدا کی محبت کے گیت لکھنے کے لیے استعمال کیا پھر سولہویں صدی کے بعد ادبی ارتقا کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ روایتی انداز فکر و اعتقاد پر اسلامی تصورات کا اثر بڑا اور سر اٹھا زمینداروں اور تاجروں کی خوشحالی نے ادب کے نئے فروغ کے لیے میدان تیار کر دیا۔ اس تحریک کے بانی تھے ایکنا تھ۔ اُن کے بعد کلکیشور، ٹکارام اور رام داس کی طرح کے قابل ادیب پیدا ہوئے۔

اٹھارہویں میں شاعری کے دو دبستان پائے جاتے تھے۔ ایک طرف تو تھی مذہبی اور کلاسیکی شاعری اور دوسری طرف سیکولر اور مقبول عام شاعری تھی۔ پہلے دبستان کے زیادہ مشہور شاعر تھے سری دھر جنہوں نے رام دے، ہری دے، پانڈو پر تاپ اور سیول امرت لکھیں رمن پنڈت جنہوں نے مذہبی دیوالا پر بہت سی کتابیں لکھیں نظم میں یعنی یا تھارتھ، دیکھا، بھیشم پر تپا، کالیامر دان وغیرہ، مور و پنت جو بڑے پر گو شاعر تھے اور جنہوں نے رلمان اور مہابھارت کی نقل میں رزمیہ نظمیں لکھیں، پرانوں کی داستانوں میں اضافہ کیا اور کیکاولی کی طرح کی متفرق نظمیں لکھیں۔ اُن کے علاوہ امرت راؤ، مہی پتی اور رگھوناتھ پنڈت اُن کے بہت سے شاگرد تھے۔

دوسرے دبستان شاعری سے تعلق رکھتے تھے۔ لونوں یا عشقیہ گیتوں کے لکھنے والے اور یودوں یا تاریخی نظموں کے کہنے والے۔ لونوں میں بڑی آزادی کے ساتھ عشق و محبت کا اظہار کیا جاتا تھا اور وہ نفی تاں تک پہنچتی تھیں۔ رام جوشی سب سے بڑا لونوں کے لکھنے والا تھا۔ اور اُس کی لونیاں بڑی حد تک نفی سے مرہ ہیں۔ یہ لونیاں گانے کا کام مرلیوں یا کھان دوب دیوتا کے لیے وقف مندر کی لڑکیوں اور گوندھالیوں کے سپرد تھا جو چلنے پھرتے گویے تھے اور گاؤں میں ڈرامے دکھایا کرتے تھے۔

تاریخی طویل نظمیں لکھنا شیواجی کے دور میں شروع ہوا۔ شیواجی کی ماں جینابائی کی فرمائش پر اگن داس نے پہلی تاریخی نظم لکھی جس میں افضل خاں کے حادثے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بہت سی طویل تاریخی نظمیں پیشواؤں کے زمانے میں لکھی گئیں۔ تاریخی نظمیں شاعری کی مقبول عام صنعت ہے۔ اُن میں صحت مند اور سیدھے سادے مراثی کسانوں کی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ انکی تشبیہات جانے پہچانے روز مرہ کی زندگی کے مناظر اور دیہاتی ماحول سے لی جاتی ہیں۔ اُن کا انداز نگارش سیدھا سادہ ہوتا ہے اور اُن میں عام لوگوں کے جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے۔

کچھ شعر اُسنے از خود ایسی نظمیں لکھیں۔ کچھ دوسروں نے اپنے مربیوں کی فرمائش پر قلم اٹھایا اگن داس، تلمسی داس اور بمبائی کی سرپرستی شیواجی کرتا تھا، آئند پھندی کے آخری پیشوا گنگا سہاسی، میونا جی اور پرہار کی عزت افزائی پیشواؤں اور دوسرے سرداروں نے کی۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے مربیوں کی تعریف و توصیف میں بڑے مبالغے سے کام لیتے تھے۔

اس قسم کی شاعری برطانوی دور کے ابتدائی زمانے تک جاری رہی، بعد کے شعرا نے اُس شان و شوکت کے قصیدے پڑھے جو ختم ہو گئی تھی اور حکومت کے ابتدائی دنوں میں جن کے دنوں میں شکوک،

بے یقینی اور خطرات پیدا ہو گئے تھے۔

ابتداء میں نثر میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے ادبی تخلیق سے تعبیر کیا جاسکے۔ سنسکرت کی کہانیوں کے کچھ ترجمے تھے جیسے جہاں بھجی، سنگھاسن بیتی اور پنجپالکھان۔ راتھاریاست کے عروج کے ساتھ بکھر اور کیفیات لکھی جانے لگی جن میں تاریخی داستانیں اور تاریخی شخصیتوں کی زندگیوں کے حالات بیان کئے جاتے تھے۔ ان کے لکھنے والے عمر تھے جو راجوں اور ان کے وزیروں کی ملازمت میں تھے۔ انکی زبان بڑی گھر در رہتی تھی اور حقائق کے بیان میں احتیاط نہیں برتی جاتی تھی۔ ان کی بہترین مثالیں ہیں بھاد صاحب گانجی، بکھر پانی پت جی بکھر، سہاسر کاشیو چر تر اور چمنس کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں۔

تیسرے قسم کی نثر مرٹھا حکمرانوں کے خطوط، مراسلوں اور سرکاری ریکارڈوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ ان میں راجپوت حکمرانوں، مغل گورنروں اور دہلی کے شہنشاہ کو بھیجے جانے والے سفیروں کی رپورٹیں ہیں اور پیشوا اور سندھیا، بلکر، مانگپور کے بھونسلے، ناتا پھر نوخس وغیرہ کی طرح کے سرداروں کے تعداد فی خطوط ہیں۔ یہ چیزیں ایسی زبان میں ہوتی ہیں جو فارسی تعلیقات سے بھری ہوتی ہے۔

برطانوی عہد سے پہلے کا ادب زیادہ تر مذہبی موضوعات پر پیدا کیا جاتا تھا سیکولر ادب مشتمل تھا، عشقیہ شاعری اور رزمیہ نظموں پر اور روزمرہ کی ضرورت کے موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں پر جیسے نجوم، مساحت، طب اور حکومت ان دونوں کو نظم کی شکل دی جاتی تھی تاکہ آسانی سے یاد کیا جاسکے۔ نثر بہت گھر در رہتی تھی، اس میں ادبی چاشنی نہیں تھی اور فارسی سے بھری ہوتی تھی۔

انیسویں صدی سے نئے رجحانات ظاہر ہونے لگے۔ اس میں پیش پیش تھے عیسائی مشنری 1805ء میں کیرنی نے مراٹھی صرف و نحو پہلی مرتبہ شائع کی اور ایک مرٹھا پنڈت وجے ناتھ کی مدد سے مراٹھی، انگریزی لغت تیار کی۔ 1814ء میں سیرم پور پریس نے پہلی مراٹھی کتاب سنگھاسن بیتی شائع کی گئی۔ بمبئی پریسیڈنسی کے پہلے گورنر مونت اسٹورٹ الفلٹن نے، جو لبرل ذہن رکھتا تھا اور تعلیم کا شائق اور تعلیم و ادب کے فروغ کا حامی تھا، 1820ء میں بمبئی نیو ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی اور اسے 50,000 روپے کی مالی مدد دی اس سوسائٹی نے اسکول قائم کئے اور وہاں کی مقامی زبانوں میں درسی کتابیں تیار کرنے کا کام شروع کیا۔ اس پروجیکٹ کی نگرانی کمپنن ہرڈیز کے سپرد کی گئی اور ریاضی، فزکس، تاریخ، صرف و نحو اور کہانیوں وغیرہ کی کتابیں مراٹھی میں شائع کی گئیں۔ سرائے مساحت، علم اجسام، علم تقسیم امراض اور مٹریاٹھیکا کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا گیا۔

اسکول بک سوسائٹی نے، جس کا قیام 1822ء میں عمل میں لایا گیا تھا، اسکول کی کتابوں اور بڑوں کے لیے سنجیدہ موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں پر اعلانات دیکر کتابوں کی تیاری کی ہمت افزائی کی چنانچہ جن کتابوں کے ترجموں کی سفارش کی گئی ان میں مندرجہ ذیل شامل تھیں۔ گولڈ اسمتھ کی تاریخ روم، مالکام کی ایران کی تاریخ، ولک کی عربوں کی تاریخ اور چینوں کی تاریخ، فزکس کیمسٹری، اخلاقیات کی کتابیں، تاریخ گجرات اور آرمے کی ہندوستان کا حال، آئین اکبری اور سکندر نامہ۔

اس طرح نئی مراٹھی نثر کی طرح ڈال دی گئی۔ ترجمے، جنہیں تصرفات کہنا چاہیے روزمرہ کی زبان میں کئے گئے تھے جسے مقفی و مسجع طرز نگارش سے پاک رکھا گیا تھا جہاں مراٹھی مترادفات نہ مل سکے وہاں انگریزی اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں۔

یکو لور سائنسی علم کو پھیلانے کا ذریعہ یہ نثر بن گئی۔ 1831ء میں سارا سکر اہایا سائنس اور فنون کا خلاصہ شائع کیا گیا، 1832ء میں جغرافیہ اور ریاضیات پر ایک کتاب شائع ہوئی۔ 1832ء میں قدرتی فلسفے کی گفتگو کا ترجمہ شائع کیا گیا۔ 1835ء میں فیکٹکس پر مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا جو ولیم ہیری بال کی کتاب کا ترجمہ تھا اور اسی سال اصولی اور اطلاقی ریاضیات پر نیچرڈوں کا ترجمہ شائع کیا گیا۔ انگلستان کی تاریخ، ایک وضاحتی یک موضوعی کتاب، انگلستان کا اجمالی بیان اور جان ولسن کی ہندو دھرم کا نقش ثانی بھی شائع ہوئیں۔ 1832ء میں حکومت کی تعلیمی پالیسی بدل گئی۔ ایک رجعت پسندانہ فیصلہ کیا گیا اور ہندوستانی زبانوں کے بجائے انگریزی کی سرپرستی کی جانے لگی۔ بمبئی کا بورڈ آف انجیکشن، جس کا صدر تھامس راسکن ہیری، انگریزی کی حمایت کرنے لگا اور ہندوستانی زبانوں میں کتابیں شائع کرنے پر روپیہ صرف کرنے سے دامن بچانے لگا۔ ہندوستانی مصنفین کے لیے یہ چوتھی تھی۔ انہوں نے بلا تخریر اس کا جواب دیا۔ سامتری جھمکیر، داود پانڈورنگا اور پرشورام تاتیہ گوڈبولے نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ جھمکیر نے مراٹھی میں کئی درسی کتابیں تیار کیں۔

مراٹھی زبان پڑھنے کا چلن بڑھانے کے لیے کئی رسالے شروع کئے گئے۔ 1832ء میں بال شاستری جھمکیر نے پہلا مراٹھی اخبار بمبئی اور پٹن شروع کیا اور 1840ء میں ایک دوسرا اخبار وک درشن شائع کرنا شروع کیا۔ بھاؤ مہانجن نے 1841ء میں پرہار کر شروع کیا جس میں لوک ہت داوی نے ست پترن کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ مضامین کا ایک ایسا سلسلہ تھا جس میں سماجی اور سیاسی مسائل کے تعلق سے معقولیت پسندی کی سفارش کی جاتی تھی اور بہت سی سماجی برائیوں کا پردہ فاش کیا جاتا تھا۔ عیسائی مشنریوں نے دنیا نو دیا نکالنا شروع کیا جس میں عصری مسائل پر بحث کی جاتی تھی۔ 1849ء میں دنیا ن پرکاش پونے سے شائع ہوتا شروع ہوا اور 1852ء میں کرشنا شاستری چپ لنکر نے دھارلاہری شروع کیا جس کا مقصد تھا مشنریوں کے پرچار کی مخالفت کرنا۔ ان اور دوسرے اخباروں نے مراٹھی تحریر کو بہت فروغ دیا۔

نکتوں اور صرف و نحو کی کتابوں کو تیار کر کے زبان کو معیاری بنانے کی ضرورت پوری کی گئی۔ برائے مراٹھی ادب کا احیا کیا گیا۔ جدیدیت کے ماحول نے جو تعلیم کی وجہ سے بڑھ رہا تھا، ذہنی آزادی اور تحقیق و تنقید کا جذبہ پیدا کیا۔ کئی انگریزی کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا اور سائنسی معیشت اور تکنیکی موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ اسی کے ساتھ سنسکرت کی کتابوں کا سراٹھی میں ترجمہ کیا گیا۔

حالانکہ انیسویں صدی کے نصف اول کے اوپن کارٹاے بہت بڑے نہیں تھے پھر بھی جیسا کہ راناڈے نے کہا تھا اس تبدیلی کی اُمید افزا نوعیت تھی تیزی کے ساتھ ادب کا پید کیا جاتا۔ انہوں نے کہا ”تمام وہ راستے کھل گئے ہیں۔ جن سے مراٹھی ادب کی مزید نشوونما ہو سکتی ہے۔ پرانی شاعری کی اشاعت میں بہت ترقی ہوئی۔ سنسکرت اور انگریزی کی کتابوں کے ترجموں کی اچھی ابتداء ہوئی اور ترقی کا یہ پہلا مرحلہ جو کچھ کیا جا چکا تھا اُس کے مقابلے میں آئندہ ترقی کے زیادہ امکانات رکھتا تھا۔

صدی کے وسط تک طبع زاد تصنیفات سامنے آنے لگیں۔ وناک جناردن کرتار نے پہلا ناول ”تھورے مادھو راؤ“ لکھا (1816ء)۔ بابا پانچنی نے (1831ء-1906ء) جو عیسائی ہو گئے تھے۔ ایک ناول ”نمایا پراتن“ میں ایک ہندوستانی بیوہ کے دکھ بیان کئے اور یسوع کے پیغام کی تعریف کی۔ اُس کے بعد نئی اور ناول لکھے گئے جن میں رومانی جذبات پائے جاتے تھے، حقیقی انسانی اساسات بھٹکتے تھے اور بالوا۔ ط

انداز میں اُس زمانے کے سماجی مسائل کے خلاف جدوجہد کی گئی تھی۔ ان ابتدائی کوشش کے بعد جن میں عجیب وغریب اور مافوق الفطرت کردار اہم ردِ اوکرتے تھے مقصدی تاویس لکھی جانے لگیں۔ اس قسم کے ادب کی بہترین مثال تھے ہری فرانس آپنے (1864ء-1889ء) وہ اپنے کردار زندگی سے لیتے تھے اُن کے ذہنوں کو تجزیہ کرتے تھے اور اُن مسائل پر بحث کرتے تھے جس کا اُن کرداروں کو سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اُن کی کہانیوں میں اس قسم کی سماجی خرابیوں کی عکاسی کی جاتی تھی۔ جیسے بچپن کی شادیاں، بیواؤں کے دکھ، مشترکہ خاندان، عورتوں کی کمتر حیثیت اور مردوں کا اُن کی طرف تھکسانہ رویہ۔ اُن کی کتابوں کا مرکزی موضوع ہے جدیدیت کے ساتھ روایت کا ٹکراؤ۔ نثر کی ادبی ترقی پر آپنے کا اثر دیرپا ہے۔

مراٹھی ادب کے نمونے میں 1874ء ایک اہم سنگ میل ہے۔ ابھی تک زیادہ تر مصنفین یا تو سنسکرت کلاسیک یا مشہور انگریزی کی کتابوں کے ترجمے میں مشغول تھے۔

نہ صرف اُن کے خیالات بلکہ زبان کی وہ شکل بھی بدلی معلوم ہوتی تھی جسے وہ استعمال کرتے تھے۔ 1874ء میں وشنو شاستری چپ لنکر نے ”بندھ مالا“ لکھ کر مراٹھی قارئین کو دکھایا کہ انسانی عمل کے تمام میدانوں جیسے تاریخ، سیاست، معیشت، فلسفہ اور اخلاقیات میں انتہائی دقیق و پیچیدہ تصورات کو پیش کرنے میں مراٹھی نثر کن بلندی تک پہنچ سکتی ہے اُن کے مضامین اسلوب اور اظہار کے نمونے بن گئے انہوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی جیسے مراٹھی زبان، شاعری، تاریخ، ادبام پرستی، ترجمہ کافن، جاسنس کی سوانح، ملک کی صورت حال وغیرہ وغیرہ۔ ”اُن کے طرز، دشنام آمیز تجدد، پردہ دار اسلوب، بے اندازہ اطلاعات اور سنسکرت اور مراٹھی ادب کی پوری پوری واقفیت نے پڑھنے والوں کا من موہ لیا۔“ اُن کی تحریروں نے تعلیم یافتہ طبقے کو اُن زنجیروں سے آزاد کرادیا۔ جو انہیں بدلی فکر سے باندھے ہوئے تھیں۔ چپ لنکر نے کیسری اور مراٹھا کو بھی شروع کیا تھا۔ جنہوں نے آگے چل کر تقریباً آدمی صدی تک مراٹھوں کی سیاسی تحریک اور فکر کی رہنمائی کی۔

1882ء میں چپ لنکر کا انتقال ہو گیا۔ اُس وقت اُن کی عمر صرف بیس سال کی تھی۔ لیکن زبان کو مالا مال کرنے کے اُن کے کام کو اگر کر سکتا، شورام مہالو پراچی اور بہت سے دوسرے مصنفوں نے جاری رکھا۔ اگر کرنے کیسری کی اشاعت کے وقت سے سات سال تک اُس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اُن کے بعد تقریباً اتنی ہی مدت تک وہ سدھار کی کے اذیتر رہے۔ وہ سماجی معاملات اور سیاسی دونوں میں شدت پسند تصورات رکھتے تھے اور بلا خوف اُن کا اظہار کرتے تھے۔ ملک نے سیاسی جدوجہد پر توجہ رکھی اور اپنے حلقوں کا خزانہ زیادہ تر بدلی حکومت کو بنایا۔ اُن کی زبان سے اُن کی شخصیت جھلکی تھی یعنی ایک طرز، کھروری اور زور دار شخصیت۔ انہوں نے گیتا رامیہ لکھی جو گیتا کی تشریح تھی اور جس میں ترک دنیا کے تعلق سے انہوں نے خشکی کی دلیل کی تردید کی اور اس بات پر زور دیا کہ ہر شخص کو بے لوثی کے ساتھ اپنا مقررہ کام پورا کرنا چاہیے۔ چپ لنکر اگر کر اور ملک کی تحریروں نے کئی دوسرے مصنفین کو متاثر کیا۔ جن میں سے شری پد کرشنا کو لہا نکر نے مزاحیہ مضامین میں شہرت پائی، شورام مہالو پرانچی نے اوبی مضامین میں کیلنکر نے تنقیدی مضامین میں اور راج وادے نے تاریخی مضامین میں۔ کئی لکھنے والوں نے سوانح اور تاریخ پر توجہ کی مغرب کے مشاہیر یعنی شاعروں، ڈرامہ نگاروں، سیاست دانوں اور حکمرانوں کی سوانح اور ہندوستان کی تاریخ کی عظیم ہستیوں کی سوانح بھی لکھی گئی ہیں۔ تاریخ پر کتابیں راج وادے، واسودیو شاستری کھرے اور پرسنس نے لکھیں۔

مغرب کے جذبے سے متاثر ہو کر اور مغربی نمونوں کے مطابق شاعری کی گئی اور ڈرامے لکھے گئے۔ کوشاکی کیشور نے، جو اپنے مختص ”لیٹسوس“ سے زیادہ مشہور ہیں، ورڈس اور تھو دوسرے روہائی ادیبوں سے متاثر ہو کر فرد کے وقار، آزادی، مساوات اور انسان دوستی پر زیادہ زور دیا۔ اُن کی نظمیں تو تاری، زبور ز اور نوامعیائی نے مراٹھی ادب میں ایک نئی روح بھونک دی۔ ان کے ہم عصروں ریورنڈ تلک، رندالکر، وناٹک، تاجپے، گدکاری اور تمومرے نے فطرت کے مختلف احوال کی عکاسی کی۔

ڈرامہ نگاروں میں کرلوسکر کے ڈرامے زیادہ مقبول تھے۔ جن کی بنیاد اصل سنسکرت ڈراموں پر قائم تھی اُن کے ہیروؤں میں دیول اہم تھے۔ انہوں نے نابرابری کی شایوں کی مذمت کی اور ان کے ڈرامے ”مسترد“ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

V۔ اردو اور ہندی ادب

شمالی ہندوستان میں اردو اور ہندی کے حالات میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی تھیں۔ لیکن اردو کا ارتقا معمول کے مطابق ہو رہا تھا جبکہ ہندی کی ترقی میں وہ تذبذب حائل تھا جو ادبی زبان کی بنیاد بنانے کے لیے ہندی کی بولیوں میں سے کسی کا انتخاب کرنے میں ہو رہا تھا۔ ان بولیوں میں سے برج بھاشا میں اعلیٰ درجہ کا ادب مقابلتا زیادہ تھا اور انیسویں صدی کے ادیبوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی حد تک غیر شائستہ ”کھڑی بولی“ شاعری کے لیے مناسب اظہار کا ذریعہ نہیں ہے۔ جہاں تک نثر کا تعلق تھا اس قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ برج بھاشا اور ہندی کے دوسری بولیوں میں نثری ادب کا وجود بالکل نہیں تھا۔ دوسری طرف فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد کھڑی بولی میں کتابیں لکھی جا رہی تھیں (1) اور یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ بولی سنجیدہ تحریروں کی صلاحیت رکھتی ہے۔

سب سے پہلے نثر کے اس اسلوب کو سدا سکھ لال، للوالال جی، شوشر اور انشاء اللہ خاں انشانے استعمال کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا رواج بڑھنے لگا لیکن نصف انیسویں صدی ختم ہونے کے بعد اس کی رفتار میں تیزی آئی۔ لیکن ہندی شاعری میں نزاعی بحث جاری رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آواز اور طاقت ور زبان کی حیثیت سے ہندی کی ترقی بیسویں صدی میں ہوئی۔ لیکن نثر میں ہندی کے اخباروں، تاریخی کتابوں، مضامین اور ڈراموں نے آئندہ کی ترقی کے لیے میدان تیار کر دیا۔

اُن نثر لکھنے والوں میں جنہوں نے مختلف اسلوبوں کے تجربے کئے مندرجہ ذیل شامل تھے۔ راجہ شیو پرشاد (1823ء-1895ء) جنہوں نے تین جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ لکھی اور اُس میں بہت سے فارسی کے الفاظ استعمال کیے۔ راجہ لکشمی سنگھ جو اپنی تحریروں میں سنسکرت کا استعمال زیادہ کرتے تھے۔ بھارت اندو پریش چندر (1850ء-1885ء) جنہوں نے درمیانی راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے انگریزی نمونوں کی پیروی کرتے ہوئے کئی ڈرامے لکھے۔

اس زمانے کی ہندی شاعری میں بڑی حد تک احیا برستی پائی جاتی تھی اور وہ برج بھاشا میں لکھی جاتی تھی لیکن سری دھرپاٹھک نے (1856ء-1923ء) اپنی نظم ”اکانت“ اس بولی میں یہ روایت تازہ کی

اور کھڑی بولی کا استعمال کیا۔ ان کی بیروی دوسروں نے کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر یہ بولی ہندی شہری اظہار کا اصل ذریعہ بن گئی۔

اردو کو اس قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اُس کی شاعری حیرت ناک حد تک ترقی کر چکی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب (وفات 1869ء) کی نظم و نثر نے آئندہ الے جدید رجحانات کی نشاندہی کر دی تھی۔ ان کے خطوط کی زبان، جو سیدھی سادی بات چیت کے انداز میں ہیں، ایک ایسا نمونہ پیش کرتی ہے جو جدید اظہار کے لیے سازگار ہے۔ ان کی شاعری میں فکر و فن کو جو اہمیت دی گئی ہے، تنقید اور استعارے کی آمد اور نئے پن پر جو زور دیا گیا ہے اور روایتی اسلوب کی جزئیات سے جس طرح بچا گیا ہے وہ ترقی کے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

1857 کی تباہ کاری، غفلتِ اشرافیہ کے باقیات کے خاتمے، ایک جدید حکومت کے قیام، معاشی حالات میں ہونی والی تبدیلیوں اور نئے تصورات اور نئی تعلیم کے پھیلنے کی وجہ سے جو سانحہ وجود میں آیا اس نے شمالی صوبوں کے سماجی ماحول کو بدل دیا۔ آنگلوں کے سامنے ایک دنیا آگئی اور نئے مسائل، موضوعات اور مفادات توجہ کے مرکز بن گئے۔ غزل کی محد و فضا ان کے اظہار کے لیے ناکافی تھی اس لیے مثنوی اور مسدس کو ترجیح دی جانے لگی۔ فطری مناظر و مظاہرے جیسے برسات کا موسم، سردی اور گرمی، بہتے ہوئے دریا اور پہاڑوں کے منظر شاعرانہ تخیل کے جڑ بن گئے۔ خیالی، بیانیہ، تاریخی، ہند آمیز اور وطنی موضوعات عام ہو گئے۔ نئے حالات میں اردو ترقی کرنے لگی اور روایتی تصورات سے نا آسودگی کا اظہار ہونے لگا۔ سر سید احمد خاں نے (1897-1817ء) جو سیدھی سادی تکلفات سے نمبر انٹر لکسے والوں میں پیش پیش تھے، خواہش ظاہر کی کہ ”ماضی کی اُن خیالی روایتوں کو ختم کر دیا جائے جو ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہیں“ اور یہ کہ ”مشرقی علوم اور مغربی ادب اور سائنس میں سمجھو تا کیا جائے“ نذیر احمد نے لکھا ”ادب (قدیم) ہمیں غلط بیانی اور چالچوسی سکھاتا ہے۔ یہ ادب واقعات کے حقیقی حسن پر پانی پھیر دیتا ہے اور اُسے ظاہر نہیں کرتا ہے۔ غیر صحت مند جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔ انگریزی کے مطالعے نے مجھ پر فتر و فتر اپنے ادب کی خرابیاں روشن کر رہی ہیں“ (1)

نئے دبستان کی بنیاد محمد حسین آزاد (وفات 1910ء) اور الطاف حسین حالی (1837ء-1913ء) نے ڈالی جنہوں نے اردو ادب کو فروغ دینے کے لیے لاہور میں ایک ادبی سوسائٹی قائم کی۔ آزاد نے نئے انداز کی اور نئے موضوعات پر نظمیں لکھیں جیسے شام کی آمد، مثنوی حسب وطن، خواب امن، ولادہ انصاف، زمستان وغیرہ۔ حالی نے ادب کی زیادہ خدمت کی۔ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار اور ناقد بھی تھے۔ انہوں نے وطنی نظمیں لکھیں، زبان اور فطرت کے متعلق نظمیں لکھیں، سماجی اصلاح کے متعلق نظمیں لکھیں اور نا صحانہ نظمیں اور مرثیے لکھے۔ اُن کی نظم شکوہ ہندوستان کے شاندار ماضی کا قصیدہ بھی ہے اور موجودہ اُلت کی شکایت بھی انہوں نے اپنا شاہکار مسدس حالی لکھ کر ابدی شہرت حاصل کر لی جو اسلام کے عروج و زوال کا ایک مرثیہ ہے۔

اس زمانے کے دوسرے شاعر جنہوں نے جدت کا پیغام دیا وہ تھے میرٹھ کے محمد اشعلیل (1873ء-1910ء) جو بڑے پرگو تھے خصوصاً تاریخی اور مذہبی نظموں کے میدان میں اور اکبر الہ آبادی

(1846ء-1921ء) جن کی ابتدا اُردو ادبی زندگی ماس دور میں گزری اور اردو کے سب سے بڑے طنز نگار تھے۔ اردو کی نئی نظم فورٹ ولیم کالج میں وجود میں آئی۔ اسکی سرپرستی میں جن لادبوں نے نمود نما پائی ان میں میر اسکن اور ان کے ساتھی شامل تھے انکا اصلی کام ثقافتی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا دہلی میں پروفیسر رام چندر نے سائنسی نثر اور مضامین کی دلغ نیکل ڈالی۔

اس کے بعد وہ مصنف پیدا ہوئے جنہوں نے اردو ادب کو بالائیل کر دیا۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل تھے۔ آزاد جنہوں نے اردو ادب کی مشہور تاریخ ”آب حیات“ لکھی، حلی، جنہوں نے سعدی، غالب اور سر سید احمد خاں کی سوانح لکھیں، نذیر احمد (1821ء-1912ء) جنہوں نے ناولیں لکھیں اور قانون کی کتابوں کا ترجمہ کیا، شکی نعمانی (1857ء-1914ء جو مورخ، ناقد، فلسف اور عالم دین تھے، ذکا اللہ (1882ء-1910ء) جو مورخ تھے، انگریزی کی سائنس کی کتابوں کے مترجم تھے اور رام چندر کے شاگرد تھے۔ مرزا لدی حسن رسوا تحقیقی نظم یعنی حراج، طنز، ناول اور کہانی میں جنہوں نے شہرت پائی وہ تھے۔

سجاد حسین (1856ء-1915ء) جو حراج میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور مشہور اخبار اودھ پنچ کے ایڈیٹر تھے، رتن ناتھ سرشار (1822ء-1902ء) جو چار جلدوں میں چھپنے والے دلچسپ ناول فسانہ آزاد کے مصنف تھے جس میں انیسویں صدی کی ابتدا کے اودھ کے سانج کی عکاسی کی گئی ہے اور عبد اللیم شرر (1860ء-1926ء) جو تاریخی ناولوں کے مصنف تھے اور ایک ایسا اسلوب نگارش رکھتے تھے جس میں تازگی پائی جاتی تھی۔

VI۔ تامل اور متلگو ادب

جورجانات شمال کی آریائی زبانوں میں دیکھنے میں آئے وہی در لوڑی زبانوں میں بھی ظاہر ہوئے یعنی تامل، متلگو، کنڑ اور ملیالم میں۔ تامل بہت پرانی زبان ہے جس میں وسیع ادب پلایا جاتا ہے۔ تامل بولنے والے لوگوں کے رواج یورپ کے لوگوں سے بہت پرانے زمانے سے قائم تھے۔ چندر ہویں صدی میں پرنگلی ہندوستان آئے، مغربی اور مشرقی ساحلوں پر آباد ہو گئے، ہندوستانی عورتوں سے انہوں نے شادیاں کیں، ہندوستانی رہن سہن اختیار کی اور تامل اور ملیالم زبانیں سیکھیں۔ ان کے بعد عیسائی مشنری آئے جن کا تعلق سوسائٹی آف مینیس سے تھا۔ انہوں نے تامل نثر کو جنم دیا، تفتیش تیار کی اور صرف و نحو کی کتابیں لکھیں۔ ان میں پہلا شخص تھارابرٹ وی ٹول (1577ء-1656ء) اس کے بعد 1700ء میں کاسٹن پٹن جوزف نیچی آیا۔ وہ بڑا اہل لسانیات تھا جس نے تامل میں کتابیں لکھیں یعنی جوزف کی زندگی پر تمبارانی اور نثر میں پرمار تھارگر کھائے۔ اس کے جلد ہی بعد پروفیسر مشنری آئے بار تھو لو میوز جبناگ نے (1683ء-1719ء) جو 1706ء میں آیا تھا، تامل کا چھاپا خانہ قائم کیا۔

مشنریوں کے ساتھ تاجر اور سلطنت قائم کرنے والے بھی آئے۔ پرنگلی، ولند ہنری، فرانسیس اور انگریز ہندوستان میں طاقت حاصل کرنے کے لیے رقابت میں مبتلا ہو گئے۔ اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کی فتح کے بعد ان کی باہمی کشاکش ہو گئی جنہوں نے جزیرہ نما میں فرانسیسیوں اور ہندوستانی

عکراؤں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔

اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا انتظامی ڈھانچہ بنایا گیا اور کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی طرح کا فورٹ سینٹ جارج کالج 1812ء میں مدراس میں قائم کیا گیا یہاں کبھی کے ملازمین کو تامل زبان پڑھائی جاتی تھی، تامل کی ایک لائبریری بنائی گئی اور تامل میں کتابیں چھاپی گئیں۔

جو چوڑت کالج میں پڑھاتے تھے انہوں نے سب سے پہلے مغربی نقطہ نظر کو جذب کیا۔ انہوں نے قدیم کلاسیکی کتابوں کے تنقیدی ٹیٹیشن چھاپے، انگریزی کتابوں کے ترجمے کے اور لغتوں اور صرف و نحو کی کتابوں کی تیار میں مدد دی۔ رفتہ رفتہ جدید اور طبع زولاب کے لیے زبان معرض وجود میں آگئی۔ متاثری سندرم پے (1815ء-1926ء) جو ایک جانے پہچانے عالم اور تامل کے استاد تھے، اپنی زبان میں لکھنے کے لیے اپنے طالب علموں کی بہت افزائی کی۔ ان کے شاگرد دیہ تاگیم پے (1826ء-1889ء) نے تامل میں پہلا ناول لکھا۔ ان کے ایک اور شاگرد تھے یو۔ وی۔ سوامی ناتھ ایئر (1800ء-1942ء) جنہیں ”تامل کی نشاۃِ عالیہ کا قیام“ تامل کلاسیکی ادب میں جان ڈالنے والا اور تامل لوگوں کی اس نسل کو محرکات مہیا کرنے والا کہا جاتا ہے جس میں سبرانیم بھی شامل تھے۔

انگریزی اور ملٹری سے کہانتوں اور حکایتوں کے ترجمے کا دور شروع ہوا جس نے تامل پڑھنے والوں میں حرکت پیدا کر دی اس کے بعد طبع زولاب میں جن کے موضوعات روایتی اور ملی ہوئے تھے، اور ڈرامے لکھے جانے لگے جو شیکسپیر، بن جاسن، گوٹو اتسی، شریڈن اور دوسروں کے چہرے تھے۔ تاریخی، سماجی، روایتی اور وطنی تصورات ادب میں مقبول ہو گئے۔

نثر کی ترقی اور جدید تصورات کی اشاعت میں اخباروں نے بھی مدد دی۔ اور انگریزی تعلیم کے فروغ نے مغربی ادب میں لوگوں کی دل چسپی بھی بڑھادی اور جدید انداز فکر کو قبول کرنے کے لیے انہیں آمادہ بھی کر دیا۔ عالموں اور مصنفوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جس نے جدید تامل ادب کو جنم دیا۔

ملگو ادب کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ادب کی ترقی میں اسی قسم کے عوامل کام کر رہے تھے جو ہندوستان کی دوسری زبانوں کی نشوونما میں کر رہے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کی وسط تک کا دور انحطاط کا دور تھا۔ شاعر حقیقی شاعری کے بجائے ”مذہبی ورزش“ کے دلدادہ تھے۔ اچھی شاعری ختم ہو گئی تھی اور عشق و محبت کے مصنوعی واقعات غالب آ گئے تھے۔ اس کے بعد کا دور یعنی 1850ء سے 1900ء تک کا تبدیلی کا دور تھا جس میں انگریزی اثر اور روایت میں تصادم ہو رہا تھا۔ شاعری میں پرانا اسلوب اب بھی بہترین سمجھا جاتا تھا۔ مہابھارت اور رمانوں سے اخذ کئے موضوعات پر نظمیں لکھیں جاتی ہیں۔ تشبیہ و استعارے سے کام لیا جاتا تھا۔ سرمدنی صفت کو پسند کیا جاتا تھا اور لادھم جس میں ادبی اہمیت کی آٹھ صفیں اور سو شعر ہوتے ہیں، مقبول تھا۔ نثر کا چلن جینیا سودی (1806ء-1862ء) نے ڈال دیا۔ وہ عقلی اور بھی سماجی نثر لکھتے تھے جو بول چال کی زبان سے بہت دور تھی۔

1880ء کے لگ بھگ سماجی اصلاح کی سرگرمیوں کے بعد ایک نئی تحریک شروع ہوئی جس کو کندھاری ویساٹم (1848ء-1919ء) نے شروع کیا تھا۔ انہوں نے خراب سماجی رواجوں کا فائدہ اٹانے کے لیے ایک اخبار ہاسہ نیومی کی اشاعت شروع کی اور عقلی فن اور ادب کو فروغ دینے کے لیے ایک اور اخبار دیوک درمھی شروع کیا۔ وہ پہلے ملگو مصنف تھے جنہوں نے ناول، مضامین، ڈرامے اور سائنس پر کتابیں

لکھیں۔ ان کے ساتھ ایک نیا لہری دور شروع ہوا جس نے جینیہ سودی کی اس دور میں رائج پت قد نثر سے منہ موڑا اور ایک سادہ اور فطری اسلوب نگارش کو چلن دیا۔

دوسرے مصنف جنہوں نے جدید اسلوب کو فروغ دیا وہ تھے گرو زلہہ، وکٹ لپا راؤ (1861ء-1916ء)، گندو گود کھاراسورتی (1868ء-1940ء)، کماراجو وکٹ لکشمین راؤ اور دیو دھر آکو کاکی ناتھن کلیورارائو۔ وہ لوگ تنگدوب میں نشاۃ ثانیہ کے، غیب تھے اس لیے کہ انہوں نے اس زبان کو جو پہلے استعمال ہوتی تھی تہذیبی دور کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے نئے دور اور ایک نئے لہجے کے لیے میدان تیار کر دیا۔

ہندوستان کی کچھ زبانوں کی لہری تحریکات کے اس اعلیٰ جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پورے ملک میں ہندوستانی ذہن کی ترقی میں مشترکہ رجحانات پائے جاتے تھے۔ مغرب کے تصورات کو جذب کرنے اور مغربی رجحانات اور اظہار کے طریقوں کو قبول کرنے کے لیے ہندوستانی ذہن تیار تھا لیکن اسی کے ساتھ اسے اپنے روایتی دورے سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ وہ بہت سی قدیم چیزوں میں ترمیم کرنے بلکہ انہیں رد کر دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ مجموعی اعتبار سے ماضی کے پورے دورے کو رد کر دے۔ اس کی کوشش تھی کہ اپنی تہذیب کی مستقل اور دیرپا اقدار کو محفوظ رکھے اور مغرب سے وہاں اقدار حاصل کرے جو ایک نئے سماج کی تعمیر کے لیے ضروری تھیں۔ مشرق اور مغرب میں سمجھوتا کرنے اور مشرق کے ضروری اقدام کو ترک کئے بغیر مغربی طور طریق سیکھنے کی ہندوستان کی کوشش نے فکر اور مذہب کے بہت سے نظاموں کو جنم دیا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مشترکہ نقطہ نظر اور یکساں تصورات و جذبات کو جنم دیا جو قومی شعور کے پیدا ہونے کی پہلی شرائط ہیں۔

